ادارہ بحث و تحقیق

مذہبی نقطہ نظر کا تنقیدی جائزہ روشن خیالی انداز میں

فہرست آرٹیکلز

منطق 13

علم اور عقیدے کا فرق 13

شر اور آزاد ارادہ 16

اس لیے خدا بھلی علت نھیں ہے۔ 21

کائناتی استدلال 24

روح کیاہے؟ 27

باطل مشکل 31

توسل بہ جھل 33

خدا بمقابلہ شر 35

اوکیم کا نشتر 37

الہی منطقیات 38

بعرہ اور بعیر 42

مؤمن اور خفیہ شخص 46

غیر حقیقی سکاٹ 50

دنیاہے امتحان 51

منہ کالا ما 53

امتحان اور مساوی مواقع 55

خدا اور طبعی قوانین 57

تخلیق اور تقدیر 59

معجزہ اور قرآن 62

خدا کی عظمت 64

پھلی وجہ 67

نمرودیبے وقوفی 70

گول منطق 72

کائنات اور ابن رشد 73

آغاز پر بحث 76

خداہے کہ نھیں ہے؟ 80

کائناتی سوالات 84

خدا اور برائی 86

خدا اور طبعی آفات 88

مزہب 91

داعش اسلامی ہے 91

یورپ کو اک نصیحت 93

اسباب و حقائقِ غزوۂ بدر 95

مکالمہ علم و عقیدہ 104
اسلام کے بنیادی ارکان اور ان کے اثرات 107
اسلام کیسے پھیلا؟ 111
دلائلِ نبوت عقل اور نقل کی روشنی میں 115
پیغمبر اسلام پر کفار کے مظالم، حقیقت اور افسانہ 124
اسلام میں عورت کا مقام 132
سانحۂ بنو قریظہ 137
آخر اسلام ہی کیوں؟ 144
پیغمبرِ اسلام اور خلفاء راشدین کے دور میں کمسن بچیوں کے نکاح 148
زمانہ قبل اسلام میں عورت کا سماجی مقام ـ قسط اول 151
سلمہ بنت عمرو 151
قتیلہ بنت نوفل 151
خدیجہ بنت خویلد 151
زمانہ قبل اسلام میں عورت کا سماجی مقام ـ قسط دوم 151
عصماء بنت مروان 151
ہند بنت عتبہ 151
فاطمہ بنت ربیعہ 151
سجاح بنت حارث 151
حاصل مطالعہ 151
معراج نبوی ـ قرآن احادیث اور تاریخ کی روشنی میں 151
وہ جو دریا سے نکالے گئے 151

APOLLO LANDS ON MOON 151
اسلامی حماقتیں 151
کیا محمد کو تمام انسانوں کیلئے بھیجا گیا تھا؟ 152
بارے کچھ اسلامی عبادات کے 157
مانی 159
جو یہاں پیو بھی تو حلال ہے!! 160
عبد اللہ بن ابی السرح اور وحی کا ڈرامہ 164
اللہ کی بے بسی 167
النضر بن الحارث – ایک جلیل القدر صحابی 172
اسلام اور بچوں کا قتل 180
جبریل – مسیحائے پیغمبر 184
اسلاموفوبیا 190
غیبی آوازیں 194
مذہب اور عورت 197
جنت کی ریوڑیاں 200
انقلاب کی تعریف 203
مذہب میں تجدید یا نئے مذہب کی ایجاد 204
جناتی مسائل 207

دوسرے سیاروں پر ذہین حیات اور قرآن 212

عبادت یا ریکارڈر! 222

مذاہب کی میتھالوجی 223

انصاف کا فسانہ 225

حدیث کی مصداقیت 233

فان لم تستیقظوا ولن تستیقظوا 236

کنواری کا بیٹا 256

نمرودیہ بے وقوفی 258

الکلام الفرقان فی خزعبلات الدکتور جواد خان 259

کائنات اور ابن رشد 271

انسانی مشینیں 274

مقدس متن 276

انسانیت 278

قرآنیات 280

قرآن کے دھندے 280

قرآن اور قمری کیلنڈر 285

کیا واقعی قرآن محفوظ ہے؟ 289

قرآن میں انسانی تصرف کی نشاندہی 297

قرآن اور دعوائے بلاغت 303
کیا یہ قرآن کا کھلا تضاد نہیں؟ 312
قرآنی بازار 314
الاتقان فی تدمیر القرآن – جمع القرآن 320
شیطانی آیات 335
للکارِ خداوندی 339
قرآنی جائزہ 1 341
قرآنی جائزہ 2 344
قرآنی جائزہ 3 349
قرآن اور اس کے تضادات 355
کیا قرآن اللہ کا کلام ہے؟ 358
وما مسنا من لغوب 361
انصاف کا فسانہ 363
معجزہ اور قرآن 371
الکلام الفرقان فی خزعبلات الدکتور جواد خان 373
قرآن اور اسرائیلیات 385

فلسفہ 393

ما بعد الطبیعات میں ابدیت کا مفہوم 393

روشن خیالی 396

خدا وجود اور عدم 399

دینِ فطرت زیرِ نشتر 401

آزادی فکر اور انسانی حقوق 404

حق موجود یا حق غیر موجود 413

فری تھنکنگ 419

دہریت اور سماجی سوچ 426

تصویرِ خدا 433

سیکولرزم 438

الحاد اور ضابطہ حیات 438

علماء اور ملاؤں 441

سیکولرزم کیوں؟ 442

کیا تم سیکولر ہو؟ 445

اسلام اور غیر مسلموں کے حقوق 452

سائنس 465

نسلِ انسانی اور تھذیب کا آغاز 465

انسانی ارتقاء کی مختصر تاریخ 467

عدم سے تخلیق – بغیر خدا کے 471

کائنات کی توانائی 478

ارتقاء کے مخالفین کی علمی مصداقیت – ہارون یحیی بطور نمونہ 480

تنقید و تاریخ 484

غلامی – ایک پیدائشی جرم 484

"غزوہ پشاور اسکول" اور بنیاد پرست 486

دہریت اور خدا، بھر کیا؟ 494

الوہی مداخلت 495

محسن انسانیت 498

شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار 514

اسلام اور جدیدیت کا خوف 515

اللہ کا دشمن کون ہے؟ 517

اسلام اور آزادی 521

اسلام ساری دنیا کے خلاف ہے 525

چور مچائے شور (حصہ اول) 527

چور مچائے شور: کشمیر (حصہ دوم) 535

تو کعبہ ٹوٹ جاتا ہے 543

میں تو آئینہ ہوں 544

نامعقولیت 546

مولوی بمقابلہ سور 554

رج کتھوں لیائیے لبھ کے بلا کو خان ا کی ہور........ 557

مجاز مؤمن کی جائے پناہ 559

اِسلام کا ناشور 561

خدا کی زبردست ہٹ دھرمی........ 563

مذہب اور فلسفہ میں کیا فرق ہے؟ 565

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے........ 567

اے ملحدو تمھاری خیر نہیں 570

حماقت کا دائرہ کار (حصہ اول)۔........ 574

حماقت کا دائرہ کار (حصہ دوم)۔........ 577

حماقت کا دائرہ کار (حصہ سوم)۔ 580

ڈائینو 581

سچائی / حقیقت کیاہے 582

آزاد انسان 588

گرگٹیریا 591

سائنس، مذہب اور مولویات........ 595

سائنس، مذہب اور مولویات (حصہ دوم)۔........ 598

سب مایاہے 603
اور خدانے عورت کو بنایا 607
تاریخ کی تحریف 610
کیا الحاد جرم ہے؟ 615
جادوگریاں 617
تلبیسی ابلیسی لاجک 621
موت کا خوف 622
خَر آسانیاں 625
خرافانیاں 628
آنکھ کا شہتیر 633
کرسٹل کی بال 636
دماغیات 638
مجہول خدا 645
سائنس اور مسلمان 649
عقل اور خدا 649
مسروقہ تھذیب 651
آٹھواں عجوبہ 654
تصویر علیاء المھدی کی 656

خدائی سوالات انسانی شناخت سے 659
کیا کوئی اسلامی تہذیب ہے؟ 661
خدا سے گوگل تک 662
انبیاء کا تقدس 664
نبیؐ کریم کی خانگی زندگی 666
ہستی 671
کوئی خدا 672
مساوات مساوات کرو ہو 673
ابو ذر غفاری – تاریخ اسلام کا ایک بھولا بسرا ورق 674
مدینہ کی ریاست 683
مدینہ کی ریاست کا آغاز 683
اسلام میں پہلا انتقال اقتدار 684
خلافت ابو بکر 685
شورش ارتداد 685
مدینہ کی ریاست ـ حصہ دوم 687
خلافت حضرت عمر 687
مال غنیمت اور کشور کشائی 687
عربوں کی فطری جبلت 688
حضرت عمر کا قتل 688
عربوں کی فتوحات کا موازنہ 688
عرب اور فارس کا ثقافتی ٹکراؤ 689
عرب اور فارس کا ثقافتی فرق 690

مدینہ کی ریاست ۔ حصہ سوم 691

حضرت عثمان کا دور 691

اسلامی طرز انتخاب 692

حضرت عثمان کا طرز خلافت 692

مشاجرات صحابہ 695

شہادت حضرت عثمان 695

شہیدِ وطن راجہ داہر 697

منطق

علم اور عقیدے کا فرق

جب انسان عالمِ وجود میں آیا تو اس نے اپنے گردونواح کی چیزوں کا جائزہ لیا اور اپنے آپ سے سوال کیا کہ یہ کیا ہیں؟ کیسے بنی ہیں؟ اور کیوں بنی ہیں؟ اس طرح اس نے ان کے متعلق کچھ غلط اور کچھ صحیح نظریات قائم کر لئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کے علم میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی سوچ بچار بھی سلجھتی گئی۔ رفتہ رفتہ نظریات کی تصحیح ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ضروریات بھی بڑھتی گئیں۔ اس نے قوانین فطرت اور کائنات کی بناوٹ دریافت کرنے کیلئے اور زیادہ کوششیں کیں، تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش حاصل کرنے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے اس عالم کے لامحدود مظاہر کو مسخر کرے اور انہیں اپنے کام میں لاسکے۔ چنانچہ سائنس اسی انسانی علم کا ذخیرہ ہے جو اسان نے اس طرح ہزاروں برس کی ان تھک کوشش، سوچ بچار، غور و فکر اور تجربات و مشاہدات سے حاصل کیا ہے۔

اس عالم کے جملہ مظاہرات کے متعلق علم و آگاہی حاصل کرنے کیلئے انسان کے پاس پانچ قوتیں ہیں، جنہیں حواس خمسہ کہتے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ قوت باصرہ = دیکھنے کی قوت

۲۔ قوت سامعہ = سننے کی طاقت

۳۔ قوت ذائقہ = چکھنے کی قوت

۴۔ قوت لامسہ = چھونے کی طاقت

۵۔ قوت شامہ = سونگھنے کی طاقت

اب مقدمہ تو یہ ہے کے جن چیزوں کو ہم حواس سے نہیں دریافت کرسکتے، ان کا علم عقل کے ذریعے بھی نہیں ہوسکتا۔ حقیقت تو یہی ہے کے حواس کے ذریعے جب ہمیں کسی چیز کا علم ہوتا ہے تو اس کے بعد عقل (جو کے ایک ذہنی صلاحیت ہے، ذہنی استعداد ہے) ان کی ترتیب و تقسیم کرتی ہے، ان سے مناسب نتائج نکالتی ہے۔ لیکن جہاں سرے سے حواس کی رسائی ہی نہ ہو ظاہر ہے عقل کی رسائی وہاں تک ناممکن ہے۔ اور دائرہ حواس سے نکل کر کوئی اور مصدقہ ذرائع علم نہیں جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ کیونکہ کائنات کا نہ کوئی اندروں ہے نہ بیروں، جو کچھ ہے عالمِ مظہر ہے۔ دنیا بھر کے مذاہب دائرۂ حواس سے نکل کر 'وحی' اور وجدان کے بل پر مطلق سچائی جاننے کا دعوی کرتے ہیں۔ ایسے کسی مصدقہ ذرائع علم کا وجود مذہب کے پاس نہیں

جس کے ذریعے اس کائنات کے آغاز وانجام اور واجب الوجود تک پہنچنے کی بات کی جائے. کیونکہ کسی بھی قسم کا علم عالم مظہر میں ہی ہے. مظہر وہ ہے جو زمان و مکان میں ہو جس سے ہمارا رابطہ بذریعہ حواس ہو. جس پر ہم عقل کے بعض خلقی (Innate) سانچوں کی مدد سے حکم لگا سکیں. خود عقل حواس ہی کے دائرے میں احسن طور پر عمل کرتی ہے. اور جب بھی عقل حواس اور زمان و مکان سے ماوراء جاتی ہے، الجھنوں اور مغالطوں میں مبتلا ہو جاتی ہے (جس کا اظہار مذاہب کی رنگا رنگ تعلیمات میں ہوتا ہے). حواس اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے. ایک دوسرے کے بغیر ایک پراگندہ اور دوسرا اندھا ہے. عقل اور حواس کی مفاہمت میں عالم فطری اور عالم مظاہر کی تشکیل ہوتی ہے. شے کی ماہیت (Thing –in – itself) یا عالم حقیقی کے بارے میں ہم بربنائے علم کوئی حکم نہیں لگا سکتے. عقل کا کام مجہول سے معروف کی طرف جاری رہتا ہے. مجہول جو ہماری معلومات میں نہیں ہوتا ہے، اس عمل سے گزرنے پر ہمارے علم میں شامل ہو کر معروف ہو جاتا ہے. یہ عملیت صرف چند تجربات تک محدود نہیں، بلکہ کسی کھیل کے سیکھنے سے لے کر اعلیٰ فنی مہارتیں حاصل کرنے میں بھی یہی عملیت کام کرتی ہے. ہمیں ابتداء میں ہاکی ٹھیک سے تھامنا بھی نہیں آتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس مرحلے سے گزر کر نہ صرف ہم ہاکی کھیلنا سیکھ گئے بلکہ ہاکی کے کھیلوں میں بھی حصہ لینے لگے. اگر اس عمل کا بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کے جاننے کا عمل سادہ نہیں بلکہ یہ تغیر پذیری کا عمل ہے. زندگی کے ہر شعبے میں اسی کی جھلک ملتی ہے. اور اس سے مراد نفسیاتی کیفیات کی تغیر پذیری یا طبعی حالات کی تبدیلی ہی نہیں، بلکہ ہمارا سماجی و ثقافتی ماحول بھی مائل بہ تغیر نظر آتا ہے. تہذیب و تمدن ان تبدیلیوں اور تغیرات سے دوچار رہتے ہیں، اس اعتبار سے دیکھیں تو یہی معلوم ہو گا کہ تغیر، حقیقت کی صفات و خصوصیات میں سے ہے. اور ظاہر ہے یہ تبدیلیاں ایک مستقل سیاق میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اب کوئی یہ سوال پوچھ سکتا ہے کے علم کیا ہے؟ علم کے معنی جاننا ہیں. لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مجھے فلاں بات کا علم ہے یا مجھے معلوم ہے کہ دو جمع چار ہوتے ہیں تو ایک شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات کیونکر آئی. اور جو بات آپ جان رہے ہیں وہ درست ہے یا نہیں؟ اب ظاہر ہے بغیر جانے ہوئے ہم کسی چیز کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے، جان کر کسی چیز کو ماننا یہ تو علم ہے. اور بے جانے ہوئے کسی شے کا اعتراف کر لینا، اسی کا نام وہم ہے. پس وحی اور عقائد سے حاصل ہونے والا علم اور عقائد وہم کے زمرے میں آتے ہیں. جن کی تجرباتی ومشاہداتی سطح پر کوئی توجیہ نہیں پیش کی جاسکتی. عقل کا کام ہمارے تصورات کی تحلیل وترتیب کرنا ہے اور یہی علم حاصل کرنا ہے. اور اسی طرح حاصل شدہ علم کائناتی وسعت کا حامل ہے. اخلاق کا مسئلہ ہو یا سیاسی اصول یا کسی بھی شے کے فیصلے ہوں، بذریعہ عقل ان تک پہنچا جا سکتا ہے. اور عقل اس بارے میں جو بھی حکم لگائے اسے قطعی اور آخری سمجھا جائے. عقلیین کے مطابق علم کی بہترین صورت ریاضیاتی ہے. جس طرح

استخراجات (Deduction) میں تیقن (Certainity) نظر آتا ہے. وہی قطعیت علم کی ہر شاخ میں ہونی چاہئے. یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ اس ریاضیاتی طریقہ کار کو کل علمی زندگی پر پھیلا دیا جائے. ریاضی کے طریقہ کار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں چند غیر تعریف شدہ تصوارت، جنہیں بدیہی تصورات (Primative Concepts) کہتے ہیں، کو قبول کر کے ان غیر تعریف شدہ تصورات سے تعریفات وضع کرنا ہے. چند اصول تسلیم کیے جاتے ہیں اور ان کی مدد سے مسائل کا ثبوت دیا جاتا ہے. یہ طریقہ ہمیں ہندسہ یا اقلیدس میں نظر آتا ہے. ہندسہ میں فاصلہ، لمبائی اور چوڑائی کے تصورات کو بغیر ان کی تعریف کیے مان لیتے ہیں. ان کی مدد سے نقطہ خط مستقیم اور زاویہ اور دائرہ کی تعریفیں دیتے ہیں. پھر بعض بدیہات تسلیم کرتے ہیں اور اس سادہ ڈھانچے سے رفتہ رفتہ جیومیٹری یا ہندسہ کا کل استخراجی نظام حاصل کرتے ہیں. جس میں ہر نتیجہ کی صحت تسلیم شدہ تصورات اور قضایا سے حاصل ہوتی ہے. یہاں یہ ممکن نہیں کہ بدیہیات کو قبول کریں اور نتائج کی صحت سے انکار کر دیں. ظاہر ہے اس قسم کے استخراجی نظام کے بنیادی تصورات اور بدیہات عقل کی پیداوار ہیں. یعنی حقائق میں سے جو چیز تجربہ میں نہ آسکے، موجودات میں سے جس چیز کو پرکھانہ جاسکے، وہ قابل تسلیم نہیں ہے. اس کائنات کو جاننے اور اس پر غور و فکر کرنے کیلئے کسی مابعد الطبیعی نظریہ یا کسی مافوق البشر ہستی کے وجود کی ضرورت نہیں. کائنات کی میکانکی توجیہ ہی مدلل اور علمی طریقہ ہے اور اس کے علاوہ ہر فکری سانچہ، ہر توجیہ، اور ہر قسم کا طرز استدلال غیر معقول اور غیر علمی ہے. جو شے عقل کی گرفت میں نہ آئے وہ بے حقیقت ہے. سچائی کو جاننے کیلئے اسے کسی خدا سے منسوب کرنے کی ضرورت اضافی ہے. اس ضمن میں تاریخ فلسفہ جدید کے مؤلف ڈاکٹر ہرلڈ ہوفڈ رنگ کہتے ہیں: "ہمارے علم کے نتائج صرف ریاضی کے ذریعہ سے پوری طرح یقینی ہوسکے ہیں، عقل تجربہ کا ماحصل ہے لہذا زمانہ کی پیداوار ہے. وہ تمام تخیلات قابل رد ہیں جن کی تائید تجربہ سے نہیں ہوتی کیونکہ تجربہ ہی تمام علوم کی ماں ہے."

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب میں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کا اصول کام کرتا ہے. مذہب عالم مظاہر کو ان ذرائع سے جاننے اور دریافت کرنے کا دعوی کرتا ہے. جو عقل و حواس کے دائرے سے باہر ہیں گویا اس عالم سے باہر ہیں. مذہب عالم فطری اور عالم مظاہر کی حقیقت پر بربنائے "وہم" حکم لگاتا ہے. جس وجہ سے ایسی ایسی خامہ فرسائیاں عقل و دانش کے نام پر دیکھنے سننے کو ملتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے. ظاہر ہے مذاہب کا وحی اور وجدان کے بل پر اس عالم کو جاننے کا دعویٰ کسی دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا. عقل و حواس کے دائرے سے نکل کر جن ذرائع سے مصدقہ علم تک رسائی کا دعوی کیا جاتا ہے اس "مصدقہ علم" کی بوالعجبیوں کی فہرست طویل تر ہے. لیکن اس مصدقہ ذرائع سے حاصل ہونے والے مصدقہ علم کی چند باتیں از خود لغو ثابت کرنے کیلیے کافی ہیں. یہ مصدقہ علم کبھی زمین کے چپٹا ہونے کا دعوی کرتا ہے تو کبھی زمین کو مچھلی کی پیٹھ پر کھڑا بتاتا ہے. یہ مصدقہ علم کہتا ہے کہ سورج گدلے پانیوں کی دلدل میں ڈوبتا ہے، عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا

ہوئے، موسیٰ کا عصا اژدھا بن جاتا تھا، چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، حیات مابعد الموت کا تصور جس میں خدا پر ایمان نہ رکھنے والوں کو لامتناہی عرصے تک جہنم کی آگ میں جلنا، اور خدا کو ماننے والوں کا کروڑوں برس تک حور نامی مخلوق کے ساتھ مباشرت میں مصروف رہنا، سیاروں اور ستاروں کا کام شیاطین و جنات کو مار بھگانا بتانا وغیرہ وغیرہ۔ انسان تصورات کی دنیا بسا کر اکثر انہی قسم کے اوہام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس "مصدقہ ذرائع سے حاصل ہونے والے مصدقہ علم" کو قطعی اور حرف آخر سمجھتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر وحی اور وجدان کو مصدقہ ذرائع علم تصور کر بھی لیا جائے، تب مذاہب عالم کی رنگا رنگ تعلیمات اور ان کے خدا اور ابتداءِ کائنات سے لے کر اختتامِ کائنات تک کے تصورات ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ اگر یہ ذرائعِ علم درست ہوتے تب مذاہب کے بیشتر مسائل ایک دوسرے سے مختلف اور جدا نہ ہوتے۔ خدا، ابتداء کائنات، اختتام کائنات، جزا و سزا وغیرہ سے متعلق ان کے تصورات ایک جیسے ہوتے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذاہب کے پاس مصدقہ علمی ذرائع ہوتے ہوئے بھی ان کے نظریات و تصورات میں قطعی اتفاق مفقود ہے جو کہ ہونا چاہئے تھا۔ ان مصدقہ ذرائع علمی سے ہٹ کر جو انسان عقل سے کام لیتے ہوئے پوری کائنات کو جاننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس لگاتار کوشش کے نتیجے میں انسان نے سائنسی ایجادات کیں اور وہ خلاؤں میں سفر کرنے لگا۔ بپھرے ہوئے سیلاب پر قابو پا گیا۔ جنگلوں اور بیابانوں کو جنت بنایا۔ روئے زمین کو عظیم الشان عمارات و محلات سے مزین کیا۔ انسان کی آسائش کیلئے ہر قسم کی مشینیں ایجاد کی گئیں تاکہ انسانی عقل کو تعمیری کاموں کی طرف راغب کر کے دنیا کو "جنت الفردوس" بنا سکے۔ دنیا بھر کے مروجہ علوم اور سائنس نے انہی حواس خمسہ کے ذریعے عالم کو دریافت کیا اور اس سے تعلق پیدا کیا، اس نے طبعی قوانین اور ظواہر معلوم کیے، ہمارے پاس مناظر و مرئیات، مسموعات اور محسوسات کا خزانہ ہے۔ جن کے ذریعے روز بروز اس عالم کے اسرار و رموز کو جان کر ان سے پردہ ہٹایا جارہا ہے اور جھوٹے بے بنیاد دعوؤں کی قلعی کھولی جاری ہے۔ عقل کے مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں جو ان کا تحلیل و تجزیہ کرتی ہے۔ حقائق کی نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے بڑے بڑے سمندروں کو عبور کرنے میں عقل کا ہی ہاتھ ہے۔ جس کی اساس حواس خمسہ ہیں۔

شر اور آزاد ارادہ

خدا کے معیاری وصف کے مطابق جن جدلیات سے خدا کی نفی ہوتی ہے ان میں سے ایک مندرجہ ذیل ہے:

1- اگر خدا موجود ہے تو وہ سب کچھ جانتا (علیم) ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور مجسم اچھائی ہے۔

2- شر، درد اور تکالیف کی موجودگی ایک ایسے خدا سے راست تناسب نہیں رکھتیں جو مجسم اچھائی ہو کیونکہ یہ برائیاں موجود

ہیں۔

3-لہذا خدا وجود نہیں رکھتا کیونکہ برائی کے وجود سے اس کے مجسم اچھائی کی صفت کی نفی ہو جاتی ہے۔

مؤمنین کی طرف سے اس کا دفاع آزاد ارادے کی موجودگی سے کیا جاتا ہے، آزاد ارادے کے اصول کے تحت یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اوپر کا مفروضہ نمبر 2 غلط ہے کیونکہ شر انسان کا پیدا کردہ ہے اور خدا نے انسان کو خیر و شر میں انتخاب کی صلاحیت یعنی آزاد ارادہ دیا ہے لہٰذا شر کی موجودگی کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا کہ خدا نہیں ہے۔

جب شر کی موجودگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو مؤمن کو خدا کی موجودگی کو جواز دینے کے لیے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد ارادے سمیت تخلیق کیا ہے، اس ضمن میں سب سے طاقتور بیان رچرڈ سوینبرن (Richard Swinburne) کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ شر کا پیشگی علم رکھتے ہوئے بھی خدا نے دنیا تخلیق کی، اس خدا نے شر کے خاتمے کے لیے مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ انسانی فیصلوں کی خود مختاری ضروری ہے، خدا سمجھتا ہے کہ اگرچہ یہ خود مختاری شر کی طرف بھی لے جائے گی تاہم اس خود مختاری کی مطلق قیمت مطلق اچھائی سے زیادہ ہے۔
یہ نکتہ کافی اہم اور قابلِ غور ہے، لہٰذا ہم یہ فرض کرتے ہوئے کہ توراتی مسالک درست ہیں اس پر تھوڑی سی بحث کرتے ہیں:

ہم کہیں گے کہ خدا ازل سے موجود ہے، وہ نہ صرف ہر چیز پر قادر اور عالم ہے بلکہ وہ مجسم اچھائی بھی ہے، اس خدا نے کسی خاص لحہ (مثلاً-1) میں کائنات تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا، اس نے آدم اور حوا کو بھی تخلیق کیا اور انہیں جنت میں بھیج دیا تاکہ وہ وہاں خوش و خرم زندگی گزار سکیں اس لحہ تک جب ابلیس انہیں اپنے خالق کے خلاف بغاوت پر اکساتا ہے، اب چونکہ ان کے پاس آزاد ارادہ تھا لہٰذا انہوں نے خدا کی نافرمانی کرنے کا انتخاب کیا، اس حماقت کا تمام انسانوں پر ایک لامتناہی اثر ہوا، انسان سے معصومیت اور لافانیت چھین لی گئی اور شر اس کی نیچر کا ایک حصہ بن گیا، اب یہ ممکن نہیں رہا کہ انسان غلطی نہ کرے، یقیناً توراتی مسالک میں گناہِ اصل کے حوالے سے کافی اختلافات ہیں جو کہ ہمیشہ ہر مذہب کا خاصہ ہوتے ہیں، بعض کے نزدیک گناہِ اصل کا ازالہ ممکن نہیں جبکہ بعض دیگر کا خیال ہے کہ حضرت یسوع کے مصلوب ہوتے ہی یہ زائل ہو گیا تھا وغیرہ، اور جس طرح توراتی مسالک میں اس قصہ کو لے کر اختلافات ہیں اسی طرح اسلامی کہانی بھی اس حوالے سے کافی مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی گناہِ اصل کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔۔ بہر حال ہم آزاد ارادے کے مسئلے کے ارتقاء کا تعاقب طے شدہ لحہ سے کرتے ہیں جب آدم اور حوا نے خدا کی نافرمانی کرنے کا فیصلہ کیا جو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ غلطی کریں گے مگر اس نے یہ خیال کیا کہ آزاد ارادے کی حفاظت از بس ضروری ہے چاہے انسان شر کے ارتکاب کا فیصلہ ہی کیوں نہ کر لے، لہٰذا خدا پر شر کی موجودگی کا الزام نہیں دھرا جاسکتا۔

یوں لگتا ہے کہ آزاد ارادے پر مشتمل یہ دفاع خدا کا انکار کرنے والوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی ہے، ذیل میں ہم اس منطق کے جھول کو بیان کریں گے:

طبعی شر:

آزاد ارادے کی یہ حجت خدا کے کندھوں پر سے برائی کی تمام تر ذمہ داری رفع کرنے میں ناکام رہتی ہے کیونکہ درد و تکالیف اپنی طبعی شکل میں موجود ہیں اور اس طرح کا شر انسان کے کردار کے نتیجہ میں واقع نہیں ہوتا، مثلاً بارشوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی، زلزلے، وبائیں اور بیماریاں، انفرادی انسانی سطح کی اگر بات کی جائے تو خواتین کے ہاں عملِ تولید اور حیض کی تکالیف، ناقص ساخت و بدہیئت بچوں کی پیدائش اور وراثتی بیماریاں جن کے ہونے میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے، اس طرح کے آلام و تکالیف سے صرف دو ہی نتیجے برآمد ہوتے ہیں:

1- یا تو خدا اس طبعی شر کا ذمہ دار ہے جس سے اس کے مطلق اچھائی کی صفت ساقط ہو جائے گی۔
2- یا خدا کو اس طرح کے شر پر کوئی اختیار نہیں ہے جس سے اس کے قادرِ مطلق کی صفت ساقط ہو جائے گی۔

انسان کا پیدا کردہ شر:

آزاد ارادے کی منطق کا دوسرا مسئلہ یہ کہنا ہے کہ خدا نے آدم اور حوا کو معتدل طبیعت میں تخلیق کیا ہے، یعنی نا تو وہ اچھائی کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں اور نا ہی برائی کی طرف تاکہ انسان آزادی سے خیر و شر کے انتخاب کا فیصلہ کر سکے، لیکن چونکہ یہ فطرت بنی نوعِ انسان میں وراثتی ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ چونکہ یہ بے چین فطرت خدا نے ہی انسان میں ودیعت کی ہے لہذا خدا ہی انسانوں کے اس رجحان کا ذمہ دار ہے کیونکہ انسان اور اس کی فطرتوں اور رجحانات کا اول و آخر خالق خدا ہی ہے، یوں جو خدا برائی کے امکانات تخلیق کرتا ہے وہ مجسم اچھائی نہیں ہو سکتا، مزید برآں یہاں کسی آزاد ارادے کی بھی نفی ہوتی ہے کیونکہ انسان کی ایسی فطرت اسے عقلی، جسمانی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار بنا دے گی اور ایسے کسی مسلط دباؤ کے تحت وہ جو کچھ بھی کرے گا وہ اس کا پوری طرح ذمہ دار نہیں ہو گا اور اس کا ارادہ پوری طرح آزاد قرار نہیں پائے گا۔

اصولِ سببیت اور شر:

اصولِ سببیت یا ہر چیز کا ایک خالق اور مسبب ہے آزاد ارادے سے متصادم ہے، اگر ہر چیز کا کوئی سبب اور مُسبب ہے اور یہ مُسبباتی سلسلہ سببِ اول کی طرف جاتا ہے جو کہ خدا ہے تو ایسے میں میرے تمام افعال کا سبب مرے ارد گرد موجود چیزوں، مکانی و زمانی حالات اور میری وہ محدود صلاحیتیں ہیں جو میں نے اپنے اجداد سے ورثہ میں پائی ہیں، نتیجتاً میرے افعال اور فیصلے

اگرچہ بادی النظر میں آزاد ارادے وانتخاب کا نتیجہ لگتے ہیں لیکن وہ در حقیقت خدا سے مسبُوب ہیں جو مُسببات کے تکون کے سب سے اوپر کھڑا ہے کیونکہ وہ مُسببِ اول ہے لہذا میں اپنے فیصلوں میں جبریت کا شکار ہوں آزاد قطعی نہیں ہوں۔

اور اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ انسان آزادانہ طور پر اپنے افعال کا خالق اور مُسبب ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز کا خالق اور مُسبب خدا نہیں ہے اور میرا انتخاب یا فیصلہ بغیر کسی سبب اور مُسبب کے تھا یعنی جو فعل میں نے انجام دیا ہے اسے خدا نے تخلیق نہیں کیا یوں ہمیں لا محالہ خدا پر سے قادرِ مطلق کی صفت کو ساقط کرنا پڑ جائے گا اور وہ قطعاً عبادت کے قابل نہیں رہے گا، دوسری طرف اگر خدا ہر چیز کا علم رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ جانتا ہے کہ میں ایک لمحہ بعد کیا کروں گا، اگر وہ جانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں یہ کام لا محالہ انجام دوں گا جو آزاد ارادے کے اصول کے منافی ہے کیونکہ میں کوئی مخصوص کام یا فعل کرنے کا لازماً پابند ہوں کیونکہ خدا یہ سب پہلے سے جانتا ہے، اور اگر خدا نہیں جانتا کہ میں اگلے لمحہ کیا کرنے والا ہوں کیونکہ میرے پاس آزاد ارادہ ہے اور میں اپنے انتخاب میں آزاد ہوں تو یہ امر خدا پر سے علیم کی صفت ساقط کر دے گا۔

خدا کی محدود فطرت اور شر:

بعض لوگ خدا کا یہ کہہ کر دفاع کرتے ہیں کہ خدا برائی کرنے پر قادر ہے مگر وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ خدا کی فطرت میں صرف اچھائی کرنا ہے۔۔ مگر "خدا کی فطرت" سے ان لوگوں کا کیا مطلب ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ کسی فطرت یا نیچر کے ہونے کا مطلب محدودیت کی موجودگی ہے، انسانی فطرت جینوں اور موروثاتی صفات کا مجموعہ ہے جن میں جسمانی حدیں بھی شامل ہیں، مثلاً اگر ہم چاہیں بھی تو ہوا میں نہیں اُڑ سکتے کیونکہ ہماری فطرت ہمارے سلوک پر کچھ حدود لاگو کرتی ہے، اب یہ کہنا کہ انسان اگر چاہے تو ہوا میں اُڑ سکتا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ اس کی فطرت میں اڑنا نہیں ہے بالکل بکواس بات ہے، فطرت ہی حدیں لاگو کرتی ہے جس کے خلاف جانا نا ممکن ہے، ایسے میں یہ ایک بے تکی بات ہے کہ خدا جس کی طاقتیں لا محدود ہیں اس میں اچھائی کرنے کی پیشگی فطرت موجود ہے؟

آزاد ارادے کے لیے لازم ہے کہ:

1-مساوی قدر کے متعدد اختیارات ہوں۔

2-نفسیاتی اور جسمانی رکاوٹیں نہ ہوں۔

3-ہدف کے حصول کی قدرت ہو یعنی طاقت اور وسائل۔

ثلاًہم ایک سیکنڈ میں سو کلومیٹر کی رفتار سے دوڑنے کی کوشش کر سکتے ہیں مگر ہم یقیناًناکام ہو جائیں گے، ایسے عوامل ہماری انسانی فطرت کا تعین کرتے ہیں، اگر ہم فرض کر لیں کہ خدا کی بھی کوئی فطرت ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اسے کچھ مخصوص حدود کے اندر رہ کر کام کرنا ہو گا اس طرح وہ قادرِ مطلق اور اپنے فیصلوں میں آزاد نہیں ہو گا۔

شر بطور ایک ضرورت:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شر اور تکالیف کی موجودگی آزاد ارادے کے لیے ضروری ہے کہ بغیر شر یا برائی کے آزاد ارادہ نہیں ہو گا۔۔اس منطق میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ تکلیف شکار کو ہوتی ہے شکاری کو نہیں، شکار نے برائی کرنے کا انتخاب نہیں کیا بلکہ وہ نا چاہتے ہوئے بھی برائی کا شکار ہوا ہے، شکار کسی دوسرے شخص کے برے انتخاب کی قیمت کیوں ادا کرے؟ معیاری صفات کے مطابق اگر خدا منصف وعادل ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شکار پر واقع ہونے والے کسی بھی طرح کے برے اثرات کو زائل کرے۔۔اگر آزاد ارادے کی تکمیل کے لیے شر کا وجود ضروری ہے تو پھر تو جنت میں بھی شر موجود ہو گا؟!!۔۔ابراہیمی مذاہب کے مطابق ساکنانِ جنت آزاد ارادے کے مالک ہوں گے تاہم ان پر برائی کے ارتکاب کو ختم کر دیا جائے گا۔۔سوال یہ ہے کہ اس علیم و قدیر نے یہ زمین پر کیوں نہیں کیا؟

شر گناہوں کا کفارہ ہے:

بعض مؤمنین شر اور تکالیف کی موجودگی کو یہ کہہ کر جسٹی فائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زمین پر انسان جو تکالیف جھیلے گا وہ آخرت میں اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گا لہٰذا مصائب وآلام آخری حساب کتاب کے لیے ایک اچھی چیز ہیں، اور جیسا کہ برٹرینڈ رسل کہتے ہیں کہ یہ <u>سادیت</u> کو عقلیانے کی ایک بھونڈی کوشش کے سوا کچھ نہیں، وہ کہتے ہیں:

"ایسی منطق پیش کرنے والوں کو میں دعوت دوں گا کہ وہ میرے ساتھ خطرناک امراض میں مبتلا بچوں کے وارڈ کی زیارت کریں اور اپنی آنکھوں سے ان تکالیف کو دیکھیں جنہیں یہ بچے جھیل رہے ہیں، کیا مؤمن مجھے یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ بچے جنہوں نے اپنی زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا انہیں تکلیف دینا اخلاقی ہے تاکہ آخرت میں ان کی خلاصی ہو سکے؟ جو اپنے آپ کو اس درد و تکلیف کی اخلاقیت کا قائل کر لیتا ہے وہ ایک ایسے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنے تمام تر انسانی احساسات کو تباہ کر کے اپنے خدا کی طرح ایک بے درد سنگ دل شخصیت میں بدل جاتا ہے"۔

عقل مندوں کو سلام!

اِس لیے خدا پہلی علت نہیں ہے۔

اول: علت کی معلول سے علیحدگی۔

سارے مؤمنین علت کے قانون پر یقین رکھتے ہیں، ان کی نظر میں ہم ملحدین علت اور پہلی علت کے سب سے بڑے منکر ہیں گویا کہ پہلی علت کا اثبات خدا کے اثبات کے مساوی ہے!! بھئی ہو سکتا ہے کہ پہلی علت ہو اور وہ خدا نہ ہو؟!

بہر حال مؤمنین کی نظر میں خدا ہی پہلی علت ہے اور وہ "علتِ کاملہ" ہے کیونکہ خدا کا "علتِ ناقصہ" ہونا نہ صرف ہمارے لیے بلکہ مؤمنین کے لیے بھی نامعقول بات ہوگی، ہے نا!!

علت دو طرح کی ہوتی ہے، علتِ کاملہ جس کی موجودگی کی صورت میں معلول کی موجودگی لازمی ہو جاتی ہے، اور ایک علتِ ناقصہ ہوتی ہے جس کی موجودگی سے معلول کی موجودگی لازمی نہیں ہوتی کیونکہ شرطوں، ضروریات (Requisites) اور زوالِ ممانعت (رکاوٹوں کا ختم ہونا) پوری نہیں ہوئی ہوتیں جیسے لکھاری لکھنے کی ناقص علت ہے کیونکہ لکھائی کے لیے کچھ شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے جیسے کاغذ، قلم اور سیاہی کی دستیابی وغیرہ، تاہم علتِ کاملہ اور علتِ ناقصہ میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں کی عدم موجودگی کا مطلب معلول کی عدم موجودگی ہوگا۔

مگر خدا یقیناً علتِ کاملہ ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اس کا ارادہ کسی شرط، ضرورت یا زوالِ ممانعت (کسی رکاوٹ کے خاتمے) کا محتاج و منتظر ہو ورنہ وہ عاجز کہلائے گا، مؤمن کہتے ہیں کہ "خدا کائنات کی علت ہے اور کائنات خدا کی معلول ہے" اب منطقی قاعدہ یہ ہے کہ جب معلول یعنی کائنات موجود نہیں تھی تو یہ ممکن نہیں کہ اس کی علت بھی موجود ہو کیونکہ علتِ کاملہ کی موجودگی اس کے معلول کی موجودگی لازمی بنا دیتی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ علت موجود ہو اور معلول موجود نہ ہو ورنہ علتِ کاملہ اپنے معلول سے الگ ہو جائے گی جو ممکن نہیں! اس طرح علت کے نہ ہونے کے سبب معلول کی عدمیت (غیر موجودگی) بغیر علت کے لازم ہو جائے گی!!

یہ لزومیت برہانِ خلف (Proof by Contradiction) پر مبنی ہے یعنی اگر علتِ کاملہ موجود ہو تو یا تو اس کی موجودگی سے معلول کا موجود ہونا لازم ہوگا یا لازم نہیں ہوگا، پہلی صورت میں مطلوب (معلول) ثابت ہوتا ہے (یعنی وجود میں آجاتا ہے) جبکہ دوسری صورت میں اگر علتِ کاملہ موجود ہو یہ فرض کرتے ہوئے کہ معلول نہیں ہے جبکہ ہم جان چکے ہیں معلول کی

عدمیت (غیر موجودگی) علت کی عدمیت سے معلول ہے (یعنی علت کی غیر موجودگی معلول کی غیر موجودگی کی علت ہے) تو اس طرح یہ لازم ہو جائے گا کہ نقیضین جمع ہو جائیں (یعنی دو متضاد چیزیں آپس میں مل جائیں) جو نا ممکن ہے کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ علت بیک وقت موجود بھی ہوگی اور نہیں بھی۔

یہ "علتی جبر" کا قانون ہے جو علتِ کاملہ کی موجودگی کی صورت میں معلول کی موجودگی واجب قرار دیتا ہے، لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا کائنات کی پہلی علت ہے اور یہ کہ علت موجود تھی اور معلول موجود نہیں تھا پھر خدا (علتِ کاملہ) نے اچانک کائنات تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ تخلیق کا مطلب کسی شئے کی موجودگی کا سبب بننا ہے یعنی تخلیق علیت ہے لہٰذا اس بات کا کوئی مطلب نہیں کہ علت موجود تھی اور کائنات موجود نہیں تھی۔

اسی مسئلہ کی وجہ سے متکلمین نے علتی جبر کے قانون کا انکار کیا ہے کیونکہ ان پر یہ واضح ہو گیا کہ اس طرح خدا کائنات تخلیق کرنے پر مجبور ہو جائے گا کیونکہ علت – جو کہ ان کی نظر میں خدا ہے – سے معلول کا جبراً صادر ہونا لازمی ہے، تاہم اس انکار پر انہیں یہ جواب دیا گیا کہ ارادہ علتِ کاملہ کی بنیادی شرط ہے، یعنی خدا کو علتِ کاملہ ہونے کے لیے لازماً مُرید ہونا (چاہنا) ہوگا تا کہ وہ علتِ کاملہ بن سکے اور اس کا معلول حاصل ہو سکے، اس سلسلہ میں ویسٹرن مشیگن یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے فلسفہ کے پروفیسر <u>کوینٹن سمتھ</u> کا مقالہ <u>CAUSATION AND THE LOGICAL IMPOSSIBILITY OF A DIVINE CAUSE</u> کافی مفید ہے۔

اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہمارے پاس علت ہے اور علت کی شرط ہے، کسی جسم کا حرکت میں ہونا خلاء میں اس کے جگہ گھیرنے کے لیے کافی شرط ہے مگر اس کا متحرک ہونا جگہ گھیرنے کی علت نہیں ہے، ہوا انسان کی موجودگی کی کافی شرط ہے مگر ہوا انسان کی موجودگی کی علت نہیں ہے۔

مذکورہ ہر قضیہ میں ہمارے پاس کوئی واقعہ یا حالت ہوگی جیسے "س" کسی دوسرے واقعے یا حالت کی کافی شرط ہوگی جیسے "ص" کی، مگر "س" ہمیشہ "ص" کی علت نہیں ہوگی کیونکہ جو چیز کسی دوسری چیز کی علت ہوتی ہے وہ اس کے لیے کافی شرط نہیں ہوتی، نتیجہ یہ ہوگا کہ:

اگر "س" "ص" کی کافی شرط ہے تو "س" "ص" کی علت نہیں ہوگی، اسی طرح کائنات کی تخلیق کا خدا کا ارادہ بگ بینگ کے ہونے کی کافی شرط ہے کیونکہ خدا کے مفروضے کو درست فرض کرنے کی صورت میں یہ بات غیر منطقی ہوگی کہ خدا نے کائنات تخلیق کرنا چاہی یا بگ بینگ کو رونما کرنا چاہا مگر وہ رونما نہیں ہوا!

لہذا خدا کا ارادہ کائنات کے وجود یا بگ بینگ کے ہونے کی علت نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی شئے بیک وقت علت اور شرطِ علت نہیں ہوسکتی، اگر یہ کہا جائے کہ خدا کا کائنات کے وجود کی علت ہے تو اس کا ارادہ کائنات کے وجود کے لیے کافی شرط نہیں ہوگا جو کہ تضاد ہے کیونکہ خدا کا ارادہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے۔

دوم: وجوبِ خواص

بیشتر عرب فلاسفہ کے نزدیک علت اور معلول کے درمیان خاصیت کا تعلق ضروری ہے، علت میں لازماً ایسی کوئی خاص خاصیت ہونی چاہیے جو دوسرے معلولوں سے ہٹ کر خصوصی طور پر اس کے اپنے معلول کے وجود کا منشا ہو، آگ کی خاصیت حرارت کا منشا یا مصدر ہے ٹھنڈک کی نہیں، اگر یہ شرط نہ ہو تو ہر چیز ہر چیز سے صادر ہونا شروع ہو جائے گی یعنی آگ سے ٹھنڈک اور برف سے گرمی حاصل کی جاسکے گی اور ہر چیز ہر چیز کی علت بن جائے گی جو بداہت اور منطق کے خلاف ہے، اسی طرح یہ علت اور معلول کے درمیان تلازم کے بھی خلاف ہے کیونکہ علت اور معلول کے درمیان تلازم کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصہ ءکلام یہ ہے کہ علت میں لازماً کوئی مخصوص خاصیت ہونی چاہیے جو اس کے معلول کے وجود کا مصدر ہو اور معلول میں ظاہر ہو، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات متعدد الخواص ہے، یہ اتنی بدیہی بات ہے کہ اسے کسی اثبات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، اب چونکہ اپنے خواص میں مختلف موجودات خدا سے معلول ہیں لہذا یہ لازم ہے کہ خدا جو ساری مختلف الخواص چیزوں کی علت ہے وہ متعدد الخواص ہو اور یہ خاصیتیں معلولات کی مقدار کے برابر ہونی چاہئیں یعنی جتنے مختلف الخواص معلولات ہوں گے خدا میں بھی اتنی ہی خاصیتیں ہونی چاہئیں، اس کے لیے لازم ہے کہ اس کی ذات مختلف حصوں میں منقسم ہو جو ممکن نہیں، اب اگر وہ منقسم نہیں تو اسے مرکب ہونا چاہیے اور مرکب محتاج ہوتا ہے اور محتاج عاجز۔۔ لہذا خدا کو ہر طرح سے سادہ ہونا چاہیے مرکب نہیں کیونکہ ہر مرکب حادث ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ واجب الوجود میں کوئی حدوث ہو، مزید برآں واحد سے صرف واحد ہی صادر ہوگا یعنی اگر خدا کی صرف ایک ہی خاصیت ہے تو اس سے صادر ہونے والے معلول میں بھی صرف وہی ایک ہی خاصیت ہوگی متعدد نہیں مگر موجودات کو دیکھ کر ایسا نظر نہیں آتا، بیشتر فلاسفہ کی بھی یہی رائے ہے کہ واحد سے صرف واحد ہی برآمد ہوگا اس طرح انہوں نے اشعریوں کی اس رائے کی مخالفت کی جس کے مطابق خدا دنیا کے واقعات میں براہ راست مداخلت کرتا ہے اور متکلمین کی بھی مخالفت کی جو کہتے تھے کہ واحد سے کثیر صادر ہو سکتا ہے۔

عقل مندوں کو سلام!

کائناتی استدلال

خدا کے وجود کے اثبات میں "کائناتی استدلال" ارسطو کے زمانے سے چلا آرہا ہے، اس استدلال میں "پہلی علت" یا "بے علت علت" ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عام طور پر اس استدلال کو یوں پیش کیا جاتا ہے:

1-ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔

2-کائنات کی لازماً کوئی علت ہونی چاہیے۔

3-یہ علت "خدا" ہے۔

یا پھر "ذہین ڈیزائن" کی شکل میں۔

1-کائنات میں ایک مخصوص ڈیزائن موجود ہے۔

2-ہر ڈیزائن کا لازماً کوئی ڈیزائنر ہونا چاہیے۔

3-یہ ڈیزائنر "خدا" ہے۔

یوں تو اس حجت پر اعتراضات کی ایک طویل فہرست ہے لیکن بغرضِ اختصار ہم صرف چند اہم اعتراضات پر ہی بحث کریں گے۔

1-حجت "مطالعاتی تشریح" (Interpretive Reading) کا استعمال کرتی ہے، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ مادہ کوئی مخصوص طرح کا سلوک کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ (سلوک) اس کا نظام ہے، اگر مادہ کسی اور طرح کا سلوک کرتا تو بھی ہم اسے اس کا نظام ہی کہتے، الغرض کہ نظام چاہے جیسا بھی ہو ہم اس کی "انسانی تشخیصی" تشریح ہی کریں گے کیونکہ بندر اپنی ماں کی نظر میں ہرن ہوتا ہے۔۔ آیئے ایک سادہ سی مثال سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں: فرض کرتے ہیں کہ ہم نے دو پانسے پھینکے اور 4 اور 7 کے دو عدد حاصل کیے تو کیا ان دو اعداد کا کوئی مطلب ہے؟ یقیناً نہیں، یہ دو اعداد محض اتفاق سے حاصل ہوگئے اور بس، لیکن اب فرض کرتے ہیں کہ کسی نے ہم سے کہا کہ: "یہ دونوں پانسے پھینکیے اور اگر آپ نے عدد 4 اور 7 حاصل کر لیے تو میں آپ کو سو روپے دوں گا" اور ہم نے پانسے پھینکے اور اتفاق سے عدد 4 اور 7 حاصل کر لیے تو اس صورت میں انہی دو اتفاقی (Random) اعداد کا ایک مخصوص مطلب بن جائے گا! کائنات کے معاملہ میں مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے مقصد کو حادثہ کے وقوع کے بعد متعین کیا ہے یعنی با مقصد اعداد کا تعین پانسے پھینکنے کے بعد کیا، اگر کائنات کی شکل کچھ اور ہوتی تو ہم اس کی طرف

دیکھ کر کہتے کہ: "یہ مخصوص نظام بغیر کسی خدا کے وجود میں نہیں آسکتا"، اب کائنات کی شکل چاہے کچھ بھی ہو ہم ہمیشہ یہی کہیں گے۔

2-اس حجت میں دوسرا مسئلہ زاویہ نظر (Perspective) کا ہے، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اعداد کو غور سے دیکھیے:

17839748591233784324938746574605

جیسا کہ واضح ہے مندرجہ بالا اعداد کا سیٹ قطعی اتفاقی (Random) ہے اور اس میں کوئی ڈیزائن (یا ترتیب) نہیں ہے، آیئے اب اتفاقی اعداد کے اسی سیٹ کو اس کے ایک مخصوص حصے پر غور کرتے ہوئے دوبارہ دیکھتے ہیں:

1783974859<u>123</u>3784324938746574605

اب ہمیں اس اتفاقی اعداد کے سیٹ میں ایک ایسا جزوی سیٹ نظر آرہا ہے جو منطقی معلوم ہوتا ہے، اسے کہتے ہیں ڈیزائن شُدہ ذیلی مجموعہ (The Designed Subset) یعنی ایک قطعی اتفاقی سیٹ کے اندر ایک ایسے ذیلی سیٹ کی موجودگی جس میں بظاہر کوئی نظام نظر آتا ہے، اگر ہم اپنی نظریں اس ذیلی سیٹ پر ہی مرکوز رکھیں گے تو ہمیں لگے گا کہ یہاں واقعی کوئی مخصوص نظام یا ڈیزائن موجود ہے، لیکن اگر ہماری نظر وسیع ہوتی تو ہمیں کبھی ایسا نہ لگتا، مثال کے طور پر فلکیاتی سائنس میں متعدد کائناتوں (<u>Multiverse</u>) کا ایک نظریہ موجود ہے جو کہتا ہے کہ ہم جس کائنات میں رہتے ہیں وہ محض ایک اتفاقی سیٹ کا ایک ذیلی سیٹ (Subset) ہے اور جو ڈیزائن ہمیں اس میں نظر آتا ہے وہ محض ایک انتخابی زاویہ نظر (Selective Perspective) ہے جس کی وجہ ہمارا اس حصے کے اندر موجود ہونا ہے اور چونکہ ہم بطور کسی منظم حصے کے کسی دوسری کائنات میں موجود نہیں رہ سکتے اس لیے ہمیں صرف وہی نظر آتا ہے جو ہماری ناک کے سامنے ہے۔
ذیلی حصے کا یہ مسئلہ زمین پر بھی لاگو ہوتا ہے، ہم زمین پر موجود زندگی اور دیگر باترتیب نظاموں سے "پھولے نہیں سماتے" مگر زمین کے باہر موجود بد نظمی ہمیں نظر نہیں آتی جہاں کھربوں کھربوں سیاروں اور ستاروں کے وجود کی نا تو کوئی وجہ ہے اور نا ہی کوئی مقصد، یہ محض اتفاقی عمل کے ذریعے پیدا ہوتے اور پھٹتے رہتے ہیں اور زیادہ تر زندگی کے قابل بھی نہیں ہیں، زندگی کے قابل کسی ایک سیارے یا چند سیاروں کا وجود محض ایک شماریاتی ریاضیاتی ناگزیریت ہے جو اتفاقی سیٹس کے اندر ایسے ذیلی سیٹ بناتی ہے جن میں نظام یا ڈیزائن نظر آتا ہے۔

3-اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کائنات کے ڈیزائن کو کسی ڈیزائنر کی ضرورت ہے؟ کیا ہم نے دوسری کائناتیں دیکھی اور ان کے ڈیزائنروں کو پہچانا ہے تاکہ ہم یہ فرض کر سکیں کہ اس کائنات کا بھی دیگر کی طرح ایک ڈیزائنر ہوگا؟

عام طور پر لوگ انسان کے بنائے ہوئے ڈیزائن استدلال کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کوئی جہاز اڑتا ہوا نظر آئے تو ہم یقیناً یہ جان جائیں گے کہ اسے کسی سوچنے والے عقل مند انسان نے ہی بنایا ہوگا، اس دلیل میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ انتخابی یعنی Selective ہے اور نتیجے کو مفروضے میں ٹھونس دیتی ہے (sticking the conclusion in the premises) اور اس کی وجہ بڑی سادہ ہے، فرض کرتے ہیں کہ کائناتی استدلال کی یہ حجت غلط ہے (یعنی کوئی ڈیزائنر نہیں ہے) تو ایسی صورت میں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ کائنات میں موجود بیشتر ڈیزائن (جیسے برف، درخت، جانور) کسی ڈیزائنر کے بنائے ہوئے نہیں ہیں، اس سے یہ پتہ چلے گا کہ انسان کے بنائے ہوئے ڈیزائن "استثناء" ہیں "قاعدہ" نہیں، لہذا یہ معلوم ہوا کہ کائناتی استدلال کا دوسرا مفروضہ (ہر ڈیزائن کا لازماً کوئی ڈیزائنر ہونا چاہیے) مفروضے کو ثابت کرنے سے پہلے ہی اسے درست فرض کر لیتا ہے، یعنی نتیجہ کو اسی مفروضے میں ٹھونس دیتا ہے، یہ ایک ایسا منطقی خلل ہے جو ساری حجت کو ڈھیر کر دیتا ہے، یہ ضروری ہے کہ کسی حجت کو درست فرض کرنے سے پہلے اس کے تمام حصوں کو ثابت کیا جائے، افسوس کی بات یہ ہے کہ جدید سائنس کسی "ڈیزائنر" کو نہیں مانتی، وہ تو بس طبعی قوتوں کو مانتی ہے اور اسے اس میں کسی ڈیزائنر کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔

4-آخری اور اہم اعتراض لامتناہی تسلسل اور انتخابی قیاس کا ہے، حجت کہتی ہے کہ کائنات میں موجود ڈیزائن کسی ڈیزائنر کی موجودگی کی دلیل ہے، چلیں مان لیا کہ یہ ڈیزائنر موجود ہے، کیا اس میں بھی ڈیزائن نہیں ہے؟ کیا وہ بھی پیچیدہ تر نہیں ہے؟ اس کا ڈیزائنر کہاں ہے؟ کائناتی استدلال پیش کرنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حجت مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے اسے مزید پیچیدہ کر دیتی ہے، یہ ایک نسبتاً سادہ ڈیزائن (کائنات) سے شروع ہوتی ہے اور ایک پیچیدہ تر ڈیزائن (خدا) پر جا ختم ہوتی ہے جو ایک ننگی منطقی غلطی ہے، بہتر یہی ہے کہ ہم اسی پر ہی رہیں جس کا ہمیں علم ہے (کائنات) اور کوئی حقیقی حل تلاش کرنے کی کوشش کریں بجائے ایسی تصوراتی چیزیں ٹھونسنے کے جن کے بارے میں ہمیں نا تو کوئی علم ہے اور نا ہی وہ مسئلہ کے حل میں کوئی کردار ادا کر سکتی ہیں (خدا) سوائے اسے مزید پیچیدہ کرنے کے۔

اس حجت کا آخری دفاع یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ: "خدا کو فلاں فلاں وجوہات کے سبب کسی ڈیزائنر کی ضرورت نہیں ہے" اور اس طرح وہ ڈیزائنر کے وجود کے مسئلہ سے جمپ کھا کر ڈیزائنر کی صفات کے مسئلہ پر پہنچ جاتے ہیں جو ایک اور مخصوص نتیجے (ڈیزائنر کی صفات) کو مفروضے میں ٹھونسنے کا عمل ہے جبکہ مفروضہ اصل میں ڈیزائنر کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس کی صفات کو نہیں جو کہ ایک اور منطقی خلل ہے جو جائز نہیں۔

عقل مندوں کو سلام!

روح کیا ہے؟

تضادات میں پڑے بغیر روح کی کوئی مخصوص تعریف وضع کرنا از حد مشکل ہے، یہ تصور انسانی تاریخ کے عجیب وغریب تصورات میں سے ایک ہے، اس کی شدید پُر اسراریت اس کی تعریف اور بھی مشکل بنا دیتی ہے، تمام مذہبی ہستیوں (خدا، فرشتے، شیاطین، جن وغیرہ) کی طرح میٹافیزیکل خصوصیات کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مادی خصوصیات کی بھی حامل ہے!! ایک طرف تو یہ "جسم" میں موجود ہے یا کسی نہ کسی طرح اس سے "متحد" ہے چاہے یہ جسم کے کسی حصے میں جیسے دل، سر یا خون میں متمرکز ہو یا پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہو (مختلف زمانوں کی مختلف تہذیبوں کے تصورات کے مطابق) یا کسی نہ کسی طرح انسان کے جسم کے ساتھ مربوط ہو، تاہم دونوں صورتوں میں یہ مکان کے فیکٹر کی پابند ہے حالانکہ یہ مادی نہیں ہے؟! اور صرف یہی وہ تنہا مادی خاصیت نہیں ہے جو روح کو عطا کی گئی ہے، مکانی حاضری کے علاوہ یہ مادی اجسام پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے!! کیونکہ اس کا وجود جسم کو زندگی بخشتا ہے اور اس کی جدائی جسم کو موت سے ہمکنار کر دیتی ہے؟!

ان مادی خصوصیات کے باوجود کہیں آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ روح کوئی مادی شئے ہے، بلکہ یہ ایک میٹافیزیکل ہستی ہے!! معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین نے اسے زمان کی قید سے آزاد کر دیا ہے!! کیونکہ جسم کی موت اس کے لیے قطعاً کوئی معنی نہیں رکھتی، بلکہ موت کی وجہ اس کی جسم سے "رحلت" ہے، جسم کو زندہ رہنے کے لیے اس کی ضرورت ہے مگر اسے جسم کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، روح کے لیے موت اس کی جسم سے علیحدگی ہے، اگرچہ مختلف تہذیبوں و مذاہب میں روح کے انجام پر اختلاف پایا جاتا ہے تاہم سب کا اس بات پر ضرور اتفاق ہے کہ یہ کبھی "ختم" نہیں ہوتی کیونکہ یہ زمان سے ماوراء ہے، جسم سے رحلت کے بعد شاید اس سے بازپرس کی جاتی ہے، یا پھر اسے کسی جگہ پر "سٹور" کر دیا جاتا ہے تاکہ اجتماعی حساب کے وقت اسے واپس لایا جا سکے، یا دوبارہ کسی دوسرے جسم میں بھیج دیا جائے یا پھر خدا میں ضم ہو جائے جو غالباً اس کا منبع ہے!!! مگر یہ ہمیشہ دائمی بقاء کی حامل ہوتی ہے اور وقت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا!!

معلوم ہوتا ہے کہ روح بیک وقت ایک طرح سے میٹافیزیکل نما بھی ہے اور مادی نما ہے، مکان کی پابند ہے مگر زمان کی نہیں، جسم پر اثر انداز ہوتی ہے مگر اس سے اثر نہیں لیتی، یہ اس قدر تضادات سے لپٹی ہوئی ہے کہ نا تو اسے سمجھا جا سکتا ہے اور نا ہی اس کی کوئی مخصوص تعریف وضع کی جا سکتی ہے، شاید یہاں پر مجھے بات ختم کرتے ہوئے سوال کو اس پر یقین رکھنے والوں کی طرف پھیر دینا چاہیے کہ شاید ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب ہو کہ۔۔۔ روح کیا ہے؟!

اپنی ناپختگی کے دور میں انسانیت کی اس مفہوم کی اختراع پر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ یہ نوٹ کرنا انتہائی آسان ہے کہ مرنے کے بعد جسم تحلیل یا مٹی بن جاتا ہے، اس تبدیلی نے یقیناً قدیم انسان کو اس چیز کے بارے میں متفکر کر دیا ہو گا جس کے فقدان کی وجہ سے جسم مٹی میں تبدیل ہو گیا۔ مٹی سے انسانی شباہت کے بت بنانا بھی آسان ہے مگر وہ ویسے نہیں ہوتے جیسا کہ زندہ جسم ہوتا ہے، اس طرح یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ زندہ ہونے کے لیے اس بت میں کس "چیز" کی کمی ہے؟

اس نکتے پر آ کر جانداروں اور مختلف جمادات کے درمیان فرق کو نوٹ کرتے ہوئے کسی "جوہر" کی موجودگی کا اندازہ لگایا گیا جو اس فرق کا ذمہ دار ہے، روح کا تصور تضادات سے کتنا ہی بھرپور کیوں نہ ہو کسی بھی قدیم انسانی تہذیب پر اس تصور کی اختراع پر کوئی الزام نہیں دھرا جا سکتا کہ ماضی میں علم و شعور کی سطح اس تصور سے زیادہ کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔

لغوی جذر پر غور کرنے والوں پر "روح" اور "ریح" اور "نفس" اور "نَفَس" کا اشتقاق مخفی نہیں ہو گا، معلوم ہوتا ہے کہ معانی کا یہ تشابہ دیگر زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے، چونکہ سانس (تنفس) زندگی کا ایک اہم مظہر ہے لہذا لفظ کا اشتقاق اسی سے آیا ہے کہ روح کا نکلنا سانس کا خاتمہ ہے، روح کے مفہوم کو فکری سند دینے کے لیے میٹا فیزیکل، لاہوتی اور مذہبی تصورات نے یکے بعد دیگرے جنم لیا تا کہ روح کے مسائل و انجام وغیرہ کو بیان کیا جا سکے، وقت کے ساتھ ساتھ اصل تصور پیچیدہ سے پیچیدہ تر اور تضادات سے بھرپور ہوتا گیا اور اس کے لیے پوری ایک میٹا فیزیکل دنیا بنا دی گئی جو ہماری دنیا سے اگر برتر نہیں تو متوازی ضرور ہے!! روح کی منطق قدماء کے نزدیک ان کی علمی، عملی و تہذیبی سطح کے حساب سے ایک صاف ستھری منطق تھی جس پر کوئی غبار نہیں تھا۔

اس تصور پر جس قدر ہم قدیم انسان کے موقف کو سمجھ سکتے ہیں اتنا ہی ہمیں جدید انسان پر حیرت ہوتی ہے جو اب بھی وہی قدیم تصورات لیے پھر رہا ہے!! حیرت کی بات ہے کہ لوگوں کی اکثریت زندگی کو باقی طبعی مظاہر کی طرح ایک ایسے طبعی مظہر کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جس کی توجیہ کے لیے ایسے میٹا فیزیکل اور خرافاتی تصورات کی چنداں ضرورت نہیں ہے، حیاتیات واضح طور پر بتاتی ہے کہ زندہ مادہ موجودات میں کوئی منفرد چیز نہیں ہے، قدرتی کیمیائی تعاملات ہی زندگی کے مظہر کے ذمہ دار ہیں، خوراک، نشو نما، افزائش و احساس بلکہ موت بھی ماسوائے کیمیائی تعاملات کے اور کچھ نہیں ہے، ان سب کی روح کے خرافاتی تصور سے ہٹ کر سائنسی طریقوں سے تفہیم کی جا سکتی ہے۔

مؤمنین کے مختلف طبقات یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ انسان اپنے تمام تر افکار، احساسات و جذبات سمیت نیچر کا بیٹا ہے اور "خسیس" مادے کی پیداوار ہے!! درحقیقت اس "خسیس" مادے کا، جو کچھ بھی کرنے سے عاجز اور طبعی صفات

خصوصیات سے عاری ہے کا اس حقیقی مادے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کی ہم بات کر رہے ہیں اور جو کائنات میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے، یہ "خسیس" مادہ مؤمنین کی غلط تجرید کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ واقعی ایک بے ہودہ اور جامد شئے ہے جو کچھ بھی کرنے سے عاجز ہے، یہ ان کے خوبصورت تصور جسے وہ خدا کہتے ہیں اور جس سے وہ تمام طبعی مواد کی صفات کو منسوب کرتے ہیں کے مقابلے میں ایک بد صورت تصور ہے!! یعنی انہوں نے کرداروں کو الٹ کر اس تصوراتی ہستی کو جو ان کے تجریدی تصور کی تخلیق ہے کو وہ خدا بنا دیا ہے جو عدم ہے اور وہی مطلق حقیقت ہے اور (کائنات کے اصل) مادے سے اس کی تمام تر طبیعاتی و کیمیائی خصوصیات چھین کر اسے مطلق ساکن بنا دیا ہے!! پھر بڑے وقار سے آکر ہمیں بتاتے ہیں کہ مادہ ان کے خدا اور اس کی میٹافیزیکل فوج یعنی روحوں، فرشتوں اور شیاطین کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا لہذا ہمیں اس پر ایمان لانا چاہیے اور کائنات اور اس کی موجودات سے کفر کرنا چاہیے!! آج کے دور میں بھی جب کبھی "زندگی" کی بات ہوتی ہے تو بغیر کسی منطقی وجہ کے "روح" کو بیچ میں ٹھونس دیا جاتا ہے، اعتراض کرنے پر عجیب و غریب بیان سننے کو ملتا ہے کہ:

"کیا اعصاب پر مشتمل دماغ ادراک و شعور پیدا کر سکتا ہے!! کیا اعصاب مادی چیزیں نہیں ہیں، پروٹین، پانی اور کاربوہائیڈریٹس پر مشتمل خلیے جو ایک اعصابی سیال منتقل کرتے ہیں، کیا یہ اجزاء جو کہ خالصتاً مادہ ہیں چیزوں کو "محسوس" کر سکتے ہیں؟! دماغ تو بس ایک "اوزار" ہے، ادراک تو آخر کار نفس یا روح کرتی ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا!!"

ظاہر ہے یہاں "خسیس" مادے کی ہی بات کی جا رہی ہے، مادہ ادراک نہیں کر سکتا مگر روح یا نفس جس کا ادراک نہیں ہو سکتا وہی ادراک کرتی ہے؟!

اگر جدید حیاتیاتی علوم سے رجوع کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ یہ قدیم اعتقاد کہ نامیاتی مادہ ایک منفرد خصوصیت کا مالک ہے اور پہلے سے موجود زندہ مادے سے ہی آسکتا ہے پہلی بار اس وقت ساقط ہو گیا تھا جب جانوروں کے غدود سے انسولین حاصل کرنے کی بجائے اسے لیبارٹری میں تیار کر لیا گیا، 1953ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایمائینو ایسڈ جو زندگی کا بنیادی عنصر ہے لیبارٹری میں نہیں بنایا جا سکتا تاہم ملر-یورے کے تجربے نے اسے غلط ثابت کر دیا، 2010ء میں کریگ وِنٹر لیبارٹری میں پہلا مصنوعی زندہ خلیہ بنانے میں کامیاب ہو گیا جسے انسانیت کی بنائی ہوئی پہلی زندگی قرار دیا جاتا ہے، لیبارٹری میں اسے یہ "مصنوعی زندگی" بنانے کے لیے کسی طرح کی روح کی ضرورت نہیں پڑی، اس طرح روح کی قبر پر آخری کیل ٹھونک دی گئی۔۔

روح کے ماننے والوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کو مانتے ہیں جس کے بارے میں لگتا ہے کہ انہیں خود بھی کچھ نہیں معلوم!! تو وہ روح کیا ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟ روایتی جواب جو سننے میں آتا ہے وہ ہے: "یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔ (الاسراء 85) اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہدو کہ وہ

میرے پروردگار کا ایک حکم ہے اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔"(؟!) عجب گول مول جواب ہے۔۔ ہم نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کا حکم آپ کے خدا سے ہے یا کسی اور خدا سے!! سوال یہ ہے کہ روح کیا ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟! آپ کا جواب کیا ہے؟!

درحقیقت سارے مذاہب اپنے تمام تر خداؤوں، نیم خداؤوں، انبیاؤوں، مسیحاؤوں اور اولیاؤوں سمیت قدیم دور کے انسان کے سادہ لوح ذہن کی اختراع ہیں، لہٰذا مذاہب کا آسمان ماسوائے سراب کے اور کچھ نہیں جنہیں پیاسا پانی سمجھ کر ان کی طرف دوڑا چلا جاتا ہے مگر وہاں پہنچنے پر اسے نہ خدا ملتا ہے نہ وصالِ صنم! مذاہب حقیقی جوابات دینے کی بجائے پہلے سے تیار شدہ "گول مول" جوابات کے ذریعے جذبات کو گدگدانے کی کوشش کرتے ہیں اور منطق کو دیوار پر دے مارتے ہیں، روح کے مفہوم پر وہی کچھ لاگو ہوتا ہے جو مذاہب کی دیگر پراڈکٹس پر لاگو ہوتا ہے اسی لیے یہ مردود ہے، یہ کہنا کہ روح موجود ہے ایک پُرلطف جواب تو ہو سکتا ہے مگر منطقی ہرگز نہیں کیونکہ روح کا تصور ایسے بہت سارے مشاہدات کی وضاحت نہیں کرتا جو اصولاً اسے کرنا چاہیے خاص طور سے اگر اس تصور کے حامی چاہتے ہیں کہ یہ انسانی معرفت کی ترقی کے آگے ٹک پائے۔

ایک غیر مادی چیز کی کسی مادی جگہ میں موجودگی کس طرح تسلیم کر لی جائے!! روح کا کسی مخصوص جگہ میں موجود ہونا اور ایک مخصوص جسم سے مربوط ہونا اسے ناقابلِ انکار مادی صفات دیتا ہے، جسم کے اندر اس کی ممکنہ موجودگی اور اس پر اثر انداز ہونے کی اس کی خاصیت اسے خالصتاً ایک مادی وجود دیتی ہے جو اصولی طور پر قابلِ جانچ ہونی چاہیے!

کیا روح رحم کے باہر پیدا ہوتی ہے یا انڈے میں یا خودکار طور پر افزائشی خلیوں سے منتقل ہوتی ہے؟! اگر یہ "باہر" سے آتی ہے تو کہاں سے؟ کیا اس کے پہنچنے سے پہلے بچہ مردہ ہوتا ہے؟! اگر زندہ ہوتا ہے تو اس صورت میں اس کا فائدہ کیا ہے؟ اگر یہ سپرم یا انڈے سے آتی ہے تو یہ مادی ہوئی، بلکہ اس کی مینڈل کے قوانین سے بھی جانچ ہو جانی چاہیے!!

ہم جانتے ہیں جسم کے مختلف حصے ایک ہی وقت میں نہیں مرتے بلکہ بتدریج مرتے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جسم کے ہر حصے کی الگ روح ہوتی ہے؟! اور کیا روح قابلِ تقسیم ہے؟ کسی شخص کا کوئی عضو کسی دوسرے شخص میں لگانے کی صورت میں کیا روح منتقل شدہ عضو کے ساتھ منتقل ہوتی ہے یا نہیں!! یہ منتقل شدہ عضو صاحبِ عضو کے مر جانے کے باوجود زندہ کیسے رہتا ہے؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض روحوں کی عمر ان کے مالکان سے زیادہ طویل ہوتی ہے کیونکہ ان کا کچھ حصہ ان کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہا!

روح کے تصور کا ایک تضاد بھرا پہلو زندہ جسموں میں مصنوعی اعضاء کی پیوند کاری ہے،روح کے تصور کی صورت میں کسی زندہ عضو کی کسی مشینی عضو سے تبدیلی کی صورت میں جو اس کا کام کر سکتا ہو کیسے سمجھا جائے؟ کیا روح پر مشتمل کسی عضو کی دستبر داری ممکن ہے؟ لیبارٹریوں میں انسانی اعضاء کو پیوند کاری سے قبل کولنگ میں رکھا جاتا ہے، کیا روح کولنگ سے اثر انداز ہوتی ہے؟!

سوالات بہت ہیں اور تضادات ان سے بھی کہیں زیادہ، جس سے روح کے مؤمنین کا موقف انتہائی کمزور پڑ جاتا ہے، انہیں چاہیے کہ وہ اپنے موقف کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، یہ کہاں کی خردمندی ہے کہ کسی غلط تصور سے محض اس لیے چمٹا رہا جائے کہ:

"انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارہم مہتدون"۔
"ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔(الزخرف 22)"

باطل مشکل

"سفید" یا "سیاہ"

دو بیساکھیاں
جن کے سہارے
ہر وہ اپاہج ذہن چلتا ہے
جو حقیقی سرمئی فضاء میں
اڑنے سے عاجز ہوتا ہے

باطل مشکل یا سیاہ و سفید کا مغالطہ

کوئی شخص اس مغالطے میں تب پڑتا ہے جب اپنی حجت اس مفروضے پر قائم کرتا ہے کہ صرف دو ہی اختیارات (آپشنز) دستیاب ہیں یا صرف دو ہی ممکنہ نتائج ہیں اس سے زیادہ نہیں جبکہ دوسرے اختیارات اور نتائج موجود ہوتے ہیں، یہ کسی موقف یا معاملے کے باقی تمام تر ممکنات کو ختم کر کے صرف دو اختیارات تک محدود کر دیتا ہے جن کا کوئی تیسرا نہیں ہوتا، ان دو اختیارات میں ایک واضح طور پر باطل ہوتا ہے اور دوسرا صاحبِ مغالطے کی اپنی پسندیدہ رائے ہوتی ہے۔

مثالیں:

1- آپ یا تو ہمارے ساتھ ہیں یا پھر ہمارے خلاف ہیں (نائن الیون کے بعد جارج ڈبلیو بُش کا بیان).

2- پاکستان سے محبت کریں یا اسے چھوڑ دیں.

3- یا تو آپ ہمارے ساتھ یہ جنگ لڑیں یا ڈرپوک اور غدار کہلائیں.

4- یا تو آپ لکس صابن استعمال کریں یا پھر اپنی جلد کی خوبصورتی داؤ پر لگا دیں.

ذرا پیچیدہ شکل:

1- یا تو اس شخص نے واقعی کوئی خلائی مخلوق دیکھی ہے یا پھر یہ شخص پاگل ہے، مگر ہم نے کبھی اس شخص میں ایسی کوئی علامت نہیں دیکھی جس سے پتہ چلتا ہو کہ یہ شخص پاگل ہے.

2- یا تو میرے پاس واقعی کچھ خصوصی طاقتیں ہیں یا پھر میں جھوٹا اور دھوکے باز ہوں، مگر میں نے زندگی میں کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا! (ایک تیسرا امکان نظر انداز کر دیا گیا کہ: مجھے وہم بھی ہو سکتا ہے).

یہ مغالطہ عام طور پر دکانداروں یا سیلز مینوں میں زیادہ رائج ہوتا ہے جو گاہک کے اختیارات (آپشنز) اتنے کم کر دیتے ہیں کہ اس کے پاس سوائے ان کی پیش کردہ مصنوعات ہی باقی رہ جاتی ہیں... یہ مغالطہ سیاستدانوں کے ہاں بھی رائج ہے جو ہر اس شخص یا گروہ کو اپنا دشمن قرار دیتے ہیں جو ان کے ساتھ نہ ہو اور اپنی تصوراتی زمرہ بندی میں غیر جانبداروں کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑتے... مذہبی انتہاپسندوں کی تقریروں میں بھی یہ مغالطہ کافی عام ہے جو سادہ لوحوں اور "عقل کے سست" لوگوں کے سامنے دنیا کی انتہائی درجے کی سادہ، سطحی، جعلی اور بگڑی ہوئی تصویر پیش کرتے ہیں، درویش خراسانی صاحب کا یہ تبصرہ اس مغالطے کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے.

اس مغالطے میں خامی یہ ہوتی ہے کہ دو اختیارات تمام امکانات کا احاطہ نہیں کر سکتے، مزید وضاحت کے لیے اس کی تجریدی صورت یوں ہوتی ہے:

1-یاتو آپ ق کا انتخاب کریں یا ک کا

2-دوسرا کوئی آپشن نہیں ہے

3-آپ ق کا انتخاب نہیں کرسکتے

4-چنانچہ آپ کو لازماً ک کا انتخاب کرنا چاہیے

اوپر کے سیناریو میں خلل مقدمہ نمبر 2 کا جھوٹ ہے.

یہ مغالطہ سوچ کو محدود کرتا اور ذہنی بالیدگی کی علامت ہوتا ہے، اسے نمایاں طور پر نسلی تفاخر Ethnocentrism میں دیکھا جاسکتا ہے، یعنی چیزوں کو دیکھنے میں نسل / جماعت / مذہب / گروہ کی مرکزیت کہ ہمارا گروہ ہی ہر چیز کا محور ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جس پر دیگر تمام چیزوں کو پرکھا جانا چاہیے اور دیگر تمام گروہوں کی درجہ بندی کی جانی چاہیے کیونکہ: ہمارا گروہ حق پر ہے اور دیگر باطل پر ہیں.. یہ انتہاء پسندی ہی قوموں کو اس غلو میں مبتلا کردیتی ہے کہ کچھ فضائل / عناصر اسی کے لیے مخصوص ہیں اور اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں، یہی ذہنی بالیدگی تہذیبوں کے ارتقاء میں رکاوٹ اور ان کے زوال کا سبب بنتی ہے، اور یہی ذہنی بالیدگی مختلف گروہوں کے درمیان نفرت کو جنم دیتی ہے اور انہیں ایک وہمی مقدس جنگ کی طرف دھکیل دیتی ہے اور زمانے کی تبدیلیوں کو قبول کرنے اور دورِ حاضر کے نئے عالمی معاشرے میں مدغم ہونے سے روکتی ہے.. یہ ذہنی بالیدگی گروہوں کو درست منطقی نہج پر نہیں سوچنے دیتی، ان کی سوچ کی حد صرف "ہم" بمقابلہ "وہ" کے گرد گھومتی رہتی ہے اور حد درجہ سادہ ہوجاتی ہے کہ یاتو سب خیر ہے یا سب شر ہے (1).

حوالہ جات:

1- The Growth of the Mind: And the Endangered Origins of Intelligence

توسل بہ جہل

توسل بہ جہل یا "تکیہء مجہول" ایک بہت ہی عام منطقی مغالطہ ہے جسے انگریز فلاسفر جان لاک نے وضع کیا تھا، یہ مغالطہ اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب دعوے کے اثبات کا بوجھ غلط فریق پر ڈال دیا جاتا ہے یا پھر جب کسی دعوے کے فریق کی اثبات کی کمزوری کسی دوسرے فریق کے دعوے کی درستگی کی دلیل بنادی جاتی ہے جبکہ دوسرے فریق کے دعوے کی درستگی کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا، اس کی ایک تازہ مثال سعید صاحب کا یہ تبصرہ ہے جس میں سائنس کی کمزوری (پہلا فریق) خدا کے وجود کی

دلیل (دوسرا فریق) بنادی گئی جبکہ خدا کے وجود (دوسرے فریق کے دعوے) کی کوئی دلیل نہیں ہے، اپنی سادہ شکل میں یہ مغالطہ کچھ اس طرح سے کام کرتا ہے:

1- "س" کا دعوی "ج" پیش کرتا ہے اور ثابت کرنے کا بوجھ "د" پر ڈال دیا جاتا ہے۔

2- "د" دعوی کرتا ہے کہ "س" غلط ہے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

یہ مغالطہ فرض کرتا ہے کہ چونکہ دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے چنانچہ دعوی درست ہے، اسی طرح اس کا برعکس بھی درست ہے یعنی چونکہ یہ ثابت نہیں ہوا کہ دعوی درست ہے لہذا وہ غلط ہے، دونوں صورتوں میں "دلیل کی عدم دستیابی" ہی "دلیل" کا کام کر رہی ہوتی ہے اور اپنے آپ میں دلیل بن جاتی ہے، یوں "دلیل کی عدم دستیابی" کسی دعوے کے درست یا غلط ہونے کی دلیل بنادی جاتی ہے، اس کی ایک شکل یوں بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ جناب چونکہ حریف یہ دعوی غلط ثابت نہیں کر سکتا لہذا یہ دعوی لازماً درست ہے۔

پچاس کی دہائی میں سینیٹر جوزف میکر تھی نے ایک ٹی وی سیریز میں بہت سارے بے قصور لوگوں پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا جسے بعد میں میکر تھزم کا نام دیا گیا، یہ الزامات کسی حقیقی دلیل پر مبنی نہیں تھے، کوئی بھی شخص اس بنیاد پر مورد الزام ٹھہرا دیا جاتا تھا کیونکہ میکر تھی کے ریکارڈ میں اس شخص کے کیمونسٹ رجحانات ثابت کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا، یعنی بجائے اس کے کہ وہ اپنا دعوی دلیل سے ثابت کرتا وہ اس کی بنیاد دعوی غلط ثابت کرنے کے لیے دلائل کی عدم دستیابی پر رکھتا تھا جو کہ مغالطہ ہے کیونکہ میکر تھی اپنی حجت ایسے مثبت نتائج جن سے پتہ چلتا ہو کہ اس نے جان لیا ہے یا ثابت کر دیا ہے کہ فلاں شخص کمیونسٹ رجحانات رکھتا ہے کی بجائے معرفت کی عدم دستیابی (جہالت) پر رکھتا تھا۔

عام گفتگو میں اس مغالطے کی شکل کچھ یوں ہوتی ہے:

جاوید: میرا خیال ہے کہ بعض لوگوں کے پاس جادوئی طاقتیں ہوتی ہیں۔

سلیم: تمہیں کیسے پتہ چلا؟

جاوید: کیونکہ ابھی تک کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس ایسی طاقتیں نہیں ہو سکتیں۔

گاڈ آف دی گیپس بھی اسی مغالطے کی ایک شاخ ہے، یہ اس برہان کی نمائندگی کرتا ہے جو مؤمنین خدا کی موجودگی کی دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ چونکہ علم ابھی تک کسی مخصوص طبعی مظہر کی وضاحت نہیں کر سکا چنانچہ یہ لازماً ان کے خدا کا کارنامہ ہے محض اس لیے کیونکہ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں اور کوئی اس کے برعکس ثابت نہیں کر سکتا۔

خدا بمقابلہ شر

مومن اچھی طرح جانتے ہیں کہ شر کے مسئلے سے کشید کردہ ملحدانہ دلائل بدیہی اور منطقی دونوں طرح سے ملحدوں کے مضبوط ترین دلائل میں سے ہیں چنانچہ مومنین نے بھی ان دلائل کا جواب دینے کی بھرپور سعی کی ہے جسے فلسفے میں تھیوڈیسی کہا جاتا ہے یعنی شر کے مقابلے میں ایک منصف خدا کا اثبات.

شر کے وجود سے کشید کردہ دلائل کے رد میں تھیوڈیسی کا کہنا ہے کہ منطقی طور پر شر کا وجود ایک محبت کرنے والے طاقتور خدا کے وجود سے متصادم نہیں ہے یعنی دوسرے لفظوں میں قاتل مرنے والے سے محبت کرتا تھا؟! 😀 عام طور پر لوگوں کو یہ کہہ کر قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شر کا وجود ہمیں درکار فضائل اور آزاد ارادے کے وجود کے لیے ضروری ہے.

تھیوڈیسی کا کہنا ہے کہ اذیت کی ہر حالت نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ اس کی وجہ بھی ہوتی ہے... در حقیقت مومنین کے لیے یہ بہت مشکل کام ہے کیونکہ اگر ہمیں اذیت کی کوئی ایک بھی ایسی حالت مل جائے جس کی کوئی ایک بھی وجہ یا جسٹیفیکیشن نہ ہو تو بنیادی طور پر یہ خدا کے وجود کی نفی کے لیے کافی ہوگی اور مومنین کی ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا.. اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تھیوڈیسی کے دلائل کتنے مضبوط ہوتے ہوں گے...

تاہم شر کے مسئلے کا درست بیان کیا ہے؟ ملحدین اسے کیسے استعمال کرتے؟ یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ زیادہ تر ملحدین کو شر کے مسئلے کا صحیح علم نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے لیے ایک کمزور سی فارمولا سازی کرتے ہیں جسے آسانی سے ڈھیر کردیا جاتا ہے.

جب ہم شر کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس کی اقسام میں بھی تفریق کرنی چاہیے تاکہ خدا کی پیدا کردہ برائی خدا کے اور قیصر کی قیصر کے حصے میں جائے..

اخلاقی شر: اس کی مثال معاشرتی برائیوں سے دی جاسکتی ہے جیسے قتل، چوری، آبروریزی وغیرہ.. شر کا مسئلہ اس نوعیت کے شرور پر بحث نہیں کرتا، ملحد یہ نہیں کہتا کہ: سمندر خان قتل ہوگیا، اسد کی گاڑی چوری ہوگئی اور پپو سے کسی نے ٹافی چھین لی.. ہائے دنیا کتنی ظالم ہے بس خدا نہیں ہے... یہ بکواس ہے.. ملحد جن برائیوں کی بات کرتا ہے وہ یہ قطعاً نہیں ہیں چنانچہ شر کے مسئلے پر مومن کا یہ فرمان کہ: خدا نے ہمیں ارادے کی آزادی دی ہے اور یہ ہم پر ہے کہ ہم اچھے کام کریں یا برے بے معنی بات ہے.

طبعی شر: اس سے مراد وہ شرور ہیں جن کا ذمہ دار انسان نہیں ہے جیسے بیماریاں، وبائیں، آفات، قحط، سیلاب، زلزلے، طوفان، شدید گرمی، شدید سردی وغیرہ، دوسرے لفظوں میں ہم ایسے شر کی بات کر رہے ہیں جو دنیا کی طبیعاتی شکل کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کی بھینٹ ہزاروں بلکہ بعض اوقات لاکھوں انسان چڑھ جاتے ہیں.. مومن کے مطابق یہ شکل خدا نے ڈیزائن کی تھی، یعنی دنیا اس شکل میں ہو یہ انتخاب خدا نے کیا تھا.

آسان لفظوں میں دنیا کی وحشت ناکی کو ہم شر کہہ سکتے ہیں، یہاں لفظ شر مجازی معلوم ہوتا ہے چنانچہ بعض اوقات ہم اسے زیادہ ڈیفائن کرتے ہوئے تکلیف واذیت (Suffering) جیسے الفاظ سے بھی بیان کر سکتے ہیں.

مگر ایک دردناک ووحشت ناک دنیا سے خدا کی عدم موجودگی کیسے ثابت ہوتی ہے؟

سیدھی سی بات ہے کہ خدا کو خدا ہونے کے لیے عالم ہونا ضروری ہے، اگر ہم فرض کریں کہ خدا عالم نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ دراصل طبعی مظاہر کی بات کر رہے ہیں جنہوں نے کائنات کو تخلیق کیا، اس صورت میں آپ میں اور ملحدین میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ کچھ طبعی مظاہر ایسے ہیں جو کائنات کی حالیہ شکل کی موجودگی کو بیان کرتے ہیں اور اس کے ذمہ دار ہیں جیسے عظیم دھماکہ.

بہر حال عالم خدا یقیناً دنیا کی بہترین شکل چاہے گا، مگر رکیے.. اس کا کیا مطلب ہے کہ بہترین شکل چاہے گا؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تصور کے کچھ ممکنات ہیں، دوسرے لفظوں میں آپ دنیا کی دوسری مختلف شکلوں کا تصور کر سکتے ہیں، یہ شکل / شکلیں نا تو محال ہیں اور نا ہی ان میں کوئی تضاد ہے، مثال کے طور پر آپ ایک ایسی دنیا کا تصور کر سکتے ہیں جس میں نا تو سیلاب ہیں، نا ہی بیماریاں ہیں اور نا ہی زلزلے ہیں اور یہ تصور ناممکن نہیں ہے (اگر کوئی کہے کہ یہ ناممکن ہے تو پھر جنت اور جہنم کا وجود بھی ناممکن ہے) اس طرح دنیا کئی متعدد شکلوں میں تخلیق کی جا سکتی تھی اور خدا کو یقیناً کسی ایک شکل کا انتخاب کرنا تھا اب اگر خدا بہترین شکل میں سے کسی کم تر شکل کا انتخاب کرتا ہے تو ایسا وہ یا تو جہالت میں کرے گا یعنی اسے اس سے بہتر شکل کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو (اور یہ اس کے مطلق علم کی صفت کے خلاف ہے) یا پھر مرجوح کو راجح پر ترجیح دے گا جو کہ محال ہے کیونکہ خدا سب سے بہتر شکل چاہتا ہے.

اب چونکہ ہم اس دنیا سے بہتر دنیا کا تصور کر سکتے ہیں چنانچہ یہ حالیہ دنیا بہترین شکل نہیں ہے اور چونکہ خدا کے وجود کے لیے لازم ہے کہ وہ بہترین شکل چاہے جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ حالیہ دنیا سب سے بہتر شکل نہیں ہے کیونکہ اس سے بہتر دنیا کا تصور کیا جا سکتا ہے چنانچہ خدا نہیں ہے.

عقل مندوں کو سلام

اوکیم کا نشتر

اوکیم کا نشتر علم منطق کا ایک مشہور اصول ہے جو انگریز فلاسفر اور منطق دان ولیم آف اوکیم کا وضع کردہ ہے، اس اصول کو تمام علمی و تحقیقی میدانوں میں استعمال کیا جاتا ہے، حال ہی میں سائنس فکشن فلم کانٹیکٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں اس اصول کا استعمال بخوبی دکھایا گیا ہے، علم منطق میں اس اصول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کے مطابق کسی بھی چیز کی آسان ترین توجیہ ہی ہمیشہ درست ہوتی ہے اور جب تک ضرورت نہ ہو معاملے میں کسی طرح کی پیچیدگیاں اور مفروضے شامل نہیں کیے جانے چاہئیں مزید برآں کوئی بھی ایسا دعوی جس کی استدلال سے نفی نہ کی جا سکتی ہو باطل ہے، اس اصول کے پہلے حصے کی ایک مثال یوں دی جا سکتی ہے:

پہلا مفروضہ: ایک کائنات ہے.

دوسرا مفروضہ: ایک کائنات ہے اور ایک خدا ہے جس نے یہ کائنات بنائی ہے.

جیسا کہ واضح ہے پہلا مفروضہ دوسرے مفروضے سے زیادہ آسان ہے جس کا مطلب ہے کہ پہلا مفروضہ ہی پسندیدہ ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرا مفروضہ لازماً غلط ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اسے ایک ثابت شدہ نظریے کے طور پر قبول نہیں کر سکتے، اوکیم کے مطابق اس کے اس اصول سے خدا کے وجود کی تمام تر دلیلیں ساقط ہو جاتی ہیں حالانکہ وہ خود خدا کو مانتا اور انتہائی مذہب پرست تھا مگر اس کا ایمان منطق پر نہیں بلکہ محض ایمان ہی پر قائم تھا اس کے باوجود اس کا کہنا تھا کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں نظریے میں اضافی پیچیدگیاں شامل کرنی پڑیں گی جن کی نا تو ضرورت ہے اور نا ہی یہ نظریے میں کوئی اضافہ کرتی ہیں اوپر کی مثال میں اگر ہم یہ کہیں کہ خدا نے ہی کائنات بنائی ہے تو یہ سوال اٹھے گا کہ خدا کو کس نے بنایا؟ یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاملے میں خدا کو شامل کرنے سے نا ہی کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نا ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات کیوں موجود ہے کیونکہ خود خدا کی بھی کوئی توجیہ نہیں ہے، اوکیم کی نظر میں علم اور لاہوت دو بالکل ہی الگ چیزیں ہیں کیونکہ خدا کے وجود کی کوئی منطقی دلیل وضع کرنا ناممکن ہے.

اوکیم کے اصول کے دوسرے حصے کے مطابق کوئی بھی ایسا دعوی جس کی نفی نہ کی جاسکتی ہو باطل ہے، مثال کے طور پر کیمبری دور میں اگر کوئی مامل جانور مل جائے تو ہم نظریہ ارتقاء کو رد کر سکتے ہیں اور اگر تجاذب کی حامل کوئی دوسری قوت دریافت ہو جائے تو تجاذب کو رد کیا جاسکتا ہے تاہم تب تک یہی نظریات ہی درست تصور کیے جائیں گے کیونکہ انہیں رد کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے تاہم ہم ایسا دعوی کر سکتے ہیں جسے رد نہ کیا جاسکے جیسے "خدا زمان و مکان سے باہر ہے اور اسے منطقی طور پر نہیں سمجھا جاسکتا" اس طرح حجت کسی بھی طریقے سے ناقابلِ نفی اور ناقابلِ بحث ہو جاتی ہے! ایسی حجت قطعی باطل اور بکواسِ محض ہوتی ہے.. اس اسلوب کی ایک مثال یوں پیش کی جاسکتی ہے:

پہلا: میں اپنے آپ کا باپ ہوں.

دوسرا: تم اپنے آپ کے باپ نہیں ہو سکتے یہ ناممکن ہے؟

پہلا: میں ایک خاص حالت ہوں جسے عقل سے نہیں سمجھا جاسکتا.

مندرجہ بالا مثال میں ایک ایسی حجت وضع کی گئی ہے جسے دنیا کی کسی بھی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا اور وہ یہ کہ پہلا شخص عقل کی حدود سے ماوراء ہے اور اس کی حالت کو نہیں سمجھا جاسکتا یوں یہ استدلال فرسودہ اور باطل ہے.

الہی منطقیات

دیکھیے ان لوگوں کو جو عبادت گاہوں میں اپنے خداؤں کے آگے بلا تکان ناک رگڑتے خود کو ذلیل کرتے اور منافقت کے آنسو بہاتے ہیں، کبھی کسی نے سوچا کہ ان لوگوں کو یہ سب کرنے پر کیا چیز اکساتی ہے؟ کیا چیز انہیں خود کو ذلیل کرنے پر مجبور کرتی ہے؟ کیا یہ لوگ یہ سب اپنے خدا کی محبت میں کرتے ہیں؟ خدا سے ان کے تعلق کا راز کیا ہے؟ یہ چاہے کتنا ہی دعوی کیوں نہ کریں کہ وہ یہ سب اپنے خدا کی محبت میں کرتے ہیں تو یہ جھوٹ ہے.

مذہبی منطق کی رو سے بندے اور خدا کا تعلق خرید و فروخت، مصلحت اور خواہشات کی تکمیل کا تعلق ہے، یقیناً مؤمن خدا کی عبادت میں اتنی تکلیفیں جنت کی لالچ میں اٹھاتا ہے، منافقت کے آنسوؤں، حمد و ثناء و تسبیح کی وجہ جنت میں حوروں، لونڈوں اور دودھ و شہد و شراب کی نہروں کی لالچ ہے، یہ سب کرنے میں اس کی خواہشات و حاجات ہی اس کے پیش نظر ہوتی ہیں، اسے اپنا مطلب ہوتا ہے خدا کی فکر نہیں ہوتی، اس سے مجھے شاہوں کے ان منافق شعراء کی یاد آتی ہے جو شاہ کی جھوٹی مدح کے لیے صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تاکہ شاہ کی خوشنودی حاصل کر کے نفع حاصل کیا جاسکے، بندے اور خدا کا تعلق بھی بعینہ یہی ہے، جس طرح شاہوں کے شعراء منافقانہ مدح کرتے ہیں اسی طرح یہ خود کو ذلیل کر کے خدا کے غرور اور کبریاء کو راضی

کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خدا کی محبت یا اسے راضی کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کے پاس جو خزانے ہیں ان کے لیے، خدا کو بھی جو "دلوں کے بھید خوب جانتا ہے" اس کی خبر ہے مگر چونکہ اس کے غرور و کبریاء کی ہوس پوری ہو رہی ہوتی ہے اور جھکتے روتے گڑگڑاتے غلاموں کا دل آویز منظر اس کے کبریاء کو تسکین پہنچا رہا ہوتا ہے وہ اس منافقت کی پرواہ نہیں کرتا، اس قسم کے تعلق کو تکافلی تعلق کہا جاتا ہے یعنی فائدہ دینا اور فائدہ اٹھانا، ایک ایسا تعلق جسے کسی طرح شریفانہ نہیں کہا جا سکتا اور نا ہی یہ خدا اور مخلوق کے تعلق کی کوئی مثالی صورت ہے.

مخلوق اور خدا کے درمیان یہ غیر اخلاقی اور گراہوا تعلق محض یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، اس کا دوسرا رخ اس سے بھی کہیں بھیانک اور خطرناک ہے، اگر مخلوق کو جنت کی رغبت نہ تو اس صورت میں خدا اسے ڈرا دھمکا کر اور جہنم میں بھوننے کی وعیدیں دے کر عبادت کے لیے مجبور کرتا ہے، اس صورت میں پیدا ہونے والا تعلق دہشت گردانہ و بہیمانہ و جابرانہ ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خدا عبادت کی یہ جنونی خواہش ہر صورت میں پوری کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی عبادت کے پیچھے اس کی محبت نہیں بلکہ در حقیقت خوف کارفرما ہے وہ اس بہیمانہ تعلق سے صرف نظر کرتا رہتا ہے کیونکہ بالآخر مخلوق اس کے سامنے خود کو ذلیل کر ہی رہی ہوتی ہے.

اس قسم کے تعلقات کی کیا توجیہ ہے؟

اس ظلم و ستم کی کیا توصیف ہے؟

بلکہ ایسے خدا کی کیا توصیف ہے جسے محض اپنے غلام بڑھانے اور انہیں ذلیل کرنے کی فکر ہے جبکہ وہ ان کی نیتیں اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ خود سے محبت کرتے ہیں؟

غرض کہ جزاء و سزاء کی سیاست خدا اور مخلوق کی سطح کے تعلق کے لیے قطعی موزوں نہیں.

بیشتر مذاہب اپنے ماننے والوں کو مرنے کے بعد جنت کی نوید سناتے ہیں، زیادہ تر مؤمنین اس جنت کو بڑی سطحیت سے لیتے ہیں، اگر جنت میں زندگی کے تصور کو ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جنت جنت نہیں جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں بلکہ ایک عذاب ہے، جب ہمیں جنت کی زندگی کی رنگینیوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو ہم اس کی لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم اس کا موازنہ اپنے دنیاوی احساس اور تصور سے کر رہے ہوتے ہیں مگر در حقیقت خواہشات کی تکمیل آخرت کی زندگی میں قطعی مختلف ہوگی.

فرض کریں آپ خدا کو راضی کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اس کے بدلے میں آپ کو جنت نواز دی گئی تو زندگی کا وطیرہ کیسا ہوگا؟ حوروں اور لونڈوں سے گروپ سیکس کرنے اور شراب و شہد کی نہروں سے پیاس بجھا لینے کے بعد کیا آپ بور نہیں ہوجائیں گے؟ خاص طور سے جبکہ آپ اپنے اندر یہ بات جانتے ہوں گے کہ یہ سب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری رہے گا... جب آپ کو یہ احساس ہوگا تب یہ جنت جہنم میں بدل جائے گی! یہ ست وخواہشات کی تکمیل پر مبنی دائمی زندگی ہی اصل عذاب ہے. انسان میں لذت کے احساس کی وجہ اس کے لاشعور میں اس بات کا ادراک ہے کہ یہ لذت دائمی نہیں، جب انسان خوش ہوتا ہے اور اس خوشی سے لطف اندوز ہوتا ہے تو اس لطف کی وجہ اس کی اپنے عقل باطن میں غم کی موجودگی کا یقین ہے، غم کے بغیر خوشی کی لذت حاصل نہیں کی جاسکتی، خوشی اور غم چاہے کتنے ہی متضاد ہوں یہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں چنانچہ جنت جیسی خالص خوشی ولذت کی زندگی کا وجود نا ممکن ہے.

غم وخوشی کا ایک اور عنصر جو پہلے سے کسی طور کم اہمیت کا حامل نہیں اور وہ زندگی کے فناء اور محدودیت کا لاشعور میں احساس ہے، جب لوگ خوش ہوتے تو ان کی عقل باطن میں یہ ادراک جاگزیں ہوتا ہے کہ زندگی محدود اور مختصر ہے چنانچہ اس سے جتنی خوشیاں کشید کرسکتے ہو کرلو مگر جنت کا انسان کیا کرے گا؟ کیا یہ جانتے ہوئے کہ یہ زندگی ابدی ہے وہ اس سے لطف اندوز ہوسکے گا؟ اس صورت میں جنت یقیناً اسے الٹی پڑ جائے گی اور ایک دن تمام ساکنانِ فردوس اجتماعی خودکشی کرکے خدا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے!!

انبیاء اور مؤمنین یہ جان ہی نہ سکے کہ مسرت کے اسباب مادی نہیں نفسیاتی ہیں، خوشی دراصل ایک عقلی حالت ہے، لذت ومسرت نفس سے اور انسان کی نفسیاتی حالت سے پھوٹتے ہیں، حوروں کی فوج، شراب اور دولت کے انبار دل میں خوشی نہیں ڈال سکتے کہ کتنے ہی زبوں حال مسرت کی ایسی زندگی گزارتے ہیں جن کی امراء بس خواہش ہی کرسکتے ہیں.

انسانی زندگی کی تنظیم میں خدا حلال وحرام کی سیاست پر انحصار کرتا ہے، مگر کیا اسے حرام کرنے کے الٹے اثر کا ادراک نہیں تھا؟ کیا اس نے "ہر ممنوع مرغوب ہوتا ہے" کو مد نظر رکھا تھا؟ کیا اس نے اس درخت سے سبق نہیں سیکھا جسے اس نے آدم پر حرام کردیا تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اگر وہ اس درخت کو آدم پر حرام نہ کرتا تو وہ اس میں سے کبھی نہ کھاتا؟

حرام کی سیاست حرام کا چیختا اشتہار ہے، یہ اس حرام چیز کی تاکید اور اس پر روشنی ڈالنے کے مترادف ہے جو کہ دوسری صورت میں اندھیروں کے طاقِ نسیاں میں دھری ہوتی اگر اس سے خبردار نہ کیا گیا ہوتا، یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا ہوتے ہوئے وہ یہ بات بھول گیا تھا، اسے سمجھنے کے لیے افلاطون کی ضرورت نہیں، دیکھیے وہ ممنوع کتابیں اور فلمیں جو کہ اگر ممنوع نہ ہوتیں تو کوئی

انہیں گھاس نہ ڈالتا، خدا کو پتہ ہونا چاہیے تھا کہ سرخ بتیوں کو توڑنا انسان کی جبلت ہے، حرام فعل میں دہری لذت ہوتی ہے، ایک حرام چیز کی لذت اور ایک حرام کرنے کی لذت، شراب کو حرام کرنے کے بعد اس کی لذت ہی دوگنی ہوگئی، ایک نشہ کی لذت اور دوسری حرام کی لذت... تو کوئی پوچھے اس خدا سے کہ وہ اس سب سے کیا چاہتا ہے؟ کسی چیز کو حرام کر کے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا اور پھر اس حرام کو کرنے پر لوگوں کے چیتھڑے اڑانے کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہے؟ کیا اسے ان گناہ گاروں کو سزا دینے کی بجائے انہیں جزاء نہیں دینی چاہیے؟ کیا انہوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کی بات نہیں مانی؟ درحقیقت.. کیا خدا نے جنت کے لاکھوں درختوں میں سے محض ایک پر پابندی لگا کر آدم کو خود اس ملعون درخت کو کھانے کی دعوت نہیں دی تھی؟ اور کیا آدم نے اس درخت کو کھا کر اس دعوت پر لبیک نہیں کہا؟ کیا اسے آدم کو انعام سے نہیں نوازنا چاہیے؟

آدم پر بات چلی تو ذہن میں ایک اور قاتلانہ سوال اٹھا... خدا نے ہی کہا تھا کہ "ولا تزر وازرۃ وزر اخری (اور کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا – سورہ الانعام، آیت 164)" تو پھر ہم آدم کے گناہ کا بوجھ کیوں اٹھائیں؟ اگر اس نے یہ گناہ کیا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ اربوں لوگ ایسے گناہ کا بوجھ کیوں اٹھا رہے ہیں جو انہوں نے سرے سے کیا ہی نہیں؟ تاریخ میں ایسے بڑے قصے پڑھے ہیں جن میں قومیں اپنے حاکموں کی حماقتوں کی سزا بھگتتی ہیں مگر جہاں پوری انسانیت ہی ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہو تو میرے خیال سے یہی عین ظلم ہے خاص طور سے جب جرم محض ایک سیب / گندم کھانے جتنا فضول ہو!!

خدا ہی موردِ الزام ہونا چاہیے، نہ صرف یہ کہ اس نے آدم کو وہ درخت کھانے کی کھلی دعوت دی اوپر سے آدم کو جنت سے نکالنے جیسا اتنا بڑا فیصلہ اس کے دور رس اثرات کو مدِ نظر رکھے بغیر ہی کر ڈالا، اگر وہ سیب والے فضول معاملے سے صرفِ نظر کر لیتا تو غلطیاں وہیں رک جاتیں اور انسانی تاریخ پر محیط خطرناک غلطیاں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی وہیں تھم جاتی.

صرف یہی کوئی اکلوتی حرکت نہیں، ہم میں سے کس نے خدا کے ہاتھوں ہونے والی اس انسانی تباہی کے بارے میں نہیں سنا جب اس نے اپنے ایک چہیتے فرشتے کو ایک کافر بستی کو نیست و نابود کرنے کے لیے بھیجا تو فرشتے نے واپس آکر اسے خبر دی کہ اس بستی میں ایک عبادت و پرہیز گزار بندہ بھی رہتا ہے کہ شاید خدا کو اس بستی اور اس کے لوگوں پر ترس آجائے مگر خدا نے چھوٹتے ہی کہا کہ: "ففیہ فابدا (اسی سے شروع کرو!!)" یہ عابد چاہے عابد نا بھی ہو اور چاہے اس کا عمل اور دین اس کی شفاعت نہ کر سکا ہو سزا کا قطعی مستحق نہیں ہے کیونکہ وہ کسی گناہ میں شریک نہیں ہوا، اس کے باوجود خدا خود کو منصف و عادل کہتا ہے، اتنا

سادہ سا مسئلہ اگر کسی مبتدی جج کے سامنے بھی پیش کر دیا جاتا تو وہ اس میں فیصلہ کرنے میں غلطی نہ کرتا کجا وہ ہستی غلطی کر جائے جس نے روزِ قیامت لوگوں سے حساب لینا ہے؟ انسانیت اس سے کیسے بچ پائے گی جبکہ اس میں انصاف کی ادنی ترخوبی نہیں ہے؟ اس بوڑھے شیخ سے کیوں شروعات کی جائے جبکہ وہ خود کہتا ہے کہ کوئی کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا؟، کاش وہ اس سے سیکھتا اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا، مگر نہیں کیونکہ ایک اور جگہ پر کہتا ہے کہ: "اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو فواحش پر مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا۔ اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ –سورہ الاسراء، آیت 16 "اس خدائی جرم میں اہلِ بستی ہی قیمت چکائیں گے کیونکہ ان کے آسودہ لوگ فواحش کر رہے تھے! بچوں عورتوں اور بوڑھوں کی چیخ وپکار خدا کی شفاعت ورحمت کو قطعی نہیں جگا سکتیں، باعثِ جنون یہ ہے کہ وہی بستی کے آسودہ لوگوں کو فواحش کرنے کا حکم دیتا ہے حالانکہ وہ خود کہتا ہے کہ: "قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء (کہدو کہ اللہ بے حیائی کے کام کرنے کا تو حکم نہیں دیتا) سورہ الاعراف، آیت 28 "کوئی بھی عقل یہ کھلا تضاد قبول نہیں کر سکتی کہ ایک باانصاف خدا ہوتے ہوئے وہ فواحش کا حکم کیونکر دے سکتا ہے؟ اور کیا یہ تباہی مچانی ضروری تھی؟ وہ اس کا الٹ بھی تو کر سکتا تھا کہ بجائے بستی کے آسودہ لوگوں کو فواحش پر لگا کر سزا دینے کے انہیں اچھائی پر لگا کر جزا بھی تو دے سکتا تھا؟

منطق کو کون سی دیوار پر ماروں؟

بعرہ اور بعیر

ایمان اور عقیدے کے مسائل کا عقل سے کوئی تعلق نہیں چاہے مذہب کو عقلیانے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کر لی جائیں، اگرچہ بعض مذہب پرست مذہب اور علم کو ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں تاہم یہ مراد حاصل کرنا قطعی ناممکن ہے کیونکہ مذہب کی بنیادیں افسانوی ہیں جبکہ علم انتہائی پختہ بنیادوں پر قائم ہے، اسی طرح مذہب تقدس پر قائم ہے جبکہ علم میں تقدس کی کوئی جگہ نہیں... مذہب میں مطلق سکون وثبات ہے جبکہ علم کسی ثوابت کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ دائمی متغیر پر انحصار کرتا ہے چنانچہ مذہب اور علم کو نا تو یکجا کیا جاسکتا ہے اور نا ہی ان میں کسی طرح سے ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے، اس کے برعکس ہم آہنگی کی یہ کوششیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ مذہب کو اپنے اثبات کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی جواز کی تلاش رہتی ہے کیونکہ علم کے ساتھ تضاد میں رہنے کا مطلب ہے کہ مذہب ہمیشہ عقلی تضاد کا شکار رہے گا اور یوں وہ ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنا رہے گا.

مذہب کو عقلیانے کی مذہب پرستوں کی کوششیں حد درجہ سادہ لوح کوششیں ہوتی ہیں، در حقیقت مذہب کو بنیادی طور پر اس سے زیادہ سادہ لوحی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ علوم کی بے پناہ ترقی کے اس دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو

خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ایسے فرسودہ اور مضحکہ خیز مقولوں پر انحصار کرتے ہیں، ان مضحکہ خیز مقولوں میں عربی کا ایک بڑا مشہور مقولہ ہے کہ "البعرہ تدل علی البعیر "یعنی اونٹ کا فضلہ (بعرہ) اونٹ کی موجودگی کی دلیل ہے، یہ بوسیدہ دلیل پیش کرتے ہوئے یہ حضرات انسان کی آج تک کی ساری علمی و ثقافتی ترقی کو دیوار پر دے مارتے ہیں جس کے ذریعے انسان نے اپنی اُس فرسودہ اور سادہ لوح ذہنیت سے نجات حاصل کر لی ہے جس نے یہ اور ایسے کئی دیگر مقولے ایجاد کیے تھے، دیہاتی بدوؤں کی ثقافت کی عالمِ طبعی سے ابتدائی تعلق نے اس طرح کے مقولے ایجاد کیے جبکہ علم ایسی ذہنیت سے کہیں آگے نکل کر اس سے کہیں پیچیدہ ذہنیتیں تشکیل دے چکا ہے کیونکہ اس کی کائناتی اور عالم طبعی کی فہم تبدیل ہو چکی ہے اور اسے پتہ چلا ہے کہ عالم طبعی علم و معرفت سے عاری ایک دیہاتی بدو کی سمجھ سے کہیں پیچیدہ ہے.

یہ مقولہ اپنی حد درجہ سادہ لوحی کے باوجود مذہب پرستوں کے ہاں کافی مقبول ہے، اگر یہ مقولہ خدا کو ثابت کرنے کے علاوہ کسی اور بات پر پیش کیا جاتا تو اس کی سخت مذمت اور تردید کی جاتی کیونکہ یہ مقولہ بڑی سادگی سے اس خدا کی ذات کی توہین کرتا ہے جسے یہ ثابت کرنے کی سعی کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ نا تو کائنات فضلہ ہے اور نا ہی خدا اونٹ ہے جس نے یہ فضلہ خارج کیا ہے، اس سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ مذہبی ذہنیت کی پراگماٹی Pragmatism ایک مصلحت کے حصول کے لیے اتنے بڑے کھڈے میں گرنا گوارہ کر لیتی ہے..!! بہر حال اس مقولے کو کچھ اعتدال کے ساتھ زیرِ بحث لاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کیا واقعی اونٹ کا فضلہ اس کی موجودگی پر دلیل ہے؟

میں اس مقولے میں وارد ہوئے فضلے اور کائنات، اور اونٹ اور خدا کے درمیان وجہ تشابہ پر بحث نہیں کروں گا، بلکہ اس مقولے کو پیدا کرنے والی ذہنیت کی اس کی اپنی حقیقت حال کے تناظر میں اس پر بحث کروں گا، پھر اسے اس انسانی ذہنیت کو پیش کروں گا جس نے اس کائنات کو چلانے والے قوانین اور عالم طبعی کا مزید گہرا اور پیچیدہ علم حاصل کر لیا ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ مذہب پرستوں کا ایسے مقولوں سے اب تک چمٹے رہنا در اصل ان کی سادہ لوحی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ایسے مقولوں میں اب کوئی جان باقی نہیں رہی.

در حقیقت یہ مقولہ (البعرہ تدل علی البعیر) اونٹ اور اس کے فضلہ کے اخراج کے پیشگی علم پر منحصر ہے یہی وجہ ہے کہ بدو اونٹ کے فضلے (بعرہ) اور دیگر جانوروں کے فضلے میں تفریق کرتا ہے، یہ سادہ سا پوسٹ مارٹم ہی اس مقولے پر قائم کسی بھی منطقی استدلال کو کائنات اور اس کے لیے کسی خدا کی موجودگی جیسے پیچیدہ مسئلے پر جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کافی ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اونٹ کا بعرہ یعنی فضلہ کا اخراج کوئی شعوری عمل نہیں ہے جبکہ کائنات کی تخلیق کے لیے وہ ممکنہ ارادہ اور

شعور درکار ہے جو مومنین کے خیال میں ان کے خداؤں میں موجود ہے، یہ معاملہ بھی اس مقولے سے استدلال کو منطقی طور پر ناقابلِ قبول بنا دیتا ہے.

ایک چھوٹی سی مثال سے اس مقولے کی فرسودگی دیکھتے ہیں، اگر کسی دریا کے کنارے کسی کو ایک بدبودار مادہ ملے تو یقیناً وہ یہی اندازہ لگائے گا کہ یہ مادہ کسی جانور کا فضلہ ہوگا مگر اس شخص کا یہ جاننا ممکن ہے کہ یہ فضلہ کس جانور کا ہے الا یہ کہ اسے پہلے سے ہی پتہ ہو، مگر دریا کے اس علاقے کے لوگ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ فضلہ مثال کے طور پر ایک مگرمچھ کا ہے کیونکہ وہ اس علاقے میں رہتے ہیں اور مگرمچھ کے فضلے کی شکل اور بدبو جانتے ہیں چنانچہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ مگرمچھ کا فضلہ مگرمچھ کی موجودگی کی دلیل ہے یا کچھوے کے انڈوں کی موجودگی کچھوے کی موجودگی کی دلیل ہے مگر یہاں ایک شرط لازم ہے اور وہ ہے پیشگی علم ورنہ دریا کے علاقے کے رہائشی مگرمچھ اور دریائی گھوڑے (Hippopotamus) کے فضلے میں کیسے تفریق کریں گے؟ کیا مومنین کو خدا کا پیشگی علم ہے تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ کائنات خدا کے وجود کی دلیل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی کے پاس بھی یہ پیشگی علم نہیں ہے.

لیجیے جناب یہاں تو رولا ہی ہوگیا اور کائنات کے وجود کے مسئلے پر مومن اور ملحد ایک دوراہے پر آ گئے، دراصل یہاں ہمیں الحادی ذہنیت اور ایمانی ذہنیت کی میکانیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس میں بنیادی مسئلہ یا فرق سوالات وضع کرنے کی ترکیب یا انداز کا ہے، جہاں مومنین یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "کائنات کو کس نے تخلیق کیا؟" وہاں ملحد اس طرح سوچتے ہیں کہ "کائنات کیسے وجود میں آئی؟" کیونکہ "کس" سے سوال کرنے کا مطلب کسی ہستی کی پیشگی موجودگی فرض کرنا ہے جس نے "تخلیق" کا یہ عمل انجام دیا، ملحدین کا مومنین کے ساتھ مسئلہ "کس" لفظ کا نہیں بلکہ عقل وادراک وشعور وارادے کے حامل ایک (یا بہت سارے) خدا کا رینڈم مفروضہ ہے جو اس کائنات کے وجود کے پیچھے کہیں کھڑا ہے چنانچہ جب مومن سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے تو سب سے پہلا سوال جو وہ کرتا ہے وہ ہے "تو پھر کائنات کو کس نے تخلیق کیا؟" جیسے وہ یہ توقع کر رہا ہو کہ آپ اس کے خدا کے علاوہ کسی اور خدا کو فرض کر رہے ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی ذہنیت کو اسی نہج پر پروگرام کیا گیا ہوتا ہے جس کے لیے یہ فرض کرنا لازمی ہوتا ہے کہ کائنات کا لازماً کوئی خدا ہے.

حیرت انگیز طور پر اس مقولے کی علمی تبدیلیوں کے پیشِ نظر ریاضیاتی بنیادوں پر از سرِ نو تشکیل کی گئی ہے جسے سببیت یا علت کا اصول کہا جاتا ہے جو کہتا ہے کہ ہر موجود کا کوئی موجد ہے مگر مذہبی ذہنیت کی کرشمہ سازیاں دیکھیے کہ وہ اس اصول کو اپنی تمام تر کلیات سمیت لاگو کرنے سے انکار کرتے ہوئے خدا کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیتا ہے چنانچہ جب یہ منطقی سوال کیا جاتا ہے کہ "اگر اونٹ کا فضلہ اونٹ کی موجودگی کی دلیل ہے تو اونٹ کس کی موجودگی کی دلیل ہے؟" یا خدا کس کی موجودگی کی دلیل

ہے؟ یا بہت ہی سادہ لفظوں میں "خدا کو کس نے بنایا؟" تو یہاں عقل کو صدمہ دینے والا جواب ملتا ہے کہ جناب خدا ہی وہ واحد چیز ہے جو بغیر کسی موجد کے وجود میں آیا ہے!! مومنین نے اس عام اصول کی اس ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ کلی موافقت اور دوستی اختیار کر رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ملحدین کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ انسان ہی خدا کو تخلیق کرتا ہے ناکہ برعکس، کیونکہ انسان اپنے ارادے اور عقل سے ان تضادات سے اوورٹیک کر جاتا ہے جنہیں ایک ایسی ہستی تھوپتی ہے جس کا کوئی موجد نہیں.

بعض مومنین کا ارشاد ہے کہ جناب خدا سببیت کے قانون سے ماوراء ہے کیونکہ اسی نے اسے تشکیل دیا ہے، تو کیا واقعی کوئی خدا ہے جس نے سببیت کا قانون بنایا ہے؟ کس کتاب یا لوح میں اس خدائی قانون کا ذکر ہے؟ کیا انسان نے اپنی عقل و فکر سے اس قانون کو دریافت نہیں کیا؟ اور کیا اسی انسان نے اس قانون میں تب تبدیلی نہیں کر دی جب اس کی علمی و معرفتی حیثیت بڑھی اور اسے پتہ چلا کہ سبب اور مسبب کے درمیان تعلق ہمیشہ براہ راست نہیں ہوتا بلکہ اتفاق بھی اس تعلق کو پیدا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے؟ مذہب پرستوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ علم کے ساتھ ایک دائمی جنگ میں ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم کفر کا ایک ہتھیار ہے جسے مذہب اور ایمان کو نشانہ بنانے کے لیے خصوصی طور پر تسخیر کیا گیا ہے، مومنین احمقانہ طور پر علم کے تعاقب کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ علم جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کسی ثابت یا مستقل کو نہیں مانتا بلکہ متغیرات کو تسلیم کرتا ہے، اگر آج علم کوئی بات ثابت کر دے تو مومنین فوراً ہی شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ معرفت ان کی مقدس کتابوں میں پہلے سے ہی ثابت شدہ ہے، پھر کچھ دیر بعد سابقہ نظریے سے ایک اور بڑا اور وسیع نظریہ دریافت کر لیا جاتا ہے تب ان کا ردِ عمل زبان کی گردن مروڑنے کی شکل میں سامنے آتا ہے تاکہ مقدس کو نئی معرفت سے ہم آہنگ کیا جا سکے اور اس طرح یہ لوگ مقدس مُتون کے ساتھ یہ شعبدہ بازی کھیلتے رہتے ہیں، یہی خدا کو بناتے ہیں اور یہی اس کا جواز پیدا کرتے ہیں.

مومنین جس چیز سے چمٹے رہنے پر مصر ہیں وہ ایک "وہمی سببیت" ہے جس کی کوئی سند نہیں ہے، یہ سند مومنین خود ہی اپنے ذہن میں تخلیق کرتے ہیں اور یہ یقین کر لیتے ہیں کہ کسی واقعے میں اور ان کے وہمی خدا میں کسی منطقی سببیت کا تعلق ہے اور یہ در حقیقت ایک نفسیاتی مرض کے سوا کچھ نہیں، مثلاً شیزوفرینیا Schizophrenia کا مریض یہ یقین دلا سکتا ہے کہ کوئی ہستیاں یا لوگ اس سے باتیں کر رہے ہیں جبکہ دوسرے لوگ ان ہستیوں کو دیکھنے یا ان کی آوازیں سننے سے قاصر ہوتے ہیں، علم میں نفس میں یہ ایک جانی پہچانی بیماری ہے جو مریض میں بصری اور صوتی وہم پیدا کر دیتی ہے.

اب میں کہہ سکتا ہوں کہ "صحبان" نامی ایک ہستی ہے جو میرے ساتھ میرے کمرے میں رہتی ہے، یہی ہستی بار بار بجلی منقطع ہونے کی وجہ ہے، اسی کی وجہ سے مجھے ایک جلدی بیماری لاحق ہے جس کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر علاج نہ کر سکا، جب جلد پر سے

دھبے ختم ہوتے ہیں تو ممکنہ طور پر "عشبوم" نے مجھے اس عجیب وغریب مرض سے نجات دلائی ہے، اسی کی وجہ سے لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں اور اسی کی وجہ سے مجھے ہر چیز بھولنے لگی ہے، مزید برآں اسی کی وجہ سے بے موسمی برسات ہوتی ہے اور سمندر میں حیرت انگیز طور پر لاکھوں مچھلیوں کی موت کا ذمہ دار بھی وہی ہے جس کی وجہ سائنسدان لاکھ کوشش کے باوجود نہ سمجھ سکے، اور اب میں تمام مومنین وملحدین کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ آئیں اور عقلی یا علمی طور پر مجھے ثابت کر کے دکھائیں کہ یہ "صحجان" موجود نہیں ہے.

یقیناً کوئی بھی اس کی عدم موجودگی ثابت نہیں کر سکتا، اور اگر ایسا ہو جائے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ واقعی موجود ہے؟ کسی چیز کی موجودگی یا غیر موجودگی پر دلیل کا محال ہونا اس کی موجودگی یا عدم موجودگی کے امکان کو یکساں نہیں کر دیتا، اس طرح واقعات کو اس وہمی سبب سے منسلک کرنا آسانی سے ممکن ہے کیونکہ اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، اس کی اکلوتی دلیل دراصل متوہم یا وہم شدہ ہے کیونکہ یہ ایک مریض ذہنیت کا شاخسانہ ہے.. مومنین یہی کچھ کرتے ہیں، وہ اس کائنات کی ہر چیز کے وقوع پذیر ہونے یا نہ ہونے کا سہرا ایک ایسی چیز کے سر ڈال دیتے ہیں جسے وہ خدا کہتے ہیں جبکہ اصل میں وہ اسے ثابت کرنے پر ہی قادر نہیں ہیں.

ایمان عین وہم ہے، ہم شیزوفرینیا کے مریض کو کبھی قائل نہیں کر سکتے کہ جو کچھ وہ دیکھ یا سن رہا ہے اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، اگر ایسی کوئی کوشش کی بھی جائے تو مریض کی حالت جارحانہ ہیسٹیریا میں بدل جاتی ہے اور اسے لگتا ہے کہ لوگ اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں، "یہودی سازش" کا نظریہ اور "اسلاموفوبیا" کی اصطلاح اسی کی تاکید ہے، مغرب جو کچھ بھی کرتا ہے مسلمانوں کو اس میں اسلام کے خلاف سازش نظر آتی ہے اور یوں وہ ہمیشہ ایک دائمی وہم کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں، ان اوہام سے وہ تب تک جان نہیں چھڑا سکتے جب تک کہ وہ عقلیت پسندی سے کام نہیں لیتے جس کا مطلب مقدس مُتون اور شخصیات کا تقدس ختم کر کے ان کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنا ہے تب ان پر اصل حقیقت آشکار ہوگی اور انہیں پتہ چلے گا کہ وہ در حقیقت کسی طویل فکری نیند میں تھے.

مؤمن اور خفیہ شخص

اگر کوئی شخص دن رات آپ کا اس طرح سے پیچھا کرے کہ آپ کی کوئی بھی حرکت یا بات اس سے چھپی نہ رہ سکے تو آپ کی حالت یقیناً دیدنی ہوگی، وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے... کام میں، راستے میں، سفر میں، بیوی یا محبوبہ کے ساتھ سوتے ہوئے حتی کہ بیت الخلاء میں بھی! ہر جگہ اور ہر وقت وہ شخص آپ کے ساتھ ہے، یقیناً آپ اس شخص سے سخت تنگ ہو جائیں گے اور اپنی اس

زندگی سے نفرت کرنے لگیں گے جس میں کوئی پرائیویسی نہیں ہے، شاید آپ یہ تمنی بھی کرتے کہ کاش آپ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے لیکن یہاں بھی مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کا دعوی ہے کہ آپ کی پیدائش بھی اسی کے فضل وکرم سے ہوئی تھی اور یہ کہ اسی نے اپنی مرضی سے آپ کو تخلیق کیا ہے، آپ کے تمام اعضاء آپ پر اس کا فضل وکرم ہیں، بلکہ یہ ساری کائنات ہی اسی نے بنائی ہے چنانچہ اسے آپ پر نظر رکھنے اور آپ پر اپنے قوانین تھوپنے کا پورا پورا حق ہے اور انہی قوانین کے حساب سے ہی وہ آپ کو سزا یا کوئی اچھا صلہ دے گا حالانکہ آپ نے اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ آپ کو تخلیق کرے نا ہی آپ نے اس سے اپنے اعضاء طلب کیے تھے دراصل اس نے آپ سے سرے سے کوئی مشورہ کیا ہی نہیں تھا، نا ہی اس نے آپ سے متعلق اپنے فیصلے آپ کو پیش کیے تھے اور آپ کو یہ اختیار دیا تھا کہ آپ انہیں قبول یا رد کریں، اس پر طرہ یہ کہ آپ نے اسے آپ کو تخلیق کرتے ہوئے نہیں دیکھا نا ہی اس بات کا کوئی ادنی تر ثبوت موجود ہے کہ اس نے یا کسی اور نے آپ کو مبینہ انٹیلی جینٹ ڈیزائن کے ذریعے بنایا ہے، پھر کس حق سے وہ آپ پر اپنا احسان تھوپتا اور آپ سے اطاعت کی امید رکھتا ہے؟!

اب یقیناً اس شخص پر آپ کا غصہ بڑھتا جا رہا ہو گا، مگر آپ عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالتے ہیں اور اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاید آپ اس سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اپنی نجی زندگی بحال کر سکیں، مگر آپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ آپ کو کوئی جواب نہیں دیتا، نا ہی وہ آپ کے سامنے حاضر ہونے کے لیے تیار ہے، اس نے تو بس آپ سے کچھ ایسے لوگوں کے ذریعے بات کرنے پر اکتفاء کیا جنہیں آپ نے نا تو کبھی دیکھا اور نا ہی کبھی سنا اور جو ہزاروں سال پہلے ہی مر کر خاک ہو چکے ہیں، ان لوگوں میں بھی ہر ایک کا یہ دعوی رہا کہ وہی اس شخص کا آفیشل نمائندہ ہے اور دوسروں کے پاس موجود اس کے سارے پیغامات جعلی ہیں، اس طرح اس شخص سے بات کرنے کی آپ کی پہلی ہی کوشش ناکامی سے دوچار ہو جاتی ہے.

اب آپ اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچتے ہیں.. اگر یہ شخص مجھ سے بات کرنے اور میرے سامنے آنے سے انکاری ہے کیوں نا میں اپنی باقی کی زندگی اسے "غیر موجود" تصور کرتے ہوئے گزاروں؟! مگر اس سے پہلے کہ آپ اس پر عمل کریں آپ کے ارد گرد موجود ہزاروں آوازیں بلند ہو کر آپ کو یہ یقین دلاتی ہیں کہ آپ غلطی پر ہیں اور یہ شخص اب بھی آپ کی تمام حرکات وسکنات میں آپ کے ساتھ ہے چاہے وہ آپ کو نظر ہی کیوں نا آئے اور چاہے اس کی موجودگی کا ایک بھی ثبوت دستیاب نہ ہو.. یہ نہ سمجھیں کہ آپ کسی لمحے اکیلے اپنے کسی فیصلے کے مالک ہوں گے.. اگر آپ نے اس کے کسی حکم کی عدولی کی تو وہ آپ کو بھون ڈالے گا.. لیکن اگر آپ نے اس کی بات مان لی تو ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ آپ کو اپنی بھاری رفاقت سے آزاد کر دے گا اور

آپ کو ایک ایسی جگہ پر جہاں کوئی سزا نہیں ہوگی ابدی زندگی جینے کے لیے چھوڑ دے گا، مگر یہ سب بھی کچھ خفیہ مقامات پر ہوگا جنہیں آپ دنیا کی کسی بھی ٹیلی سکوپ سے نہیں دیکھ سکتے.

آپ پھر سے سوچتے ہیں.. اگر وہ مجھے یہیں پر اپنی رفاقت اور خفیہ جزاء وسزا کے بغیر ہمیشہ کے لیے اپنی آزادانہ زندگی جینے دیتا تو اپنا وقت بھی بچاتا اور میرا بھی.. کتنا اچھا شارٹ کٹ ہوتا.. ہے نا.. بہر حال آپ اس کی بات ماننے پر رضامند ہو جاتے ہیں کہ شاید اس سے کوئی افاقہ ہو، یہ شخص جیسا کہ اس کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا، چاہتا ہے کہ آپ اس کے سامنے خود کو ذلیل کریں اور گڑگڑائیں اور اس کے کسی مقدس فیصلہ پر قطعی بحث نہ کریں، آپ کو اپنی زندگی کا ہر صغیرہ وکبیرہ اسی کی مرضی سے جینا ہوگا، آپ کا اس سے تعلق ایک مالک اور غلام کا ہے، وہ بس حکم دیتا ہے اور آپ کا کام بس اس حکم کی بلا چوں وچرا بجا آوری ہے، اب چونکہ آپ نے اس کی اطاعت کا فیصلہ کر لیا ہے آپ اس سب پر کاربند رہنے کی اپنی بھرپور کوشش کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس اطاعت پر اس کی طرف سے کسی ردِ عمل کی کوئی امید نہیں، چاہے آپ یہ احکامات بجالائیں یا نہیں وہ ہمیشہ خاموش اور پوشیدہ رہتا ہے اور آپ کو اپنی رائے یا درجہ بندی کے بارے میں کبھی نہیں بتاتا، مگر آپ کو اس صبر آزما، طویل اور خاموش رفاقت کے بعد مستقبل میں کچھ راحت کی امید ہے تاہم اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں اور تب تک آپ اپنی یہ مادی اکلوتی زندگی اس کے چکر میں تباہ کر چکے ہوں گے جو کہ غالباً آپ کو دوبارہ نہیں ملنے والی.

لیجیے آپ ایک نیک، فرمانبردار، ذلیل، بے ارادہ وبے فیصلہ غلام بننے میں کامیاب ہوگئے، حتی کہ آپ اپنی مجالس اور اپنے آپ کے ساتھ بھی یہ دعوی کرتے ہیں کہ آپ اپنی اس ذلت آمیز صورتحال پر راضی اور خوش ہیں.

اب جبکہ آپ پوری طرح غلام بن کر ایک ایسے شخص کے احکامات کی بجا آوری کر رہے ہیں جس کے بارے میں آپ کو بتایا گیا تھا کہ وہ موجود ہے اور ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے حالانکہ آپ نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نا ہی محسوس کر سکتے ہیں، آپ کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ آپ اس سے منسوب افعال کا جائزہ لیں.. آپ اپنی دعاؤں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا کہ یہ جیسے سنی ہی نہ گئی ہوں.. آپ اپنی زندگی کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم پڑتا ہے کہ یہ قطعی مادی اسباب پر قائم ہے، آپ بطور اس شخص کے ایک فرمانبردار غلام کے اپنا اور اس شخص کے منکر کے درمیان موازنہ کرتے ہیں جو خوشی سے اپنی آزادانہ زندگی جی رہا ہے تو آپ کو ایسا کوئی مادی فرق نظر نہیں آتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آپ اس شخص کے لیے جو کچھ کرتے ہیں اسے پسند آتا ہے.. بلکہ بیشتر اوقات آپ کو اس کے منکر آپ سے زیادہ بہتر حالت میں نظر آتے ہیں، جب آپ اپنے جیسوں سے اس بارے پوچھتے ہیں تو آپ کو بتایا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص اپنے منکرین کو اس دنیا میں دیتا ہے جبکہ وہ پوشیدہ دوسری زندگی محض آپ کے لیے ہوگی جس میں آپ کو ہر طرح کی عیاشی کی اجازت ہوگی.. تاہم یہ تب ہوگا جب آپ

بالکل ہی ایک اور انسان بن چکے ہوں گے جو آپ کی حالیہ صورت سے کہیں بہتر ہوگا حتی کہ جس انسان کو یہ جزاء ملے گی وہ آپ سے بہت ساری چیزوں میں مختلف تقریباً ایک اور انسان ہوگا.

اور اگر آپ نے بغاوت کرنے کی کوشش کی تو ایک خطرناک قسم کا عذاب آپ کا منتظر ہے جو اس شخص نے بڑی بے رحمی سے آپ کے لیے پہلے سے ہی تیار کر رکھا ہے جس میں وہ آپ کو بھونے گا اور جب آپ گل سڑ جائیں گے تو آپ کی جلد تبدیل کر کے آپ کو دوبارہ بھوننا شروع کر دے گا.. یہ مت بھولیں کہ آپ کے ساتھ یہ درندگی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری رکھے گا وہ بھی محض اس لیے کہ آپ نے اس کی بات نہیں مانی تھی، جبکہ آپ کو بھونتے ہوئے آپ کی چیخوں اور بھنے گوشت کی بو سے وہ خوب لطف اندوز ہوگا اور آپ کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے ماتھے پر ایک شکن تک نمودار نہیں ہوگی، وہ آپ کا کوئی بھی بہانہ نہیں سنے گا کہ آپ نے اپنی پیدائش کا انتخاب نہیں کیا تھا اور آپ نے نہ تو اسے دیکھا تھا اور نا ہی اس کی کوئی آواز سنی تھی اور یہ کہ اس کے تمام پیغامات اس قدر پرانے اور متضاد تھے کہ بہت سارے لوگ انہیں لانے کا دعوی کر رہے تھے چنانچہ آپ الجھ گئے، نہ صرف یہ بلکہ علم و منطق بھی ایسے کسی شخص کے وجود کی نفی کر رہے تھے.... مگر آپ کا کوئی بھی عذر کام نہیں آئے گا چاہے کتنے ہی زمانے گزر جائیں.. اس پر متضاد یہ کہ اس نے خصوصی طور پر آپ کو بہکانے کے لیے ایک پوشیدہ ہستی بھی مختص کر رکھی تھی جس کا دن رات کام ہی یہی تھا کہ وہ آپ کو راہ راست سے بھٹکاتا پھرے.. یہ ہستی آپ کو گمراہ کرنے کی بڑی بڑی صلاحیتوں سے لیس تھی... مگر خبردار جو آپ اس کے کسی بہکاوے میں آئے!

مگر ایک چیز ہے جس میں آپ اس کی فرمانبردارنہ کر سکے اور اسے چھپانے میں کامیاب بھی رہے.. اور وہ ہے اس کی محبت اور احترام، آپ اپنی مجالس میں اور شاید اپنے آپ کے ساتھ بھی اس کا دعوی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں، مگر در حقیقت آپ اس سے ڈرتے اور نفرت کرتے ہیں.. آپ کو اس کی ہر وقت کی اس گھٹیار قابت سے نفرت ہے، آپ اس کی ظالمانہ سزاؤں سے ڈرتے ہیں.. حتی کہ اس وقت بھی آپ میرے سامنے اس بات کا اعتراف نہیں کریں گے کیونکہ آپ کو یہ خدشہ ہے کہ کہیں وہ شخص آپ کو دیکھ نہ رہا ہو اور ایک ملحد کے سامنے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر آپ پر سیخ پا نہ ہو جائے... ہے نا؟

اس سے مت ڈریں... بس اس بار اعتراف کر لیں.. کیونکہ میں تو آپ کو بس ایسے ہی کسی خفیہ شخص کے بارے میں بتا رہا تھا..

کوئی بھی شخص..

غیر حقیقی سکاٹ

جمعہ کے ایک مبارک دن کو میں جمعہ کا خطبہ سن رہا تھا، خطیب صاحب اسلامی شریعت میں توبہ اس کی اہمیت اور شرائط پر وعظ فرمارہے تھے کہ اللہ توبہ کرنے والے شخص کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے ماسوائے شرک ہے..! خطیب کا فرمان کچھ یوں تھا: "توبہ نصوح کے بعد مومن کو گناہ اور حرام کی طرف واپس نہیں جانا چاہیے کیونکہ جو مسلمان توبہ نصوح کرتا ہے وہ اہل دین کے محافظوں میں شامل ہو جاتا ہے، مگر جو واپس معصیت کی طرف لوٹ جائے تو اس کی توبہ نامکمل اور غیر حقیقی ہے...." خطیب صاحب کے وعظ کے آخری حصے میں دنیا کا مشہور ترین منطقی مغالطہ موجود ہے جسے مذاہب کے ماننے والے ہزاروں سالوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں اور وہ ہے "غیر حقیقی سکاٹ" کا مغالطہ جس میں کسی اصول یا عقیدے کے ماننے والوں کے کردہ جرائم یہ کہہ کر مسترد کر دیے جاتے ہیں کہ وہ غیر حقیقی مومن ہیں یا انہیں حقیقت کا علم نہیں! چاہے جرم کا تعلق اس عقیدے اور تعلیمات سے کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو.

اس مغالطے کا سب سے بہترین نمونہ تب دیکھنے کو ملا جب رسول ﷺ کے کارٹون منظرِ عام پر آئے اور مسلمانوں نے پوری دنیا میں مظاہرے کرتے ہوئے گاڑیوں، دکانوں غرض کہ جو کچھ بھی ان کے ہاتھ لگا سب کو آگ لگادی اور سفارت خانوں کو نقصان پہنچایا، اس کے بعد جدت پسندی کے عوے دار ٹی وی پر آکر یہ فرمانے لگے کہ یہ لوگ "حقیقی" اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے! یوں قرآن وحدیث کی تعلیمات پر عمل کرنے والا ہر مسلمان غیر حقیقی مسلمان بن گیا اور جو ان تعلیمات سے چشم پوشی اختیار کرے وہ حقیقی اور اچھا مسلمان ہو گیا، ان کے بعد کچھ ایسے لوگ بھی آئے جنہوں نے اس مذہبی جنون کی جسٹیفیکیشن کی کیونکہ حقیقی اسلام کا دفاع اسی طرح ہی ہونا چاہیے!.. یہاں کس پر یقین کیا جائے؟ اس سے قطع نظر کہ ان مسلمانوں کی ایسی جنونی حرکتوں کا حقیقی اسلام سے تعلق ہے یا نہیں، جب تک وہ اس دین سے منسلک ہیں اور خود کو مسلمان کہتے ہیں اور اس کے نام کا پرچم بلند کرتے ہوئے قتل وغارت گری کرتے ہیں تو وہ اس کی ہی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ اس اکثریتی گروہ کو کسی طور مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا جن سے باقی سارے مسلمان ہمدردی بھی رکھتے ہیں، امن کے دعوے دار اس دین کے ماننے والوں سے آئے دن ایسی حرکتیں ایسے ہی نہیں ہو رہیں، وقت آگیا ہے کہ مومنین بھونڈی جسٹیفیکیشن سے باز آجائیں اور دنیا کا کھل کر سامنا کریں کہ ان کا دین ہی سارے عالم میں تباہی، بربادی، تشدد، عدم برداشت کا علمبردار ہے جیسا کہ ان کی حرکتوں سے عیاں ہے.

دنیا ہے امتحان

پرسوں ہی خدا خدا کر کے "القضاء والقدر فی ضوء الکتاب والسنہ" نامی کتاب ختم کی، کتاب انتہائی بور اور منطقی مغالطوں سے پُر تھی کیونکہ ایسے مسائل میں منطق کی ویسے بھی کوئی جگہ نہیں ہوتی، مصنف لکھتا ہے: "تقدیر اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس کے بارے میں اس کے مقرب ترین فرشتے تک نہیں جانتے، اس میں پڑنا جائز نہیں اور نا ہی عقل کے ذریعے اس کی تلاش کرنی چاہیے" تو گویا انہوں نے خود ہی اعتراف کر لیا کہ مذہبی خرافات میں عقل کا کوئی کام نہیں، ظاہر ہے یہ عقل کے سامنے ٹک نہیں سکتیں، اس اعتراف کے باوجود کتاب کا مصنف حیرت انگیز طور پر اس خیال کو عقلیانے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے!!

مصنف لکھتا ہے کہ خدا نے انہیں تخلیق کرنے سے ہزاروں سال پہلے ہی ان کے اعمال لکھ دیے تھے، اس کے بعد انہیں پیدا کیا تاکہ ان کا امتحان لے کر یہ جان سکے کہ کون اچھا ہے اور کون برا..!! منطقی طور پر کوئی امتحان وضع کرنے کی وجہ کسی چیز کی تصدیق کرنا ہوتا ہے، مثلاً اگر میرے پاس پینسل بنانے کی فیکٹری ہو تو یہ جاننے کے لیے کہ کیا میری فیکٹری میں بننے والی پینسلیں معیار کے مطابق ہیں یا نہیں میں ان کی جانچ کے لیے ایک امتحان یا ٹیسٹ وضع کروں گا، کیونکہ مجھے نتائج کا علم نہیں ہے اس لیے مجھے تصدیق درکار ہے، اسی طرح ڈرائیونگ کا بھی ایک امتحان ہوتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ جس شخص کا امتحان لیا جارہا ہے وہ ڈرائیونگ جانتا بھی ہے یا نہیں، مگر خدائی ماڈل میں امتحان کے نتائج پہلے سے ہی معلوم ہیں، خدا پہلے سے ہی یہ جانتا ہے کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں، اسی نے ہی لوگوں کی یہ تقدیر بنائی ہے اور اس کا علم مطلق ہے چنانچہ یہاں خدا کا امتحان کون لے گا؟ کیا وہ اپنا امتحان خود لے! اس کے پیدا کردہ انسانوں کا اس پر کوئی اختیار نہیں لہذا وہ امتحان کے نتائج نہیں بدل سکتے کیونکہ خدا ان کے تمام اعمال ان کے سوچنے سے بھی پہلے جانتا ہے بلکہ ان کے پیدا ہونے سے بھی پہلے.. سارے انسان محض روبوٹس ہیں جو پہلے سے لکھے ہوئے کچھ احکامات پر عمل کر رہے ہوتے ہیں.

یہ یاد رکھیں کہ خدا کے مطلق علم کے اصول میں صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی مخلوق کا مستقبل جانتا ہے بلکہ وہ اپنے خود کے افعال کا مستقبل بھی جانتا ہے..!! یہاں خدا ایک اور مصیبت میں پھنس جاتا ہے، کیا خدا اگر چاہے تو اپنا مستقبل بدل سکتا ہے؟ اگر وہ بدل سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا مستقبل بدلنے سے پہلے ہی اسے علم تھا کہ وہ اپنا مستقبل بدلے گا! اس طرح خدا

منطقی طور پر ناممکن اپنے "مطلق علم" کے جال میں پھنس جاتا ہے.. لگتا ہے خدا کی تقدیر کے جال میں صرف ہم ہی نہیں خود خدا بھی پھنسا ہوا ہے.. اچھی بات ہے نا ..؟

مومنین کی دلچسپ توجیہات کے لیے لازم ہے کہ آپ اپنی عقل کا بلب بجھا دیں اور اسے حقیقت حال سے الگ کر لیں، مگر میں انہیں مختصراً دو حصوں میں بیان کرنا چاہوں گا:

1- دعاء تقدیر کو بدل سکتی ہے اور صدقہ بلاؤں کو ٹال سکتا ہے اس کا مطلب ہے کہ انسان مخیر یعنی بااختیار ہے.
2- تقدیر کئی قسم کی ہوتی ہے، ایک تقدیر کا تعلق وقت سے ہے اور ایک تقدیر کلی ہے جسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا.

پہلی تفسیر "گول منطق" کے مغالطے کا بہترین نمونہ ہے، اگر ہم فرض کر لیں کہ دعاء کرنے یا صدقہ دینے سے خدا تقدیر کو بدل دے گا تو کیا خدا کو آپ کی اس دعاء اور صدقے کا پہلے سے علم تھا یا نہیں؟ یا خدا کو نہیں پتہ تھا کہ آپ دعاء کرنے والے ہیں! مومن کا جواب یقیناً یہی ہو گا کہ جی خدا کو یقیناً علم تھا کہ میں دعاء کروں گا، اس کا مطلب ہے کہ دعاء اور صدقہ آپ کے باقی اعمال کی طرح پہلے سے ہی آپ پر لکھا ہوا تھا، آپ نے یہ دعاء اپنی مرضی سے نہیں کی بلکہ یہ طے تھا کہ آپ نے یہ دعاء کرنی ہے، اور اس طرح ہم پہلے سوال کی طرف واپس چلے جاتے ہیں! اگر کوئی اس بے ہودہ دلیل کا مزید دفاع کرنا چاہتا ہو تو آپ کو اس کی دماغی حالت پر غور کرنا چاہیے.

دوسری تفسیر پہلی سے مشابہ ہے مگر ایک نئے دھوکے کے ساتھ، کتاب کے مطابق مومن فرض کرتا ہے کہ ایک حولی تقدیر ہوتی ہے، ایک کونی، ایک یومی اور ایک معلق تقدیر ہوتی ہے، اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ ساری تقدیریں چاہے ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں "لوحِ محفوظ" پر لکھی ہوئی ہیں... جی ہاں ہر چیز اس لوح پر لکھی ہوئی ہے، شیطان کی بغاوت، آدم کا زمین پر اتارا جانا، تمام انبیاء کی اقوام کی ہلاکت یہ ساری باتیں خدا نے خود ہی لکھیں اور ان کے لیے ایک سینار یو تصنیف کیا تا کہ بعد میں اس کائناتی ڈرامے کا ایک کردار بن سکے!! اب کہیں یہ خدا قومِ عاد پر غصہ کرتا ہوا نظر آتا ہے تو کبھی قومِ ثمود پر برہم ہو رہا ہوتا جیسے اس نے یہ سینار یو خود لکھا ہی نہ ہو! اور اسے پتہ ہی نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے.. جیسے اس لوح پر لکھی ہوئی ساری باتیں اسے بھول گئی ہوں... اور پتہ نہیں خدا کو کسی لوح کی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟ کیا وہ نسیان کا مریض ہے اسی لیے ہر چیز لکھ کر رکھتا ہے؟ اسے یاد کر کے جان کیوں نہیں چھڑا لیتا؟... چلیے منطق کو دیوار پر مارتے ہیں اور ایک استاد اور اس کے شاگرد کی اس گفتگو پر اکتفاء کرتے ہیں:

استاد: سالانہ امتحان کا وقت آگیا ہے مگر میں نے تم سب کے نمبر پہلے ہی لکھ لیے ہیں اور نتائج بھیج دیے ہیں، تم سب فیل ہو.

طالب علم: کیوں سر؟ پھر امتحان کا کیا فائدہ؟ یہ انصاف نہیں ہے.

استاد: انصاف کیسے نہیں ہے، تمہارے پاس پرچہ حل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے.

طالب علم: اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ہم پرچہ حل کریں یا نہیں دونوں صورتوں میں ہم فیل ہی ہیں؟

استاد: تمہیں ان باتوں کا نہیں پتہ لہذا زیادہ سوالات مت کرو اور پرچہ حل کرو لعلکم تعقلون!!

اگلے دن استاد کو پاگل خانے بھیج دیا گیا جہاں خدا پہلے ہی زیرِ علاج تھا.

منہ کالا ما

خیالی دہریوں سے مناظرے کر کے فتح پانا مومنین کی پرانی عادت رہی ہے، تاریخی طور پر یہ بیماری سب سے پہلے امام غزالی کو لاحق ہوئی، اپنی کتاب "تہافۃ الفلاسفۃ" میں امام صاحب ایک خیالی دہریہ گھڑتے ہیں اور پھر اسے اپنے تئیں "چت" کرتے ہوئے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں.. اس سے قطع نظر کہ امام صاحب واقعی اس خیالی دہریے کو چت کر پائے یا نہیں، تاہم ان کے بعد ان کے چیلوں کے ہاتھ ایک "جھنجھنا" ضرور آگیا جسے یہ کسی دہریے کی "بو" سونگھتے ہی بجانا شروع کر دیتے ہیں.. اس طرح ان چیلوں نے اپنے استاد کی طرح ہزاروں نہیں تو کم سے کم سینکڑوں خیالی دہریوں سے ضرور مناظرے کیے اور فتح یاب ہوئے، مگر کیا دہریے کو چت کرنا اتنا ہی آسان ہے؟ ایسے ہی ایک چیلے نے ایک نیا مناظرہ گھڑا ہے جو دنیا کی ادنی ترمنطق تک سے عاری ہے اور پہلے ہی سوال پر ڈھیر کیا جا سکتا ہے مگر نتیجہ جیسا کہ سب جانتے ہیں اور جو کہ پہلے سے ہی طے ہے انہیں اس "خیالی" دہریے پر فتح بھی حاصل ہوئی ہے، مجھے اس بے چارے دہریے سے کچھ ہمدردی سی ہونے لگی ہے کہ بے چارہ جانے کتنی صدیوں سے اس طرح اکیلا ہی ذلیل و خوار ہوتا آرہا ہے، چنانچہ سوچا کیوں نہ لگے ہاتھوں اس مسکین کی کچھ مدد کی جائے، لہذا مومن کے مناظرے کے سیاق کو سباق کو اسی طرح برقرار رکھتے ہوئے ذیل کا مناظرہ پیش خدمت ہے:

(نوٹ: اضافی مکالموں کو سرخ اور نیلے رنگ سے نمایاں کیا گیا ہے)

دہریہ: بہت اچھے یعنی تم مانتے ہو کہ فزکس اور طبیعات کے قوانین تمہارے خدا نے بنائے؟

معصوم مسلمان: جی سر

دہریہ: یعنی تمہارے نزدیک ہر چیز کا کوی نہ کوی خالق موجود ہے؟

معصوم مسلمان: جی سر

دہریہ: اچھا اگر ہر چیز کا خالق ہونا ضروری ہے تو پھر بتاو تمہارے خدا کا خالق کون ہے؟

معصوم مسلمان: سر خدا کو کسی نے تخلیق نہیں کیا وہ ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا

دہریہ: اچھا بتاو ابد کے بعد کہاں جائے گا؟

معصوم مسلمان: سر ابد مخلوق پر ہوتی ہے خالق پر نہیں

دہریہ: (جواب نہ ہونے پر بیزار ہوتے ہوے) اچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہر چیز کا خالق موجود ہو اور خدا کا خالق نہ ہو

معصوم مسلمان: (جواب دیتے، دیتے تنگ آ گیا تو سوال کرنے پر آ گیا) اچھا سر آپ یہ بتائیں کہ کیا مرد کسی بچے کو جنم دے سکتا ہے نو مہینے اپنے پیٹ میں رکھنے کے بعد؟

دہریہ: (سوال سے پریشان ہوتے ہوے) فلحال اسکا ممکن ہونا ناممکنات میں سے ہے، کیونکہ یہ مرد کی صفات کے خلاف ہے

معصوم مسلمان: بس اسی طرح خالق کا تخلیق ہونا ناممکن ہے کیونکہ یہ خالق کی صفات کے خلاف ہے کیونکہ خدا وہ ہے جسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔

دہریہ: اگر خالق کا تخلیق ہونا ناممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز کا کوئی خالق ہو، پھر کائنات کا کسی خالق کی کارستانی ہونا کیوں ضروری ہے؟
معصوم مسلمان: لمبی خاموشی...
معصوم مسلمان: اچھا سر یہ بتائیں کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا کوی خالق نہیں تو یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟

دہریہ:(لمبی لمبی سائنسی بونگیا مارتے ہوئے جو یہ بتاتی ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ خود بہ خود ہر چیز وجود میں آگئی)

معصوم مسلمان: اچھا تو بتائیں پھر گندم خود بہ خود وجود میں کیوں نہیں آتی؟ پاکستان کے گاوں کے لوگوں کی تو بات نہ کریں شہری بجلی کے نہ ہونے سے پریشان ہیں وہ خود بہ خود وجود میں کیوں نہیں آتی؟

بتائیں سڑکیں خود بہ خود وجود میں کیوں نہیں آتی؟

بتائیں کہ کالاباغ ڈیم کیوں نہیں بن جاتا پاکستانیوں کے مسائل حل ہو جائیں؟

دہریہ: کیونکہ انہیں کلاسیکی سببیت درکار ہوتی ہے مگر اب ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز کلاسیکی سببیت کی پابند نہیں ہوتی جیسے الفا پارٹیکلز، اور پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر چیز کا کوئی سبب ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا سے پہلے بھی اس کا کوئی مسبب تھا؟
معصوم مسلمان: سر میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ خدا کو کسی نے تخلیق نہیں کیا وہ ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا
دہریہ: اس طرح آپ کے مفروضے کا پہلا حصہ ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ آپ یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ "ہر چیز" کا کوئی نہ کوئی خالق یعنی مسبب ہے اور پہلے حصے کے ساقط ہونے پر سارا مفروضہ ساقط ہو جاتا ہے.. یا ہم آپ کے مفروضے سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کچھ چیزوں کا واقعی کوئی سبب نہیں ہے اس صورت میں خدا کی بجائے کائنات بے سبب کیوں نہیں ہو سکتی؟ اور چونکہ کائنات موجود ہے اور اسے جانچا جا سکتا ہے چنانچہ اس سے پہلے خدا جیسی تصوراتی چیز کو داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے.
معصوم مسلمان: قبر کی سی خاموشی....
ہنٹر ارام اے...

امتحان اور مساوی مواقع

مؤمنین کا دعوی ہے کہ خدا نے انسانوں کا امتحان لینے کے لیے انہیں تخلیق کیا ہے، تاہم ایسے بہت سارے دلائل ہیں جو اس دعوے کو غلط ثابت کرتے ہیں، مثلاً ایک شخص "ا" ہے جو انڈیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہے، اس گاؤں میں ہندو مذہب کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب ہے ہی نہیں، اس شخص نے کبھی کسی دوسرے مذہب کے بارے میں نہیں سنا چنانچہ یہ شخص ساری زندگی اپنے خاندان کے مذہب پر رہا اور اسی پر مرا، اب ایک شخص "ب" ہے جو سعودیہ کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا، اس کے والدین نے بچپن سے ہی اسے یہی سکھایا کہ اسلام ہی دینِ حق ہے، اس شخص نے بھی کبھی کسی دوسرے مذہب کے بارے میں نہیں سنا اور ساری زندگی اپنے خاندان کے مذہب رہا اور اسی پر دارِ فانی سے کوچ کر

گیا، اور اب ایک شخص "ج" ہے جو ایک بچہ ہے اور یورپ کے ایک دہریہ گھرانے میں پیدا ہوا اور سات سال کی عمر میں ہی مر گیا.

اگر ہم یہ کہیں کہ شخص "ا" جہنم میں جائے گا تو یہ ظلم ہے کیونکہ اس نے زندگی میں ہندو مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کے بارے میں سنا ہی نہیں چنانچہ اسے جہنم رسید کرنا ظلم ہوگا، اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ شخص جنت میں جائے گا تو یہ بھی ظلم ہے کہ ایک کافر ہونے کے ناتے اس نے جنت میں جانے والا کوئی کام کیا ہی نہیں کیونکہ اس کے اسلام قبول کرنے کے امکانات صفر 0٪ تھے اور وہ اسلام کے نقطہ نظر سے کافر ہے، اب اگر اس کا جنت یا جہنم دونوں میں جانا ظلم وزیادتی ہے تو کیا یہ ایک خطرناک تضاد نہیں ہے؟

اگر ہم کہیں کہ شخص "ب" جنت میں جائے گا تو یہ ظلم ہوگا کیونکہ اسے مذاہب کو جانچنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا، وہ محض ایک وراثتی مسلمان تھا اور وہی کچھ کر رہا تھا جو اسے بچپن سے سکھایا پڑھایا گیا تھا چنانچہ اسے جنت میں بھیجنا ظلم ہوگا کیونکہ وہ محض ایک ایسے عقیدے کی وجہ سے جنت میں چلا گیا جو اس پر پہلے سی ہی تھوپا گیا تھا، اور اگر ہم کہیں کہ وہ جہنم میں جائے گا تو یہ بھی ظلم ہوگا کیونکہ اسلام کے علاوہ اس کے کسی دوسرے مذہب کے انتخاب کے امکانات صفر 0٪ تھے.

اگر ہم کہیں کہ شخص "ج" جہنم میں جائے گا تو یہ بھی ظلم ہوگا کیونکہ وہ ایک بچہ ہے اور ابھی اتنا بڑا ہوا ہی نہیں کہ اپنے لیے درست مذہب کا انتخاب کر سکے، اور اگر ہم یہ کہیں کہ وہ جنت میں جائے گا تو بھی ظلم ہے کیونکہ اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جو دوسروں نے جنت میں جانے کے لیے کیا.

قصہ مختصر کہ جو بھی ہندووں کے اس گاؤں میں پیدا ہوا وہ وراثتی ہندو ہے، اسی طرح جو بھی سعودیہ میں پیدا ہوا وہ وراثتی مسلمان ہے... یعنی ہندووں کے گاؤں کے لوگ اس امتحان سے نہیں گزرے جو خدا نے وضع کیا ہے جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اصل میں ایسا کوئی امتحان ہے ہی نہیں کیونکہ ایسے امتحان کے لیے یہ لازم ہے کہ تمام انسانوں کو اس کی خبر ہو، لیکن اگر صرف کچھ لوگوں کو اس امتحان کی خبر ہو اور باقیوں کو یا اکثریت کو نا ہو تو اس کا مطلب ہے کہ خدا کے انصاف کے اصول میں کوئی خلل ہے.

خدا اور طبعی قوانین

مذاہب کے ماننے والوں کا ہمیشہ یہ دعوی رہا ہے کہ خدا نے ہی طبعیات (فزکس) کے تمام قوانین تخلیق کیے ہیں چنانچہ ہمیں یہ سوال نہیں کرنا چاہیے کہ "خدا کو کس نے تخلیق کیا؟"کیونکہ اس صورت میں ہم-قوانین کے خالق اور جن کے لیے قوانین بنائے گئے-میں برابری کر دیں گے.

پہلی نظر میں یہ بات کافی معقول معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر آپ مُقدس مُتون پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ ساری بات بکواسِ محض ہے، کیونکہ طبعیات کے قوانین خدا پر بھی لاگو ہوتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ یہ خدا سے بھی پہلے سے موجود ہیں، اور چونکہ طبعیات کے قوانین خدا کے وجود سے بھی پہلے سے موجود ہیں چنانچہ یہاں ایک اور خالق کا وجود لازم ہو جاتا ہے جس نے خدا اور طبعیات کے قوانین کو تخلیق کیا.

مثلاً قرآن میں ہے کہ:

"اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي ْخَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَال ْاَر ْضَ فِي ْسِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اس ْتَوٰى عَلَى ال ْعَر ْشِ " (سورہ الاعراف، آیت 54)

(کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جلوہ افروز ہوا)
لغت میں "عرش" کا مطلب بادشاہ کا بستر یا کرسی ہے تاہم یہاں کرسی مراد ہے ثبوت کے طور پر سورہ البقرہ کی آیت 255 میں ہے کہ:

"وَسِعَ كُر ْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَال ْاَر ْضَ"
اور "استوی" سے مراد لیٹنا یا بیٹھنا ہے، یعنی قرآن نے خدا کو ایک بادشاہ کے طور پر پیش کیا ہے جو تھکا دینے والے خدائی امور کی انجام دہی کے بعد تھک ہار کر آرام کی غرض سے اپنی کرسی پر جا بیٹھتا ہے، اس سارے قضیے میں سب سے دلچسپ بات خدا کا اس کرسی پر بیٹھنا ہے، اگر خدا طبعی قوانین سے ماوراء ہے تو اسے بیٹھنے کے لیے کرسی کی ضرورت کیوں ہے؟ خدا کا کرسی پر بیٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی قوت ایسی ضرور موجود ہے جو اسے نیچے کی طرف کھینچ کر اس کرسی پر بٹھاتی ہے، اور یہ قوت یقیناً کششِ ثقل ہے.

اگر چہ یہ ثابت ہو گیا کہ کششِ ثقل کے قوانین خدا پر بھی لاگو ہوتے ہیں تاہم اب بھی ایک مشکل سوال باقی ہے، اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کرسی ایک مادی چیز ہے؟ اس سوال کا جواب بھی قرآن میں موجود ہے:

”وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ “(سورہ ہود، آیت 7)

(اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا)

پانی ایک طبعی مادی چیز ہے جو کائنات کے کئی سیاروں کے علاوہ ہمارے اس چھوٹے سے کرہ ارض پر بھی پایا جاتا ہے، عرش کا پانی پر ہونا یا سادہ لفظوں میں پانی کا اس عرش کو اٹھانا اس بات کی بین دلیل ہے کہ خدا کو اٹھانے والا یہ عرش ایک مادی چیز ہے، ویسے بھی اس نتیجے کی ضرورت نہیں کیونکہ کششِ ثقل کا وجود ہی کافی ہے جو عرش کو پانی کی طرف دھکیل رہا ہے، گویا ساتویں آسمان پر بھی کششِ ثقل موجود ہے 😀

”علمائے حق“ کی طرف سے اس مسئلے کے دو ممکنہ جوابات ہو سکتے ہیں، پہلا جواب کچھ یوں ہو سکتا ہے کہ:

”ہم نہیں جانتے کہ کیسے، یعنی ہم جانتے ہیں کہ خدا عرش پر بیٹھتا ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ کیسے اس عرش پر بیٹھتا ہے، خدا کو کسی مخلوق یا مادی چیز سے تشبیہ دینا غلط ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ ”لیس کمثلہ شیء“ (اس کے جیسی کوئی چیز نہیں)“

اس جواب کا جواب پانی ہے، عرش کے پاس پانی کا ہونا اس جواب کے رد کے لیے کافی ہے کیونکہ پانی ایک مادی چیز ہے جس پر طبیعات کے قوانین لاگو ہوتے ہیں، جب قرآن یہ کہتا ہے کہ پانی نے عرش کو اٹھایا ہوا ہے تو اس طرح وہ ایک ایسے مادے کو جس پر طبیعات کے قوانین لاگو ہوتے ہیں معاملے میں داخل کر دیتا ہے، اب ایک طبعی مادی چیز ایک ایسی چیز کو کیسے اٹھا سکتی ہے جو طبیعات یا کائنات سے ماوراء ہے؟

دوسرا ممکنہ جواب وہی گھسا پٹا ہے کہ:

”ہمیں اپنی محدود عقل کو ایسے معاملات میں نہیں الجھانا چاہیے، ہم ایک انتہائی ضعیف مخلوق ہیں جس کی کوئی اہمیت نہیں“

اس کا جواب بھی وہی گھسا پٹا ہے کہ خلقت میں نقص خالق کے نقص کی دلیل ہے، اگر میری محدود عقل نے خدا کے وجود کے مسئلے پر کوئی منطقی تضاد دریافت کر لیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ خدا اپنے آپ تک رسائی کے لیے کچھ چیزیں دستیاب کرنے سے قاصر ہے، میری یہ عقل (مذاہب کے ماننے والوں کے مطابق) خدا کی ایک مخلوق کے سوا کچھ نہیں ہے جسے اس خدا نے اپنا

آپ منوانے کے لیے اپنے بندوں میں ودیعت کی ہے، تو اگر میری عقل اس کے وجود کا ادراک کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو یہ عقل کا نقص ہے جسے خدا نے کچھ مخصوص خواص کے ساتھ بنایا ہے.

تخلیق اور تقدیر

سوال یہ تھا کہ خدا نے ہمیں کیوں بنایا؟ ایک صاحب نے اس سوال کا یوں جواب دیا: "تمہیں یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے، اگر سڑک پر کوئی شخص بغیر کسی معقول وجہ کے تمہارے سر پر کچھ دے مارے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ موجود نہیں ہے؟"

چلیے ان صاحب کی اس منطق کا جائزہ لیتے ہیں، سب سے پہلے تو یہ کہ اگر سڑک پر کوئی شخص مجھے مارے گا تو میں اس کے موجود ہونے اور اس کے اس حملے کا گواہ ہوں گا چنانچہ اس کے وجود پر کبھی بھی شک نہیں کروں گا، مگر تم کہتے ہو کہ خدا نے ہمیں ایسے ہی بغیر کسی وجہ کے بنایا ہے جبکہ ہم اس نام نہاد تخلیق کی گواہی کے لیے موجود نہیں تھے، اس طرح ان صاحب کی یہ مثال حالات کے عدم تشابہ کی وجہ سے آسانی سے ساقط ہو جاتی ہے.

دوسرا یہ کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی وجہ کے مجھ پر حملہ کر دے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ ظالم ہے، اور اگر ہم اس ظالم شخص کو خدا سے تشبیہ دیں گے تو خدا سے انصاف کی صفت ساقط ہو جائے گی کیونکہ وہ بھی ظالم ٹھہرے گا، تو کیا آپ کا خدا ظالم ہے؟

اس طرح سوال وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے کہ انسانوں کو تخلیق کرنے کا خدا کو کیا منطقی فائدہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہمارے پاس دو آپشن ہیں:

اول: خدا کو انسانوں کی ضرورت ہے اس لیے اس نے انہیں تخلیق کیا.

دوم: خدا کو انسانوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود اس نے انہیں تخلیق کیا.

اگر پہلا آپشن منتخب کیا جائے تو خدا سے کمال کی صفت ساقط ہو جاتی ہے جس کے مطابق خدا کو اپنی مخلوقات میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور کمال کی صفت کے ساقط ہونے سے خدا بھی ساقط ہو جاتا ہے.

اگر دوسرا آپشن منتخب کیا جائے تو خدا فضولیا ثابت ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے عقلِ سلیم کے پاس کوئی نہ کوئی منطقی وجہ ہوتی ہے، اگر میں کوئی کمپیوٹر بناتا ہوں تو میرے پاس اسے بنانے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی جیسے اس سے استفادہ حاصل کرنا، یا پھر میں اتنا احمق ہوں گا کہ بلا ضرورت ایک ایسی چیز بناؤں گا جس سے مجھے نا تو کوئی فائدہ ہوگا اور نا ہی اسے استعمال کر کے میں اس سے کسی قسم کا استفادہ حاصل کرنے کی توقع رکھوں گا، اب چونکہ دعوی یہی ہے کہ خدا کو انسانوں کی ضرورت نہیں ہے تو خدا فضولیا ہوا کیونکہ اسے نے بغیر کسی واضح وجہ کے مخلوقات کو تخلیق کیا، اب اگر خدا فضولیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ناقص ہے، اور نقص خدا سے کمال کی صفت کو ساقط کر دے گا، اور کمال کی صفت کے ساقط ہونے پر خدا بھی ساقط ہو جائے گا.

بعض حضرات نے اس مسئلے کا یوں جواب دیا کہ: "ہماری محدود عقل اس مسئلے کے کسی منطقی حل کا ادراک نہیں کر سکتی چنانچہ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو"، اس پر میرا جواب یہ ہے کہ مخلوق میں نقص خالق کے نقص کی دلیل ہے، ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو عقل دی تا کہ وہ اسے اُس تک پہنچنے کے لیے استعمال کرے، اب اگر عقل محدود یا کمزور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے اس تک پہنچنے کے لیے انسان کو یہ محدود اور کمزور عقل دے کر غلطی کی، اگر عقل ہی خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے تو پھر خدا اسے محدود کیوں کرتا ہے اور اس کے سامنے اپنے نا ہونے کے دلائل کیوں رکھ دیتا ہے؟

فرض کرتے ہیں کہ میں نے 200 گیگا بائٹ کی ہارڈ ڈسک بنائی جبکہ میں (قادرِ مطلق انسان ہونے کے ناطے) 500 گیگا بائٹ کی ہارڈ ڈسک بنانے کی استطاعت رکھتا تھا تو کیا 200 گیگا بائٹ کے انتخاب کی کوئی منطقی وجہ ہے جبکہ میں 500 گیگا بائٹ کی ہارڈ ڈسک بنا سکتا تھا؟ یقیناً نہیں، یہاں صرف دو وجوہات ہو سکتی ہیں:

اول: میں 500 گیگا بائٹ کی ہارڈ ڈسک نہیں بنا سکتا اور اس طرح میری کمال کی صفت ساقط ہو جاتی ہے.

دوم: میں قادرِ مطلق ہوں اور 500 گیگا بائٹ یا اس سے زائد کی ہارڈ ڈسک بنا سکتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا، اس طرح میں فضولیا ہو جاتا ہوں کیونکہ میں اس سے اچھی ہارڈ ڈسک بنا سکتا تھا مگر میں نے ایک غیر منطقی سبب کی وجہ سے ایسا نہیں کیا، یہاں قرآن کا یہ قول پیشِ نظر رہے کہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" (کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔) یعنی انسان کی تخلیق وہ سب سے بہترین تخلیق تھی جو خدا پیش کر سکتا تھا!!.

مُسیر یا مُخیر؟

ایک صاحب نے مسیر اور مخیر کے مسئلے کا جواب مندرجہ ذیل مثال پیش کر کے دیا:

"اگر میں اپنے بچے کے سامنے ایک چاکلیٹ اور ایک پتھر رکھ دوں، اور اپنی بیوی کو یہ یقین دلاؤں کہ بچہ چاکلیٹ کا ہی انتخاب کرے گا اور یہ بات کاغذ پر بھی لکھ لوں کیونکہ مجھے پیشگی علم ہے کہ وہ چاکلیٹ کا انتخاب ہی کرے گا، اور بچے نے چاکلیٹ کا انتخاب کیا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اسے چاکلیٹ منتخب کرنے پر مجبور کیا؟"

یہاں ایک بار پھر یہ صاحب غیر منطقی تشبیہ کے مغالطے میں پڑ گئے، اگر آپ اپنے بچے کو چاکلیٹ اور پتھر میں انتخاب کرنے کا موقع دیں تو یہاں آپ بہت ساری باتوں کے پیشِ نظر (جیسے بچوں کا چاکلیٹ کو پسند کرنا) یہ "توقع" کرتے ہیں کہ بچہ چاکلیٹ کا ہی انتخاب کرے گا، یہاں آپ کے "پیشگی علم" کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، کیا ہوا اگر بچے کا پیٹ بھرا ہوا ہو؟ اگر پتھر بچے کی توجہ حاصل کر لے تو؟ یعنی یہاں ایک چھوٹا سا امکان موجود ہے کہ بچہ آپ کی توقعات پر پورا نہ اترے اور پتھر کا انتخاب کر لے، پس یہ ثابت ہوا کہ آپ کبھی بھی بچے کے انتخاب پر 100٪ پُر یقین نہیں ہو سکتے، یہاں فرق صرف یہ ہے کہ چاکلیٹ کے انتخاب کے امکانات 95٪ ہیں اور پتھر کے انتخاب کے امکانات 5٪... مختصراً آپ کا یہ "پیشگی علم" کامل نہیں تھا اور قابلِ تغیر تھا... اس طرح آپ کا دعوی اور حجت دونوں ساقط ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ خدا کا پیشگی علم 100٪ کامل اور نا قابلِ تغیر ہے.

اب میرا آپ سے ایک سوال ہے، میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی خدا کو معلوم تھا کہ میں جہنم میں جاؤں گا، یعنی خدا اپنے مطلق علم کی وجہ سے 100٪ پُر یقین تھا کہ میرا انجام بالآخر جہنم ہو گا چاہے میں کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کر لوں، کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں مُسیر تھا مُخیر نہیں تھا؟

چلیے معاملے کی ایک بار پھر منطقی جانچ کرتے ہیں:

اول: اگر میں مخیر تھا تو اس کا یہ مطلب ہے ہوا کہ خدا کا میرے بارے میں جو پیشگی علم تھا میں اس کے برخلاف جا کر جنت میں جا سکتا ہوں، مگر اس طرح خدا کی مطلق علم کی صفت ساقط ہو جاتی ہے، اور مطلق علم کی صفت ساقط ہو جانے پر خدا ناقص ہو جائے گا، اور خدا کا نقص اسے اور اس کی تمام صفات کو ساقط کر دے گا.

دوم: اب اگر میں مُسیر ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں جتنی بھی کوشش کیوں نہ کر لوں میں وہ نتائج تبدیل نہیں کر سکتا جو خدا نے میرے لیے پیشگی متعین کر رکھے ہیں، اور اگر میں یہ نتائج تبدیل نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا ظالم ہے

کیونکہ اس نے مجھے ایک ایسے انتخاب کی بنیاد پر سزا دی جو اس نے میرے لیے پہلے ہی متعین کر رکھا تھا اور میرا اس کی تبدیلی پر کوئی اختیار نہیں تھا، ظلم کی صفت خدا کی مطلق انصاف کی صفت ساقط کر دے گی جس کے نتیجہ میں خدا کے کمال کی صفت بھی ساقط ہو جائے گی اور کمال کی صفت ساقط ہونے پر خدا ساقط ہو جائے گا۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہاں صرف دو آپشن ہیں، یا تو یہ خدا جاہل ہے (نہیں جانتا کہ میرا انتخاب اور انجام کیا ہوگا) یا ظالم (میرے انتخاب سے پہلے ہی وہ جانتا ہے کہ میں کیا منتخب کروں گا یوں میرے پاس اپنے افعال پر کنٹرول اور ان میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں) دونوں صورتوں میں ایک ایسا تضاد کھڑا ہو جاتا ہے جو خدا کو بری طرح ساقط کر دیتا ہے، آخر میں سورہ انعام کی آیت 111 پیش کرنا چاہوں گا:

وَلَو اَنَّنَا نَزَّلنَا اِلَیہِمُ المَلٰٓئِکَۃَ وَکَلَّمَھُمُ المَوتٰی وَحَشَرنَا عَلَیہِم کُلَّ شَیءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوا
لِیُؤمِنُوا اِلَّا اَن یَّشَآءَ اللّٰہُ وَلٰکِنَّ اَکثَرَھُم یَجھَلُونَ ﴿۱۱۱﴾

اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے گفتگو کرنے لگتے اور ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لاموجود بھی کر دیتے تو بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بات یہ ہے کہ یہ اکثر نادان ہیں۔

معجزہ اور قرآن

اسلامی تاریخ ہمیشہ ان تمام تصورات کو جو پہلے سے متعین کردہ فریم سے نکلنے کی کوشش کرتے تھے ضائع کرتی رہی جس کی وجہ سے بہت سارے مُتون کا انجام نامعلوم رہا جبکہ ان کے مصنفین کا انجام قتل، قید اور ملک بدری کے مابین جھولتا رہا، تاہم تمام وجوہات مذہبی نہیں تھیں جس قدر کہ سیاسی تھیں جو مذہب کی آڑ لیے ہوئے تھیں کیونکہ جیسا کہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اسلام میں تلوار ہمیشہ مذہب کی بنیاد پر نہیں اُٹھائی گئی۔

اگر مسلمان متکلمین اور فلسفیوں کو پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے زیرِ بحث موضوعات بہت جرات مندانہ تھے، انہوں نے ایسے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر آج کے دور میں بات کرنا غالب کے بقول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، دیگر موضوعات کی طرح قرآن کا معجزہ بھی ایک ایسا شجرِ ممنوعہ تھا جسے یہ مسلمان مفکرین زیرِ بحث لائے، اگرچہ اسلامی تاریخ اسے زندقہ قرار دیتی ہے مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ لوگ ان الزامات سے بہت دور اور مبرا تھے کیونکہ وہ اس قدر گہرے موضوعات پر بحث کرتے تھے جو فقہائے دین کے احاطہ فہم سے باہر تھے یہی وجہ ہے کہ ان فقہاء نے اسے اسلامی مملکت کی آئیڈیالوجی کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔

(1)ابن الروندی قرآن پر کہتے ہیں: "اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ فصاحت میں عرب کا کوئی قبیلہ دیگر قبائل سے بڑھ کر ہو، اور اس قبیلے کا کوئی ایک گروہ باقی قبیلے سے زیادہ فصاحت رکھتا ہو، اور اس گروہ میں کوئی ایک شخص باقیوں سے زیادہ فصیح ہو... اب فرض کریں کہ اس کی فصاحت کی شہرت سارے عرب میں پھیل گئی تو عجم پر اس کا کیا حکم ہے جو زبان نہیں جانتے اور ان پر اس کی کیا حجت ہے؟!" اسی سیاق میں ابن الروندی آگے لکھتے ہیں: "تمہارا دعوی ہے کہ معجزہ قائم اور موجود ہے جو کہ قرآن ہے، اور کہتے ہو کہ "جسے انکار ہو وہ اس کے جیسا لا کر دکھائے" تو اگر تم برتر کلام چاہتے ہو تو ہم بلغاء، فصحاء اور شعراء کے کلام سے اس کے جیسا ہزار لا سکتے ہیں جس کے الفاظ اس سے زیادہ رواں، معانی میں بے تحاشا مختصر، ادائیگی اور عبارت میں بلیغ اور تناسق میں باکمال ہوگا، تو اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہم تم سے وہی مطالبہ کرتے ہیں جو تم ہم سے کرتے ہو" ابن الروندی کی بات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہر متن اور مصنف کا اپنا ایک اسلوبی پہلو ہوتا ہے جو اسے باقی لکھاریوں اور تخلیق کاروں سے ممتاز کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر یا مصنف کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے جس کی نقل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، یوں یہ چیلنج دے کر وہ بتا رہے ہیں کہ یہی حجت حریف پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی انسان کسی دوسرے کے جیسی کوئی چیز نہیں لا سکتا(2) کیونکہ تخلیق کی مثال جیسا کہ جابری کہتے ہیں ڈرائینگ، مجسمہ سازی، فلسفہ اور فکر کی طرح ہے جس کی نقل نہیں کی جا سکتی کیونکہ تعریف میں نقل "تخلیق" نہیں ہے(3).

ابو بکر الرازی کا خیال ہے کہ اگر کسی کتاب میں کوئی معجزہ ہے تو اسے دینی کتابوں میں نہیں بلکہ علمی کتابوں میں ہونا چاہیے، اس ضمن میں وہ کہتے ہیں: "واللہ اگر کسی کتاب کا حجت ہونا واجب ہوتا تو وہ انجنیئرنگ اور ریاضی کی کتابیں ہوتیں جن سے افلاک اور سیاروں کی حرکت کا علم حاصل ہوتا ہے، اور منطق اور طب کی کتابیں جن میں بدن کی منفعت کے علوم ہیں یہ کتابیں ایسی کتابوں سے زیادہ حجت کی حقدار ہیں جن سے نا تو کوئی نفع ہوتا ہے نا نقصان اور نا ہی کوئی مستور (پوشیدہ) ظاہر ہوتا ہے (یعنی قرآن)" وہ مزید لکھتے ہیں: "ہم اس سے بہتر شعر، بلیغ خطبے اور خوبصورت رسائل لا سکتے ہیں جو اس سے زیادہ فصیح اور باکمال ہوں گے، قرآن میں ایسا کوئی فضل نہیں ہے، یہ محض کلام کے باب میں ہے".

قرآنی معجزے کا تعلق دو معاملات سے رہا، ایک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ان پڑھ ہونا اور دوسرا اسے تقدس کی چادر میں لپیٹ کر ایک اعلی فنی قیمت دینے کی کوشش کرنا تاہم امیت کا مسئلہ زیادہ اہم رہا کیونکہ اسے متن کی قدر یا ویلیو بڑھانے کے لیے" استعمال" کیا گیا تاکہ اسے انسانی تصنیف نہ کہا جائے تاہم اس زمانے میں امیت کا مطلب ان پڑھ ہونا نہیں تھا اور نا ہی ان پڑھ ہونا کوئی معجزے کی علامت ہے، بلکہ اس کے برعکس پڑھنا لکھنا بلیغ کلام کہنے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے کیونکہ بلیغ باتیں پڑھنے لکھنے سے مشروط نہیں ہیں، عرب کے شعراء اور خطیب بغیر کسی سابقہ تیاری کے شعر کہتے اور خطبے پڑھتے تھے(13) یوں ایک

زبانی ثقافت میں جہاں پڑھنے لکھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی استثناء حاصل نہیں ہے، تو پھر امیت سے معجزے کا قیاس کیسے کیا جائے؟

حوالہ جات:

1- تاریخ الالحاد فی الاسلام، عبد الرحمن بدوی، سینا للنشر، دوسرا ایڈیشن 1993.

2- تاریخ الالحاد فی الاسلام، صفحہ 253.

3- مدخل الی القرآن الکریم، پہلا اڈیشن 2006 صفحہ 83.

4- مدخل الی القرآن الکریم، صفحہ 83.

خدا کی عظمت

عدم کے بطن سے نمودار ہونے والے ایک انتہائی چھوٹے سے نقطے سے اتنی بڑی اور خوبصورت کائنات کا وجود میں آنا حیرت انگیز امر ہے... اس نکتے پر میں اکثر مذہب پرستوں سے اتفاق کروں گا کہ عقل کے لیے ابھی تک ایسی نامعقول بات کا تصور کرنا تقریباً ناممکن ہے... بلکہ مضحکہ خیز طور پر یہ کائناتی تعجب خیزی فرض کرنا اس قدر ناممکن ہے کہ ہمیں اپنے وجود کے آغاز کے نامعقول مسئلے کے حل کے لیے اس سے بھی بڑی نامعقول چیز فرض کرنی پڑ جاتی ہے... بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کہ ہم اس قدر بے وقوف ہیں کہ اس کائنات کو نہیں سمجھ سکتے ہم ایک ایسی قوت کا وجود فرض کر لیتے ہیں جو ہم سے بھی زیادہ ذہین اور اس کائنات سے بڑی ہے جو اس کائنات کے وجود کی وجہ ہے، اور ہٹ دھرمی یہ کہ اوپر سے یہ قوت ہمیں خود اُس پر سوچنے تک سے بھی منع کرتی ہے اور یوں ہم اپنی حماقتوں کی ساری وجوہات اس قوت پر ڈال دیتے ہیں جسے ہمارا ذہین ہونا منظور نہیں... کیا کبھی آپ نے سوال سے بھاگنے کا اس سے بڑا احمقانہ طریقہ دیکھا ہے؟ بات پلے پڑی؟ اگر نہیں تو یوں سمجھتے ہیں:

سلیم: تم نے اس آدمی کو کیوں مارا؟

جاوید: کیونکہ "بابا" نے کہا تھا.

سلیم: بابا نے تمہیں اس آدمی کو مارنے کے لیے کیوں کہا؟

جاوید: بابا کچھ بھی کرنے میں آزاد ہے ہمیں اس سے اس طرح کے سوالات کرنے کا حق نہیں ہے.

سلیم: مگر میں سمجھنا چاہتا ہوں.

جاوید: ہماری عقل ناقص اور چھوٹی ہے چنانچہ ہم جتنی بھی کوشش کر لیں ہم بابا کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتے.

یہ اور ایسے کئی اسباب اور مسببات ہیں جن کے ذریعے اصل جواب سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے ایک ایسا جواب پیش کیا جاتا ہے جو اپنے آپ میں "ناجواب" ہوتا ہے.

جوابات کے اس "گول مول" انداز میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ خدا پر اس قدر کائناتی نقائص اور برائیاں چپکا دیتا ہے کہ ذہنوں میں موجود خدا کا وہ اعلی تصور ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے.. یہ چیزوں اور معاملات کی وجوہات اور مسببات پر ایک انتہائی سطحی فکر ہے جہاں بُری باتوں کو گول مول القاب عطاء کر کے حقیقی جوابات سے راہِ فرار اختیار کی جاتی ہے.. یوں مذہب کی تاریخ نے خدا میں جو خامیاں تخلیق کی ہیں اور جن میں سب سے بڑا کردار مذہب کے ٹھیکے داروں نے ادا کیا ہے، یوں ہیں:

نکما: خدا اس قدر نکما ہے کہ اس کی بہترین تخلیق ایک بے وقوف اور برے جانداروں پر مشتمل ہے جو نہ صرف اس کا ادراک نہیں کر سکتے بلکہ انہیں در پیش مصیبتوں میں سے وہ اس کی حکمت تک نہیں سمجھ سکتے.

محدودیت: خدا آسمان پر کچھ مخصوص مقامات پر موجود ہوتا ہے جیسے عرش اور زمین پر اس کے کچھ چند گھر.

فضولیت: خدا بلا کسی وجہ اور مقصد کے ازل سے موجود ہے اور اچانک ہی وہ بلا وجہ آسمان اور زمین بنانے کا فیصلہ کرتا ہے جس میں نا تو اس کا کوئی فائدہ ہے اور نا ہی اس کی مخلوق کا.

سخت گیری: خدا اتنا سخت گیر ہے کہ اس کی سختی دنیا کے تمام ظالموں، مجرموں اور قاتلوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ وہ بے قصور لوگوں پر ڈھائے جانے والے طبعی و غیر طبعی مظالم خاموشی سے ایک تماش بین کی طرح دیکھتا رہتا ہے اور ذرا بھی جنبش نہیں کرتا.

درندگی: خدا اتنا بڑا درندہ ہے کہ وہ زندہ مخلوق بنا کر انہیں زندگی کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا اور وہ انہیں ہمیشہ کے لیے جہنم میں بھونتا رہتا ہے، حالانکہ وہ اس مخلوق کا دردناک انجام جانتا ہے مگر پھر بھی وہ انہیں تخلیق کرتا ہے.

انتہاء پسندی: خدا اتنا بڑا انتہاء پسند ہے کہ وہ اپنی ساری مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کو برتر قرار دیتا ہے، پھر اس مخلوق میں بھی بعض کو بعض پر برتر قرار دیتا ہے اور پھر ان بعض میں سے کچھ کو ان باقیوں سے برتر قرار دیتا ہے اور یوں انتہاء پسندی کا یہ سلسلہ ادنی تر درجے تک جاری رہتا ہے جس کی وجہ سے تاریخ خون خرابے سے بھری پڑی ہے.

خباثت: خدا خبیث ہے کیونکہ وہ پیدائشی طور پر معذور مخلوق پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ مخلوق ساری زندگی محتاجی اور عذاب میں مبتلا رہتی ہے.

خون خوار: خدا خون خوار ہے کیونکہ وہ ایسی مخلوقات تخلیق کرتا ہے جو ایک دوسرے کو کھا کر زندہ رہتی ہیں.

سطحیت: خدا بہت سطحی ہے، کیونکہ اتنی عظیم کائنات تخلیق کرنے، اور اس قدر پیچیدہ انسان پیدا کرنے کے بعد جو اس کی حکمتوں کو نہیں سمجھ سکتا اسے اس کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور فضول قسم کی باتوں پر سزا دیتا ہے جیسے رفع حاجت، کھانے کی اقسام، بستر پر شریک شخص کی جنس وغیرہ.

عاجزی: خدا اپنی مخلوقات سے بات کرنے سے بالکل عاجز و قاصر ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کچھ ہزار سال بعد وہ ایک نبی بھیجتا ہے جس کے ساتھ اس کا ایک پیغام ہوتا ہے جسے ممکنہ طور پر ہر زمان و مکان کے لیے کار آمد ہونا چاہیے ہوتا ہے مگر وہ پیغام کار آمد نہیں ہوتا چنانچہ وہ دوبارہ ٹرائی کرتا ہے اور کچھ عرصہ بعد ایک اور نبی ایک اور پیغام کے ساتھ دوبارہ بھیجتا ہے اور خدا کی ناکامیوں کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے.

جہالت: خدا مکمل طور پر طبیعات، کیمیاء، طب، جغرافیا، تاریخ، ادب، انسانی آداب و اخلاق سب سے مکمل طور پر ناواقف اور جاہل ہے، اس کی مقدس کتابیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں.

عظمت کا جنون: خدا خطرناک حد تک عظمت کے جنون میں مبتلا ہے، مخلوقات کو تخلیق کرنے کا اس کا واحد مقصد یہی ہے کہ وہ دن رات، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، نہاتے دھوتے بس اس کی تسبیح کرتے اور اسے سجدے کرتے رہیں.

جنس کا عقدہ: خدا ایک مشرقی مرد کی ذہنیت کا حامل ہے جو جنس کے عقدے کا شکار ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ عورت سے جلتا کڑھتا رہتا ہے اور ہر دم اسے نیچا دکھانے اور اسے ڈبوں میں پیک کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، عورت چاہے دنیا کی آخری اعلی ترین ڈگری ہی کیوں نا حاصل کرلے اس کی نظر میں وہ پھر بھی ایک جاہل گنوار بھنگی سے کم تر ہی رہتی ہے کیونکہ وہ ہر حال میں

اپنے ہم جنسوں کو اس سے برتر دیکھنا چاہتا ہے، عورت کے جسم سے تو اسے خاص الرجی ہے جو ذراسا بھی کہیں سے اگر نظر آجائے تو اس کا غصہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتا ہے، ہاں اس کے ہم جنس بھلے چڈی بنیان میں گھومتے رہیں.

غصہ: خدا ہمیشہ غصے میں رہتا ہے، ہر فضول سی بات پر غصے میں اس کا عرش ہلنے لگتا ہے، مثلاً اگر کوئی کسی غلط شخص کے ساتھ ہمبستر ہو جائے تو خدا آپے سے باہر ہو جاتا ہے.

تنہائی: خدا دائمی نزلے کی طرح دائمی ازلی تنہائی کا شکار ہے یوں اس پر پڑنے والے غصے کے دورے اور عذاب دینے کے اس کے مختلف پیچیدہ طریقے سمجھ میں آتے ہیں، جو تنہائی کا شکار ایک بیمار ذہن کی علامت ہیں.

یہ تھیں خدا کی کچھ مختصر بیماریاں جن کا مختلف مذاہب کا خدا شکار نظر آتا ہے، تو میں جتنا مذہب کے ٹھیکیداروں کو ڈھیل دیتی جائیں گی خدا کی یہ بیماریاں اس قدر پیچیدہ ہوتی چلی جائیں گی، چنانچہ میری تمام سچے مؤمنین کو یہ نصیحت ہے کہ اگر آپ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اسے خود تلاش کریں، کسی کو بھی یہ اجازت مت دیں کہ وہ خدا کی صورت بگاڑ کر اسے سونے کی طشتری میں آپ کو پیش کرے، اس طرح خدا حقیقت کی تلاش و جستجو سے عاجز دماغوں کے لیے ایک لذیذ پکوان بن کر رہ جائے گا، اگر خدا موجود ہے اور اسے آپ میں دلچسپی ہے تو اسے آپ کو اپنی پہچان کرانے میں کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے، حقیقت جاننے کے لیے آپ کا سچا ہونا کافی ہے.

پہلی وجہ

کائنات کو تخلیق کرنے والی کسی ہستی کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے مؤمنین کی سب سے پرانی دلیل اولین وجہ یا پہلا سبب ہے جو ارسطو کے فلسفے سے ماخوذ ہے، تاہم ارسطو نے یہ فرض نہیں کیا تھا کہ اولین وجہ خدا ہے، اس نے محض اسے کائنات کے آغاز کا مفروضہ قرار دیا تھا، اگر کوئی برف پر چلنے کی وجہ سے پھسل جائے تو برف اس کے پھسلنے کی وجہ ہوگی اور برف کی وجہ پانی کا جمنا ہے، پانی کے جمنے کی وجہ حرارت کی کمی ہے، حرارت کی کمی کی وجہ سردی کا موسم ہے... اسی طرح سوالات جاری رہیں گے، ہر چیز کسی دوسری چیز کی وجہ ہوگی، اس طرح ارسطو نے فرض کر لیا کہ لازماً ہر چیز کی کوئی نہ کوئی پہلی وجہ ہوگی جس کی وجہ اس سے پہلے کسی وجہ کے بغیر ہوگی یعنی وہ اپنی وجہ آپ ہوگی، اس طرح ارسطو نے سابقہ فلسفیوں کے نظریات کی مخالفت کی جو یہ کہتے تھے کہ کوئی چیز یوں اس لیے ہے کیونکہ وہ محض اس لیے ہے... بہر حال ارسطو نے اس پہلی وجہ کی کیفیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی اور اسے نظر انداز کر دیا حالانکہ اس کے مفروضے کے لحاظ سے یہ پہلی وجہ بنیادی حیثیت کی حامل تھی اور اپنے بعد کے اسباب

سے زمانی طور پر آگے تھی، تاہم اب آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت ہمیں بتاتا ہے کہ زمان کائنات سے الگ نہیں ہے جیسا کہ ارسطو کے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے بلکہ وہ کائنات کا حصہ ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ کسی پہلے سبب کی تسبیب کے لیے وقت کا ہونا لازمی ہے اب چونکہ وقت کائنات کا حصہ ہے چنانچہ کائنات بھی موجود ہے جس سے پہلی وجہ کا مفروضہ اپنے آپ ڈھیر ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات خود خدا سے بھی زیادہ پرانی ہو جاتی ہے!!

بہر حال خدا کو ثابت کرنے کے لیے اس دلیل کو یوں پیش کیا جاتا ہے:

1- ہر موجود چیز کا کوئی نہ کوئی موجد ہے.
2- اگر اسباب کا تعاقب کیا جائے تو ہمارے سامنے دو ممکنات ہوں گی:
ا) یا تو اسباب لامتناہی ہوں گے.
ب) یا پھر کوئی مطلق سبب ہوگا جس کا کوئی سبب نہیں ہوگا.
3- اگر اسباب لامتناہی ہوں تو نتائج کی توجیہ ان کے سبب کے لحاظ سے ہوگی مگر ان اسباب کا مجموعی طور پر کوئی مسبب نہیں ہے اس کے باوجود انہیں کسی مسبب کی ضرورت ہے کیونکہ یہ موجود ہیں (مفروضہ 1 کے مطابق) جس کا حتمی نتیجہ کسی مطلق سبب کا وجود ہوگا (مفروضہ 2ب کے مطابق).
4- اس مطلق سبب کی وجہ کوئی لازم الوجود ہستی ہوگی جسے کسی موجد کی ضرورت نہیں ہوگی جو خدا ہے جس کا مطلب ہے کہ خدا موجود ہے.

یہ حجت یا دلیل کافی مضبوط معلوم ہوتی ہے اور خدا کے اثبات کی اہم ترین دلیل ہے، مگر کچھ فلسفیوں کو اس پر اعتراض ہے..!!

مشہور فلسفی ڈیوڈ ہوم اس حجت پر یوں اعتراض کرتے ہیں:

"ضرورت کے اس مفروضے کے تحت مادی کائنات ہی وہ لازم الوجود ہستی کیوں نہیں ہو سکتی ؟"

دراصل ڈیوڈ ہوم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم اپنے ارد گرد کے وجود اور اس کی ترکیب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ ہمیں کسی غیر مادی ہستی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے جسے ہم ثابت نہ کر سکتے ہوں.

ایک اور مشہور فلسفی ایمانویل کانٹ کا کہنا ہے کہ جب ہم کائنات کے آغاز بارے میں سوچتے ہیں تو یہ پوچھنا لازمی ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟ کیونکہ ہم کسی واقعے کے لیے کسی سبب کے نہ ہونے کو قبول نہیں کر سکتے، اگر کائنات کے آغاز کا مُسبب خدا ہے تو ہم اس سوال سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتے کہ خدا کے وجود کا مُسبب کیا ہے ؟

مشہور ریاضی دان، منطق دان اور فلسفی برٹرینڈ رسل نے اس دلیل کو وقت کا زیاں قرار دیا ہے کیونکہ یہ توہین آمیز حد تک فضول دلیل ہے... رسل کے مطابق دلیل یہ فرض کرتے ہوئے شروع ہوتی ہے کہ کوئی چیز بغیر کسی موجد کے موجود نہیں ہوسکتی اور پھر یہ دلیل یہ ثابت کرتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے!!!

نمرود کی بے وقوفی

جب اہلِ عراق نے شاہ نمرود بن کنعان کو یہ شکایت کی کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے سارے بت توڑ دیے ہیں تو نمرود نے ابراہیم (علیہ السلام) کو بلوا کر کہا کہ:

نمرود: تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟

ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: استغفر اللہ کچھ نہیں...

نمرود نے کہا: یہ کون سا خدا ہے جس کا تم دعوی کر رہے ہو؟

ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: اللہ میرا خدا ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے..

نمرود انہیں کونے میں لے گیا اور کہا: زندگی اور موت میں دیتا ہوں..

پھر نمرود نے دو آدمی بلائے، ایک کو مار دیا اور دوسرے کو معاف کر دیا...

ابراہیم (علیہ السلام) کو کچھ جھٹکا لگا، لیکن وہ گویا ہوئے کہ: میرا خدا سورج کو مشرق سے لاتا ہے تم اسے مغرب سے لاکر دکھادو!!

اب نمرود کو جھٹکا لگا..

پھر کسی وقت ایک آیت نازل ہوئی:

(أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ) سورہ گائے... میرا مطلب ہے سورہ بقرہ

اگر نمرود کے ساتھ ابراہیم (علیہ السلام) کا یہ قصہ درست ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل غیر منطقی تھی بلکہ نمرود گدھا تھا (نمرود بھائی سے معذرت کے ساتھ کہ آپ یقیناً بڑے طاقتور بادشاہ رہے ہوں گے مگر آپ بے وقوف تھے)

ابراہیم (علیہ السلام) کی حجت تھی کہ ان کا خدا سورج کو مشرق سے لاتا ہے آپ اسے مغرب سے لاکر دکھائیں...

ویری گڈ...

نمرود بھائی... آپ نے انہیں یہ کیوں نہیں کہا کہ کیا آپ کا خدا اسے ابھی اسی وقت مغرب سے لاسکتا ہے!!؟

ٹینشن ہوگئی نا...

یو مسڈ اٹ مسٹر نمرود...

اب کوئی فائدہ نہیں... ڈائریکٹر یہی چاہتا تھا کہ: فبہت الذی کفر.

گول منطق

مباحثوں کے منطقی مغالطے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں، میں ان پر غور کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ یہ خدا کا دفاع کرنے والوں کی طرف سے بے دلیل مفروضوں کو ثابت کرنے کے لیے اکثر و بیشتر دہرائے جاتے رہتے ہیں جس کے لیے دلیل کے طور پر گول منطق استعمال کی جاتی ہے، مگر یہ گول منطق ہے کیا؟ سادہ مثال کچھ یوں ہو سکتی ہے:

ب درست ہے کیونکہ ب درست ہے
لیکن اس کی عملی مثال کا نمونہ یوں ہوتا ہے:

سلیم: کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟

جاوید: ہاں

سلیم: کیوں؟

جاوید: کیونکہ اس کا قرآن میں ذکر ہے

سلیم: اور تم قرآن پر یقین کیوں رکھتے ہو؟

جاوید: کیونکہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہے

ایک اور مثال:

جاوید: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اشرف الخلق ہیں

سلیم: تمہیں کیسے پتہ کو وہ اشرف الخلق ہیں؟

جاوید: کیونکہ قرآن میں لکھا ہے کہ وہ اشرف الخلق ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں

سلیم: قرآن کہاں سے آیا؟

جاوید: اللہ کی طرف سے

سلیم: تمہیں کیسے پتہ کہ وہ اللہ کی طرف سے آیا ہے؟

جاوید: کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے

اوپر کی مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جاوید نے ایک چیز کو درست فرض کر لیا ہے تاکہ اسی چیز کو درست ثابت کر سکے! اس طرح اس کی منطق بغیر کسی نتیجے کے گول ہو جاتی ہے اور سلیم کو اس کے پہلے سوال پر واپس لے جاتی ہے، جب بحث زوروں پر ہو تو یہ منطق بڑی پیچیدہ شکل اختیار کر لیتی ہے اور بحث کرنے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کب یہ غلطی کر گیا، اگرچہ یہ منطق انتہائی فضول ہے تاہم کبھی کبھی اسے پکڑنا کافی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ کئی چہرے بدل سکتی ہے، جیسے:

جاوید: نبی جھوٹ نہیں بولتا، اور چونکہ وہ جھوٹ نہیں بولتا اس لیے وہ حقیقت بیان کرتا ہے

ایک اور مثال:

جاوید: آج ناصر بڑا جذباتی ہو رہا ہے
سلیم: وہ کیسے؟
جاوید: کیونکہ وہ غصے میں ہے

اوپر کی دو مثالوں میں محض لفظ بدل کر جاوید نے یہ فرض کر لیا کہ اس نے سوال کا جواب دے دیا یا اپنے مفروضے کو ثابت کر دیا ہے چنانچہ "جھوٹ نہیں بولتا" کی بجائے "حقیقت بیان کرتا ہے" اور "جذباتی" کی بجائے "غصہ"... یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ "وہ جھوٹ نہیں بولتا کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولتا" یا "وہ غصے میں ہے کیونکہ وہ غصے میں ہے" یا پھر "خدا موجود ہے کیونکہ وہ موجود ہے"... یہ منطق گفتگو میں کوئی نئی بات یا نتیجہ شامل نہیں کرتی، یہ محض سوال سے راہِ فرار اختیار کرنے کا ایک طریقہ ہے اور بس..

کائنات اور ابن رشد

شاید میری یہ پوسٹ پڑھ کر کافی لوگوں کو جھٹکا لگا ہوگا کہ اس کا دماغ ""سٹک"" گیا ہے، دل ہی دل میں ملحد تو قرار دیا ہی ہوگا، کفر کا فتوی لگانے کے لیے بھی کچھ لوگوں نے کمر کس لی ہوگی، کچھ کرم فرماؤں نے تو ای میل بھیج کر اپنے ایسے خیالات کا باقاعدہ اظہار بھی کیا، لیکن یہ کوئی نئی بحث نہیں ہے بلکہ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان پرانا ہے، ہماری اسلامی تاریخ بھی ان مباحث سے خالی نہیں ہے، غزالی، ابن سیناء، ابن رشد، الفارابی و دیگر نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے بھی لگائے ہیں، میں نے اپنی مذکورہ پوسٹ میں کہا تھا کہ:

اقتباس:

"""یادرہے کہ قدیم فلاسفروں بشمول مسلمانوں کے ہمیشہ یہی رائے رہی ہے اور انہوں نے دنیا کے قدیم ہونے کا اعتراف کیا ہے لیکن مذہبی تعصب کی وجہ سے وہ بات کو گھماتے رہے"""

لیکن شاید میرے اس نکتے پر کسی نے غور نہیں کیا، اور کریں بھی تو کیسے کریں، کچھ پتہ ہو تو کریں، میں شرط لگا سکتا ہوں کہ پورے بلاگستان میں کسی نے امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد کی تہافت التہافت پڑھی ہو؟ ان کتابوں میں خدا پر ایسے ایسے مباحث ہیں کہ سن کر ماں کے پیٹ میں ہی بچے کے بال سفید ہو جائیں، میری وہ تحریر تو کچھ بھی نہیں، بلکہ میں نے تو ان کے مطالعے سے اخذ کردہ نتائج پر ہی اپنی بات کی تھی، مجھے اندازہ تھا کہ ایسی بات یہاں کسی کو ہضم نہیں ہوگی کیونکہ ہمارے ہاں مذہب کو روایتی انداز میں پڑھنے اور سمجھنے کا چلن ہے جو صدیوں سے ایسے ہی چلا آرہا ہے، ایسے میں اگر کوئی اس ڈگر سے ہٹ کر کوئی بات کہہ دے تو وہ اور اس کی بات دونوں چبھنے لگتے ہیں، ہمارے ہاں صرف ندویوں، تھانویوں، کروڑویوں، ہزارویوں، نانوتویوں، عطاریوں، قادریوں، بریلویوں، چشتیوں، ملنگیوں اور نقویوں کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ہمارے بچوں تک کو ان غداروں کے نام ازبر ہیں، کسی بچے سے ابن بطہ کے بارے میں پوچھ لیں، العز ابن عبد السلام کے بارے پوچھ لیں انہیں کھ نہیں پتہ ہوگا، چنانچہ ایسے وراثتی مسلمانوں سے مجھے بھی کسی طرح کی کوئی امید نہیں ہے، اب چاہے کفر کے فتوے لگائیں یا آکر گولی ماردیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں وہی لکھوں گا جو میرا دل چاہے گا کیونکہ میں آزاد پیدا ہوا تھا اور آزاد ہی مروں گا، میں بلاگنگ صرف اس لیے کرتا ہوں کہ میں بلاگنگ کرنا چاہتا ہوں، میں لوگوں کے لیے نہیں لکھتا، اگر کسی کو میرے خیالات پسند نہیں ہیں تو وہ یہاں تشریف لانے اور تبصرہ کرنے کی زحمت نہ کیا کریں.

تو دنیا کے قدیم ہونے کا خیال کوئی نیا نہیں ہے، ابن رشد کا بھی یہی خیال ہے کہ دنیا قدیم ہے یعنی اس کا کوئی آغاز نہیں ہے اور یہ ازل سے خدا کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے جیسے سورج اور روشنی کا ساتھ، اور وقت میں اس سے (یعنی خدا) پرانی نہیں ہے، خدا کا کائنات سے برتر ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ علت کا معلول سے برتر ہونا جو کہ ذات اور رتبے کی برتری ہے نا کہ زمان کی اور اس کے لیے ان کی دلیل ہے:

1- اگر خدا وقت کے لحاظ سے کائنات سے پرانا ہوتا تو وقت سے پہلے بھی وقت ہوتا جو ناممکن ہے.

2- مطلق قدیم سے کوئی واقعہ رونما ہونا ناممکن ہے.

3- دنیا کا امکان موجود تھا چنانچہ دنیا ابھی تک ممکن الوقوع ہے.

4- ہر واقعے سے پہلے مادہ ہوتا ہے کیونکہ کوئی واقعہ مادے کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوسکتا چنانچہ مادہ قدیم ہے سو دنیا بھی قدیم ہے.

امام غزالی ابن رشد کے دلائل کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر ابن رشد اپنے موقف کا دفاع کرتے ہوئے بڑی مہارت سے ان کے دلائل کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ (امام غزالی) دراصل معاملے کو شکوک وشبہات سے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو مسئلے کو حل کرنے سے قاصر ہے اور خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر فلکیاتی اجسام (سیارے وستارے وغیرہ) کسی ازلی موجود (خدا) کا کام ہے جس کا وجود ماضی کے وقت میں داخل نہیں ہے تو اس کے افعال بھی ماضی کے وقت میں داخل نہیں ہونے چاہئیں !!.

اسی نہج پر چلتے ہوئے ابن رشد کہتے ہیں کہ جس طرح کائنات یا دنیا ازلی ہے جس کا کوئی آغاز نہیں ہے اسی طرح یہ ابدی بھی ہے جس کا کوئی آخر یا خاتمہ نہیں ہے، وہ اس کے خراب اور فناء ہونے کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہمیشہ قائم رہے گی، وہ کائنات کی ازلیت پر مندرجہ بالا دلائل اس کی ابدیت پر بھی لاگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات کی علت معلول ہے اور یہ ازلی ابدی ہے یعنی علت معلول کے ساتھ رہے گی اور یہ کہ اگر علت تغیر پذیر نہ ہو تو معلول بھی نہیں بدلے گا.

اب ایک روایتی مولوی کو ابن رشد کی ایسی باتیں مجذوب کی بڑ لگیں گی کیونکہ وہ یہ ثقیل باتیں ہضم نہیں کر پائے گا، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا اور کائنات ہمیشہ سے ایک ساتھ چلے آرہے ہوں؟ دنیا قدیم کیسے ہو سکتی ہے؟ وقت کیا بلا ہے؟ چنانچہ مولوی پہلا کام یہی کرے گا کہ ابن رشد پر کفر کا فتوی لگا دے گا اور یہی ہوا بھی، ابن رشد پر کفر کے فتوی لگائے گئے، انہیں ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا.

لیکن ابن رشد ایک سچا مسلمان تھا، اس کے فلسفے کی بنیاد صرف منطق پر ہی نہیں کھڑی تھی بلکہ اسے مذہب کا بھی سہارا تھا، اس نے اپنے فلسفے کو قرآن سے بھی ثابت کیا:

(وھو الذي خلق السماوات والأرض في ستة أيام، وكان عرشه على الماء) (سورہ ہود آیت 7)

(اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں اور تھا اس کا تخت پانی پر)

صاف ظاہر ہے کہ اس وجود سے پہلے بھی کوئی وجود تھا جو کہ عرش اور پانی ہے چنانچہ وقت بھی موجود ہے.

(یوم تبدّل الأرض غير الأرض والسماوات) (سورہ ابراہیم آیت 48)

(جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان)

یہاں بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وجود کے بعد بھی کوئی وجود ہو گا.

(ثم استوی إلی السماء وھي دخان)(سورہ فصلت آیت 11)

(پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا)

یہاں پتہ چلتاہے کہ آسمان کو کسی چیز سے بنایا گیا جس کے لیے مادے کا پہلے سے موجود ہونا لازم ہے

یہ اور ایسی کئی قرآنی دلیلوں سے ابن رشد دنیا کے قدیم ہونے کو ثابت کرتے ہیں کیونکہ شریعت میں ایسا کوئی متن موجود نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ خدا مطلق عدم میں موجود تھا!! چنانچہ ابن رشد کے خیال میں دنیا کا قدیم ہونا شریعت کے عین مطابق ہے مخالف نہیں.

مزید بر آں وہ یہ تک کہتے ہیں کہ خدا کلیات جانتا ہے جزئیات نہیں جانتا جو بہر حال اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں ہے.

اس ضمن میں میرا موقف صرف اتنا عرض کرنا تھا کہ جب دنیا قدیم ہے اور مادہ ازل سے موجود ہے تو پھر یہاں خدا کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

آغاز پر بحث

خدا پرست:

کیا خدا ازل سے موجود ہے؟......ہاں

خدا کو کس نے بنایا؟..........کسی نے نہیں

تو پھر خدا کہاں سے آیا؟......(کوئی جواب نہیں)

تو پھر اس کے وجود کی کیا علت ہے؟......وہ ازل سے موجود ہے اور اپنی ذات میں قائم ہے!

مادہ پرست:

کیا مادہ ازل سے موجود ہے؟.......ہاں

مادے کو کس نے بنایا؟............کسی نے نہیں

تو پھر مادہ کہاں سے آیا؟..........(کوئی جواب نہیں)

تو پھر اس کے وجود کی کیا علت ہے؟.......مادہ ازل سے موجود ہے اور اپنی ذات میں قائم ہے!

کسی بھی موضوع پر بات کرنے سے پہلے ہمیں اس کی بنیادی باتوں کو مختصر ہی سہی بیان کرنا چاہیے.

ازل: شاید اس کا مطلب ہے وقت کی لامتناہی مقدار میں موجود ہونا یا وقت کی حدود سے باہر وجود رکھنا.
خدا: ایک غیر مادی اور اپنی صفات میں مطلق عاقل شخصیت جسے اس پر ایمان رکھنے والے ہر موجود چیز کی اصل اور علت قرار دیتے ہیں.
مادہ: ایک غیر عاقل بُلند حرارت و کثافت کا ڈھیر جس کے پھٹنے سے کائنات وجود میں آئی اور اسی سے کچھ خاص ماحول کے بننے سے اتفاق سے زندگی کی سادہ اشکال وجود میں آئیں اور ترقی کرتے ہوئے اس شکل تک پہنچیں جس طرح کہ اب نظر آتی ہیں.

آغاز کا مسئلہ

خدا کے آغاز کا مسئلہ تب کھڑا ہوتا ہے جب ہم اس کے وجود کی علت کا سوال اٹھاتے ہیں، اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہم فرض کرتے ہیں کہ اس خدا سے بھی ایک اعلی مرتبے کا خدا ہے جس نے اس خدا کو بنایا ہے لیکن یہاں ایک اور پُراسرار خدا کا مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے جس نے اس اعلی مرتبے کے خدا کو بنایا جس نے اس مادے کو بنانے والے خدا کو بنایا!! اگر ہم اسی طرح الٹی سمت میں چلتے چلے جائیں تو اس صورت میں ہمارے پاس دو راستے ہوں گے:

یا تو ہمیں کسی ایسی شخصیت کو قبول کرنا ہوگا جس نے اس تسلسل کا آغاز کیا یا پھر الٹی سمت میں اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا جہاں کسی جواب کے ملنے کا کوئی امکان نہیں چنانچہ اس بند گلی سے نکلنے کے لیے ہمیں اس اولین خدا اور اس لامتناہی سلسلے کو مسترد کرنا ہوگا.

لیکن اگر ہم اس اولین خدا کے نا ہونے پر اتفاق کر لیں تو کیا اس طرح لامتناہی تسلسل اور غیر ابدیت کا مسئلہ ختم ہوجائے گا؟

نہیں، بلکہ آغاز کا مسئلہ ایک بار پھر سر اٹھائے گا لیکن مادے کی صورت میں، اب چونکہ ہم اس کے وجود کا انکار نہیں کرسکتے چنانچہ یہ سوال کہ یہ مادہ کہاں سے آیا پوری قوت کے ساتھ ہمارے سامنے ہوگا، تو کیا یہ مادہ اصل میں موجود ہی تھا اور اسے آغاز قرار دیا جاسکتا ہے؟ یا یہ کسی اور طرح کے مادے کا نتیجہ ہے جو بذات خود کسی اور حالت سے تبدیل ہوا اور اس طرح اس مادے تک پہنچا جو پھٹ کر اس کائنات کے وجود کا سبب بنا؟ یہاں امکان جو بھی ہو دونوں صورتوں میں ہمیں ایک ایسی حقیقت کا سامنا ہے جس سے ہم راہِ فرار اختیار نہیں کرسکتے اور وہ ہے کسی مادے کا وجود جو ممکنہ طور پر اصل اور آغاز ہوسکتا ہے.

اب ہمارا ایمان چاہے خدا کی ازلیت پر ہو یا مادے کی آغاز کا مسئلہ پوری قوت کے ساتھ دونوں طرف موجود ہے بس فرق صرف اتنا ہے کہ ہم مادے کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا اس سے روز پالا پڑتا ہے بلکہ ہم بذاتِ خود اس کا حصہ ہیں جبکہ خدا کے وجود کے اقرار کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ وہ — یعنی خدا — غیر مادی ہے.

اب یہاں ایک سوال اٹھتا ہے...

کیا ہمارا اپنی حواسِ خمسہ سے خدا کا ادراک نہ کر سکنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ موجود نہیں ہے؟ یا اس کے ادراک کے لیے کسی اور طرح کے حواس کی ضرورت ہے؟

اگر ہم اس کا ادراک اپنی حواس سے نہیں کر سکتے تو پھر کیسے کر سکتے ہیں؟

میں ان سوالوں کی مزید گہرائی میں نہیں جاؤں گا بلکہ انہیں بحث کے لیے کھلا چھوڑ تا ہوں.

جب ہمیں کوئی سوال درپیش ہو اور باوجود کوشش کے ہم اس کا جواب نہ پا سکیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہماری صلاحیتیں ابھی اتنی نہیں ہیں کہ ہم اس طرح کے کسی سوال کا جواب دے سکیں یا پھر سوال کو ہی دراصل کچھ ترمیم کی ضرورت ہے تاکہ اس کا جواب پا کر ہم اپنے علم و معرفت کی پیاس بجھا سکیں، یہ اقرار کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی آغاز ہے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے راہِ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی اور اس ضمن میں یہ سوال کہ خدا پر ایمان رکھنے والوں کے خدا کو کس نے بنایا یا مادے کو آغاز سمجھنے والوں کے مادے کو کس نے بنایا ایسا ہے جیسا کہ ہم یہ سوال کریں کہ اس آغاز کو کس نے شروع کیا جس سے یہ سارے عدم سے وجود میں آئے!؟ میرے خیال سے یہ سوال فضول ہے کیونکہ ہم اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے سوائے دیقچی میں چمچ گھمانے کے... چنانچہ خدا کے آغاز کے بارے میں جواب نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مادہ ہی آغاز ہے اور اسی طرح اس کا برعکس بھی درست ہے کیونکہ اس سوال کو ہم جس رخ پر بھی گھمائیں ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پائیں گے، سو ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم سوال کے صیغے کو تبدیل کر دیں تاکہ ہم کوئی قابلِ قبول جواب حاصل کر سکیں، کُل کے مصدر کا سوال اس کے بنانے والے کے بارے میں نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا ساخت کے بارے میں ہونا چاہیے، یعنی اگر ہم سوال کا صیغہ بدل کر یہ کہیں کہ یہ مصدر کیا ہے یا اس آغاز کی طبعی صورت کیا ہے تبھی ہم اپنے سوالوں کے جواب پا سکیں گے.

کسی نہ کسی آغاز پر اتفاق کی صورت میں اور اس آغاز کی ساخت کی تلاش کے لیے ہمیں کچھ اختیارات تشکیل دینے چاہئیں جن پر بحث ہو سکے اور جن سے آگے کے راستے کا تعین ہو سکے جو کچھ اس طرح سے ہو سکتے ہیں:

1- ایک عاقل / سمجھدار ازلی شخصیت (خدا) کا وجود جو آغاز کی علامت ہے اور جس نے مادے کو وقت کے کسی خاص لمحے میں بنایا جس سے یہ کائنات اور پھر زندگی کا ظہور ہوا (یعنی مادہ ازلی نہیں ہے).

2- ایک غیر جاندار و غیر سمجھدار ڈھیر کا وجود (مادہ) جو آغاز کی علامت ہے جس سے زندگی کا ظہور ہوا اور کسی سمجھدار ازلی شخصیت کا کوئی وجود نہیں ہے سوائے ان لوگوں کے ذہنوں میں جو اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی خدا موجود نہیں ہے).

3- مادہ اور خدا دونوں ایک ساتھ ازل سے موجود ہیں، یعنی دونوں ازلیت کے حامل ہیں اور ایک ساتھ ہی آغاز کی علامت ہیں یعنی دونوں میں سے کسی نے دوسرے کو نہیں بنایا، ان کے آپس میں کسی طرح کے تعامل کی وجہ سے زندگی وجود میں آئی اور اس حالت تک پہنچی، خیال رہے کہ ان کے آپس کے اس تعامل کی کئی صورتیں اور اختیارات ہو سکتے ہیں لیکن یہ اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں ہے.

اوپر کے تین اختیارات پر بحث کے لیے ظاہر ہے کہ کئی سوالات جنم لیں گے، یہاں پر میں کچھ سوالات ترتیب دینے کی کوشش کروں گا:

1- عدم سے وجود: اگر مادہ غیر عاقل ہے تو بے عقلی سے عقل کہاں سے آگئی؟ اور اگر موت زندگی کی نفی ہے تو زندگی موت سے کیسے آگئی؟ اور روشنی اندھیرے سے کیسے آئی جبکہ اندھیرے کا مطلب روشنی کا فقدان ہے؟

2- مادہ اور عدم: اگر خدا غیر مادی ہے تو اس نے مادی چیزیں کیسے تخلیق کر لیں؟ اور کیا مادے کو عدم سے وجود میں لایا جا سکتا ہے؟

3- مکان کی لامتناہیت: کیا ہماری کائنات کے باہر کوئی حدیں ہیں؟ اگر کائنات پھیل رہی ہے تو یہ کس کھاتے میں بڑی ہوئے جا رہی ہے؟ یعنی ہماری کائنات کے گرد بھی کچھ ہے؟ اور کیا وجود کا حجم لامتناہی ہے اور ہماری کائنات محض اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے؟ کیا مکان کی لامتناہیت (اگر وہ ہے) مادے کی تابع ہے یا کسی اور مصدر کے وجود کی تابع ہے جو اپنے مکان میں لامتناہی ہے؟

4- زمان کی لامتناہیت: کس میں لامتناہی زمان میں موجود رہنے کی صلاحیت ہے؟ خدا یا مادہ؟

5- حرکت اور جمود: کیا آغاز کی صفت حرکت تھی یا جمود؟ کیا زندگی جمود سے ہے یا حرکت سے؟

یقیناً ان سوالات پر بحث کرنے سے مختلف نتائج سامنے آئیں گے، جس میں غور وفکر کرنے والے کی سوچ کا انداز، اس کی منطق اور اس کا ثقافتی پس منظر اہم کردار ادا کرے گا، یہ بات بھی یقینی ہے کہ مفکر کا مذہبی پس منظر بھی ان سوالوں کے جوابات میں کلیدی حیثیت کا حامل ہوگا چنانچہ میں ان سوالوں پر بحث اور غور وفکر کھلی چھوڑتا ہوں بلکہ مزید سوالات شامل کرنے کی بھی دعوت دیتا ہوں کیونکہ موضوع بہت بڑا ہے اور بندہ اور بلاگ بہت چھوٹا 🙂

آخری نقطہ نظر:

آخر میں، میں اپنا نقطہ نظر بھی بیان کرنا چاہوں گا، کوئی اس کا پابند نہیں ہے بلکہ اسے بھی زیر بحث لایا جاسکتا ہے جو کچھ یوں ہے:

بے عقلی اپنا ادراک کر کے عقل کی حالت تک نہیں پہنچ سکتی، اسی طرح لازم ہے کہ زندگی بھی زندگی سے برآمد ہو اور روشنی روشنی سے، مادی دنیا کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ مادہ غیر مادی "چیز" سے برآمد ہو، زمان ومکان کی لامتناہیت میں صرف وہی رہ سکتا ہے جو دونوں لحاظ سے ان سے بھی کہیں زیادہ لامتناہیت کا حامل ہو.

خیر ہے کہ نہیں ہے؟

مذہب اور علم (سائنس) میں ایک تشابہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں واقعات کی تفسیر اور اسباب کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں، گویا کہ مذہب علم کا "تصوراتی" متبادل ہے، لیکن مسئلہ تب کھڑا ہوتا ہے جب مذہب اپنے اور اپنے عقائد کے لیے ایک طرح کے حق یا سچ کا دعوی داغتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ صفت کسی بھی تصوراتی متبادل میں نہیں ہو سکتی؟!

مذہب اور علم کے درمیان اختلاف ختم کرنے کی کوشش در حقیقت مذہب کے دفاع کے لیے کی جانے والی ایک ناکام کوشش ہے، جب بھی مذہب کو اپنے کسی روایتی موقف سے دستبردار ہونا پڑتا ہے یہ کوششیں شروع کر دی جاتی ہیں، اس کا انداز بہت پرانا اور جانا پہچانا ہے جو کسی مسئلے پر جدید علمی موقف اور اسی مسئلے پر مذہبی موقف کے درمیان جھگڑے سے شروع ہوتا ہے جو سالوں بلکہ دہائیوں تک چلتا رہتا ہے جس میں آخر کار علمی نقطہ نظر کی ہی جیت ہوتی ہے، جب یہ نقطہ نظر علمی، ادبی اور عوامی حلقوں میں مقبول ہونا شروع ہو جاتا ہے، تب مذہبی نقطہ نظر کے لوگ کہتے ہیں کہ اصل میں جھگڑے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی

کیونکہ اس اختلاف کا تعلق مذہب کی روح سے نہیں تھا چنانچہ اگر مذہب اپنے اس موقف سے دستبردار ہو جائے تو اس کی روح اور جوہر کو کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن سچ یہ ہے کہ اس طرح کی توجیہات اپنے پیچھے دستبرداریوں کا ایک طویل اور فیصلہ کن سلسلہ لیے ہوئے ہیں جن کی قربانی مذہب کو علم کے ساتھ ہر ٹکراؤ پر دینی پڑی، اگرچہ مذہب کی روح اور جوہر کا یہ فلسفہ بڑا خوبصورت ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مذہب کبھی بھی علم کے ساتھ اپنے کسی بھی جھگڑے میں طویل جنگ کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹا، جدید علمی ثقافت کے دباؤ اور معاشرے کی دورِ جدید کی ضروریات کے سامنے بالآخر مذہب کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑ جاتے ہیں.

علمی اور روایتی مذہبی نقطہ نظر کے درمیان نوری سالوں کا فاصلہ ہے، علمی تحقیق کے نتائج ہمیشہ مذہبی عقیدے سے متصادم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا فیصلہ حتمی ہو جاتا ہے.

قاری کائنات کی تخلیق کا مذہبی نقطہ نظر جانتا ہے کہ کس طرح خدا نے اس کائنات کو کسی مخصوص وقت میں بنایا، قاری کو اولین انسان کا اپنی بیوی کے ساتھ جنت سے نکالا جانا بھی یاد ہوگا جہاں سے انسان کی اس زمین پر تاریخ شروع ہوتی ہے، یہ عین مذہبی عقیدہ ہے کہ خدا اپنی مخلوقات کا خیال رکھتا ہے اور ان کی عبادتیں اور دعائیں سنتا ہے بلکہ کبھی کبھی طبعی نظام میں مداخلت بھی کرتا ہے جنہیں معجزات کا نام دیا جاتا ہے، اور کائنات جب سے اسے خدا نے بنایا ہے ایسی ہی ہے جیسی کہ وہ اب نظر آتی ہے یعنی وہی فلکیاتی اجسام، وہی جانور اور پودے جو روزِ اول سے موجود ہیں جبکہ اس معاملے پر علمی نظریات عدم سے تخلیق کا اعتراف نہیں کرتے اور نا ہی یہ بتاتے ہیں کہ کائنات ابتداء سے ایسی ہی تھی جیسی کہ وہ اب نظر آتی ہے، انگریز عالم اور فلسفی برٹرینڈ رسل نے اس نظریے کو ایک خوبصورت ادبی انداز میں "آزاد آدمی کی عبادت" کے عنوان سے بیان کیا ہے:

A Free Man's Worship

:To Dr. Faustus in his study Mephistopheles told the history of the Creation, saying

The endless praises of the choirs of angels had begun to grow weari-some; for, after " all, did he not deserve their praise? Had he not given them endless joy? Would it not be more amusing to obtain undeserved praise, to be worshipped by beings whom he tortured? He smiled in-wardly, and resolved that the great drama should be .performed

For countless ages the hot nebula whirled aimlessly through space. At length it “ began to take shape, the central mass threw off planets, the planets cooled, boiling seas and burning mountains heaved and tossed, from black masses of cloud hot sheets of rain deluged the barely solid crust. And now the first germ of life grew in the depths of the ocean, and developed rapidly in the fructifying warmth into vast forest trees, huge ferns springing from the damp mould, sea monsters breeding, fighting, devouring, and passing away. And from the monsters, as the play unfol-ded itself, Man was born, with the power of thought, the knowledge of good and evil, and the .cruel thirst for worship

And Man saw that all is passing in this mad, monstrous world, that all is struggling to .snatch, at any cost, a few brief moments of life before Death's inexorable decree And Man said: 'There is a hidden purpose, could we but fathom it, and the purpose is good; for we must reverence something, and in the visible world there is nothing worthy of reverence.' And Man stood aside from the struggle, resolving that God intended harmony to come out of chaos by human efforts. And when he followed the instincts which God had transmitted to him from his ancestry of beasts of prey, he called it Sin, and asked God to forgive him. But he doubted whether he could be justly forgiven, until he invented a divine Plan by which God's wrath was to have been appeased. And seeing the present was bad, he made it yet worse, that thereby the future might be better. And he gave God thanks for the strength that enabled him to forgo even the joys that were possible. And God smiled; and when he saw that Man had become per-fect in renunciation and worship, he sent another sun through the sky, which crashed into Man's sun; and all returned again to nebula. "'Yes,' he ”'.murmured, 'it was a good play; I will have it performed again

رسل کی اس تحریر میں کائنات، زندگی، انسان، مذاہب، عبادتیں اور ان کی ترقی کا علمی اور طبعی نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے، آخر میں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر چیز کا انجام فناء اور عدم ہے اور اس کے بعد کسی جاندار کے لیے کوئی امید نہیں ہے، سب اس بادل سے ہیں اور سب نے اسی بادل کی طرف ہی جانا ہے.

ایک اور موقع پر جب رسل سے پوچھا گیا کہ: کیا انسان موت کے بعد جیے گا؟ تو اس نے انکار میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ: جب ہم اس سوال کو جذباتی کی بجائے علمی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کے جاری رہنے کی کوئی عقلی وجہ دریافت کرنا انتہائی مشکل ہے، مجھے موت کے بعد زندگی کے عقیدے کی کوئی علمی بنیاد نظر نہیں آتی.

اگر اس ٹھنڈے اور کٹھور علمی نظریے کا مقابلہ خوبصورت اور گرما گرم مذہبی نظریے سے کیا جائے تو ہمیں غیبیات، فرشتے، جن، معجزات، عبادتیں کائنات کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہوئی نظر آئیں گی، یہ بات انسان کی تاریخ اور اس کے انجام سے متعلق بھی لاگو ہوتی ہے، جبکہ علمی نظریے کو ایک اور ریاضی دان لاپلاس نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے جب اس نے اپنی کتاب سسٹم آف دی ورلڈ (The Exhibition System of the World) نپولین کو تحفتاً دی تو نپولین نے اس سے پوچھا کہ: "تمہارے نظام میں خدا کون سے مقام پر ہے؟" تو لاپلاس نے جواب دیا کہ: "خدا ایک ایسا مفروضہ ہے جس کی مجھے اپنے نظام میں ضرورت نہیں ہے". تو پھر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں جب ہم دو صدیاں پہلے نیتشے کو یہ اعلان کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ خدا مر گیا ہے، کیا ہم انکار کر سکتے ہیں کہ وہ خدا جو یورپ میں مر گیا کیا دوسری جگہوں پر علمی ترقی کے نیچے دب کر آخری سانسیں نہیں لے رہا؟ یقیناً جب ہم کہتے ہیں کہ خدا مر گیا ہے یا مرنے والا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قوموں کے ضمیر سے مذہبی عقائد ختم ہو گئے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ کائنات کی ساخت کے حوالے سے انسان نے جو علمی دریافتیں کی ہیں وہ ساری کی ساری خدا کے ذکر سے خالی ہیں بالکل جس طرح لاپلاس کہتے ہیں.

پھر بھی دفاعی مورچے سے ایک آخری آواز ضرور بلند ہوتی ہے جو کہتی ہے کہ: مادے کے بارے میں علمی نظریات کو مان بھی لیا جائے تب بھی کائنات کے ابتدائی مصدر کا مسئلہ برقرار رہے گا... رسل کی بات مانتے ہوئے ہم فرض کرتے ہیں کہ کائنات ایک بادل (Nebula) سے شروع ہوئی مگر علم ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ یہ بادل کہاں سے آیا اور نا ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ ابتدائی مادہ کہاں سے آیا جس سے ہر چیز نے ترقی کی؟ چنانچہ یہاں پر لازم ہے کہ علم کو مذہب سے رابطہ کرنا چاہیے، لیکن سوال کو اس طرح سے پیش کرنا دراصل یہ بتاتا ہے کہ ہماری سوچ پر ہماری مذہبی تربیت کا کس قدر اثر ہے، تھوڑی دیر کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ خدا نے ہی وہ پہلا مادہ بنایا تو کیا اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ کیا اس مفروضے کو تسلیم کرنے سے پہلے بادل کے مصدر کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ نہیں!! آپ پہلے بادل کے وجود کی علت کا سوال اٹھاتے ہیں اور جواب

دیتے ہیں کہ یہ خدا ہے، اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خدا کے وجود کی علت کیا ہے؟ یہاں آپ کا جواب وہی جانا پہچانا ہے کہ خدا کا وجود غیر معلول ہے، یہاں میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم یہ کیوں فرض نہیں کر لیتے کہ پہلے مادے کا وجود غیر معلول ہے جس سے بحث بھی ختم ہو جائے گی اور ہمیں غیبیات اور روحانی قسم کی مخلوقات سے رجوع بھی نہیں کرنا پڑے گا جن کا وجود ہم ثابت نہیں کر سکتے؟ یاد رہے کہ قدیم فلاسفروں بشمول مسلمانوں کے ہمیشہ یہی رائے رہی ہے اور انہوں نے دنیا کے قدیم ہونے کا اعتراف کیا ہے لیکن مذہبی تعصب کی وجہ سے وہ بات کو گھماتے رہے، در حقیقت ہمیں کائنات کے ابتدائی مصدر کے حوالے سے انتہائی انکساری سے اپنی کم علمی کا اعتراف کر لینا چاہیے، جب آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ خدا ہی پہلے مادے کے وجود کی علت ہے جس پر یہ ساری کائنات مشتمل ہے، اور میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خدا کے وجود کی علت کیا ہے تو سب سے بڑا جواب جو آپ مجھے دے سکتے ہیں وہ ہے: "نہیں معلوم، بس خدا کا وجود غیر معلول ہے" اسی طرح جب آپ مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ پہلے مادے کے وجود کی علت کیا ہے تو سب سے بڑا جواب جو میں آپ کو دے سکتا ہوں وہ ہے: "نہیں معلوم، بس مادے کا وجود غیر معلول ہے"، یعنی آخر میں فریقین نے چیزوں کے پہلے مصدر پر اپنی کم علمی کا اعتراف کر لیا بس فرق صرف اتنا ہے کہ آپ نے مجھ سے ایک مرحلہ بعد اعتراف کیا اور معاملے میں غیبی عناصر داخل کر دیے جن کا مسئلے کے حل میں کوئی کردار نہیں ہے.

تو خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ مادہ قدیم ہے جدید نہیں ہے اور خدا بھی قدیم ہے جدید نہیں ہے تو اس طرح گویا ہم نے اعتراف کر لیا کہ ہم چیزوں کے پہلے مصدر کے بارے میں نا تو جانتے ہیں اور نا ہی جان سکتے ہیں، چنانچہ بہتر یہی ہے کہ بجائے الٹے سیدھے راستے اختیار کرنے کے ہم اپنی جہالت کا براہ راست اعتراف کر لیں، دنیا کی کسی بھی عدالت میں کسی بھی معاملے کے اثبات یا نفی کے لیے فیصلہ تب تک معلق رہتا ہے جب تک کہ قطعی ثبوت دستیاب نہ ہو جائیں اور خدا کو اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے ایسے ثبوتوں کی اشد ضرورت ہے، حقیقت کی سنجیدہ تلاش میں یہ فکری دیانتداری کی کم سے کم حد ہے.

کائناتی سوالات

اس کائنات کے کسی خدا کے وجود کی اثبات یا نفی کے لیے پیش کیے جانے والے دلائل میں کچھ منطقی سوالات کسی حد تک کائناتی بھی ہوتے ہیں جنہیں اس ماورائی طاقت کی نفی کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے اور بہت کم لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے سوالات نا تو خدا کے وجود کو ثابت کر سکتے ہیں اور نا ہی نفی.

پہلا سوال: اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے تو پھر یہ کائنات اتنی بڑی کیوں ہے؟ یعنی اس نے اس کائنات کو انسان کے حجم سے متناسب کیوں نہیں بنایا جس کے لیے صرف ایک نظامِ شمسی یا صرف ایک کہکشاں ہی کافی تھی؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہم فرض کرتے ہیں کہ کائنات بہت چھوٹی ہے، یعنی ایک نظامِ شمسی یا ایک کہکشاں پر مشتمل ہے، اس صورت میں یہ سوال کیا جاتا: اگر خدا اتنا ہی طاقتور ہے تو اس کی کائنات اتنی چھوٹی کیوں ہے؟

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات چھوٹی ہو یا بڑی، خدا کا انکار کرنے والے اس کے حجم کو ہمیشہ اس کے وجود کی نفی کے لیے ہی استعمال کریں گے جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کا حجم خدا کے نا ہونے کی دلیل نہیں ہے اگرچہ یہ اس خدا کی صلاحیتوں کی ایک مثال ضرور ہے.

دوسرا سوال: اگر انسان ہی زندگی کی علامت ہے جسے کائنات کے اس انجینئر نے بنایا ہے تو اتنی بڑی کائنات میں اس کی حیثیت ایک ذرے کی سی کیوں ہے؟

یہ سوال کافی منطقی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں کائنات کے مقابلے میں انسان کے حجم کا اور خدا کے ہونے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

اگر انسان کا حجم کسی سیارے کے برابر ہوتا تو کیا اس سے خدا کا وجود ثابت ہو جاتا؟ اور پھر یہ کہ انسان کی اہمیت کائنات کے مقابلے میں اس کے حجم میں نہیں ہے بلکہ اس کی ذات میں ہے چنانچہ انسان کا حجم خدا کے ہونے یا نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے.

تیسرا سوال: اگر خدا موجود ہے تو آخر میں وہ کائنات کو تباہ کیوں کر دے گا؟

اب مجھے نہیں پتہ کہ اس سوال کا خدا کے ہونے سے کیا تعلق بنتا ہے؟ ہمیں کیا اگر وہ اسے قائم رکھنا چاہے یا اسے ختم کر کے کوئی دوسری کائنات بنانا چاہے؟ اور کیا اس سے خدا کے وجود کی نفی ہوتی ہے؟

بہر حال.. اس قسم کے سوالوں میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ بے محل استعمال کیے جاتے ہیں، اس قسم کے سوالات کو خدا کی سوچ (بہت چھوٹے سے انسان کے لیے اتنی بڑی کائنات کیوں بنائی) اور اس کی صلاحیتوں پر بحث کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے بشر طیکہ ہم اس کے وجود پر متفق ہوں، لیکن کسی طور بھی انہیں اس کے وجود کی نفی یا اثبات کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا.

خدا اور برائی

کیا خدا برائی کو روکنا چاہتا ہے مگر روک نہیں سکتا؟ اس صورت میں وہ قادرِ مطلق نہیں ہے!!
کیا وہ روک سکتا ہے مگر نہیں چاہتا؟ اس صورت میں وہ برا ہے!!

یا تو خدا برائی کو روکنا چاہتا ہے لیکن روکنے کی استطاعت نہیں رکھتا، یا وہ روک سکتا ہے مگر روکنا نہیں چاہتا، یا پھر وہ ناہی روک سکتا ہے اور ناہی روکنا چاہتا ہے۔

اگر وہ برائی کو روکنا چاہتا ہے مگر روکنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو اسے قادرِ مطلق نہیں کہا جا سکتا!
اگر وہ برائی کو روک سکتا ہے مگر روکنا نہیں چاہتا تو پھر یقیناً وہ برا ہے!

لیکن اگر خدا برائی کو روک سکتا ہے اور روکنا بھی چاہتا ہے تو پھر دنیا میں برائی کیوں ہے؟

یہ معاملہ واضح طور پر برائی کی ساری ذمہ داری خدا پر ڈالتا نظر آتا ہے جیسے وہی ازل سے لے کر آج تک تمام تر برائیوں کا ذمہ دار ہو، تاہم میرے خیال میں یہاں ایک گمشدہ کڑی ہے جسے زیرِ بحث لانا چاہیے اور وہ ہے ذمہ داری، چنانچہ یہ لازم ہے کہ انسان کی پیدا کردہ برائیوں اور طبعی، ماحولیاتی اور ہماری ارد گرد کی کائنات کی پیدا کردہ برائیوں میں فرق کیا جائے۔

جہاں تک انسان کی پیدا کردہ برائیوں کا تعلق ہے جیسے جنگیں، قتل وغارت، ظلم اور جو بھی برائی کی دیگر صورتیں ہیں، ان برائیوں کی ساری ذمہ داری خدا پر ڈال دی گئی ہے حالانکہ ان برائیوں کا ذمہ دار انسان ہے خدا نہیں لیکن انسان کو اس طرح بری کر دیا گیا ہے گویا وہ بالکل معصوم ہو، چنانچہ یہ لازم ہے کہ ان برائیوں کے حقیقی ذمہ دار کا تعین کیا جائے اور اس سے اخلاقی جواب طلبی کی جائے جو میرے خیال میں انسان ہے خدا نہیں۔

لیکن یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو وہ برے انسان کو برائی کرنے سے روک کر شر کو ختم کیوں نہیں کرتا؟ یہاں مجھے ایک فلم کا قصہ یاد آتا ہے جس کے آخر میں ایک باپ اپنے برے بیٹے کو قتل کر کے اس کی لاش پر رو رہا ہوتا ہے اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کہہ کر بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے برے بیٹے کو اس لیے مارا تا کہ اس کے اندر موجود برائی کو مارا جا سکے، یہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدا اس دنیا میں موجود برائی کو ختم کرنا چاہے.. یہ مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ برائی انسان کا

ایک حصہ ہے تو خدا کو چاہیے کہ وہ اس برے انسان کو ختم کر دے، اگر خدا "چھانٹی" کا یہ عمل شروع کر دے تو میرے خیال میں نتائج کچھ یوں ہوں گے:

-اگر سارے نہیں تو زیادہ تر انسانوں کو ختم کرنا پڑے گا تا کہ ان کے اندر موجود برائی کو ختم کیا جاسکے۔
-خدا کا یہ فعل یہ ثابت کرے گا کہ وہ انسان کے جینے کے حق کا احترام نہیں کرتا جو ممکنہ طور پر اسی نے ہی اسے بنا کر یہ زندگی دی ہے۔
-اس طرح وہ انسان کی اصلاح کا آپشن کھو دے گا جو بہر حال قتل اور "چھانٹی" سے بہتر ہے۔

لیکن یہاں بھی ایک سوال اٹھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اب تک انسان کی اصلاح کیوں نہیں کی؟

میرے خیال سے انسان کی اصلاح کا عمل اس کی مرضی سے ہونا چاہیے، خدا کو ہم پر یہ تبدیلی نہیں تھوپنی چاہیے ورنہ وہ یہ ثابت کرے گا کہ وہ ایک ڈکٹیٹر ہے اور ہماری پرائیویسی اور حیثیت کا احترام نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں ہماری حیثیت پہلے سے پروگرام شُدہ مخلوق سے زیادہ نہیں ہوگی۔

تو اے دنیا والو! انسان کی برائی اس بات کی دلیل ہے کہ خدا نے اسے جو آزادی دی ہے وہ اس کا احترام کرتا ہے، خدا کا وجود ہی دراصل انصاف کی ضمانت ہے، کیونکہ خدا کے بغیر کسی مطلق انصاف کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اب آتے ہیں طبعی اور ماحولیاتی برائی کی طرف، اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ طبعی مسائل اور آفتیں انسان کے ان قدرتی وسائل کے غلط استعمال کی وجہ سے آتی ہیں، اس طرح انسان جزوی طور پر ان آفتوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار ہے لیکن کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا بھی باقی ماندہ قدرتی آفات کا ذمہ دار ہے؟

اس سے پہلے کہ ہم اس خدا پر الزام لگائیں اور باقی ماندہ طبعی آفات کو اس کے گلے فِٹ کریں ہمیں ان باتوں کو مدِ نظر رکھنا ہوگا:

-جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ ایک واحد اکائی ہے جو کچھ طبعی قوانین کی پابند ہے اور متغیرات سے متاثر ہوتی ہے، سائنس کی ترقی کے بعد اب کوئی اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ آفتیں انسان پر خداؤں کا غصہ ہیں، آج ہر کوئی جانتا ہے کہ دنیا کچھ قوانین کی پابند ہے اور ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے اور یہ کہ ایسی زیادہ تر آفتیں قدرتی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہیں، لیکن مسئلہ تب ہوتا ہے جب ایسی آفتیں انسانی آبادی کے علاقوں میں واقع ہوتی ہیں جیسے زلزلے وغیرہ۔

-بطور انسان ہمارے لیے موت ہر چیز کا خاتمہ ہے، وجوہات چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہوں موت ایک ہی ہوتی ہے، جبکہ خدا کے لیے موت انسان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک بعد سے دوسرے بعد میں منتقل ہونا ہے چنانچہ انسان اپنی زندگی مکمل ضرور کرتا ہے لیکن ہمارے جانے پہچانے بعد میں نہیں بلکہ خدا کے بعد میں جسے ہم نہیں جانتے اور جو میرے خیال سے خدا کی کسی برائی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا.

میں خاتمہ اسی منطق سے کرنا چاہوں گا جس منطق سے میں نے آغاز کیا تھا لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ:

کیا انسان برائی کو روکنا چاہتا ہے مگر روک نہیں سکتا؟ اس صورت میں وہ عاجز ہے!
کیا انسان برائی کو روک سکتا ہے مگر روکنا نہیں چاہتا؟ اس صورت میں وہ برا ہے!

اگر انسان برائی کو روکنا چاہتا ہے مگر روک نہیں پاتا تو وہ یقیناً عاجز ہے چنانچہ اسے ایک قادرِ مطلق خدا کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس برائی کے خلاف اس کی مدد کر سکے!

اگر انسان برائی کو روک سکتا ہے مگر روکنا نہیں چاہتا تو وہ یقیناً بُرا ہے اور اس صورت میں بھی اسے ایک قادرِ مطلق خدا کی ضرورت ہے جو اس کی اصلاح کرے اور اسے برے سے اچھے میں تبدیل کر سکے!

لیکن اگر انسان اصلاح اور تبدیلی سے انکاری ہو تو خدا کیا کر سکتا ہے؟؟

خدا اور طبعی آفات

کیا خدا کے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ طبعی یا انسانی آفات وقوع پذیر نہ ہوں؟ جیسے زلزلے، لاؤوں کا پھٹنا، طوفانوں کا آنا، بجلی کا گرنا، شہابیوں کا گرنا، جنگیں، بھوک، بیماریاں وغیرہ؟

یعنی، کیا ان آفتوں کا ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس مادی دنیا کے پس پردہ کوئی ایسی شخصیت سرگرم عمل نہیں ہے جسے خدا کہا جائے؟

یہاں میرا موضوع گفتگو اس خدا کی طاقت اور صلاحیتیں نہیں ہیں بلکہ خدا، قدرتی آفتوں اور سائنس کے قوانین کا آپس میں تعلق ہے.

قدیم زمانوں میں انسان نے ان آفتوں کی توجیہ تلاش کرنے میں بڑی محنت کی، کبھی اسے گماں گزرا کہ ان آفات کا سبب خداؤں کی آپس میں جنگ ہے، تو کبھی اسے لگا کہ خداؤں نے اس پر اپنا غصہ اتارا ہے اور اسے سزا دی ہے، اس وقت اسے خبر نہ تھی کہ کائنات دراصل کچھ علمی قوانین کے تحت چل رہی ہے جنہیں اس نے آگے جا کر دریافت کرنا ہے.

آج انسان جانتا ہے کہ زلزلے دراصل زمین کی پرتوں کے پھسلنے کی وجہ سے آتے ہیں، بجلی کا گرنا محض ایک ڈسچارج کا عمل ہے وغیرہ.. آج انسان پہلے سے کہیں زیادہ قدرتی آفات کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ان کی پیش گوئی کرنے اور ان کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہے جیسے اوزون کی پرت کا سوراخ، گلوبل وارمنگ، بیماریاں وغیرہ.. یہ سب انسان کی سائنسی ترقی اور کائنات کے قوانین کی دریافت سے ہی ممکن ہو سکا ہے، آج انسان نے جتنی سائنسی ترقی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے خود کو تحقیق کے کام پر مامور کیا اور کائنات کے قوانین کا احترام کیا.

آج سب جانتے ہیں کہ ہر چیز کچھ قوانین کی تابع ہے جن کی دریافت جاری ہے.

اس تناظر میں قدرتی آفات کے مقابلے کے لیے خدا سے کیا مطلوب ہے؟ یعنی اسے کیا کرنا چاہیے؟

کیا اسے تمام طبعی قوانین توڑ دینے چاہئیں؟
کیا اسے بجلی کا گرنا اور لاؤوں کا پھٹنا بند کر دینا چاہیے؟
کیا اسے جنگلوں میں لگنے والی آگ بجھانی چاہیے؟
کیا اسے شہابیوں کا رخ دوسری طرف موڑ دینا چاہیے؟
کیا اسے آندھیاں اور طوفان روک دینے چاہئیں؟
کیا اسے تمام طبعی قوانین ملتوی کرتے ہوئے انہیں معطل کر دینا چاہیے؟

لیکن اگر تمام طبعی قوانین معطل کر دیے گئے اور کائنات اپنا توازن کھو بیٹھی تو کیا ہوگا؟

جس طرح انسان ان طبعی قوانین کا احترام کرتا ہے اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے ترقی کرتا ہے خدا کو بھی چاہیے کہ وہ ان قوانین کا احترام کرے بشرطیکہ ہم اس کے وجود اور اس کی تخلیق پر یقین رکھتے ہوں.

ماضی میں بیماریاں انتہائی خطرناک ہوا کرتی تھیں، آج میڈیکل سائنس کی ترقی اور ویکسین کی ایجاد کی وجہ سے انسان ماضی کی ان خطرناک بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگیا ہے، آج تھوڑی سی دواء ان بیماریوں کے علاج کے لیے کافی ہے جو ماضی میں جان لے کر ہی دم لیتی تھیں اور مزید تحقیق جاری وساری ہے.

ماضی میں زلزلہ ہر چیز تباہ وبرباد کرنے کے لیے کافی تھا تاہم آج ایسی عمارتیں بنائی جارہی ہیں جو زلزلوں کے جھٹکے برداشت کر کے ویسی کی ویسی ہی کھڑی رہتی ہیں.

ماضی کا انسان تو بس اڑنے کے خواب ہی دیکھ سکتا تھا جبکہ آج کا انسان کششِ ثقل کا مقابلہ کرتے ہوئے روز کہیں نہ کہیں اڑتا پھرتا ہے.

یہ اور ایسی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں جو انسان کی ترقی کو نمایاں کرتی ہیں، لیکن یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہر چیز کچھ قوانین کے تابع ہے جو توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے تو پھر ہم طبعی آفات کو غلطی گردانتے ہوئے اس کا الزام خدا پر کیوں ڈال دیتے ہیں؟

لیکن کہانی کا ایک اور پہلو بھی ہے، اگر ہم دنیا کے مسائل پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ انسان کے زیادہ تر مسائل اس کے قدرتی وسائل کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اوزون کا سوراخ، گلوبل وارمنگ، آلودگی، آئے دن تیل کا سمندروں میں بہ جانا، جنگلوں کا کاٹنا، ادھر ادھر جنگیں کرتے پھرنا یہ سب باتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ اپنے اکثر مسائل کے ذمہ دار ہم خود ہیں، اور خدا کو ہم نے اپنی انسانی غلطیوں کی کھونٹی بنایا ہوا ہے جس پر ہم اپنی تمام غلطیاں لٹکا کر اپنی مصیبت کی ساری ذمہ داری اس پر ڈال دیتے ہیں، جیسے ہی کہیں زلزلہ آتا ہے سب چلا اٹھتے ہیں کہ خدا کہاں ہے؟ بہت کم لوگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ کیا اس کا ذمہ دار خدا ہے یا یہ کسی انسانی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے؟

جہاں قدرتی آفات نہیں آتیں وہاں کوئی خدا کا شکریہ ادا نہیں کرتا، کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہاں کا امن، سکون خدا کی دین ہے، جب انسان ترقی کرتا ہے یا کسی مصیبت کا مقابلہ کامیابی سے کرلیتا ہے تو اس کا سہرا خود کے سر پر سجاتا ہے اور جب وہ ناکام ہوجاتا ہے تو کیوں سارا الزام خدا پر ڈال کر ایک طرف ہوجاتا ہے؟

اگر کہیں کوئی آفت آتی ہے تو اس کی صرف دو ہی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں، یا تو اس کی وجہ طبعی قوانین کا اپنے معمول کے مطابق چلنا ہے یا پھر کسی مداخلت کی وجہ سے ان طبعی قوانین میں خلل واقع ہونا ہے، دونوں صورتوں میں اس کائنات کے پیچھے

کھڑے کسی خدا کا وجود نا تو ثابت ہوتا ہے اور نا ہی اس کی نفی ہوتی ہے کیونکہ یہ واقعات جنہیں ہم آفات یا آفتیں کہتے ہیں کچھ طبعی قوانین کے تحت خودکار طور پر وقوع پذیر ہوتی ہیں اور سب کو جن میں خدا بھی شامل ہے ان قوانین کا احترام کرنا چاہیے اور شاید یہی ہوتا بھی ہے.

مزہب

داعش اسلامی ہے

سب سے پہلے تو اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ "السلف الصالح" کا لقب کفار وملحدین ویہود ونصاری وزنادقہ کا عطا کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کا خود وضع کردہ ہے، رہی بات "سلفِ صالح" کے جرائم کی تو جنہیں اعتراض ہو ان سے درخواست ہے کہ ان جرائم کے شاندار نمونوں کے لیے تاریخ بلکہ اسلامی تاریخ سے رجوع فرمائیں، آپ کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی کہ یہ کتابیں ایسے سنہری واقعات سے اٹی پڑی ہیں، بلکہ "موقعہ صفین" کو ہی لے لیں جس میں حضرت علی کرم واللہ وجہہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی فوجیں آپس میں ٹکرائیں اور اسلامی تاریخ کے مطابق یہ جنگ کوئی چار ماہ تک جاری رہی جس میں اسی تاریخ کے مطابق نوے سے ایک لاکھ بیں ہزار "صحابہ" ہلاک ہوئے.. ہلاک اس لیے کیونکہ مسلمان کنفیوز تھے کہ کس گروہ کا مرنے والا شہید اور کس گروہ کا مرنے والا جہنمی ہے!؟ یاد رہے کہ یہ جنگ محض اقتدار کی جنگ تھی، "موقعہ الحرہ" کی اگر بات کی جائے تو وہ بھی بربریت کا ایک عظیم الشان نمونہ تھی جس میں یزید بن معاویہ کی فوج اہلِ مدینہ کو بیعت کے لیے مجبور کرنے کے لیے مدینہ میں داخل ہوئی اور ہزاروں صحابہ کو بمع ان کے اہل وعیال کے قتل کر ڈالا، بلکہ یزید کی فوج نے مدینہ کی عورتوں کی کھلے عام آبروریزی کی جن میں یقیناً صحابیات کی ایک کثیر تعداد شامل تھی، کھلے عام آبروریزی کے اس واقعے کی شاید ہی تاریخ میں کوئی مثال ملتی ہو کیونکہ اس واقعے کے بعد جو بھی شخص اپنی بیٹی کی شادی کرتا دولہے کے اہلِ خانہ سے کہتا کہ: میں اپنی بیٹی کے کنوارے ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتا!!

"موقعہ الجمل" کے ذکر کے بغیر تو جرائم وبربریت کی یہ تاریخ تو ادھوری ہی رہ جاتی ہے جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں، ام المؤمنین اونٹھ پر سوار اپنی فوج کی قیادت فرما رہی تھیں، اگر ان کے اونٹھ کی لگام حضرت علی کی فوج کے ہاتھ میں آجاتی تو اس کا مطلب جنگ کا خاتمہ اور شکست ہوتا لہذا ام المؤمنین کے فوجیوں میں سے ہر وقت کوئی نہ کوئی جلیل القدر صحابی لگام تھامے رہتا، اسلامی تاریخ کے مطابق اس چکر میں ستر

صحابیوں کے ہاتھ کٹے جبکہ حضرت علی کی فوج سے پانچ ہزار اور حضرت ام المؤمنین کی فوج سے تیرہ ہزار صحابہ ہلاک ہوئے!! پھر بھی نہ جانے ایسے لوگ کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس "سلفِ صالح" کی حمد و ثناء کرتے نہیں تھکتے، اور جب ایسے واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے تو جواب آتا ہے کہ آپ جس سلفِ صالح پر یہ "الزامات" لگا رہے ہیں انہیں ڈیڑھ ارب مسلمان مانتے ہیں لہذا اگر آپ کے پاس دستاویزی ثبوت ہیں تو ٹھیک ورنہ باز آ جائیں...!؟ ایسی باتیں سن کر بندہ سرپیٹ کر رہ جاتا ہے کہ جس تاریخ میں یہ سب جرائم ریکارڈ ہیں وہ ہم کفار نے نہیں لکھی بلکہ بنو قریظہ کے قتل عام کی سرپرستی تو رسالت مآب نے خود کی!؟

الغرض کہ قتل عام اور آثارِ قدیمہ کی تباہی کی صورت میں جو کچھ "داعش" آج کل کر رہی ہے وہ دراصل اسی "سلفِ صالح" کی سنت کی عملی شکل ہے، عباسی خلافت کا پہلا فرمان ہی یہی تھا کہ اموی دور کے خلفاء و امراء کی قبریں کھود کر ہڈیاں جلا کر ہوا میں اڑادی جائیں، بتوں کی تجسید تو اسلام نے کبھی برداشت ہی نہیں کی، طالبان اور القاعدہ نے جس طرح ہزاروں سال قدیم بدھا کے مجسموں کو تباہ و برباد کیا وہ ساری دنیا نے دیکھا، یہ ان کے رسول کی سنت تھی کہ جب وہ خود مکہ میں داخل ہوئے تو پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ "انبیاء کے دادا" کی سنت پر عمل کرتے ہوئے کعبہ کے بتوں کی مسماری تھا... اسلامی تاریخ سے ہی ایسے کتنے ثبوت چاہئیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام بطور ایک مذہب، عقیدے اور اجتماعی نظام کے ایک دہشت گردانہ فکر ہے اور داعش تو محض آج کے دور میں اس "سلفِ صالح" کی ایک عملی مثال اور نمونہ ہے۔

سب سے بڑا جھوٹ "سیاسی اسلام" کا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ وہ تنظیمیں کر رہی ہیں جنہوں نے اس نوعیت کے اسلام کا پرچم اٹھا رکھا ہے، سچ یہ ہے کہ یہ عبارت حقیقت کو مسخ کرتی ہے، اس سے بس یہ فائدہ ہوتا ہے کہ "پُر امن" اسلام کے دعویداروں کی حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے ورنہ سچائی یہی ہے کہ لفظ "اسلام" اپنے سیاسی جوہر کی تعبیر کے لیے کافی ہے، دراصل "سیاسی اسلام" کی اصطلاح "سیاسی ابلاغی" اصطلاح ہے جیسے "داعش" اور "القاعدہ" ہے تاکہ "دینِ حق" کی بدنام شہرت کو جتنا ہو سکے بچایا جا سکے، وہ بھی ایسی ہی تنظیموں کے حق میں جو اعتدال کی دعوے دار ہیں تاکہ ان کی دکان چلتی رہے۔

داعش یا کسی اور اسلامی شدت پسندی میں کوئی فرق نہیں چاہے وہ سنی ہو، وہابی ہو یا شیعہ... سوال یہ ہے کہ انفرادی سطح پر مسلمانوں نے اس "دہشت گرد" اسلام کے خلاف صدیوں سے کون سا ردِ عمل دکھایا ہے سوائے اسے من و عن قبول کرنے کے؟ کچھ بھی نہیں... پھر کیسے آج داعش غیر اسلامی ہو گئی؟ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی معاشروں کے سو فیصد مسائل کی وجہ مذہبی-عقائدی ہیں، پر مسلمان اتنے غبی ہیں کہ آج بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔

اور اگر اس مذہب میں حقیقت کا کوئی ایک بھی پہلو ہوتا تو اس کے ماننے والے اسے سب پر زبردستی نہ تھوپتے پھرتے... یہ اسلام اور وہ اسلام کا راگ الاپنا بند کریں.. کیونکہ "اِس اسلام" اور "اُس اسلام" میں سوائے ضمنی تفصیلات اور "لا ئیکس" کے کوئی فرق نہیں، سچ یہی ہے کہ داعش کسی بھی دوسرے اسلامی گروہ سے زیادہ صافی و مصفی اسلام پر عمل پیرا ہے، فرق بس اتنا ہے کہ داعش والے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے بلکہ عمل کرنے پر یقین رکھتے ہیں، اگر داعش اسلامی نہیں ہے تو کوئی بتا سکتا ہے کہ اس کا قرآن الگ ہے؟ یا ان کے پاس سیرت و حدیث کی کوئی اور کتابیں ہیں؟ اور کیا غیر سیاسی اسلام اصل میں ہوتا بھی ہے؟

رچرڈ ڈاکنز کہتے ہیں کہ اچھے مؤمن مذہب کا دفاع کر کے انتہاپسندوں کو ایک اچھی بنیاد فراہم کرتے ہیں، سادہ لوح مسلمانوں نے آج تک یہی کیا ہے اور مسلسل کیے جا رہے ہیں، اگر داعش اسلام کی نمائندگی نہیں کرتا اور اگر وہ لوگ اسلام کی شبیہ خراب کر رہے ہیں تو مسلمان ان کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ نبی کے کارٹونوں پر تو مسلمانوں نے دنیا ہلا کر رکھ دی تھی... اسلام کا نام کس نے زیادہ خراب کیا کارٹونوں نے یا داعش نے؟ پھر یہ خاموشی کہیں اقرار تو نہیں؟

یورپ کو اک نصیحت

کہا جاتا ہے کہ ایک مسلمان حاکم نے ایک آئینہ خریدا اور جب خود کو اس آئینے میں دیکھا تو اپنی بدصورتی دیکھ کر سخت غصہ اور کراہت محسوس کی، کسی قریبی نے اس غم و غصہ کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: میں نے خود کو آئینے میں دیکھا، مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اتنا بدصورت ہوں گا. اس پر چہیتے نے کہا کہ: آپ خود کو ایک بار آئینے میں دیکھ کر غصہ ہو گئے، ہم جو آپ کو روز دیکھتے ہیں ذرا سوچے ہماری کیا حالت ہوتی ہو گی؟

جراتِ تحقیق کی تحریریں پڑھنے والوں کو عام طور پر غصہ آتا ہے کیونکہ انہیں ان تحریروں میں اسلام کا بدصورت چہرہ نظر آتا ہے، مجھے بذاتِ خود اسلام سے کوئی بغض نہیں ہے، عرض بس اتنی ہے کہ اس کی یہ بدصورت شکل دھولیں، لیکن ایسے مسلمانوں کا کیا کیا جائے جنہیں بچپن سے ہی یہ سکھا پڑھا دیا جاتا ہے کہ دین اللہ کے ہاں اسلام ہے (آل عمران 19) اور اسلام کے علاوہ اگر کوئی کسی دین پر ہو گا تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا (آل عمران 85) لہٰذا وہ قتل کرتے ہیں، غلام بناتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، کفر کے فتوے دیتے ہیں، رجم کرتے اور دھماکوں میں بے قصور لوگوں کو انتہائی پُر چین ضمیر کے ساتھ اڑا دیتے ہیں کیونکہ یہی اللہ کا حکم ہے۔

ایک کرم فرمانے لکھا: جراتِ تحقیق کی تحریریں پڑھ کر میں خود سے بہت شرمندہ ہوا، کیا میرا چہرہ اتنا بھیانک تھا؟ شکر ہے میں نے یہ بدصورت ماسک اتار پھینکا ہے۔

میں نے جواب دیا: شکریہ، یقیناً اچھے مسلمان بھی ہیں ہاں اگر وہ اسلام کو صحیح معنوں میں نافذ کرتے تو ہماری مصیبت دیدنی ہوتی۔

جواب آیا: نہیں جناب، کوئی اچھا یا برا مسلمان نہیں ہوتا، بس ایک پڑھے لکھے با عمل مسلمان کے مقابلے میں ایک جاہل بے عمل مسلمان ہوتا ہے، جو مسلمان آپ کو بظاہر اچھا اور شریف لگتا ہے وہ خود کش بمباروں اور دہشت گردوں کی کاروائیوں پر خوش ہوتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں وہ شریعت لاگو کر رہا ہوتا ہے۔

پھر مسئلہ کیا ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت چاہتی ہے کہ ایک کتاب لاگو کی جائے جسے وہ اللہ کی کتاب کہتے ہیں اور ایک ایسے شخص کی پیروی کی جائے جسے وہ اللہ کا پیغمبر کہتے ہیں...

اللہ کی کتاب؟

اللہ کا پیغمبر؟

سوچ کر ہی ہنسی آتی ہے... تاہم یہ ماننے میں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں کوئی مضائقہ نہیں، ہندو ہاتھی کی شکل کے ایک خدا کو پوجتے ہیں جو 300 ملین خداؤں میں سے ایک ہے!!

پھر مسئلہ کہاں ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ جسے اللہ کی کتاب کہا جاتا ہے اور جسے اللہ کے پیغمبر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کی تعلیمات انسانیت اور انسانی حقوق سے مطابقت نہیں رکھتیں، آپ کو ایک ایسے دروازے میں سے گزرنے پر اکسایا جاتا ہے جس کے ماتھے پر بظاہر اللہ کی کتاب اور اللہ کا رسول لکھا ہوا ہوتا ہے.. پھر آہستہ آہستہ آپ کو آپ کی انسانیت سے فارغ کر دیا جاتا ہے اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ آپ کب ایک طالبانی داعشی مجرم بن گئے...!؟

اگر یورپ تہذیبی سطح پر خودکشی نہیں کرنا چاہتا تو اسے یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ جن لوگوں کا وہ بڑی خوش نودی سے استقبال کر رہا ہے اپنے مذہب اور رسول کو ہر تہذیبی، انسانی اور قانونی اعتبار سے اوپر رکھتے ہیں، لہٰذا اہلِ یورپ کو چاہیے کہ انہیں متنبہ کریں کہ ان کے ملکوں میں اسلامی تعلیمات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، یہ انتباہ تحریری ہونا چاہیے اور پناہ کے طالب کو ایک معاہدے پر دستخط کرنا چاہیے کہ وہ اسلام کی ان تعلیمات کو جو انسانی حقوق اور پناہ دینے والے ملک کے مروجہ قوانین کے خلاف ہیں انہیں ترک کر دے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں اسے فوراً اس ملک کی سرزمین کو چھوڑنا ہوگا، یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ پناہ دینے والے ملک کے مروجہ قوانین اور اسلامی تعلیمات کے درمیان تضادات کی بھی نشان دہی کی جائے تاکہ ہر چیز واضح ہو، مزید برآں ان ممالک کو چاہیے کہ پناہ گزینوں کے بچوں کو واضح طور پر یہ تعلیم دی جائے کہ ان کی سرزمین پر اسلام کی ان تعلیمات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو انسانی حقوق کے خلاف ہیں۔

بہتر ہے کہ شروع میں ہی یہ ناراضگی مول لے لی جائے ورنہ آخر میں صرف تباہی و بربادی ہی ہاتھ آئے گی، یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام نے ہی ان ممالک کو تباہ و برباد کیا جہاں سے یہ پناہ گزین آئے ہیں... یہی تعلیمات ان ممالک کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیں گی جو ان پناہ گزینوں کو محض انسانی بنیادوں پر پناہ دے رہے ہیں اگر ان ممالک نے اس کی روک تھام کے لیے بروقت اقدامات نہیں کیے۔

اسباب و حقائقِ غزوۂ بدر

عام روایتی مسلمان بہت سادے اور بھولے ہوتے ہیں، اسلام پر ان کا غیر متزلزل ایمان صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے دینی علم کا اہم ترین ذریعہ اپنے گھر سے حاصل ہونے والی دینی معلومات اور جمعہ کے دن عربی خطبے سے قبل خطیب کی تقریر ہوتا ہے۔ غیر مسلموں سے نفرت اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ معصوم ناپختہ ذہنوں میں بچپن سے ہی بٹھا دی جاتی ہے، جو عموماً مسخ شدہ تاریخ کی صورت میں انہیں ازبر کرائی جاتی ہے۔ ان مسلمان بچوں کے ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے کہ اسلام کی شروعات سے ہی کافروں نے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، اور ان پر ہر طرح سے عرصۂ حیات تنگ کیا گیا۔ یہ بات ان بچوں کی ذہن میں اس قدر راسخ ہو جاتی ہے کہ ذہن اس کے برعکس کچھ سننے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ بچپن کی یہ معلومات اس قدر پختہ ہوتی ہیں کہ دلائل کے انبار بھی بچپن سے نقش، اِن نقوش کو دھندلانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کبھی اس رخ پر نہیں سوچتے کہ جن ذرائع سے انہیں یہ معلومات فراہم کی گئیں آیا وہ ذرائع "معتبر ہونے کے معیار پر پورا بھی اترتے ہیں یا نہیں؟ ان کی معلومات "علم" کا درجہ رکھتی بھی ہیں یا وہ مغالطوں کا شکار ہیں؟

ایساہی ایک مغالطہ "غزوہٴبدر" ہے، کسی بھی مسلمان سے پوچھ لیں کہ کفر واسلام کا سب سے پہلا معرکہ کیسے ہوا؟ فٹ سے جواب آئے گا، "کافروں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا"۔ بغیر کسی تحقیق اور تفتیش کے "غزوہٴبدر" کی تمام تر ذمہ داری مکہ کے کافروں پر ڈال دی جاتی ہے کہ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو کافروں کو مسلمانوں کا چین کی نیند سونا ایک آنکھ نہ بھایا اور انہوں نے اپنی شرارتوں کا دائرہ کار مکہ سے بڑھاتے ہوئے مدینہ تک پھیلا دیا، اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، کیونکہ بچپن سے یہی گھٹی پلائی گئی ہے کہ کافر ہمیشہ ظالم اور جارح ہوتا ہے اور مسلمان ہمیشہ مظلوم اور دفاع کرنے والا ہوتا ہے۔

مسلمان علماء بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ "غزوہٴبدر" کے اسباب کیا تھے اور جارح کون تھا؟ لیکن پھر بھی اصل صورت حال اس لئے پوشیدہ رکھی جاتی ہے کہ حقیقت سامنے آنے سے معصوم ذہنوں میں بہت سے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں، اور 1400 سال سے مسلمانوں کی مظلومیت کی جو تصویر ہر مسلمان کے ذہن میں نقش کر دی گئی ہے وہ دھندلا سکتی ہے۔ اس لئے عموماً واقعات کو تفصیل اور تحقیق کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے اختصار سے کام لیتے ہوئے حقیقی اسباب پر روشنی ڈالے بغیر بدر کے میدان میں دونوں فوجوں کو باہم ٹکرا دیا جاتا ہے، اور پھر قوت ایمانی کے باعث 313 مجاہدین اسلام کی ایک ہزار کفار پر فتح مبین کے نقارے بجا دیئے جاتے ہیں۔

جنگ بدر اور 1965ء کی پاک و ہند کی جنگ میں اس لحاظ سے کافی مماثلت ہے کہ ہماری نصابی کتابوں میں ہمیں ان دونوں جنگوں کے اصل محرکات کے بارے میں گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہماری نصابی کتابوں میں درج ہے کہ 6 ستمبر 1965ء کو ہندوستان نے بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر اعلانیہ طور پر یک طرفہ جنگ کا آغاز کرتے ہوئے لاہور پر حملہ کر دیا تھا، لیکن یہ بات کہیں ذکر نہیں کی جاتی کہ 65ء کی جنگ کا اصل محرّک "آپریشن جبرالٹر" تھا، اسی طرح جنگ بدر کے بارے میں بھی اصل حقائق کو چھپاتے ہوئے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہجرت کے بعد کفار مکہ نے مدینہ پر حملہ کر دیا تھا تاکہ مسلمانوں کا خاتمہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسلام کا نام تک مٹا دیا جائے، اور جنگ بدر کے اصل اسباب و محرّکات کا بالکل بھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ غزوہ بدر کا اصل محرک کفار مکہ کا مدینہ پر حملہ آور ہونا نہیں تھا، بلکہ ہجرت کے بعد سے یکے بعد دیگرے مسلسل ایک سال سے مسلمانوں کی جانب سے قریش مکہ کے تجارتی قافلوں کو لوٹنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ کتنے مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہے کہ غزوہ بدر سے قبل پیغمبر اسلام نے تقریباً آٹھ بار قریش مکہ کے تجارتی قافلے کو لوٹنے کی کوششیں کیں؟ اور لوٹ مار کی انہی کوششوں کے نتیجے میں بالآخر جنگ بدر کا میدان کارزار گرم ہوا۔

مسلمانوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی مرضی سے مکہ سے یثرب ہجرت کی، کیونکہ پیغمبر اسلام کی 13 سالہ شب و روز کو ششوں سے صرف 83 افراد شمع اسلام کے پروانے بن پائے تھے، پیغمبر اسلام مایوس ہو چکے تھے کہ مکہ کے مزید لوگ ان کی دعوت پر کان دھریں گے، نیز خدیجہ اور ابو طالب کے انتقال کے باعث پیغمبر اسلام کی پشت پناہی کرنے والا کوئی مضبوط سہارا بھی اب میسر نہ تھا، اس لئے اب مکہ کو خیر باد کہنے میں ہی عافیت تھی۔ سردارانِ قریش نے مسلمانوں سے ہر گز مطالبہ نہیں کیا تھا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر کسی اور علاقے کی طرف منتقل ہو جائیں، بلکہ سرداران قریش نے پوری کوشش کی مسلمان مکہ چھوڑ کر نا جائیں، اس لئے جس کا جس پر بس چل سکا اسے ہجرت سے روکنے کی اپنی بھرپور کوشش بھی کی۔ اس بات کی تصدیق کیلئے سیرت کی اولین کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے، میں طوالت کے اندیشے کے باعث اسے ذکر نہیں کر رہا۔

مسلمانوں کے یثرب ہجرت کر جانے کے بعد مسلمان مؤرخ یہ تو لکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی کفار مکہ نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا اور مدینہ میں بھی انہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہے، لیکن کوئی ایک واقعہ بیان کرنے سے قاصر ہیں کہ ہجرت کے بعد کفار مکہ کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف کوئی ایک جارحانہ کاروائی سرانجام دی ہو!!! جی ہاں کفار مکہ کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف ہجرت کے بعد کسی ایک مسلح کاروائی کا ذکر نہیں ملتا، میں نے حتی المقدور تحقیق کی کہ ہجرت کے بعد کفار مکہ کی جانب سے کوئی ایک ایسا فعل مل جائے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہو کہ کفار مکہ نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا، اور انہیں مدینہ میں بھی سکون کا سانس نہ لینے دیا، لیکن مجھے اسلامی تاریخ کے مصادر میں سے کوئی ایک ایسی روایت نہیں مل سکی جس کی بنیاد پر یہ مقدمہ قائم کیا جاسکتا ہو۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں اور کفارِ مکہ میں باہمی رابطہ ختم ہو گیا۔ مسلمان مکہ سے تقریباً ڈھائی سو میل دور مدینہ ہجرت کر گئے۔ مسلمانوں کو انصار کی شکل میں نئے ہمدرد اور حمایتی دستیاب ہو گئے اور ایک محفوظ جائے پناہ دستیاب ہو گئی جہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اب کفار مکہ اور مہاجرین مدینہ کے درمیان امن قائم ہو جانا چاہئے تھا۔ اور لکم دینکم ولی دین کے اصول پر کاربند رہنا چاہئے تھا، فریقین کو ایک دوسرے کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ غیر جانبدارانہ رائے تو یہی ہونی چاہئے تھا کہ ہجرت کے بعد جس نے بھی نقص امن اور زیادتی کی طرف پہلا قدم اٹھایا اسے ہی قصوروار ٹھہرایا جائے۔ خواہ وہ کفار مکہ ہوں یا مسلمانان مدینہ۔

اس کے برعکس ہجرت کے بعد وہی مظلوم، مسکین، بے یار و مددگار مسلمان ایک نئے رنگ وروپ میں نظر آتے ہیں، امن و سلامتی کے داعی، ظلم کی مخالفت پر کمربستہ مسلمان اب تمام تر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک نئے رنگ وروپ میں نظر آتے ہیں۔ قریش کے تجارتی قافلے شام کی طرف جانے والی اسی تجارتی شاہراہ پر آمد و رفت رکھتے تھے جسے قرآن لِإِيلَافِ

قریش اِیلا فہم رحلة الشتاء والصیف (سورة قریش) کہہ کر اس تجارتی شاہراہ کے پر امن ہونے کو قریش پر اللہ کے احسان کے طور پر ذکر کرتا ہے، لیکن اب رسول اللہ بذات خود قرآن کے احسان کو حرفِ غلط ثابت کرنے کیلئے میدان عمل میں اترتے ہیں۔ شجاعت اور رسالت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر کفار مکہ سے کوئی انتقام لینا مقصود تھا تو کفار مکہ سے اعلان جنگ کرتے ہوئے مکہ پر حملہ کیا جاتا، لیکن یہاں دنیا دیکھتی ہے کہ اللہ کی رسالت کے ایک مدّعی، اپنے دین کی وسعت کیلئے ایک انوکھا راستہ اختیار کرتے ہوئے، ایک پر امن شارع تجارت کو میدان جنگ میں تبدیل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ تمام مہذب اقوام تجارتی شاہراہوں کو محفوظ بنانا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتی ہیں، کیونکہ ایسی شاہراہوں سے انسانی ضروریات وابستہ ہوتی ہیں، لیکن اب ایسی صورت حال میں کیا کہا جائے جب یہ سب کچھ اخلاقیات کے نام پر ہی برپا کیا جارہا ہو، اور یہ کارنامہ سرانجام دینے والا بھی کوئی اور نہیں بلکہ دنیا کے نظام کی "اصلاح" کیلئے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کرنے والی ذات خود ہو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا اصل مقصد مسلمانوں کیلئے پر امن خطے کا حصول نہیں بلکہ مکہ پر حملہ آور ہونے کیلئے ایک محفوظ چھاؤنی کا حصول تھا۔ رسول اللہ نے جہالت کے سر پر قائم اس دور کے قبائلی نظام کو ختم کرنے کے بجائے، اسی جاہلانہ نظام کو اپنے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

محدثین، سیرت نگار، اور مؤرخین اسلام، غزوہ بدر سے قبل کل آٹھ مہمات کا ذکر کرتے ہیں، میں اختصار کے ساتھ ان کا یہاں ذکر کر رہا ہوں، یہ آٹھ جنگی مہمات اس بات کا پول بہت طرح کھول کر رکھ دیتی ہیں کہ غزوہ بدر کے اصل محرّکات اور اسباب کیا تھے۔ مسلمان محققین کو چیلنج ہے کہ ان آٹھ مہمات سے قبل، کفار مکہ کی طرف سے کسی ایک اشتعال انگیز مسلح مہم کا ذکر اپنی ہی کتابوں سے نکال کر دکھادیں، تاکہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ سچا ثابت ہوسکے کہ ہجرت کے بعد کفار مکہ نے مدینہ میں بھی مسلمانوں کو سکھ کا سانس لینے نہ دیا، اور یہ کہ غزوہ بدر دفاعی جنگ تھی نا کہ اقدامی۔

(نوٹ: جہاں جہاں بھی تجارتی قافلوں کے "لوٹنے" کا ذکر ہے، لوٹنے کا لفظ میں نے اپنی جانب سے شامل نہیں کیا ہے، بلکہ مسلمانوں کی مقدس کتابوں میں بھی ان مقامات پر یہی لوٹنے کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔)

1- سریۂ حمزہ

رسول اللہ نے سب سے پہلے ہجرت کے سات مہینے بعد رمضان المبارک 1ھ میں تیس مہاجرین کی جمیعت کو حضرت حمزہ کی سرکردگی میں سیف البحر کی طرف روانہ فرمایا تاکہ قریش کا قافلہ جو ابوجہل کی سرکردگی میں شام سے مکہ کی طرف واپس آرہا تھا اس کا تعاقب کریں۔ ہجرت کے بعد یہ پہلا سریہ تھا، اس سریہ کیلئے رسول اللہ نے باقاعدہ ایک پرچم بناکر حضرت حمزہ کے حوالے کیا تھا، جسے اسلام کا سب سے پہلا پرچم قرار دیا جاتا ہے۔ جب حضرت حمزہ سیف البحر پہنچے اور قافلے پر حملہ آور ہونا چاہا

تومجدی بن عمرو جہنی نے درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کرایا اور لڑائی کی نوبت نہ آنے دی، اس طرح ابوجہل قافلہ لے کر مکہ روانہ ہوا اور حضرت حمزہ کو خالی ہاتھ مدینہ واپس لوٹنا پڑا۔

2- سریۂ عبیدہ بن حارث

ہجرت کے آٹھ ماہ بعد ماہ شوال 1ھ میں رسول اللہ نے مہاجرین کے ساٹھ یا اسی سواروں پر عبیدہ بن حارث کو امیر بنا کر رابغ کے مقام کی طرف روانہ کیا، وہاں پہنچ کر قریش کے قافلے سے مڈبھیڑ ہوئی جو دو سو کی جمعیت پر مشتمل تھا، اس بار بھی لڑائی کی نوبت تو نہ آسکی البتہ سعد بن ابی وقاص نے ایک تیر چلایا، یہ پہلا تیر قرار دیا جاتا ہے جو اسلام میں چلایا گیا۔ جس کا اعزاز بھی ایک "مظلوم مسلمان" کو حاصل ہوتا ہے۔ افسوس اوّلین جارحیت کا یہ اعزاز بھی کسی کافر کو نصیب نہ ہو سکا۔

3- سریۂ سعد بن ابی وقاص

پھر ماہ ذی قعدہ (واضح رہے کہ ذی قعدہ کے مہینے کا شمار "اشہر حرم" میں ہوتا ہے، جن میں اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی جنگ کی ممانعت ہے) میں بیس مہاجرین پر مشتمل ایک مہم سعد ابن ابی وقاص کی سرکردگی میں مقام خرّار کی طرف روانہ کی۔ یہ لوگ دن میں تو چھپ جاتے اور رات میں قافلہ کو تلاش کرتے، خرّار پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریش کا قافلہ تو نکل چکا ہے، اس لئے ناکام ونامراد مدینہ واپس لوٹنا پڑا۔

4- غزوہ ابواء

عام طور پر مسلمانوں کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ بدر وہ پہلا غزوہ تھا جس میں رسول اللہ نے خود شرکت کی تھی، لیکن سیرت کی تمام تر معتبر کتابوں کے مطابق غزوہ ابواء کو رسول اللہ کا پہلا غزوہ ہونے کا شرف واعزاز حاصل ہے، صفر ۲ھ میں ساٹھ مہاجرین کے ہمراہ قریش کے ایک قافلے کی آمد کی خبر پا کر رسول اللہ اسے لوٹنے کی غرض سے روانہ ہوئے، افسوس جب آپ ابواء پہنچے تو قریش کا قافلہ نکل چکا تھا۔ اس لئے مال غنیمت حاصل کئے بغیر ہی مدینہ واپس لوٹنا پڑا۔ اسی غزوہ کو غزوہ ودّان بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ابواء اور ودّان قریب قریب مقام ہیں، جن کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ مہم پندرہ روز پر مشتمل تھی۔

5- غزوہ بواط

اگلے ماہ یعنی ربیع الاول ۲ھ رسول اللہ کو پھر وحی کے ذریعے اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ مکہ جا رہا ہے، اس لئے آپ دو سو کا لشکر لے کر اس قافلے پر حملے کی غرض سے بواط کی طرف روانہ ہوئے، قریش کے اس قافلے میں ڈھائی ہزار اونٹ تھے، اور امیہ بن خلف اس قافلے میں موجود تھے، قافلے کے کل شرکاء کی تعداد سو تھی، بواط پہنچ کر معلوم ہوا کہ قافلہ تو رسول اللہ کے بواط پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے آگے روانہ ہو چکا ہے، اس لئے بغیر جدال و قتال واپس مدینہ لوٹنا پڑا۔

6-غزوہ عشیرہ

جمادی الاولیٰ ۲ھ میں آپ نے دو سو مہاجرین کو لے کر قریش کے قافلہ پر حملہ کرنے کیلئے عُشَیرہ کی طرف خروج کیا، جو ینبوع کے قریب ہے، اس مہم میں تیس اونٹ ہمراہ تھے، اس بار پھر حسب سابق رسول اللہ کے ہدف تک پہنچنے سے پہلے ہی کئی روز پیشتر قافلہ آگے نکل چکا تھا، چنانچہ مشیت ایزدی کے خلاف بغیر مال غنیمت حاصل کئے مدینہ واپس لوٹ آنا پڑا۔

7-غزوہ سفوان (غزوہ بدر صغریٰ یا بدر اولیٰ)

غزوہ عشیرہ سے واپسی کے بعد تقریباً دس روز رسول اللہ نے مدینہ میں گزارے ہوں گے کہ کُرز بن جابر فہری نے مدینہ سے باہر ایک چراہ گاہ پر حملہ کیا اور اونٹ اور بکریاں لوٹ کر لے گیا۔ رسول اللہ یہ خبر سن کر اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور مقام سفوان تک گئے، مگر آپ کے اس مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی کرز یہاں سے نکل چکا تھا، اس لئے مدینہ واپس لوٹتے ہی بنی۔ سفوان نامی یہ مقام بدر کے قریب ایک جگہ ہے، اس لئے اس غزوہ کو بدر اولیٰ یا بدر صغریٰ بھی کہتے ہیں۔

کُرز بن جابر فہری کی جانب سے مدینہ کی چراہ گاہ پر حملہ ایک واحد مہم ہے جس کے بارے کہا جاسکتا ہے کہ کفار مکہ کی جانب سے مدینہ کے خلاف رونما ہوئی، لیکن اول تو یہ اہل مکہ کی قیادت کی طرف سے باقاعدہ کوئی مہم نہیں تھی، دوسری بات یہ کہ کُرز بن جابر فہری، مسلمانوں کی جانب سے قریش کے قافلے کے بار بار تعاقب سے سخت سیخ پا تھا۔ اس نے اپنی جانب سے مسلمانوں کو ڈرانے کی کوشش کی کہ اگر قریش کے قافلوں کا تعاقب جاری رکھا گیا تو قریش بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا حق رکھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے کُرز بن جابر فہری کا غصے میں ذاتی اور انفرادی فعل قرار دیا جاسکتا ہے، اس سے زائد کچھ اور نہیں۔

8-سریۂ عبداللہ بن جحش

اس غزوہ کی تفصیل میری گذشتہ تحریر قرآن میں انسانی تصرف کی نشاندہی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، اختصار کے ساتھ ذکر ہے کہ غزوہ سفوان سے واپسی پر ماہ رجب 2 ہجری میں رسول اللہ نے عبداللہ بن جحش کو گیارہ مہاجرین کے ہمراہ مقام نخلہ کی طرف روانہ کیا، یہ رجب کا مہینہ بھی "اشہر حرم" یعنی حرمت والے مہینوں میں شمار ہوتا ہے جس میں جنگ کی سخت ممانعت ہے، روانگی کے وقت عبداللہ بن جحش کو رسول اللہ نے ایک خط دیا اور کہا کہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے کھول کر دیکھنا۔ چنانچہ دو روز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد خط کھول کر دیکھا تو لکھا تھا "مکہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پر اترو، وہاں سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ گذرنے والا ہے، اس قافلے کی خبر گیری رکھو، اور اس قافلے کی خبروں سے مطلع کرتے رہو" عبداللہ بن جحش نے خط پڑھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا جس کو شہادت عزیز ہو وہ میرے ساتھ چلے، اور سب نے ان کے ساتھ جانا قبول کر لیا۔ جب قریش کا تجارتی قافلہ اس مقام سے گذرا تو حرمت کا مہینہ ہونے کے باوجود واقد بن عبداللہ تمیمی نے قافلہ کے سردار عمرو بن الحضرمی کے ایک تیر مارا جس سے وہ مر گیا، اس کے مرتے ہی قافلے والے پریشان ہو کر بھاگ اٹھے اور

مسلمانوں نے قافلے کے تمام مال واسباب پر قبضہ کر لیا، اور اہل قافلہ میں سے عثمان بن عبد اللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر لیا۔ عبداللہ بن جحش نے اس مال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا، چار حصے غانمین کو دیئے اور ایک حصہ (خمس) رسول اللہ کیلئے رکھا۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ: "یہ پہلی غنیمت تھی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور عمرو بن حضرمی پہلا شخص تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اور عثمان بن عبد اللہ اور حکم بن کیسان پہلے قیدی تھے جو مسلمانوں نے گرفتار کئے" ابن ہشام کے الفاظ پر غور کر لیجئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ جارحیت میں پہل کس نے کی۔

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ کیا کہ ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام نے مسلسل قریش کے تجارتی قافلوں کا تعاقب کر کے انہیں ہراساں کیا، جب کہ اس دوران سوائے کرز بن جابر فہری والے انفرادی واقعہ کے قریش مکہ کی طرف سے مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف کسی بھی قسم کی کوئی مسلح مہم جوئی نہیں کی گئی، اور کسی بھی قسم کی اشتعال انگیزی سے اجتناب برتا گیا، اس تمام تر تفصیل کو جاننے کے بعد مسلمان کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اہل مکہ نے مدینہ کے مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا، اور مسلمانوں کی تمام تر مہمات دراصل "دفاعی" نوعیت کی تھیں۔

اب غزوۂ بدر کی حقیقت بھی جان لیجئے تا کہ یہ واضح ہو کہ جنگ بدر مسلمانوں کی طرف سے اہل مکہ کی جارحیت کے مقابلے کیلئے کوئی "دفاعی" اقدام تھا یا مسلمانوں کی جانب سے اہل مکہ کے خلاف خالصتاً جارحانہ جہادی کارروائی تھی۔

غزوہ بدر

ابن اسحاق کہتے ہیں:

"پھر یہ خبر رسول اللہ کے گوش گذار ہوئی کہ ابوسفیان ملک شام سے قریش کا بہت بڑا قافلہ لے کر آرہا ہے، جس میں قریش کا بہت کثیر مال تجارت ہے اور تیس یا چالیس قریش کے آدمی ہیں......... جب رسول اللہ نے ابوسفیان کے شام سے آنے کی خبر سنی تو مسلمانوں سے فرمایا کہ قریش کا قافلہ ملک شام سے بہت سے مال کے ساتھ آرہا ہے تم اس سے جنگ کے واسطے چلو کہ خدا ان کا مال تم کو دلوا دے......... ابوسفیان جب مدینہ کے قریب پہنچا تو ہر ایک آتے جاتے شخص سے رسول اللہ کا حال دریافت کرتا تھا، کیونکہ اس کو رسول کریم کی طرف سے فکر لگا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص سے اس کو خبر پہنچی کہ آپ صلعم نے اس قافلے کیلئے ساتھیوں کو نکلنے کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ اسی وقت اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو کچھ مزدوری دے کر مکہ روانہ کیا تا کہ قریش کو بہت جلد اپنے قافلے کی حفاظت اور حمایت کیلئے بھیج دے۔ چنانچہ ضمضم بن عمرو فوراً نہایت سرعت کے ساتھ مکہ کو روانہ ہوا۔" .... ضمضم بن عمرو غفاری ابوسفیان کا فرستادہ آیا تھا (یعنی مکہ پہنچا) اور اس نے غُل مچایا تھا اور اپنے اونٹ کا کجاوہ الٹا

کر کے اور کرتا پھاڑ کے کہہ رہا تھا: ”اے گروہ قریش! اللطیمۃ اللطیمۃ تمہارے مال ابوسفیان کے ساتھ ہیں اور محمد نے ان کے لوٹنے کا ارادہ کیا ہے، تم جلد ابوسفیان کی مدد کو پہنچو“

ابن اسحاق کی اس عبارت سے کئی باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں کہ:

1- غزوہ بدر کا اصل سبب مسلمانوں کی طرف سے قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹنے کی منصوبہ بندی تھا، نا کہ قریش مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کی کوئی عسکری کارروائی۔

2- مسلمان بڑے کرّوفرّ سے کہتے ہیں کہ 313 نے 1000 کو شکست دی، مزید تفصیل آگے بیان کروں گا، یہاں یہ جان لیں کہ یہ 313 اصل میں تیس یا چالیس افراد پر مشتمل ایک تجارتی قافلے کو لوٹنے کیلیئے نکلے تھے، نا کہ کسی عسکری قوت کے خلاف۔ وہ تو چونکہ ابوسفیان اپنا تجارتی قافلے اپنی دانشمندی سے بچا کر مکہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ ان 313 کا اصل منصوبہ تو تیس یا چالیس لوگوں پر مشتمل تجارتی قافلے پر شب خون مارنا تھا۔

3- رسول اللہ کا یہ فرمان ”تم اس سے جنگ کے واسطے چلو کہ خدا ان کا مال تم کو دلوادے“ غزوہ بدر کے تمام اغراض و مقاصد بہت اچھی طرح بیان کر دیتا ہے کہ ع

غنیمت تھا مقصود و مطلوبِ مومن
نا شوقِ شہادت، نا خوفِ جگ ہنسائی

4- قریش مکہ، ضمضم بن عمرو غفاری کی اطلاع پر اپنے اموال بچانے اور ابوسفیان کی مدد کیلیئے مکہ سے روانہ ہوتے تھے نا کہ مدینہ پر یلغار کرنے کیلیئے۔ جبکہ مسلمانوں کی طرف سے یہ جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ قریش مکہ براہ راست مدینہ پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ:

”پھر آپ صلعم نے سب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے لوگو! جس کی رائے ہو وہ بیان کرو، اور اس سے آپ کا منشا انصار کی رائے لینا تھا......... حضور اکرم کو یہ اندیشہ تھا کہ انصار شائد میری اس مدد پر کفایت کریں گے کہ جو دشمن میرے اوپر مدینہ میں چڑھ کر آئے اس سے مجھے بچائیں اور جب میں اپنے دشمنوں پر حملہ کرنے کیلیئے نکلوں تو یہ اس میں شریک نہ ہوں“۔

یہاں دیکھ لیں خود رسول اللہ دشمن پر حملہ آور ہونے کا ذکر کر رہے ہیں، نا کہ کسی قسم کے دفاع کا۔ نیز رسول اللہ کو یہ اندیشہ تھا کہ انصار نے تو اس بات پر بیعت کی تھی کہ اگر دشمن مدینہ پر چڑھ آئے گا تب رسول اللہ کی حفاظت کریں گے، لیکن یہاں تو

خود رسول اللہ ہی دشمن پر چڑھ دوڑے تھے تو اندیشہ ہوا کہ اس صورت میں ناجانے انصار ساتھ دیں گے یا نہیں۔ کیا اب بھی غزوۂ بدر کی بابت ایک جارحانہ اقدام ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہہ باقی رہ جاتا ہے؟

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:

"جب ابوسفیان اپنے قافلے کو لے کر نکل گیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ اب میں غازیان اسلام کی دست برد سے بچ گیا، اس نے قریش کو کہلا بھیجا کہ جس قافلے کی مخالفت اور حمایت کے واسطے تم آئے تھے وہ قافلہ اب دشمن کی زد سے محفوظ نکل گیا۔ لہذا تم بھی واپس مکے چلے جاؤ، ابوجہل نے کہا "ہم ابھی مکہ نہ جائیں گے، ہم بدر میں چل کر خوب اونٹ ذبح کریں گے اور تین روز وہاں رہ کر خوب کھانے کھائیں گے، اور شرابیں اڑائیں گے، اور ناچ رنگ دیکھیں گے تاکہ ہمارے اس کرّوفرّ کے ساتھ آنے کو دیکھ کر تمام عرب ہم سے خوف کریں اور جانیں کہ ہاں قریش ایسے ہیں" کیونکہ ان دنوں میں بدر کے میدان میں بازار لگتا تھا اور عرب کے ہر ایک شہر کے لوگ یہاں آکر جمع ہوتے تھے اور خرید وفروخت کرتے تھے۔"

ابن اسحاق کے اس بیان سے مزید اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ قریش مکہ کا جنگ وجدال کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا، ابوسفیان نے خود پیغام بھیجا کہ قافلہ بحفاظت مدینہ پہنچ گیا ہے اس لئے واپس آجاؤ، اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) کا بدر جانے کا مقصد صرف بدر کے بازار میں شرکت اور ناؤونوش کی محفلیں منعقد کرنا تھا، تاکہ قریش کی دھاک باقی عرب پر جم جائے، نا کہ جنگ کے ارادے سے بدر کا قصد کیا تھا۔

ڈھول کا پول

ابوجہل کی یہ گفتگو سن کر اخنس بن شریق بن عمرو بن وہب ثقفی نے جو بنی زہرہ کا حلیف تھا مقام جحفہ میں اپنی قوم سے کہا کہ اے بنی زہرہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال اور تمہارے آدمی یعنی مخرمہ بن نوفل کو جو ابوسفیان کے ساتھ تھا نجات دے دی، اب تمہیں کیا ضروری ہے کہ تم خواہ مخواہ پریشان ہو، جس کام کی خاطر تم آئے تھے، وہ کام ہو گیا، میرے نزدیک یہی مناسب ہے کہ تم اس (ابوجہل) کے کہنے میں نہ آؤ اور اپنے گھر کو چل دو، چنانچہ بنوزہرہ کے تمام لوگ اور بنی عدی بن کعب کے سب لوگ مکہ کو واپس ہو گئے، بدر میں ان میں سے ایک بھی شریک نہ ہوا۔ اسی طرح طالب بن ابی طالب بھی چند لوگوں ساتھ مکہ کو واپس ہو گئے، کیونکہ قریش نے ان سے کہا تھا کہ اے بنی ہاشم! اگرچہ تم ہمارے ساتھ چلے آئے ہو مگر تمہارا دل محمد ہی کی طرف ہے۔ باقی قبائل قریش بدر کی طرف ابوجہل کی سرکردگی میں روانہ ہوئے۔

سیرت ابن ہشام کی مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں خود فیصلہ کیجئے کہ مسلمانوں کی طرف سے کس قدر شدّومدّ سے یہ کہا جاتا ہے کہ قریش مکہ کے ایک ہزار (ایک اور قول کے مطابق 900) کے مقابلے میں مسلمان محض 313 تھے، لیکن یہ بیان نہیں کیا

جاتا کہ جنگ سے قبل ہی قریش کے قافلے سے بنوزہرہ، اور بنی عدی بن کعب کے تمام لوگ، اور طالب بن ابی طالب اپنے ساتھیوں ہمراہ جنگ سے قبل ہی مکہ واپس لوٹ گئے تھے، اب ابن ہشام نے ان واپس لوٹ جانے والوں کی تعداد تو ذکر نہیں کی، (طبقات ابن سعد میں بنوزہرہ کے افراد کی تعداد ایک سو تا تین سو ذکر کی گئی ہے، اسی طرح بنوعدی بن کعب کی تعداد بھی قیاس کی جاسکتی ہے) لیکن بنوزہرہ اور بنوعدی بن کعب کے تمام لوگوں کی واپسی کے ذکر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ گنتی کے چند افراد تو نہیں ہوسکتے، جیسا کہ طالب بن ابی طالب کے ساتھ کے ساتھیوں کیلئے "چند افراد" کا ذکر کیا۔ اس لئے دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ اس جنگ کو ایک ہزار (یا900) بمقابلہ 313 قرار نہ دیا جائے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قریش مکہ کی تعداد مسلمانوں کے برابر یا ڈیڑھ گنا زیادہ ہوگی۔ نیز مسلمانوں کو تو کم از کم غزوۂ بدر کو 313 بمقابلہ ایک ہزار نہیں کہنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق غزوہ بدر میں پانچ ہزار فرشتے بھی مسلمانوں کی جانب سے شریک قتال تھے۔

مکالمہ علم و عقیدہ

مسلم: تم خدا کو نہیں مانتے؟

ملحد: نہیں میں خدا کو نہیں مانتا!

مسلم: تعجب ہے، کیسے کوئی خدا کا انکار کر سکتا ہے۔

ملحد: جو چیز وجود رکھتی ہے وہ اپنا وجود خود منوا سکتی ہے، اگر خدا موجود ہوتا تو اپنا وجود خود منوا سکتا تھا، اور مجھے اسے ماننے میں کوئی عار نہ ہوتا۔

مسلم: عجیب آدمی ہو، خود ہی کہتے ہو خدا اپنا وجود خود منوا سکتا ہے، اور وہ منواتا بھی ہے، پھر بھی تم اس کا انکار کرتے ہو۔

ملحد: دیکھو! نے یہ کہا ہے کہ "اگر خدا موجود ہوتا تو اپنا وجود بھی منوا سکتا تھا" میرے خدا کو نا ماننے اور تمہارے خدا کو ماننے میں فرق یہ ہے تمہیں کوئی بات بطور عقیدہ بتائی جاتی ہے تو تم اس پر فوراً یقین کر لیتے ہو کہ یہ تو عقیدے کا مسئلہ ہے، اور تمہاری دینی تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ عقیدے کے بارے میں سوال کرنا، غور و فکر کرنا اور اسے کسی عقلی معیار پر پرکھنا شجر ممنوعہ ہے، اس لئے تم عقیدہ کے ماننے والے ہو، تمہیں ہوش سنبھالتے ہی یہ بتایا گیا کہ خدا ہے، اور تم نے اسے مان لیا، کبھی اس پر شک نہیں کیا، کبھی دوسرے پہلو پر غور و فکر ہی نہیں کیا کہ سچائی تمہارے عقیدے کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔

مسلم: تو تم عقیدے کو نہیں مانتے ہو؟

ملحد: نہیں میں عقیدے کو نہیں مانتا۔

مسلم: پھر تم کسی بات کا یقین کیسے کر لیتے ہو؟

ملحد: میں علم کو مانتا ہوں۔ جو بات معلوم ہو سکے میں اسے مانتا نہیں بلکہ اسے جانتا ہوں۔ ماننے اور جاننے میں یہی فرق ہے، یہی فرق ہے عقیدے اور علم میں۔

مسلم: دنیا میں بہت سی چیزیں ہوں گی جو تم نے خود نہیں دیکھی ہوں گی مگر تم اسے مانتے ہو، پھر یہ جاننا کیسے ہوا؟ میرے دوست تم بھی عقیدہ پرست ہو، تم بھی باتوں کو مانتے ہو، اور جانے بغیر ان پر یقین بھی رکھتے ہو۔ تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے، تم صرف باتوں کو گھمانا جانتے ہو۔

ملحد: ایسا نہیں ہے، میں عقیدہ نہیں علم پر یقین رکھتا ہوں۔

مسلم: اچھا ایک بات بتاؤ؟ تم خدا پر تو یقین نہیں رکھتے، لیکن کیا تم ایٹم پر یقین رکھتے ہو؟

ملحد: ہاں رکھتا ہوں۔

مسلم: تو پھر تو تم ایٹم میں موجود الیکٹران، پروٹان پر بھی یقین رکھتے ہو گے؟

ملحد: ہاں رکھتا ہوں

مسلم: کیا تم نے کبھی اپنی آنکھوں سے ایٹم کو دیکھا ہے۔ تم نے خود کبھی الیکٹران یا پروٹان کا مشاہدہ کیا ہے؟

ملحد: نہیں میں نے کبھی ایک سنگل ایٹم کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی الیکٹران اور پروٹان کا مشاہدہ کیا ہے۔

مسلم: تو بس پھر یہ بات ثابت ہو گئی کہ تم ایٹم اور الیکٹران اور پروٹان کو صرف عقیدہ کی بنیاد پر مانتے ہو، نہ خود کبھی دیکھا، نہ مشاہدہ کیا، نہ کبھی ان کے وجود پر شک کیا، نہ کبھی تحقیق کی، نہ کبھی چھان پھٹک کرنے کی کوشش کی۔ ہاہاہاہا تم تو چاروں شانے چت ہو گئے ہو۔

ملحد: دیکھو جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں ایٹم کے وجود کے پر یقین رکھتا ہوں اور الیکٹران اور پروٹان کے وجود کا قائل ہوں اگر چہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ان کا مشاہدہ نہ کیا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ عناصر کبھی انسانی مشاہدے میں نہیں آئے۔ انسان نے ان کا مشاہدہ کیا ہے اپنے حواس خمسہ سے انہیں محسوس کیا ہے۔ ایٹم کا مشاہدہ عام حالات میں نہیں ہو سکتا بلکہ اس کیلئے ایک لیبارٹری کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ آلات کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر ایٹم اور اسکے اجزاء کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن انسانوں کو یہ سہولیات دستیاب ہیں انہوں نے بلاشبہ یہ مشاہدہ کیا ہے۔ تو سائنسدانوں نے بنفس نفیس یہ مشاہدہ کرنے کے بعد ہمیں بتایا کہ ایٹم کی ساخت کیسی ہوتی ہے۔ تو چونکہ ایٹم اور اس کی ساخت کا علم مجھ تک ایک ایسے معتبر ذریعے سے پہنچا ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا اس لئے میرے پاس کوئی اور اختیار موجود ہی نہیں ہے۔

مسلم: ایک منٹ! ایک منٹ! بس یہیں رک جاؤ ابھی ابھی تم نے کہا تم نے خود کبھی ایٹم اور اس کے اجزاء کا مشاہدہ نہیں کیا تمہیں سائنس دانوں کے ذریعے معلوم ہوا جنہوں نے ایٹم اور اسکے اجزاء کا بذات خود مشاہدہ کیا انہوں نے اپنا علم تم تک منتقل

کیا اور تمہیں یہ حقیقت معلوم ہو گئی کہ ایٹم اور اسکے اجزاء وجود رکھتے ہیں، یعنی ایک معتبر ذریعہ سے تمہیں یہ علم حاصل ہوا اور تم اس پر یقین کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک سچا نبی آیا جس نے جبرائیل کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا، جو فرشتوں اور جنات کو دیکھنے کی قدرت رکھتا ہے، جسے اللہ نے جنت و دوزخ کی سیر کرائی، پل صراط کا مشاہدہ کرایا، پچھلے گذرے ہوئے انبیاء سے ملاقات کرائی، سابقہ کتابیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور پھر یہی ساری باتیں ہمیں بتائیں، تو تمہارا اس سائنسدان کی بات پر یقین کرنا اور میرا اپنے پیغمبر کی بات پر یقین کرنا ایک ہی بات تو ہے، تم بھی سائنسدان کی بتائی ہوئی بات پر یقین رکھتے ہو اور میں بھی اپنے پیغمبر کی بتائی ہوئی بات پر یقین رکھتا ہوں، جیسے تم ایٹم اور اسکے اجزاء کے وجود پر بن دیکھے سائنسدانوں پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوئے یقین رکھتے ہو ایسے ہی میں بھی اپنے پیغمبر کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوئے اللہ، فرشتے، انبیاء، الہامی کتابوں، جنت دوزخ، پل صراط، لوح محفوظ، اور جنات پر یقین رکھتا ہوں۔ اب تو تم اپنے ہی بیان کردہ اصولوں کے جال میں پھنس گئے ہو، اب ذرا اس جال سے نکل کر تو دکھاؤ، آج تو تمہیں کلمہ پڑھوا کر ہی چھوڑوں گا۔

ملحد: میرے بھائی! میرے بھولے دوست! اگر میں بھی محنت کروں اور سائنس کا علم حاصل کر لوں، پھر مجھے لیبارٹری اور مطلوبہ آلات بھی دستیاب ہوں تو میں بذات خود بھی ایٹم اور اسکے اجزاء کا مشاہدہ کر سکتا ہوں، کیا تم علم حاصل کر کے یا محنت، ریاضت یا عبادت کر کے یا کوئی اور طریقہ اختیار کر کے اپنے مذہبی عقائد کی تصدیق کے حصول کیلئے اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتے ہو؟ جیسے سائنسدان ایٹم اور اس کے اجزاء کا مشاہدہ کرتا ہے، تم بھی مذہبی دعووں کا مشاہدہ کر سکتے ہو؟ کیا تمہارے پیغمبر نے جو دعوے کئے ان کی تصدیق کسی آزاد ذریعہ سے کی جا سکتی ہے؟۔ جبکہ سائنس داں جو بھی دعویٰ کریں تو اس دعویٰ کی آزاد ذرائع سے تصدیق بالکل ممکن ہے، بلکہ اگر آزاد ذرائع سے اس دعویٰ کی تصدیق نہ ہو تو ایسا دعویٰ مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے ممکن نہیں ہے کہ کوئی سائنسدان جھوٹ بول کر گمراہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ دنیا میں لاکھوں دیگر سائنسدان موجود ہیں جو لیبارٹری ٹیسٹ کی بنیاد پر اس کے کھرے کھوٹے کو الگ کر دکھا سکتے ہیں۔ مگر افسوس تمہارے پاس ایسا کوئی معیار، کوئی ذریعہ، کوئی بنیاد موجود نہیں جو کسی نبی کے دعویٰ کے تصدیق کر سکے۔ کیا آج تک تمہارے پیغمبر کے دعووں کی مسلمانوں کے علاوہ کسی آزاد یا غیر جانب دار ذریعہ نے تصدیق کی ہے؟

مسلم: تمہارے ہر اعتراض کا جواب ہمارے قرآن میں موجود ہے، لیکن ابھی مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے، میں پھر کبھی بعد میں تمہارے تمام اعتراضات کا جواب قرآن سے دوں گا، ابھی مجھے اجازت دیں۔

ملحد: بالکل اجازت ہے، میں جواب کا بھی منتظر رہوں گا لیکن جاتے جاتے اپنے ایمان سے ایک بات تو بتا جاؤ۔

مسلم: ہاں پوچھو!

ملحد: سچی سچی بتاناتم نے آج تک خود ترجمے کے ساتھ مکمل قرآن سمجھ کر کبھی پڑھا بھی ہے۔
مسلم: عربی میں قرآن تو بہت بار پڑھا ہے،، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ترجمے کے ساتھ خود کبھی نہیں پڑھا۔

اسلام کے بنیادی ارکان اور ان کے اثرات

صحیح بخاری، کتاب الایمان کی حدیث ہے:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ: ”بنی الإسلام علی خمس شھادۃ أن لا إلہ إلا اللہ وأن محمدا رسول اللہ، وإقام الصلاۃ، وإیتاء الزکاۃ، والحج، وصوم رمضان“۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے۔ اول گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

میری کوشش ہے کہ میں اسلام کے ان پانچوں بنیادی ارکان کی مختصر وضاحت اور مسلمانوں کی زندگی پر ان اہم ترین ارکانِ اسلام (جنہیں اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے) کے عمومی اثرات کا جائزہ آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔

توحید

توحید کا مفہوم یہ ہے کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے، وہی عبادت کے لائق ہے، اس لئے متعدد معبودان باطلہ کی عبادت کے بجائے ایک معبود کی عبادت کی جائے۔ توحید کے عقیدے کا لازمی اثر ایک مؤحد کی زندگی میں فکری ارتکاز کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے۔ اگر ایک معاشرے میں مختلف معبودوں کی عبادت کی جاتی ہوگی تو ان میں ہر کوئی اپنے معبود کو دوسروں کے معبود سے افضل قرار دیئے جانے کی بنیاد پر اختلاف کرنا، اور لڑنا جھگڑنا عین ممکن ہے، لیکن توحید اپنے ماننے والوں کو یہ موقع ضرور فراہم کرتی ہے کہ کم از کم معبود کی ذات کے حوالے سے ان کے باہمی اختلاف کی بنیاد ختم ہو جائے۔ دنیا کے کئی مذاہب، توحید کے علمبردار ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں، لیکن اسلام کا عقیدہ توحید دیگر مذاہب کی نسبت سادہ، آسان فہم اور ترقی یافتہ ہے۔

لیکن حیران کن بات ہے کہ دنیا کا سب سے ترقی یافتہ عقیدہ توحید رکھنے والے مسلمان باہمی اختلافات اور عدم برداشت میں دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی نسبت امتیازی مقام رکھتے ہیں اور اپنے اس رویّے کی بناء پر دنیا میں سب سے زیادہ معبود رکھنے والے ہندوؤں سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں جو 33 کروڑ دیوی دیوتاؤں کو پوجا کے قابل سمجھتے ہیں، لیکن ہندو اپنے بھگوانوں کو لے کر کبھی دنگے فساد کرتے نظر نہیں آتے۔ جبکہ اس کے برعکس دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے

مسلمانوں میں عدم اتفاق اورعدم برداشت کارویہ عموماً یکساں طور پر پایا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید کے دعوے داروں کی زندگی میں عقیدۂ توحید ان کی ذاتی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی کردار ادا نہیں کرپایا۔ دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ باہمی اختلافات کو ختم کرنے کیلئے ایک زبردست مشترکہ قدر (Common Value) رکھنے کے باوجود نہ صرف اتفاق و اتحاد کی برکت سے محروم ہے بلکہ آپس میں بہت بری طرح سے دست بگریباں ہے۔

صلوٰۃ

اسلام میں صلوٰۃ یا نماز کو دین کا ستون، قرار دیا گیا ہے، گویا دین کی پوری عمارت نماز پر قائم ہے۔ نماز کی ادائیگی کا انداز میدان جنگ میں ایک لشکر کی ترتیب سے بہت مماثل ہے، جس میں ایک سپہ سالار لشکر کی قیادت کررہا ہوتا ہے، ایک نقارچی ہوتا ہے جو سپہ سالار کے تمام احکامات وپیغامات کو لشکر کے تمام افراد تک پہنچانے کی ذمہ داری انجام دیتا ہے، اور پھر صف بستہ فوج، جو اپنے سپہ سالار کے ایک ایک حکم کو سن کر پوری تندہی سے انجام دینے کی کوشش کرتی ہے، نماز کی ادائیگی بھی اسی منظم انداز میں ہوتی ہے، اور مسلمان اسکالرز جہاں نماز کے دیگر فوائد کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس فائدے کا خصوصی ذکر ہوتا ہے کہ نماز کی ادائیگی مسلمان میں نظم وضبط پیدا کرتی ہے۔

لیکن جب ہم مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی نظم ونسق کی خوبی سے یکسر عاری ایک بے ہنگم ہجوم کی صورت نظر آتی ہے، ایک مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نماز کے ذریعے نظم ونسق پیدا ہونے کا کوئی عملی مظاہرہ ہمیں نظر نہیں آتا۔

قرآن کی ہی ایک آیت میں ذکر ہے کہ نماز بے حیائی برائی سے روکتی ہے، لیکن مشاہدہ اور تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے، اور ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات دیکھتے ہیں کہ بہت پابندی سے نماز ادا کرنے والے لوگ بڑی دیدہ دلیری سے معاشرتی ودیگر برائیوں کا ارتکاب کرتے نظر آتے ہیں، یہ خبر بھی آپ کی نظروں سے ضرور گذری ہوگی کہ انٹرنیٹ پر پورن میٹیریل کو سرچ کرنے میں اسلام کا قلعہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" سرفہرست ہے۔

پابندیٔ اوقات کو بھی نماز کی پابندی کے ثمرات میں سے گنوایا جاتا ہے، مگر مسلمانوں میں بحیثیت قوم نماز کا یہ اثر بھی مفقود ہی نظر آتا ہے۔

نماز کیلئے جسمانی طہارت کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے، ایک مسلمان کو نماز ادا کرنے کیلئے باغسل اور باوضو ہونا ضروری ہے، کہا جاتا ہے کہ غسل اور وضو ایک مسلمان کیلئے ظاہری طہارت ہے اور یہ ظاہری طہارت باطنی طہارت کا سبب بنتی ہے، صفائی ستھرائی کو نصف ایمان بھی قرار دیا گیا ہے، اس کا لازمی اثر ایک مسلمان کی زندگی پر یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی میں بھی صفائی ستھرائی کا عملی مظاہرہ کرے، لیکن مسلمان ممالک میں عمومی طور پر اس صفائی ستھرائی کا فقدان اس بات کا ثبوت ہے

کہ صفائی ستھرائی کو نصف ایمان قرار دیئے جانے کے باوجود اسے اجتماعی طور پر اپنانے سے گریزاں ہیں، اوران کے گلی محلے، قصبے اور شہر صفائی ستھرائی کے اعتبار سے انتہائی ابتری کا شکار ہیں۔

صیام

صوم یا روزہ شرعی طور پر ماہ رمضان میں دن کے مخصوص حصے میں کھانے، پینے اور جنسی تعلق سے خود کو روکے رکھنے کا نام ہے، روزہ دین اسلام کی اہم ترین عبادتوں میں سے ایک ہے، اور رمضان کا مہینہ دین اسلام میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، رمضان کے مہینے میں ہی مسلمان روزے رکھتے ہیں، تراویح جیسی عبادت انجام دیتے ہیں جسے ادا کرنے کا موقع سال بھر میں صرف ماہ رمضان میں ہی میسر آتا ہے، قرآن بھی ماہ رمضان میں نازل ہوا، شب قدر بھی رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کی جاتی ہے، رمضان کے اختتام پر مسلمان اپنا اہم ترین تہوار عید الفطر مناتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اہم بات یہ کہ رمضان کے مہینے میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔

رمضان کا پورا مہینہ گویا مسلمانوں کیلیئے ایک ٹریننگ کیمپ ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی نظریاتی اور عملی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ مسلمان بھوک، پیاس کو برداشت کرنے کی تربیت سے گذر کر عملی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا صبر اور برداشت کے ذریعے کرکے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں جس کی بنیاد صبر اور برداشت جیسی اعلیٰ صلاحیت اور خوبیوں پر قائم ہو۔

رمضان کے مہینے میں مسلمانوں کی اس قدر کٹھن نظریاتی اور عملی تربیت کے باوجود دیکھتے ہیں کہ مسلم معاشروں میں صبر اور برداشت کا عملی مظاہرہ بالکل بھی نظر نہیں آتا۔ رمضان کا مہینہ گذرنا تو درکنار، مسلمان ماہ رمضان میں ہی آپ کو صبر اور برداشت کے جامے سے باہر ہوتے ہوئے عموماً نظر آجاتے ہیں، جوں جوں روزہ افطار کرنے کا وقت قریب آتا ہے، بازاروں، محلوں اور سڑکوں پر بے صبری اور عدم برداشت کے بیسیوں عملی نمونے آپ خود اپنی نگاہوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ شیطان کے قید ہونے کے باوجود جرائم کی شرح میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ذخیرہ اندوزی، اور منافع خوری اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ یہ تو عین رمضان کے مہینے کے مشاہدات ہیں، باقی پورا سال تو نور علی نور کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔

زکوٰۃ

مسلمانوں پر فرض ہے کہ سال بھر کی ضرورت سے زائد آمدنی پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ ادا کریں۔ زکوٰۃ کو مال کی طہارت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کا مصرف قرآن کے مطابق غرباء، فقراء اور مساکین ہیں۔ مالدار مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کرنے کا مقصد قرآن کے بیان کردہ مصرف سے بھی واضح ہوتا ہے کہ غریب اور نادار لوگوں کی مدد ہو، غربت کا خاتمہ ہو، اور جذبہ ایثار پیدا ہو۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مالدار اور صاحب ثروت مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد اور نظام زکوٰۃ کی موجودگی کے باوجود دنیا کا کوئی ایک خطہ بھی اس حوالے سے بطور مثال پیش نہیں کیا جاسکتا جہاں نظام زکوٰۃ کے ذریعے غربت کا خاتمہ کیا گیا ہو۔ دنیا بھر میں غربت اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گذارنے والوں کی ایک بہت بڑی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ علماء کرام یہ صراحت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم صرف مسلمانوں پر ہی خرچ کی جاسکتی ہے (حالانکہ قرآن زکوٰۃ کی رقم غیر مسلموں پر خرچ کرنے کی ممانعت نہیں کرتا) اس صراحت کے بعد عملاً ایسا ہونا چاہئے تھا کہ دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی غریب مسلمان نہ ملتا۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ آنکھ بند کرکے دنیا بھر کے غریبوں پر ہاتھ رکھا جائے تو ہر دوسرا غریب مسلمان نکلے گا۔

حج

حج ایک ایسی عبادت ہے جو مسلمان پر زندگی بھر میں استطاعت کی شرط کے ساتھ ایک دفعہ ادا کرنا فرض ہے۔ علماء کرام حج کی حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کے اجتماعی اور انفرادی فوائد ہیں۔ اجتماعی فائدہ یہ ہے کہ حج مسلمانوں کی بین الاقوامی کانفرنس ہے، جس میں مسلمان سال بھر میں ایک دفعہ جمع ہوکر اپنے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل بیان کرسکیں اور مشترکہ طور پر ان کا حل تلاش کرسکیں۔ حج کا انفرادی فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حج کی ادائیگی کے بعد ایک مسلمان گناہوں سے اس طرح پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسے ایک نومولود معصوم بچہ جس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ دیگر ارکان اسلام کی طرح ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حج کا بھی مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، پوری دنیا میں مسلمانوں کی صورت حال کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ مسلمان بحیثیت ایک قوم سیاسی، معاشرتی اور معاشی طور پر انتہائی پسماندہ ہیں، حج کے ذریعے کبھی مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلے کا حل نہیں نکالا جاسکا۔ حج مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے میں بھی بالکل بے اثر ثابت ہوا ہے۔ موجودہ دور میں صورت حال یہ ہے کہ ہر سال لگ بھگ تیس تا چالیس لاکھ لوگ حج کرتے ہیں، جس پر مجموعی طور پر کھربوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ سعودی حکومت نے ملکی قوانین کچھ اس طرح وضع کررکھے ہیں کہ مسلمانوں کی عمر بھر کی کمائی جو حج پر خرچ ہوتی ہے اس کا بیشتر فائدہ سعودی حکمران طبقے کو پہنچتا ہے، اور یہ حاصل شدہ فائدہ کہاں اور کس مصرف پر خرچ ہوتا ہے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

اسلام تو اپنے ان بنیادی ارکان اور عبادات سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ کرسکا لیکن یہ اتحاد و اتفاق، نظم و نسق، صبر اور برداشت، غربت کا خاتمہ، اور معاشرتی و سیاسی مسائل کا حل مغرب نے وحی الٰہی کی روشنی کے بغیر حاصل کرلیا۔ ہم ابھی تک اپنی بداعمالیوں کو معاشرے میں شرح جرائم کا اضافہ سمجھ رہے ہیں۔

اسلام کیسے پھیلا؟

عام طور پر مسلمانوں میں یہی مشہور ہے کہ اسلام کی دعوت کے پھیلنے کا سب سے بڑا سبب خود محمد صلعم اور ان کے ساتھیوں کا کردار تھا یا اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا معجزہ تھا کہ جو بھی سنتا ایمان لے آتا اور اس پر مسلمانوں کی کتب میں کئی ایک واقعات بیان ہوئے ہیں جبکہ جو شخص تھوڑا بہت بھی اسلامی تاریخ سے شغف رکھتا ہے، اس پر اس بات کا کھوکھلا پن بہت جلد واضح ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت اسلام کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک مکی دور اور دوسرا مدنی دور۔ مکہ کی 13 سالہ دعوت کے دوران بہت تھوڑی تعداد مسلمان ہونے والوں کی تھی اور ان میں سے بھی بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو اس عرب معاشرے میں پس رہے تھے۔ اس دور میں قرآن کوئی خاص اثر دکھا سکا اور نہ محمد صلعم اور ان کے ساتھیوں کے اسوہ و کردار کی کہانیاں۔

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد جب رفتہ رفتہ مسلمانوں کو قوت حاصل ہونا شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اسلام کا پھیلاؤ بھی تیز ہوا اور فتح مکہ کے بعد وہی تمام لوگ جن کو قرآن اسلام کی طرف لا سکا اور نہ محمد صلعم کا کردار، وہ سب اپنے ذاتی مفادات اور جانوں کے تحفظ کی خاطر مسلمان ہو گئے۔ اس ضمن میں تین بڑے عوامل ہمارے سامنے آتے ہیں، جن کی با دلیل تفصیل ذیل میں بیان کی جارہی ہے۔

زور زبردستی کا اسلام

صحابی رسول صلعم ابو ہریرۃ نے ایک آیت کی تفسیر میں فرمایا: "تم سب لوگوں میں تمام لوگوں کے لئے بہترین ہو کیونکہ تم انہیں، ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر لے آتے ہو حتیٰ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ، حدیث:4557)

مدینہ منورہ میں قوت حاصل کر لینے کے بعد اس زور زبردستی کے ساتھ لوگوں کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر اسلام قبول کروانے والی پالیسی کو دن بدن مقدم کیا گیا۔ جتنی مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی رہی اتنی ہی زور زبردستی کی اس پالیسی پر اسلام کا پھیلاؤ ہوتا رہا۔

محمد صلعم کے بھیجے ہوئے سپاہی تلوار لئے لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوتے اور ان سے صاف کہتے، "کلمہ شہادت پڑھ لے بصورت دیگر میں تیری گردن اڑادوں گا"۔ اس احسن دعوت کے نتیجے میں کلمہ شہادت پڑھ لیا جاتا۔

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذی الخلصۃ، حدیث:4357)

مدینہ اوراس کے آس پاس مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ مسلمانوں سے کسی کی جان ومال کے تحفظ کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مسلمانوں کے نبوی مجاہد نکلتے، عام بکریاں چراتے چرواہے تک کو مسلمان نہ سمجھتے تو قتل کر دیتے اور اس کی ساری بکریوں پر قبضہ کر لیتے۔

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ولا تقولوالمن حدیث:4591)

محمد صلعم کی جانب سے دوسرے قبائل کو اپنی نبوت کے قبول کرنے کی جو دعوت دی جاتی تھی اس میں با قاعدہ دھمکیاں دی جاتی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دین اسلام کو قبول نہ کیا تو ہم تم لوگوں پر حملہ آور ہوں گے۔

یمامہ کے رہنے والے ایک شخص کو جب محمد صلعم کی طرف سے نبوت کا ایسا ہی دعوتی خط ملا تو اس نے اس خط کی جب کوئی پرواہ نہ کی تو محمد صلعم نے اپنے فوجیوں کا دستہ اس کی طرف بھیجا، انہوں نے اس شخص کا مال واسباب اور تمام اہل وعیال کو قابو کر لیا۔ جس کے بعد یہ شخص مدینہ پہنچا، اسلام قبول کیا اور یوں اپنے مال واسباب اور اہل وعیال کا تحفظ کر لیا۔

اس ساری تفصیل کے لئے دیکھئے مشہور عربی سیرت نگار دکتور مہدی رزق اللہ احمد کی کتاب سیرت نبوی (جلد دوم، ص 123، مطبوعہ دارالسلام پبلشرز لاہور)

ان حالات میں مدینہ اور اس کے گرد وپیش کے لوگوں کے پاس اپنی جان ومال اور عزت کے تحفظ کا ایک ہی مستقل حل تھا اور وہ تھا اسلام کو قبول کر لینا۔ مدینہ میں منافقین کی ایک بڑی جماعت کے جس وجود کا رونا مسلمان ہمیشہ سے روتے آئے ہیں، وہ اسی زور زبردستی اور جبر کے ماحول کا نتیجہ تھی۔ منافقین کا یہ گروہ محض اپنی جان ومال اور عزت کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے مستقل طور پر محفوظ رکھنے کے لئے اسلام قبول کئے بیٹھا تھا اور اس کے بعد حالات یہ تھے کہ کسی بھی صورت یہ لوگ اسلام کو چھوڑ نہ سکتے تھے کیونکہ تب بھی ارتداد کی صورت میں قتل کر دیے جانے کا مستقل حل اسلام ان کے لئے پیش کر چکا تھا۔

منافقین کی یہ جماعت اپنے جان ومال کی خاطر جبر کے جن حالات کا شکار تھی، ان کی آنے والی نسلوں پر ان کے حوالے سے، اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، یہ ایک الگ تفصیل طلب موضوع ہے۔ یہاں تک یہ تفصیل اس لئے ضروری تھی کہ دلائل کے ساتھ یہ بات پیش کر دی جائے کہ اسلام کے پھیلنے بلکہ پھیلانے میں زور زبردستی اور جبر کا بہت بڑا عنصر شامل تھا۔

عربوں کی پسماندہ ذہنیت

عربوں کی اکثریت اس دور میں ایک انتہائی جاہل اور پسماندہ ذہنیت رکھنے والے افراد پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کے لئے اپنے دین کی حقانیت اور دوسرے کے دین کے بطلان کی کوئی علمی و ٹھوس وجوہات موجود نہیں تھیں۔ سرداروں پر مشتمل قبائلی نظام تھا اور اکثر ایسا ہوتا کہ قبیلے کا سردار جو دین قبول کر لیتا، وہی اس قبیلے کے باقی لوگ بھی قبول کر لیتے۔ ذہنی پسماندگی اس حد تک تھی کہ حق اور باطل کا فیصلہ جنگوں اور لڑائیوں کی ہار جیت سے کیا جاتا۔ فتح مکہ کے بعد جوق در جوق جو لوگ اسلام میں داخل

ہوئے، اس کی وجہ قرآن یا نبوی تعلیمات کا کوئی مثبت پہلو نہ تھا بلکہ اسلام میں ان لوگوں کے دخول کا سبب یہی ذہنی پسماندگی تھی۔

چنانچہ ایک صحابی رسول عمرو بن سلمہ نے خود بیان کرتے ہوئے کہا: "اور اہل عرب مسلمان ہونے کے لئے فتح مکہ کے منتظر تھے اور کہتے تھے کہ حضرت محمد صلعم کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر حضرت محمد صلعم ان پر غالب آ گئے تو وہ نبی بر حق ہیں۔ پھر جب مکہ فتح ہوا تو ہر ایک قوم نے چاہا کہ وہ پہلے مسلمان ہو جائے۔"

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 4302)

اس سے خود اندازہ لگایئے عرب کس قدر ذہنی طور پر مفلوک الحالی کا شکار تھے۔ ان لوگوں نے محض اس لئے اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام کو قبول کر لیا کہ ان کے خیال میں جو غلبہ پا جائے وہ حق پر ہوتا ہے۔ قرآن یا محمد صلعم کی تعلیمات یا ان کے کسی معجزے سے ان کا نبی ہونا، ان کو قبول نہ ہوا تھا بلکہ محض اس لئے کہ محمد صلعم مکہ والوں پر غلبہ پا گئے تھے۔ گویا خود اسلام کے دعوے کے مطابق اتنے بے شمار نبی جو غلبہ نہ پا سکے اپنی قوموں پر، وہ جھوٹے ہو گئے اور محمد صلعم اس لئے نبی بر حق ہوئے کہ اپنی قوم پر غلبہ حاصل کر گئے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسی مفلوک الحال اور پسمانہ ذہنیت کے لوگوں کا اسلام قبول کرنا، قرآن بطور فخر بیان کرتا ہے کہ لوگ گروہ در گروہ دین اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ (سورۃ النصر:2)

کوئی بھی فہم و فراست والا انسان کبھی بھی ہار جیت یا غلبہ و مغلوبیت کو حق و باطل کا معیار نہیں بنا سکتا۔ دین، عقائد و نظریات کے بدلاؤ میں جنگ یا لڑائی کا نتیجہ کیسے کوئی فیصلہ کن بنیاد بن سکتا ہے؟ آج اگر مسلمانوں کو ہر طرف سے کفر کے مقابلے میں ذلت آمیز رسوائیوں کا سامنا ہے تو کیا یہ کفر کے حق اور اسلام کے باطل پر ہونے کی دلیل ہو گی؟ مگر افسوس کے اس وقت کے عرب ایسی ہی ذہنیت کے حامل تھے اور یہی پسماندہ ذہنیت کے لوگ اسلام کے پھیلاؤ کا دوسرا بڑا سبب تھے۔

مال و اسباب کا لالچ

دور نبوی میں ہی مدینہ کے گرد و پیش، پھر فتح مکہ اور اس کے بعد جو فتوحات ہوئیں، ان میں مسلمانوں نے بے شمار مال و اسباب شکست کھانے والوں سے لوٹا۔ اس مال و اسباب کو اسلام قبول کروانے کے لئے لوگوں کے سامنے بطور رشوت پیش کیا گیا۔

انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی قوم کو جا کر کہا:

"اے لوگو! مسلمان ہو جاؤ، اللہ کی قسم! محمد صلعم اتنا کچھ دیتے ہیں کہ محتاجی کا ڈر نہیں رہتا۔"

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ، حدیث 2311)

فتح مکہ کے بعد صرف غزوہ حنین میں مسلمانوں کی لوٹ مار کے حاصل کو بیان کرتے ہوئے عربی سیرت نگار ڈکتور مہدی رزق اللہ نے مختلف حوالہ جات کو پیش کرتے ہوئے لکھا:

"قیدی اور مال غنیمت کا کوئی شمار نہ تھا۔ روایت ہے کہ حنین کی جنگ کی قیدی عورتیں اور بچے چھ ہزار تھے۔ چاندی چار ہزار اوقیہ یعنی 1،60،000 درہم تھی۔ اونٹ چوبیس ہزار تھے۔ بھیڑ بکریاں چالیس ہزار سے زیادہ تھیں۔

(سیرت النبی، جلد دوم، ص 235، مطبوعہ دارالسلام پبلشرز لاہور)

محمد صلعم نے فتح مکہ کی فتوحات کے بعد مال غنیمت کی عام اسلامی تقسیم کا کوئی لحاظ نہ رکھا اور من مرضی سے لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بے دریغ مال خرچ کیا، حتیٰ کے اس کی خاطر اپنے ساتھیوں کی سخت کڑوی کسیلی بھی سننا پڑیں۔

صحابی رسول انس کی مختلف روایات میں ہے کہ :

"جس روز مکہ فتح ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش میں اموال غنیمت تقسیم کئے تو انصار غضبناک ہو گئے۔"

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث:4332)

"جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہوازن کے اموال بطور انعام عطا فرمائے تو انصار کے کچھ لوگوں کو رنج ہوا کیونکہ نبی صلعم نے لوگوں کو سو سو اونٹ دینا شروع کر دیے تھے۔ انصار نے کہا: اللہ تعالیٰ رسول صلعم کو معاف فرمائے، آپ قریش کو دے رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز کر رہے ہیں۔"

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث:4331)

من پسند اشخاص کو سو سو اونٹوں کے عطیات دینے پر ایک شخص نے صاف کہا: "اس تقسیم میں اللہ کی رضا کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔"

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث:4336)

سونے کی ایسی ہی من پسند تقسیم پر ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ "آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے کہا: ہم ان لوگوں سے زیادہ اس سونے کے حقدار تھے۔" جب محمد صلعم کو یہ خبر پہنچی تو شکوہ کرتے ہوئے کہا: "تم لوگ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔"

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث:4351)

ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ مال غنیمت کی کیسی اندھی و غیر منصفانہ تقسیم صرف اس لئے شروع کر دی گئی تھی کہ لوگ اسلام میں داخل ہوں اور اس کی خاطر اپنے پرانے ساتھیوں کی انتہائی سخت و تند باتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ ان باتوں پر زرا

غور فرمائیں، یہ ایسی سنگین ہیں کہ اگر آج کوئی محمد صلعم کے بارے میں کہے تو فوری طور پر اس کی گردن اتار دی جائے، لیکن یہ سب ایک بڑے مقصد کی خاطر برداشت کیا جارہا تھا۔

مختلف جنگوں میں لوٹ مار کے بعد حاصل ہونے والے اس کثیر مال و دولت کو لوگوں کے اسلام کی رشوت بنادیا گیا تھا۔ مال و دولت کے لالچ میں لوگ تیزی سے اسلام قبول کر رہے تھے اور اس مال کی خاطر ان کے دل کی دنیا بدل رہی تھی۔ محمد صلعم جو اتنا کثیر مال ان پر خرچ کر رہے تھے، ان کے لئے سب سے محبوب ذات بن رہے تھے۔

صحابی رسول صلعم صفوان بن امیہ اپنی دل کی تبدیلی کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! جس وقت رسول اللہ صلعم نے مجھے مال دینا شروع کیا تو میرے دل کی حالت یہ تھی کہ آپ صلعم مجھے تمام لوگوں سے بڑھ کر ناپسند تھے۔ آپ صلعم مجھے مال دیتے رہے، دیتے رہے، حتیٰ کہ آپ مجھے سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب ہو گئے۔"

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ، حدیث 2313)

صحابی رسول صلعم انس اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ بہت سے لوگوں نے صرف دنیا کی خاطر اسلام کو قبول کیا۔ چنانچہ فرمایا: "آدمی اسلام قبول کرنے لگتا ہے تو وہ محض دنیا کا خواہشمند ہوتا ہے اور پھر جیسے ہی اسلام قبول کرلیتا ہے، اسلام اسے دنیا اور اس کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب ہو جاتا ہے۔"

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ، حدیث 2312)

گویا کہ لوگ اسلام کو قبول دنیا کی خاطر ہی کر رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ مال انہیں محمد صلعم سے حاصل ہو سکے اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اس کے محبوب ہونے کی بات اسی لئے تھی کہ مال پر مال مل رہا تھا جیسا کہ صفوان بن امیہ کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک دفعہ دنیا کی خاطر اسلام قبول کر لینا ان کے پاس اب دوسرا کوئی راستہ واپسی کا نہ چھوڑتا تھا کیونکہ اسلام چھوڑنے کی صورت میں ارتداد کی سزا قتل ان کا مقدر تھی تو بہتری اسی میں تھی کہ یہ مال و اسباب والے دین کو دل و جان سے تسلیم کر لیا جائے۔

اس ساری تفصیل سے واضح ہے کہ مال و اسباب کی بے پناہ من چاہی تقسیم بھی ایک بڑا سبب اسلام کے فروغ کا بنی۔ کچھ پرانے ساتھیوں کی ناراضگیاں، من چاہی، غیر منصفانہ تقسیم کے الزامات سب اسی لئے برداشت کیا گیا کہ زیادہ سے زیادہ نئے لوگوں کو ایک دفعہ مال کی خاطر اسلام میں داخل کر لیا جائے کیونکہ پھر ان کی باسلامت واپسی ناممکن ہی تھی۔

دلائلِ نبوت عقل اور نقل کی روشنی میں

محمد صلعم کی ذات ایک ایسی ہستی کی ہے کہ جن کی نبوت پر اس دنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی پر مشتمل مسلمانوں کا ایمان ہے اور دنیا کی اتنی بڑی آبادی پر مشتمل یہ تعداد محمد صلعم کے نام پر ہر وقت مرنے مارنے پر تیار ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی منہ

نہیں موڑا جاسکتا یہ اتنی بڑی مسلم آبادی کے 99 فیصد حصے نے شاید کبھی سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ ہم لوگ محمد صلعم کو نبی کیوں مانتے ہیں؟ اصولی طور پر بات کی جائے تو "محمد صلعم کی نبوت کا معیار و دلیل کیا ہے؟"

مسلمانوں کے بڑے بڑے علماء تک اس سوال کے جواب اپنے پیدائشی طور پر مسلمان ہونے اور اسی بنیاد پر بچپن سے سیکھی اس بات کو اپنی دلیل سمجھتے ہیں کہ "محمد صلعم اللہ کے آخری نبی ہیں۔" کچھ لوگوں کیلئے تو یہ سوال ہی بڑی حیرت کا باعث ہے حالانکہ جب تمام مسلمان محمد صلعم کا آخری نبی مان کر ساری دنیا کو ان کی پیروی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں تو اس بنیادی سوال کا جواب دیا جانا نہایت ضروری امر ہے۔ سب سے پہلے ہم ان چند بزعم خویش فراہم کئے جانے والے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں جو مسلمانوں کی جانب سے محمد صلعم کی نبوت کی دلیل کے طور پر عموماً پیش کئے جاتے ہیں۔

معجزوں کی دلیل

مسلمان علماء و عوام بلا سوچے سمجھے جس بات کو محمد صلعم کی نبوت کی دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں ان میں سرِ فہرست ان کے معجزات کی کہانیاں ہیں جو خود مسلمانوں کی کتب میں موجود ہیں۔ ہم ان معجزوں کی حقانیت و بطلان پر بحث کئے بغیر اس بات کا اصولی جائزہ لیتے ہیں کہ کیا معجزوں کو نبوت کی دلیل مانا بھی جاسکتا ہے یا نہیں؟ ایک سابقہ مسلمان کے طور پر مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے علماء تک معجزوں کو نبوت کی دلیل بناتے ہوئے کس قدر علمی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معجزے کی تعریف میں یہ بات داخل ہے کہ "ایسا خرق عادت کام جو کسی نبی کے ہاتھ پر انجام پائے۔" یعنی کسی بھی خرق عادت کام کو دکھانے والے کو نبی نہیں مانا جاسکتا بلکہ پہلے کسی کو نبی تسلیم کیا جاتا ہے اور جب اس کے ہاتھ پر کوئی خرق عادت کام ظاہر ہو تو اسے معجزہ کہا جاتا ہے۔

یہ تو تھی اصولی بات جو اس غیر علمی دلیل کے رد کے لئے کافی ہے اور دوسری بات یہ کہ خود محمد صلعم نے اپنی نبوت کو پیش کرتے ہوئے کبھی معجزے کو دلیل نہیں بنایا۔ کیا ابو بکر و خدیجہ کوئی معجزہ دیکھ کر ایمان لائے تھے، اگر نہیں تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ نبوت کا معیار و دلیل معجزہ ہرگز نہیں۔ معجزوں کی جو کہانیاں پیش کی جاتی ہیں، وہ تو بہت بعد کا معاملہ ہے، حالانکہ اس سے بہت پہلے محض محمد صلعم کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرکے کئی لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور اس دعویٰ نبوت کی تکذیب کر کے ابو لہب جیسوں کی مذمت میں قرآن کی آیات باقاعدہ نام لے کر آچکی تھیں۔ اگر معجزہ دلیل تھا تو محمد صلعم نے جب تک ایسا کوئی کام نہیں دکھایا تو ظاہر ہے کہ اس دلیل کے تحت نبوت ابھی ثابت ہی نہیں اور تب تک ابو لہب اگر نہ بھی مانتا یا بُرا بھلا بھی کہتا تو کیا قصور تھا کہ نام لے لے کر قرآن میں اسے کوسنے دئے گئے؟ اور جنہوں نے محمد کو نبی مان لیا تھا وہ کس بنیاد پر حقیقی مومن قرار پاگئے تھے جبکہ معجزاتی دلیل پیش کرنے والوں کی رُو سے تو یہ لوگ اندھا ایمان لے آئے۔ مختصر یہ کہ نبوت کی

دلیل معجزے کو بنانا سوائے عقلی طور پر ناپختگی کے کچھ نہیں۔عوامی طور پر چونکہ یہ دلیل زیادہ پیش کی جاتی ہے اس لئے اس پر بحث پہلے کرنا مناسب سمجھا۔مزید پیش کئے جانے والے دلائل پر تجزیہ آگے پیش کروں گا۔

دیگر الہامی کتب کی دلیل

محمد صلعم کی نبوت کے اثبات میں ایک اور بہت بڑی دلیل کے طور پر جو بات مسلمانوں کی جانب سے ہمیشہ پیش کی جاتی رہی ہے ،وہ یہ ہے کہ دیگر الہامی کتب توریت و انجیل میں محمد صلعم کے بطور نبی آنے کا تذکرہ موجود ہے۔یہ بات چونکہ قرآن میں بھی موجود ہے کہ اہل کتاب (عیسائی اور یہودی) اپنی کتب میں محمد صلعم کا تذکرہ پاتے ہیں،اس لئے ہر مسلمان بغیر سوچے سمجھے اس بات کو دلیل سمجھتا ہے۔جس کسی میں بھی تھوڑی سی سمجھ بوجھ بھی ہو تو وہ یہ بات مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ بات دلیل نہیں بلکہ الگ سے ایک اور دعویٰ ہے۔پہلے تو آپ کو نبوت ثابت کرنا تھی اور اب آپ کو یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ دیگر الہامی کتب میں بھی محمد صلعم کے آنے کا تذکرہ موجود ہے۔

میں اس بحث میں جائے بغیر کے مسلمان اس ضمن میں اپنی مانی ہوئی تحریف شدہ کتب توریت و انجیل کے کن مقامات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں،ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں،جس سے یہ ثابت ہو گا کہ محمد صلعم اپنے دعویٰ نبوت کی طرح اس دوسرے دعویٰ میں بھی کبھی کوئی دلیل پیش نہ کر سکے۔

مسلمانوں کی امہات الکتب صحاح ستہ وغیرہ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہیں جن میں یہ موجود ہے کہ محمد صلعم نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہودیوں کے کئی احکامات ان کی کتابوں سے نکال کر دکھائے،جن کو یہودی چھپانا چاہ رہے تھے جیسا کہ زنا کی سزا رجم وغیرہ۔عرض یہ ہے کہ کیا محمد صلعم کی پوری سیرت میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ملتا ہے کہ محمد صلعم نے اہل کتاب کی کتب کو پیش کرتے ہوئے اپنی نبوت بھی ان کتب سے ثابت کی ہو؟کوئی ایک واقعہ جس میں محمد صلعم نے اپنے تمام ساتھیوں کو ساتھ ملا کر بھی یہودیوں کو یا عیسائیوں کو توریت یا انجیل کا وہ مقام دکھایا ہو،جہاں پر محمد صلعم کے آنے کا تذکرہ موجود تھا؟ انتہائی قابل افسوس معاملہ یہ ہے کہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔پچھلی کتب میں محمد صلعم کے آنے کا تذکرہ ایک دعوے کے طور پر کیا تو گیا مگر کبھی بھی اسے ثابت نہ کیا گیا چہ جائیکہ یہ بات خود محمد صلعم کی اپنی نبوت کی دلیل بن پاتی۔

آج مسلمانوں کے بڑے بڑے علماء توریت و انجیل کے ایسے مقامات کو من چاہے مطلب پہنا کر محمد صلعم کی نبوت پر دلیل بناتے ہین جہاں کسی نہ کسی انداز میں کسی آنے والے نبی کا تذکرہ موجود ہے حالانکہ یہ بات آج معنی ہی نہیں رکھتی کیونکہ خود محمد صلعم نے خود کوئی ایسی بات ثابت نہ کر سکے۔کیا محمد صلعم کے ماننے والے اپنے نبی سے بڑھ کر توریت و انجیل کے عالم ہیں کہ وہ باتیں بھی ان کتب سے نکال لاتے ہیں جو خود ان کا نبی بھی نکال سکا نہ کبھی پیش کر سکا۔

اس دلیل کے رد میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلمان خود محمد صلعم کے دور سے ہی اس بات کو مانتے آئے ہیں کہ توریت وانجیل تحریف شدہ ہیں اور خود قرآن کے مطابق اہل کتاب اپنی کتب میں اپنی مرضی سے کچھ چیزیں ملا لیتے ہیں۔ایسی صورتحال میں توریت وانجیل کا کوئی بھی مقام دلیل بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کیونکہ کیا معلوم کہ جو بات توریت وانجیل سے بطور دلیل پیش کی جارہی ہو،وہ خود تحریف شدہ ہو۔یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب کے ماننے والے کسی نہ کسی نبی کے آنے کے منتظر ہیں، یہ انتظار اس وقت بھی تھا جب محمد صلعم کا دور تھا اور آج بھی یہ انتظار جاری ہے کہ جب محمد صلعم کو گزرے چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔جب مسلمانوں کے اپنے دعوے کے مطابق یہودی اور عیسائی اپنی کتب میں دنیاوی مفاد کے عوض تحریف کر دیتے تھے تو کیا معلوم کس یہودی اور عیسائی نے اس آنے والے کا تذکرہ بھی محض اپنی قوم کو 'لارالیا" لگانے کے لئے ڈالا ہو۔لہٰذا مسلمانوں کے توریت وانجیل پر تحریف شدہ ہونے کے تسلیم شدہ الزامات کے بعد اسی کو محمد صلعم کی نبوت پر دلیل بنانا،اخلاقی طور پر بھی درست ہی نہیں۔اگر ایسا ہوتا بھی تو الزامی دلیل کو تحقیقی دلیل بنا کر پیش کرنا سوائے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے کچھ نہیں۔

اس بات کی تردید کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ محمد صلعم نے سب سے پہلے جن لوگوں کو اپنی نبوت کی دعوت دی تھی،وہ اہل کتاب نہیں تھے بلکہ مشرکین مکہ تھے۔یہ مشرکین مکہ توریت وانجیل کو نہیں مانتے تھے کیونکہ اگر وہ ان کتب کو مانتے تو عیسائی اور یہودی ہوتے نہ کہ بتوں کو پوجنے والے۔اگر توریت وانجیل میں محمد صلعم کا تذکرہ ہوتا بھی اور محمد صلعم نے وہ تذکرہ پیش کیا بھی ہوتا تو ان مشرکین مکہ پر اس کا پیش کیا جانا ایسا ہی ہے جیسے مسلمانوں پر ہندوؤں کی مقدس کتابیں دلیل بنانا۔(اسی طرح آج بھی توریت وانجیل سے محمد صلعم کی نبوت کو ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش دیگر مذاہب کے لئے یہی حیثیت رکھتی ہے) اب عرض یہ ہے کہ اہل کتاب میں محمد صلعم کا تذکرہ موجود بھی ہوتا تو ابولہب اور ابوجہل کیوں اس نبوت کو مانتے؟کیا یہ بات سمجھنے کے لئے کافی نہیں کہ محمد صلعم کا دعویٰ نبوت ہرگز بھی توریت وانجیل کے سہارے ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو پیش کئے بغیر خود محمد صلعم نے اپنی نبوت پیش بھی کی،نہ ماننے والوں کو کافر بھی قرار دیا اور مسلمان ہوجانے والوں کو ایمان کے اعلیٰ درجات کی خوشخبریاں بھی دیں۔گویا جس دلیل کو آج مسلمان بڑے زور وشور سے پیش کرتے ہیں،محمد صلعم نے اپنی نبوت کا دعویٰ کرتے ہوئے خود اس دلیل کو ٹکے جتنی حیثیت بھی نہیں دی۔

خاندان اور سیرت وکردار کی دلیل

مسلمانوں نے محمد صلعم کی نبوت کی دلیل کے طور پر ایک اور بات جو بہت کثرت سے بیان کی ہے،وہ محمد صلعم کی خاندانی عظمت اور خود محمد صلعم کا اپنے بلند اخلاق وکردار کا تذکرہ ہے،جو مسلمانوں کے مطابق تمام تر مخالفت کے باوجود مشرکین مکہ کو بھی تسلیم تھا۔

اس دلیل کا تجزیہ کرنے سے پہلے اصولی طور پر ایک بات سمجھنی ضروری ہے، وہ یہ کہ مخالف سے اپنی کسی خوبی کو منوانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مخالف نے وہ بات خود کہی اور اور خود تذکرہ بھی کیا ہو، ورنہ اپنی خوبیاں دوسروں کے منہ سے خود ہی بیان کرنا کبھی کوئی ثبوت قرار نہیں پا سکتا۔ اس بات کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ اگر غیر مسلموں کو ایک قوم سمجھیں اور اس پر مسلمانوں سے یہ کہا جائے کہ سلمان رشدی کہتا ہے کہ "مسلمان بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ابو جہل بڑا نیک، پرہیز گار اور رحم دل آدمی تھا" تو ہر مسلمان اس بات کا انکار کرے گا کیونکہ مسلمانوں کا مئوقف بتانے کا حق صرف مسلمانوں کو ہے، سلمان رشدی جیسے مسلمان مخالف کو نہیں۔ انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ پھر مسلمانوں کا اپنے علماء کی کتب کے حوالے سے کافروں کا یہ مئوقف بتانا کہ محمد صلعم نبوت سے پہلے بھی صادق و امین تھے یا بڑے بلند کردار کے مالک تھے، ایک غیر اصولی دلیل نہیں تو کیا ہے؟

جس طرح کسی اسلام مخالف کا مسلمانوں کے حوالے سے اپنی یا کسی اور اسلام مخالف کی تعریف کرنا کوئی وقعت نہیں رکھتا تو بھلا مسلمانوں کا کافروں کے حوالے سے محمد صلعم کی خوبیوں کو پیش کرنا کیسے غیر مسلموں کے لئے کسی وقعت کا حامل ہو سکتا ہے؟

اس ضمن میں اصولی طور پر دوسری بات جس پر غور و فکر کیا جانا ضروری ہے، وہ یہ کہ اگر ایک شخص خاندان، سیرت و کردار کے حوالے سے بلند ثابت ہو بھی جائے تو کیا یہ اس کے دعویٰ نبوت کے ثبوت کو کافی ہے؟ کیا کسی بھی دور میں جو شخص سب سے بلند خاندان اور سب سے بلند سیرت و کردار کا حامل ہو، اس کو نبی مان لیا جانا یا اس کے دعویٰ نبوت کو مان لینا، واقعی درست اور با دلیل ہے؟ اگر ہر دور کے لئے یہ بات درست نہیں تو صرف محمد صلعم کے لئے کس طرح اس بات کو دلیل مان لیا جائے؟ ان اصولی باتوں کو سمجھنے کے بعد آیئے زرا اس دلیل کا تفصیلی جائزہ بھی لیتے ہیں کہ کیا واقعی محمد صلعم خاندان اور سیرت و کردار کے حوالے سے انتہائی بلند اور دوسروں سے امتیازی اخلاق کے حامل واقع ہوئے تھے؟ یا یہ بات نبوت کی دلیل کے طور پر غیر اصولی ہونے کے ساتھ ساتھ مشکوک بھی ہے۔

جب ہم مسلمانوں کی جانب سے لکھی جانے والی قدیم و جدید کتب سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات شدت سے ابھر کر سامنے آتی ہے کہ محمد صلعم کے دعویٰ نبوت سے پہلے، ان کی زندگی کو بڑے مختصر اور سرسری انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ محمد صلعم کے دادا، والد و والدہ اور بچپن، لڑکپن، پھر جوانی سے وحی تک کی چالیس سالہ زندگی چند مخصوص واقعات کے گرد ہی بیان کی گئی ہے۔ ان واقعات میں بھی ملے جلے، اچھے بُرے کردار پر مبنی ہر طرح کے واقعات ہیں، جن سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ محمد صلعم اور ان کے آباء و اجداد باقی عرب معاشرے سے کوئی بہت الگ خوبیوں کے حامل نہ تھے بلکہ بہت سے معاملات و واقعات ایسے ضرور ہیں جو نبوت کے دعویدار کسی بھی فرد کے کردار کے انتہائی منافی ہیں۔

محمد صلعم کے دادا کا کردار

محمد صلعم کے دادا عبد المطلب کی زندگی کے بارے میں جو انتہائی مختصر حالات کتب سیرت میں موجود ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ عبد المطلب نے محض اپنی اولاد میں دس لڑکے ہونے کی چاہت میں جو کہ ان کا دفاع کر سکیں، یہ نذر مانی تھی کہ ان میں سے ایک لڑکے کو کعبہ کے پاس قربان کر دیں گے۔ (الرحیق المختوم: ص74، المجلس العلمی اعظم گڑھ بھارت بحوالہ سیرت ابن ہشام 1/142)

مسلمانوں کے الزام کے مطابق وہ عرب کا جاہلانہ معاشرہ جہاں ایسے ظالم موجود تھے جو بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے، اسی معاشرے میں بیٹوں کی چاہ میں بیٹے کو بھی قربان کرنے کی ظالمانہ اور شقی القلبی سے بھری نذر ماننے والے بھی کوئی اور نہیں محمد صلعم کے دادا تھے۔ مگر عبد المطلب کی ایسی ظالمانہ طبیعت کے باوجود وہ اللہ کے ایسے نزدیک تھے کہ ایک سفر میں پانی ختم ہو گیا تو عبد المطلب پر اللہ نے پانی برسایا اور ان کے مخالفین پر ایک قطرہ تک نہ برسا۔ (الرحیق المختوم، حوالہ ایضاً)

محمد صلعم کے والد کا کردار

قدیم ترین سیرت نگار ابن اسحاق نے یہ واقعہ روایت کیا ہے کہ ایک عورت جو کہ ورقہ بن نوفل کی بہن تھی، نے محمد صلعم کے والد عبد اللہ کو یہ پیشکش کی تھی کہ میرے ساتھ ہمبستر ہو جاؤ تو میں تمھیں اتنے اتنے اونٹ دوں گی۔ عبد اللہ نے اپنے والد کے ساتھ ہونے کا عذر کیا لیکن بعد میں دوبارہ اس عورت کے پاس آئے اور اس کی ہمبستری مع اونٹوں والی پیشکش کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ (سیرت ابن ہشام، مترجم ص149، عبد اللہ اکیڈمی لاہور)

یہ ہمبستری والا معاملہ پایہ تکمیل کو پہنچا یا نہیں، اس سے قطع نظر عبد اللہ کا صرف اپنے والد کی وجہ سے پہلے ایک غیر عورت کے ساتھ ہمبستری سے انکار اور پھر دوبارہ آکر خود کو اونٹوں کے لئے اس عورت کو پیش کرنا، خوب ان کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔

محمد صلعم کی ذات، کردار و اخلاق

آپ صلعم کے بچپن و لڑکپن کے متعلق مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جب بھی جاہلیت کی کسی رسم یا مشرکین کی کسی محفل لہو و لعب کی طرف رغبت ہوتی تو قدرت کی جانب سے اس میں رکاوٹ ڈال دی جاتی۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ مشرکین کے میلے میں جانے سے دو فرشتوں نے آپ کو روک دیا۔ (سیرت نبوی از دکتور مہدی رزق اللہ، دارالسلام لاہور ص 199 بحوالہ دلائل النبوۃ: 2/35)

اسی طرح محمد صلعم ایک دو دفعہ باقاعدہ ارادہ کر کے زمانہ جاہلیت کی قصہ گوئی کی محفل کے لئے نکلے، وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ایک شادی کے موقعے پر بجتے باجے کو سننے بیٹھ گئے تو اللہ نے کان ہی بند کر دیا اور پھر سو گئے۔ (الرحیق المختوم: ص88 بحوالہ طبری 2/279)

مشہور سیرت نگار صفی الرحمٰن مبارکپوری نے بیان کیاہے کہ "چنانچہ جب بھی بعض دنیاوی تمتعات کے حصول کے لئے نفس کے جذبات متحرک ہوئے یا بعض ناپسندیدہ رسم ورواج کی پیروی پر طبیعت آمادہ ہوئی تو عنایت ربانی رکاوٹ بن گئی۔" (الرحیق المختوم: ص88)

یہ واقعات اور باتیں یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ محمد صلعم اللہ کی حفاظت میں رہے لیکن ان واقعات سے الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلعم اپنی خواہشات اور طبیعت میں عام انسانوں کی طرح ہی تھے اور دنیاوی و جاہلانہ لہو ولعب کی طرف آمادہ ہوتے تھے، مگر کسی نہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے ایسے جاہلانہ کاموں میں شامل نہ ہو سکے۔ باقی اگر کوئی بھی شخص کوئی براکام کرناچاہے اور اس کے کرنے سے پہلے ہی وہ سو جائے، گانے سنناچاہے تو کان بند ہو جائے، جاہلیت کے میلوں میں بھی جاناچاہے تو کوئی آکر روک دے تو اس میں ایسے شخص کے کردار کی عظمت کہاں سے نکل آئی؟ ایساتو کسی بھی شخص کو براکام کرنے سے روک دیا جائے تو ظاہر ہے وہ کر ہی نہ سکے گا۔ اندھا اگر کہے کہ میں نے کبھی ناچ نہیں دیکھا تو اس میں اس کا کیا کمال؟ شیطان بھی آدم کو سجدے سے انکار سے پہلے بیہوش کر دیا جاتا یا فرشتے اس کو انکار کرنے سے روک دیتے تو ضرور اس منطق سے نیک پرہیز گار ثابت ہوتا۔

باقی جب مزید تفصیل میں جائیں تو پتا چلتاہے کہ اس زبردستی کی حفاظت کے باوجود بھی محمد صلعم ایسے معاملات میں مشغول رہے، جو کسی بلند کردار کے حامل سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

چنانچہ محمد صلعم ایسے لوگوں کے ساتھ بھی گئے جو بتوں کا استلام (تبرک کی خاطر انہیں چھونا) کرتے تھے۔ (سیرت نبوی از دکتور مہدی رزق اللہ، دارالسلام لاہور ص 199 بحوالہ دلائل النبوۃ للبیہقی:2/36)

بنو کنانہ اور قریش کے درمیان ایک جنگ ہوئی، جس میں فریقین نے باہمی حرمتوں کو پامال کیا (سیرت نبوی از دکتور مہدی رزق اللہ، دارالسلام لاہور ص200 بحوالہ فتح الباری: 3/24) اور جاہلانہ عصبیت کی خاطر خون بہایا گیا۔ اس جنگ کا نام حرب فجار اسی لئے پڑا تھا کہ اس جنگ میں بعض حرام کاموں کو بھی حلال کر لیا گیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام، مترجم ص174، عبداللہ اکیڈمی لاہور)

یہ ایک انتہائی طویل جنگ تھی اور محمد صلعم نے بھی اس عصبیت پر مبنی حرمتوں کو پامال کرتی جنگ میں کئی دفعہ قریش کی جانب سے اپنے چچاؤں کے ساتھ مل کر حصہ لیا تھا اور باقاعدہ دشمنوں کی طرف سے آنے والے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے۔ ابن اسحاق کے مطابق محمد صلعم اس وقت بیس سال کے تھے۔ (سیرت ابن ہشام، مترجم ص174، عبداللہ اکیڈمی لاہور)

خدیجہ کے ساتھ شادی کے موقع پر محمد صلعم کا کردار مزید یوں سامنے آتا ہے کہ خدیجہ کے ساتھ باقاعدہ منصوبہ بنا کر نکاح کا پیغام خدیجہ کے والد تک اس وقت پہنچایا گیا جب وہ نشے کی حالت میں ہو کیونکہ باہوش و حواس وہ کبھی خدیجہ کا نکاح محمد

صلعم سے نہ کرتا۔ (سیرت نبوی از ڈاکتور مہدی رزق اللہ، دارالسلام لاہور ص 208 بحوالہ کشف لاستار للبزار:3/237، ومجمع الزوائد:9/222۔روایت کم از کم حسن درجے کی ہے۔)

پھر باقاعدہ اس سازشی منصوبے پر عمل کیا گیا اور خدیجہ کے والد نے نشے کی حالت میں ہی اپنی بیٹی خدیجہ کا نکاح محمد صلعم کے ساتھ کیا۔ (سیرت نبوی از ڈاکتور مہدی رزق اللہ، دارالسلام لاہور ص 209 بحوالہ مجمع الزوائد:9/220، ہیثمی نے یہ روایت احمد اور طبرانی کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد لکھا: "احمد کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔)

اس سارے واقعے سے خدیجہ اور محمد کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا زبردست نمونہ سامنے آتا ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ محمد صلعم کی نفسیاتی و ذہنی حالت کیسی تھی؟ یہ ایک انتہائی اہم بات ہے کیونکہ ایک شخص اخلاقی لحاظ سے چاہے مضبوط بھی ہو لیکن نفسیاتی و ذہنی طور پر اس کی حالت صحیح نہ ہو تو اس کی بات پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایسے شخص کی باتوں کو وزن دینا خواہ مخواہ کی زیادتی ہے۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ محمد صلعم پر اس دور کے مطابق بچپن سے ہی یہ شبہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ ان پر کوئی شیطانی اثر ہے۔ سب سے پہلے جس نے یہ شبہ ظاہر کیا وہ محمد صلعم کی دائی حلیمہ اور ان کے شوہر تھے۔ چنانچہ حلیمہ نے تو باقاعدہ آپ کی والدہ آمنہ کے سامنے اس بات کا اقرار کیا کہ محمد پر کسی شیطانی اثر کا خوف ہے۔۔(سیرت ابن ہشام، مترجم ص 154، عبداللہ اکیڈمی لاہور)

اگرچہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ نے شیطان کے اثر والی بات کو تسلیم نہ کیا لیکن اس سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ بچپن سے ہی کچھ لوگ ایسے خدشات کا شکار ضرور تھے اور بعد میں آنے والے واقعات حلیمہ کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ مزید ار بات یہ ہے کہ خود محمد صلعم نے گھنٹی کی آواز کو شیطان کا باجا قرار دے رکھا ہے۔(صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب کراہۃ الکلب و الجرس فی السفر، حدیث:5548) اور خود محمد صلعم کے ہی مطابق ان پر جو وحی آتی وہ گھنٹی بجنے کی طرح بھی ہوتی۔ (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، حدیث 3215)

محمد صلعم کی اپنی ہی بات سے صاف پتا چلتا ہے کہ حلیمہ کی بات ہی درست تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جسے شیطانی اثر سمجھا جاتا ہے وہ اصل میں سارا نفسیاتی خلل ہے۔ چنانچہ مشرکین مکہ محمد صلعم پر اس لحاظ سے اعتراض کیا کرتے تھے، جس کا تذکرہ خود قرآن نے کیا ہے کہ "اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہے۔"(القلم:51)

کافروں کی یہ بات محض اسلام دشمنی کا نتیجہ نہ تھی جیسا کہ مسلمان باور کرواتے ہیں کیونکہ محمد صلعم خود اپنے متعلق دعویٰ نبوت سے بھی پہلے کچھ ایسے ہی خدشات کا شکار تھے۔ چنانچہ نبوت ملنے سے پہلے خدیجہ سے اس بات کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مجھے کوئی روشنی سی نظر آتی ہے اور میں ایک آواز بھی سنتا ہوں، مجھے خیال گزرتا ہے کہ کہیں یہ

جنون تونہیں۔"(سیرت نبوی از دکتور مہدی رزق اللہ، دارالسلام لاہور ص 226 بحوالہ الفتح الربانی:20/207،روایت کی سند حسن درجے کی ہے۔)

ایک ایسا شخص جسے بچپن سے ہی آسیب زدہ سمجھا گیا ہو، خود اسے کبھی روشنیاں نظر آئیں تو کبھی نامعلوم آوازیں اور اس کا اپنا خیال یہ ہو کہ اسے جنون لاحق ہے، ایسے کی ذہنی ونفسیاتی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ان نامعلوم آوازوں اور خوفناک شکلوں سے گھبرا کر محمد صلعم کی حالت یہ ہو جاتی کہ جاتے جاتے زمین پر گر پڑتے۔(صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، حدیث 3238)

پہلی وحی کا جو قصہ بیان کیا جاتا ہے اس سے بھی واضح ہے کہ محمد صلعم اسے اپنی ہی کسی شدید ذہنی ونفسیاتی کشمکش کا نتیجہ سمجھ رہے تھے، چنانچہ بعد میں جسے پہلی وحی قرار دیا گیا، اس کے بعد حالت یہ تھی کہ "آپ کی گردن اور کندھے کے درمیان کا گوشت حرکت کر رہا تھا۔" اور "جب خوف وہراس کی یہ کیفیت دور ہوئی تو فرمایا:"خدیجہ میرا کیا حال ہو گیا ہے؟"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلعم اسے اپنے ہی کسی حال کا نتیجہ سمجھتے تھے اور اس حد تک پریشان تھے کہ صاف کہا: "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔"

(صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اول مابدی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی، حدیث 6982)

افسوس کہ یہ روشنیاں، خوفناک شکلیں نظر آنا اور اس شدید ذہنی ونفسیاتی بیماری کے غلبے سے جاتے جاتے گر پڑنے کو خدیجہ کے کہنے سننے میں آکر بیماری سمجھنے کی بجائے فرشتہ سمجھ لیا جو ان کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آرہا تھا۔ اب بھلا بتایئے، ایسے میں اگر کفار ومشرکین محمد صلعم کو جنون زدہ قرار دیتے تھے تو کیا غلط کہتے تھے؟ اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہو گا کہ جس شخص کو خود اپنی وحی کا یقین نہ تھا اور وہ اسے اپنے جنون کا کرشمہ سمجھ رہا تھا بعد میں دوسروں سے یہ مطالبہ کرتا پھرے کہ اسے بلادلیل صرف اس کے دعویٰ پر نبی مان لیا جائے۔

یہاں پر میں ایک اور اہم نقطے کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس پہلی وحی کے قصے کے بعد خدیجہ نے ہی آپ کا ذہن اس طرف مبذول کروایا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی ذہنی عارضہ نہیں بلکہ آپ شاید نبی بن رہے ہیں، حالانکہ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ اگر اس قصے کو پہلی وحی مان بھی لیا جائے تو اس میں دور دور تک محمد صلعم کو نبی بنائے جانے کا تذکرہ ہی موجود نہیں۔ شروع کی چند آیات چھوڑئے، ساری کی ساری سورۃ العلق پڑھ جایئے، آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ محمد صلعم کو نبی بنایا جارہا ہے، مگر خدیجہ سمیت تمام کی تمام امت مسلمہ اس پہلی وحی کو ہی بنیاد بنا کر محمد صلعم کو نبی مانتی آرہی ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اگر فرشتہ آیا ہے اور محمد صلعم سے اس نے بات بھی کی تو ظاہر ہے کہ محمد صلعم نبی ہیں تو عرض ہے کہ قرآن کی رُو سے بھی یہ بات باطل ہے کیونکہ فرشتہ تو عیسیٰ کی والدہ (مریم علیہا السلام) پر بھی آیا تھا اور اس نے مریم (علیہا السلام) سے بات بھی کی تھی۔(مریم:17-21) کیا مریم بھی نبی تھی؟

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ محض اپنے اجتہاد سے خدیجہ نے محمد صلعم کو نبوت پر فائز کر دیا تھا اور امت مسلمہ اسی اجتہاد کی پیروی کرتے کرتے آج محمد صلعم کو نبی مان رہی ہے۔ ورنہ محمد صلعم کی نبوت صرف ایک ذہنی و نفسیاتی مسائل کے شکار شخص کے خالی دعووں کے کچھ نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ محمد صلعم نے مکہ والوں پر جب اپنی نبوت کو پیش کیا تو سوائے دعووں کے آپ کو کچھ نہ ملے گا۔" میں نبی ہوں کیونکہ میرے پر وحی آتی ہے اور میرے پر وحی آتی ہے کیونکہ میں نبی ہوں" کا ایسا فلسفہ ہے کہ آج بھی محمد صلعم کی نبوت ماننے والوں کے پاس خود محمد صلعم کی اپنی ذات کے کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے اس ذات اقدس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے کہ ماننے والوں کے سامنے وہ حقیقی حالات بھی آسکیں کہ جن کی روشنی میں کسی بھی انصاف پسند کے لئے فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ ایسی ذات شریفہ کا کوئی بھی دعویٰ کیا وزن رکھ سکتا ہے؟

پیغمبر اسلام پر کفار کے مظالم، حقیقت اور افسانہ

اکثر مسلمانوں کو جن کی دینی معلومات، جمعہ کے دن مولوی صاحب کے خطبے، کسی اخبار میں جمعہ کے دن شائع ہونے والے دینی صفحے، یا الیکٹرانک میڈیا کے توسط سے حاصل ہونے والی معلومات تک محدود ہوتی ہیں یہی باور کرایا جاتا ہے کہ جب مکہ میں پیغمبر اسلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اس وقت اسلام قبول کرنے والوں پر بلا امتیاز ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اس ظلم کی داستاں کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ گویا کفار مکہ اپنی روزمرہ کی تمام تر مصروفیات ترک کر کے صرف اسلام قبول کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی منصوبہ بندیوں اور سازشیں تیار کرنے میں تمام تر وقت صرف کیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات صرف اس طرح کے مبالغہ آمیز جملے سننے کو ملتے ہیں کہ کافروں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، ان کا جینا دوبھر کر دیا، ہر وقت انہیں ایذاء رسانی کی منصوبہ بندی کرتے رہتے لیکن تفصیلی واقعات بیان نہیں کئے جاتے کہ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جانے والے واقعات کی تفصیلات کیا ہیں؟ محض مبالغہ آرائی پر تمام تر دعوے دائر کر کے کفار مکہ کو ظالم و جابر قرار دے کر بے چارے عقیدت پسند مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں مسلمانوں کیلئے حاصل کی جاتی ہیں اور مکہ کے وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا (جنہیں عرف عام میں مشرکین مکہ کہا جاتا ہے) کے حصے میں ان سادہ لوح مسلمانوں کا غصہ، بغض کدورت اور نفرت ہی آتی ہے۔

یہ واقعات کس قدر مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں؟ اور کس قدر حقیقت پر؟ ہمارے پاس ظالم (مشرکین مکہ) کی طرف سے تو کوئی

ریکارڈ موجود نہیں ہے کہ ان کا موقف کیا تھا؟ اگر ان کی طرف سے کوئی ریکارڈ موجود بھی ہوتا تو یقیناً وہ اپنی صفائی ہی بیان کرتے اور ان واقعات کی تردید کرتے، ظلم کو کون اپنی وراثت قرار دینا چاہتا ہے؟ دو سگے بھائی آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں میں سے ہر ایک والدین کے سامنے مظلوم ہونے کا ہی دعوے دار ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ان ایام کی تاریخ کنگھالنے کیلئے صرف مظلومین یعنی مسلمانوں کی بیان کردہ روایات ہی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ مظلوم ہمیشہ ظلم کو مبالغہ آرائی کے ساتھ ہی بیان کرے گا جو انسانی طبیعت کا تقاضا ہے۔ دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ جب ہم ظلم کی اس داستان کی چھان بین کرنے کیلئے مسلمانوں کی ہی یک طرفہ روایت کردہ تاریخ کو کنگھالتے ہیں تو انتہائی حیران کن صورت حال سامنے آتی ہے، جو مسلمانوں کی طرف سے بیان کردہ صورت حال سے قطعاً مختلف ہے۔

مجھے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے نہ تو ابو الحکمہ عمرو ابن ہشام (جنہیں پیغمبر اسلام نے اپنے بُغض کی وجہ سے ابو جہل کہہ کر پکارا)، نہ عبد العزیٰ (جنہیں قرآن عورتوں کی طرح کوسنے سناتے ہوئے ابو لہب کہہ کر پکارتا ہے) نہ ولید بن مغیرہ اور نہ ہی نضر بن حارث کی احادیث اور روایات کی ضرورت ہے، بلکہ مجھے یہ تمام تر سہولت احادیث مبارکہ اور "رحمۃ للعالمین" کی شان میں لکھی گئی سیرت کی کتابوں سے بآسانی دستیاب ہے۔

یاد رہے کہ پیغمبر اسلام کا دعویٰ نبوت سے لے کر ہجرت تک کے درمیان کا عرصہ تیرہ سال پر محیط ہے، مسلمان علماء جس مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کفار کے مظالم اور مسلمانوں کی مظلومیت بیان کرتے ہیں کہ اس عرصہ میں کفار کی جانب سے اہل اسلام کو ہر ممکنہ ایذاء رسائی کا سامنا کرنا پڑا، ہر دن تکلیف، مشقت اور جبر کا ایک نیا سورج لے کر طلوع ہوتا تھا، اس صورت حال کے پیش نظر ظلم و ستم کے واقعات کی اس قدر بھرمار ہونی چاہئے تھی کہ ان واقعات کو رقم کرنے کیلئے ایک باقاعدہ دیوان مرتب کرنا پڑتا، لیکن دیوان تو درکنار، کیا کسی مسلمان نے آج تک معمولی ضخامت کی کوئی ایک کتاب بھی دیکھی جس میں ظلم و ستم کے صرف وہ واقعات قلم بند کئے گئے ہوں جن کا سامنا اہل اسلام کو مکی دور میں کرنا پڑا؟، حالانکہ اسلامی کتب خانے "آداب مباشرت" سے لے کر "دجال کی آمد" اور "موت کا منظر بمعہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ جیسے موضوعات پر مبنی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔

قارئین کی سہولت کیلئے میں نے اس موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اس حصے کو میں ان دعووں کی حقیقت بیان کرنے کیلئے مختص کر رہا ہوں جن میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو اپنے مکی دور میں کن "مصائب و آلام" اور ظلم کے "سیل رواں" کو جھیلنا پڑا۔ اور عنقریب اگلے حصے میں پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کو اسی طرح کے جن "اذیت ناک" حالات و واقعات سے گذرنا پڑا انہیں بیان کروں گا۔

مشرکین مکہ کی مخالفت کا سبب

اصل موضوع کی طرف آنے سے قبل اگر پیغمبر اسلام اور مشرکین مکہ کی مخالفت کے اصل اسباب کا بھی ذرا جائزہ لے لیں تو صورت حال کی وضاحت میں کافی حد تک آسانی ہو جائے گی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:"مجھ کو جو روایات پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ جب رسول اللہ نے اپنی دعوت کا اعلان کیا، مشرک آپ کے کچھ مزاحم نہیں ہوئے جب تک کہ آپ نے ان کے معبودوں کو برا نہیں کہا، اور جب آپ نے برا کہنا شروع کیا جس سے وہ نہایت خفا ہوئے اور حضور کی دشمنی پر اتفاق کیا۔(سیرت ابن ہشام: جلد اول، باب 32، اعلانیہ دعوت اسلام، صفحہ:170)

ابن اسحاق کی اس صراحت کے بعد کہ مشرکین مکہ نے اس وقت تک پیغمبر اسلام کی مخالفت پر کمر نہیں باندھی جب تک کہ پیغمبر اسلام نے ان کے معبودوں کو برا بھلا نہیں کہا، پھر جب پیغمبر اسلام نے کفار مکہ کے معبودوں کو برا بھلا کہنا شروع بھی کر دیا تو کفار مکہ نے پیغمبر اسلام کو "توہین معبودان" کا مرتکب ہونے کے باوجود ان کے خلاف C295 کی طرز کا نہ تو کوئی مقدمہ دائر کیا اور نہ ہی "ماورائے عدالت" قتل کی منصوبہ بندی کی بلکہ ایک نہایت مہذب جمہوری انداز اور قبائلی روایت کے مطابق پیغمبر اسلام کے سرپرست ابو طالب کے پاس معتبرین قریش کا ایک وفد بھیجا، اور براہ راست پیغمبر اسلام سے کوئی مؤاخذہ نہ کیا، چنانچہ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:

"یہ سب ابو طالب کے پاس آئے اور کہا اے ابو طالب! یا تو تم اپنے بھتیجے یعنی حضور کو منع کرو کہ وہ ہمارے بتوں کو برا نہ کہے اور ہمارے باپ دادا کو جاہل اور گمراہ نہ بتائے، ورنہ ہم کو اجازت دو کہ ہم خود اس سے سمجھ لیں، کیونکہ اس کی مخالفت میں تم بھی ہمارے شریک ہو، یعنی تم بھی ہماری طرح ہی مسلمان نہیں ہوئے ہو، پس تم ہمارے اور اس کے درمیان میں دخل نہ دینا۔"

(سیرت ابن ہشام۔ جلد اول، باب 32۔ اعلانیہ دعوت اسلام، صفحہ:170)

مندرجہ بالا عبارت سے اندازہ کیجئے کہ کفار مکہ کا مطالبہ کیا تھا؟ کفار مکہ نے ابو طالب کے سامنے صرف یہ مطالبہ رکھا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے مقدس معبودوں کو برا بھلا نہ کہے، اور ہمارے باپ دادا کو جاہل اور گمراہ نہ کہے، کفار مکہ نے ابو طالب سے ہرگز یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اپنے بھتیجے کو اپنے دین کی دعوت دینے سے روکو۔ حالانکہ حکمران طبقہ ہونے کی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرداران قریش کو پاکستان کے پینل کوڈ C&AB295 جیسے کسی کالے قانون کے تکلف کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ان کی قبائلی روایات نے انہیں اس طرح کے کسی بھی اقدام سے باز رکھا۔

حضرت عباس کی شہادت

جب پیغمبر اسلام نے مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا تو اس وقت محمد صلعم کے چچا حضرت عباس نے اہل یثرب سے

جو گفتگو فرمائی اسے ملاحظہ کرلیا جائے واضح ہو جاتا ہے کہ مکہ میں پیغمبر اسلام کی جان، مال اور آبرو کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا، ابن اسحاق کہتے ہیں کہ:

پہلے حضرت عباس نے اہل یثرب سے اس طرح گفتگو شروع کی: "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ محمد کا مقام و مرتبہ ہمارے ہاں کیا ہے ہم نے ابھی تک انہیں ان کے مخالفین سے محفوظ رکھا ہوا ہے" وہ اپنی قوم اور شہر میں رہتے ہوئے باعزت اور محفوظ ہیں" لیکن اب یہ اصرار کررہے ہیں کہ تمہارے ساتھ تمہارے شہر جائیں گے۔ خوب اچھی طرح سوچ لو اگر تم سمجھتے ہو کہ ان سے کیا ہوا عہد پورا کرسکتے ہو اور انہیں ان کے مخالفین سے محفوظ رکھ سکتے ہو تو بخوشی یہ ذمہ داری اٹھاؤ ورنہ انہیں رہنے دو۔ یہ اپنی قوم اور شہر میں عزت اور حفاظت سے رہ رہے ہیں۔" (سیرت ابن ہشام جلد اول صفحہ 294)

گویا محمد صلعم کو قریش کے مقتدر قبیلہ بنو ہاشم سے تعلق کے استحقاق کا مکمل فائدہ حاصل تھا، اور اسکے باعث کسی کی مجال نہیں تھی کہ انہیں کسی قسم کا گزند پہنچا سکے۔ دوسری طرف نصابی کتب اور دیگر ذرائع میں گمراہ کن طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ گویا مکہ میں گزارے گئے نبوت کے 13 سال میں سے ہر دن محمد صلعم پر گذشتہ دن سے زیادہ بھاری تھا۔

ابن اسحاق کی شہادت

ابن اسحاق مزید لکھتے ہیں کہ: "پھر قریش حضور کی عداوت پر نہایت سخت ہو گئے اور جس گروہ میں سے جو چند مسلمان ہوئے تھے ان کو سخت تکلیفیں پہنچانے لگے (حسبِ روایت صرف تکلیفیں پہنچانے کا دعویٰ ذکر کیا، لیکن بطور ثبوت کوئی تفصیل بیان نہیں کی) مگر رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابو طالب کے سبب سے ان کی گستاخیوں سے محفوظ رکھا"۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھ سے یحیٰی بن عروۃ بن زبیر نے اپنے باپ عروۃ بن زبیر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص سے کہا کہ تم نے قریش کی سب سے بڑی زیادتی اور عداوت کا رسول اللہ کے ساتھ کون سا واقعہ دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا ایک روز میں موجود تھا کہ قریش کے سب بڑے بڑے لوگ حجر اسود کے پاس خانہ کعبہ میں اکھٹے ہوئے اور رسول اللہ کا ذکر کرنے لگے اور کہتے تھے کہ جیسا ہم نے اس شخص پر صبر کیا ہے ایسا کسی پر نہیں کیا، ہمارے دین کو برا کہتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ بتلاتا ہے، ہم نے اس پر بڑا ہی صبر کیا ہے۔ یہ لوگ ایسی ہی باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں حضور تشریف لائے اور آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور طواف میں مشغول ہوئے اور جب آپ طواف کرتے ہوئے ان کے پاس سے گذرتے تو یہ آپ پر آوازہ کرتے، چنانچہ تین بار ایسا ہوا اور اس کا ملال حضور کے چہرۂ مبارک پر مجھ کو معلوم ہوا، اور تیسرے آوازہ پر آپ کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے اے گروہِ قریش! تم سنتے ہو خبر دار ہو جاؤ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تمہارے پاس ذبح کے ساتھ آیا ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضور کے اس کلام کا ایسا اثر ہوا کہ قریش سکتہ کی حالت میں ہو گئے اور جو شخص کہ ان میں زیادہ گفتگو کر رہا تھا وہ حضور سے نرمی سے باتیں کرنے لگا اور عرض کیا کہ آپ تشریف لے

جائیں، چنانچہ آپ تشریف لے گئے پھر دوسرے روز یہ لوگ اکھٹے ہوئے اور ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا اور کہنے لگے کہ تم ہی ہمارے معبودوں میں عیب نکالتے ہو اور ہمارے دین کو برا کہتے ہو، رسول اللہ نے فرمایا ہاں میں ہی کہتا ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے حضور کی چادر مبارک پکڑ لی، ابو بکر یہ حالت دیکھ کر روتے ہوئے کھڑے ہوئے اور قریش سے کہنے لگے کہ کیا تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو کہ جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، تب قریش آپ کو چھوڑ کر چلے گئے، راوی کہتا ہے کہ یہ سخت واقعہ ہے جو قریش کا میں نے حضور کے ساتھ دیکھا اور کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ قریش کا ایک سخت واقعہ حضور کی ایذاءرسانی کا مجھ کو یہ پہنچا ہے کہ ایک روز جو آپ اپنے دولت خانے سے باہر تشریف لائے تو ہر فرد بشر آزاد اور غلام، اور چھوٹے اور بڑے سب نے آپ کو جھوٹا اور کذاب کہا، اور آپ کو اذیت پہنچائی۔ آپ واپس چلے آئے اور سخت رنجیدگی کی حالت میں منہ لپیٹ کر لیٹ رہے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

یا ایھا المدثر قم فانذر ”اے منہ لپیٹنے والے کھڑے ہو اور لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراؤ“۔ (سورۃ المدثر)

بیان کردہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو محض قریش مکہ کی طرف سے زبانی طور پر ”تشدد“ کا نشانہ بنایا گیا، یا ایک واقعہ میں ایک شخص نے چادر پکڑ کر کھینچا، اور ابن اسحاق واضح طور پر گواہی دے رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام کو اس سے زیادہ ”جسمانی تشدد“ کا سامنا نہیں کرپڑا۔ مسلمانو! کیا تمہارے لئے خود پیغمبر اسلام کے سگے چچا حضرت عباس اور عالم اسلام کے سب سے پہلے سیرت نگار ابن اسحاق کی یہ گواہی کافی نہیں کہ ”رسول اللہ کو اللہ نے ان کے کافر چچا کے سبب سے کافروں کی گستاخیوں سے محفوظ رکھا“؟

کیا یہ مقام فکر نہیں ہے کہ اگر پیغمبر اسلام کے ساتھ کوئی ناروا سلوک پیش آیا ہوتا تو کیا صحابہ کرام اسے روایت نہ کرتے؟ ابن اسحاق ایسی کوئی روایت کیونکر اپنی سیرت کی کتاب میں بیان نہ کرتے، جبکہ انہوں نے اپنی کتاب میں ہر باریکی کو بیان کیا؟ حضرت عباس اور ابن اسحاق کی شہادت اس امر کی طرف کافی اشارہ ہے کہ پیغمبر اسلام کو ایذاءرسانی کے کئی واقعات دور صحابہ کے بعد اختراع کئے گئے۔

سردار قریش پر پیغمبر اسلام کی وجہ سے تشدد

ایک طرف تو پیغمبر اسلام اپنے کافر چچا کی بدولت خصوصی پروٹوکول سے استفادہ فرماتے ہیں اور دوسری جانب پیغمبر اسلام کی ہی وجہ سے قریش کا سب سے بڑا سردار عمرو بن ہشام (ابو جہل) پیغمبر اسلام کے ایک دوسرے مسلمان چچا حضرت حمزہ کے ہاتھوں جسمانی تشدد کا نشانہ بنتا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ:

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھ سے قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ ایک روز حضور صفا پہاڑ کے پاس تشریف رکھتے

تھے، ابو جہل نے آپ کو بہت ناسزا کہنا شروع کیا، اور بہت کچھ "زبانی اذیت" آپ کو پہنچائی، آپ خاموش سنتے رہے اور کچھ نہ فرمایا، وہیں عبد اللہ بن جدعان بن عمرو بن کعب کی آزاد لونڈی کا گھر تھا وہ اپنے گھر میں سے ابو جہل کی ساری باتیں سن رہی تھی پھر ابو جہل حضور کو کہہ سن کر خانہ کعبہ کے پاس قریش کی ایک مجلس میں جا بیٹھا اور حضور بھی اپنی دولت سرا میں تشریف لے گئے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر بعد حضرت حمزہ بن عبد المطلب اپنی کمان لئے ہوئے صفاء پر آئے کیونکہ آپ روزانہ تیز اندازی کی مشق کے واسطے تشریف لے جاتے تھے اور وہاں سے فارغ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کر کے پھر گھر جاتے تھے اور راستہ میں جس جگہ سے گذرتے وہاں لوگوں سے سلام علیک کر کے ان سے بات چیت بھی کرتے اور قریش میں آپ نہایت بہادر اور شجاع جوان تھے، غرضیکہ جس وقت آپ صفاء پر تشریف لائے اس عورت نے ابو جہل کے، حضور کو برا بھلا کہنے کا سارا قصہ آپ سے بیان کیا (کاش کوئی راوی یہ بھی بیان کر دیتا کہ ابو جہل نے کیا کہا تھا، مگر یہاں سارے راوی خاموش ہیں) جس کے سنتے ہی حضرت حمزہ برانگیختہ ہو گئے، آپ وہاں سے فوراً مسجد حرام میں ابو جہل کی تلاش کے واسطے تشریف لائے، دیکھا تو وہ لوگوں میں بیٹھا تھا، حضرت حمزہ اس کے قریب آئے اور اس زور سے اپنی کمان اس کے سر پر ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور فرمایا کہ تو میرے بھتیجے کو سخت سست کہتا ہے۔ میں بھی اسی کے دین پر ہوں اور جو وہ کہتا ہے وہی میں بھی کہتا ہوں، اگر تجھ میں کچھ طاقت ہے تو مجھ کو جواب دے۔ بنی مخزوم کے چند آدمیوں نے چاہا کہ ابو جہل کی حمایت پر کھڑے ہوں مگر خود اس نے ان کو منع کر دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ واقعات ابن ہشام نے "نبوت کی شہرت اور قریش کی ایذاء رسانیاں" کے عنوان سے بیان کئے ہیں لیکن پورے باب میں کفارِ قریش کی نسبت مسلمانوں کی جانب سے جسمانی ایذاء رسانی کے واقعات زیادہ بیان ہوئے۔

عبد العزیٰ (ابو لہب) کی اخلاقی حمایت

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ ابو طالب کے انتقال کے بعد پیغمبر اسلام گھر میں ہی رہنے لگے اور باہر نکلنا کم کر دیا، قریش کو وہ کامیابی حاصل ہو گئی جو اب تک حاصل نہ ہوئی تھی اور نہ انہیں توقع تھی۔ تو عبد العزیٰ (ابو لہب) جسے انتہائی شقی القلب دشمنِ اسلام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کو معلوم ہوا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہا اے محمد! آپ جہاں چاہتے ہیں جائیے، جو کام آپ ابو طالب کی زندگی میں کرتے تھے کیجئے، لات کی قسم جب تک میں زندہ ہوں کسی کی آپ تک رسائی نہ ہو گی۔ ابن الغیاطلہ نے رسول اللہ کو برا بھلا کہا تھا، ابو لہب اس کے پاس آیا اور اسے برا بھلا کہا۔ تو وہ چلاتا ہوا بھاگا کہ اے گروہ قریش ابو عتبہ (ابو لہب) بے دین ہو گیا۔ قریش آ گئے اور ابو لہب کے پاس کھڑے ہو گئے، ابو لہب نے کہا میں نے دین عبد المطلب کو ترک نہیں کیا۔ مگر میں ظلم سے اپنے بھتیجے کی حفاظت کرتا ہوں یہاں تک کہ یہ جس کام کا ارادہ کرتے ہیں اس کیلئے چلے جائیں۔ قریش نے کہا: تم نے اچھا کیا، خوب کیا اور صلہ رحم کیا۔

اب اس واقعہ میں ذرااخلاق بولہبی اور اخلاق محمدی کا موازنہ بھی کر لیجئے کہ چچانے کیسے ہزار مخالفت کے باوجود محض قرابت کی بنیاد اپنی اخلاقی ذمہ داری کا پاس کیا، اور کیسے بھتیجے نے اس حسن سلوک کا جواب ابولہب کالقب عطا کر کے دیا، اور قریش کا جواب بھی ملاحظہ کیجئے کہ قریش نے عبدالعزیٰ کو برا بھلا کہنے کے بجائے اس کے حسن سلوک کی ستائش کی۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

لیکن یہ واقعہ جاننے کے بعد انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ یہ شعر کچھ یوں پڑھا جائے ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
شرار مصطفوی سے چراغ بولہبی

پیغمبر اسلام کے قتل کی سازش

سادہ لوح مسلمانوں کو یہی باور کرایا جاتا ہے کہ کفار مکہ نے بارہا پیغمبر اسلام کے قتل کے منصوبے بنائے، لیکن اگر سیرت کی کتابوں میں ان واقعات کی تفصیل دیکھی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قریش اپنی قبائلی روایات کے ہاتھوں مجبور تھے اور اسی مجبوری نے انہیں پیغمبر اسلام کے خلاف کسی بھی انتہائی اقدام سے باز رکھا۔ قریش کو معلوم تھا کہ اگر انہوں نے پیغمبر اسلام کو قتل کر دیا تو سب سے پہلے تو پیغمبر اسلام کا پورا قبیلہ بنوہاشم جو سر دست تو مشرکین مکہ کا ہم مذہب ہے بعد میں قبائلی روایات کے مطابق پیغمبر اسلام کے قصاص کیلئے کمربستہ ہو گا، اور ان کے ساتھ ان کے تمام قبائلی حلیف بھی اپنے نظریاتی اختلافات کو پس پشت ڈال کر محمد کے لواحقین کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ قریش مکہ کی اسی اصول پرستی کا پورا پورا فائدہ پیغمبر اسلام کو حاصل ہوا اور وہ 13 سال تک مشرکین مکہ کی "مذہبی دلآزاری" کرتے رہے، ان کے معبودوں کی توہین فرماتے رہے، اور ان کے آباء واجداد کو جہنمی اور لعنتی قرار دے کر ان کے سینے پر مونگ دلتے رہے۔

اسلامی روایات ہی کی روشنی میں ہجرت یثرب کے وقت ایک واحد موقع نظر آتا ہے جہاں قریش اور اس کے ذیلی قبائل پیغمبر اسلام کے قتل پر عملی طور پر آمادہ نظر آتے ہیں، لیکن اس کی منصوبہ بندی کیلئے جو مجلس منعقد ہوتی ہے اس کا احوال پڑھ لیں کہ قبائلی روایات کی موجودگی میں یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

ابن ہشام کے مطابق قریش کے زعماء نے قصی بن کلاب کے مکان جسے دارالندوۃ کہا جاتا تھا ایک مجلس مشاورت کے انعقاد کا انتظام کیا۔ کافی سوچ وبچار کے بعد یہ ترکیب طے پاتی ہے کہ مکہ کے تمام قبائل میں سے ایک ایک جوان چھانٹ کر مسلح تیار

کریں۔اور جب محمد سو رہے ہوں تو وہ سب جوان یکبارگی ایک ہاتھ تلوار کا ان پر ماریں اس طرح انہیں قتل کر دیں پھر اگر محمد کی قوم قصاص لینا چاہے گی تو اتنے قبائل سے نہ لڑ سکے گی۔لا محالہ خون بہا پر معاملہ طے پائے گا۔"

ابن ہشام کی اس عبارت سے بخوبی علم ہو سکتا ہے کہ قریش کو اپنی قبائلی روایتوں کا کس قدر پاس تھا اور کس طرح بدقت تمام انہوں نے سوچ بچار کے بعد ایک ایسا طریقہ نکالا کہ قبائلی قوانین پر آنچ بھی نہ آئے اور اپنے معبودوں کی حرمت کی حفاظت کا بندوبست بھی ہو جائے۔

سفر طائف

پیغمبر اسلام پر کفار کے مظالم کی داستان کو بیان کرتے ہوئے ہم محمد صلعم کے سفر طائف کو کس طرح بھول سکتے ہیں؟ انتہائی دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ابن اسحاق اپنی سیرت میں سفر طائف کے دوران محمد صلعم پر کسی پتھراؤ کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے، بلکہ اسکے برعکس یہ ذکر کیا کہ "جب محمد صلعم طائف والوں سے مایوس ہو کر عتبہ اور شیبہ (جو محمد صلعم کے بدترین دشمن تھے) کے باغ کی ایک دیوار کے پاس انگور کی بیل کے سائے میں تشریف فرما ہو گئے تو عتبہ اور شیبہ نے حضور صلعم کو اس حالت میں دیکھا تو ان کو آپ صلعم پر ترس آیا اور انہوں نے اپنے نصرانی غلام عداس کو کہا کہ انگور کے خوشے طباق میں رکھ ان کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو کہ نوش کریں، عداس نے ایسا ہی کیا"

طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق محمد صلعم 10 روز تک اور ایک اور روایت کے مطابق ایک ماہ تک طائف میں قیام فرما رہے، اگر پتھراؤ والا واقعہ پیش آیا ہوتا تو کیا پیغمبر اسلام 10 روز یا ایک ماہ تک طائف میں قیام فرماتے؟ طائف سے واپسی پر جنات کے سے ملاقات کا ذکر تو ملتا ہے، لیکن سرور کائنات کے زخمی ہونے کا کسی ایک بھی روایت میں ذکر تک نہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہو ہی چکا ہے کہ اس دور کی قبائلی روایات کس قدر مستحکم اور عصبیت پر مبنی تھیں، اگر پتھراؤ کا واقعہ پیش آیا ہوتا تو کیا محمد صلعم کا قبیلہ اس پر خاموش رہتا؟ ابو سفیان جو کہ اس وقت قریش کا سردار تھا، اپنی قبائلی ذمہ داری کی بدولت وہ بھی خاموش نہ رہتا، بلکہ حتی المقدور ردّ عمل ضرور ظاہر کرتا۔ پیغمبر اسلام کے جانثار چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس اور انکے دیگر حمایت کنندہ اس اندوہناک واقعہ پر کیوں خاموش رہے؟ اگر طائف میں پتھراؤ سے زخمی ہونے کے واقعہ کو مان بھی لیا جائے تو پیغمبر اسلام نے ہجرت یثرب کے بعد اپنے مخالفین کے ساتھ جو منتقمانہ روح فرسا سلوک روا رکھا اس سے موازنہ کیا جائے تو اس واقعہ کی چنداں اہمیت بھی باقی نہیں رہ جاتی۔

درسی کتب میں مذکور جھوٹا واقعہ

ہمارے ہاں کی درسی کتابوں میں ایک واقعہ عرصہ دراز سے معصوم ناپختہ اذہان میں نقش کرایا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام جب نماز پڑھنے جاتے تو ایک بڑھیا ان پر روزانہ کچرا پھینکا کرتی تھی، ایک روز جب اس بڑھیا نے کچرا نہ پھینکا تو پیغمبر اسلام اس کی خیریت

دریافت کرنے اس کے گھر جا پہنچے، جو علیل تھی تو محمد صلعم نے اس کی عیادت کی۔ یہ واقعہ کسی حدیث کی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کا "مصلح کل "قسم کا کردار ابھارنے کیلئے جھوٹ تک کا سہارا لینے میں کوئی عار نہیں سمجھا جاتا۔

اسلام میں عورت کا مقام

عصر حاضر میں اسلام میں عورت کے معاشرتی و سماجی کردار کے حوالے سے کافی سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور مسلم دنیا خود اس معاملہ میں ابہام کا شکار ہے۔ ایک سوچ کو افغانستان میں طالبان نے رائج کیا اور اس کو عین اسلامی بتایا۔ لیکن مسلم دنیا کے ایک طبقہ نے اس سوچ کو اسلامی تعلیمات سے متصادم قرار دیا۔ اسی طرح سعودیہ، ایران اور چند دیگر عرب ممالک میں بھی عورت کے معاشرتی اور سماجی کردار کے حوالے سے سنجیدہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ طالبان، عربوں اور سعودیہ کے اسلامی سماجی ڈھانچے میں عورت کے استحصال پر اٹھنے والے سوالات کے جواب میں لبرل مسلمان طبقہ اس استحصال کو پشتون و عرب روایات سے جوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلامی تعلیمات سے اس استحصال کا کوئی تعلق نہیں اور عورتوں پہ جو پابندیاں عائد ہیں وہ طالبان اور عرب کی خود ساختہ پابندیاں ہیں۔

آیئے! ہم جاننے کی کوشش کریں کہ عورت کے معاشرتی و سماجی کردار کے حوالے سے پیغمبرِ اسلام خود کیا سوچ رکھتے تھے اور اس موضوع پر امت کے لیے ان کے کیا احکامات وارشادات موجود ہیں۔ جبکہ طالبان اور عرب معاشروں میں عورت کے استحصال کا حقیقی ذمہ دار کون ہے؟

جنتی کون ہے؟

☆ حضرت انس سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "آج تم کو جنتی عورت کے بارے میں نہ بتادوں وہ کون ہے؟ ہم نے کہا ضرور تو آپ نے فرمایا! شوہر پر فریفتہ ہونے والی، زیادہ بچے جننے والی، جب یہ غصہ ہو جائے، یا اسے کچھ برا بھلا کہہ دیا جائے، یا اس کا شوہر ناراض ہو جائے، تو یہ عورت (شوہر کو راضی کرتے ہوئے) کہے میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہے میں اس وقت نہ سوؤں گی جب تک کہ تم خوش نہ ہو جاؤ۔" (ترغیب ج۳ ص ۳۷)

صالح اور نیک عورتیں بہت کم ہیں

☆بی بی عائشہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مومنہ عورت کی مثال عورتوں میں ایسی ہے جیسا کہ کوؤں میں وہ کوا جس کے ایک پر میں سفیدی ہو۔" (مطالب عالیہ ج۲ ص ۲۱)

عورتوں کا جہاد گھریلو کام ہے

☆حضرت انس سے روایت ہے کہ:"عورتوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ اے رسول اللہ جہاد کرنے سے مرد تو فضیلت لوٹ لے گئے۔ ہم عورتوں کے لیے بھی کوئی عمل ہے جس سے جہاد کی فضیلت ہم پا سکیں۔ آپ نے فرمایاہاں گھریلو کام میں تمہارا لگنا یہ جہاد کی فضیلت کے برابر ہے۔"(مطالب عالیہ ج ۲ ص ۳۹)

شوہر کی اطاعت ہر حال میں لازم

☆ بی بی عائشہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"اگر آدمی اپنی بیوی کو حکم دے کہ وہ جبل احمر (پہاڑ) کو جبل اسود کی طرف منتقل کرے۔ یا جبل اسود (پہاڑ) کو جبل احمر کی طرف منتقل کرے، اس کا حق ہے کہ وہ ایسا کرے۔"(ابن ماجہ، مشکوہ، ترغیب)

حضرت انس سے روایت ہے کہ:"ایک شخص گھر سے باہر جاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہہ گیا کہ گھر سے نہ نکلنا۔ اس عورت کے والدین گھر کے نچلے حصہ میں رہتے تھے اور وہ گھر کے اوپر رہا کرتی تھی۔ والد بیمار ہوئے تو اس نے نبی پاک کی خدمت میں بھیج کر عرض کیا اور معلوم کیا (کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر والد کی تیمارداری کر آئے)۔ آپ نے فرمایا اپنے شوہر کی بات مانو چنانچہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا پھر اس نے نبی پاک کے پاس آدمی بھیج کر معلوم کیا، آپ نے فرمایا شوہر کی اطاعت کرو۔ پھر نبی پاک نے اس عورت کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اللہ نے تمہارے شوہر کی اطاعت کی وجہ سے تمہارے والد کی مغفرت کر دی۔"(مجمع ج ۴ ص ۳۱۶)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول پاک نے فرمایا:"اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔"(ترمذی ج ۱ ص ۱۳۸)

☆ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ﷺ نے فرمایا:"جب شوہر اپنی عورت کو بستر پر بلائے اور عورت نہ جائے تو فرشتے اس عورت پر صبح ہونے تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔"(بخاری ج ۲ ص ۲۸۲)

☆ حضرت طلق سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"مرد جب اپنی ضرورت سے عورت کو بلائے تو عورت فوراً آجائے چاہے وہ تنور پر کیوں نہ بیٹھی ہو۔"(ترمذی، ترغیب)

☆ حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"عورت خدا کا حق ادا کرنے والی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ شوہر کا پورا حق ادا نہ کرے۔ اگر شوہر اسے بلائے اور وہ اونٹ کی پالان پر ہو تب بھی وہ انکار نہیں کر سکتی۔"(طبرانی، ترغیب)

☆ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ شوہر کی موجودگی میں روزہ (نفلی روزہ) رکھے ہاں مگر اس کی اجازت سے۔ اگر اس نے (بلا اجازت) روزہ رکھا تو بھوکی پیاسی رہی اور قبول نہ کیا جائے گا۔" (مجمع ج۴ ص ۳۱۰)

☆ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"جب عورت اپنے شوہر سے (غصہ کی وجہ سے) الگ بستر پر رات گزارے تو اس پر فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ عورت شوہر کے پاس آجائے۔"(بخاری۔ مسلم)

شوہر سے طلاق مانگنے پر جنت حرام

☆ حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ نبی پاک نے فرمایا:"جو عورت اپنے شوہر سے بلا کسی ضرورت شدید وپریشانی کے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔"(ابن ماجہ، ابوداود، ترمذی)

خُلع کا مطالبہ کرنے والی عورت منافق ہے

☆ ضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"شوہر سے علیحدگی چاہنے والی خُلع کا مطالبہ کرنے والی عورت منافق ہے۔"(مشکوہ۔ نسائی)

شوہر کی بلا اجازت نکلنے پر لعنت

☆ ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"جب عورت شوہر کی ناراضگی میں نکلتی ہے تو آسمان کے سارے فرشتے اور جس جگہ سے گزرتی ہے ساری چیزیں انسان جن کے علاوہ سب لعنت کرتے ہیں۔"(طبرانی۔ ترغیب)

کثرت سے بچے جننے والی عورت

☆ حضرت معقل سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"تمہاری عورتوں میں بہتر وہ ہے جو خوب محبت کرنے والی اور کثرت سے اولاد جننے والی ہو۔"(بیہقی۔ کنز۔ جامع صغیر)

☆ عبداللہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"خوبصورت بانجھ عورت کو چھوڑ دو اور کالی بچے جننے والی عورت کو اختیار کرو کہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دیگر امتوں پر فخر کروں گا۔"(اتحاف المہرہ۔ ابویعلی)

عورت کا گھر سے باہر نکلنا

☆ ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"عورت پردہ ہے اور عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے۔ عورت کے لیے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ تقرب یہ ہے کہ وہ گھر کے کسی گوشہ میں رہے۔"(ترمذی۔ طبرانی۔ کنز)

☆ ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "عورتوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں مگر شدید ضرورت کی بنیاد پر۔" (طبرانی۔ کنزالعمال)

عورتوں کا تنہا سفر کرنا

☆ ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کوئی عورت سفر نہ کرے ہاں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا محرم ہو۔" (طحاوی۔ بخاری)

بناؤ سنگھار کرنے والی عورتیں

☆ میمونہ بنت سعدی سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو عورت اپنے شوہر کے علاوہ زینت و سنگھار کر کے چلی، قیامت کے دن سخت ظلمت و تاریکی میں رہے۔" (ترمذی۔ جامع صغیر)

☆ ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب عورت عطر لگا کر لوگوں کے پاس گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے محظوظ ہوں تو وہ زانیہ ہے۔" (کنزالعمال)

عورت کے لیے دو ہی محفوظ مقام ہیں

☆ ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "عورتوں کے یے دو ہی مقامات قابل ستر ہیں۔ ایک شوہر کا گھر اور دوسرا قبر۔" (کنزالعمال)

شوہر کے بھائی کے متعلق حکم

☆ عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خبردار عورتوں کے پاس آنے جانے سے بچو۔ ایک انصاری نے پوچھا دیور کے متعلق کیا حکم ہے (وہ بھابھی کے پاس نہ آئے جائے)۔ آپ ﷺم نے فرمایا وہ تو موت ہے۔" (بخاری)

گھر کی کھڑکیاں، روشندان اور سوراخ

☆ امام غزالی سے مروی ہے کہ حضرات صحابہ گھر کی کھڑکیاں اور روشندان جس سے باہر نظر آئے بند فرمادیا کرتے تھے تاکہ عورتیں باہر مردوں کو نہ جھانک سکیں۔

☆ حضرت معاذ بن جبل نے دیکھا کہ ایک عورت گھر کی کھڑکی سے باہر مردوں کو جھانک رہی ہے تو اسے انہوں نے پیٹا۔ (اتحاف السادہ۔ شرح احیاء)

قبروں، مزاروں پر جانے والی عورتیں

☆ ابن عباس سے مروی ہے کہ: " آپ ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو قبروں پر جانے والی ہیں۔" (ابوداود۔ ابن ماجہ)

عبدالرحمن بن حسان سے مروی ہے کہ:"آپ ﷺ نے مزاروں پر جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔"(ابن ماجہ)

عورت اور جوتی کا استعمال

ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ:"بی بی عائشہ سے پوچھا گیا عورتیں جوتا پہن سکتی ہیں؟ انہوں نے کہا رسول پاک نے لعنت فرمائی ہے ان پر جو عورتیں مرد کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔"(ابو داود۔ مشکوہ)

عورتوں کا پاجامہ اور ٹخنے

☆ انس بن مالک سے مروی ہے کہ:"آپ ﷺ نے بی بی فاطمہ کو ایڑی کی جانب سے ایک بالشت کی اجازت دی اور فرمایا عورتوں کا کپڑا اتنا لٹکے۔ یعنی ٹخنے کو چھپائے۔"(مجمع الزوائد)

عورت کے لیے امارت و دنیاوی عہدہ

☆ حضرت ابو بکرہ سے مروی ہے کہ:"جب رسول اللہ کو خبر ملی کہ اہل فارس نے کسری کی بیٹی کو تخت شاہی پر بٹھایا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنا حاکم اور والی عورت کو بنایا۔"(بخاری۔ ترمذی۔ مشکوہ)

عورتیں اور جہنم

☆ ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"ننانوے (99) عورتوں میں سے ایک عورت جنت میں جائے گی اور باقی جہنم میں۔"(ابو الشیخ۔ کنز العمال)

☆ عمران بن حصین سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"جنت میں رہنے والی عورتیں کم ہوں گی (یعنی مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ جہنم میں ہوں گی)۔"(بخاری)

عورت اور فتنہ

☆ اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"میں نے اپنے بعد عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کو تکلیف دہ ہو۔"(مشکوہ)

☆ ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔ بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ عورتوں کے سبب سے تھا۔"(مشکوہ)

عورت اور نحوست

☆ ابن عمر سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"نحوست تین چیزوں میں ہے۔ عورت، گھر اور گھوڑے میں۔"(مشکوہ۔ ابن ماجہ)

☆ عبداللہ ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی بیوی، خادم یا جانور حاصل کرے تو اسکی پیشانی پکڑ کر کہے: "اے اللہ میں اس کی بھلائی آپ سے مانگتا ہوں۔ آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس کے شر سے اور اس کی خلقت وطبیعت کے شر سے۔" (ابن ماجہ)

عورت کو مارنا پیٹنا

☆ اشعث بن قیس سے روایت ہے کہ: "حضرت عمر نے دعوت کے روز جب رات ڈھلنے لگی تو آپ نے کھڑے ہو کر اپنی عورت کو مارا۔ میں ان دونوں کے درمیان آگیا۔ جب وہ اپنے بستر پر جانے لگے تو مجھ سے کہا: یاد رکھ! نبی ﷺ فرماتے تھے کہ مرد سے اپنی بیوی کو مارنے کے متعلق سوال نہ کیا جائے گا۔" (ابن ماجہ)

سانحۂ بنو قریظہ

وَ أَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا۔ وَ أَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ وَ أَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا وَكَانَ اللهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا۔

اور جن اہلِ کتاب نے ان (کافروں) کی مدد کی تھی اللہ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، تم ایک گروہ کو قتل کرتے ہو اور ایک گروہ کو جنگی قیدی بناتے ہو۔ اور اس نے تمہیں ان کی زمین کا اور ان کے گھروں کا اور ان کے اموال کا اور اس زمین کا جس میں تم نے قدم بھی نہ رکھا تھا مالک بنا دیا، اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے. (القران، سورۂ احزاب، آیت 26-27)

مسلمانوں کی مدینہ آمد سے پہلے وہاں انتہائی مذہبی رواداری کا ماحول تھا۔ قبیلوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ حسن معاشرت تھی۔ چنانچہ جب بھی کوئی تنازع کھڑا ہوتا یا جنگ چھڑ جاتی تو مختلف قبائل مذہبی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر قبائلی تعلقات کی بنیاد پر اپنے حلیفوں کی مدد کیلئے اس میں حصہ لیتے تھے۔ یہودی قبیلہ بنو قینقاع قبیلہ خزرج کا حلیف تھا۔ جبکہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کسی بھی لڑائی کی صورت میں قبیلہ بنو اوس کی مدد کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ کی مدینہ آمد کے ساتھ یہ ماحول تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ شروع شروع میں جب مسلمان کمزور تھے اور انہیں قریش مکہ سے خطرہ تھا تو رسول اللہ نے تمام قبائل کے ساتھ معاہدات کئے جن کا مقصد کسی بھی جارحیت کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنا تھا۔ لیکن بدر کی فتح نے صورت حال بالکل بدل کر رکھ دی۔ اب مسلمان بے خانماں لوگ نہیں بلکہ ایک فاتح قوت تھے۔ اس فتح سے جہاں مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ وہیں مدینہ کی مقامی آبادی میں مخالف آوازیں بھی بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اس سے نمٹنے کیلئے آپ صلعم نے ان مردوزن کے قتل کے احکام جاری کرنے شروع کر دیئے جو آپ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ جس سے نہ صرف آپکے مخالفین میں کمی ہوئی بلکہ مدینہ کی تمام آبادی میں مسلمانوں کی دہشت پھیل گئی۔

"محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ محمد بن مسلمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو یہودی سہمے ہوئے تھے، اس لئے کہ دشمن خدا کعب بن اشرف کے ساتھ جو ہم نے کیا، اس وجہ سے یہودی ڈر گئے تھے، کوئی یہودی ایسا نہ تھا جسے اپنی جان کا خطرہ نہ ہو"۔ (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول، صفحہ نمبر 296)

اکا دکا مخالفین کو ختم کرنے کے بعد آپ صلعم نے یہودی قبیلہ قینقاع سے نپٹنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ آپ نے پیغام بھیج کر بنی قینقاع کو بلایا اور انہیں مخاطب کر کے کہا۔

" اے گروہ یہود، اسلام قبول کر لو، بخدا تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی ماجرا پیش آئے جو قریش کو آیا"۔

بنو قینقاع نے اس دعوت کا مثبت جواب نہ دیا بلکہ کہلا بھیجا:

" اے محمد صلعم آپ کو ان لوگوں سے دھوکا نہ لگے جن سے آپ لڑے ہیں، آپ صلعم ناتجربہ کار لوگوں سے لڑے ہیں، ہم جنگجو قوم ہیں، جب ہمارے ساتھ جنگ ہو گی تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم جیسوں سے تمہاری لڑائی کبھی نہیں ہوئی"۔ (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول صفحہ نمبر 124)

بنو قینقاع کا یہ جواب سن کر رسول اللہ نے قبیلہ بنو قینقاع کے محاصرے کا حکم فرمایا، بنو قینقاع زیادہ دیر تک مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکے، اور پندرہ دن کے محاصرے کے بعد قلعہ کے دروازے کھول دیئے۔ رسول اللہ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خزرج قبیلے کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول رسول اللہ کے حضور پیش ہوا اور عرض کیا:

" اے محمد! میرے حلیفوں پر مہربانی کیجئے۔ آپ صلعم نے اس سے اپنا رخ مبارک پھیر لیا، اس نے اپنا ہاتھ رسول کریم صلعم کے گریبان میں داخل کیا۔ رسول اکرم صلعم نے فرمایا، مجھے چھوڑ دو۔ آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ چہرے پر ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آپ صلعم نے ارشاد فرمایا، تجھ پر افسوس، مجھے چھوڑ دو۔ اس نے کہا، بخدا میں آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرے حلیفوں پر مہربانی نہیں فرمائیں گے۔ چار سو کھلے جسم کے جوان اور تین سو زرہ پوش جنہوں نے مجھے سرخ و سیاہ سے بچایا تھا، آپ انہیں ایک ہی صبح میں کاٹ ڈالیں گے۔ بخدا میں زمانے کی گردشوں کا خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ رسول اللہ نے فرمایا، جاؤ میں نے ان کو تمہاری خاطر آزاد کیا" (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول، صفحہ نمبر 123)

اس کے بعد آپ نے بنو قینقاع کو مدینہ بدر کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد آپ صلعم نے بنو نضیر نامی دوسرے یہودی قبیلے پر اپنے قتل کی سازش کرنے کا الزام لگا ان کا بھی محاصرہ کیا اور مدینہ بدر کر دیا۔ لیکن جس قسم کے ظلم و بربریت کا شکار یہودی قبیلہ بنو قریظہ ہوا، اس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ قبیلہ بنو قریظہ کا قتل عام رسول کریم کے دامن پر اس قدر بڑا دھبہ ہے جسے سات سمندروں کا پانی بھی مل کر نہیں دھو سکتا، ایک ہی دن میں آٹھ نو سو انسانوں کو تہہ تیغ کرنا اور بچوں اور عورتوں کو

غلام بنالینے کو کسی بھی دلیل سے منصفانہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ دنیا کی کوئی بھی عدالت رسول اللہ کو ان کے اس فعل سے بری قرار نہیں دے سکتی۔ آج کے وقتوں میں جہاں موت کی سزا کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے، کوئی بھی ملک یا معاشرہ رسول اللہ کو فائرنگ سکواڈ کے حوالے کرنے سے دریغ نہ کرتا۔

بنو قریظہ کے قتل عام کا واقعہ پانچویں ہجری، (627ء) میں پیش آیا، بنو قریظہ یہودیوں کا سب سے بڑا، طاقتور اور امیر قبیلہ تھا۔ مسلمان مؤرخ محمد بن عمر واقدی کے مطابق بنو قریظہ والے اعلیٰ نسب کے مالک اور صاحب جائیداد تھے جبکہ ہمارے پاس نہ تو کھجور کے درخت تھے اور نہ انگور کے باغات، ہمارے پاس سوائے اونٹوں اور بھیڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ رسول اللہ نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا جس کے تحت وہ جنگ کی صورت میں مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔ لیکن جنگ خندق کے موقع پر جب اہل مکہ اپنے حمایتیوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے تو بنو قریظہ نے معاہدہ شکنی کا ارتکاب کرتے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔

کہانی کے پس منظر کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ام المومنین صفیہ بنت حیی کا باپ حیی بن اخطب جو قبیلہ بنو نضیر کا سردار تھا اور کچھ عرصہ پہلے مدینہ سے جلاوطن کیا جاچکا تھا۔ وہ اپنے قبیلے اور بنی وائل کے عمائدین کو لے کر مکہ پہنچا اور انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کی صلاح دی۔ وہاں سے مثبت جواب پاکر اس نے غطفان کے قبائل کو بھی اس حملے میں حصہ لینے کیلئے قائل کرلیا۔ بعد ازاں وہ چپکے سے رات کے اندھیرے میں مدینہ پہنچا اور بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے گھر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا، کعب نے دروازہ کھولنے سے انکار کردیا لیکن حیی کی منت سماجت پر آخر دروازہ کھول دیا۔ حیی نے کعب کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا لیکن کعب نے اس سازش کا حصہ بننے سے انکار کردیا، لیکن حیی کے پرزور اصرار پر اس نے بھی اس مشترکہ لشکر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

مسلمان ابھی اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ بنو غطفان اور قریش کے مشترکہ لشکر کا مقابلہ کرسکیں، چنانچہ سلمان فارسی کی تجویز پر انہوں نے دفاعی جنگ لڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے مدینہ کے گرد خندق کھودلی۔ لہٰذا یہ لڑائی ایک محاصرے سے زیادہ کچھ اور ثابت نہ ہوئی جو ایک ماہ تک جاری رہا۔ رسول اللہ غطفان قبیلہ کے نعمان بن مسعود نامی ایک نو مسلم کے ذریعے اہل مکہ اور بنو قریظہ کے درمیان پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہوگئے، کیونکہ نعمان کے درپردہ اسلام قبول کرنے کا پتہ نہ تو اہل مکہ کو تھا اور نہ ہی بنو قریظہ کو۔ لہٰذا وہ بہت آسانی سے بنو قریظہ اور اہل مکہ کو اپنے خلوص کا یقین دلاتے ہوئے انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس پھوٹ کے نتیجے میں مشرکین محاصرہ اٹھا کر مکہ واپس لوٹ گئے، اور بنو قریظہ مسلمانوں کے رحم وکرم پر رہ گئے۔ مسلمانوں کا شروع میں بنو قریظہ پر حملہ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ شائد یہ تھی کہ بنو قریظہ جنگ میں ایک انتہائی غیر فعال رکن تھے۔ انہوں نے اس جنگ میں کسی قسم کی کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی تھی۔ بلکہ اس جنگ میں

ان کی عدم دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ان کی طرف سے خندق نہیں کھدی ہوئی تھی لہذا ان کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ ہو سکتا تھا۔لیکن انہوں نے اہل مکہ کو اس سے فائدہ اٹھانے کا نہیں کہا۔بنو قریظہ کے اس رویہ پر ابوسفیان نے ان کے خلوص پر شک کا اظہار کیا۔اور محاصرہ اٹھا کر مکہ کی طرف کوچ کر گیا۔لیکن جب اہل مکہ اپنا محاصرہ اٹھا کر چلے گئے تو رسول اللہ نے ستانے کی بجائے بنو قریظہ سے مال غنیمت حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کو بنو قریظہ پر حملے کی صلاح دینے حضرت جبرائیل کو بھیجا پڑا۔

"عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم جب جنگ خندق سے (فارغ ہوکر) واپس آئے اور ہتھیار رکھ کر غسل کرنا چاہا تو جبرائیل آئے، ان کا سر غبار سے اٹا ہوا تھا۔جبرائیل نے کہا آپ نے ہتھیار اتار دیئے ؟ اللہ کی قسم میں نے تو ابھی تک ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔آپ صلعم نے دریافت فرمایا تو پھر اب کہاں کا ارادہ ہے؟انہوں نے فرمایا ادھر اور بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا۔عائشہ نے بیان کیا کہ پھر رسول اللہ صلعم نے بنو قریظہ کے خلاف لشکر کشی کی"۔(صیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2813)

حضور نے مدینہ میں ابن ام مکتوم کو حاکم مقرر کیا اور ایک مسلمان کو حکم دیا کہ وہ سب مسلمانوں کو اطلاع کر دے کہ ہم بنو قریظہ کی طرف جا رہے ہیں اور عصر کی نماز وہیں پڑھیں گے۔

رسول اللہ بنی قریظہ پہنچے تو فرمایا، اے بندر اور سوَر کے بھائیو (یہودیو) مجھ سے ڈرو، مجھ سے ڈرو، بعض نے بعض سے کہا، یہ ابوالقاسم (نبیؐ کریم) ہیں۔(طبقات ابن سعد، جلد اوّل، صفحہ 283)

حضور نے چھتیس سواروں اور تین ہزار پیدل مسلمانوں کے ساتھ بنو قریظہ کا محاصرہ جاری کر لیا جو پچیس دن تک جاری رہا۔جب بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کو یقین ہو گیا کہ مسلمان انہیں مطیع کئے بغیر واپس جانے والے نہیں تو اس نے اپنی قوم کو اکٹھا کر کے کہا کہ ہمارے پاس تین صورتیں ہیں، ہم اسلام قبول کر لیتے ہیں، اس طرح ہمارا جان ومال محفوظ رہے گا لیکن قبیلے نے کہا کہ ہم تورات کے مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے کو تیار نہیں ہیں۔کعب نے دوسری صورت بتائی کہ اپنے بیوی بچوں کو قتل کر کے مسلمانوں پر پل پڑو، اگر قتل ہو گئے تو ہمیں اہل وعیال کی فکر نہیں ہو گی اور اگر جیت گئے تو خدا ہمیں اور عورتیں اور بچے دے گا۔لیکن قبیلے والوں نے اس بات کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم اپنے بے گناہ بیوی بچوں کو کیسے قتل کر دیں اور ان کے بغیر یہ زندگی کس کام کی۔کعب نے تیسری صورت بیان کی کہ آج ہفتے کی رات ہے اور مسلمان ہماری طرف سے بے فکر ہوں گے کہ ہم ہفتے کے روز کچھ ایسا نہیں کریں گے، لہذا ہم شبخون مارتے ہیں، لیکن قبیلے والوں نے یہ تجویز بھی یہ کہہ کر رد کر دی کہ ہفتے کا دن تو ایک مقدس دن ہے ہم ہفتے کے روز یہ کچھ کیسے کریں۔محاصرہ طول پکڑ گیا لیکن پچیس راتوں کے بعد بنو قریظہ والے ہمت ہار گئے۔اور انہوں نے رسول کریم سے درخواست کی کہ بنی عمرو بن عوف کے ابولبابہ بن المنذر کو بات

چیت کیلئے اندر بھیجیں، کیونکہ ان کا قبیلہ بنو قریظہ کا حلیف تھا۔ حضور نے ابولبابہ کو بنو قریظہ کے پاس بات چیت کیلئے بھیج تو دیا۔ لیکن آپ اس وقت تک بنو قریظہ کو قتل کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

"جب ان کی نظر ابولبابہ پر پڑی تو وہ سب ان کا استقبال کرنے کیلئے اٹھے، ان کی عورتیں اور بچے روتے ہوئے آپ کے پاس آئے، اس منظر سے ابولبابہ کو ان پر ترس آ گیا، بنو قریظہ نے ان سے کہا: کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم محمد کے فیصلے پر ہتھیار رکھ دیں، انہوں نے کہا ہاں مگر اپنے حلق پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم سب ذبح کر ڈالے جاؤ گے۔ ابولبابہ کہتے ہیں کہ کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی مگر فوراً ہی میرے دل نے محسوس کیا کہ یہ تو میں نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی۔ ابولبابہ وہاں سے بغیر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے سیدھے مدینہ آ کر مسجد نبوی میں آئے اور انہوں نے اپنی خطا کی پاداش میں خود کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھا اور اللہ سے عہد کیا کہ جب تک اس خیانت کو اللہ معاف نہ کر دے گا میں اس جگہ سے نہیں ہٹوں گا اور اب کبھی بنو قریظہ کی زمین پر قدم نہ رکھوں گا اور اللہ مجھے کبھی بھی اس علاقہ میں نہ دیکھے جس میں میں نے اللہ اور رسول کی خیانت کی ہے"۔ (تاریخ الامم والملوک جلد دوم، صفحہ 226 ، محمد بن جریر الطبری)

ابن ہشام کے مطابق یہ آیت حضرت ابولبابہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ

اے مومنو تم اللہ اور رسول سے خیانت نہ کیا کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں خیانت کیا کرو حالانکہ تم (خیانت کی خرابی کو) جانتے ہو (سورۃ انفال آیت 27)

بنو قریظہ والوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس شرط پر ہتھیار رکھتے ہیں کہ انہیں بھی بنو نضیر کی طرح مدینہ بدر کر دیا جائے لیکن رسول اللہ نے ان سے غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے کا تقاضا کیا۔ مجبوراً بنو قریظہ نے صبح کے وقت قلعے کا دروازہ کھول دیا، بنو قریظہ کو اس حالت میں دیکھ کر قبیلہ بنو اوس کے لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ قبیلہ بنو قریظہ کے لوگ ہمارے حلیف و موالی ہیں۔ جب آپ نے بنو قینقاع کا محاصرہ کیا تھا تو آپ نے خزرج کے عبداللہ بن ابی بن سلول کے کہنے پر انہیں معاف کر دیا تھا اور انہیں قتل کرنے کی بجائے صرف جلاوطن کرنے کی سزا دی تھی۔ اب ہم یہی درخواست آپ سے اپنے حلیف قبیلے کیلئے کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا، اے اوس کے لوگو! کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ہی قبیلے کا سردار بنو قریظہ کا فیصلہ کرے، بنو اوس نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا۔ حضور نے فرمایا تو پھر سعد بن معاذ کو اختیار ہے کہ جو فیصلہ کرے۔

سعد بن معاذ قبیلہ اوس کی شاخ بنی عبد الاشہل سے تھا، آپ رسول اللہ کے بہت نزدیک سمجھے جاتے تھے، جب رسول اللہ نے کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگانے کی خواہش کا اظہار کیا تو یہ سعد بن معاذ ہی تھے جنہوں نے محمد بن مسلمہ کو کعب کے قتل کیلئے

بھیجا۔ آپ غزوہ احزاب میں بنو عامر بن لوئی کے حبان بن قیس بن العرقہ کے تیر کا نشانہ بننے کی وجہ سے زخمی ہو گئے تھے، تیر ان کی نبض کی رگ میں لگا تھا، جس سے آپکا بہت زیادہ خون بہنا شروع ہو گیا، سعد نے دعا مانگی:

"اے خدا! اگر ابھی قریش کی جنگ باقی ہے تو مجھ کو زندہ رکھیو، کیونکہ مجھ کو قریش سے زیادہ کسی سے جنگ کرنے کی خواہش نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے تیرے رسول کو تکلیفیں پہنچائیں، اور ان کو ان کے گھر سے نکالا ہے، اور اگر تو نے قریش کی جنگ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ تو مجھ کو اس وقت تک زندہ رکھ کہ میں اپنی آنکھوں سے بنی قریظہ کی ہلاکت دیکھ لوں"۔ (سیرۃ رسول اللہ، ابن اسحاق، جلد سوم صفحہ نمبر 69)

"اللہ جب تک میری آنکھیں بنو قریظہ کی تباہی کو دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہو لیں تو مجھے موت نہ دے، یہ لوگ عہد جاہلیت میں سعد کے موالی اور حلیف تھے"۔ (تاریخ الامم والملوک، جلد دوم، صفحہ نمبر 219، محمد بن جریر الطبری)

سعد بن معاذ کے زخمی ہونے کی وجہ سے رسول کریم نے انہیں رفیدہ نامی خاتون کے خیمے میں بھیج دیا تھا، یہ خاتون زخمیوں کی دیکھ بھال کو ثواب کا کام سمجھ کر کرتی تھی۔ قبیلہ اوس کے چند لوگ سعد بن معاذ کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ بنو قریظہ کی زندگی آپ کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے، لہذا اب وقت آ گیا ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے کے اپنے حلیف قبیلہ کے احسانوں کا بدلہ چکاتے ہوئے ان کی جان بخشی اسی طرح کروائی جائے جیسے عبداللہ بن ابی نے بنو قینقاع کے سلسلہ میں کیا تھا۔ لیکن سعد بن معاذ نے یہ کہہ کر ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ سعد کوئی ایسا شخص نہیں ہے جسے خدا کی رضا کے مقابلے میں کسی انسان کی ملامت کا ڈر ہو۔ یہ بات سن کر سب لوگ واپس چلے گئے اور سعد بن معاذ کے فیصلہ سنانے سے پہلے ہی بنی الاشہل میں یہ مشہور کر دیا کہ بنو قریظہ کے تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ سعد رسول کریم کے پاس پہنچے تو وہاں انصار نے انہیں کہا کہ رسول کریم نے بنو قریظہ کی تقدیر کا فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں دیا ہے۔ سعد نے پوچھا کیا میں جو بھی فیصلہ کروں، وہ تمہیں قبول ہو گا۔ انصار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سعد نے کہا:

پس میں یہ حکم کرتا ہوں کہ بنی قریظہ کے تمام مردوں کو قتل کیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، حضور نے سعد کا فیصلہ سن کر فرمایا: اے سعد! تم نے بیشک اللہ کو جو ساتویں آسمان پر فیصلہ تھا تم نے اس کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

بنو نجار قبیلہ کی ایک عورت کے گھر میں تمام مردوں کو رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ ان کی تعداد چار سو سے نو سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان مرد قیدیوں کی نگرانی انہی محمد بن مسلمہ کے ذمہ ٹھہری جو رسول کریم کی خواہش پر کعب بن اشرف کو دھوکے سے قتل کر چکے تھے۔ جبکہ ایک ہزار عورتیں اور بچے عبداللہ بن سلام نامی نو مسلم اور سابقہ یہودی راہب کے زیر نگرانی کر دیئے گئے۔ حضور کے حکم کے مطابق مدینہ کے بازار میں چند گڑھے کھودے گئے۔ اور بنی قریظہ کے مرد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں لائے جاتے اور ان کی گردن ماری جاتی۔

"بنو قریظہ کی جب کوئی جماعت قتل کیلئے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں جانے لگتی تو وہ کعب بن اسد سے پوچھتے، کعب! کہو ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اس کے جواب میں ہر مرتبہ وہ کہتا کیا اتنی بات بھی نہیں سمجھتے بلانے والا برابر بلا رہا ہے اور جو جاتا ہے ان میں سے کوئی واپس نہیں پلٹتا، سمجھ لو کیا ہو گا، بخدا مارے جاؤ گے۔ اس طرح نوبت بہ نوبت رسول اللہ صلعم نے سب کو قتل کروا دیا۔ (تاریخ الامم والملوک، جلد دوم صفحہ 229، محمد بن جریر الطبری)

بنو قریظہ کے قتل ہونے والے یہودیوں کی تعداد چھ سو سے لے کر نو سو تک بتائی جاتی ہے۔ یہ تمام قتل عام رسول اللہ کی موجودگی میں ہوا اور اس کو حضرت علی اور حضرت زبیر بن العوام اور قبیلہ بنو اوس کے چند مردوں نے سرانجام دیا۔ جو لڑکے کم عمر تھے ان کے قتل کا فیصلہ کرنے کیلئے ان کو ننگا کیا جاتا، جس لڑکے کے زیر ناف بال آ چکے تھے، انہیں مرد تصور کر کے قتل کر دیا گیا لیکن اگر کسی کے زیر ناف بال ابھی تک نہیں آئے تھے انہیں بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

"رسول اللہ صلعم کا حکم تھا کہ جس کے زیر ناف بال آ چکے ہوں اسے قتل کر دیا جائے۔ چونکہ عطی قرظی کے ابھی بال نہیں آئے تھے، لہذا انہیں زندہ چھوڑ دیا گیا، چنانچہ وہ مسلمان ہو کر شرف صحابیت سے مشرف ہوئے"۔(الرحیق المختوم، صفحہ نمبر 431۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری)

"حضرت عطی قرظیؓ سے روایت ہے کہ میں اس وقت لڑکا تھا کہ جس وقت سعدؓ نے بنو قریظہ کے قتل کا حکم فرمایا۔ پھر مجھ کو دیکھا اور میرے قتل میں انہوں نے شک کیا، جس وقت انہوں نے مجھ کو زیر ناف بالوں والا نہیں پایا۔ میں وہی ہوں جو تم لوگوں کے درمیان موجود ہوں"۔ (سنن نسائی، جلد دوم، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 3463)

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مردوں کے علاوہ ایک قتل ہونے والی ایک عورت کا ذکر بھی ملتا ہے۔

"عبداللہ بن محمد، محمد بن سلمہ، محمد بن اسحاق، محمد بن جعفر، عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ بنو قریظہ کی عورتوں میں سے کوئی عورت نہیں ماری گئی مگر ایک عورت جو میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی، باتیں کر رہی تھی اور ہنستی جاتی تھی اس طرح کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ میں بل پڑتے تھے اور رسول اللہ صلعم اس کے مردوں کو بازار میں قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک پکارنے والے نے اس کا نام لے کر پکارا، فلانی عورت کہاں ہے ؟ وہ بولی میں ہوں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہوا تجھ کو یعنی تیرا نام کیوں پکارا جاتا ہے تو نے قصور کیا کیا؟ وہ بولی میں نے ایک نیا کام کیا، رسول اللہ صلعم کو معاذ اللہ گالیاں دی تھیں۔ حضرت عائشہ نے کہا پھر وہ پکارنے والا اس عورت کو لے گیا اور اس کی گردن ماری گئی اور میں اب تک نہیں بھولی جیسا اس وقت مجھ کو تعجب آیا تھا کہ وہ اتنا ہنستی جاتی تھی کہ پیٹھ اور پیٹ میں بل پڑتے تھے حالانکہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں قتل کی جاؤں گی"۔ (سنن ابو داؤد، جلد دوم، حدیث نمبر 898)

قتل عام سے فارغ ہونے کے بعد رسول کریم نے بنو قریظہ کی عورتوں، بچوں اور مال کو تقسیم کیا، آپ نے سب سے پہلے اپنے لئے کل مال کا خمس (پانچواں حصہ) علیحدہ کیا۔باقی مال کے حضور نے چار حصے کئے، تین حصے سوار کو ملے اور ایک حصہ پیادے کو۔ عورتوں کی تقسیم کے وقت رسول کریم نے اپنے لئے ریحانہ بنت زید بن عمرو(کچھ حوالوں کے مطابق ریحانہ کا نام ریحانہ بنت شمعون تھا) کو اپنے لئے پسند کیا، یہ بنو قریظہ کے سردار کی بیٹی تھی۔ رسول کریم نے ریحانہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تاکہ وہ ام المومنین کا مرتبہ پاسکے لیکن ریحانہ نے انکار کر دیا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر امّ المومنین بننے کی بجائے ایک کنیز بننا زیادہ پسند کرے گی۔ جسے سن کر رسول اللہ بہت دکھی ہوئے۔ گو چند حوالوں کے مطابق ریحانہ نے کچھ عرصہ بعد اسلام قبول کر لیا لیکن یہ بات اتنی مستند نہیں سمجھی جاتی، اور نہ ہی قرین قیاس ہے، ویسے بھی سیرت کی کتابوں میں ریحانہ کا ذکر ایک ام المومنین کی بجائے ایک کنیز کے طور پر ہی کیا گیا ہے

بنو قریظہ کے قتلِ عام سے فارغ ہونے کے بعد چند یہودی عورتیں اور بچے مسلمانوں میں بانٹ دیئے گئے اور باقی بچوں اور عورتوں کو تلواروں اور گھوڑوں کے عوض بیچنے کیلئے نجد اور شام بھیج دیا گیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر (سورۃ الانبیاء آیت 107)

آخر اسلام ہی کیوں؟

آخر پاکستان کے ملحد اسلام، مسلمان اور پاکستان کے ہی پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں؟ ملحدوں کو عیسائی، یہودی یا ہندو نظر کیوں نہیں آتے؟ ملحد اسرائیل یا امریکہ کے خلاف بات کیوں نہیں کرتے؟ یہ وہ سوال ہیں جو پاکستان میں تیزی سے پھیلتے ہوئے الحادی انقلاب کی وجہ سے اکثر لوگوں کے ذہنوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

آج ہم ان سوالوں کے جوابات پر عقلی تجزیہ کریں گے، تجزیہ کچھ طویل ضرور ہے لیکن ان سب باتوں کو ایک ہی تسلسل اور نشست میں جاننا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے غور کرو کہ تم میں سے کتنے ہیں جو قرآن اور حدیثیں پڑھ پڑھ کر مسلمان ہوئے؟ اگر اپنے آپ پر غور کرو گے تو تمہیں شرم آئے گی کیونکہ تم میں ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے علم کی بنیاد پر مسلمان بنا ہو تم مسلمان صرف اس لئے ہو کہ تم مسلمان کے گھر پیدا ہوئے اور پھر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تمہارے اندر کچھ تبدیلی نہ آس کی جبکہ یہاں زیادہ تر ملحد وہ ہیں جو ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوئے اور پھر علمی تبدیلی کی بنیادوں پر ملحد ہو گئے۔ بس ایک شعوری علم پر چل رہا ہے تو دوسرا وراثتی علم پر اور یاد رکھو وراثتی علم کبھی بھی جدید شعوری علم سے آگے نہیں جا سکتا اور یہی وہ علمی کلیہ ہے جس کی وجہ سے الحاد ہر دن پاکستان میں پھیلتا جا رہا ہے۔

آج کی عالمی اخلاقی جدت سے تم نے صرف ایک ہی بات سیکھی ہے کہ کسی کے مذہب یا عقیدے کو نشانہ نہ بناؤ بلکہ دوسروں کے مذہب کی تعظیم کرو اور تمہیں شاید یہ بھی نہیں پتہ کہ تم نے یہ جو سنہرا اسبق سیکھا ہے یہ کہاں سے آیا؟ کیسے دریافت ہوا؟ اس سنہرے اصول کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ تمہاری اسلامی تاریخ میں کافروں کو یا تو مار دیا جاتا تھا یا زبردستی اسلام قبول کروایا جاتا تھا پھر تم نے دوسروں کے مذہب کی تعظیم کا سبق کہاں سے سیکھ لیا؟ اگر تم صرف اسی سوال کا جواب ڈھونڈ لو تو تم مسلمان سے شاید انسان بن جاؤ گے، آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کسی دوسرے کے مذہب کی تعظیم کا یہ سنہرا اصول کہاں سے سیکھا؟ لیکن یہ جاننے سے پہلے تھوڑے سے مذہبی حقائق جاننا بہت ضروری ہیں۔

اگر ہم حدیثوں کو چھوڑ کر صرف قرآن کی ہی بات کریں تو یہ جان لو کہ قرآن میں دہشت گردی پر اکسانے والی آیات 15/20 سے زیادہ نہیں ہیں۔ جبکہ ہندوؤں کے پاس دنیا کی سب سے بڑی جنگی مقدس کتاب مہابھارت ہے پھر وہ تم سے زیادہ امن پسند کیوں ہیں؟ مسیحیوں کے پاس بائبل میں پرانا عہد نامہ خون ریزیوں سے بھرا پڑا ہے اس کے باوجود وہ تمہارے لئے مذہبی دل آزاری یا کسی کے مذہب کی تعظیم کے سنہرے اصول کیسے بنا دیتے ہیں؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ صدیوں پہلے ہندوؤں نے آپس میں اتنی مذہبی خون ریزی کی کہ انہوں نے امن کا سبق سیکھ لیا وہ جو اچھوتوں کو نیچ سمجھتے تھے ان کو برابر شہری حقوق دے دیے اور ایک اچھوت وینکٹ رامن نامی آدمی کو ہندوستان کا صدر مملکت بنا دیا، یہ ہے سیکولر نظام تمہارے پڑوس میں۔

پھر جن مسیحیوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر آج تم اپنے مذہب کی توہین سے منع کرتے ہو وہ بھی کبھی تمہاری طرح یورپ میں بائبل کا نفاذ چاہتے تھے اور پھر صلیبی جنگوں میں اٹلی سے لیکر فرانس، برطانیہ، جرمنی سویڈن اور پھر شمالی یورپ کے آخری ملک فن لینڈ تک مذہب کے نام پر خون بہایا گیا جسے آج بھی وہ خود یورپ کا سیاہ دور کہتے ہیں۔ بس پھر انہوں نے امن کا سبق ایسے سیکھا کہ پاپائے روم نے بائبل کے پرانے عہد نامہ پر جوں کا توں چلنے سے منع کر دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اب مسیحی کو انجیل میں بتائے ہوئے مسیحی سے زیادہ اچھا مسیحی بننا ہے اس طرح ہندوؤں اور مسیحیوں نے اپنے اپنے مذہب سے دھشت گردی کے ڈنگ ہمیشہ کیلئے نکال دیے اب جو ان کا مذہب بچا اس کی تعظیم سیکولر نظام کے تحت لازم کر دی گئی اور آج ہر مغربی باشندہ بے شک وہ ایتھئسٹ ہو یا اگنوسٹک وہ کبھی مسیحت کو برا بھلا نہیں کہتا اسی طرح ہندو ایتھئسٹ کسی فورم پر ہندو مذہب کی توہین نہیں کرتا کیونکہ ان کے مذاہب ان کی عبادت گاہوں تک محدود ہیں اسی لئے ان کے مذاہب ان کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بنتے۔

اور اگر تم ہندو یا مسیحیوں کی ریس کرتے ہوئے اپنے مذہب کی تعظیم چاہتے ہو تو تمہیں بھی سب سے پہلے اپنے مذہب سے دھشت گردی کو الگ کرنا ہوگا لیکن کرے گا کون؟ تمہارا تو کوئی ایک پاپائے روم ہی نہیں۔۔ایک گروپ ایرانیوں کی مذھبی غلامی میں ہے تو دوسرا عربوں کی غلامی میں۔

جس مذہبی خونی راستوں پر تم آج جارہے ہو اسی مذہبی خون کی ندیوں میں ہندوستان اور یورپ کے لوگ صدیوں پہلے ڈبکیاں لگا چکے ہیں اور ملحد صرف انہی علمی بنیادوں پر تم کو خون خرابے سے روکنا چاہتے ہیں اسی لئے وہ تمہارے مذہب سے کیڑے نکال نکال کر تمہارے سامنے رکھتے ہیں تاکہ تمہارے اندر کچھ علمی اور عقلی غیرت جاگے۔پاکستانی ایتھئسٹ صرف اسلام اور مسلمان کو ہی نشانہ کیوں بناتے ہیں؟ یہ بحث لمبی ہے لیکن بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات سمجھ لینے سے ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

اب غور کرو جب تم بیمار ہوتے ہو تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہو وہ تمہاری بیماری کی کچھ علامتیں جاننے کیلئے تم سے پوچھتا ہے کہ کھانسی تو نہیں آتی؟ تم کبھی یہ نہیں کہتے کہ میرے گھر کے سامنے ایک عیسائی عورت رہتی ہے وہ ہر وقت کھانستی رہتی ہے اور جب ڈاکٹر پوچھتا ہے تمہیں چکر تو نہیں آتے؟ تم کبھی یہ نہیں کہتے کہ میرے ایک پڑوسی ہندو بابے کو بہت چکر آتے ہیں کیونکہ جب بیماری تمہاری ہے تو علامتیں بھی تم سے ہی پوچھی جائیں گی اور ان کا جواب بھی تم اپنے ہی بارے میں دوگے اور پھر میٹھی یا کڑوی دوائی بھی تمہی کو دی جائے گی اگر تم صرف اسی اصول پر تھوڑا سا غور کرو تو بہت کچھ سیکھ جاؤگے۔

پھر پاکستان میں ہندو بھی رہتے ہیں مسیحی بھی اور پارسی بھی لیکن اپنے آپ سے پوچھ کر بتاؤ کیا کبھی کسی ہندو نے پاکستان میں بھگونت گیتا یا کسی مسیحی نے بائبل کا نظام رائج کرنے کا مطالبہ کیا؟ کبھی نہیں کیونکہ دنیا کی قومیں تم سے زیادہ عقلمند ہیں، صدیوں پہلے ان میں مذہبی ظلمات کے خلاف الحادی انقلاب آئے جس سے قوموں میں مذہب سے ہٹ کر سوچنے کا شعور پیدا ہوا اور انہوں نے مذہب کو ریاست سے الگ کرکے سیکولر نظام اپنالئے جس سے پاکستانی ہندوؤں اور مسیحیوں میں بھی عقلی شعور آگیا اسی لئے وہ کبھی گیتا یا بائبل کے نفاذ کی بات نہیں کرتے۔لیکن آج کے جدید دور میں صرف تمہی ہو جو ایک نظامِ محمدی نافذ کرنا چاہتا ہے تو دوسرا نفاذ جعفریہ۔کیا تم نے پاکستان کو بدو عرب اور مجوسی ایران کی غلامی کا اکھاڑا سمجھ رکھا ہے؟

پھر تم کہتے ہو کہ ملحد امریکہ یا اسرائیلی ظلم کے خلاف کیوں نہیں بولتا جب کبھی امریکی گورے اور اسرائیلی پاکستان میں آکر خود کش حملے کریں گے تو ملحد کی توپوں کا رخ ان کی طرف ضرور ہوگا لیکن فی الحال تم خود جانتے ہو کہ پاکستان تمہاری ہی مذہبی شدت پسندی کی بیماری کو بھگت رہا ہے اسی لئے علاج بھی سب سے پہلے تمہارا ہی ضروری ہے۔

اور تمہارے جاہل مُلاں تمہیں بتاتے ہیں کہ امریکہ یا اسرائیل اسلام کو ختم کرنا چاہتا ہے تمہاری عقل اتنی سی بات نہیں سوچ سکتی کہ اسلامی تاریخ اپنی آپس کی ہی شعیہ سنی قتل وغارت گری سے بھری پڑی ہے اور آج اگر عالمی برادری صرف ایران اور سعودی عرب سے مکمل طور پر ہاتھ ہٹالیں تو عالم اسلام میں جنگِ جمل جیسا ایسا خون ریز سلسہ شروع ہو جائے گا کہ پھر تم میں سے جو زندہ بچے گا وہ اسلام سے خود ہی توبہ کر لے گا۔

لیکن یاد رکھو عالمی قوانین کی موجودگی میں عالمی برادری کبھی ایسا نہیں ہونے دے گی، آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک سیکولر ہیں اور سیکولر ازم کا پہلا اصول ہی یہی ہے کہ کسی کے مذہب کو برا مت کہو، تم نے ان سے یہ سنہرا اصول تو سیکھ لیا لیکن یاد رکھو تم شعیہ سنی کے چکر میں مرتے رہنا، تمہارے مذہب کی برائیوں کو نا تو امریکہ آکر تمہیں بتائے گا اور نا ہی اسرائیل کیونکہ یہ تمہارا اندرونی معاملہ ہے اسی اندرونی معاملے کی وجہ سے عراق، شام، تیونس، صومالیہ میں کیا کچھ نہیں ہو رہا؟

پاکستانی ملاؤں اور کرپٹ سیاستدانوں نے ایک شیطانی چال کے ذریعے پاکستانی دستور میں لکھ دیا کہ اس ملک پر حکمرانی اللہ کی ہو گی تاکہ حکومت کرپٹ سیاستدان اور ملاں کریں اور بھوک و افلاس کی شکار عوام اپنے آئینی حاکم اللہ ہی سے دعائیں مانگتے مانگتے اللہ کے پاس پہنچ جائیں۔

لہٰذا اب دو ہی راستے باقی بچے ہیں یا تو پاکستان بھی قدیم یورپ کی طرح مذہبی بنیادوں پر خونی سیاہ دور میں داخل ہو گا اور یا پھر الحاد کا علمی انقلاب سر اٹھانے والی ہر مذہبی جہالت کا صفایا کر دے گا۔ آج کل پاکستان کے نوجوان اپنی علمی تحقیقات سے مذہبی کتابوں کے کیڑے نکال نکال کر عوام کے سامنے رکھ رہے ہیں اور جب عوام ان کیڑوں کو اپنی آنکھوں سے رینگتے دیکھتی ہے تو الحاد پھیلتا ہے اور یاد رکھو جو انقلاب علمی بنیادوں پر آتے ہیں انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔

آج پاکستان سے مذہب کی اجارہ داری ختم کر کے سیکولر نظام نافذ کر دو تو دوسرے دن کسی ملحد کو تمہارے مذہب پر انگلی اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو گی کیونکہ سیکولر نظام مذہب سے دہشت گردی کا ڈنگ ختم کر دیتا ہے اور پھر تمہارا مذہب بھی دنیا کے تمام مذاہب کی طرح قابلِ تعظیم ہو گا اور ریاست بھی خوشحال ہو جائے گی، جتنی جلدی ہو سکے اس راستے پر آجاؤ اور اپنی زندگی میں ہی دنیا کی قوموں سے کچھ اچھی باتیں سیکھ کر اپنی نسلوں کو سکھا دو تاکہ جنگِ جمل، جنگِ سفیان یا جنگ کربلا کو ہر سال پاکستان میں زندہ کرنے کی بجائے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاریخ میں دفن کر دیا جائے۔

شکریہ۔

آپ کا دوست مولوی اُستر ا۔

پیغمبرِ اسلام اور خلفاء راشدین کے دور میں کمسن بچیوں کے نکاح

اسلامی مستند کتب کے اوراق سے چند اہم مثالیں

اسلام میں کم سنی یا صغیر سنی میں نکاح کے حوالے سے بات کی جائے تو عام طور پر بی بی عائشہ اور پیغمبرِ اسلام کے نکاح کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور اس پر تنقید کی جاتی ہے۔ مذہب اسلام کے پیروکاروں کی غالب اکثریت 6 سال کی عمر میں بی بی عائشہ کے نکاح کو درست مانتی ہے اور تنقید پر اس کا بھرپور دفاع بھی کرتی ہے۔ آج بھی تمام اسلامی مکاتبِ فکر کے علماء اور مجتہدین اس بات پر متفق ہیں کہ 6 یا 9 سال کی بچی کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ کچھ اسلامی بھائی جو اس کو درست تصور نہیں کرتے وہ بی بی عائشہ کی نکاح کے وقت 6 سال عمر کی متواتر اور مستند روایات جن کی راوی خود بی بی عائشہ ہیں کو جھٹلاتے ہوئے کسی مستند روایت کے بغیر ہی صرف "اگرچہ, چونکہ, چنانچہ" کا سہارا لے کر بی بی کی نکاح کے وقت عمر 18 سال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ خلافِ حقائق ہے۔

اسی بات کو لے کر میں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ پیغمبرِ اسلام اور خلفاء راشدین کے دور میں کم سِنی میں بچیوں کی شادی کے حوالے سے عمومی معاشرتی رجحان کیا تھا؟ اور کیا بی بی عائشہ کے علاوہ کسی اور کی کم سِنی میں شادی ہوئی؟۔ اس بارے میں مستند اسلامی تاریخ کیا کہتی ہے؟۔ اس حوالے سے جو جوابات اسلامی تاریخی کتب سے ملے اُن میں سے چند انتہائی اہم کا ذکر کچھ یوں ہے:

1- بی بی زینب بنتِ محمد

آپ پیغمبرِ اسلام کی سب سے بڑی بیٹی ہیں۔ آپ اعلانِ نبوت سے 10 سال قبل پیدا ہوئیں۔ روایت میں ہے کہ "آپ کی شادی ابو العاص بن ربیع لقیط سے ہوئی اور یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے"

یعنی جب پیغمبرِ اسلام نے آپ کا نکاح ابو العاص سے کیا اُس وقت آپ کی عمر 9 سال یا اس سے بھی کم تھی۔

(طبقات ابن سعد۔ جلد چہارم۔ حصہ ہشتم۔ صفحہ 341۔ ناشر دارالاشاعت کراچی)

2- بی بی رقیہ بنت محمد

آپ پیغمبرِ اسلام کی دوسری بیٹی ہیں اور آپ اعلان نبوت سے 8 سال قبل پیدا ہوئیں۔ روایت میں ہے کہ "آپ کی شادی ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوئی اور یہ قبل از نبوت کا ہے"

اس روایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے جب عتبہ کے ساتھ رقیہ کے ساتھ نکاح کیا تو اس وقت رقیہ کی عمر 7 سال یا اِس سے بھی کم تھی

(طبقات ابن سعد۔ جلد چہارم۔ حصہ ہشتم۔ صفحہ 345)

3-بی بی ام کلثوم بنت محمد

آپ پیغمبرِ اسلام کی تیسری بیٹی ہیں۔ آپ اعلانِ نبوت سے 7 سال قبل پیدا ہوئیں۔ روایت میں ہے کہ "آپ کی شادی قبل از نبوت ابو لہب کے بیٹے عتیبہ سے ہوئی"

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلام نے ام کلثوم کا نکاح عتیبہ سے کیا اس وقت ام کلثوم کی عمر 6 سال یا اس سے بھی کم تھی۔

(طبقات ابن سعد۔ جلد چہارم۔ حصہ ہشتم۔ صفحہ 346)

4- بی بی فاطمہ بنت محمد

روایات کے مطابق آپ نبوت کے پانچویں سال 20 جمادی الثانی کو پید ہوئیں۔ آپکی شادی یکم ذوالحج 2 ہجری کو جبکہ آپ کی عمر 9 سال تھی علی ابن ابی طالب سے ہوئی۔ آپ کی وفات 3 جمادی الثانی 11 ہجری کو ہوئی اور اُس وقت آپ کی عمر 18 سال تھی.

(اہل تشیع اور اہلسنت میں پیغمبر اسلام کی بیٹیوں کی تعداد کے معاملے پر اختلافات ہیں۔ اہل تشیع زینب، رقیہ اور ام کلثوم کو بی بی خدیجہ اور پیغمبر اسلام کی حقیقی اولاد تسلیم نہیں کرتے لیکن اس پر تمام مکاتب کا اتفاق ہے کہ ان کی پرورش اور شادیاں پیغمبر اسلام نے بذات خود کیں۔)

5- بی بی ام کلثوم بنت ابی بکر

آپ خلیفہ اول ابو بکر کی بیٹی ہیں۔ آپکی ولادت 12 یا 13 ہجری میں ابو بکر کی رحلت کے کچھ ماہ بعد ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ "خلیفہ عمر بن خطاب نے ام کلثوم بنت ابی بکر جب کہ وہ کمسن تھیں، نکاح کا پیغام بھیجا۔ یہ پیغام بی بی عائشہ کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے ام کثوم کو اختیار دیا تو ام کلثوم نے کہا: "میں ان کے ساتھ نکاح نہیں کروں گی"۔

اس پر بی بی عائشہ نے فرمایا: "کیا تم امیر المومنین کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کرتی ہو؟"

وہ بولیں: "ہاں! وہ بہت سخت زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور خواتین کے ساتھ سخت مزاج ہیں"۔

(تاریخ طبری۔ جلد سوم۔ حصہ اول۔ صفحہ 221۔ ناشر نفیس اکیڈمی کراچی)

اس روایت سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خلیفہ دوم عمر خطاب 5 سالہ بچی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتے تھے۔بی بی عائشہ کو بھی اس نکاح پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ام کلثوم نے بھی صرف خلیفہ دوم کی سخت مزاجی کی وجہ سے انکار کیا۔بچی کی کم سنی کو نہ زیرِ بحث لایا گیا اور نہ اس پر کوئی اعتراض کیا گیا۔خلیفہ دوم کی اُس وقت عمر تقریبا 55 سال تھی۔

6-بی بی ام کلثوم بنت علی

ام کلثوم بنت علی کا نکاح خلیفہ دوم عمر خطاب کے ساتھ 17 ہجری میں ہوا اس وقت آپ کی عمر 8 یا 10 سال تھی۔اہل تشیع اس نکاح کے واقعہ کو تسلیم نہیں کرتے۔اہلسنت کے مشہور عالم دین مولانا شبلی نعمانی یوں لکھتے ہیں:

"حضرت عمر نے جناب امیر (علی) سے ام کلثوم کیلئے درخواست کی،جناب ممدوح نے پہلے ام کلثوم کی صغیر سنی کے سبب انکار کیا۔لیکن جب خلیفہ عمر نے زیادہ تمنا ظاہر کی اور کہا کہ اس سے مجھ کو حصول شرف مقصود ہے تو جناب امیر نے منظور فرمایا اور 17 ہجری میں 40 ہزار مہر پر نکاح ہوا"

(الفاروق۔صفحہ 406)

علی ابن ابی طالب کے انکار کے بعد خلیفہ دوم عمر خطاب نے صغیر سنی کے اعتراض کو کس طرح دور کیا ایک روایت میں یوں بیان ہوتا ہے:

"عمر خطاب نے علی سے ام کلثوم کے لیے درخواست کی،علی نے کہا ابھی وہ کمسن ہے۔عمر نے کہا خدا جانتا ہے کہ یہ درست نہیں۔دراصل آپ یہ شادی چاہتے ہی نہیں ہیں۔اگر وہ کمسن ہے تو آپ اُس کو میرے پاس بھیجیں۔تب علی نے ام کلثوم کو کپڑوں کا ایک جوڑا دیا اور کہا کہ خلیفہ عمر کے پاس جا کر اُن سے کہنا کہ میرے والد جاننا چاہتے ہیں کہ یہ لباس کس کے لیے ہے؟ جب ام کلثوم پیغام لے کر خلیفہ عمر کے پاس آئیں تو خلیفہ نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے انہیں اپنی جانب کھینچا۔تب ام کلثوم نے خلیفہ سے کہا کہ ہاتھ چھوڑ دیں خلیفہ نے ایسا ہی کیا اور کہا کہ آپ بہت اچھے اخلاق کی مالکہ ہیں آپ اپنے والد سے کہنا کہ آپ بہت پیاری ہیں اور جیسا وہ آپ کے متعلق سمجھتے تھے ویسا نہیں ہے۔اس کے بعد علی نے ام کلثوم کی شادی عمر سے کر دی"۔

(تاریخ خمیس۔جلد دوم۔صفحہ 384)

ان درج بالا روایات کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کے دور میں کمسن بچیوں کے نکاح کی رسم عام تھی اور اس کو معیوب تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ انہی روایات کی روشنی میں موجودہ دور میں تمام مکاتب فکر کے جید علماؤ مجتہدین کے فتاویٰ موجود ہیں جن میں ماں کی چھاتی سے دودھ پینے والی بچی کے نکاح کی بھی اجازت ہے لیکن بچی کے ساتھ مباشرت 9 سال کی عمر تک ہی کی جاسکتی ہے۔ 9 سال سے پہلے بوس و کنار کی اجازت ہے لیکن مباشرت کی نہیں۔ جن علماء کے فتاویٰ موجود ہیں ان میں مفتی اعظم سعودیہ شیخ عبدالعزیز الشیخ، ڈاکٹر احمد المیبی، شیخ محمد بن عبدالرحمان اور دیگر شامل ہیں جبکہ کتب احادیث میں کمسن سے نکاح کے حق میں تواتر سے احادیث موجود ہیں۔

زمانہ قبل اسلام میں عورت کا سماجی مقام ۔ قسط اول

زمانہ قبل اسلام میں عورت کا سماجی مقام ۔ قسط دوم

معراج نبوی ۔ قرآن احادیث اور تاریخ کی روشنی میں

وہ جو دریا سے نکال گئے

APOLLO LANDS ON MOON

اسلامی حماقتیں

جب بھی کسو سے یہ سنتے ہیں کہ اسلام کو نقصان پہچانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسے اچھی طرح سے نہیں سمجھا تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا علی بن ابی طالب نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ قرآن "حمال اوجہ" یعنیکہ دو چہرہ ہے تو کیا وہ اسلام کو نہیں سمجھتا تھا؟! کیا علی اور ام المومنین عائشہ اسلام قرآن اور سنت سے نابلد تھے جب انہوں نے آپس میں الجمل کی خونین لڑائی لڑی اور چار ہزار صحابہ اور حفاظ قرآن کو اپنی حماقتوں کی بھینٹ چڑھا دیا؟! کیا ہم ان لوگوں سے زیادہ بہتر قرآن کو سمجھ سکتے ہیں؟! اور اگر اسلام 1432 سال سے ناقابل فہم رہا ہے تو کیا اب کے بعد ہم اسے سمجھ پائیں گے؟!

سیکولرزم مذہب کو ذاتی انتخاب بنا دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیوں کر ضمیر اور عقیدہ حکومتِ وقت کی تلوار سے زبردستی تھوپا جائے پھر مختلف فکر رکھنے والے لوگوں کو کافر قرار دے کر انہیں کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے؟! سیکولرزم لوگوں کو مذہبی

عقیدے کے انتخاب کی اجازت دیتا ہے مگر اسے دوسروں پر زبردستی تھوپنے نہیں دیتا جو انہیں پسند نہیں کیونکہ یہ ہماری مصلحت ہم سے زیادہ جانتے ہیں.

مسلمانوں کی فکر میں گنگا پوری طرح سے الٹی بہتی ہے، انہیں پاگل پن کی حد تک یقین ہے کہ محمد اشرف المرسلین ہے گویا سابقہ انبیاء میں شرف یعنی عزت کی کمی تھی!! انہیں یقین ہے کہ محمد "علی خلق عظیم" ہے جیسا کہ اس نے اپنے لیے اپنی تصنیف شدہ کتاب قرآن میں کہا ہے لیکن خود اسلامی تاریخ کی کتابیں ہی محمد کو اس کے برعکس ثابت کرتی ہیں، اس میں کسی طرح کی کوئی اخلاقیات نہیں تھیں اس نے عورتوں کی عزتیں تار تار کیں قیدیوں کو سزائے موت سنائی مخالف شاعروں کا دھوکے اور غداری سے خفیہ قتل کرائے اور قافلے لوٹے یعنی ہٹلر سے بھی دو ہاتھ آگے رہا!

سادہ سی علمی اور منطقی دلیل سے ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام ایک جاہلانہ مذہب ہے مثال کے طور پر یہ ثابت کرنے کیلیئے کہ محمد ایک رات میں گیارہ عورتوں سے کس طرح ہمبستر ہوتا تھا اس نے اپنے احمق تابعین کے لیے یہ قصہ گھڑا کہ جبریل میرے پاس ایک پتیلا لیکر آیا جس سے کھا کر مجھ میں نکاح کیلیئے چالیس مردوں کی طاقت حاصل ہو گئی!! کیا اللہ محمد کو نکاح کی یہ قوت بغیر کسی محسوس چیز یعنی پتیلا اور کھانے کے بغیر نہیں دے سکتا تھا؟؟ احمقوں کے لیے احمقانہ کہانی!

اسلامی ملکوں میں چلے جائیں ابھی لوگ اپنی گہری نیند میں ہوتے ہیں کہ مساجد سے گدھوں کے ہینکنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اگر ان کے مذہبی مراسم اتنے عجیب اور اذیت ناک ہیں تو اس میں لوگوں کا کیا قصور ہے؟! کیا جب تک یہ احمق بچوں بوڑھوں اور بیماروں کی نیند حرام نہ کریں ان کا اللہ ان سے راضی نہیں ہوتا؟!

کیا محمد کو تمام انسانوں کیلئے بھیجا گیا تھا؟

مولویانِ اسلام کا دعوی ہے کہ محمد اللہ کی طرف سے تمام بنی نوع انسان کیلیئے بھیجا گیا آخری نبی تھا، مگر کیا یہ بات سچ ہے؟ شاید اس دعوی کی وجہ بعض قرآنی آیات ہیں جو "الناس" یعنی لوگوں کے بارے میں ہیں جیسے (مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۔ اے آدم زاد تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی شامت اعمال کی وجہ سے ہے۔ اور اے نبی ہم نے تم کو لوگوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اس بات کا اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ النساء79) اگر آیت کو ظاہری طور پر لیا جائے تو اس

سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام لوگوں کیلئے بھیجا گیا ہے مگر قرآن میں لفظ "الناس" کا استعمال عام استعمال سے مختلف ہے، اگر ہم دوسری قرآنی آیات کو لیں تو معلوم پڑے گا کہ "الناس" سے مراد لوگوں کا ایک مخصوص گروہ ہے نا کہ تمام بنی نوع انسان:

(زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ وَالۡقَنَاطِيۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَيۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِ‌ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ۚ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ— لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں مگر یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں۔ اور اللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے۔ آل عمران 14) یہاں واضح ہے کہ قرآن نے لفظ "الناس" کا استعمال صرف مردوں کیلئے کیا ہے کیونکہ عورتیں انہیں ہی دی جائیں گی اور وہی گھڑ سواری اور کھیتی باڑی سے رغبت رکھتے ہیں نا کہ عورتیں اس لیئے یہاں الناس سے صرف مرد مقصود ہیں.

(وَقَوۡمَ نُوۡحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغۡرَقۡنٰهُمۡ وَجَعَلۡنٰهُمۡ لِلنَّاسِ اٰيَةً‌ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا— اور نوح کی قوم نے بھی جب پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور انکو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیا۔ اور ظالموں کے لئے ہم نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔— الفرقان 37) نشانی آیت یا معجزہ کا اثر اسے دیکھنے والوں پر پڑتا ہے لیکن زمین پر ساری قوم نوح کو غرق کر دیا گیا تھا اور صرف نوح اور ان کے اہلِ بیت ہی زندہ بچے تھے اس کے باوجود قرآن انہیں "الناس" کہتا ہے جبکہ وہ صرف ایک خاندان کے افراد ہیں یعنی صرف کچھ لوگ ہیں کیونکہ ان کے بعد آنے والے لوگوں نے طوفان کا معجزہ نہیں دیکھا تھا اسے دیکھنے والے صرف نوح کے خاندان کے ہی لوگ تھے جنہیں قرآن "الناس" سے مخاطب کرتا ہے.

(فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيۡقَاتِ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ— وَّقِيۡلَ لِلنَّاسِ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّجۡتَمِعُوۡنَ— آخر جادوگر ایک مقررہ دن کی معیاد پر جمع ہو گئے۔— اور لوگوں سے کہدیا گیا کہ تم سب کو اکھٹے ہو جانا چاہیے۔— الشعراء 38-39) یہاں قوم فرعون کی بات ہو رہی ہے جنہیں جادو دیکھنے کیلئے جمع کیا گیا ظاہری بات ہے کہ یہ تماشہ دیکھنے آنے والے مصر کے تمام لوگ نہیں تھے کجا یہ کہ دنیا کے تمام لوگوں کی بات کی جائے اس کے باوجود قرآن کہتا ہے "اور لوگوں سے کہدیا گیا".

(وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡـكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ الۡاُوۡلٰى بَصَآٮِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لَّعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ— اور ہم نے پہلی امتوں کے ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب دی جو لوگوں کے لئے بصیرت اور ہدایت اور رحمت ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔— القصص 43) موسیٰ جیسا کہ سب جانتے ہیں صرف بنی اسرائیل کے لیے

بھیجے گئے تھے اس کی دعوت تو اہلِ مصر تک کیلئے نہیں تھی اس کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب لوگوں کے لیے بصیرت اور ہدایت اور رحمت ہے. یہاں "الناس" سے صرف بنی اسرائیل کا گروہ ہی مقصود ہے.

محمد سے مخاطب ہوتے ہوئے قرآن اس سے بھی کہیں زیادہ واضح تھا (وَہٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ مُبٰرَکٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَمَنۡ حَوۡلَہَا ؕ— اور ویسی ہی یہ کتاب جسے ہم نے نازل کیا ہے بابرکت جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور جو اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اے نبی تم مکے اور اسکے آس پاس کے لوگوں کو آگاہ کردو۔— الانعام 92) یہاں محمد کی ذمہ داری روزِ روشن کی طرح عیاں ہے یعنی اس کا کام مکے اور اسکے آس پاس کے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے زمین کے تمام لوگوں کو نہیں.

پھر اس سے کہا کہ (فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ— وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ— تو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارنا ورنہ تمکو عذاب دیا جائے گا۔— اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈرسنا دو۔— الشعراء 213-214) صاف ظاہر ہے کہ محمد کی ذمہ داری یہی تھی کہ وہ اپنے قریب کے رشتہ داروں یعنی قریش اور آس پاس کے اعراب کو متنبہ کرے.

مزید وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے (وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوۡمٍ ہَادٍ— اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اسکے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی۔ اے نبی تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو اور ہر ایک قوم کے لئے راہنما ہوا کرتا ہے۔— الرعد 7) اس سے زیادہ وضاحت اور بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن محمد سے کہتا ہے کہ تم صرف کافروں یعنی قریش کو خبردار کرنے آئے ہو کیونکہ باقی ہر قوم کا اپنا ایک مخصوص راہنما ہوتا ہے.

شاید اسلام کے شیخوں کو اس آیت سے غلط فہمی ہو گئی ہے (وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ— اور اے محمد ﷺ ہم نے تمکو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔— سبا 28) لفظ "کافہ" جو "الناس" سے پہلے آیا ہے کا مطلب جمع ہو سکتا ہے مگر اسی وقت اس کا مطلب "الکف" یعنی روکنا بھی ہو سکتا ہے یعنی لوگوں کو وہ جس کفر میں ہیں اس سے روکنا جیسا کہ قرطبی اپنی تفسیر میں بیان کرتا ہے، بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن میں لفظ "الناس" کا مطلب قریش یا قوم فرعون یا لوگوں کا کوئی بھی چھوٹا سا گروہ

ہو سکتا ہے، اس آیت کا منطقی معنی یہی بنتا ہے کہ اللہ نے محمد کو مکہ کے گرد تمام عربوں کیلئے اور انہیں اپنے کفر سے روکنے کیلئے بھیجا.

اس بات کی قرآن تصدیق بھی کرتا ہے (وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ- اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انہیں احکام الہٰی کھول کھول کر بتادے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ رہنے دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔- ابراہیم 4) یعنی یہ لازم ہے ہر رسول اس قوم کی زبان جانتا ہو جن کیلئے وہ بھیجا گیا ہو تاکہ انہیں اللہ کا پیغام احسن طریقہ سے پہنچا سکے اس معنی کی قرآن مزید تصدیق بھی کرتا ہے (نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ- عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ- بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ- اس کو امانتدار فرشتہ لے کر اترا ہے۔- یعنی اسنے تمہارے دل پر اسکا القا کیا ہے تاکہ لوگوں کو خبردار کرتے رہو۔- اور القا بھی فصیح و بلیغ عربی زبان میں کیا ہے۔- الشعراء 93-94-95) محمد کی ذمہ داری عربوں کو انہی کی عربی زبان میں خبردار کرنا ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا اسے عربی زبان میں چینیوں کو خبردار کرنے بھیج دے!!.

اس معنی کی مزید تاکید بھی قرآن کرتا ہے (وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ- فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ- اور اگر ہم اس کو کسی عجمی پر اتارتے۔- اور وہ اسے ان لوگوں کر پڑھ کر سناتا تو یہ اسے کبھی نہ مانتے۔- الشعراء 198-199) کیا کسی کو اس سے زیادہ وضاحت درکار ہے؟ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ عربی زبان میں اتارے گئے قرآن کا مقصد عجم نہیں تھے جو عربی نہیں سمجھتے بلکہ عرب ہی مقصود تھے جن کی زبان عربی ہے اگر اللہ اسے عجمیوں پر اتارتا جنہیں عربی نہیں آتی تو کبھی اس پر ایمان نہ لاتے، یقیناً اللہ لوگوں کو اسلام کے شیخوں سے زیادہ جانتا ہے.

اس بات کی مزید توثیق کیلئے کہ محمد صرف عربوں کیلئے ہی نبی بنا کر بھیجا گیا تھا قرآن کہتا ہے (وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ- اور اگر ہم اس قرآن کو غیر عربی زبان میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اسکی آیتیں ہماری زبان میں کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں- فصلت 44) اگر اللہ محمد کو قریش پر عجمی قرآن دے کر بھیجتا یعنی کسی دوسری زبان میں تو وہ کہتے کہ اس کا ترجمہ کرکے ہمیں بتاؤ کہ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آرہا، اگر اللہ نے قریش پر قرآن ان کی اپنی زبان میں ہی نازل کیا جبکہ وہ ساری دنیا کی آبادی کے حساب سے اقلیت تھے کیونکہ دوسری صورت میں وہ پیغام کو ہی نہ سمجھ سکتے تو کیا یہ معقول بات ہے کہ اللہ ایک عربی رسول کو عربی قرآن کے ساتھ ساری دنیا کے لوگوں کیلئے بھیجے گا جو چھ ہزار سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں؟

اسلامی پیغام میں زبان کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے جہاں سابقہ انبیاء کے معجزے طبعی نوعیت کے تھے جیسے سمندر کو چیرنا من وسلوی اتارنا اور مردوں کو زندہ کرنا وہاں محمد کو قرآن کے علاوہ کوئی معجزہ نہیں دیا گیا جس کی فصاحت وبلاغت پر قرآن کا خدا فخر کرتا ہوا نظر آتا ہے اور مشرکین کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اس جیسی کوئی ایک سورت لا کر دکھادیں کیونکہ اس کی زبان بلاغت کے لحاظ سے معجزہ قرار دی گئی ایسے میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خدا جو سب کچھ جانتا ہے عربی زبان میں لغوی معجزوں پر مشتمل ایک ایسی کتاب بھیجے جسے اہلِ عرب تک اچھی طرح نہ سمجھ سکے اور انہیں اس کی تفسیر کی ضرورت پڑی پھر وہ خدا تمام اہلِ ارض سے جو یہ زبان نہیں جانتے ان سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس قرآنی لغت کی خوبصورتی کے قائل ہو جائیں اور بغیر کوئی معجزہ دیکھے (جیسے موسیٰ کا معجزہ) ایمان لے آئیں؟

اللہ یا قرآن کا مصنف اس بات پر بہت فخر کرتا تھا کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے:

(اِنَّا ٓ انۡزَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۔ ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم لوگ سمجھ سکو۔۔ یوسف 2)

(کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ۔ ایسی کتاب جسکی آیتیں جدا جدا بیان کی گئی ہیں یعنی قرآن عربی ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔۔ فصلت 3)

(اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ۔ کہ ہم نے اسکو قرآن عربی بنایا ہے تاکہ تم لوگ سمجھو۔۔ الزخرف 3)

(وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ وَ ہٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ وَ بُشۡرٰی لِلۡمُحۡسِنِیۡنَ۔ اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب تھی لوگوں کے لئے رہنما اور رحمت۔ اور یہ کتاب عربی زبان میں ہے اسکی تصدیق کرنے والی تاکہ ظالموں کو خبردار کرے۔ اور نیکوکاروں کو خوشخبری سنائے۔۔ الاحقاف 12)

(وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا وَّ صَرَّفۡنَا فِیۡہِ مِنَ الۡوَعِیۡدِ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ اَوۡ یُحۡدِثُ لَہُمۡ ذِکۡرًا۔ اور ہم نے اسکو اسی طرح کا قرآن عربی نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح کے ڈراوے بیان کر دیئے ہیں تاکہ لوگ پرہیزگار بنیں۔ یا اللہ انکے لئے نصیحت پیدا کر دے۔۔ طہ 113)

(فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَ تُنۡذِرَ بِہٖ قَوۡمًا لُّدًّا۔ اے پیغمبر ﷺ ہم نے یہ قرآن تمہاری زبان میں آسان بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم اس سے پرہیزگاروں کو خوشخبری پہنچادو اور جھگڑالوؤں کو ڈرسنا دو۔۔ مریم 97)

(فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ۔ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔۔ الدخان 58)

(وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ۔اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔۔الزمر 27)

کیا اتنے زور اور تاکید و عربی زبان پر فخر کرنے کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے محمد کو کرہ ارض کے تمام لوگوں کیلئے بھیجا ہو اور ان سے ایسی زبان میں کلام کیا ہو جسے نہ وہ جانتے ہیں اور نا ہی سمجھتے ہیں؟ یقینی طور پر اللہ کا قرآن کے پیغام سے ساری انسانیت مراد نہیں تھی، اس بات کا ثبوت آج کی دنیا میں بھی نظر آتا ہے، عرب مسلمانوں کی تعداد جو عام عربی بولتے ہیں اور قرآن کی فصیح عربی نہیں سمجھتے تقریباً سو ملین ہے جن میں عورتیں اور بچے سب شامل ہیں ان میں سے آدھے تو سرے سے ان پڑھ ہیں اور قرآن کو نہیں سمجھتے جبکہ دنیا کے باقی مسلمان جن کی تعداد کوئی ایک ارب ہے وہ تو سرے سے عربی جانتے ہی نہیں اگرچہ بعض نے پورا قرآن حفظ کر رکھا ہوتا ہے تاہم یہ صرف رٹا ہی ہوتا ہے اور انہیں اس کے ایک لفظ کے مطلب تک کا نہیں پتہ ہوتا اس طرح وہ قرآن کے اس قول کی زندہ مثال ہوتے ہیں: کمثل الحمار یحمل اسفارا (انکی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں) ایسے لوگوں کی بہترین مثال پاکستان کے مسلمان ہیں جو اپنے اسلام میں دیگر مسلمانوں سے زیادہ متعصب اور متشدد ہیں جس کی وجہ ان کا عربی قرآنِ مبین کو نہ سمجھنا ہے. کیا اللہ کا محمد کو قرآن کے پیغام کے ساتھ بھیجنے کا یہی مقصد تھا کہ لوگ اسے بغیر سمجھے حفظ کر لیں؟

اور پھر خدا نے جو ساری دنیا کا حال جانتا ہے 124000 پیغمبر بھیجے جیسا کہ بعض اسلامی مصادر میں مذکور ہے، اگر ایک نبی کرہ ارض کے تمام لوگوں تک اس کا پیغام پہنچا سکتا تھا تو پھر اتنے پیغمبر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ بھیجے بھی زمین کے صرف ایک محدود حصے میں تھے جو چند سو کلو میٹر سے زیادہ نہیں ہے اور جہاں باقی زمین کے مقابلے میں صرف چند قومیں ہی رہتی ہیں؟ کیا وہ تمام انسانوں کو بغیر انبیاء کے اپنے ہی دین پر پیدا کر کے خود کو اور ہمیں مذاہب کے اس جنجال اور قتل و غارت گری سے نہیں بچا سکتا تھا؟

بارے کچھ اسلامی عبادات کے

کعبہ ایک چوکور یا مکعب شکل کی عمارت ہوتی ہے جو شاید عربوں کی عبادت گاہوں کی پسندیدہ شکل رہی ہے، پرانے زمانوں میں عرب میں کئی کعبے رہے ہیں جن میں نجران کا کعبہ، یمانی کعبہ، بیت اللات، شداد الایادی کا کعبہ اور غطفان کا کعبہ خاصی شہرت کے حامل تھے نیز یہ کہ ہر کعبے میں ایک کالے پتھر (حجر اسود) کے لیے ایک فریم بھی ہوا کرتا تھا، ان کعبوں کو خدا کا گھر سمجھا

جاتا تھا پھر ان کے گرد بتوں کا جال بچھا دیا جاتا تھا جو دراصل ایسے چھوٹے خدا ہوتے تھے جو آسمان پر موجود خدا کے ہاں لوگوں کی شفاعت کیا کرتے تھے.

نبطی عرب ایک سیاہ پتھر کو مقدس گردانتے تھے جو سورج کے خدا کی علامت تھا، اسی طرح ہذیلیوں نے منات نامی خدا کے سیاہ پتھر کی عبادت کی مزید بر آں ذوالشری نامی خدا کا بھی ایک سیاہ پتھر ہوا کرتا تھا.

جہاں تک مکے کے کعبے کا تعلق ہے تو کئی محققین کا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت کی وجہ شہر مکہ کا تجارت کی پٹی پر واقع ہونا تھا یہی وجہ ہے کہ عربوں میں اس کی مقبولیت زیادہ رہی، مکے کا تجارتی راستہ کاٹنے کے لیے بیز نطیوں کی ایماء پر حبشیوں کی مکہ پر چڑھائی کی ناکامی بھی اس مقبولیت کی ایک نفسیاتی وجہ ہو سکتی ہے، اس واقعے پر ایک عرب شاعر رؤبہ بن العجاج کہتے ہیں:

ومسہم مامس اصحاب الفیل
ترمیہم بحجارہ من سجیل
ولعبت بہم طیر ابابیل
فصیروا مثل عصف ماکول

(نوٹ کریں کہ قثم بن عبد اللات کی سورہ فیل اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کے ایک شاعر سے کتنی مماثلت رکھتی ہے)

ابرہہ کی مہم کی ناکامی میں کوئی خدائی ہاتھ نہیں تھا کیونکہ تاریخ ناکام فوجی حملوں سے بھری پڑی ہے، کہا جاتا ہے کہ جس سال ابرہہ نے مکہ و دیگر کعبوں پر چڑھائی کی مہم شروع کی اس سال چیچک کی وباء بری طرح پھیلی ہوئی تھی..

جہاں تک اسلامی حج کا تعلق ہے تو یہ قبل از اسلام کے "حجوں" سے زیادہ مختلف نہیں ہے، اسلام نے اسے محض کچھ پالش کر کے اپنی آئیڈیالوجی گھسیڑی ہے.

مثلاً اگر صفا مروہ کی سعی کو ہی لے لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی طور پر صفا اور مروہ اساف اور نائلہ نامی بتوں کی عبادت کی جگہ تھی، یقیناً اسلامی کہانی سعی کی عبادت کی دوسری وجوہات بیان کرتی ہے جس میں ہاجرہ کا قصہ اور آدم اور حوا کا صفا مروہ پر نازل ہونا شامل ہے.. یہاں بھی نوٹ کریں کہ اساف اور نائلہ مرد اور عورت خدا ہیں..

اس کے علاوہ ایک قبل از اسلام کہانی بھی ہے جس میں ایک جوڑے نے یہاں جنسی عمل انجام دیا، اسلامی راوی اس کہانی کو ترقی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ اس گندے فعل کی وجہ سے بت بن گئے تھے.. جبکہ ہم جو اس افسانوی قصے کو مسترد کرتے ہیں جنس کی عبادت کو اس قصے میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں.

اگلی کسی تحریر میں ہم مزید بوگسیات پر روشنی ڈالیں گے جیسے اسلام میں چاند کی اہمیت اور قبل از اسلام کے وہ مقدس دن جن سے اسلام دستبردار نہیں ہوا وغیرہ..

نوٹ: تحریر میں دی گئی معلومات کے حوالوں کے لیئے آپ تاریخ العرب قبل الاسلام–الاسطورہ والتراث اور نحو المیثولوجیا لدی العرب دیکھ سکتے ہیں.

مانی

اگر کوئی افسانوی قصہ یا فکر کسی دوسرے قصے یا فکر سے مشابہت رکھتی ہو تو منطقی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بعد والے نے پہلے والے سے اقتباس کیا ہے یا اس سے متاثر ہوا ہے.. اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ذرامانوی مذہب پر ایک نظر ڈالتے ہیں.

مانی 216ء عیسوی کو بابل میں پیدا ہوا..
اس نے دعوی کیا کہ اللہ نے اسے ایک فرشتے کے ذریعے بتایا ہے کہ وہ پہلے کے تمام انبیاء جیسے زرداشت، عیسی، بدھا کی رسالت کی تکمیل کرنے آیا ہے اور آخری نبی ہے..
مانی پر بذریعہ وحی ایک کتاب بھی اتاری گئی جو اللہ کا کلام تھا..
مانوی مومن دن اور رات میں چار نمازیں پڑھتے تھے اور سال میں ایک ماہ روزے بھی رکھتے تھے..
مانوی عقیدے کے مطابق جب کوئی نیک مانوی مرتا ہے تو اسے جنت ملتی ہے جس میں تمام ترتعیشات کے ساتھ ساتھ خوبصورت حوریں بھی شامل ہیں..
مانی سب لوگوں سے اچھا ہے یعنی "خیر الناس" ہے اور انسانیت کو ظلمات کے اندھیروں سے بچانے کا ذمہ اسی کے سر ہے اور جو لوگ اس کی رسالت پر یقین نہیں رکھتے حقیقت سے بے بہرہ ہیں یا حقیقت کا صرف کچھ حصہ جانتے ہیں (یعنی دوسرے انبیاء کو ماننے والے)..

مانوی مذہب نے بہت مقبولیت حاصل کی اور جزیرہ عرب تک پہنچا..یعنی اسلام کو پیدا کرنے والے ماحول میں مانوی فکر اور روایات جانی پہچانی تھیں..

ان سب حقائق سے کیا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے.

جو یہاں پیو بھی تو حلال ہے!!

(اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا— بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں وہ بہت سا اختلاف پاتے۔—النساء82)

مسلمان قرآن کو اتنے مقدسانہ طریقہ سے پڑھتے ہیں کہ آیات کے عیب ظاہر ہی نہیں ہو پاتے مگر کیا مقدس کتابوں کو اس طرح کے معصومانہ طریقہ پڑھنا چاہیے؟ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ خدا کی بجائے عقل کو حاضر ناظر جان کر اسے ناقدانہ نظر سے پڑھتے تو انہیں اوپر والی آیت کا مذاق سمجھ میں آجاتا، ورنہ بغیر ناقدانہ نظر کے اتنی مقدس کتابوں میں صحیح اور غلط کا فیصلہ کیسے ہو پائے گا؟

آج ہم ایسے ہی ایک قرآنی تضاد پر بات کرنے لگے ہیں جو مدت تک ظلمائے اسلام میں فساد کا باعث رہا ہے.

(وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ—وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ—اور تمہارے لئے چوپایوں میں بھی مقام عبرت و غور ہے کہ انکے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے اس کے درمیان سے نکال کر ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔—اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق کھاتے ہو جو لوگ سمجھ رکھتے ہیں انکے لئے ان چیزوں میں نشانی ہے۔—النحل66-67)

ان دو آیات میں ”اللہ“ اپنے بندوں کو دی جانے والی چند نعمتوں کا ذکر کر رہا ہے:

دودھ کی نعمت-چوپایوں کی نعمت-شراب کی نعمت جسے وہ انگور اور کھجور سے کشید کرتے ہیں اور رزق کی نعمت جو انہیں ان پھلوں کی صورت ملتی ہے.

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو اپنی نعمتیں جتلا رہا ہے کہ اس نے انہیں چوپائے، دودھ، کھجور اور انگور دیئے جس سے وہ شراب بناتے ہیں اور عمدہ رزق کھاتے ہیں، یہی نہیں بلکہ اس میں عقلمندوں کیلئیے نشانی بھی ہے!!

یہ بیان شراب کو حرام قرار دینے والی آیت سے متصادم ہے جو کہتی ہے:

(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَیۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ-اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ-المائدہ 90)

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر شراب کو نعمت قرار دیتے ہوئے اسے اپنے جملہ نعمتوں میں شمار کرے اور پھر اچانک اس کے خلاف جاتے ہوئے اسے "اعمال شیطان" قرار دے دے؟

جب اللہ شراب کو اپنی نعمتوں میں شمار کر رہا تھا کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ کل وہ اسے اعمالِ شیطان بنا دے گا؟

تفسیر ابی بکر الجزائری میں ہے:

"یعنی کھجور اور انگور کے بعض پھلوں سے تم شراب بناتے ہو یعنی نشہ آور شراب اور یہ شراب کو حرام قرار دینے سے پہلے تھا"

ایسا ہی بیان تفسیر الطبری میں ہے:

"یہ آیت اس وقت اتری جب وہ شراب پی رہے تھے جو شراب کو حرام کرنے سے پہلے ہے"

نوٹ کریں کہ مفسر اسے شراب کو حرام قرار دیئے جانے سے قبل کا معاملہ قرار دے رہے ہیں مگر یہ بات نظر انداز کر رہے ہیں کہ اللہ اسے اپنی جملہ نعمتوں میں شمار کر رہا ہے؟ تضاد صاف ظاہر ہے جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مصنف کو یہ پتہ ہی نہیں ہو تا کہ اس نے کل کیا لکھنا ہے!!

یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کوئی کمیونزم کی خوبیاں شمار کرے اور پھر کل آکر کہے کہ کمیونزم شیطانی نظام ہے!!!!

یہ آیت بہت بڑی فقہی بحث کی وجہ بنی رہی ہے اور فقہاء نے اس پر خوب قلابازیاں کھائی ہیں، مثال کے طور پر احناف کہتے ہیں:

"سکر اسے مراد نشہ نہ دینے والی شراب ہے دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے اپنی نعمتیں اپنے بندوں کو جتلائی ہیں اور جتلانا حلال چیز پر ہو سکتا ہے حرام پر نہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نشہ نہ دینے والی شراب پی جا سکتی ہے جب وہ نشہ آور ہو جائے تو جائز نہیں"

صاف ظاہر ہے کہ آیت کی تفسیر کی بوکھلاہٹ نے انہیں شراب پینے کی اجازت دینے پر مجبور کر دیا مگر صرف اس صورت میں اگر وہ نشہ آور نہ ہو!!!

اس آیت کی وجہ سے امام سفیان الثوری اور ابراہیم النخعی نے شراب پینی شروع کر دی تھی جو تفسیر القرطبی میں درج ہے:

"ابراہیم النخعی اور ابو جعفر الطحاوی نے اسے جائز قرار دیا اور وہ اپنے زمانے کے لوگوں کے امام تھے اور سفیان الثوری بھی اسے پیتے تھے"

یوں فریق مخالف جو اس آیت کو منسوخ قرار دیتا ہے بہت اچھلا اور احادیث سے دلائل دے دے کر صفحات کے صفحات سیاہ کر دیے جیسے "ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے" وغیرہ بلکہ بعض نے تو لفظ "سکر" کا معنی ہی بدل دیا اور اسے عام مشروب قرار دیا جیسے پیپسی مرنڈا اور سپرائٹ.....!!!

اس سارے جاہلانہ مذاق میں کوئی ان سے پوچھے کہ عقل کہاں ہے؟ کیا ان انہوں نے یہ آیت نہیں پڑھی:

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى – مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک ان الفاظ کو جو منہ سے کہو سمجھنے نہ لگو۔ نماز کے پاس نہ جاؤ۔ – النساء 43)

کیا یہاں لفظ "سکاری" سے مراد نشہ نہیں ہے؟ یا اس کا مقام اور اور اُس کا مقام اور ہے؟

کیاانہیں نظر نہیں آتا کہ آیت انگور اور کھجور کی بات کر رہی ہے جن سے شراب بنائی جاتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ابو ہریرہ نے نبی سے روایت کیا "شراب ان دو درختوں سے ہے کھجور اور انگور"

اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اللہ اپنے وسیع اور بلیغ لغت سے اس لغوی مسئلہ سے بچ نہیں سکتا تھا؟

جواب یقیناًہاں میں ہے اسے بس لفظ "سکرا" کو لفظ "شراب" (عام مشروب) سے بدلنے کی ضرورت تھی اور یہ اشکال پیدا ہی نہ ہوتا:

"ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ شرابا طیباورزقاحسناان فی ذلک لایہ لقوم یعقلون"

آپ نے دیکھا کہ کس طرح صرف ایک لفظ بدلنے سے سارا مسئلہ حل ہو گیا اور شبہہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، اب کوئی بھی شراب کو حلال قرار نہیں دے سکتا کیونکہ اس طرح آیت میں شراب کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اس طرح سفیان الثوری اور ابراہیم النخعی اس حرام سے بچ جاتے اور کوئی اس لفظ سے غلط مطلب نہ نکال سکتا.. مگر کیا یہ کام خدا کیلیئے مشکل تھا؟ یا اسے اپنے اس قول کے نتائج کی خبر نہیں تھی؟

یہاں کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ یہ آیت جیسا کہ مفسرین نے بھی اوپر بیان کیا ہے شراب کو حرام کرنے سے پہلے کی ہے، ایسے خردمند کو ہم کہیں گے کہ اس سے ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اللہ نے شراب کو اپنی نعمتوں میں کیوں شمار کیا؟ کیونکہ یہ خبر ہے اور ابن عربی کے مطابق خبر منسوخ نہیں ہوتی، اگر اللہ جانتا تھا کہ وہ اسے کل حرام کر دے گا تو اسے شراب کو اپنی نعمتوں میں شمار کرنے کیلیئے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا اس آیت میں شراب کا ذکر اللہ کی نعمتوں کے بیان کے ضمن میں ہوا ہے!!!

کوئی یہ اعتراض بھی کر سکتا ہے کہ "حسنا" کی صفت شراب پر لاگو نہیں ہوتی، ایسے چیمپئن کو بھی ہم یہ کہیں گے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس پر لاگو ہو یا نہ ہو اگر بفرضِ محال اس پر لاگو نہ بھی ہو تو بھی یہ بری قرار نہیں پائے گی کیونکہ شراب نعمتوں کی فہرست میں آئی ہے جو کہ عبرت کیلیئے ہیں یعنی "جو لوگ سمجھ رکھتے ہیں انکے لئے ان چیزوں میں نشانی ہے"!!

خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایسا قرآنی جھول ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کتاب دنیا کی سب سے بڑی جعلسازی ہے اور قطعی طور پر آسمانی نہیں ہو سکتی، کاتب کو پتہ ہی نہیں تھا کہ ایک دن اسے شراب کو حرام کرنا پڑے گا چنانچہ وہ اسے اللہ کی نعمتوں میں شمار کر

گیا! اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہوتی تو اللہ ایسے تضاد میں کبھی نہ پڑتا اور ایسا لفظ استعمال کرتا جس سے قطعی شبہہ نہ ہوتا جیسے "شراباًطیباً"

عبد اللہ بن ابی السرح اور وحی کا ڈرامہ

جبریل نے محمد کو کئی بار بے وقوف بنایا، جب فنِ نبوت میں اس کا استاد ورقہ بن نوفل مر گیا تو روایات کے مطابق کوئی تین سے دو سال وحی منقطع رہی حالانکہ اس وقت مکیوں سے اس کی لڑائی عین عروج پر تھی، مسلمان اخباری اسے "وحی میں فتور" قرار دیتے ہیں یعنی کہ اسے جبریل نظر تو آتا تھا مگر کوئی آیتیں نہیں دیتا تھا چنانچہ صاحب بہت غمزدہ ہوئے اور شدید نفسیاتی دباؤ میں آگئے اور کئی بار بلند و بالا پہاڑیوں پر چڑھ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر عین وقت پر جبریل آکر اسے یہ کہہ کر روک دیتا تھا کہ "اے محمد تم واقعی اللہ کے رسول ہو" جیسا کہ بخاری اور طبری میں مذکور ہے.. دوسری بار جبریل نے اسے تب دھوکہ دیا جب قریشیوں نے اس کیلئیے النضر بن الحارث کی قیادت میں ایک امتحان وضع کیا اور اسے تین سوال دیے جن کے جواب کیلئیے اس نے اگلے دن کی مہلت مانگ لی مگر وقت پر نہیں آیا، اس وقت جبریل پندرہ دن تک غائب رہا اور جب آیا بھی تو اسے گول مول جواب ہی دے پایا.. محمد کی سیرت کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب محمد سے ذرا ٹیڑھے سوال کیے جاتے تھے اور وہ کہیں پھنس جاتا تھا تو جبریل اچانک ہی کہیں غائب ہو جاتا تھا لیکن جب معاملہ اس کے کسی جنسی مسئلہ کے متعلق ہوتا تھا تو فوراً ہی نازل ہو جاتا تھا جس کی گواہ خود اس کی اپنی بیوی عائشہ ہے جب ایک عورت خود کو محمد کے حوالے کرنے آئی اور اس نے اس کیلئیے فوراً ہی ایک آیت گھڑ لی تو عائشہ نے کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا رب تمہاری مرضی میں بہت جلدی کر رہا ہے"!!

اسے لکھ دو یہ ایسے ہی اتری ہے!

یہاں ہمارا سامنا جھوٹی وحی کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلے سے ہے جو اتفاق سے وقوع پذیر ہوا اور محمد کو ایک مشکل میں پھنسا گیا جب اس نے عبد اللہ بن ابی السرح القرشی المکی کی تصنیف کردہ ایک آیت پر ڈاکہ ڈالا جو مسلمان ہو کر مہاجرین کے ساتھ یثرب آگیا تھا جہاں اسے وحی کی کتابت کا عہدہ دیا گیا.. ابن سید الناس اپنی کتاب "عیون الاثر فی المغازی والسیر" میں کہتا ہے کہ عبد اللہ بن ابی السرح قریش میں سے سب سے پہلا شخص تھا جس نے وحی لکھی تھی جبکہ انصار میں سے سب سے پہلے وحی کی کتابت کعب بن ابی نے کی تھی اگرچہ جیسا کہ اسلامی تاریخ کی روایت ہے اس حوالے سے کچھ متضاد روایات بھی موجود ہیں، اور جیسا کہ سب جانتے ہیں وحی لکھنے والا محمد کے سامنے بیٹھتا تھا اور محمد اسے کچھ آیات لکھواتا تھا جن کے بارے میں اس کا دعوی تھا کہ یہ جبریل کے ذریعے بھیجی جانے والی اللہ کی وحی ہے، ایک دن جب محمد عبد اللہ بن ابی السرح کو سورہ المومنون کی کچھ آیات لکھوا رہا تھا تو ایک عجیب ڈرامہ ہوا، آیات یہ تھیں:

(وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ﴿12﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿13﴾
ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ☆ ثُمَّ
أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ﴿14﴾

یہاں–سیرت کی کتابوں کے مطابق جن میں الطبری، القرطبی اور البیضاوی شامل ہیں–عبد اللہ بن ابی السرح نے حیران ہو کر کہا: "تبارک اللہ احسن الخالقین".. معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ محمد کو بڑا پسند آیا چنانچہ محمد نے عبد اللہ بن ابی السرح کو حکم دیا کہ "اکتبہا، ہکذا انزلت (اسے لکھ دو یہ ایسے ہی اتری ہے)" چنانچہ عبد اللہ بن ابی السرح نے اسے لکھ دیا اور آیت یوں ہو گئی:

(ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ☆ ثُمَّ
أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿14﴾)

یہ ڈرامہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ کر عبد اللہ بن ابی السرح کے دل میں شکوک وشبہات کا جنم لینا ایک فطری امر تھا کہ اس نے ایک عبارت محض تعجب کے طور پر کہی تھی اور محمد نے اسے وحی کے طور پر اپنے قرآن میں شامل کروا دیا.. تفسیر الطبری، القرطبی اور البیضاوی میں آیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی السرح نے کہا "اگر محمد پر وحی آتی ہے تو پھر مجھ پر بھی وحی آئی ہے اور اگر اسے اللہ اتارتا ہے تو میں نے اللہ جیسا کلام اتارا ہے".. نیسابوری اپنی کتاب "اسباب النزول" میں لکھتا ہے کہ عبد اللہ بن ابی السرح نے کہا کہ "اگر محمد سچا ہے تو مجھ پر بھی ویسے ہی وحی آئی ہے جیسے اس پر آئی ہے اور اگر جھوٹا ہے تو میں نے بھی ویسا کلام کہا جیسا کہ اس نے کہا".. کیا ابن ابی السرح نے محمد پر جھوٹا الزام لگایا؟ یقیناً نہیں.. سچ یہ ہے کہ اس کے منہ سے نکلی بات پر محمد نے بغیر کاپی رائٹ کی پرواہ کیے قبضہ کر لیا اور یہ بھول گیا کہ اسی نے مکیوں کو یہ چیلنج دیا تھا کہ وہ اس جیسی ایک آیت تک نہیں لا سکتے چاہے وہ جنوں کی مدد ہی کیوں نہ لے لیں.. اور اس طرح عبد اللہ بن ابی السرح نے وحی کے جھوٹ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا بلکہ اس کا ایک اہم کردار رہا اور حقیقت اس پر آشکار ہو گئی.. تاہم مزید تصدیق کیلیئے–جیسا کہ واقعات کے سیاق سے پتہ چلتا ہے–اس نے محمد کا ردِ عمل دیکھنے کیلیئے ایک کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا.. اور جیسا کہ واقدی کی کتاب المغازی، ابن الاثیر کی الکامل فی التاریخ اور تفسیر الطبری میں آیا ہے، جب محمد اسے "علیم حکیم" لکھنے کیلیئے کہتا تو وہ اسے الٹ کر "حکیم علیم" کر دیتا اور پھر محمد کو پڑھ کر سناتا مگر محمد کو اس الٹ پھیر اور تبدیلی کا ذرا بھی پتہ نہ چلتا.. الواقدی اس پر عبد اللہ بن ابی السرح کا ایک تبصرہ نقل کرتا ہے کہ: "مایدری محمد مایقول انی لاکتب لہ ماشئت ہذا الذی کتبت یوحی الی کما یوحی الی محمد (محمد کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور میں جو چاہتا اسے لکھ کر دے رہا تھا، یہ جو میں نے لکھا ہے مجھ پر وحی ہوتی ہے جیسا کہ محمد پر وحی ہوتی ہے)" جبکہ طبری اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی السرح محمد کو اپنا لکھا ہوا پڑھ کر سناتا تھا تو محمد کہتا تھا کہ

"نعم سواء (ہاں ٹھیک ہے)".. عبد اللہ بن ابی السرح نے یہ کھیل کئی آیات کے ساتھ کھیلا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ محمد محض ایک فراڈیا ہے واپس مکہ بھاگ گیا اور اسلام کو خیر باد کہہ دیا...

مکہ جاکر عبد اللہ بن ابی السرح نے مکیوں کو محمد کے جھوٹ کا یہ تازہ قصہ سنایا جنہیں پہلے ہی محمد کے جھوٹ کیلئیے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اس کا امتحان لے چکے تھے اور محمد اس میں بری طرح پٹ چکا تھا کہ کس طرح اس نے محض تعجب اور حیرانی میں ایک بات کہی اور محمد نے اسے قرآن میں شامل کر دیا اور کس طرح وہ آیات میں ردوبدل کر کے اسے سناتا اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا اور نا ہی وہ کوئی اعتراض کرتا... اس نے مکیوں کو بتایا کہ "دینکم خیر من دینہ (تمہارا دین اس کے دین سے بہتر ہے)".. جب محمد کو پتہ چلا کہ بندہ اس کے ساتھ کیا گیم کھیل کر گیا ہے تو اس کی سٹی گل ہو گئی، مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور یہ پہچاننا مشکل تھا کہ عبد اللہ بن ابی السرح نے قرآن میں کہاں کہاں ردوبدل کیا ہے چنانچہ عبد اللہ بن ابی السرح کو جھوٹا قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئے محمد نے دوبارہ وحی کی گیم کھیلی اور ایک آیت لے آیا کہ:

(وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْہِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَکُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْہُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔ اور جو یہ کہے کہ جس طرح کی کتاب اللہ نے نازل کی ہے اسی طرح کی میں بھی بنالیتا ہوں اور کاش تم ان ظالم یعنی مشرک لوگوں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے انکی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور اسکی آیتوں سے سرکشی کرتے تھے۔ - سورۃ الانعام آیت 93)

آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ادبی چوری کو قانونی حیثیت دینے کی ایک بھونڈی کوشش ہے تا کہ اپنے احمق تابعین کو گمراہ کرنے کا ڈرامہ جاری رہ سکے کہ واقعی آسمان سے کوئی وحی اس پر نازل ہوتی ہے مگر سچائی کی گردن مروڑنے کی اس کے ہر کوشش رائیگاں گئی کہ تاریخ کا مکر اس سے کہیں طاقتور تھا کیونکہ یہ آیت ہر صاحب عقل ودانش کیلئیے ایک اضافی دلیل کے طور پر موجود رہی جس سے اس کے جھوٹے وحی کا پردہ چاک ہوا۔

ظاہر ہے اتنی بڑی "بیستی" کے بعد محمد جیسا وحشی شخص عبد اللہ بن ابی السرح کو زندہ کیسے چھوڑ سکتا تھا.. اس کی لغت میں رحمت نام کی کوئی چیز نہیں تھی.. ان نے اپنے دشمنوں کو بدترین گالیوں سے نوازا تھا یہ گالیاں اس کی اعلی اخلاقیات کا منہ بولتا ثبوت ہیں جیسے: تباً، حمالہ الحطب، عتل، زنیم، ہماز مشاء بنمیم، افاک اثیم، مثل الحمار یحمل اسفارا، خنزیر وغیرہ اور انہیں گھٹیا ترین القاب سے پکارا جیسے عمرو بن ہشام بن المغیرہ پر اس نے ابو جہل کا لقب چپکا دیا حالانکہ وہ ایک بڑا ہی باحکمت شخص تھا اور اہلِ مکہ اسے "ابی الحکم" کے نام سے بلایا کرتے تھے، اس طرح اس نے مسیلمہ بن حبیب الحنفی پر "مسیلمہ الکذاب" کا لقب چپکا دیا حالانکہ اس کا جرم محض اتنا تھا کہ اس نے اسی کی طرح جھوٹی نبوت کا دعوی کیا تھا.. غرض کے محمد کے ہاتھ جو لگا اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا.. فتح مکہ کے دن – جسے وہ دعوت سے فتح نہ کر سکا تو تلوار سے فتح کرنے آن پہنچا – اس نے مکیوں میں سے دس لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا چاہے وہ کعبے کے غلاف کے پیچھے ہی کیوں نہ چھپے ہوں، ان دس میں عبد اللہ بن ابی السرح کا نام بھی شامل تھا.. خون کے پیاسے اسے پاگل کتوں کی طرح ہر جگہ ڈھونڈتے رہے مگر عبد اللہ بن ابی السرح محمد کے عزیز ترین دوست عثمان بن عفان کے گھر چھپا ہوا تھا کیونکہ وہ اس کا رضاعی بھائی تھا!!.. جب معاملات ٹھنڈے ہوگئے تو عثمان اسے لے کر محمد کے پاس آیا اور جیسا کہ سیرہ ابن ہشام، الطبقات الکبری، المغازی اور تفسیر القرطبی میں درج ہے عثمان نے اس کیلئیے امان طلب کی مگر محمد خاموش رہا، جب عثمان نے اپنی عرضی تین دفعہ دہرائی تو وہ اسے کرہاً معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، جب عثمان اور عبد اللہ بن ابی السرح چلے گئے تو محمد نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس نے جان بوجھ کر اس امید پر طویل خاموشی اختیار کی تھی کہ کوئی اٹھ کر اس کی گردن اڑا دے!! اور اس طرح عبد اللہ بن ابی السرح محمد کی خون آلود تلوار سے بڑی مشکل سے بچ پایا اور پھر "جہاد فی سبیل اللہ" کے کوڈ نیم کے تحت لوٹ مار کی جنگوں میں شامل ہو گیا جس کے ساتھ محمد کا سچا نبی ہونا اتنا ضروری نہیں تھا جتنا کہ غلام، باندیاں اور مالِ غنیمت کا آنا ضروری تھا.

اللہ کی بے بسی

پرانے زمانوں کے انسان کا خدا کو ایجاد کرنے کا مقصد خود کو آندھی طوفانوں اور دیگر قدرتی آفات سے بچانا تھا جس کے بدلے میں وہ خدا کو قربانیاں دیتا تھا پھر جب انسان نے کچھ ترقی کر لی تو اس نے خدا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جن میں ایک اچھائی اور ایک برائی کا خدا تھا اور ظاہر ہے اچھائی کے خدا کا کام محبت بارش وغیرہ دینا تھا جبکہ برائی کے خدا کا کام موت بیماری مصیبت اور قدرتی آفتیں نازل کرنا تھا یوں انسان نے ان ناقابلِ فہم امور کی ایک توجیہ تیار کر لی تھی. پھر انسان نے ان خداؤں کو قربانیاں دینی شروع کیں حتی کہ بعض معاشروں میں کنواری خوبصورت لڑکیوں تک کو قربان کر دیا جاتا تھا تاکہ خدا کی قربت کی ضمانت

حاصل کی جاسکے اور خدا ان قربانیوں کے بدلے میں ان پر بارشیں نازل کرے اور فصلوں کو ہرا بھرا کردے غرض کے تمام قدیمی معاشروں میں خدا ہی انسان کو بچاتا اور اس کے دفاع کیلئیے لڑتا تھا.

پھر جنگوں، نفرتوں اور دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی آیات سے بھرپور تورات کے ساتھ موسی پدھارا اور انسانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ زمین کے حصول کیلئیے جنگیں لڑیں اور خون بہائیں، موسی کے خدا نے صرف اس حکم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ داود کیلئیے جنگوں کی حکمتِ عملی ترتیب دی اور اپنے عرش سے اتر کر فوجیوں کے ساتھ زمین پر ان کے ساتھ شانہ بشانہ لڑا بلکہ ان سب کے آگے آگے رہا، معلوم ہوتا ہے کہ موسی کے خدا کو اپنی باقی مخلوقات سے کوئی خاص دلچسبی نہیں تھی ماسوائے اس کی اپنی چنیدہ قوم کے چنانچہ اس نے شاہ چاؤول یا شاوول کو وصیت کی کہ وہ ہر حرکت کرنے والی چیز کو قتل کردے، اور چونکہ موسی کے خدا کو اپنی چنیدہ قوم کے علاوہ دوسری کسی بھی قوم سے کوئی دلچسبی نہیں تھی چنانچہ اس نے ان کی سائیڈ لیتے ہوئے انہیں باقی تمام قوموں کی زمین دینے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے حصول کیلئیے ان کے ساتھ دوسری قوموں کو نیست ونابود کرنے کیلئیے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا (یشوع کا سفر).

آغاز میں اسلام بھی اسی ٹائپ کے خدا کے ساتھ نمودار ہوا جب قثم مکہ میں تھا اور لوگوں کو سابقہ انبیاء کے قصے سنا سنا کر ڈرانے کی کوشش کرتا تھا کہ کس طرح خدا نے سابقہ قوموں کو اپنے انبیاء کی بات نہ ماننے پر سزائیں دیں اور انہیں تہس نہس کردیا اور جو ان پر ایمان لائے تھے ان کی حفاظت کی، مگر ہجرت کے بعد خدا کا تصور اور کام دونوں اچانک تبدیل ہوگئے اور خدا کفار پر زمین الٹنے یا طوفان بھیجنے کے قابل نہیں رہا تھا چنانچہ اس نے مومنین سے جنت کے بدلے میں ان کی جان اور مال خرید لیا تا کہ وہ اس کے دین کی نصرت کیلئیے جنگیں لڑیں (اِنَّ اللہَ اش◌ترٰی مِنَ ال◌مُؤ◌مِنِی◌نَ اَن◌فُسَہُم◌وَاَم◌وَالَہُم◌بِاَنَّ لَہُمُ ال◌جَنَّۃَ◌ؕیُقَاتِلُو◌نَ فِی◌سَبِی◌لِ اللہِ فَیَق◌تُلُو◌نَ وَیُق◌تَلُو◌نَ◌وَع◌دًا عَلَی◌ہِ حَقًّا فِی التَّو◌رٰىۃِ وَال◌اِن◌جِی◌لِ وَال◌قُر◌اٰنِ◌ؕوَمَن◌اَو◌فٰی بِعَہ◌دِہٖ مِنَ اللہِ فَاس◌تَب◌شِرُو◌ا بِبَی◌عِکُمُ الَّذِی◌بَایَع◌تُم◌بِہٖ◌ؕوَذٰلِکَ ہُوَ ال◌فَو◌زُال◌عَظِی◌مُ– اللہ نے مومنوں سے انکی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں اور اسکے عوض انکے لئے بہشت تیار کی ہے۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔ یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔– التوبہ 111) کیونکہ یا تو خدا خود لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا یا سستی کے مارے لڑنا نہیں چاہتا تھا جیسا کہ موسی کے زمانے میں لڑا تھا چنانچہ اس نے مومنین سے ان کی جان ومال خرد دینے پر اکتفا کیا تا کہ وہ اس کی جگہ لڑ سکیں.

اللہ کی راہ میں قتل یا قتال کرنے والوں کو ایک تیر سے دو شکار کرنے کا موقع مل گیا، دنیا میں عورتوں کو قید کر کے انہیں کنیزیں بنا کر عیش کریں جبکہ آخرت کی جنت میں مزید حوریں ان کی منتظر ہوتیں، جتنا وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اتنی زیادہ کنیزیں اور حوریں انہیں میسر آتیں، عیاشی دینے والا یہ خدا مومنین کو بہت پسند آیا اور وہ اس سے اتنا قریب ہوتے چلے گئے کہ وہ انہیں اپنی طرح انسان کی سی کوئی شئے لگنے لگا چنانچہ انہوں نے اس کیلئیے ہاتھ پیر سننے کیلئیے کان اور بولنے کیلئیے زبان ایجاد کر لی تاہم اس بیچارے خدا کو شادی کی سی اہم صفت سے محروم رکھا تا کہ اس کے بچے نہ پیدا ہو جائیں اور "توحید" کی عمارت ڈھیر نہ ہو جائے، تاہم باقی صفات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی حتی کہ ابن تیمیہ نے تو اسے ہر رات اپنے عرش پر سے اتر کر زمین کی سیر کرنے پر مجبور کر دیا تا کہ وہ مومنین کی دعائیں سنے اور انہیں پورا کرے گویا عرش کے دور ہونے کی وجہ سے خدا کو مومنین کی آواز سننے میں دقت کا سامنا تھا، اگر اس زمانے میں سیٹ لائیٹ سسٹم ایجاد ہو گیا ہوتا تو شاید خدا کو یہ زحمت نہ کرنی پڑتی.

پھر آہستہ آہستہ مسلمانوں کے خدا نے ان کی حفاظت کرنی چھوڑ دی جنہیں جنگوں بیماریوں اور قدرتی آفتوں کا سامنا ہوتا رہا مگر خدا ان کی حفاظت کرنے کیلئیے ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا. چنانچہ خدا نے جو ذمہ داری نبھانی چھوڑ دی وہ اس کے چچوں نے سنبھال لی، اب جہاں کافر اپنی حفاظت کیلئیے زلزلہ سے محفوظ عمارتیں، سیلابوں سے بچنے کیلئیے ڈیم اور دیگر چیزیں بنا رہے تھے وہاں مسلمانوں کی ساری توجہ کفار سے اپنے خدا کی حفاظت پر مرکوز رہی، فقہاء نے خوب اجتہاد کر کے کفر کے فتوے تیار کیئے تا کہ ان سے اختلاف کرنے والوں پر لاگو کیئے جا سکیں اور انہیں خدا کا دشمن قرار دیا جا سکے، اس طرح اللہ کے دشمن اس کے دوستوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئے، اب جس شخص کو اللہ کا دشمن قرار دے دیا جائے اسے قتل کرنا عین فرض ہو گیا تا کہ اسے قتل کر کے قاتل اللہ کی قربت حاصل کر سکے یوں خدا اپنے دشمنوں سے اپنی حفاظت کرنے سے بھی عاجز ہو گیا اور یہ کام اس نے اسلامی جماعتوں کے شدت پسندوں کے حوالے کر دیا جو ساری دنیا میں کینسر کی طرح پھیل گئی ہیں، مراکش میں ایک اسلامی دہشت گرد نے عدالت کو بتایا کہ اس نے مقتول کو اللہ سے قربت حاصل کرنے کیلئیے قتل کیا اور مقتول اللہ سے قربت کیلئیے اس کی پہلی قربانی تھا!! ہالینڈ میں فلم ڈائریکٹر تھیووین گوخ Theo van Gogh کو قتل کرنے والے محمد بویری نے عدالت میں کہا کہ اسے اپنے کیئے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اس نے یہ قتل اللہ سے قربت حاصل کرنے کیلئیے کیا ہے کیونکہ مقتول اللہ کا دشمن تھا!! اسی طرح عراق کے مسلمان دہشت گرد لوگوں کو کیمرے کے سامنے قتل کرتے ہیں اور اس بربریت کو ریکارڈ کر کے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے دشمنوں کو ذبح کر رہے ہوتے ہیں. خدا صرف انسان کی حمایت سے ہی دستبردار نہیں ہوا بلکہ مومنین کو اپنے دشمن قتل کرتے ہوئے دیکھ کر مزے بھی لیتا ہے کیونکہ وہ انہیں خود قتل کرنے سے قاصر ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اللہ کے دشمن کی صفت اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی. عائشہ نے موقعہ الجمل میں علی بن ابی طالب سے جنگ کرنے کے بعد جب مدینہ کا رخ کیا تو ام اوفی العبدیہ نامی خاتون اس کے پاس آئی اور کہا کہ

اے ام المومنین ایسی عورت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جس نے اپنے چھوٹے بچے کو قتل کر دیا ہوا؟ تو ام المومنین نے جواب دیا کہ اس پر آگ واجب ہو گئی! تو اس خاتون نے کہا تو آپ کا اس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے اپنے بیس ہزار بڑے بچوں کو ایک ساتھ قتل کر دیا؟ تو یہاں ام المومنین نے فرمایا کہ: اللہ کی دشمن کو پکڑ لو!!! (العقد الفرید) جو عورت اپنے بچے کو قتل کر دے اس پر جہنم کی آگ واجب ہو جاتی ہے مگر جس عورت نے جرات کر کے کہا کہ عائشہ نے علی کے خلاف اپنے موقف کی وجہ سے اپنے ہزاروں بیٹے مروا دیئے وہ صرف عائشہ کی نہیں بلکہ اللہ کی بھی دشمن ٹھہری کیونکہ عائشہ سے دشمنی مول لینا اللہ سے دشمنی مول لینے کے مترادف ہے!؟

جس طرح انسانوں کی حفاظت کی ذمہ داری خدا سے اس کی نااہلی کی وجہ سے چھین لی گئی اسی طرح خدا خود کوئی فیصلہ کرنے کے بھی قابل نہیں رہا اور یہ بھاری ذمہ داری بھی اسلامی دہشت گردوں کے سر آن پڑی، اس کی مثال عراق میں جیش الاسلام کا یہ بیان ہے جس میں کہا گیا ہے (ملزمان محمد ہارون حماد (سوڈانی شہری) اور ماہر عطایا (سوڈانی شہری) کے معاملے پر جیش الاسلام کی شرعی کمیٹی نے غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی توبہ سچی ہے لہذا انہیں چھوڑ دیا جائے۔ الشرق الاوسط 7 اپریل 2005) شرعی کمیٹی کے ارکان نے اللہ کی جگہ لیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں حضرات کی اللہ کے حضور توبہ سچی تھی چنانچہ خدا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس فیصلے کو قبول کرے، خدا نے مداخلت کر کے کسی کو یہ بتانے کی جرات نہیں کی کہ کیا وہ "توبہ نصوح" تھی بھی کہ نہیں.

عجیب بات یہ ہے کہ فقہاء کو اللہ کے باتوں کے خلاف جانے کا پورا حق ہے مثلاً قرآن میں ہے (اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوۡرٍ – اللہ تو مومنوں سے انکے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔ بیشک اللہ کسی خیانت کرنے والے ناشکرے کو دوست نہیں رکھتا۔ – الحج 38) آیت صاف صاف کہتی ہے کہ اللہ ہی دشمنوں سے مومنو کی حفاظت کرتا ہے مگر فقہاء کہتے ہیں مومنین کو اللہ کی حفاظت کرنی اور اس کے دشمنوں کو ذبح کرنا چاہیئے جس طرح الجزائر کے دہشت گرد مخالفین کو ذبح کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے دشمن ہیں یا جس طرح سوڈان میں اسلامیوں نے الوفاق اخبار کے چیف ایڈیٹر کو ذبح کر ڈالا حالانکہ اس کا تعلق اخوان المسلمین سے تھا مگر وہ اچانک اللہ کا دشمن بن گیا کیونکہ اس نے "المجہول فی کتاب الرسول" نامی کتاب کے کچھ حصے شائع کر دیے تھے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی دنیا میں اللہ کا دشمن بننا کس قدر آسان ہے.

اب جبکہ خدا کو اس کے تمام بنیادی کاموں سے فارغ کر دیا گیا حتی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے دشمنوں سے بچانے سے بھی عاجز ہو گیا، یوں اس کے سارے کلام کی حیثیت کسی مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں رہی اور اس کا کوئی حقیقی معنی یا مطلب باقی نہیں رہا، مثلا قرآن میں آتا ہے:

•(اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ–کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔–العنکبوت 45)

چودہ صدیاں پہلے قرآن کے نزول سے لے کر اب تک مسلمان مسلسل نماز پڑھے جا رہے ہیں، بلکہ نماز کو انہوں نے ایک نیا خدا بناڈالا ہے کیونکہ نماز نہ پڑھنے والا کافر اور واجب القتل ہے، امام احمد نے اپنے مسند میں نماز کیلئیے سات باب وقت کئیے اور بخاری نے محض رفع یدین پر پورا ایک باب لکھ مارا!! یوں نماز ہی نیا خدا اٹھرا جس کا بنیادی کام انسان کی حفاظت نہیں بلکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون کافر ہے جو نماز نہیں پڑھتا، یہ بات بھی یقینی ہے کہ نماز نے انہیں کسی قسم کی برائی یا منکر سے نہیں روکا کیونکہ آج کی اسلامی دنیا نے باقی ساری دنیا کی برائیوں کے ریکارڈ توڑ رکھے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ یہ فحشاء اور منکر انڈر گراونڈ کرتے ہیں اور کافر برسرِ عام.

کیا وہ خدا جسے اپنے دفاع کے قابل تک نہ چھوڑا گیا ہو کسی کو اپنے اوپر ایمان لانے یا اپنی عبادت کرنے پر قائل کر سکتا ہے جبکہ اسے یہ تک نہیں معلوم کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کیونکہ فقہاء نے اس سے یہ حق کب کا چھین لیا ہے اور اب وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے کیا پسند کرنا چاہیے اور کیا نہیں، ذیل میں کچھ مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے فیصلے کون کرتا ہے:

•ابن الجوزی کا فرمان ہے کہ (کافروں کو اللہ کی صفات کے حامل نام سے بلانے پر اللہ عزوجل کو غصہ آتا ہے–زاد المعاد ج 2 ص 197)

•بخاری کی حدیث میں ہے (اللہ کو چھینک پسند ہے اور انگڑائی سے نفرت ہے اگر تم میں سے کوئی چھینکے اور اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ سننے والے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسے کہے یرحمک اللہ–سابقہ منبع)

معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی ساری ذمہ داری انسان کی حفاظت کی بجائے فقہاء اور شیخوں کو مذہبی کور فراہم کرنا رہ گئی ہے تاکہ وہ اس کے نام پر لوگوں پر کنٹرول کریں اور اپنی جیبوں کو کرپٹ حاکموں کی دولت سے بھریں جسے یہ ملک کی دولت لوٹ کر حاصل کرتے ہیں، تو کیا خدا کے پاس ایسی کوئی ذمہ داری باقی رہی گئی ہے جسے وہ فقہاء کی مداخلت کے بغیر خود انجام دے سکے؟ اور کیا آج کے انسان کو ایسے خدا کی کوئی ضرورت ہے جو اپنے آپ کو دین کے تاجروں تک سے نہیں بچا سکتا کجا یہ کہ وہ انہیں قدرتی آفتوں سے بچائے گا؟

النضر بن الحارث – ایک جلیل القدر صحابی

نازی وزیر اطلاعات جوزف گوبلز Joseph Goebbels سے ایک مشہور قول منسوب ہے کہ "جب بھی میں لفظ مثقف سنتا ہوں تو اپنے پستول کو محسوس کرتا ہوں" اسی طرح ہمیں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ محمد جب بھی النضر بن الحارث کا نام سنتا ہوگا اپنی تلوار کو ضرور محسوس کرتا ہوگا کہ اقتدار کے اس پیاسے کے دل میں جو نفرت اس مثقف کیلئیے موجود تھی اس کی یقیناً کوئی حد نہیں رہی ہوگی کیونکہ النضر بن الحارث ایک ایسی سیسہ پلائی دیوار تھی جو محمدی فراڈ کو مکی مرحلے میں ہی ناکام بنانے کی قدرت رکھتی تھی چنانچہ جیسے ہی وہ اس کے ہاتھ لگا اس نے اس کا خون بہانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا.

النضر بن الحارث بن کلدہ قریش میں اپنے زمانے کا مثقف اور تعلیم یافتہ ترین شخص تھا، اس نے ملکِ روم وفارس اور نجران کی سیر کر رکھی تھی اور ان کے علوم، تاریخ اور قصے کہانیوں سے اچھی طرح فیضیاب ہو چکا تھا.. ابن ہشام اپنی سیرت میں لکھتا ہے کہ النضر بن الحارث حیرہ آیا اور فرس کے شاہوں، رستم اور اسبندیار کے قصے سنے، برطانوی مستشرق ڈیوڈ مار گولتھ David S. Margoliouth اپنی کتاب Mohammed and the Rise of Islam میں لکھتا ہے کہ اس نے یونان، فارس اور حیرہ کے عربوں کی کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ کیا تھا..

محمد بن حبیب بن امیہ بن عمرو البغدادی کی "المنمق من تاریخ قریش" میں درج ہے کہ وہ قریش کے زنادقہ میں سے تھا جس نے حیرہ کے نصاری سے زندقہ سیکھا تھا.. اس شخص کے حوالے سے ایسی خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف یہ شخص اپنے زمانے کے علوم سے اچھی طرح آگاہ تھا بلکہ اس نے پرانے قصے اور کہانیاں ان کے اصل مصادر سے حاصل کر رکھے تھے اور یوں اس نے محمد کے نبوت کے دعوے کو اس کے مکی دور میں ہی چیلنج کر دیا تھا..

دوسری طرف ڈیماگوگی محمد تھا جو کسی بھی طرح سیاسی طاقت حاصل کر کے مطلق اقتدار کا خواہش مند تھا اور عرب و عجم پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا.. محمد کے ان الفاظ پر غور کیجئیے جو اس نے اپنے چچا ابو طالب سے کہے تھے جب قریش کے سردار ابو طالب سے یہ کہنے آئے تھے کہ وہ اپنے بھتیجے کو لگام ڈال کر رکھے جیسا کہ ابن ہشام کی سیرت اور ابن سعد کی الطبقات الکبری اور دیگر میں آیا ہے: "اے چچا میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک لفظ کہیں اور عرب کے احسان مند اور عجم کی گردنوں کے مالک بن جائیں" اور وہ ایک لفظ جو محمد چاہتا تھا وہ تھا "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" یعنی اگر وہ اس کی چودھراہٹ کو تسلیم کر لیں اور اس کی نبوت پر ایمان لے آئیں تو وہ تمام جزیرہ عرب اور ممالکِ عجم کو ان کے زیرِ نگیں کر دے گا.. اگر ہم نبوت نامی کسی چیز کو مان بھی لیں تو بھی کیا یہ کسی نبی کا بیان ہو سکتا ہے؟ ایسی باتیں بس وہی کر سکتا ہے جس پر اقتدار کا بھوت سوار ہو...

دراصل برطانوی مستشرق مار گولتھ وہ پہلا شخص تھا جس نے محمد کو ایک ماہر سیاستدان قرار دیا جو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس کام کیلئیے کون سا شخص مناسب ہے اور مواقع سے فائدہ اٹھانا اور عربوں کی کمزوریاں بھی اچھی طرح جانتا ہے دوسری طرف وہ اسے نبی کی تمام تر صفات سے عاری قرار دیتا ہے خاص طور سے اخلاقیات کے باب میں.

ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد پہلے درجے کا ڈیماگوگی تھا، یہی ڈیماگوگی ہی دراصل اس کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھی، نبوت کا دعوی کر کے اور لوگوں کی نچلی خواہشات کو ابھار کر اس نے بڑے آرام سے ایک حکومت قائم کر لی کہ اگر لوگ اس کی بات مان جائیں تو جنت میں حوریں، غلام، دودھ، شہد اور شراب کی نہریں ان کی منتظر ہوں گی بصورت دیگر ایک ایسا خطرناک خدا ان کا منتظر ہو گا جو منکرین کا گوشت بھون بھون کر خوش ہو گا اور جب ان کی جلد جل کر خاکستر ہو جائے گی اسے نئی جلد سے تبدیل کر دیا جائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ تک کیلئیے چلتا رہے گا...اپنی نبوت کی تصدیق کیلئیے اس نے آیتیں اگلنا شروع کر دیں جس میں پرانے لوگوں کی خبریں اور قصے کہانیاں تھیں اور جاہلوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہا کہ یہ بکواس اس پر آسمان پر موجود ایک خدا کی طرف سے نازل ہو رہی ہے..ان افسانوں کا تعلق کچھ تو اسرائیلیات سے ہے، کچھ ملکِ فارس، روم، یمن اور عراق سے ہیں، تاہم یہ سارے قصے اس کے پاس گڈمڈ ہو کر پہنچے چنانچہ اس نے ان میں اپنے وسیع تصور کا استعمال کر کے اپنی طرف سے اضافے کئیے، کچھ کو نئے سرے سے ترتیب دیا، بعض کے کرداروں کا نام بدل دیا، کچھ کے زمانے بدل دیے اور کچھ کی شخصیات جیسے کنواری مریم کو ہارون کی بہن قرار دینا وغیرہ..

برطانوی مستشرق ایڈورڈ سیل اپنی کتاب HISTORICAL DEVELOPMENT OF THE QUR'AN میں لکھتا ہے کہ یثرب آنے تک محمد کو یہودیت اور عیسائیت کے درمیان فرق کا نہیں پتہ تھا، وہ سمجھتا تھا کہ دونوں کی تعلیمات یکساں ہیں، ایسی حالت میں ایک ایسا شخص جو ان کہانیوں کو اللہ کی وحی قرار دے کر لوگوں سناتا تھا اور ایک ایسے شخص میں جو ان قصے کہانیوں کی حقیقت جانتا تھا ٹکراؤ ہونا لازمی امر تھا جو اپنی قوم کو بتا رہا تھا کہ یہ سب محض سابقہ لوگوں کے قصے کہانیاں یعنی اساطیر الاولین ہیں.

محمد کے گلے میں کانٹا

مکہ میں محمد کی ناکامی اور وہاں سے ذلت آمیز فرار کی وجہ النضر بن الحارث ہی تھا جس نے اس کی خرافات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جن سے محمد مکیوں کو یہ کہہ کر کہ یہ اللہ کی وحی ہے بہکانا چاہتا تھا..وہ پہلا شخص تھا جس نے قریشیوں کو بتایا کہ محمد جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض پرانے قصے کہانیاں ہیں، محمد نے اس کی اس بات کا جواب ایک آیت سے دیا (اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ

الۡ اَوَّلِیۡنَ–جب اسکو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔–سورہ المطففین آیت 13)
ابن ہشام اپنی سیرت میں لکھتا ہے کہ "جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں بیٹھتے اور اللہ کا ذکر کرتے اور اپنی قوم کو سابقہ قوموں پر پڑنے والے اللہ کے عذاب سے متنبہ کرتے، اور جب چلے جاتے تو النضر بن الحارث اس کی مجلس میں پہنچ جاتا اور کہتا: میں اللہ کی قسم اے قریش کی قوم اس سے اچھی بات کہتا ہوں تو میرے پاس آ ؤ میں تمہیں اس کی باتوں سے بہتر باتیں سناؤں گا، پھر وہ انہیں فارس کے شاہوں اور رستم اور اسبندیار کے بارے میں بتاتا اور کہتا: کس چیز میں محمد مجھ سے اچھی باتیں سنا سکتا ہے؟"

برطانوی مستشرق ڈیوڈ مارگولتھ اوپر مذکور اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ النضر بن الحارث مکیوں سے کہتا تھا کہ اگر یہ کہانیاں جو محمد سناتا ہے نبوت کا معیار ہیں تو وہ بھی اس کی طرح نبوت کا دعوی کر سکتا ہے کیونکہ وہ اس سے اچھی کہانیاں سنا سکتا ہے..مارگولتھ کا خیال ہے کہ جب محمد مکیوں کے مطالبہ پر کوئی معجزہ دکھانے میں ناکام ہو گیا تو اس نے قرآن کو ہی معجزہ قرار دے دیا اور چیلنج کر دیا کہ وہ اس جیسی ایک سورت ہی لا کر دکھا دیں مگر وہ نہیں لا سکیں گے چاہے جنوں کی مدد ہی کیوں نہ لے لیں..یہاں النضر بن الحارث سامنے آیا:

One man, Al-Nadir Ibn Harith, accepted the challenge to produce anything as good, " and either versified or put into rhyme the tales of the Persian kings which Firdausi some four centuries later rendered immortal or perhaps those of the kings of Hirah. These " surahs " he read out at seances similar to those in which the Prophet pub lished the Koran. The effect of this criticism must have been very damaging ; for when the Prophet at the battle of Badr got the man into his power, he executed him at ".once, while he allowed the other prisoners to be ransomed

"ایک ہی شخص تھا جس نے یہ چیلنج قبول کیا اور اعلان کیا کہ وہ اس سے اچھا کلام لا سکتا ہے اور وہ تھا النضر بن الحارث، چاہے وہ فارس کے شاہوں کے قصے ہوں جنہیں فردوسی نے چار صدیوں بعد محفوظ کیا یا حیرہ کے شاہوں کے قصے، وہ سورتیں جو النضر بن الحارث مجالس میں پڑھا کرتا تھا قرآن کی سورتوں سے انتہائی مشابہ تھے، اس طرح کی تنقید کا اثر یقیناً تباہ کن تھا چنانچہ جیسے ہی غزوہ بدر میں النضر بن الحارث محمد کے ہاتھ لگا اس نے اسے فوراً ہی مار ڈالا جبکہ باقی قیدیوں کو اس نے فدیہ کے بدلے آزاد کر دیا تھا"

النضر بن الحارث کے اس چیلنج کو قبول کرنے پر ابن ہشام لکھتا ہے "اس نے ہی کہا تھا جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے: میں ایسا کلام نازل کروں گا جیسا کہ اللہ نے نازل کیا ہے".. محمد نے اس کا جواب ایک آیت سے دیا(وَاِذَا تُتۡ◌لٰی عَلَ◌یۡہِمۡ◌ اٰیٰتُنَا قَالُوۡ◌ا قَدۡ◌ سَمِعۡ◌نَا لَوۡ◌ نَشَآءُ لَقُلۡ◌نَا مِثۡ◌لَ ہٰذَاۤ ◌ۙ اِنۡ◌ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡ◌رُ الۡ◌اَوَّلِیۡ◌نَ–اور جب انکو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ تو کہتے ہیں یہ کلام ہم نے سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کا کلام ہم بھی کہدیں اور یہ ہے ہی کیا صرف اگلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔–سورہ الانفال آیت 31)اس آیت کی تفسیر میں قرطبی لکھتا ہے "یہ آیت النضر بن الحارث پر نازل ہوئی، وہ وہ تجارت میں حیرہ کی طرف گیا اور کلیلہ اور دمنہ، کسری اور قیصر کی حدیثیں خریدیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزرے لوگوں کی خبریں سنائیں نضر نے کہا: اگر میں چاہوں تو اس جیسا کہہ سکتا ہوں، اور یہ کمینگی اور جھوٹ تھا، اور کہا گیا: ان کو وہم ہو گیا تھا کہ وہ اس جیسا لا سکتے ہیں جیسا کہ موسی کے جادوگروں کو وہم ہو گیا تھا، پھر جب ایسا کرنا چاہا اور نہ کر سکے تو ہٹ دھرمی میں کہا: یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں" تفسیر البغوی میں درج ہے: "وَاِذَا تُتۡ◌لٰی عَلَ◌یۡہِمۡ◌ اٰیٰتُنَا قَالُوۡ◌ا یعنی النضر بن الحارث، قَدۡ◌ سَمِعۡ◌نَا لَوۡ◌ نَشَآءُ لَقُلۡ◌نَا مِثۡ◌لَ ہٰذَاۤ، وہ اس لیے کہ وہ تجارت کیلئیے فارس اور حیرہ جاتا تھا اور رستم اور اسبندیار اور عجم کی خبریں سنتا تھا اور یہود و نصاری کے پاس جاتا تھا اور انہیں تورات اور انجیل پڑھتے اور رکوع اور سجدے کرتے دیکھتا تھا، پھر جب وہ مکہ آیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اور قرآن پڑھتے دیکھا تو نضر نے کہا: قَدۡ◌ سَمِعۡ◌نَا لَوۡ◌ نَشَآءُ لَقُلۡ◌نَا مِثۡ◌لَ ہٰذَاۤ ◌ۙ اِنۡ◌ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡ◌رُ الۡ◌اَوَّلِیۡ◌نَ"

محمد کی دعوت، اس کے قرآن اور خرافات کیلئیے النضر بن الحارث کتنا بڑا خطرہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنی ہاشم کے یتیم نے النضر بن الحارث کے جواب میں آٹھ آیات مختص کیں جیسا کہ ابن ہشام کی سیرت میں آیا ہے، افسوسناک امر یہ ہے کہ جو بھی نثر و شعر النضر بن الحارث نے محمد کے مقابلے میں لکھا وہ سب ضائع کر دیا گیا، جس طرح محمد کی ہجو میں کی جانے والی ساری شاعری ضائع کر دی گئی جو مختلف شاعروں نے اس زمانے میں کی تھی، اس شاعری میں مسلمان ہونے سے پہلے حسان بن ثابت کی شاعری بھی شامل ہے.. کیونکہ جو ایسے شعر پڑھتا یا انہیں لکھ کر رکھتا اس کا انجام موت ہوتا.

اس طرح عربی اسلامی تاریخ میں صرف وہ اشعار اور قصے کہانیاں ہی باقی رہ گئے جن میں صرف اور صرف محمد کی تعریف ہے اور اس سے ایسے ایسے معجزے منسوب کیے گئے ہیں جو اگر وہ واقعی کر گزرتا تو اسے اپنے جھوٹے پیغام کو پھیلانے میں کچھ محنت نہ کرنا پڑتی، اور اس طرح تاریخ کی سب سے بڑی جعلسازی عمل میں لائی گئی اور جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ تاریخ ہمیشہ فتح پانے والا ہی لکھتا ہے اور محمد بزور تلوار فتح پا چکا تھا.

محمد کا امتحان

مکیوں نے جو امتحان محمد کیلئے وضع کیا وہ مکی دور کے محمدی دعوت کی حد فاصل ہے جس میں ایک معمولی سے امتحان کے ذریعے محمد کو اپنی نبوت ثابت کرنے کا بھرپور موقع ملا، ابن ہشام کہتا ہے کہ قریشیوں نے النضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یثرب کے یہود کی طرف بھیجا کیونکہ وہ اہلِ کتاب تھے اور انہیں انبیاء کا علم تھا تاکہ ان سے محمد کے بارے میں پوچھا جائے، یہودیوں نے النضر بن الحارث کو تجویز دی کہ وہ محمد سے تین سوال کرے اگر وہ جواب دے دے تو وہ نبی ہے ورنہ وہ جھوٹا ہے...

پہلا سوال "ان نوجوانوں کے بارے میں تھا جو پہلے زمانے میں گئے ان کے ساتھ کیا ہوا ان کا ایک عجیب واقعہ ہے (اہلِ کہف)" دوسرا سوال "ایک آدمی جس نے مشرق اور مغرب کا طواف کیا اس کی کیا خبر ہے اور وہ کون ہے (ذوالقرنین)" اور تیسرا اور آخری سوال تھا کہ "روح کیا ہے".

اور جیسا کہ ابن ہشام کہتا ہے کہ النضر اور عقبہ نے مکہ واپس آکر قریش سے کہا کہ "اے قریش ہم تمہارے اور محمد کے معاملے پر فیصلہ کن بات لائے ہیں" مگر برطانوی مستشرق مارگولتھ کہتا ہے کہ اسے یقین ہے کہ ان سوالوں کی تجویز یہودیوں نے نہیں دی تھی کیونکہ پہلے سوال کا تعلق سات سونے والوں (اہلِ کہف) سے متعلق ہے جبکہ دوسرے سوال کا تعلق عظیم سکندر Alexander the Great سے ہے، مارگولتھ کو یقین ہے کہ یہ سوال النضر بن الحارث نے ہی ترتیب دیے تھے اور اس کیلئے اسے یہودیوں کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اسے تورات، انجیل، فارس اور روم کے قصوں کا پہلے سے ہی اچھی طرح علم تھا اس کے علاوہ وہ شاعر اور نثر نگار بھی تھا؟ کچھ بھی ہو یہ سوالات محمد کیلئے تباہ کن تھے جس نے جوابات کیلئے مکیوں سے اگلے دن کی مہلت طلب کرلی...!!

اگلا دن آیا اور گزر گیا مگر محمد نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا... دن گزرتے رہے اور محمد اپنی عاجزی سے نہیں نکل پایا.. اور جیسا کہ سیرت کی کتابیں کہتی ہیں لوگوں محمد کی اس عاجزی پر سخت افسوس ہوا اور انہیں یقین ہو چلا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور کوئی اسے سکھا پڑھا رہا ہے السیرہ الحلبیہ میں ہے کہ اس وقت لوگوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ یہ سکھانے والا دراصل یمامہ کا "الرحمن" نامی ایک یہودی ہے..

پندرہ دن بعد جو اس کی مدد کرنے والوں سے رابطے کیلئے کافی تھے محمد کچھ آیات لے کر نمودار ہوا جن میں ان سوالوں کے جوابات تھے، ان جوابات پر نظر ڈالنے سے پہلے ذرا اس بے وجہ تاخیر کے بہانوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں جو انتہائی درجے کے احمقانہ بہانے ہیں.. پہلا بہانہ یہ تھا کہ اس نے جب مکیوں سے اگلے دن جواب دینے کا وعدہ کیا تو "ان شاء اللہ" نہیں کہا.. یہ

بہانہ سورہ کہف کی آیت نمبر 23 میں آیا ہے کہ (وَلَاتَقُو لَنَّ لِشَایٔ اِنِّی فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا– اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کر دوں گا۔)

دوسرا بہانہ ابوہریرہ کی ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جبریل نے ان دنوں نہ آنے کی یہ وجہ بتائی کہ اس کے گھر میں حسن و حسین کا ایک کتا تھا اور جس گھر میں کتے ہوں وہاں فرشتے نہیں آتے..!؟

جہاں تک جوابات کا تعلق ہے تو وہ محمد کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت تھے.. اہلِ کہف سے متعلق سوال پر مارگلوتھ لکھتا ہے کہ محمد نے ان کی تعداد کا کوئی تعین نہیں کیا... اور واقعی ایسا ہی ہے، آیت دیکھیے جو اللہ نے جواب کے طور پر بھیجی ہے:

(سَیَقُو لُو نَ ثَلٰثَۃٌ رَّابِعُهُم کَل بُهُم وَیَقُو لُو نَ خَم سَۃٌ سَادِسُهُم کَل بُهُم رَج مًا بِال غَی بِ وَ یَقُو لُو نَ سَب عَۃٌ وَّثَامِنُهُم کَل بُهُم قُل رَّبِّی اَع لَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا یَع لَمُهُم اِلَّا قَلِی لٌ فَلَا تُمَارِ فِی هِم اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَس تَف تِ فِی هِم مِّن هُم اَحَدًا– بعض لوگ اٹکل پچو کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا اور بعض کہیں گے کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہدو کہ میرا پروردگار ہی انکے شمار سے خوب واقف ہے انکو جانتے بھی ہیں تو تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں تو تم انکے معاملے میں بحث نہ کرنا مگر سرسری سی بحث۔ اور نہ انکے بارے میں ان میں سے کسی سے کچھ دریافت ہی کرنا۔–سورہ الکہف آیت 22)

یعنی محمد کے خدا کو ان کی صحیح تعداد نہیں معلوم کہ کیا وہ تین ہیں، پانچ ہیں یا سات... لیجیے محمد کنفیوز ہے اسے ان کی صحیح تعداد کا پتہ ہی نہیں.. مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اسی آیت میں اللہ محمد سے کہتا ہے کہ (کہدو کہ میرا پروردگار ہی انکے شمار سے خوب واقف ہے) اگر اللہ کو ان کی تعداد معلوم ہے تو بات کو گھمانے پھرانے کی بجائے انہیں ان کی صحیح تعداد کیوں نہیں بتا دیتا؟ یہ ساری جہالت کیوں؟ شاید تین، شاید پانچ.. شاید سات.. اس کا مطلب ہے کہ پندرہ دن بعد بھی محمد کوئی فیصلہ کن جواب نہیں لا پایا اور جس نے اسے یہ جواب دینے میں مدد دی اسے بھی دراصل غیر یقینی معلومات تھیں...

محمد کی بد قسمتی کہ وہ یہ جانے بغیر ہی مر گیا کہ اہلِ کہف کا قصہ دراصل ایک افسانوی قصہ ہے جسے بیزنطہ Byzantium (حالیہ اسطنبول) کے ایک پادری نے چھٹی صدی عیسوی میں تعلیمی مقاصد کیلئیے گھڑا تھا جو یورپ میں کافی مقبول رہا اور تاجروں کے ساتھ مشرق تک پہنچا..! مگر محمد نے اسے ایسے پیش کیا جیسے یہ واقعتاً ایک حقیقی قصہ تھا..

اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف جس کا جواب پہلے سوال کے جواب سے بھی زیادہ دھندلا اور فضول ہے، محمد کی آیت کہتی ہے:

(وَیَس۔ لُونَکَ عَن ذِی القَرنَینِ قُل سَاتلُوا عَلَیکُم مِّنہُ ذِکرًا ﴿۸۳﴾ اِنَّا مَکَّنَّا لَہٗ فِی الاَرضِ وَاٰتَینٰہُ مِن کُلِّ شَیءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ فَاَتبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغرِبَ الشَّمسِ وَجَدَہَا تَغرُبُ فِی عَینٍ حَمِئَۃٍ وَّوَجَدَ عِندَہَا قَومًا قُلنَا یٰذَا القَرنَینِ اِمَّا اَن تُعَذِّبَ وَاِمَّا اَن تَتَّخِذَ فِیہِم حُسنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوفَ نُعَذِّبُہٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّہٖ فَیُعَذِّبُہٗ عَذَابًا نُّکرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا مَن اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَہٗ جَزَآءَ الحُسنٰی وَسَنَقُولُ لَہٗ مِن اَمرِنَا یُسرًا ﴿۸۸﴾—اور تم سے ذوالقرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہدو کہ میں اسکا کسی قدر حال تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ ہم نے اسکو زمین میں بڑا اقتدار دیا تھا اور ہر طرح کا سامان اسکو عطا کیا تھا۔ تو اس نے سفر کا ایک سامان کیا۔ یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو اسے ایسا پایا کہ ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا ہے اور اس چشمے کے پاس ایک قوم دیکھی۔ ہم نے کہا ذوالقرنین! تم انکو خواہ تکلیف دو خواہ انکے بارے میں بھلائی اختیار کرو دونوں باتوں کی تمکو قدرت ہے۔ ذوالقرنین نے کہا کہ جو کفر و بدکرداری سے ظلم کرے گا اسے ہم سزا دیں گے پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائے گا۔ تو وہ بھی اسے بڑا عذاب دے گا۔ اور جو ایمان لائے گا اور عمل نیک کرے گا اسکے لئے بہت اچھا بدلہ ہے۔ اور ہم اپنے معاملے میں اس سے نرم بات کہیں گے۔ -سورہ کہف)

یہاں بھی محمد افسانے کے کردار کا حقیقی نام پیش کرنے میں ناکام رہا اور اپنے صحابیوں، سیرت دانوں اور مفسرین کو ایک نا ختم ہونے والے مخمصے میں ڈال گیا..

ابن اسحق کہتا ہے کہ "ذاالقرنین اہل مصر میں سے تھا، اس کا نام مرزیان بن مرذبہ الیونانی ولد یونان بن یافث بن نوح تھا" ابن ہشام نے لکھا: "اس کا نام الاسکندر تھا اسی نے الاسکندریہ شہر بنایا تھا اور اسی سے منسوب ہوا" اس کے علاوہ ابن ہشام اپنی سیرت میں لکھتا ہے کہ جب علی بن ابی طالب سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "وہ اللہ کا ایک نصیحت کرنے والا بندہ تھا اس نے اپنی قوم کو اللہ کی دعوت دی تو انہوں نے اسے اس کے سینگ پر مارا اور وہ مر گیا تو اللہ نے اسے دوبارہ زندہ کیا اور اس نے اپنی قوم کو دوبارہ دعوت دی تو انہوں نے اس کے سینگ پر مارا اور وہ مر گیا تو اس کا نام ذاالقرنین پڑ گیا"...

الخطط المقریزیہ میں توذوالقرنین پورانسب درج ہے "الصعب بن ذی مرائد بن الحارث الرائش بن الہال ذی سدد بن عاد ذی منح بن عار الملطاط بن سکسک بن وائل بن حمیر بن سبابن یشجب بن یعرب بن قحطان بن ھود علیہ السلام بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام اوروہ حمیر کاشاہوں میں سے ایک یمن کاایک بادشاہ تھااوروہ عرب عاربہ ہیں"

کیایہ سارے متضادبیانات اس بات کاثبوت نہیں کہ محمد کی آیت سے کسی کوکوئی فائدہ نہیں پہنچااوریہ سائلین کوکوئی جواب نہیں دے پائی حتیٰ کہ اس کے داماد سے بھی جب پوچھا گیاتواس نے بھی ایسی کہانی سنادی جو عقل اور منطق سے بالکل منافی تھی..

رہاتیسرا سوال تواس سے محمد کے خدانے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کہاکہ "وَیَس۔ لُونَکَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِن اَمرِرَبِّی۔ اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہدو کہ وہ میرے پروردگار کاایک حکم ہے".. یہ محمد ہی تھاناجس نے یہ دعوی کیاتھاکہ اس کے خدانے کہاہے کہ:(قُل لَّوکَانَ البَحرُمِدَادًالِّکَلِمٰتِ رَبِّی لَنَفِدَ البَحرُقَبلَ اَن تَنفَدَکَلِمٰتُ رَبِّی وَلَوجِئنَابِمِثلِہٖ مَدَدًا۔ کہدوکہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے روشنائی ہوتو قبل اسکے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہوجائے اگرچہ ہم ویساہی اور اسکی مدد کولائیں۔ سورہ الکہف آیت 109) توپھر یہ خداجس کے الفاظ کبھی ختم ہی نہیں ہوتے ان میں سے کچھ الفاظ استعمال کرکے لوگوں کوروح کی حقیقت کے بارے میں نہیں بتاسکتاتھا؟ حیرت انگیز بات ہے..!

اوریوں محمد اس امتحان میں بری طرح ناکام رہا.. وعدہ خلافی کرکے اورپندرہ دن تک غائب رہنے کے بعد بھی وہ ان کے سوالوں کا کوئی حتمی جواب نہیں لاسکا، ناہی وہ اہلِ کہف کی حقیقی تعداد بتاسکااورناہی ذوالقرنین کی شخصیت متعین کرسکااورناہی یہ بتاسکاکہ روح کیاہوتی ہے.. کیاایسے بھونڈے جوابات جن سے خوداس کے صحابہ پریشانی کاشکار ہوگئے قریشیوں اورخاص کر النضر بن الحارث جیسے فلاسفر شخص کو قائل کرسکتے تھے؟ یہی وجہ تھی کہ مکیوں کومحمد کی جھوٹی نبوت کایقین ہوگیا.. اس صورت میں اس کا یثرب بھاگ جاناکوئی تعجب خیز امر نہیں جہاں جاکر اس نے ایک لٹیرے کاروپ دھارلیااور قافلوں کی لوٹ مار پر گزاراکرنے لگا اوراپنے دین کولوگوں کی گردن پر تلواررکھ کر منواناشروع کردیا..

فلاسفر قاتل کے قبضے میں

غزوہ بدر میں جس کی چنگاری شام سے آتے ابی سفیان کے قافلہ پر محمد کے حملے سے بھڑکی، النضر بن الحارث دیگر ستر مکیوں کے ساتھ قید کر لیا گیا.. محمد نے دیگر قیدیوں کو فدیہ کے بدلے آزاد کرنے کا حکم دیا جبکہ غریب قیدیوں کا فدیہ اس کے دس صحابیوں کو لکھنا سکھانا طے پایا (کیونکہ جاہل ہی اس کے جھوٹ کے قائل ہو سکے تھے) مگر اس ڈیل سے النضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مستثنی قرار دیا اور انہیں قتل کرنے کا حکم دیا.. السیرہ الحلبیہ میں لکھا ہے کہ قید ہو جانے کے بعد النضر بن الحارث نے اپنے ساتھی قیدی کو کہا کہ: "محمد مجھے مارنے والا ہے کیونکہ اس نے مجھے موت بھری نظروں سے دیکھا ہے" اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محمد کے دل میں النضر کیلئیے کتنی نفرت اور کراہیت دفن تھی.. جب اس نے علی بن ابی طالب کو النضر بن الحارث کو قتل کرنے کا حکم دیا تو المقداد نے اس سے کہا کہ "النضر میرا قیدی ہے" کیونکہ اسی نے النضر کو قید کیا تھا مگر اسے قتل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا مگر محمد نے اسے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا کہ "یہ اللہ کی کتاب پر وہ کہتا تھا جو کہتا تھا.."

اور اس طرح "رحمت کے نبی" نے اپنی زہریلی نفرت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور النضر بن الحارث کو قتل کر دیا کیونکہ وہ مکہ میں اپنی ناکامی پر النضر کے کردار کو نہیں بھولا تھا جس نے اس کی خرافات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور نا ہی وہ امتحان بھولا تھا جس میں اسے ساری دنیا کے سامنے ذلت اٹھانی پڑی تھی.. النضر بن الحارث کے قتل کا دن تلوار اور جہالت کا عقل و معرفت پر فتح کا دن تھا اور اسلام کی جاہلیت کی کامیابی کا آغاز تھا.. یہ تلوار آج بھی چودہ سو سال سے ہر اس شخص کی گردن پر لٹکتی رہتی ہے جو آزادی سے اور عقل کو راہنما بنا کر سوچنا چاہتا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ "یہ سب پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں"... محمد کا زمانہ یورپ میں گھڑ سوار تلوار بازوں کا زمانہ تھا ان تلوار بازوں کی اخلاقیات کا حصہ تھا کہ اگر ان کا دشمن ان کے قبضے میں آ جائے تو وہ اسے قتل نہیں کرتے تھے.. محمد کی اخلاقیات اس زمانے کے تلوار بازوں سے تو کیا نیلسن منڈیلا جیسے آج کے ہیروز کے برابر بھی نہیں ہیں جس نے نصف صدی تک اسے قید میں رکھنے والے جلادوں کو اقتدار میں آنے کے بعد معاف کر دیا...

ایک خود ساختہ جھوٹا نبی جو عام لوگوں کی اخلاقیات تو درکنار ممکنہ انبیاء کی اخلاقیات تک پر پورا نہیں اتر سکا اگر واقعی انبیاء ہیں!

اسلام اور بچوں کا قتل

بچوں سے محبت اور ان کا خیال رکھنا انسانی و حیوانی جبلت میں شامل ہے اور یہ جبلت نوع حیوان و انسان کی بقاء کیلئیے ضروری بھی ہے، ماں چاہے جانور کی ہو یا انسان کی اپنے بچوں کیلئیے اپنی جان کی قربانی تک دینے سے گریز نہیں کرتی، قدیم زمانوں کا انسان جب اپنے بتوں کی عبادت گاہوں میں خون کی قربانی دیتا تھا اور لڑکیوں کو سمندر برد کر دیتا تھا تو تب بھی وہ ہمیشہ بالغ نوجوان یا لڑکی کی قربانی دیا کرتا تھا، تاریخ سے ایسا کوئی واقعہ ثابت نہیں ہوتا جس میں انسان نے بچوں کی قربانی دی ہو یا انہیں ذبح کیا ہو،

زمانہ قدیم کے عرب کہا کرتے تھے کہ "اطفالنا اکبادنا تمشی علی الارض "یعنی ہمارے بچے ہمارے کلیجے ہیں جو زمین پر چلتے ہیں، یونانیوں نے تو کیوپڈ Cupid نامی بچے کو محبت کا دیوتا تک بناڈالا جو مردوں اور عورتوں کے دلوں میں اپنے تیر مار کر ان میں محبت جگاتا تھا غرض کہ تمام انسانی تاریخ میں بچے اپنے خاندان کی خصوصی عنایت و توجہ کا مرکز رہے اور جب جدید معاشرے تشکیل ہوئے تو بچوں کے قتل، جنسی زیادتی، مار اور بے گار لینے کے خلاف قوانین وضع کیے گئے اور ان کیلئیے تعلیم اور صحت کے قوانین رائج کیے گئے.

آسمانی مذاہب کی آمد کے ساتھ جس کا آغاز ابراہیم نامی نبی سے ہوتا ہے بچوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، ابراہیم کے خدا نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے اسحٰق کو ذبح کر دے اور ابراہیم نے بلا چوں وچرا اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی تیاری پکڑلی اور اسے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور ہاتھ پاوٴں باندھ دیے یعنی "وتلہ للجبین" جیسا کہ قرآن کہتا ہے تاہم ذبح کرنے کے آخری لمحے میں ابراہیم کا خدا اچانک بچے کو آسمان سے اتاری ہوئی ایک بھیڑ سے بدل دیتا ہے، یقیناً بچہ دہشت زدہ ہو گیا ہو گا جب اسے پتہ چلا ہو گا کہ اس کا باپ اسے ذبح کرنے والا ہے، بچوں کو ذبح کرنے کا یہ پہلا تاریخی ریکارڈ ہے جو مذاہب کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، پھر "یہوہ" نامی خدا کی طرف سے موسی آیا اور بنی اسرائیل کو سکھایا کہ بچوں کو کیسے ذبح کیا جاتا ہے چنانچہ صموئیل کے پہلے سفر میں کہا "انہیں معاف نہ کرنا بلکہ قتل کر دینا ہر مرد و زن کو، بچوں کو اور شیر خواروں کو، گائے کو اور بکریوں کو اونٹوں کو اور گدھوں کو" (اصحاح 15 آیت 3) صرف اسی پر ہی بس نہیں بلکہ بچوں پر اپنی بے رحمی ثابت کرنے کیلئیے یہ خدا مزید کہتا ہے "انہیں سجدہ مت کرنا اور نا ہی ان کی عبادت کرنا کیونکہ میں ہی تمہارا رب خدا ہوں جو بڑوں کے گناہ ان کے بچوں کی تیسری اور چوتھی نسل میں دیکھتا ہوں جو مجھ سے بغض رکھتے ہیں" (اصحاح 20 آیت 5) اس خدا کی غیرت کے کیا ہی کہنے جو اپنے سے بغض رکھنے والوں کے بچوں کی چوتھی نسل تک سے بدلہ لینے پر آمادہ ہے ایسی بے رحمی تو ظالم ترین مجرموں تک میں نہیں ہوتی.

پھر اسلام آیا اور بچوں کو فتنہ قرار دے دیا جن سے ہر مسلمان کو بچنا چاہیے تاکہ وہ راہِ راست سے نہ بھٹک جائیں اور عذابِ الہی ان کا مقدر بن جائے (وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ) (الانفال 28) اسی قرآن میں جب موسی خضر کے ساتھ مٹر گشت کر رہے تھے تو ایک گاوٴں سے ان کا گزر ہوا جس میں کچھ بچے راستے میں کھیل رہے تھے، خضر نے ان میں سے ایک بچے کو پکڑ کر بڑی بے رحمی سے ذبح کر ڈالا اور جب موسی نے اس سے اس بے سبب قتل کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ (وَاَمَّا الۡغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤۡمِنَيۡنِ فَخَشِيۡنَاۤ اَنۡ يُّرۡهِقَهُمَا طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا‌ۚ‏ فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيۡرًا مِّنۡهُ زَكٰوةً وَّاَقۡرَبَ رُحۡمًا) (الكهف 80-81).

اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے ایک معصوم بچے کو خضر نے کیوں قتل کر دیا؟ اس آیت کی تفسیر میں قرطبی کہتا ہے (کہا جاتا ہے کہ یہ خضر علیہ السلام کا کلام ہے اور کلام کا سیاق اس بات کا گواہ ہے یعنی ہمیں خدشہ تھا کہ وہ انہیں اپنے ظلم و کفر سے تھکا نہ دے اور اس ضمن میں اللہ نے انہیں اپنے اجتہاد سے نفوس کو قتل کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، اور کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس کی خضر نے نمائندگی کی ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی محبت میں بہک کر اس کے دین میں داخل نہ ہو جائیں، ابن جریج سے مروی ہے کہ بچے کی ماں ایک مسلمان بچے سے حاملہ تھی اور مقتول بچہ کافر تھا) چاہے یہ کلام خضر کا ہو یا اللہ کا حقیقت یہ ہے کہ خضر نے ایک بے قصور بچے کو جس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا قتل کر دیا محض اس خدشے کی بنیاد پر کہ وہ بڑا ہو کر اپنے والدین کیلئیے فتنہ نہ بن جائے اور وہ اپنا دین نہ بدل لیں جو کہ قرآن ہمیں نہیں بتاتا، یعنی مستقبل کے خدشات کی بنیاد پر بچوں کو قتل کرنا اللہ کے ہاں جائز ہے جس نے خضر کو نفوس کو اپنے ذاتی اجتہاد کی بنیاد پر قتل کرنے کی اجازت دے رکھی تھی جبکہ انسانی انصاف یہ کہتا ہے کہ ملزم تب تک بے گناہ ہے جب تک کہ اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے ایسے میں خدا کے اس انصاف پر کیا کہا جائے؟ ایک منصف خدا کسی نبی کو ایک معصوم بچے کو مستقبل کے شبہ پر قتل کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ افسوسناک امر یہ ہے کہ مفسرین جنہوں نے اس بے گناہ بچے کے قتل کو مستحسن قرار دیا اسے کافر بنا ڈالا اور اس کے بھائی کو جو ابھی اس کی ماں کے پیٹ میں تھا مسلمان بنا دیا جس کا مطلب ہے کہ اللہ نے اس کے والدین کو اس کے بدلے میں ایک مسلمان بچہ عطا کر دیا جو مقتول بچے سے بہتر تھا کیونکہ وہ کافر تھا.. یہ کون سی منطق ہے جو بچوں کو مسلمان اور کافر میں تقسیم کرتی ہے جبکہ دنیا کے تمام قوانین نابالغ بچوں کے کسی بھی فیصلے کی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالتے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائیں؟ اسلامی فقہ میں بھی اگر کوئی مسلمان بچہ مرتد ہو جائے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جا سکتی لیکن یہی وہ منطق ہے جسے بنیاد بنا کر انہوں نے بنی قریظہ کے بچوں کو تلاش کر کر کے قتل کیا، تعجب خیز بات یہ ہے کہ اسلام کے فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام لوگوں کی حقیقی فطرت اسلام ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے (ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے جب تک کہ اس کی زبان اس کی نمائندگی نہ کرے اس کے والدین اسے یہودی نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں) (الجامع الصغیر للسیوطی ج 5 حدیث نمبر 6356) تو اگر بچے کی فطرت اسلام ہے جب تک کہ اس کے والدین اس کا مذہب نہ بدل دیں تو یہ بچہ جسے خضر نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا کافر کیسے ہو گیا جبکہ اس کے والدین مسلمان تھے؟

اسلام میں بچوں کا قتل فقہائے اسلام کے ہاں مشہور وہ معروف معاملہ ہے جس کیلئیے وہ رب الغلام والی حدیث پر تکیہ کرتے ہیں جو یہ ہے:

(ریاض الصالحین، صفحہ 71 حدیث نمبر 30 باب الصبر)

فقہائے اسلام نے اس بوگس حدیث پر استدلال کرتے ہوئے بے گناہوں میں کسی مسلمان کا اپنے آپ کو قتل کرنا جائز قرار دیا اگر اس میں مسلمانوں کیلئیے کوئی بھلائی ہو، اس بچے کا قصہ بیان کرنے کے بعد ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ: (اس میں بچے نے دین کے ظہور کی مصلحت کے پیش نظر اپنے آپ کو قتل کروادیا اس لیے ائمہ اربعہ نے یہ پسند کیا ہے کہ مسلمان کفار کی صفوں میں گھل مل جائے چاہے اس میں اس کی جان کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو اگر اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو) (مجموع الفتاوی 28/540).

پاکستانی بچے رفیق اللہ کا قصہ مشہور ہے جسے قتل وتباہی کے مولویوں نے امریکی فوجیوں کے درمیان اپنے آپ کو اڑانے کیلئیے افغانستان بھیجا، یہ بچہ پاکستان کے دینی مدارس میں پڑھتا تھا جب اسے ان ظالموں نے بموں سے باندھ کر اس مقدس دینی مہم کیلئیے افغانستان بھیج دیا مگر اس کی خوش قسمتی کہ اسے افغانی پولیس نے پکڑ لیا، صدر کرزئی کے معاف کرنے پر بچے نے اپنے بچ جانے پر خوشی کا اظہار کیا.

ایران میں دو ہزار سے زائد لوگوں نے عراق میں خودکش حملے کیلئیے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا جن میں 25 فی صد رضاکاروں کی عمر 18 سال سے کم تھی جبکہ سب سے چھوٹے خودکش حملہ آور کی عمر محض 7 سال تھی!! (ایلاف 5 جون 2004) عراق میں بچوں کا قتل تو ایک عام سی بات ہے جس کے لوگ عادی ہوچکے ہیں، بصرہ میں 68 بچے اس وقت موت کے گھاٹ اتار دیے گئے جب وہ سکول جارہے تھے جبکہ بغداد میں 18 بچے ایک کار بم دھماکے میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، عراق کے بچوں کے قتل عام کی یہ صرف چند مثالیں ہیں.

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں بچوں کا اس طرح بہیمانہ قتل کیوں رائج ہے؟ وجہ یقیناً وہ مقدس مُتون ہیں جو اسلام کے یہ شیخ پاکستان اور وہابیوں کے دیگر گڑھوں میں اپنے دینی مدارس میں بچوں کو پڑھاتے ہیں اور جب یہ بچے بڑے ہوتے ہیں تو اگر اپنے آپ کو کسی خودکش حملے کی نذر نا بھی کریں تو بھی ان میں اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، محمد عطا اور اسلامی غزوات کے دیگر ہیرو برآمد ہوتے ہیں، اس چیز کی ذمہ دار مقدس تحریریں ہمیں قرآن میں بھی ملتی ہیں جب نوح اپنے خدا سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کافروں کو ہلاک کردے کیونکہ یہ صرف برے اور کافر بچے پیدا کرتے ہیں، نبی اسلام کی احادیث میں بھی وہ یہ یقین دلاتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ مشرکین کے بچے اپنے والدین کے ساتھ جہنم میں جائیں گے، مسند ابی داود میں ہے: (ابو عقیل نے ابی المتوکل الناجی اور اس نے بہیہ سے روایت کیا کہ بہیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے بچوں کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہوں گے؟ کہا: جنت میں، پھر اس نے مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا کہ روز قیامت وہ کہاں ہوں گے؟ کہا آگ میں تو اس نے کہا کہ وہ اعمال تک نہیں پہنچے اور ان پر قلم نہیں چلائے گئے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے والے تھے قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم چاہو تو آگ میں تمہیں ان کی چیخیں سنوا دوں!!

تہذیب سنن ابی داود لابن القیم–باب فی ذراری المشرکین) ابی عقیل کی وجہ سے کچھ اہل حدیث اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں تاہم پھر بھی زیادہ تر شیخ و مولوی اسے اپنے شاگردوں کو سناتے اور پڑھاتے ہیں، ابن ہشام روایت کرتے ہیں کہ بدر کے بعد جب نبی نے عقبہ بن معیط کو قتل کرنے کا حکم دیا تو عقبہ نے اس سے پوچھا: اے محمد بچوں کیلیئے کون ہے؟ تو نبی اسلام نے کہا: آگ–سیرہ ابن ہشام تیسرا حصہ ص 194). جو مذہب والدین کے گناہوں کی سزا ان کے بچوں کو دے اور انہیں جہنم بردکر کے سخت ترین عذاب کی نوید سنائے اور انبیاء کو بچوں کو مستقبل کے خطرات کے پیش نظر قتل کرنے کی اجازت دے ایسا مذہب ناتو بچوں کی معصومیت کی پرواہ کرتا ہے اور ناہی اسے کوئی اہمیت دیتا ہے، کتنا گھٹیا ہے وہ مذہب اور کتنا سنگ دل ہے وہ خدا جو بچوں کی گردن پر چھری پھیر کر اپنی ظالمانہ خواہشات کی تسکین کرتا ہے.

جبریل – مسیحائی پیغمبر

قرآن کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے والا واضح طور پر یہ نوٹ کرتا ہے کہ جب بھی حضرت محمد ﷺ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اچانک جبریل آکر اُن کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں جو ہمیشہ اُنکی منشا کے عین مطابق ہوتا ہے، مثلاً جب صحابہ کرام نے حرام مہینوں میں قریش کے ایک قافلہ پر حملہ کر کے مالِ غنیمت حاصل کیا اور حرام مہینوں کی وجہ سے سوالات اٹھے تو اچانک جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور انہیں خدا کی طرف سے بشارت دی کہ وہ اُن کے صحابہ کے اس فعل پر راضی ہے چنانچہ نبی پر کوئی حرج نہیں کہ وہ لوٹ مار کے مالِ غنیمت سے اپنا حصہ وصول کر لیں (ظاہر ہے اسکے بغیر بحیثیتِ انسان انکی گزر بسر کیسے ہو گی؟)۔

(یَس◌ـ ◌ لُو◌نَکَ عَنِ الشَّہ◌رِال◌حَرَامِ قِتَالٍ فِی◌ہِ◌ قُل◌قِتَالٌ فِی◌ہِ کَبِی◌رٌ◌ وَصَدٌّ عَن◌سَبِی◌لِ اللّٰہِ وَ کُفرٌ◌ بِہٖ وَال◌مَس◌جِدِال◌حَرَامِ☆ وَاِخ◌رَاجُ اَہ◌لِہٖ مِن◌ہُ اَک◌بَرُعِن◌دَاللّٰہِ◌ وَال◌فِت◌نَۃُ اَک◌بَرُ مِنَ ال◌قَت◌لِ◌ وَلَایَزَالُو◌نَ یُقَاتِلُو◌نَکُم◌حَتّٰی یَرُدُّو◌کُم◌عَن◌دِی◌نِکُم◌اِنِ اس◌تَطَاعُو◌ا◌ وَمَن◌ یَّر◌تَدِد◌مِن◌کُم◌عَن◌دِی◌نِہٖ فَیَمُت◌وَہُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَت◌اَع◌مَالُہُم◌فِی الدُّن◌یَا وَال◌اٰخِرَۃِ◌ وَاُولٰٓئِکَ اَص◌حٰبُ النَّارِ◌ ہُم◌فِی◌ہَاخٰلِدُو◌نَ–اے پیغمبر لوگ تم سے عزّت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں جانے سے بند کرنا اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا جو یہ کفار کرتے ہیں اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ گناہ ہے۔ اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر مقدور رکھیں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے

اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔۔سورہ بقرہ آیت 217)

اگرچہ ایسے کئی سیاسی معاملے ہیں جن میں جبریل علیہ السلام آسمان سے بطورِ مددگار بروقت تشریف لا کر اُن کی مشکل آسان کر دیتے ہیں یا اُن کی خواہشات پر تائید ایزدی کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ تاہم اس پوسٹ میں ہم حضرت محمد ﷺ کے سیاسی مسائل سے ہٹ کر صرف اُنکے ذاتی مسائل پر نظر ڈالیں گے کہ کس طرح جبریل حسبِ منشاء وحی لے کر آتے ہیں۔.

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش محمد ﷺ کے چچا کی بیٹی اور اُن کے لے پالک بیٹے حضرت زید بن حارثہ کی زوجہ تھی، ایک دن حضرت محمد ﷺ زید سے ملنے گئے تو حضرت زینب نے دروازہ کھولا اور انہیں دیکھتے ہی وہ آپ ﷺ کو پسند آجاتی ہیں، قصہ مختصر کہ کچھ ہی عرصہ بعد حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دے دی اور آپ ﷺ کے لئے راستہ بن گیا، لیکن یہاں ایک مسئلہ تھا۔۔مسئلہ یہ تھا کہ سب جانتے تھے کہ حضرت زید آپ ﷺ کے لے پالک بیٹے ہیں اور اس طرح حضرت زینب اُن کے بیٹے کی بیوی یعنی اُن کی بہو تھیں اور اُن پر حلال نہیں ہو سکتی تھیں۔۔اب اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟

حل سورہ احزاب کی آیت نمبر 37 کی صورت میں آیا:

(وَاِذ ◌ تقو ◌ لُ لِلَّذِی ◌ ◌ اَن ◌ عَمَ اللّٰہُ عَلَی ◌ ہِ وَاَن ◌ عَم ◌ تَ عَلَی ◌ ہِ اَم ◌ سِک ◌ عَلَی ◌ کَ زَو ◌ جَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَ تُخ ◌ فِی ◌ نَف ◌ سِکَ مَا اللّٰہُ مُب ◌ دِی ◌ ہِ وَتَخ ◌ شَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَن ◌ تَخ ◌ شٰہُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَی ◌ دٌ مِّن ◌ ہَا وَطَرًا زَوَّج ◌ نٰکَہَا لِکَی ◌ لَا یَکُو ◌ نَ عَلَی ال ◌ مُؤ ◌ مِنِی ◌ نَ حَرَجٌ فِی ◌ اَز ◌ وَاجِ اَد ◌ عِیَآئِہِم ◌ اِذَا قَضَو ◌ ا مِن ◌ ہُنَّ وَطَرًا ؕ وَکَانَ اَم ◌ رُ اللّٰہِ مَف ◌ عُو ◌ لًا—اور جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے احسان کیا تھا اور تم نے بھی احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ سے ڈر اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسکو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ پھر جب زید نے اس سے تعلق ختم کر لیا یعنی اسکو طلاق دے دی تو ہم نے اسے تمہاری زوجیت میں دیدیا تاکہ مومنوں پر انکے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں جب وہ بیٹے ان سے اپنا تعلق ختم کر لیں یعنی طلاق دے دیں کچھ تنگی نہ رہے اور اللہ کا حکم واقع ہو کر رہنے والا تھا۔)

مبادا کوئی اور حضرت زینب کے چکر میں پڑ جائے اللہ تعالیٰ نے بروقت آیت نازل فرما کر حضرت محمد ﷺ کے لیے اُن کی سابقہ بہو کو حلال کر دیا، اور مسئلے کا حل بڑا اسادہ ہے، یعنی اصلی بیٹوں اور گود لیے ہوئے بیٹوں کی بیویوں میں تفریق کر دی گئی، اس کی تصدیق کے لیے اسی سورت کی آیت نمبر 40 میں گود لینے سے منع کر دیا گیا:

(مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا– محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں لیکن اللہ کے پیغمبر اور نبیوں کی مہر یعنی سلسلہ نبوت کو ختم کر دینے والے ہیں اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔)

اگر چہ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت زینب سے عقد روایتی اسلامی طریقے سے ہٹ کر یعنی بغیر نکاح یا گواہان کے ہوا جبکہ ابھی عدت کی مدت نہیں گزری تھی۔ لیکن پورے واقعے سے ہمیں تین باتیں پتہ چلتی ہیں۔

نمبر ایک: کہ اللہ کو اپنے رسول کی خوشی کتنی عزیز ہے۔

نمبر دو، یتیم بچوں کو اپنا نام دے کر پالنا درست نہیں ہے۔ اس سے شاید ان بچوں کو نام و نسب تو مل جائے لیکن اللہ کو بہر حال یہ پسند نہیں۔

نمبر تین: جن شادی شدہ جوڑوں کی اولاد نہ ہو، انہیں رضائے الٰہی پر شاکر رہنا چاہیئے نہ کہ اللہ کی حکمت کو چلینج کرنا چاہیئے۔

بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "ہماری معلومات کے مطابق اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو گود لینے کو حرام قرار دیتا ہے محض اس لیے تا کہ نبی اپنی پسندیدہ خاتون سے شادی کر سکے!" بہر حال ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں۔

حضرت خدیجہ کی رحلت کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سودہ بن زمعہ سے نکاح کیا، کہا جاتا ہے کہ اس شادی کا مقصد اُن کی دونوں صاحبزادیوں ام کلثوم اور فاطمہ کی دیکھ بھال تھا، حضرت سودہ سے نکاح کے تین سال بعد حضرت محمد ﷺ نے حضرت عائشہ کہ اپنے عقد میں لیا جبکہ اسوقت حضرت عائشہ کی عمر مبارک نو سال تھی۔ پھر حضرت زینب بنت جحش اور یوں امہات المومنین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اتنی شادیوں اور کئی سال گزرنے کے بعد حضرت محمد ﷺ نے محسوس کیا کہ حضرت سودہ کی عمر مبارک ڈھل رہی ہے (حالانکہ خود انکی عمر مبارک بھی اسوقت خاصی زیادہ ہو چکی تھی) چنانچہ اُنہوں نے حضرت سودہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا مگر اُنہوں نے منت سماجت کی اور حضرت عائشہ کے حق میں اپنی باری سے دستبردار ہونے پر تیار ہو گئیں، یوں آپ ﷺ مخمصے میں پڑ گئے، ایک طرف اُن کے پاس ایک عمر رسیدہ کے ساتھ گزارنے کے لیے وقت نہیں تھا دوسری طرف لوگوں کی باتوں کی فکر.

اب کیا کیا جائے؟

اس کا حل سورہ نساء کی آیت نمبر 128 میں نازل ہوا:

(وَاِنِ ام رَاَةٌ خَافَت مِن بَع لِهَا نُشُو زًا اَو اِع رَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَی هِمَا اَن یُّص لِحَا بَی نَهُمَا صُل حًا ؕ وَالصُّل حُ خَی رٌ ؕ وَاُح ضِرَتِ ال اَن فُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِن تُح سِنُو ا وَتَتَّقُو ا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَع مَلُو نَ خَبِی رًا ۔اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کرلیں۔ اور صلح خوب چیز ہے اور طبیعتیں تو خود غرضی کی طرف مائل ہوتی ہی ہیں۔ اور اگر تم نیکو کاری اور پرہیز گاری کروگے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔)

یوں رسول اللہ نے حضرت سودہ کو طلاق نہیں دی کیونکہ وہ اپنی باری سے حضرت عائشہ کے حق میں دستبردار ہوگئی تھیں اور چونکہ جبریل علیہ السلام نے بھی تصدیق کردی تھی کہ اللہ آپ کے اس فیصلے سے راضی ہے.

اس کے بعد حضرت محمد ﷺ کی سیاسی اور دینی طاقت بڑھتی چلی گئی جس کے ساتھ ساتھ ازواجِ مطہرات اور خادماؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور ہر معاملے کے لیے اترنے والی آیات ناکافی ہوگئیں کہ عورتیں اور بھی بہت تھیں جنکو سہارا دینا ضروری تھا اور خود اُنکی عمرِ مبارک ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو چلی تھی جبکہ کچھ نا سمجھ لوگوں کا منہ بند کرنا بھی لازم تھا

اس کا حل بھی سورہ احزاب کی آیت نمبر 50 میں نازل ہوگیا:

(یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَح لَل نَا لَکَ اَز وَاجَکَ الّٰتِیۤ اٰتَی تَ اُجُو رَهُنَّ وَمَا مَلَکَت یَمِی نُکَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَی کَ وَبَنٰتِ عَمِّکَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِکَ وَبَنٰتِ خَالِکَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِکَ الّٰتِی هَاجَر نَ مَعَکَ ۫ وَام رَاَةً مُّو مِنَةً اِن وَّهَبَت نَف سَهَا لِلنَّبِیِّ اِن اَرَادَ النَّبِیُّ اَن یَّس تَن کِحَهَا ☆ خَالِصَةً لَّکَ مِن دُو نِ ال مُو مِنِی نَ ؕ قَد عَلِم نَا مَا فَرَض نَا عَلَی هِم فِیۤ اَز وَاجِهِم وَمَا مَلَکَت اَی مَانُهُم لِکَی لَا یَکُو نَ عَلَی کَ حَرَجٌ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُو رًا رَّحِی مًا ۔اے پیغمبر ﷺ ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جنکو تم نے انکے مہر دے دیئے ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری باندیاں جو اللہ نے تمکو کفار سے بطور مال غنیمت دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں سب حلال ہیں اور کوئی مومن عورت اگر اپنے آپکو پیغمبر ﷺ حوالے کر دے یعنی مہر کے بغیر نکاح میں آنا چاہے بشرطیکہ پیغمبر ﷺ بھی اس سے نکاح کرنا چاہیں وہ

بھی حلال ہے **لیکن یہ اجازت اے نبی ﷺ خاص تم ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔** ہم نے انکی بیویوں اور باندیوں کے بارے میں جو مہر واجب الادا مقرر کر دیا ہے ہم کو معلوم ہے یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہ رہے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔)

اس پر اللہ کی رضا کی مزید تاکید اور مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے جبریل اگلی آیت بھی لے آئے جو سورہ احزاب کی آیت نمبر 51 ہے:

(تُر◌جِی◌ مَن◌تَشَآءُ مِن◌ھُنَّ وَتُ۔ ◌وِی◌ اِلَی◌کَ مَن◌تَشَآءُ◌ط وَمَنِ اب◌تَغَی◌تَ مِمَّن◌عَزَل◌تَ فَلَاجُنَاحَ عَلَی◌کَ◌ط ذٰلِکَ اَد◌ٰی اَن◌تَقَرَّ اَع◌یُنُھُنَّ وَلَایَح◌زَنَّ وَیَر◌ضَی◌نَ بِمَا اٰتَی◌تَھُنَّ کُلُّھُنَّ◌ط وَاللّٰہُ یَع◌لَمُ مَافِی◌ قُلُو◌بِکُم◌◌ط وَکَانَ اللّٰہُ عَلِی◌مًا حَلِی◌مًا۔ اے پیغمبر ﷺ تمکو یہ بھی اختیار ہے کہ جس بیوی کو چاہو پیچھے رکھو اور جسے چاہو اپنے پاس رکھو۔ اور جسکو تم نے پیچھے کر دیا ہو اگر اسکو پھر اپنے پاس طلب کر لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ اجازت اس لئے ہے کہ انکی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور جو کچھ تم انکو دو اسے لے کر سب خوش رہیں۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے جانتا ہے۔ اور اللہ جاننے والا ہے بردبار ہے۔)

یعنی آپ ﷺ امہات المؤمنین میں سے اگر کسی کو وقت کی ضرورت یا طبیعت کے تقاضے کے تحت "پیچھے رکھنا" چاہیں تو انہیں اجازت ہے اور اگر جنگوں میں باندیاں بنائی گئی (مِمَّن◌عَزَل◌تَ) عورتوں میں سے کسی سے مباشرت فرمانا چاہیں تو بھی اسکی اجازت ہے۔۔

دراصل مفسرین میں (تُر◌جِی◌ مَن◌تَشَآءُ مِن◌ھُنَّ) کی تفسیر میں اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ہمبستری کے لیے کسی بھی خاتون کا انتخاب کر سکتے ہیں اور جسے چاہے پینڈنگ میں رکھ سکتے ہیں اور اس دوران کوئی اور ان سے عقد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ رسولِ کریم ﷺ کی منتظر ہیں، بعض نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے رسول اللہ اپنی ازواجِ مطہرات، خادماؤں اور ان عورتوں سے جنھوں نے خود کو اُن کے حوالے کر دیا ہے جب چاہیں ہمبستری فرما سکتے ہیں اور اس کے لیے عام مومنین کی طرح وہ کسی ٹائم فریم کے پابند نہیں۔

اور ظاہر ہے امت کا اختلاف رحمت ہی ہے..!

اور پھر جب ازواجِ مطہرات کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ خود مؤرخین میں ان کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے تو اللہ نے اپنے رسول کی عزت اور گھرانے کو دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لئے سورہ احزاب کی آیت نمبر 53 کی صورت میں بذریعہ جبرائیل علیہ السلام ارشاد فرمایا:

(یٰ ◌ٓاَیُّہَا الَّذِی ◌ن اٰمَنُو ◌ الاتد ◌ خُلُو ◌ ابُیُو ◌ت النَّبِیِّ اِلَّآ ◌ٓ اَن ◌ یُّو ◌ ذَنَ لَکُم ◌ اِلٰی طَعَامٍ غَی ◌ رَ نٰظِرِی ◌ن اِنٰیہُ ◌ۙ وَ لٰکِن ◌ اِذَا دُعِ ◌ تُم ◌ فَاد ◌ خُلُو ◌ افَاِذَا طَعِم ◌ تُم ◌ فَان ◌ تَشِرُ و ◌ اوَلَا مُس ◌ تَا ◌ نِسِی ◌ نَ لِحَدِی ◌ ثٍ ◌ؕ اِنَّ ذٰلِکُم ◌ کَانَ یُو ◌ ذِی النَّبِیَّ فَیَس ◌ تَح ◌ ی مِن ◌ کُم ◌ ◌ٛ وَاللّٰہُ لَا یَس ◌ تَح ◌ ی مِنَ ال ◌ حَقِّ ◌ؕ وَاِذَا سَاَل ◌ تُمُو ◌ ہُنَّ مَتَاعًا فَس ◌ ـ ◌ٔ لُو ◌ ہُنَّ مِن ◌ وَّرَآءِ حِجَابٍ ◌ؕ ذٰلِکُم ◌ اَط ◌ ہَرُ لِقُلُو ◌ بِکُم ◌ وَقُلُو ◌ بِہِنَّ ◌ؕ وَمَا کَانَ لَکُم ◌ اَن ◌ تُؤ ◌ ذُو ◌ ارَسُو ◌ لَ اللّٰہِ وَلَآ ◌ٓ اَن ◌ تَن ◌ کِحُو ◌ ◌ٓ ااَز ◌ وَاجَہٗ مِن ◌ ◌ٛ بَع ◌ دِہٖٓ ◌ٓ اَبَدًا ◌ؕ اِنَّ ذٰلِکُم ◌ کَانَ عِن ◌ دَ اللّٰہِ عَظِی ◌ مًا۔ مومنو! پیغمبر ﷺ کے گھروں میں نہ جایا کرو مگر اس صورت میں کہ تمکو اجازت دی جائے یعنی کھانے کیلیئے بلایا جائے جبکہ اسکے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے لیکن جب تمہاری دعوت کی جائے تو جاؤ اور جب کھانا کھاچکو تو چل دو اور باتوں میں جی لگا کر نہ بیٹھ رہو۔ یہ بات پیغمبر ﷺ کو ایذا دیتی تھی اور وہ تم سے حیا کرتے تھے اور کہتے نہیں تھے لیکن اللہ سچی بات کے کہنے سے نہیں شرماتا۔ اور جب پیغمبر ﷺ کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔ اور تمکو یہ شایاں نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ انکی بیویوں سے کبھی انکے بعد نکاح کرو بیشک یہ اللہ کے نزدیک بڑا گناہ کا کام ہے۔)

یوں اللہ نے اپنے رسول کو اس خدائی فرمان کے ذریعے یہ اطمینان دلایا کہ اب کوئی اُن کی ازواجِ مطہرات کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا کیونکہ کسی کو اُنکی رحلت کے بعد بھی اُنکی ازواج سے عقد کرنے کی اجازت نہیں، اب یہ ایک الگ بات ہے کہ اس حکم ربانی کی وجہ سے درجنوں امہات المؤمنین جن میں بیشتر کی عمر بیس سے بھی کم ہے اور جنہوں نے کثیر تعداد میں ہونے کی وجہ سے جسمانی آسودگی (جو کہ ہر انسان کا فطری تقاضاہے) کبھی حاصل ہی نہیں کی ہوگی وہ کیا کریں گی؟ اپنے پیارے رسول کی خوشی کی خاطر اللہ عزوجل نے انکی رحلت کے بعد انکی ازواج کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی پابندی لگا کر غیرتِ پیغمبری کا خیال رکھا.

کثیر تعداد میں امہات المؤمنین کے باوجود آپ ﷺ کو اپنی کنیز ماریہ سے خصوصی لگاؤ تھا جو مقوقس نے آپ کو بطور تحفتاً بھیجی تھی، اور روایات کے مطابق وہ بہت حسین اور گوری رنگت والی تھیں۔ ایک رات جب آپ ﷺ حضرت حفصہ کے گھر میں تھے (حضرت عمر بن الخطاب کی بیٹی جو دُنیاوی اعتبار سے کچھ زیادہ خوبصورت نہیں تھیں) حضرت حفصہ کسی کام سے اپنے

والدین کے گھر گئی (ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے خود انہیں بھیجا تھا) تو آپ ﷺ نے اس دوران حضرت ماریہ کے ساتھ ہمبستری فرمائی۔ اس دوران حفصہ واپس آگئی اور انہوں نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور انسان ہونے کی وجہ سے آپ غصہ میں آگئیں، حضرت محمد ﷺ نے اُنکو منالیا اور وعدہ فرمایا کہ وہ پھر کبھی ماریہ کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے، ماریہ کو ہاتھ نہ لگانے کے آپ ﷺ کے اس وعدے کے اسباب کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں تاہم فی الوقت اتنا کافی ہے کہ انہوں نے حضرت حفصہ سے وعدہ کیا کہ وہ ماریہ کو پھر کبھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔

لیکن جلد ہی اس کا حل بھی سورہ تحریم کی آیت نمبر 1 کی شکل میں آسمان سے نازل ہوا:

(یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ – اے پیغمبر ﷺ جو چیز اللہ نے تمہارے لئے جائز کی ہے تم اس سے کنارہ کشی کیوں کرتے ہو؟ کیا اس سے اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو؟ اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔)

اور یوں جبریل علیہ السلام نے ہمیشہ کی طرح بروقت آکر حضرت ماریہ سے دور رہنے کا آپ ﷺ کا وعدہ زائل فرمادیا اور اللہ تعالٰی نے آپ ﷺ کی مرضی کے پیشِ نظر انکو پھر حضرت ماریہ کے نزدیک جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اسلاموفوبیا

سلام میں قیدی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے

اسلاموفوبیا کی اصطلاح اکثر وبیشتر سننے میں آتی رہتی ہے جو مسلمانوں کی متعارف کردہ ہے خاص کر جو لبرل مسلمان ہیں۔۔ اس اصطلاح کا مطلب مغربی اقوام کا اسلام سے بے جا اور ہیسٹریا کی حد تک پہنچا ہوا خوف ہے۔۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام سے خوف کی اصل وجہ یہودی انتہا پسندوں کا مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا ہے گویا کہ اسے بھی مسلمان "یہودی سازش" ہی قرار دیتے ہیں جو کہ ان کی عادت بن چکی ہے۔

اس تصور کو رد کرنے کیلئے کہ اسلام دہشت گردی اور قتل وغارت گری کا مذہب ہے یہ مسلمان اکثر وبیشتر کسی حد تک امن پسند ممالک کی مثالیں دیتے ہیں جن میں خصوصی طور پر ترکی اور ملائیشیا جیسے سیکولر ممالک شامل ہیں۔ مگر یہ لوگ جان بوجھ کر

طالبان کا ذکر نہیں کرتے جس کی ماضیء قریب میں افغانستان پر حکومت تھی اور جس نے افغانی قوم کے ساتھ کتوں سے بھی بدتر سلوک کیا۔

سعد الفقیہ کو یہ پسند نہیں۔شاید وہ پوری قوم کا اجتماعی قتل چاہتا ہے

اس کے علاوہ یہ دھوکے باز طالبان جیسی دیگر حکومتوں کا ذکر بھی گول کر جاتے ہیں جو اگرچہ اسلامی شریعت کے اطلاق میں طالبان جیسا کمال نہیں رکھتے کیونکہ طالبان کا اسلام از حد صاف ستھرا اور خالص اسلام ہے تاہم یہ بھی کم نہیں جیسے سعودی عرب۔سوڈان اور صومال کی اسلامی عدالتیں۔سعودی عرب کی ہی اگر مثال لی جائے جہاں آج بھی خواتین کو کار چلانے کی اجازت نہیں ہے جبکہ مغربی دنیا میں وہ خلائی جہاز بغیر کسی پرابلم کے چلاتی ہیں۔

در حقیقت اسلاموفوبیا کی اصطلاح بذات خود ایک اسلامی پروپگنڈا ہے نا کہ کوئی یہودی سازش جیسا کہ مسلمان دعوی کرتے ہیں۔۔یہ اصل میں ترقی یافتہ ممالک میں اسلامی خطرے کے خلاف شعور کی بیداری ہے۔

جنگل کا اسلامی قانون اس عورت پر لاگو کیا جارہا ہے

گیارہ ستمبر سے قبل مغرب اسلام کو دیگر توحیدی مذاہب کی طرح کا کوئی مذہب سمجھتا تھا۔بعض لوگ اسے تشدد پسند عیسائیت سے مشابہ کوئی چیز سمجھتے تھے جبکہ کچھ حلقے مسلمانوں کو امن پسند بت پرست سمجھتے تھے تاہم زیادہ تر اقوام کو اسلام کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اور نا ہی وہ اسے کوئی اہمیت دیتے تھے۔ہر کوئی اپنی روزمرہ کی زندگی میں مصروف تھا۔۔مغرب پوری طرح غفلت میں تھا۔۔برطانیہ نے تو انسانیت۔جمہوری اقدار اور شخصی آزادی کی بنیاد پر کئی دہشت گردوں کو پناہ تک دے رکھی تھی جیسے ابی حمزۃ المصری اور سعودیہ کا مشہور تکفیری شیخ سعد الفقیہ جسے سعودی عرب کا حالیہ تکفیری قاتلانہ نظام پسند نہیں اور وہ چاہتا ہے کہ اسلامی قاتلانہ شریعت پر اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے عمل کیا جائے۔

گیارہ ستمبر کے بعد مشرق و مغرب دونوں کو شدید دھچکا لگا۔۔وہ ہزاروں بے گناہوں کی لاشوں پر خوابِ غفلت سے بے دار ہوئے۔۔اوپر سے طرہ یہ کہ اس دہشت گردی پر مسلمانوں نے جشن منائے۔۔سڑکوں پر نکل کر رقص کیئے اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔

فلسطین کے مسلمان گیارہ ستمبر کے واقعہ پر جشن مناتے ہوئے

اور اس طرح اسلام کے ساتھ مغرب کے تعلق نے ایک نیا موڑ لیا اور لوگوں نے دھڑا دھڑ قرآن خرید کر اس خطرناک مذہب کی تعلیمات جاننے کی کوشش کی۔دوسری طرف میڈیا نے اسلام پر رپورٹیں تیار کرنا شروع کیں تاکہ اس مذہب کی تعلیمات کی بابت لوگوں میں شعور بیدار کیا جاسکے جس میں گردن کاٹنا۔ہاتھ کاٹنا۔کوڑے مارنا۔عورتوں پر تشدد کرنا اور دیگر بربریت پر مشتمل تعلیمات شامل تھیں۔

مغرب کو واضح پیغام۔پھر اسلاموفوبیا کہاں ہے؟

صلعم کے کارٹونوں پر اسلامی دنیا کے شدید ردِ عمل نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس طرح مغرب کو اس شیطانی مذہب کی سنگینی اور اس سے درپیش خطرات کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ جس وقت مغرب کو یہ احساس ہوا کہ آزادی۔ مساوات اور لبرازم پر مبنی ان کی اقدار کو اسلامی اژدہا سے شدید خطرات کا سامنا تھا وہیں اسلام کا دفاع کرنے والوں کو بھی اپنی بقاء خطرے میں نظر آنے لگی کیونکہ شہتوت کا وہ آخری پتہ جس نے ان کی شرمگاہ کو ڈھانپ رکھا تھا کھسک چکا تھا جس پر وہ مغرب کو اسلام سے بے جا خوف پر ملامت کرنے لگے۔

شاید اگلے سو سال تک انسانیت کو درپیش خطرات میں سے اسلام سر فہرست رہے گا۔ کیونکہ زیادہ تر مسلمان تعلیمی اور شعوری لحاظ سے جاہل ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر اسلامی ممالک میں نظامِ تعلیم اسلامی شدت پسندوں کے ہاتھ ہے جسے وہ بچوں کی برین واشنگ کیلیئے استعمال کرتے ہیں اور یہ زہر نئی نسل کو منتقل کرتے ہیں

غیبی آوازیں

کیا آپ کو کوئی آوازیں سنائی دیتی ہیں؟ مجہول آوازیں جو آپ کے سوا کوئی دوسرا نہ سن سکتا ہو؟ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو پھر آپ ایک صحت مند انسان ہیں جس کی دماغی حالت بالکل ٹھیک ہے، کیونکہ جسے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہوں وہ دماغی مریض ہوتا ہے، پاگل خانے ایسے مریضوں سے بھرے پڑے ہیں جنہیں ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو ان سے بات کرتی ہیں.

کیا آپ نے کبھی ایسے کسی پاگل کو دیکھا ہے؟ میں نے بچپن میں ایسے کئی پاگل دیکھے تھے جو گلیوں میں آوارہ گھومتے پھرتے تھے، ان میں سے ایک کی پیش گوئی تھی کہ ہمارا شہر سمندر میں ڈوب جائے گا، یہ پیش گوئی وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کرتا تھا اور لوگ اس پر ہنستے تھے کیونکہ ہمارا شہر سمندر سے ہزاروں میل دور تھا اور اس کے سمندر میں ڈوبنے کے دور دور تک کوئی امکانات نہیں تھے۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ نبی ہو جس کا ہم مذاق اڑاتے رہے اور اب اس کی پاداش میں اللہ ہمارے شہر کو غرقاب کردے گا؟ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ انڈین مرغا پاکستانی مرغے کو ہرادے گا۔۔ اور سچ کہوں تو اس کی یہ پیش گوئی بالکل درست تھی کیونکہ کچھ ہی عرصہ بعد پاکستانی کرکٹ ٹیم انڈین ٹیم سے ہار گئی تھی۔۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ شخص پوری طرح مالیخولیا کا مریض تھا اور عقل سے فارغ تھا۔

جب کوئی شخص کہے کہ اس نے ایک آواز سنی ہے جو کہہ رہی تھی کہ اپنی قوم کو ہدایت دو تو غالب امکان یہی ہے کہ وہ بیمار ہے اور ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میسنجروں کے میسنجر اور بارہ پروں والے جبریل نے ہی اس سے بات کی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ فرشتے لوگوں سے بات کرتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جن بھی لوگوں سے بات کرتے ہیں، جبکہ کچھ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ شیطان بھی لوگوں سے بات کرتا ہے۔۔ امریکہ میں ہزاروں لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ ایلینز نے ان سے بات کی جبکہ ان کے سوا کسی اور نے یہ شرفِ ملاقات نہیں دیکھی ہوتی، قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ لوگ پاگل ہیں انبیاء نہیں.

پوری دنیا میں نفسیاتی اور اعصابی ڈاکٹروں کے پاس ہر سال لاکھوں لوگ ایسی آوازوں سے اپنا علاج کرواتے ہیں جو انہیں اپنے دماغ میں سنائی دیتی ہیں، ایسا انسان جسے اس طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہوں وہ یقیناً ایک مریض اور بے چارہ شخص ہے اور شاید دوسروں کیلیئے بھی خطرہ ثابت ہو۔۔ کچھ عرصہ قبل ایک خبر پڑھی تھی کہ ایک عورت نے اپنے بچوں کو قتل کردیا اور عدالت میں کہا کہ ایک آواز نے اسے ایسا کرنے کیلیئے کہا جسے اس نے یسوع کی آواز سمجھا۔۔ آپ بھی یہ قصہ سن کر یہی کہیں گے کہ یہ عورت پاگل ہے مگر۔۔۔ کیا ہزاروں سال قبل مشرقِ وسطی میں ایسا ہی ایک واقعہ نہیں ہوا؟

جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے۔۔ابراہیم نامی ایک پاگل نے ایسی ہی ایک آواز سنی جس نے اسے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور وہ پاگل اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئیے پہاڑ پر چڑھ گیا۔۔ذرا سوچیں اگر ایسا ہی کوئی ابراہیم آج کے زمانے میں آکر ایسی حرکت کرنے لگے تو کیا ہوگا؟لوگ اسے پاگل خانے میں داخل کروانے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیں گے۔۔مشرقِ وسطی ہی کا ایک اور پاگل بھی ابراہیم ہی کی طرح آوازیں سنتا تھا اور ان کی بنیاد پر لوگوں کی زندگی کے فیصلے کرتا تھا۔۔اسے قتل کردو۔۔ اُس قبیلے کی عورتوں کو باندیاں بنالو۔۔اس کا ہاتھ کاٹ دو۔۔اس کی گردن کاٹ دو۔۔۔کس بنیاد پر؟ محض ایک آواز جو اس سے بات کرتی تھی،یہ ہمارے شہر کے اس پاگل سے مختلف نہیں ہے جو ہمارے شہر کے ڈوبنے کی پیش گوئی کیا کرتا تھا۔۔مگر پہلا نبی اور دوسرا پاگل کیوں قرار پایا؟

دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ لوگوں نے پہلے پر یقین کرلیا جبکہ دوسرے کی بات کسی نے نہیں مانی،بعض اوقات ایسے کسی نفسیاتی مریض کا تُکا لگ جاتا ہے جیسے کچھ سالوں پہلے کینیا میں ایک نبی آیا اور لاکھوں لوگ اس پر ایمان لے آئے۔۔اس نے پیش گوئی کی کہ نیروبی شہر میں زلزلہ آئے گا اور اسے تباہ کردے گا،پھر اتفاق ایسا ہوا کہ واقعی نیروبی میں معمولی سے زلزلے کے جھٹکے محسوس کیئے گئے چنانچہ اس نے لوگوں سے کہا کہ یسوع انہیں متنبہ کررہا تھا،یوں لوگ جوق درجوق اس پر ایمان لانے لگے۔۔کم از کم اس کی پیش گوئیاں صلعم سے تو بہتر ہی ہیں تو کیوں نا اس پر ایمان لایا جائے؟ آخر اسے بھی تو آوازیں سنائی دیتی ہیں؟

ان انبیاء کی کامیابی کا راز ماضی میں آنے والی ایسے ہی پاگلوں پر ہے،ہمارے شہر کو غرقاب کرنے کی پیش گوئی کرنے والے پاگل نے اپنے آپ کو سابقہ انبیاء سے منسلک نہیں کیا،جبکہ صلعم نے ایسا کیا اور کچھ سابقہ انبیاء کے دستیاب قصے بیان کردیئے،ساری Trick یہی ہے،اگر ماضی میں انبیاء کو آوازیں سنائی دیتی تھیں تو وہ کیوں نا آوازیں سنے؟اور چونکہ وہ سابقہ انبیاء کا احترام کرتا تھا لہذا یہ بات یقینی ہے کہ اسے بھی آوازیں سنائی دیتی ہوں گی۔۔اس طرح اس کی نبوت پر مہرِ تصدیق ثبت ہوجاتی ہے۔

اپنے آپ کو ایک نبی کیسے ثابت کریں؟ یہ بہت آسان ہے۔۔آپ کو پرانی کتابوں کی تصدیق کرنی ہوگی اور توریت،انجیل اور زبور کا راگ الاپنا ہوگا پھر ہزاروں سال پہلے مر کر سڑ جانے والے انبیاء کے کندھوں پر بندوق رکھ کر بہترین جھوٹے قصے سنانے ہوں گے،یہ بعینہ نئے آنے والے ڈکٹیٹر کی طرح ہیں جو اپنے اقتدار کو جواز دینے کیلئیے سابقہ ڈکٹیٹر کی تعظیم کرتا ہے تاکہ اپنا الو سیدھا کرسکے۔۔عبد الناصر پھر انور السادات۔۔سٹالن پھر لینن انقلاب کو جاری رکھتے ہیں اور پھر اگلے موڑ پر یوٹرن لیتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر جب یہ پاگل جسے آوازیں سنائی دیتی ہیں ہزاروں سال پہلے ایسے ہی پاگلوں کا حوالہ دیتا ہے جنہیں ایسی ہی آوازیں سنائی دیتی تھیں تو پھر اس کا انکار کفر بن جاتا ہے اور ایسے لوگوں کیلیئے جہنم کے دروغے سیخ کباب لیئے منتظر ہوتے ہیں۔۔ انسانیت کی تاریخ مضحکہ خیز ہے خاص طور سے جب ایسے پاگل لوگوں کو بے وقوف بنا کر دولت واقتدار تک پہنچ جاتے ہیں، یا پھر ایسے لوگ جو ایسے پاگلوں کی کہانیوں کو بنیاد بنا کر لوگوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔۔ پاگلوں کو بھی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ابنیاء کو بھی، یہ انبیاء بھی دیگر پاگلوں کی طرح پاگل ہی ہیں مگر وہ لوگوں کو یہ قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ یہ آواز اللہ کی ہے، ایسے پاگلوں کی شخصیت احمقوں کیلیئے کرشماتی شخصیت بن جاتی ہے اور وہ اسے پوجنے لگتے ہیں۔

جب یہ نفسیاتی نبی مرتا ہے اور جو کسی حد تک عیش و آرام کی زندگی گزار چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد سیاستدان کی باری آتی ہے جسے سلطان یا خلیفہ کہا جاتا ہے، یہ خلیفہ یا سلطان بھاڑے کے راوی اور مؤرخ تعینات کرتا ہے جو احمقوں کیلیئے اس قصے کو عظیم بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔۔ وہ اسے ڈرامہ اور سیرتِ نبوی بنا دیتے ہیں جن سے احکامات کشید کر کے فقہ، شریعت اور لاہوت بنایا جاتا ہے اور پھر آگے چل کر یہ سب بکواس قانون بن جاتی ہے اور جو کوئی بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کی جرات کرتا ہے اسے کڑی سے کڑی سزا دی جاتی ہے، خلیفہ خدا کا سایہ بن جاتا ہے اور اس کا حکم خدا کا حکم اور اس کی معصیت خدا اور نبی کی معصیت بن جاتی ہے، یوں خلیفہ خدا کا نائب بن کر لوگوں پر طویل حکومت کرتا ہے۔

تاہم سوال یہ ہے کہ ماضی میں لوگوں نے ان پاگلوں پر یقین کیوں کیا؟ جواب آپ کی سوچ سے بھی زیادہ آسان ہے۔۔۔

ماضی میں وکیپیڈیا نہیں تھا، تعلیم نہیں تھی، لوگوں کو نہیں پتہ تھا کہ معقول اور خیال میں کیسے تفریق کی جائے، آج کی طرح کی سائنس نہیں تھی جو آپ کو جوابات دے سکے، لوگوں کا سارا انحصار جادوگروں، نجومیوں، انبیاء اور خرافات پر ہوتا تھا، وہ انہی میں اپنے سوالوں کے جوابات ڈھونڈتے تھے۔۔۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔۔ قرآن بہت سارے قدرتی مظاہر کی بات کرتا ہے اور چودہ سو سال پہلے عرب کے صحراؤں میں بغیر گوگل کے رہنے والے ایک عرب بدو کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔۔ ہے نا؟ درست مگر قدرتی مظاہر کی کیا توجیہ پیش کرتا ہے یہی راز ہے؟ زلزلہ سزا ہے۔۔ بیماری امتحان ہے۔۔ چاند اور ستارے رات کو راستہ بتانے کیلیئے قطب نما کا کام کرتے ہیں۔۔ یہ سب انتہائی مضحکہ خیز ہے۔۔ خاص طور سے جب آپ قرآن کی دن اور رات کی توجیہ پڑھتے ہیں تو ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔۔ قرآن کا کاتب دن اور رات کو سورج جیسے چمکنے والے ستارے سے منسلک کرنے میں ناکام رہا اور دن رات کو سورج سے بالکل الگ کسی شئے کے طور پر پیش کیا، صلعم کو لگا کہ دن اور رات چادریں ہیں۔۔ رات کی چادر آکر دن کو ڈھک لیتی ہے اور دن کی چادر آکر رات کی چادر کو ڈھک لیتی ہے۔۔ کیا ہی عظیم سائنسی توجیہ ہے؟!

اعجازیوں کی تاویلوں پر کان نہ دھریں۔۔ کہانی بہت ہی آسان ہے، نہ سائنسدان تھے نہ سائنس تھی، وہ ایک قدیم دنیا تھی جس پر جادوگروں، نجومیوں، جعلسازوں اور لمبی لمبی داڑھیوں والے انبیاء کا راج تھا یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے پاگلوں پر یقین کر لیا.

یہاں کوئی اعتراض اٹھاتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ یہ ساری کہانیاں جو قرآن سناتا ہے جو صلعم کو معلوم تھیں اور انجیل میں بھی لکھی ہوئی ہیں۔۔ وہ ساری پیش گوئیاں۔۔ ان سب کا کیا۔۔ ایسے شخص کو میں کہوں گا کہ ذرا آرام فرمائیں۔۔ لمبی سانس لیں۔۔ بیئر کا ایک گلاس پیئیں اور میرے ساتھ سوچیں۔۔ کیا آج بھی ایسے کہانیاں لکھنے والے موجود نہیں جو ایسی کہانیاں لکھتے ہیں جو کبھی ہوئی ہی نہیں تھیں؟ یہ کہانیاں بالکل ایسی ہی ہیں۔۔ آوازیں سننے والا ایک پاگل + بادشاہ، سلطان، خلیفہ + خیالی کہانیاں گھڑنے والا مصنف = مذہب۔۔۔ کنگ آرتھر یا جان ڈارک کا قصہ جنہوں نے اپنی قوم کو آزاد کیا۔۔ یہ موسی کا قصہ ہے۔۔ سورہ کہف میں موسی اور خضر کا قصہ شرلاک ہومز کا قصہ ہے۔۔ موسی کو ایک تابوت میں ڈال کر نیل میں بہا دینا اور اس کا مصریوں سے بچ جانا سوپر مین کے بچ جانے کا قصہ ہے جس کے باپ نے کریپٹن سیارے کے پھٹ جانے کی پیش گوئی کی اور سپر مین کو ایک جہاز میں بٹھا کر وہاں سے نکال دیا۔۔

خیالی کہانیاں جن کی بنیاد آوازیں سننے والے پاگل ہیں اور جو وقت کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں پختہ ہوتی چلی جاتی ہیں اور مصداقیت حاصل کر لیتی ہیں اور لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ خلاء سے آئی ہیں جہاں خدا رہتا ہے۔۔ وہ ڈرپوک خدا جس کی آواز صرف پاگلوں کے دماغوں میں ہی گونجتی ہے۔

مذہب اور عورت

یہ خبر پڑھنے کے بعد سوچا پاکستانی عورت کے لیے ایک مضمون لکھا جائے کیونکہ ریتیلے ممالک میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے، ساتھ ہی میں نے اس مضمون کے ساتھ "ونڈر وومن" کی تصاویر کا انتخاب کیا ہے کیونکہ یہ عورت کا میکس کی دنیا میں ایک ایسے وقت میں آئی جب کامکس کی دنیا پر "مرد سپر ہیروز" چھائے ہوئے تھے جیسے سپر مین، بیٹ مین اور سپائیڈر مین وغیرہ، ایسے میں یہ تصویری کہانیوں کی پہلی اور سب سے زیادہ شہرت پانے والی "سپر ہیروئین خاتون" ہے، مصنف نے اس شخصیت کا اقتباس یونانی جنگجو امازونی خواتین سے کیا، ونڈر وومن عورت کی آزادی اور خود مختاری کی علامت ہے، یہ محض اپنی "سپر ہیروانہ" طاقتوں پر ہی انحصار نہیں کرتی بلکہ اپنی عقلی صلاحیتوں کا بھی بھرپور استعمال کرتی ہے، ایک ایسی دنیا میں جس میں ہر طرف مرد ہی چھایا ہوا ہے اس کا مقصد محبت، بھائی چارہ، اور جنسی مساوات کے امازونی قدروں کا فروغ ہے. وہ مواقع جو عورت کو آج حاصل ہیں وہ سونے کی طشتری پر رکھے ہوئے نہیں ملے تھے، یہ مذاہب اور فرسودہ روایات کے خلاف طویل

جنگ کے بعد ہی حاصل ہو پائے ہیں، مذہب عورت کی آزادی اور مرد کے ساتھ اس کے مساویانہ حقوق کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ رہا ہے، تمام جدید لبرل قدریں تنویری فکر کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہیں جس نے دنیا کے بیشتر ممالک میں عورت کو حقوق کے معاملے میں مرد کے برابر لا کھڑا کیا جس میں سیاسی اقتدار بھی شامل ہے، یہ سب اندھیری دنیا کے ساتھ فکری جنگ کے بغیر ممکن نہیں تھا، مذہب کا تعلق اسی اندھیری دنیا سے ہے جو عورت اور ترقی سے نفرت کرتا ہے، یہ قرونِ اولی کی دنیا ہے، اگر ہم مذاہب پر ہی قائم رہتے تو کبھی ترقی نہ کرتے اور نا ہی انسانیت کچھ ایجاد یا دریافت کر پاتی، مذاہب کی وجہ سے دنیا میں ترقی کا پہیہ کوئی ایک ہزار سال تاخیر کا شکار ہوا، اور اگر یہ سب جاری رہتا تو آج آپ اپنے کسی لختِ جگر کی کسی فضول وجہ سے موت پر آنسو بہا رہی ہوتیں جیسے ویکسینیشن کی عدم دستیابی.

تمام مذاہب ایک ہی جیسے ہیں اور ایک ہی طرح سے ری ایکٹ کرتے ہیں، عیسائیت بھی عورت کی مرد سے مساوات کے سخت خلاف ہے مگر یورپ میں اپنی شکست کے بعد اسے حقیقتِ حال کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے، تاہم اسلام آج بھی وہی قرونِ اولی کا فرسودہ راگ الاپ رہا ہے اور یہ تصور پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ آپ کی آزادی مسلمانوں کو شکست دینے کی ایک یہودی، امریکی ماسونی، فرعونی شدادی سازش ہے.. ہر مذہب میں عورت کے خلاف ظالمانہ تعلیمات ہیں، مگر تنویری اور آزاد فکر نے ہمیشہ عورت کی تعلیم کا ہتھیار استعمال کیا اور ان فرسودہ مذہبی تعلیمات کا بھانڈا پھوڑا جو خوبصورت لبادے میں عورت کی دشمنی پر مبنی تھے، یہ ریاست اور اس کے قوانین کو سیکولر بنائے بغیر ممکن نہیں تھا... ذیل میں یہودیت سے ایک مثال ہے:

اگرچہ اسرائیل کے بیشتر یہودیوں نے سیکولرازم اور لبرل ازم کو اپنا لیا ہے تاہم شدت پسند اور بنیاد پرست یہودی خواتین کی تمام تر سرگرمیوں کے خلاف ہیں اور ایسے پیش آتے ہیں جیسے قرونِ اولی میں رہتے ہوں جہاں معاشرے میں عورت کا کردار صفر کے برابر ہے اس طرح یہ بنیاد پرست یہودی مسلمانوں کے مولویوں، پیروں اور شیخوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں.

یہودی مولوی الیاکیم لیوانون (Elyakim Levanon) کو ایک خاتون کا خط موصول ہوا جس میں اس خاتون نے سوال کیا کہ کیا وہ کمیونٹی سیکریٹری کا عہدہ سنبھال سکتی ہے؟ اور جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں یہ سب سے بڑی غلطی ہے، کبھی کسی مولوی سے کچھ نہ پوچھیں کیونکہ وہ یقیناً منع کر دے گا جو ان کا انسانوں کو کنٹرول کرنے کا روایتی طریقہ ہے اور اس کام کے لیے مذہب ایک بہترین اوزار ہے، ریتیلے ممالک کے پاکھنڈی مولویوں اور عورت کے خلاف ان کے گھٹیا فتووں سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے.. آپ کا کیا خیال ہے کہ اس یہودی مولوی نے کہا ہو گا کہ ہاں جائز ہے؟ جبکہ اس کا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جو عورت کو اقتدار دینے میں کئی مغربی ممالک سے آگے ہے؟ جواب سنیے:

The first problem is giving women authority, and being a secretary means having "authority, This is the proper way to prevent a situation in which the woman votes one way and her husband votes another," He also said it was not appropriate for women to .mix with men in late evening meetings of community leaders

گویا کہ آپ اقرا چینل پر کسی پاکھنڈی مولوی کو سن رہے ہوں؟

اس خبر پر کئی خواتین نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا، ایک خاتون نے کہا کہ عورت نے اپنا حق جہدِ مسلسل اور مشکل ترین اوقات میں اپنے آپ کو ثابت کر کے حاصل کیا ہے، جبکہ نورٹ ٹسور نامی خاتون نے کہا کہ یہودی مولوی کا فتوی جمہوری اقدار کے خلاف ہے، اب ہم قرونِ وسطی میں نہیں رہتے، مجھے توقع ہے کہ مذہبی قیادت لیوانون کے بیان کی مذمت کرے گی اور معاشرے میں یہودی عورت کے مقام کو مزید واضح کرے گی.
عورت کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار دینے کی روش کسی قدر نئی ہے، اس کی تاخیر کی وجہ مذاہب ہیں، دنیا کا کون سا مذہب کہتا ہے کہ عورت اقتدار میں حصہ لے سکتی ہے؟ یقین کریں ایک بھی نہیں.. مسلمان مولویوں کی اس بک بک پر دہان نہ دیں جو حقوقِ نسواں پر بات کرتے ہوئے یوں شروعات کرتے ہیں کہ: اسلام نے عورت کو مرد کے برابر کا درجہ دیا ہے ماسوائے (............) اور پھر خالی جگہ کو سستی اور گھٹیا جسٹی فیکیشن سے بھر دیتے ہیں جو عقل میں نہیں گھستی.. تمام مذاہب نے عورت کو مرد سے کم تر درجہ دیا ہے اور اسی بنیاد پر اسے اقتدار کی ذمہ داریوں کے قابل نہیں سمجھا، اسلام بھی یہی کر رہا ہے لہذا دھوکہ نہ کھائیں.

بطور انسان آپ کے آزاد ہونے میں سیکولر تحریکوں اور آزاد فکر کا بڑا گہرا تعلق ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو ملحد ہونا چاہیے مگر اپنی قسمت اور خوشی کو کسی پاکھنڈی مولوی یا شیخ کے ہاتھوں پامال نہ ہونے دیں بلکہ معاشرے کے ایسے گندے انڈوں کے خلاف مضبوط اپوزیشن بنیں، صرف اپنے آج کے لیے ہی نہیں بلکہ مستقبل میں اپنی بیٹیوں اور پوتیوں کے لیے، ڈاکٹر عنیقہ ناز جیسی "ونڈر وومن" آپ کے لیے ایک بہترین نمونہ اور مشعلِ راہ ہے، جب تک زندہ رہیں، ایسے مذہبی جنونیوں کو لگام ڈالے رکھی جو اب ان کی موت پر جتنا اظہارِ افسوس کر رہے ہیں اندر سے اتنے ہی خوش ہیں کہ شکر ہے بلا ٹلی.
اسلام پر تنقید صرف ملحدین کی حد تک ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ معاشرے کے تمام طبقات کو اس میں شامل ہونا چاہیے جو ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں، مذاہب ایک ناکام نظام ہیں جو صورتِ حال کو ویسا کا ویسا ہی رکھتے ہیں، انصاف اور مساوات میں عورت کے حق کا دفاع کرنا کوئی امریکی یہودی سازش نہیں ہے جیسا کہ یہ طفیلی آپ کو ڈراتے رہتے ہیں، بلکہ یہ انسانی حق وانصاف کا ایک لا ینفک جزو ہے.

یہودی مولوی لیوانون ایک جانی پہچانی تصویر ہے، یہ شیخ عریفی اور بن باز اور عثیمین ہے، یہ شیخ عوضی ہے، یہ سیستانی کی کاربن کاپی ہے..

عورت کو بھاری ذمہ داریاں دے کر ہم ان بکروں اور جو کچھ ان کا دین آپ کے بارے میں کہتا ہے غلط ثابت کر سکتے ہیں، ریتیلے ممالک میں مذہبی جنونیوں کو لگام ڈالنے کے لیے حقوقِ نسواں کی حمایت کرنا ازبس ضروری ہے..

شاید آپ کو میرے ملحدانہ خیالات سے اتفاق نہ ہو مگر آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ جس قدر دین کے ٹھیکیداروں کی حجتیں کمزور پڑیں گی اسی قدر عورت اپنی مساوات کی منزل کے قریب تر ہوتی چلی جائے گی، عورت کی آزادی پدری ثقافت سے چھٹکارے کے بغیر ممکن نہیں اور یہ سب مذہب پر تنقید کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا.

بندھے کی ریوڑیاں

یہ معاشرہ در حقیقت مرد کا معاشرہ ہے، مشرق ہو یا مغرب، دونوں ہی معاشروں میں عورت مردوں کے زیرِ تسلط ذلت و خواری کی زندگی جی رہی ہے۔ حقوق کے نام پر کبھی اسکو شٹل کاک برقعے میں محبوس کیا جاتا ہے، کبھی اسکے کپڑے نوچ اتارے جاتے ہیں۔ کہیں یہ مرد کی تفریح کا سامان بنی دکان میں سجی بیٹھی ہے اور کہیں یہ ساری زندگی گھر کی چاردیواری میں قیدِ بامشقت کاٹتے کاٹتے بوڑھی ہو جاتی ہے اور اس پر ستم یہ کہ اسکو اسکی آزادی اور تعظیم کہا جاتا ہے۔

اسلامی سکالرز بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں کہ اسلام نے آکر عورت کو ذلت کے گڑھے سے نکالا اور عظمت کی رفعتوں پہ بٹھا دیا۔ اسلام نے شاید کسی دور میں ایسا کیا ہو، لیکن موجودہ معاشرے کو دیکھتے ہوئے اور اگر اسے اسلام مانیں تو یہ دعویٰ مجھے غلط نظر آتا ہے۔

عورت اور مرد میں مساوات کیسے ہے۔ عورت گھر ہی میں رہے، باہر محرم کے بغیر نکلنا ممنوع، جب نکلے تو اچھی طرح پردہ کر کے نکلے کہ مرد اسے دیکھ کر شہوت محسوس نہ کریں (مردوں کو اپنی غلیظ نظریں جھکانے کی ضرورت نہیں)، شوہر اسے ہمبستری کے لئے بلائے اور وہ رغبت نہ ہونے پر انکار کر دے تو اللہ ناراض، خاوند کی خدمت اور بچوں کی پرورش، مجازی خدا کا ہر حکم بجالانا، ہر ضرورت یا خواہش کے لئے مجازی خدا کی اجازت لازمی۔ گھر کے فیصلے مجازی خدا ہی کرے گا اسنے صرف ان پر عملدرامد کرنا ہے۔

مساوات کہتے ہیں برابری کو کہ دونوں فریقین بالکل برابر ہو جائیں، یہ کیسی مساوات ہے کہ جسمیں ایک فریق دوسرے کے ماتحت ہو رہاہے اور اسکو حکمت کا نام دیا جارہاہے۔

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر، اسلئے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی"۔(4:34القرآن)
مساوات اسکو کہتے ہیں کہ "ایک کو ایک پر فضیلت بخشی" یا "عورتوں پر حاکم" کا نام برابری رکھا گیا ہے؟

کسی شاعر نے کیا خوب کہاہے کہ

ہمارا کھیت سانجھا ہے، مگر تقسیم ہے ایسی

کہ ساری مولیاں میری ہیں، سارے مونگرے تیرے ہیں

عزت وعفت صرف عورت ہی کا خاصہ ہے؟ مرد اس سے بالاتر کیوں؟ اب کہنے والے کہیں گے کہ مردوں کی بھی عزت و عفت ہے۔۔۔ تو بھائی میرے مرد کی عزت کیوں نہیں لٹتی؟ ہمیشہ عورت ہی کی عفت کیوں خطرے میں رہتی ہے۔۔ کیوں؟ اسلئے کہ یہ مرد معاشرہ ہے۔

کیسی تکریم ہے کہ اسے کتے سے بھی بدتر قرار دیا اور سور، گدھے کی کیٹیگری میں ڈال دیا گیا ہے؟

"عورت گدھا اور کتا نماز کو قطع کر دیتا ہے ہاں اگر کجاوہ کی پچھلی لکڑی کے برابر سترہ ہو تو نماز باقی رہتی ہے۔" (صحیح مسلم)
کم و بیش ایسا ہی بیان ایک اور جگہ بھی ہے، بس فرق یہ ہے کہ عام کتوں کو عورت پہ ترجیح دی ہے اور سیاہ کتے (جسمیں شیطان ہوتا ہے) کے برابر گردانا ہے۔

"نماز کے دوران سترہ نہ ہونے کی صورت میں کتا، گدھا، سور، یہودی، مجوسی یا عورت کا ایک پتھر پھینکنے سے کم فاصلے سے گزرنے پر نماز قطع ہو جاتی ہے" (ابوداود)
"عورت، گھوڑے اور گھر میں نحوست ہے" (صحیح بخاری) منحوس قرار دے کے کونسی عزت کی بلندی پہ بٹھا رکھا ہے عورت کو؟

"اے ایمان والو نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک اتنا ہوش نہ ہو کہ جو کہو اسے سمجھو، اور نہ ناپاکی کی حالت میں بے نہائے مگر مسافری میں، اور اگر بیمار ہو یا سفر میں یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا اور پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔۔۔(4:43القرآن)
کیسی تعظیم ہے کہ اسے چُھونا غلاظت اور گندگی چھونے کے مترادف ہے؟

اسکے ہاتھ کی پکی روٹیاں تو شوق سے ٹھونستی ہیں لیکن اسے چھوئیں تو طہارت حاصل کرنا پڑتی ہے عبادت سے پہلے۔ کبھی اسے عقل میں مرد سے آدھا قرار دے کر اسکی توہین کی جاتی ہے، کبھی اس کی تخلیق کا مقصد آدم کی تنہائی دور کرنا اور اسکی تسکین کرنا بتا کر اس کی تذلیل کی جاتی ہے۔ ہماری تمام معلوم انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیشہ عورت مرد کو جنم دیتی ہے، انبیاء تک نے عورت سے جنم لیا، جبکہ دوسری طرف مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ عورت نے آدم سے جنم لیا۔۔۔واٹ لگا دی عورت کی ساری تخلیق کی اذیت برداشت کرنے کی جو وہ ہزاروں سال سے کر رہی ہے تا کہ نسلِ انسانی باقی رہے۔ مرد کے لئے ایک سے زاید بیویوں کی اجازت اور جنت میں ستر ستر حوریں۔ اپنا شریکِ حیات شئیر کرنے پر مجبور کون ہے؟ عورت۔ جنت میں حوریں کس لئے ہیں؟ مرد کے لئے۔ (عورت کیا چاٹے گی حوروں کو؟)

برابری اور مساوات کی کیا ہی عمدہ مثال ہے کہ جو عورتیں پسند ہوں، دو دو، تین تین، چار چار نکاح کر و ان سے اور پھر انکے درمیان مساوات اور عدل سے کام لو۔

اب یہ نہ کہیئے گا کہ ملاحدہ بیویوں کو بھی چار خاوند رکھنے کا فتویٰ جاری کر رہا ہے۔ مقصد یہاں مساوات کا ہے کہ مرد کو بھی چاہیئے کہ ایک شریف انسان کی طرح ایک بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارے اور ایک کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی جیسے غیر انسانی و غیر اخلاقی فعل کو ذہن میں بھی جگہ نہ دے نہ بیوی کے بڑھاپے کا بہانہ بنا کر اور نہ اولاد کا (تاوقتیکہ کہ وہ یہ حق عورت کو بھی دینے پر تیار نہ ہو جائے)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عورت پر دہری ذمہ داری لاد دی جائے کہ بچے بھی پالے اور سالن روٹی بھی کرے اور پھر باہر جا کے پیسے بھی کمائے۔ نہیں۔ میری ذاتی رائے (جس سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے) یہ ہے کہ ٹھیک ہے زندگی کی دوڑ میں آدھا میدان عورت سنبھالے اور آدھا مرد، بھلے عورت گھر کا نظم و نسق، بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ میں مشغول رہے اور خاوند محنت مشقت کر کے پسینہ بہا کے چار پیسے کما کر لائے، اسمیں میرے نزدیک کوئی عیب نہیں، دونوں کا اپنا اپنا میدانِ عمل ہے۔ لیکن صرف اسکو بنیاد بنا کر مرد کو عورت پر حاکم سمجھنا سراسر غلط ہے۔ عورت کو اگر گھر گرہستی سونپی ہے تو پھر گھر میں عورت کا فیصلہ فائنل ہونا چاہیئے۔ باہر کے معاملات کیسے طے کئے جائیں گے یہ مرد فیصلہ کرے اور گھر کے معاملات کیسے چلائے جائیں گے یہ عورت طے کرے۔

لیکن ساتھ میں یہ بھی کہ اگر کوئی عورت یہ سمجھتی ہے کہ وہ مقابلے کی دنیا میں اپنالوہا منوا سکتی ہے اور اسمیں ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ دنیا کو کچھ دے سکتی ہے اور دینا چاہتی بھی ہے تو اسکو اسکے اس حق سے محروم نہ کیا جائے۔ یہاں پھر خاوند کو اسکی گھریلو ذمہ داریوں میں برابری کی سطح پر ہاتھ بٹانا لازم ہے۔ اسکی راہ میں روڑے نہ اٹکائے بلکہ اسکی حوصلہ افزائی کرے۔ ہر معاشرے میں خبیث الفطرت لوگ موجود ہوتے ہیں کہ جنکی نظر میں عورت ایک "شے" ہے کہ جس کا مصرف صرف اس سے تسکین اور مزہ حاصل کیا جاناہے، انکی حوصلہ شکنی کرنا، انکی نظریں جھکانا مسئلے کا حل ہے نہ کہ عورت کو کپڑے کی دبیز تہوں میں لپیٹ لپاٹ کر مرد کا طفیلی بنا دینا۔ آپ گھر سے باہر نکلیں اور آپ کے راستے میں کچھ زہریلے سانپ رہتے ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ ساری زندگی گھر میں رہیں گے یا سانپوں کو کچلیں گے؟

عورت ایک آبجیکٹ نہیں، یہ بھی مرد کی طرح گوشت پوست سے بنی انسان ہی ہے۔ اسے انسانوں کی طرح برتیں، یہ صرف جسم نہیں جو آپکی تفریح طبع کا سامان ہے بلکہ اسمیں چھپی صلاحیتوں کو بھی نشو نما کا موقع دیں۔ اسکو ناقص العقل قرار دے کر معاملات سے الگ کرنے کی بجائے اس کو موقع دیں کہ یہ انسانیت کو درپیش مسائل کے حل میں اپنا کردار ادا کرے۔ مختلف ہونے اور کمتر ہونے میں فرق ہے۔ اگر مرد جسمانی ساخت اور تقاضوں میں عورت سے کچھ مختلف ہے تو اسکا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ بہتر ہے۔ مرد اور عورت دو ٹکڑے ہیں کہ جنکے ملنے سے انسان بنتا اور مکمل ہوتا ہے۔ کسی ایک کے بھی نہ ہونے سے دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔

انقلاب کی تعریف

وہ لوگ جو آج مختلف عرب ممالک میں سوریا کے سفارتخانوں کے سامنے "انقلاب" کے حق میں مظاہرے کر رہے ہیں، انہی لوگوں نے کل "بحرین" کے مظاہروں کو نظر انداز کیا تھا کیونکہ ان کی نظر میں وہ "شیعہ" کے مظاہرے تھے، اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ماضی قریب میں سوڈان کے مظاہروں سے نظریں پھیر لی تھیں کیونکہ وہ اخوان المسلمین کے حامی "سنی" صدر البشیر کے خلاف تھیں اور اس سرکاری روایت پر یقین کر لیا تھا کہ یہ مظاہرے بے راہ رو اور رنڈیاں کر رہی ہیں تا کہ انہیں زیادہ حقوق مل سکیں..

اور یوں کسی بھی عرب ملک میں انقلاب کی تعریف یہ ہے کہ: "انقلاب ہر وہ عوامی "سنی" موومنٹ ہے جس کی قیادت کسی بھی عرب ملک میں "اخوان المسلمون" کر رہے ہوں تا کہ اقتدار پر قبضہ کر کر کے اس ملک پر حکومت کی جا سکے"

اور جب کوئی ایسا دن آئے جب آپ کو ملازمت نہ ملے اور "دورِ عمری" جیسا کوئی قحط آ جائے اور آپ احتجاج کا اپنا حق استعمال کرنے کی غرض سے سڑک پر نکلنا چاہیں تو اگلے دن کے اخبار میں اس سرخی سے آپ کو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ "کچھ خوارج (قاتلہم اللہ) نے مسلمانوں کے خلیفہ کے خلاف احتجاج کرنے جرات کی"

بشرطیکہ آپ اگلے دن تک زندہ رہ پائے تو..

مذہب میں تجدید یا نئے مذہب کی ایجاد

یہودیت، عیسائیت اور اسلام دونوں ایسے مذاہب ہیں جن کے اپنے طے شدہ مخصوص ارکان ہیں اور جو کوئی ان بنیادی ارکان کی پابندی کرنے سے انکاری ہو جائے انہیں ان مذاہب سے "فارغ" کر دیا جاتا ہے چاہے یہ فارغ کیے جانے والے خود کو حق پر اور دوسروں کو باطل پر ہی کیوں نہ سمجھیں...

عیسائیت کی مثال لیتے ہوئے فرض کرتے ہیں کہ اگر کوئی عیسائی عیسی کو اللہ کا بیٹا ماننے اور وحی کے تصور کا انکاری ہو جائے تو بیشتر کی نظر میں وہ بہر حال عیسائی نہیں رہے گا، اور اگر وہ درمیانی صدیوں کا باشندہ ہوتا تو اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا، اس اختلاف کے باوجود بھی اگر وہ شخص خود کو عیسائی سمجھتا رہے تو یہ اس کا حق ہے مگر حقیقتِ حال یہی ہے کہ اس نے دراصل اصل نام کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نیا مذہب ایجاد کر ڈالا.

اسی نہج پر چلتے ہوئے اب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں اور فرض کرتے ہیں کہ کوئی مسلمان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکاری ہو جائے اور قرآن کو کسی یہودی حاخام (مولوی) کی تصنیف قرار دے اور حج کے رکن کو بت پرستانہ رسم کہہ ڈالے جس میں لوگ ایک سیاہ پتھر کے گرد چکر لگایا کرتے تھے اور عورتیں تبرک کے طور پر اس سے اپنی شرمگاہیں رگڑا کرتی تھیں تو کیا یہ شخص مسلمان رہے گا؟ یقیناً یہ شخص مسلمان نہیں رہے گا اور اگر وہ سرِ عام اپنے ان نظریات کا اعلان کر دے تو حکومت تو بعد کی بات ہے کوئی بھی "مجاہد" اسے مرتد قرار دیتے ہوئے اسے قتل کر ڈالے گا، لیکن اگر وہ شخص پھر بھی خود کو مسلمان قرار دے تو؟ یقیناً یہ اس کا حق ہے مگر درحقیقت اس نے بھی اصل نام کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نیا دین ایجاد کر لیا.

کچھ لوگ اس کے لیے "دین میں تجدید" کی اصطلاح استعمال کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو کہ درحقیقت تقیہ کی ایک شکل ہے، یہ کہنے کی بجائے کہ ہم ایک نیا دین بنا رہے ہیں وہ اسے اس دین میں تجدید قرار دیتے ہیں جو کہ محض ایک تعبیری اختلاف ہے.

معاملہ کچھ بھی رہا ہو، ہم نئے مذاہب کی دہلیز پر ہیں جو انہی ناموں کے ساتھ قطعی مختلف مضمون کے ساتھ آن دھمکنے والے ہیں، ان نئے مذاہب میں خصوصی طور پر خرافات کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جائے گی جس میں بنیادی خرافت ہی یہی ہے کہ مقدس کتابیں آسمان سے خدا کی طرف سے انبیاء پر وحی کے طور پر "اتاری" گئی ہیں.. آج کی اسلامی جماعتوں کی بنیاد ہی اسی افسانے پر قائم ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ معاشروں پر اسلامی شریعت "ٹھونسنا" چاہتے ہیں کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاہم اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ ایک یہودی حاخام کی تصنیف ہے تو یہ ساری اسلامی تحریکیں اس طرح سے ڈھیر ہو جائیں گی جیسے دھوپ میں برف پگھلتی ہے، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان مقدس کتابوں کو اتنی آسانی سے نہیں لینا چاہیے کیونکہ ساری دنیا پر ان کے تشویش ناک اثرات مرتب ہوتے ہیں.. مثلاً:

- مصر میں اخوان المسلمین کے صدارت کے امیدوار کا فرمانِ اقدس ہے کہ اگر وہ صدر بن گیا تو عیسائیوں کو زبردستی اسلام میں داخل کرے گا یا پھر انہیں جزیہ دینے پر مجبور کیا جائے گا بصورتِ دیگر انہیں ملک بدر کر دیا جائے گا کیونکہ جزیہ ایک قرآنی حکم ہے جس کے تحت لازم ہے کہ غیر مسلم بے عزت ہو کر (وہم صاغرون) مسلمانوں کو جزیہ دیں اور چونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے لہذا اللہ کی شریعت کا اطلاق ضروری ہو جاتا ہے.

- کوئی اقتصادی مسائل کے حل کے لیے انسانی تجارت اور غلاموں اور لونڈیوں کے بازاروں کی واپسی چاہتا ہے کیونکہ قرآن انسانی غلامی کو جائز قرار دیتا ہے اور چونکہ یہ اللہ کا کلام ہے چنانچہ اللہ کی شریعت لازماً لاگو کی جانی چاہیے، ملاحظہ فرمائیں ویڈیو ایک بلکہ اس کویتی خاتون کا تو کویتی حکومت سے دیرینہ مطالبہ ہے کہ لونڈیاں خریدنے اور رکھنے کا قانون پاس ہونا چاہیے کیونکہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں یعنی وہ اسلام کے دورِ عروج کے اس منظر کو بحال کرنا چاہتی ہیں:

-کوئی شرعی حدود کے اطلاق کا مطالبہ کررہا ہے جیسے سنگسار، ہاتھ کاٹنا، گردن کاٹنا، مرتد کا قتل وغیرہ کیونکہ یہ اللہ کی شریعت ہے، ایسے بہت سے بڑے بڑے منصوبے ہیں جو ان وحشیانہ سزاؤں کو قانونی حیثیت دینے کے لیے سرگرداں ہیں جیسے:

1- مصری سزاؤں کا قانون جو ایک بہت بڑا منصوبہ ہے جسے پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی نے 1982ء میں وضع کیا تھا اور جو وڑے وڈے جج صاحبان اور قانون دانوں اور مولویوں پر مشتمل تھی... منصوبہ ملاحظہ فرمائیں.

2- عرب ممالک کا سزاؤں کا یکجا قانون جس کی عرب لیگ نے 1996ء میں منظوری دی تھی.. یہاں ملاحظہ فرمائیں.

3- خلیج تعاون کونسل کے ممبر ممالک کا یکجا قانون، یہاں ملاحظہ فرمائیں.

–کوئی فرعونی آثارِ قدیمہ کے بتوں اور فرعونی نقوش کو تباہ کرنے کے درپے ہے کیونکہ قرآن بت شکن ہے..اور کوئی ہندوستان میں ہندوؤں کے سارے بتوں کو تباہ کرنے کے چکر میں ہے اور یقیناً اس کی بھی وجہ قرآن ہے.

–کوئی سپین، روم، یورپ اور امریکہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ دین اللہ کے لیے ہو..ملاحظہ فرمائیں ویڈیو ایک اور ویڈیو دو.

یقیناً کچھ لوگ–جن کی تعداد کا تعین کرنا مشکل ہے–ایسی خرافات کو خیر باد کہہ چکے ہیں مگر اپنے عقائد کا اظہار نہیں کرتے خاص طور سے اسلامی معاشروں میں جہاں ردت کی تلوار ان کے سروں پر ہر وقت لٹکتی رہتی ہے، مگر انٹرنیٹ کے بڑے پیمانے پر پھیلاؤ اور اس پر عرفیتی ناموں (نک نیمز) کے استعمال نے ایسی فرسودہ حکومتوں اور معاشروں کی لاگو کردہ ساری پابندیوں کی بینڈ بجادی ہے جس کے سامنے حکومتی اور مذہبی حلقے بے بس نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جلد ہی دنیا ایسی فکری تبدیلیوں سے دوچار ہونے والی ہے جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں..یہ امر سیاستدانوں اور مولویوں کے لیے تشویش کا باعث ہے یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دس سال سے زیادہ عرصہ سے اسلامی ممالک اقوامِ متحدہ میں مذاہب کی توہین کا قانون پاس کرانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں جس کے حوالے سے آخری کوشش غالباً 2010ء میں پاکستان کی جانب سے کی گئی تھی اور یہ قرارداد غالباً اس سے اگلے سال ویٹو کردی گئی تھی..وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ توہین کی بات تو کرتے ہیں مگر توہین کو ڈیفائن نہیں کرتے اور مقصد یقیناً یہی ہے کہ عالمی برادری پر تفتیشی عدالتیں تھوپی جائیں تاکہ اسلامی خرافات کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو کچلا جاسکے.

جناتی مسائل

جنات کا مسئلہ باعثِ حیرت ہے..اس لیے نہیں کہ یہ محض خرافاتی "مخلوق" ہے جو اسلام میں سابقہ مذاہب کے بھوتوں، بدروحوں اور چڑیلوں کے قصوں سے داخل ہوئی ہے کہ مذاہب تو ہوتے ہی خرافات کے گڑھ ہیں اور اس ضمن میں اسلام استثناء نہیں انتہاء ہے..بلکہ اس لیے کہ اسلام میں جنات کی اہمیت انسانوں کے برابر ہے..اور مزے کی بات یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس عجیب وغریب "مساوات" پر کوئی حیرت نہیں ہوتی!

اسلامی روایات کے مطابق زمین پر جن شیطان اور اس کے بیٹوں کی نسل سے ہیں جو ایک "غیبی" دنیا میں رہتے ہیں جسے دیکھا اور جانچا نہیں جا سکتا اس کے باوجود آپ کو احمقانہ طور پر اس دنیا کے وجود پر یقین رکھنا ہے، اگرچہ خدا نے انہیں آگ سے بنایا ہے (اور جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔ سورۃ الحجر آیت 27) لیکن ایک اور مقام پر فرمایا کہ اس نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا (اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔ سورۃ الحجر آیت 30) چنانچہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے جنات کو تخلیق کرنے کے لیے آگ کو پانی سے اس طرح مکس کیا کہ نہ تو آگ بجھی اور نہ ہی پانی بخارات بن سکا..!؟ انٹرسٹنگ ہے.. ہے نا..

بہر حال جنوں میں ابلیس کے موقف کی احمقانہ طور پر حمایت کرنے والے برے جن بھی ہیں جنہیں وہ لوگوں کو "الو" بنانے اور بہکانے کے کام پر مامور کرتا ہے اور اچھے جن بھی ہیں جو اللہ کی اطاعت میں زندگی گزارتے ہیں، لیکن جو بات سوچ کر پیٹ میں درد ہوتا ہے یہ ہے کہ اچھے جن انسانوں کو بہکانے کی ابلیس کی اس "بہیمانہ سازش" کو روکنے کے لیے مداخلت کیوں نہیں کرتے؟ یا جنوں کی دنیا میں بھی مسلمان تنزلی کا شکار ہیں؟ بہر حال جنوں میں مسلمان تو ہیں ہی.. یہودی بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور شاید دہریے بھی یعنی اس معاملے میں وہ بالکل انسانوں کی طرح ہیں، ان کے اچھوں کو جزاء اور بروں کو سزا ملتی ہے یعنی وہ بھی انسانوں کی طرح مکلف ہیں چنانچہ لازم ہے کہ وہ کچھ مخصوص اعمال سرانجام دیں تاکہ وہ جنت میں داخل ہو سکیں ورنہ اپنے باپ کے ساتھ جہنم کی آگ ان کی منتظر ہے.

جنوں کے حوالے سے وارد ہونے والے متون دلچسپی سے خالی نہیں، مثلاً سورہ الکہف کی آیت 50 کی تفسیر میں تفسیر القرطبی میں آیا ہے: "مجاہد نے کہا: اس میں سے نسل اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ اس نے اپنے باہ کو اپنی ہی شرمگاہ میں داخل کر دیا اور پانچ انڈے دیے، کہا: یہی اس کی نسل کی اصل ہے، اور کہا گیا: اللہ نے اس کی دائیں ران پر باہ پیدا کیا اور بائیں ران پر شرمگاہ اور وہ اس سے اس سے مباشرت کرتا ہے اور یوں اس کے لیے روزانہ دس انڈے نکلتے ہیں، ہر انڈے سے ستر شیطان مرد اور ستر شیطان عورتیں نکلتی ہیں، وہ اڑتے ہوئے نکلتے ہیں، ان کے باپ کے ہاں سب سے عظیم وہی ہے جو آدم کی نسل میں سب سے زیادہ فتنہ برپا کرتا ہے، میں نے کہا: اس باب میں جو صحیح میں ثابت ہوا ہے وہ ہے جس کا حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں امام ابی بکر البرقانی سے نقل کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ابی محمد عبد الغنی بن سعید الحافظ سے ایک سند نکالی ہے جو عاصم نے ابی عثمان اور اس نے سلمان سے روایت کی ہے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: بازار میں سب سے پہلے داخل ہونے اور سب آخر میں نکلنے والے نہ بنو کیونکہ اس میں شیطان نے انڈے دیے ہوتے ہیں، اور یہ اس بات کی دلالت ہے کہ شیطان میں سے اس کی نسل ہے، واللہ اعلم"

یہ تھے شیطان اور اس کی نسل پر "اہلِ علم" کے کچھ اقوال، یقیناً آج کل ایسے علمی خزانوں سے استفادہ کافی کم ہو گیا ہے ورنہ ان میں صرف شرعی ہی نہیں بلکہ حیاتیاتی علوم بھی موجود ہیں، یہ ہیں وہ کتابیں جو علمائے حق چاہتے ہیں کہ ہم پڑھیں تا کہ امت کا سابقہ دورِ عروج واپس آ جائے، اور امتوں میں نکالی جانے والی سب سے بہترین امت کا سر فخر سے بلند ہو جائے!!

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مذہبی فسانوں کے مطابق تمام انبیاء – جن کی تعداد نامعقولیت کی حد تک جاتے ہوئے ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے – صرف انسانوں کے لیے بھیجے گئے تھے سوائے محمد صلعم کے، یعنی انسانوں پر ڈھائی گئی مصیبتیں کیا کم تھیں کہ انہوں نے جنوں کے لیے بھی آپ کا دعوی کر دیا وہ بھی بالکل برابری کی حیثیت سے؟، فوٹون سوال اٹھاتا ہے کہ انسانوں کے لیے ایک لاکھ تئیس ہزار نو سو ننانوے نبی بھیجنے کے بعد خدا کو آخر میں اچانک جنات کا خیال کیوں آ گیا؟.. عنیقہ کا یہ فوٹون کافی خطرناک سوالات کرتا ہے.. وہ کہتا ہے کہ جب وہ جن و انس دونوں کے لیے بالکل برابر بھیجے گئے تھے تو جنوں کے لیے انہوں نے کیا کیا؟

در حقیقت انہوں نے معاملے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور جنوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا، نہ جنوں کی دنیا میں جا کر مسلمان جنوں کے شانہ بشانہ کافر جنوں سے جہاد کیا، نہ ان کے شرعی مسائل حل کیے اور نا ہی بیان، ثبوت کے طور پر سارا دینی لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو جنوں کے بارے میں کچھ نہیں ملے گا.. کیا جنوں پر ہمبستری کے بعد غسل جنابت واجب ہے یا نہیں؟ کیا جن عورتیں ماہواری کے دوران نماز پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟ ان کے روزے کے احکام کیا ہیں؟ نماز کے احکام کیا ہیں؟ آگ سے بنے ہونے کی وجہ سے کیا نماز کے لیے انہیں پانی سے وضوء کرنا ہو گا یا ریت منہ پر ملنی ہو گی؟ ان کی رفع حاجت کی دعاء کیا ہے؟ الغرض یہاں آپ ایک ہزار سوالیہ نشان لگا سکتے ہیں؟؟

جو چند سطور ملیں گی وہ بھی ڈرامہ بازی سے زیادہ کچھ نہیں، جب خدا نے دیکھا کہ انہوں نے جنوں کے لیے کچھ نہیں کیا تو اسے خود ہی انہیں یاد دلانا پڑا کہ: "اے پیغمبر ﷺ لوگوں سے کہدو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے اس کتاب کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا – سورۃ الجن آیت 01"

ایسے ہی اچانک جنات کی ایک جماعت نے اتفاق سے قرآن سن لیا.. ذرا تصور کرتے ہیں کہ جنات کی ایک جماعت اپنے روز مرہ امور کی انجام دہی کے لیے حسبِ معمول کہیں جا رہی تھی کہ اچانک انہیں گانے جیسی کوئی چیز سنائی دی جس نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی اور آگے بڑھنے سے پہلے وہ اسے سننے کے لیے رک گئے، غور سے سننے اور تصدیق کرنے پر ان پر انکشاف ہوا کہ دراصل یہ قرآن ہے جس نے انہیں خیرہ کر دیا تھا اور یوں اچانک وہ سب مسلمان ہو جاتے ہیں.. ایسے ہی چلتے پھرتے، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا کہ ہو سکتا ہے ان کا اس معاملے سے سرے سے کوئی لینا دینا ہی نہ ہو کیونکہ محمد اور اس کے

قرآن کا مضمون خالصتاً بشری ہے اور اگر قرآن کا ان سے کوئی لینا دینا ہوتا تو اس میں ان کے مسائل پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا جس طرح اس میں انسانوں کے مسائل بیان کیے گئے ہیں.

پھر جنوں کے نبی یثرب کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں اور خدا کے نام پر قبائلی روایات لاگو کرتے ہیں، جہاد کے نام پر جنگیں لڑتے ہیں، سیاسی معاہدے کرتے ہیں، آس پاس کے ممالک کے حاکموں کو خطوط ارسال کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر جنوں کی دنیا کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کرتے بلکہ ان بے چاروں کا تو اس ساری تاریخ میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے، نہ ان کی دنیا میں جہاد ہوتا ہے، نہ معاہدے ہوتے ہیں، نہ خطوط ارسال کیے جاتے ہیں اور نا ہی کوئی شریعت بیان کی جاتی ہے؟!

ایک دلچسپ قصہ صحیح مسلم میں یوں بیان ہوا ہے: "عامر الشعبی کہتے ہیں کہ میں نے علقمہ سے پوچھا کہ کیا لیلۃ الجن میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کیا لیلۃ الجن میں تم میں سے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا؟ (یعنی جس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں سے ملاقات فرمائی) انہوں نے کہا کہ نہیں، لیکن ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گم پایا۔ پس ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہاڑ کی وادیوں اور گھاٹیوں میں تلاش کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ملے۔ ہم سمجھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن اڑا لے گئے یا کسی نے چپکے سے مار ڈالا اور رات ہم نے نہایت برے طور سے بسر کی۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حراء (جبل نور پہاڑ ہے جو مکہ اور منیٰ کے درمیان میں ہے) کی طرف سے آ رہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! رات کو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گم پایا اور جب تلاش کے باوجود بھی آپ نہ ملے تو آخر ہم نے (آپ کے بغیر) بہت برے طور سے رات گزاری۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جنوں کی طرف سے ایک بلانے والا آیا تو میں اس کے ساتھ چلا گیا اور جنوں کو قرآن سنایا۔ پھر آپ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے اور ان کے نشان اور ان کے انگاروں کے نشان بتلائے۔ جنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زادراہ چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس جانور کی ہر ہڈی جو اللہ کے نام پر کاٹا جائے، وہ تمہاری خوراک ہے۔ تمہارے ہاتھ میں پڑتے ہی وہ گوشت سے پر ہو جائے گی اور ہر ایک اونٹ کی مینگنی تمہارے جانوروں کی خوراک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہڈی اور مینگنی سے استنجاء مت کرو، کیونکہ وہ تمہارے بھائی جنوں (اور ان کے جانوروں) کی خوراک ہے۔"

زبردست..!!! انہیں اچانک جنوں کا خیال آیا اور وہ ایک مشکوک انداز میں پوری رات غائب رہے حالانکہ صحابہ کو بتانے میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ وہ جنوں کی طرف جا رہے ہیں لہذا وہ آج رات ان کے بارے فکر مند نہ ہوں..

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ جنوں کی ملاقات کی جگہ پر آگ کے انگارے پائے گئے، لگتا ہے محمد سے اس اہم کانفرنس کے دوران آگ سے بنے جنوں کو آگ جلانے کی ضرورت پڑی، اور بجائے اس کے کہ وہ اس نادر موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی طرف بھیجے ہوئے نبی سے خشوع وخضوع سے انسانوں کی طرح اپنے ماحول کے حساب سے تعالیم اسلام سے فیض یاب ہوتے انہوں نے بھوکے ہونے کی شکایت کی! مسئلہ کو حل کرنے کے لیے محمد نے اللہ کے نام پر کاٹے جانے والے ہر جانور کی ہڈی جو جنوں کو کچرے کے ڈبوں میں ملے ان کی خوراک قرار دیا، اس سے پہلے نہ جانے وہ بے چارے کیا کھا کر گزارہ کرتے تھے نہیں معلوم...؟! یہاں بھی فوٹون کے پیٹ میں شدید مروڑ اٹھتے ہیں اور وہ سوال کرتا ہے کہ دنیا میں اللہ کے نام پر کاٹے جانے والے جانوروں کی تعداد ہی کتنی ہے جو ان کی ہڈیاں جنوں کی ضخیم آبادی کو پوری ہوں گی؟

چنانچہ یہ جاننے کے لیے کہ اسلام کے احکامات محض انسان کے لیے ہی مخصوص تھے نا کہ کسی سیارے کی خلائی مخلوق کے لیے، آپ کا جن ہونا ضروری نہیں ہے، مسلمانوں کے ہی زعم کے مطابق قرآن کی آیات خالصتاً انسانی واقعات کے پیش نظر اتاری گئیں تھیں اور خدا نے صرف انسانوں کو ہی مخاطب کیا اور وعیدیں دیں.

محمد صلعم نے سورۃ جن اور سورۃ رحمن (جس پر پھر کبھی بات ہوگی) کی شکل میں بڑی تاخیر سے معاملات سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر ایک دن ایک متنازعہ واقعے میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئے مگر نا تو جنوں کی اسلامی حکومت کا نظام وضع اور واضح کیا اور نا ہی قرآن میں صراحت سے ان کے احکامات بیان کیے جو کہ آسمان کا زمین کے لیے آخری پیغام تھا.. اگرچہ اس ضمن میں انسان کی صورتِ حال بھی کچھ اتنی خوش کن نہیں.

آج بھی جن حیرت و پریشانی کے عالم میں قرآن کے صفحات پلٹتے ہیں مگر انہیں نا تو اپنے فرائض اور واجبات کا پتہ چلتا ہے اور نا ہی دیگر احکامات کا جن کا آغاز کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہونے سے شروع ہوتا ہے اور حیض و نفاس اور جنابت کے مسائل سے ہوتے ہوئے کافر جنوں سے جہاد فی سبیل اللہ پر آکر ختم ہوتا ہے، حالانکہ وہ بالکل انسان کی طرح مکلف ہیں مگر ان کے شرعی احکامات گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہیں.

دوسرے سیاروں پر ذہین حیات اور قرآن

ہوتا یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں ایسے کئی سوالات یا موضوعات ہوتے ہیں جنہیں آپ ایک بلاگر کی حیثیت سے زیرِ کیبورڈ لانا چاہتے ہیں مگر وقت کی قلت اور سستی اکثر و بیشتر آڑے آتی رہتی ہے اور معاملہ التواء کا شکار ہوتا رہتا ہے، مگر پھر کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے کہ آپ کو اس مخصوص موضوع پر لکھنے میں ذرا جلدی کرنی پڑتی ہے، یہ تحریر بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا نتیجہ ہے،

میرے بلاگ کے پاسازیافٹر میں موجود شٹ بکس یا شاؤٹ بکس میں ایک صاحب نے مندرجہ ذیل تبصرہ کیا جو یہ سطور لکھتے وقت تک بڑھاجاسکتاہے:

”فرحان: مکی صاحب میری خواہش ہے کہ آپ ایک تحریر اس بارے میں بھی لکھیں کہ اس پوری کائنات میں صرف زمین پہ انسان ہی کیوں ہیں اور اگر صرف زمین پہ ہی انسان بسانے تھے تو یہ لامحدود کائناتیں بنانے کا مقصد کیا تھا؟؟؟“

ایسا نہیں ہے کہ میں خصوصی طور پر اپنے اس قاری کی خواہش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ تحریر لکھ رہا ہوں تاہم مجھے اعتراف ہے کہ اس سے مجھے مہمیز ضرور ملی، کیا اس وسیع و عریض کائنات کے دوسرے سیاروں پر ذہین حیات موجود ہے؟ حقیقتاً اس سوال کا کوئی براہ راست جواب موجود نہیں ہے کیونکہ اس ضمن میں ہمارے پاس کوئی مسکت شہادت نہیں ہے، جو بھی کچھ ہے وہ محض قیاسات پر مبنی ہے اس کے باوجود کائنات میں کسی ذہین حیات کی موجودگی پر اس وقت تقریباً تمام علمی حلقوں میں اجماع پایا جاتا ہے اور اگر متعدد کائناتوں کا نظریہ درست ثابت ہو جاتا ہے تو ذہین حیات پر مشتمل ایسے سیاروں کی تعداد میں جنونی اضافہ ہو جائے گا، مختصراً یہ نظریہ علمِ فلک کے علمی حقائق پر مبنی ہے جو کرہ ارض اور اس کے ستارے (سورج) کو ایسی کوئی فوقیت یا خصوصیت نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ تمام کائنات مجموعی طور پر انہی طبیعاتی اور کیمیائی قوانین کی پابند ہے جو ہمارے سیارے پر رائج ہیں، اس سلسلے میں علم پسندوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ بالخصوص کارل ساگان اور دیگر طبیعات دانوں کے مضامین پڑھیں جبکہ مذہب پسندوں کو ”پڑھنے“ کے اس کٹھن مرحلے سے گزرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کے پاس پہلے سے ہی ایک کتاب موجود ہے جو ان کی جگہ ”سوچنے“ کا کام کرتی ہے، ضمیر کے سوالات کے لیے مولوی موجود ہیں جبکہ کسی بھی دیگر مسئلے کے حل کے لیے ”دعاء“ کا زمانوں سے آزمودہ نسخہ دستیاب ہے لہذا وہ یہ کشٹ نہ کریں.

اس بار ”اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی“ کی مصداق مومنین نے بازی لینے کی ٹھانی اور اس سے پہلے کہ یہ نظریہ حتمی طور پر ثابت ہو جائے انہوں نے اسے پہلے ہی قرآن سے ثابت کر ڈالا ہے اور ایک آیت کی گردن مروڑ کر اس میں سے کائنات میں ذہین حیات کی موجودگی کشید کر لی ہے چنانچہ میں انہیں اس عظیم پیشگی دریافت پر پیشگی مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ اسی نہج پر چلتے ہوئے قدری میکانیات سمیت تمام ترپیچیدہ علمی نظریات میں موجود مشکلات کو اسی طرح حل کر کے نہ صرف جدید علوم کی بلکہ انسانیت کی بھی خدمت کرتے رہیں گے.

مومنین کے ایک اعجازی ڈاکٹر عبد الدائم الکحیل نے اپنے اس مضمون میں کائنات میں ذہین حیات کی موجودگی پر فلکیات دانوں کے پورے دس حوالے پیش کر کے آخر میں حسبِ سابق وحسبِ روایت یہ ثابت کیا ہے کہ علم تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہے مگر اللہ نے قرآن میں چودہ سو سال پہلے ہی ہمیں یہ معجزہ سورہ شوری کی آیت نمبر 29 میں بتا دیا تھا کہ:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ﴿سورہ شوری آیت 29﴾

(اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان جانوروں کا جو اس نے ان میں پھیلا رکھے ہیں۔ اور وہ جب چاہے انکے جمع کر لینے پر قادر بھی ہے۔)

اگرچہ میں اس آیت کی یہ من مانی تفسیر جو دیگر تفاسیر سے قطعی متصادم ہے مسترد کرتا ہوں لیکن موضوع پر براہ راست داخل ہونے کے لیے میں یہ تفسیر عارضی طور پر قبول کر لیتا ہوں اور اس کے قبول کر لینے کے نتیجے میں قرآنی تضادات کا جو انبار کھڑا ہو گا انہیں مختصراً زیرِ بحث لانے کی کوشش کرتا ہوں.

موضوع پر براہ راست آنے کے لیے اس اسلامی مفروضے سے آغاز کرتے ہیں جس کے مطابق خدا ایک مطلق اور کامل منصف (عادل) ہے، مطلق انصاف کی یہ صفت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی تمام تر مخلوقات سے مساوی سلوک کرے، اور اس مساوات کے لیے لازم ہے کہ وہ کائنات کے ایسے تمام سیاروں پر جن پر ذہین حیات موجود ہے کی ہدایت کے لیے انبیاء بھیجے اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے انہیں اپنی عبادت پر مامور کرے جیسا کہ اس نے اہلِ زمین کے ساتھ کیا، دوسرے لفظوں میں ان مخلوقات میں ادراک اور عقل کا وجود انہیں عبادات اور فرائض کے لیے مکلف بنا دیتا ہے، دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ یہ ذہین مخلوقات – جیسا کہ اہلِ زمین کے ساتھ ہوا – خود کار طور پر کائنات کے خالق اور زندگی کے معنی اور مقصد اور انجام پر سوال اٹھائیں گی، اور ان سوالوں کے جوابات کی سعی میں مذہب اور فلسفے کا وجود میں آنا حتمی ہے، چنانچہ ان میں ایسے لوگ ضرور ظاہر ہوں گے جو ان سوالوں کے جوابات دینے کی مقدرت کا دعوی کریں گے اور یوں بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ نبوت کا دعوی بھی کر ڈالیں جیسا کہ زمین پر ہوا، مزید بر آں ان سیاروں کا زمین سے ملتے جلتے ہونے کا یہ مطلب بھی ہو گا کہ وہاں زندگی کے لیے ضروری وسائل پر لڑائی بھی ہو گی جس کے نتیجے میں ظالم اور مظلوم وجود میں آئیں گے اور مطلق انصاف کی تلاش شروع ہو جائے گی جو یقیناً صرف حیات بعد از مرگ کی صورت میں ہی ممکن ہے، اس کے علاوہ موت بالکل وہی فکری اور جذباتی مسائل پیدا کرے گی جو زمین پر ہمیں روز در پیش ہوتے ہیں.

مومنین کے لیے قرآن اللہ کے کلام کی حیثیت رکھتا ہے، سادہ لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پاس قرآن کی شکل میں بالکل وہی الفاظ موجود ہیں جو اللہ نے "بول" کر جبریل نامی فرشتے کے ذریعے اپنے نبی محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچائے اور اس نے اس کلام کو غلطیوں سے بالکل پاک صورت میں ہم تک پہنچایا، اور چونکہ مومنین کے نزدیک قرآن ازلی (کم از کم معتزلیوں کے اس مفروضے کے سقوط کے بعد کہ قرآن مخلوق ہے) ہے چنانچہ یہ نہ صرف نافذ الحکم اور مطلق حق ہے بلکہ ہر زمان و مکان اور تمام وجود کے لیے (جس میں موجودگی کی صورت میں دیگر کائناتیں بھی شامل ہیں) کارآمد ہے، یعنی طبیعات، کیمیاء اور دیگر طبعی قوانین کی طرح اسے وجود کے ہر گوشے اور ہر زمانے کے لیے کارآمد ہونا چاہیے اور اس کی درستگی اور حقانیت پر کسی بھی نوعیت کا نقص نکالنا اللہ اور اس کی وحدانیت میں نقص نکالنے کے مترادف ہوگا.

تاہم حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ازلیت اور اس کے ہر زمان و مکان کے لیے کارآمد ہونے کا دعوی کائنات میں ذہین "مخلوقات" کی موجودگی کے ممکنات سے کلی طور پر متصادم ہے اور بہت سارے تضادات کو جنم دیتا ہے جن میں کچھ درجِ ذیل ہیں:

زبان:

چونکہ قرآن عرب کی زبان عربی میں "اتارا" گیا چنانچہ لازم ہے کہ ہر اس سیارے پر جس میں ذہین "مخلوق" موجود ہو کوئی ایسی قوم یا قبیلہ لازماً ہونا چاہیے جو "فطرتاً" عربی زبان بولتا ہو اور وہ بھی عین اسی طرح جس طرح کی عربی چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نما عرب میں بولی اور سمجھی جاتی تھی.

فلکیاتی اور زمانی مسائل:

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ذہین حیات صرف زمین سے ہی مشابہت رکھنے والے سیاروں پر نمودار ہو سکتی ہے جس میں زندگی کی نمو کے لیے زمین سے مشابہت رکھتا ماحول سیارے کا حجم اور اپنے سورج سے اس کی دوری اور اس کی طبیعاتی اور کیمیائی تکوین وغیرہ شامل ہے تب بھی اس سے دیگر بہت سارے بڑے بڑے ممکنہ فرق کے امکانات سے نہیں بچا جا سکتا جیسے اس سیارے کا کسی دہرے ستاروی نظام (binary star system) کا تابع ہونا یا عام طور پر ایک سے زائد سورجوں کا تابع ہونا، سیارے کا اپنے سورج (یا سورجوں) کے گرد چکر کا دورانیہ، اپنے محور کے گرد چکر کا دورانیہ، دن کی لمبائی، چاندوں کی تعداد اور اس کے خطے کے ستاروں کا ماحول وغیرہ.. ان ممکنات کے حقیقی ہونے کی صورت میں – جس کا یقیناً کافی امکان ہے – لازم ہے کہ قرآنی آیات میں اس حساب سے بنیادی تبدیلیاں کی جائیں جن میں سرِ فہرست لغوی تبدیلیاں شامل ہیں.

یہاں میں "صرف مثال کے طور پر" اور بات واضح کرنے کے لیے وہ تبدیلیاں پیش کر رہا ہوں جو ایک ممکنہ سیارے کے دوہرے ستاروی نظام کے گرد گردش کرنے کی صورت میں ان آیات میں کرنی پڑیں گی جن میں سورج کا ذکر ہوا ہے، مزید

بر آں میں یہ فرض کر رہا ہوں کہ اس سیارے کا کم از کم ایک چاند ضرور ہے، چنانچہ کچھ مخصوص آیات کی صورتِ حال کچھ یوں ہو گی:

1-فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿سورہ ق آیت 39﴾

(توجو کچھ یہ کفار بکتے ہیں اس پر صبر کرو اور آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور اسکے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو۔)

اس آیت کو یوں کرنا پڑے گا:

فاصبر علی مایقولون و سبح بحمد ربک قبل طلوع الشمسین و قبل غروبہما

یا

قبل طلوع الشمس الاولی و غروب الثانیہ

یا

قبل طلوع الشمس الثانیہ و غروب الاولی

2-اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿سورہ رحمن آیت 5﴾

(سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔)

اس آیت کو یوں کرنا پڑے گا:

الشمسین والقمر یحسبون (ایک چاند کی صورت میں)

والشمسین والقمرین یحسبون (دو چاند ہونے کی صورت میں)

والشمسین والاقمار یحسبون (تین یا اس سے زیادہ چاند ہونے کی صورت میں

3-وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿سورہ نوح آیت 16﴾

(اور چاند کو ان میں روشن بنایا ہے اور سورج کو چراغ بنادیا ہے۔)

یہ آیت یوں ہو گی:

وجعل القمر فیہن نوراوجعل الشمسین سراجین (ایک چاند کی صورت میں)
وجعل القمرین فیہن نوراوجعل الشمسین سراجین (دوچاند ہونے کی صورت میں)
وجعل الاقمار فیہن نوراوجعل الشمسین سراجین (تین یااس سے زیادہ چاند ہونے کی صورت میں)

4-وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿سورہ القیامہ آیت 9﴾
(اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں۔)

یہ آیت یوں کرنی پڑے گی:

وجمع الشمسین والقمر (ایک چاند کی صورت میں)
وجمع الشمسین والقمرین (دوچانے ہونے کی صورت میں)
وجمع الشمسین والأقمار (تین یااس سے زیادہ چاند ہونے کی صورت میں)

5-اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿سورہ التکویر آیت 1﴾
(جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔)

یہ آیت یوں کرنی پڑے گی:

اذاالشمسین کورتا

6-حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿سورہ الکہف آیت 86﴾
(یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو اسے ایسا پایا کہ ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا ہے اور اس چشمے کے پاس ایک قوم دیکھی۔ ہم نے کہا ذوالقرنین! تم انکو خواہ تکلیف دو خواہ انکے بارے میں بھلائی اختیار کرو دونوں باتوں کی تمکو قدرت ہے۔)

اس آیت کی صورتِ حال کچھ یوں ہوگی:

حتی اذا بلغ مغرب الشمس الاولی وجدہا تغرب فی العین الحمئۃ الاولی ثم حتی اذا بلغ مغرب الشمس الثانیہ وجدہا تغرب فی العین الحمئۃ الثانیہ ووجد عندہا قوماً قلنا...(دہرے ستاروں کے گرد سیارے کا چکر اس سادہ تمثیل سے کہیں پیچیدہ ہے مگر یہاں صرف ایک مثال دینا مقصود ہے)

7- وَالشَّمۡسِ وَضُحٰہَا ۪ۙ﴿سورہ الشمس آیت 1﴾ (غور کریں کہ یہاں سورت کا نام سورہ "الشمسین" ہونا چاہیے)

یہ آیت یوں کرنی پڑے گی:

والشمسین وضحاہما

یہ تو تھی صرف سورج کی صورتِ حال جہاں تک چاند کا معاملہ ہے تو یہ بھی قرآن میں کئی لغوی اور عقائدی مسئلے کھڑے کردے گا، مثال کے طور پر جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ سیارے کا ایک سے زیادہ چاند ہو سکتا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چاند کا چکر زمین کے چاند کے چکر سے بڑا یا چھوٹا ہو جس سے رمضان کے روزوں اور مہینے کے دنوں کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا..

اس کے علاوہ سیارے کے سال کی لمبائی کا مسئلہ بھی ہے بہت ممکن ہے کہ اس کا سال زمینی سال سے لمبا ہو اور چاند کے بارہ دورانیوں سے زیادہ سے ناپا جاتا ہو یا سال کم ہو سکتا ہے اور چاند کے بارہ دورانیوں سے کم سے ناپا جاتا ہو دونوں صورتوں میں سورہ التوبہ کی آیت 36 قطعی طور پر غلط ہو جائے گی:

اِنَّ عِدَّۃَ الشُّہُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰہِ اثۡنَا عَشَرَ شَہۡرًا فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ مِنۡہَاۤ اَرۡبَعَۃٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ۬ۙ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِیۡہِنَّ اَنۡفُسَکُمۡ وَ قَاتِلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ کَآفَّۃً ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۶﴾

(اللہ کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں اس روز سے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اللہ کی کتاب میں سال کے بارہ مہینے لکھے ہوئے ہیں ان میں سے چار مہینے ادب کے ہیں یہی دین کا سیدھا رستہ ہے تو ان مہینوں میں قتال ناحق سے اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا۔ اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔)

سیارے کا موسم:

سیارے کا موسم اس کے مدار کی تفصیلات اور دونوں ستاروں (سورجوں) سے اس کی دوری کے حساب سے تبدیل ہو گا اور یہ چیز بھی کچھ آیات سے براہ راست متصادم ہو گی جیسے:

اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿سورہ قریش آیت 2﴾

(یعنی انکو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کی بنا پر۔)

حیاتیاتی ماحول:

قرآن بہت سارے پھلوں کا ذکر کرتا ہے جیسے تین، زیتون، انگور، کھجور وغیرہ لیکن اگر یہ سارے پھل ان سیاروں پر نہ ہوئے تو؟

ذہین مخلوق کی جسمانی ساخت:

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ ذہین مخلوق بالکل اسی طرح ہی ارتقاء کرے جس طرح کا ارتقاء زمین پر ہوا ہے چنانچہ یہ ناممکن نہیں کہ ان کے چار ہاتھ ہوں، دیکھنے کا مختلف نظام ہو یا منہ سونڈھ کی صورت ہو وغیرہ.. یہ صورتِ حال بھی بہت ساری قرآنی آیات سے متصادم ہو گی جو انسانی جسم کے اعضاء بیان کرتی ہیں جیسے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿سورہ البلد آیت 8 اور 9﴾

(بھلا ہم نے اسکو دو آنکھیں نہیں دیں؟—اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے۔)

ذہین مخلوق کی ذہانت کی سطح:

لازم نہیں ہے کہ زیرِ بحث ممکنہ سیارے کی ذہین مخلوق کی ذہنی سطح ہمارے برابر ہو، یہ زیادہ یا کم ہو سکتی ہے، قرآن کا منطقی اور کہانیاں بیان کرنے کا عمومی انداز انتہائی سادہ ہے جو کہ ظاہر ہے اس دور کے سادہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے تھا، یہ کسی طور پیچیدہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کا حامل نہیں ہے، مختلف سیاروں کی مختلف ذہین مخلوقات کی ذہنی سطح میں یقیناً بہت فرق ہو گا، یہ فرق اتنا زیادہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی ذہنی سطح کے حساب سے الگ سے کوئی دوسری کتاب اتارنے کی ضرورت پیش آجائے.

ستاروں کی عمر:

اگرچہ قرآن نہیں کہتا کہ قیامت دراصل سورج کی طبعی موت کے نتیجے میں برپا ہونے والی زمینی تباہی کی صورت آئے گی تاہم

بہت سارے اعجازیے قیامت کی یہی توجیہ بیان کرتے ہیں، اگر یہ مفروضہ مان لیا جائے کہ کسی آباد سیارے پر قیامت اس کے ستارے کی موت کی وجہ سے آئے گی – اور چونکہ ستارے حجم میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں – چنانچہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت کا کوئی ایک دن نہیں ہے بلکہ یہاں بہت ساری قیامتیں ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس وقت بہت سارے ایسے سیاروں پر واقعی قیامت آچکی ہے اور ان پر آباد لوگ اس وقت جنت یا جہنم میں جا آباد ہوئے ہیں.

قرآن میں مذکور شخصیات:

کیا اس سیارے پر ابو لہب اور اروی بنت حرب (حمالۃ الحطب یعنی ام جمیل) ہوگی؟ زید بن حارثہ ہوگا؟ محمد، موسی، عیسی اور مریم ہوگی؟ سلطنتِ روم ہوگی؟ ذوالقرنین ہوگا؟ آدم اور حوا کے قصہء تخلیق کا کیا؟ کیا اس سیارے کا اپنا آدم اور حوا، ہابیل اور قابیل ہوگا؟ کیا اس میں جن ہوں گے جو اس سیارے کے آسمان سے گزر کر خدا اور فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کریں گے اور انہیں شہابیے مار کر واپس بھگا دیا جائے گا جیسا کہ بقولِ قرآن ہمارے ہاں ہوتا ہے؟

قرآن میں مذکور مقامات:

قرآن بہت سارے مقامات کا ذکر کرتا ہے جیسے بدر، حنین، مکہ، یثرب، بیت المقدس، مصر، سیناء وغیرہ اسی طرح کچھ پہاڑوں کا ذکر بھی کرتا ہے جیسے احد، طور.. کچھ عمارتوں کا ذکر بھی ہے جیسے کعبہ، مسجد اقصی وغیرہ.. تو کیا اس سیارے پر یہ تمام مقامات، پہاڑ اور عمارتیں ہوں گی وہ بھی بالکل انہی ناموں سے؟

الغرض اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہر زمان و مکان میں اور کائنات کے ہر گوشے میں قرآنی متن ان تمام سیاروں پر لاگو ہو جائے جن پر کوئی ذہین مخلوق آباد ہے تو ہمیں لامتناہی خدائی طاقت سے ان پر یا تو کمزور شرائط لاگو کرنی ہوں گی یا مضبوط، کمزور شرائط لاگو کرنے کی صورت میں لازم ہے کہ ایسے تمام سیاروں کا کم از کم ایک سورج ہو جو زمینی سورج کی خصوصیات کا حامل ہو اور ایک چاند بھی ہو جو زمینی چاند کی خصوصیات کا حامل ہو، مزید برآں ان سیاروں کی طبیعی خصوصیات بالکل زمین کی خصوصیات جیسی ہوں جیسے سال کی لمبائی، زمین کے گرد چاند کا مدار، زمین کے محور کا جھکاؤ وغیرہ.. اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ ہر سیارے پر قرآن میں مذکور وہ تمام مقامات، عمارتیں اور شخصیات موجود ہوں اور انہی ناموں سے ہوں، اس کا اطلاق ان تمام اوصاف اور واقعات پر بھی ہوتا ہے جو قرآن میں مذکور ہیں جیسے وہ تمام جاندار موجود ہونے چاہئیں جنہیں ہر سیارے کے عرب جمال (اونٹھ) حمیر (گدھے) ہدہد، عنکبوت (مکڑی) نحل (شہد کی مکھی) اور نمل (چیونٹی) کہہ سکیں.. یا پھر مضبوط شرائط جیسے کہ ان تمام سیاروں کو قدری (کوانٹم) حد تک زمین کی بالکل کاربن کاپی ہونا چاہیے یعنی کہ ہر سیارے کے اتنے ہی ایٹم، الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران ہونے چاہئیں جتنے کے زمین کے ہیں.

دونوں صورتوں میں یہ لازم ہو جائے گا کہ ہر سیارے کا اپنا ایک ابو لہب ہو، اس کی اپنی حمالۃ الحطب ہو، اپنا محمد ہو، اپنی فاطمہ ہو، اپنا ابو جہل ہو اور اپنا ہی زید بن حارثہ ہو، اسی طرح لازم ہے کہ ہر سیارے کا اپنا ابو بکر ہو، اپنا احد ہو، اپنا جزیرہ نما عرب ہو، اپنا یثرب ہو، اور اس کے تمام اونٹھ، گدھے گھوڑے اور خچر بالکل زمین کے گدھوں گھوڑوں اور خچروں کے عین مطابق ہوں.. اسی طرح ان تمام سیاروں پر وہی تمام واقعات وقوع پذیر ہونے چاہئیں جو اب تک زمین پر ہوئے... ان شرائط میں یہ بھی شامل ہے کہ ان تمام سیاروں کے سورجوں کی کمیت اور عمر بھی زمین کے سورج کی عمر اور کمیت کے برابر ہو.

ان سیاروں اور ان کے ماحول پر کمزور شرائط کے اطلاق سے نئے سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے.. کیا قرآن بالترتیب تمام سیاروں پر اتارا جائے گا؟ (معاملات کو آسان کرنے کے لیے ہم اضافیت کی لاگو کردہ حدود و قیود پر بات نہیں کریں گے بلکہ اسلامیوں کے نہج پر چلتے ہوئے ان تمام پیچیدہ مسائل پر خدائی قدرت کا جھاڑو پھیر کر انہیں آسانی سے حل کر لیں گے) اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر ہر سیارے کا اپنا ایک جبریل ہونا چاہیے جو بروقت ہر سیارے پر موجود ہر محمد پر بروقت قرآن اتار سکے اور اگر صرف ایک جبریل ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہر سیارے پر قرآن کے اترنے کے وقت میں فرق ہے جس سے کہانی میں مزید ٹویسٹ آ جائے گا.

مضبوط شرائط کے اطلاق کی صورت میں سب سے پہلا سوال یہی اٹھے گا کہ ہزاروں یا لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے کے کاربن کاپی سیارے اور لوگ بنانے کا کیا فائدہ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا لٰعِبِیْنَ ﴿سورہ الدخان آیت 38﴾
(اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے اسکو کھیل کیلئے نہیں بنایا۔)

دوسرے سوال بھی یقیناً اٹھیں گے جیسے کیا ایک ہی شخص کی لاکھوں کاپیاں جنت میں جمع ہو سکیں گی؟

مذکورہ بالا تناظر میں مومنین کو تین میں سے ایک موقف اختیار کرنا ہو گا..

پہلا موقف یہ ہے کہ وہ کائنات میں قرآن کی مرکزیت سے چمٹے رہیں اور یہ موقف اختیار کریں کہ کائنات میں ذہین مخلوق صرف زمین پر ہی ہے اور اس کے علاوہ اور کسی سیارے پر قطعی نہیں ہو سکتی، تاہم اس صورت میں ان کا جدید علوم کے عمومی ٹرینڈ سے بہت بڑا تصادم ہو جائے گا جس سے وہ ہر ممکنہ طریقے سے چمٹے رہنے کی کوشش کرتے ہیں، مزید برآں کسی سیارے پر ذہین حیات کی دریافت کی صورت میں انہیں شدید خفت کا سامنا کرنا پڑے گا.

دوسرا ممکنہ موقف یہ ہوسکتا ہے کہ مومنین قرآن کی مرکزیت سے چمٹے رہنے کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ اختیار کریں کہ انہیں دوسرے سیاروں پر اس کی تبلیغ کرنی چاہیے، تاہم اس آپشن کے بھی اپنے مسائل ہیں، سب سے پہلا مسئلہ تو یہی ہے کہ کسی دوسرے سیارے کا رہائشی جس کی شکل وشباہت بھی ممکنہ طور پر انسان جیسی نہیں ہے اور اس تعریف میں وہ "انسان" ہی نہیں ہے وہ گزرے زمانوں میں کسی چوتھے سیارے پر آئے کسی انسانی نبی کی نبوت پر کیوں یقین کرے گا؟ (اس کی مت ماری گئی ہو تو الگ بات ہے) اس کے علاوہ اگر ہم مادی رکاوٹوں کو مدِ نظر رکھیں جس میں کائنات کا بے پناہ حجم اور انسان کی محدود عمر شامل ہے اور اسلام کے اپنے مسائل بھی پیشِ نظر رکھیں جن کی وجہ سے وہ محض کرہ ارض پر ہی اپنے دین کو پھیلانے میں ناکام رہے ہیں تو یہ آپشن ناممکن ہے.

مومنین کا تیسرا موقف جس کے بارے میں وہ شاید سوچنا بھی پسند نہ کریں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ یہ اعتراف کر لیں کہ وہ تمام تر آیات جو زمان ومکان، واقعات اور انسان سے متعلق ہیں کائناتی نہیں ہیں اور صرف زمین پر لاگو ہوتی ہیں اور یہ کہ ہر وہ سیارہ جس پر کوئی ذہین مخلوق موجود ہے کا اپنا الگ قرآن ہے، بات کو ذرا گھما پھرا کر اگر نتیجہ نکالا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہیں معتزلہ کے تخلیقِ قرآن کے موقف سے مشابہ موقف اختیار کرنا پڑے گا، اس موقف سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ زیادہ تر قرآن جس زمانے میں اترا اسی کے زمان ومکان میں محدود ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اجتہاد کرتے ہوئے زمان ومکان میں محدود قرآن کو الگ کریں اور اسے ترقی دیں اور آفاقی قرآن کو محدود قرآن سے الگ کرتے ہوئے اس پر بھی اجتہاد کی چھری چلائیں اور اس میں جو کچھ عقل اور منطق کے مطابق ہو اسے یاد کریں.

آخر میں ایک سوال.. کیا خدا کوئی ایسا کائناتی قرآن "نازل" کر سکتا ہے جو ہر زمان ومکان کے لیے کارآمد ہو؟

عقل مندوں کو سلام!

عبادت یا ریکارڈر!

کیا خدا نامی یہ ہستی ایک ہی کلام کے بار بار تکرار سے بور نہیں ہوتی؟!

دو لوگوں کے درمیان کسی بھی قسم کا مکالمہ دونوں کی ثقافتی سطح اور اندازِ فکر کی نمائندگی کرے گا مگر جب ہم عبادت کی بات کرتے ہیں جسے ممکنہ طور پر انسان اور خدا نامی اس ہستی کے درمیان مکالمے کی سی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تو یہ بھی اس امر کی عکاس ہے کہ یہ انسان اپنے خدا کو کس طرح دیکھتا ہے.

جب انسان روزانہ اپنے خدا کے حضور پیش ہو کر ایک ہی طریقے سے وہی کلام بار بار دہراتا ہے یہ سوچے بغیر کہ دوسری طرف کی وہ ہستی ایک ہی بات کی بار بار تکرار سے بور بھی ہوتی ہے یا نہیں تو اس طرح وہ گویا یہ یقین دلا رہا ہوتا ہے کہ اس کا خدا محض ایک مشین کی مانند ہے جو روزانہ مخصوص کلام کی تکرار سے ہی چارج ہوتا اور ردِ عمل ظاہر کرتا ہے کیونکہ ایک محبت کرنے والے حقیقی خدا کی حیثیت سے اسے ممکنہ طور پر سننا، بولنا، سمجھنا اور مکالمہ کرنا چاہیے چنانچہ عبادت مکالمے کا ایک ایسا ذریعہ ہونا چاہیے جس میں فریقین ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ان کے نقطہ ہائے نظر مزید قریب ہوں، اس صورت میں انسان کے خدا نامی اس ہستی کے ساتھ تعلقات درست نہج پر جاتے قرار دیے جاسکتے ہیں.

عبادت اگر انسان کو اس کے خدا کی سطح تک نہ لے جائے تو وہ یقیناً خدا کو اس کی سطح تک لے آئے گی، اور اگر یہ ان میں قربت پیدا نہ کر سکے تو پھر یہ محض کلام کی باطل تکرار ہے جو انسان کو ایک ٹیپ ریکارڈر میں بدل دے گی جو ایک ہی بات بار بار دہرائے چلا جاتا ہے.. ذرا سوچیے اس کی خدا کی کیا حالت ہوتی ہوگی جب وہ یہ ریکارڈر روزانہ کروڑہا بار کروڑہا لوگوں سے سنتا ہوگا.. کیا اسے دردِ شقیقہ نہیں ہو جاتا ہوگا؟

زندہ خدا وہ ہے جس کے ماننے والوں کی عبادت میں زندگی اور تازگی جھلکتی ہے، وہ خدا مردہ ہے جس کے ماننے والوں کی عبادت اسے اپنی ہی نظروں میں گرا کر رکھ دے.

مذاہب کی میتھالوجی

اگر آج کے مذاہب کا آپس میں موازنہ کیا جائے تو معلوم پڑے گا کہ ان کی بہت ساری صفات باہم مشترک اور ایک جیسی ہیں، اور کچھ نہیں تو اس سے انسان کے مزاج کا ایک معمولی سا تکوینی نقص ضرور ابھر کر سامنے آتا ہے جسے ارتقاء اور علوم کی طاقت ابھی تک ختم نہ کر سکی اور وہ ہے اطمینان اور یقین کی شدید خواہش.

تاریخ ایسے مذاہب سے بھری پڑی ہے جو مر کر ناپید ہو گئے کیونکہ ان کے ماننے والوں کا ان پر سے اعتقاد اٹھ گیا، جب مذہب مر کر ختم ہوتا ہے اور اسے کوئی ماننے والا نہیں رہتا تب یہ جدید مفہوم میں "میتھالوجی" بن جاتا ہے جیسے مشہور و معروف یونانی میتھالوجی جو اب صرف قصے کہانیوں اور قدیم خرافات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے جنہیں بچوں کو سلانے کی غرض سے نیند سے پہلے سنایا جاتا ہے.

ایسے ہی مذاہب میں جو اب محض افسانوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں قدیم مصری مذہب ہے جو فوت ہو کر ختم ہو چکا ہے، اسی قدیم مصری مذہب سے ملتا جلتا ایک قرطاجی مذہب بھی ہے جو تمام ہو چکا ہے، روم کا قدیم مذہب بھی قصہء پارینہ بن چکا ہے جبکہ قدیم طاوی مذہب تیزی سے ناپیدگی کی طرف گامزن ہے تاہم جو بات زیادہ تر عام لوگ نہیں جانتے وہ یہ ہے کہ آج بھی لوگوں کے درمیان رائج بیشتر خرافات جنہیں وہ خدا کی طرف سے بھیجی گئی مطلق حقیقت سمجھتے ہیں دراصل ناپید ہونے والے انہی پرانے مذاہب کی باقیات ہیں جن پر زمانے کے حساب سے کچھ ٹوٹے لگا انہیں خوشنما بنا دیا گیا ہے.

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ آخر یہ پرانے مذاہب ناپید ہو کر خرافات میں کیسے تبدیل ہو گئے؟ کیا اس لیے کہ یہ غیر حقیقی مذاہب تھے اور اب خدا نے حقیقی مذاہب نازل کر دیے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہے، یہ مذاہب اس لیے ناپید ہو گئے کیونکہ ان سے زیادہ طاقتور لوگوں کے مذہب نے ان پر قبضہ کر کے ان پر اپنی نئی فکر تھوپ دی مثال کے طور پر فرعونی مصر پر بازنطینی سلطنت نے قبضہ کر کے اپنا آرتھوڈکس عیسائی مذہب تھوپ دیا یا پھر اس لیے کہ پرانا مذہب تقلباتِ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکا جس کی وجہ سے اس کے ماننے والے اپنے آپ کو اپڈیٹ کرنے پر مجبور ہو گئے اور پھر وقت کے ساتھ وہ مذہب ناپید ہو گیا یا پھر اس لیے کہ نیا مذہب پرانے سے زیادہ طاقتور تھا، اس کی قریبی مثال ہسپانویوں کی ہے جب وہ اسلحے اور گھوڑوں سمیت جنوبی امریکہ پہنچے تو وہاں کے اصل شہریوں پر واضح ہو گیا کہ ہسپانویوں کا نیا خدا ان کے پرانے خداؤں سے زیادہ طاقتور ہے چنانچہ انہوں نے اپنا پرانا دین چھوڑ کر عیسائیت کو اپنا لیا.

انسانی دماغ کے پاس یقین کرنے، اعتقاد رکھنے اور ایمان کی بڑی صلاحیت ہے چاہے یہ عقیدے ہمارے آج کے زمانے کے حساب سے کتنے ہی بوسیدہ کیوں نہ ہوں کیونکہ وہ حقیقت میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہوتا ہے جو اسے بعد از مرگ بھی زندگی دے سکے اور اس مراد کے لیے چاہے اسے اپنے آپ کو کسی فریب سے ہی کیوں نہ قائل کرنا پڑے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں آج بھی ایسے ہزاروں عقیدے موجود ہیں جو ایک دوسرے سے نہ صرف متصادم ہیں بلکہ ایک دوسرے کا اعتراف تک نہیں کرتے... غور طلب بات یہ ہے ماضی کے ہزاروں مذاہب کا زندگی کے آغاز کے حوالے سے اپنے اپنے الگ نظریات تھے اور ہر فریق کو اپنے نظریے کی درستگی کا ایمان کی حد تک یقین تھا چنانچہ کسی کا خیال تھا کہ ہم کینگرو کی نسل سے ہیں جیسا کہ اسٹریلیا کے قدیم باشندوں کا عقیدہ تھا یا ہم روحوں کی Reincarnation کا نتیجہ ہیں کہ آج کی بلی مر کر ہاتھی کی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ آدم اور حواء ہی اصل ہیں جبکہ اصل میں ان میں سے کسی بھی تاویل کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے،

کچھ عرصہ قبل میں اپنے ایک ذرا آزاد خیال دوست سے گفتگو کر رہا تھا، اس نے بتایا کہ اصل میں نظریہ ارتقاء قرآن سے متصادم

نہیں ہے!!! یہ یقیناً ایک مذہب کی ناپیدگی کی علامت ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی زمانے سے ہم آہنگی کی کوشش میں مذہب میں تبدیلی کرنا.

جب انسان کی عقل یہ سمجھنے لگے کہ صرف اسی کے پاس ہی مطلق حقیقت ہے تو یقیناً اسے باقی لوگ غلطی پر نظر آئیں گے یہی وجہ ہے کہ سنی اور شیعہ کی بحث کبھی ختم نہیں ہوتی کیونکہ ہر کوئی اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے جبکہ عیسائی ان دونوں پر ہنس رہا ہوتا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ دونوں غلطی پر اور وہ حق پر ہے جبکہ بہائی ان تینوں کو دیکھ کر ان کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنستا ہوگا اور پتہ نہیں ہندو کیا سوچتا ہوگا..؟!

مذاہب اندھیری جگہوں پر ہی پنپتے ہیں جہاں جہالت ناچ رہی ہو تاہم انٹرنیٹ اور جدید میڈیا کی آمد سے ان کا پھیلاؤ کسی حد تک رک گیا ہے اور جلد ہی مذہب کے پیڑ کا آخری پتہ بھی گر جائے گا جس نے مذہبی فکر کی شرمگاہ کو چھپا رکھا ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حالیہ مذاہب کی زیادہ سے زیادہ بقیہ عمر دو سو سال سے زیادہ نہیں تب آج کے بڑے مذاہب کا انجام بھی اپنے سابقہ مذاہب سے مختلف نہیں ہوگا کہ تاریخ کسی افسانے پر رحم نہیں کرتی...

انصاف کا فسانہ

جب ابتدائی انسان نے کچھ شعور پکڑا تو اپنے تجربے سے اسے یہ معلوم ہوا کہ طاقتور ہی ہمیشہ زیادہ تر چیزوں پر قابض ہو جاتا ہے اور اس طرح کمزوروں پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے، اسی صورتحال کا سامنا جاگیرداروں اور تاجروں کی صورت میں بھی رہا جنہوں نے اقلیت ہونے کے باوجود صرف طاقت کے بل بر اقلیت پر مظالم ڈھائے اور ان کا استحصال کیا، اس صورتحال کے حتمی نتیجے کے طور پر انسان نے "انصاف" کا مفہوم ایجاد کیا جو ہر انسانی معاشرے کے تمام افراد میں مساوات کا مظہر تھا، مگر یہ خوبصورت نظریاتی مفہوم نظریاتی ہی رہا اور حقیقی دنیا میں اس کا اطلاق انتہائی مشکل ثابت ہوا، مگر انسان پھر بھی اس کا مشتاق رہا، یہی وجہ ہے کہ جب انسان نے آسمانی خداؤں کا نظام ایجاد کیا تو کچھ خداؤں کو انصاف کی صفت بھی مرحمت فرمادی تاکہ وہ اسے طبعی آفتوں، برے انسانوں کے شر اور برائی کے خدا سے نجات دلا سکے، پھر اس نے افسانے گھڑے جن میں اچھائی کا خدا برائی کے خدا سے لڑ کر مظلوم انسانوں کی نصرت کرتا اور انہیں بچاتا ہے، مگر انصاف کا مفہوم پھر بھی افسانوں اور قصے کہانیوں تک ہی سمٹا رہا اور انسانی معاشروں میں اس کا اطلاق نہ ہو سکا.

پھر اتفاق سے وہ مشہورِ زمانہ تینوں توحیدی مذاہب کہیں سے نمودار ہوئے اور دعوی کیا کہ خدا ہی انصاف ہے اور اس کے انصاف جیسا کوئی انصاف نہیں ہے، مگر ان مذاہب نے جب یہ فرمایا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت میں بنایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے تب وہ اپنی بات میں ہی تضاد کا شکار ہوگئے، کیونکہ اگر انسان خدا کی صورت میں ہی بنایا گیا ہے جو عین انصاف ہے اور اس کی روح خدا کی روح کا ہی حصہ ہے تو پھر دنیا میں ظلم اور برائی کے انبار کہاں سے لگ گئے؟ کئی فلسفیوں نے اس تضاد کو حل کرنے کی بھرپور کوششیں کی مگر ناکام رہے، چنانچہ صورتحال سے تنگ آکر بیل Bayle نے کہا کہ:

1- یا تو خدا دنیا سے ظلم اور برائی کا خاتمہ چاہتا ہے مگر کر نہیں سکتا

2- یا پھر وہ ایسا کر سکتا ہے مگر کرنا نہیں چاہتا

3- یا وہ نا چاہتا ہے اور نا ہی کر سکتا ہے

4- یا تو چاہتا ہے اور قادر ہے

اگر پہلے مفروضے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو خدا کمزور ثابت ہوگا اور خدا ہونے کے لائق نہیں رہے گا، اگر دوسرے مفروضے کو درست تسلیم کیا جائے تو خدا حاسد قرار پائے گا جو انسان کی زندگی پر حسد کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پر اپنے ظلم جاری وساری رکھے اور اسے سکھ کا سانس نہ لینے دے، اگر تیسرے مفروضے کو تسلیم کر لیا جائے تو خدا کمزور ہوگا اور خدا ہونے کے قابل نہیں رہے گا، اور اگر آخری یعنی چوتھا مفروضہ درست ہے یا درست تسلیم کر لیا جائے یعنی خدا دنیا سے ظلم وبرائی کا خاتمہ کر سکتا ہے اور ختم کرنا بھی چاہتا ہے تو پھر دنیا میں ظلم وبرائی کی موجودگی ناممکن ہے.. مگر چونکہ دنیا میں ظلم وبرائی موجود ہے چنانچہ یہ امر یقینی ہے کہ یہ ظلم خدا کی روح سے ہی آرہا ہے جو اس نے انسان میں پھونکی جس سے وہ ظالم بن گیا، سوزن نیمن (Susan Neiman) اپنی کتاب ایول ان ماڈرن تھاوٹ (Evil in Modern Thought) میں رقمطراز ہیں کہ: "شاید کائنات کی خوبصورتی اور اس کے قوانین کا نظم وضبط خالق کی حکمت کے گواہ ہوں، مگر مخلوق جو خالق کی صورت میں بنائی گئی اس حکمت کی عکاسی نہیں کرتی، چنانچہ اگر ہم نسلِ انسانی کی تاریخ اور اس کے مظالم پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خالق کی حکمت اور خوبصورتی کی صفات ایسی صفات ہیں جن کا دفاع نہیں کیا جاسکتا".

اس ضمن میں اگر اسلامی خدا کی بات کی جائے تو وہ کہتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (سورہ الذاریات آیت 56)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

یعنی انسان کو تخلیق کرنے کی پہلی اور آخری وجہ محض اس کی عبادت ہے اور جو اس کی عبادت نہیں کرے گا وہ گویا اپنے وجود کی وجہ سے انحراف کا مرتکب ہو گا اور خدا اسے سخت ترین سزا دے گا، اگر خدا انصاف پسند ہوتا تو انسان کو اپنی عبادت کے لیے پہلے سے ہی پروگرام شدہ بناتا اگر اسے تخلیق کرنے کا مقصد محض اپنی عبادت ہی کروانا تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس قرآن میں ایسی بہت ساری آیات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگ جنہیں خدا نے تخلیق کیا ہے اس کی عبادت نہیں کرتے:

1-اَفَمَن ◌کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّن ◌رَّبِّہٖ وَیَت ◌لُو ◌ہُ شَاہِدٌ مِّن ◌ہُ وَمِن ◌قَب ◌لِہٖ کِتٰبُ مُو ◌سٰۤی اِمَامًا وَّرَح ◌مَۃً ؕ◌ اُولٰٓئِکَ یُؤ ◌مِنُو ◌نَ بِہٖ ؕ◌ وَمَن ◌یَّک ◌فُر ◌بِہٖ مِنَ ال ◌اَح ◌زَابِ فَالنَّارُ مَو ◌عِدُہٗ ۚ◌ فَلَا تَکُ فِی ◌مِر ◌یَۃٍ مِّن ◌ہُ ☆ اِنَّہُ ال ◌حَقُّ مِن ◌رَّبِّکَ وَلٰکِنَّ اَک ◌ثَرَ النَّاسِ لَا یُؤ ◌مِنُو ◌نَ (سورہ ہود آیت 17)

بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن رکھتے ہوں اور انکے ساتھ ایک آسمانی گواہ بھی اسکی جانب سے ہو اور اس سے پہلے موسٰی کی کتاب ہو جو پیشوا اور رحمت ہے تو کیا وہ قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے؟ یہی لوگ تو اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اور فرقوں میں سے اس سے منکر ہو تو اس کا ٹھکانہ آگ ہے تو تم اس قرآن سے شک میں نہ ہونا۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

2-وَاتَّبَع ◌تُ مِلَّۃَ اٰبَآءِی ◌ۤ اِب ◌رٰہِی ◌مَ وَاِس ◌حٰقَ وَیَع ◌قُو ◌بَ ؕ◌ مَا کَانَ لَنَاۤ اَن ◌نُّش ◌رِکَ بِاللّٰہِ مِن ◌شَی ◌ءٍ ؕ◌ ذٰلِکَ مِن ◌فَض ◌لِ اللّٰہِ عَلَی ◌نَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَک ◌ثَرَ النَّاسِ لَا یَش ◌کُرُو ◌نَ (سورہ یوسف آیت 38)

اور میں اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے مذہب پر چلتا ہوں۔ ہمیں شایاں نہیں ہے کہ کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک بنائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور لوگوں پر بھی۔ لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

3-وَمَاۤ اَک ◌ثَرُ النَّاسِ وَلَو ◌حَرَص ◌تَ بِمُؤ ◌مِنِی ◌نَ (سورہ یوسف آیت 103)

اور بہت سے آدمی گو تم کتنی ہی خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

4-الٓمّٓرٰ ◌تِل ◌کَ اٰیٰتُ ال ◌کِتٰبِ ؕ◌ وَالَّذِی ◌ۤ اُن ◌زِلَ اِلَی ◌کَ مِن ◌رَّبِّکَ ال ◌حَقُّ وَلٰکِنَّ اَک ◌ثَرَ النَّاسِ لَا یُؤ ◌مِنُو ◌نَ (سورہ الرعد آیت 1)

المرا۔ اے نبی یہ کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں۔ اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

5-وَلَقَدۡ صَرَّفۡنٰہُ بَیۡنَہُمۡ لِیَذَّکَّرُوۡا ۫ۖ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوۡرًا (سورہ الفرقان آیت 50)

6-وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَہُمۡ اَکۡثَرُ الۡاَوَّلِیۡنَ (سورہ الصافات آیت 71)

اور ان سے پیشتر بہت سے پہلے لوگ بھی گمراہ ہو گئے تھے۔

7-اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (سورہ غافر آیت 59)

قیامت تو آنے والی ہے اسکے آنے میں کچھ شک نہیں۔ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔

مزید یہ کہ خدا نے لوگوں کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جہنم کو ان سے اور جنوں سے بھی بھر دے گا:

1-قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡہَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنۡکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (سورہ الاعراف آیت 18)

اللہ نے فرمایا نکل جا یہاں سے پاجی۔ مردود جو لوگ ان میں سے تیری پیروی کریں گے میں ان کو اور تجھ کو جہنم میں ڈال کر تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

2-وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلَا یَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِیۡنَ ﴿118﴾ۙ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَلِذٰلِکَ خَلَقَہُمۡ ؕ وَتَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿119﴾ (سورہ ہود)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا اور وہ برابر اختلاف کرتے رہیں گے۔ مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم فرمائے اور اسی لئے اس نے انکو پیدا کیا ہے اور تمہارے پروردگار کا قول پورا ہو گیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

3-وَلَوۡ شِئۡنَا لَاٰتَیۡنَا کُلَّ نَفۡسٍ ہُدٰىہَا وَلٰکِنۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ مِنِّیۡ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ (سورہ السجدہ آیت 13)

اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔ لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

4-لَامۡلَ‌ـ ٴ نَّ جَہَنَّمَ مِنۡکَ وَمِمَّنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (سورہ ص آیت 85)
کہ میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

یہاں خدا کہتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی ملت پر پیدا کرتا مگر اس نے انہیں مختلف پیدا کیا تا کہ "میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا" کا جواز پیدا کیا جا سکے.. معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ "وہ برابر اختلاف کرتے رہیں" جیسا کہ سورہ ہود کی آیات 118 اور 119 میں کہا گیا ہے چنانچہ وجہ تخلیق یہی ہے حالانکہ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ اس نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے بنایا ہے اور اب کہتا کہ انہیں اس لیے بنایا ہے تا کہ وہ آپس میں اختلاف کر سکیں، چاہے ہم وجہ تخلیق کے اس تضاد سے صرف نظر کر بھی لیں، کیا انصاف پسند خدا کو یہ زیب دیتا ہے جو سارے انسانوں کو ایک امت وملت پر پیدا کر کے ان کے درمیان اختلاف کے امکانات ختم کر سکتا تھا، انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور کئی مذاہب پر محض اس لیے پیدا کرے تا کہ انہیں جہنم میں بھرنے کا اپنا کیا ہوا وعدہ وفا کر سکے؟ اور اگر خدا انصاف پسند ہوتا تو کیا وہ اپنی نافرمانی کرنے والے ابلیس کو قیامت تک اپنے بندوں کو بہکانے کے لیے کھلا چھوڑ دیتا؟ کیا یہ انصاف ہے کہ جنہیں محض اپنی عبادت کے لیے بنایا انہیں بہکانے کے لیے ابلیس کو زندہ چھوڑ دیا جائے؟ اور کیا یہ انصاف ہے کہ لوگوں کو محض ایک ہی وجہ یعنی اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا جائے اور عبادت نہ کرنے پر انہیں بھون ڈالا جائے؟ ان لوگوں کا کیا جن سے اگر پوچھا جاتا تو وہ پیدا ہونا ہی پسند نہ کرتے؟ خدا انہیں پیدا کرنے سے پہلے انہیں یہ اختیار دے سکتا تھا کیونکہ اس نے آدم کی پیٹھ سے اس کی ساری اولاد کو نکال کر ان سے قسم لی اور پھر انہیں آدم کی پیٹھ میں واپس کر دیا.

اور کیا یہ انصاف ہے کہ خدا لوگوں کو بہکائے اور جب وہ بہک جائیں انہیں سزا دے جیسا کہ سورہ انعام کی آیت 125 میں کہا کہ:

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ
تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اس طرح اللہ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ خدا مجرموں کی طرح مکر بھی کرتا ہے (وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ– اللہ سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے– سورہ انفال آیت 30) بلکہ اس کا مکر مجرموں کے مکر سے کہیں بڑھ کر ہے، وہ اپنی آیات پر یقین نہ کرنے والوں کو گھیر کر

غلطیاں کرواتا ہے پھر انہیں ان غلطیوں کی سزا دیتا ہے (وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَنَسۡتَدۡرِجُہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ– اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا انکو ہم بتدریج اس طرح پکڑیں گے کہ انکو معلوم ہی نہیں ہو گا۔ سورہ الاعراف آیت 182). استدراج یعنی Baiting کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے اور اسے ہر انسانی معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کو ایسے جرائم کرنے کی شہہ دیتا ہے جو کہ اگر کوئی اسے شہہ نہ دلاتا تو وہ کبھی نہ کرتا، کیا انسانی قوانین خدا کے قوانین سے زیادہ باانصاف ہیں؟

اور کیا انصاف پسند خدا کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کی سزا بے گناہوں کو دے؟ لیکن قوم لوط، عاد اور ثمود بلکہ کئی دیگر قوموں کے ساتھ اس نے یہی کیا جب پورے کے پورے گاؤں اور شہر بمع مکینوں کے محض اس لیے نیست ونابود کر دیے کیونکہ ان میں سے کسی اقلیت نے فحش کام کیے تھے یا صالح کی اونٹنی کے پیر کاٹ دیے تھے؟ ان معاشروں میں بچوں کا کیا قصور تھا؟ کیا انہوں نے یہ منکر کیا تھا یا اونٹنی کے پیر کاٹنے میں مدد دی تھی؟ اور چاہے انہوں نے حصہ لیا بھی ہو کیا دنیا کے تمام قوانین یہ نہیں کہتے کہ بالغ ہونے تک بچے اپنے قول وفعل کے ذمہ دار نہیں ہیں؟

اب ہم جانتے ہیں کہ طبعی آفتیں جیسے زلزلے طوفان وغیرہ خدا کے انتقام کا ذریعہ نہیں ہوسکتے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کیوں اور کیسے ہوتے ہیں، یہ ایسے صحرائی یا پہاڑی علاقوں میں بھی آسکتے ہیں جہاں ایسا کوئی بھی نہیں رہتا جنہیں خدا سزا دینا چاہتا ہو!! کیا اس سے خدا کی ایمان داری اور انصاف مشکوک نہیں ہو جاتا جو کہتا ہے کہ اس نے ان طبعی آفتوں کے ذریعے شہروں کے شہر تباہ کر دیے؟ نومبر 1755 میں سپین کے شہر بر سیلونا میں آنے والے زلزلے کے بعد یہ نقطہ یورپی فلسفیوں کے ہاں بھی زیرِ بحث رہا، زلزلے کے بعد ایک سونامی آیا اور ہزاروں انسان، جانور، گھر سب تباہ وبرباد ہوگئے، اس وقت عیسائی پادریوں کا فرمان تھا کہ زلزلہ خدا کی طرف سے اس شہر کے مکینوں پر عذاب تھا کیونکہ انہوں نے تفتیشی عدالتیں قائم کر کے عیسائیت کی ساکھ کو نقصان پہنچایا، مگر وہ یہ بتانے سے قاصر رہے کہ زلزلے کی وجہ سے کئی گرجے تو تباہ ہوگئے مگر شہر میں قائم ایک فاشی کا اڈہ کیونکر محفوظ رہا؟!.

جرمن فلاسفر لیبنز Gottfried Leibniz نے شر کو تین قسموں میں تقسیم کیا جن میں ایک طبعی شر Natural evil ہے جو ان تکالیف پر مشتمل ہے جو انسانوں کو اپنی زندگی میں درپیش ہوتے ہیں، دوسری قسم اخلاقی شر Moral evil ہے جو ان جرائم پر مشتمل ہے جو انسان سے سرزرد ہوتے ہیں جن کی سزا طبعی شر ہوتا ہے، اور تیسری قسم غیبی یا مابعد الطبیعاتی شر Metaphysical evil ہے جو کہ مادہ کی فرسودگی ہے اور مادے کی اسی فرسودگی کی وجہ سے زلزلے اور دیگر طبعی آفتیں آتی ہیں چنانچہ ان کی وجہ سے خدا کو الزام نہیں دینا چاہیے، اگر اس بیان کو تسلیم کرلیا جائے کہ اخلاقی شر وہ جرائم ہیں جن کا ہم

ارتکاب کرتے ہیں تو کیا یہ انصاف ہے کہ خدا ان جرائم کی پاداش میں انسان کو دنیا میں طبعی آفتوں کی صورت میں سزا دے پھر آخرت میں انہی جرائم کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم برد کر دے اور جب بھی ان کی چمڑی جل کر خاکستر ہو جائے اسے نئی چمڑی سے بدل دے؟

اصولی طور پر سزا جرم کی مناسبت سے دی جانی چاہیے یا جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ Punishment must befit the crime اگر کوئی شخص 65 سال جیتا ہے جس میں کہ پندرہ سال بچپنے کی عمر ہے جس میں وہ مکلف نہیں ہے تو کیا پچاس سال خدا کی نافرمانی کرنے پر ہمیشہ ہمیشہ کی سزا انصاف کے عین مطابق ہے؟ کیا یہ سزا جرم سے راست متناسب ہے؟ پچاس سال کی نافرمانی پر خدا اسے پچاس سال کی سزا کیوں نہیں دیتا؟

بعض جرائم جن کی سزا انسان کو ازل تک ملتی رہے گی متعین ہی نہیں ہیں مثلاً قرآن میں ملتا ہے کہ:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ
یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْہِمْ وَاَرْجُلُہُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمْ
خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (سورہ المائدہ آیت 33)

جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ بری طرح قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے غائب کر دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں انکی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار ہے۔

یہاں جرم کا کوئی تعین نہیں ہے، انسان اللہ سے کیسے لڑ سکتا ہے؟ اور یہ فساد کون سا ہے؟ چاہے فقہاء فساد کی نوعیت کا تعین بھی کر لیں تب بھی سزا جرم کی نوعیت کے حساب سے متعین نہیں ہے، بعض کو بری طرح قتل کیا جا سکتا ہے، یا سولی پر چڑھایا جا سکتا ہے یا ہاتھ پاؤں کاٹے جا سکتے ہیں یا ملک بدر بھی کیے جا سکتے ہیں، اب ملک بدر ہونے والے کو قتل کیے جانے والے یا ہاتھ پاؤں کاٹے جانے والے سے کم سزا ملی اگرچہ جرم ایک ہی ہے یعنی خدا سے لڑائی یا زمین پر فساد.. اسی پر بس نہیں.. یہ سب تو محض دنیا میں ہے آخرت میں مزید ایک بہت بڑا بھاری عذاب ان کا منتظر ہے.. کیا ایک ہی جرم پر دو دفعہ سزا دینا انصاف کے عین مطابق ہے؟

سزا کے حوالے سے اگر احادیث سے رجوع کیا جائے تو وہ کچھ ملتا ہے کہ جسے پڑھ کر سر کے بال بھری جوانی میں ہی سفید ہو جائیں:

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ سے گذرے (جہاں قبریں تھیں) تو (دو قبر والوں کے بارے میں) فرمایا (اِنَّہُمَا لَیُعَذَّبَانِ ومایُعَذَّبَانِ مِن کَبِیرٍ اَمَّا اَحَدُہُمَا فَکَانَ یَسعَی بِالنَّمِیمَۃِ وَاَمَّا اَحَدُہُمَا فَکَانَ لَایَستَتِرُ من بَولِہِ) (اِن دونوں کو قبر میں عذاب ہو رہاہے اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں ہو رہاتو اِن میں ایک تو چغلی کیا کرتا تھا اور دوسرا خود کو اپنے پیشاب (کی چھینٹوں) سے بچایا نہیں کرتا تھا)

(صحیح البُخاری / حدیث ۱۲۹۵ / کتاب الجنائز / باب ۸۰، صحیح مسلم / حدیث ۲۹۲ / کتاب الطہارہ / باب ۳۴

کیاخود کو پیشاب کی چھینٹوں سے نہ بچانے جیسے معمولی جرم کے لیے- اگر یہ واقعی جرم ہے- قبر میں ہمیشہ کے لیے ایسی دردناک سزادینا کہ اگلے کی چیخیں تک قبر سے باہر آرہی ہوں، انصاف ہے؟ کیاایسی احادیث سے خدا کے انصاف پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے جس نے فضول قسم کی باتوں کے لیے دردناک ترین سزائیں متعین کرر کھی ہیں؟

اور اگر احادیث میں بچوں کے انجام کے بارے دیکھا جائے تو تعجب خیز مواد ملتا ہے مثلاً: حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عقبہ ابن معیط کو مارڈالنے کا ارادہ کیاتو (اس نے) کہا کہ (میرے بچوں کو کون پالے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آگ"۔ (ابوداوٗد)، سیوطی کی الحاوی للفتاوی میں ہے کہ: رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزِ قیامت بغیر سر کے بچوں کو لایا جائے گا تو اللہ تعالی کہیں گے: تم کون ہو، تو وہ کہیں گے: ہم مظلوم ہیں، اللہ تعالی کہیں گے: تم پر کس نے ظلم کیاہے، وہ کہیں گے: ہمارے آباء مردوں سے ہمبستر ہوتے تھے اور ان میں اپنی منی خارج کرتے تھے، اللہ تعالی کہیں گے: انہیں آگ میں لے جاؤ اور ان کے ماتھے پر لکھ دو اللہ کی رحمت سے مایوس.

جو خدا کسی بچے کو محض اس لیے جہنم برد کر دیتا ہو کہ اس کے باپ نے بدر میں نبی سے جنگ کی تھی، اور جو خدا بچوں کے سر کاٹ کر انہیں اپنی رحمت سے مایوس کر کے محض اس لیے جہنم رسید کر دیتا ہو کیونکہ ان کے آباء نے مردوں سے لواطت کی اور اپنی منی ان میں خارج کی، ایسا خدا انصاف کے مفہوم کے عین مطابق منصف کہلائے گا؟

اس میں شک نہیں کہ اسلامی خدا جسے ایک مرد کی صورت میں پیش کیا گیاہے جس کے دو ہاتھ پیر ہیں اور جو اپنے عرش پر بھی بیٹھتا ہے جسے آٹھ فرشتوں نے اٹھار کھا ہے کا انصاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اور اگر کوئی مسلمان یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کا خدا عادل و منصف ہے تو پھر یہ یقیناً ایک ایسا خدائی انصاف ہو گا جسے ہم نہیں جانتے.

انہی وجوہات کی بناء پر بعض فلسفیوں نے جیسے ہیگل نے خدا کی موت کا اعلان کر دیا جبکہ کچھ دوسروں فلسفیوں نے جیسے روسو نے کہا کہ خدا رحیم ہے مگر ہمیں اس کی اور اس کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے، فریڈریک اینگلز نے کہا کہ: "نسلِ انسانی تب تک آزاد نہیں ہو سکتی جب تک وہ خدا کو دیے ہوئے اپنے اختیارات واپس نہیں لے لیتی" چنانچہ خدائی انصاف ہمیشہ افسانہ ہی رہے گا کیونکہ خدا انسان ہے اور انسان اب تک اپنی زندگی میں انصاف قائم نہیں کر سکا ہے.

حدیث کی مصداقیت

اہلِ سنت کے اسلام میں صحیح بخاری قرآن کے بعد سب سے زیادہ درست ترین کتاب مانی جاتی ہے اور حدیث کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے، بخاری 194 ہجری کو پیدا ہوئے تھے جبکہ احادیث کی تدوین انہوں نے 16 سال کی عمر میں شروع کی تھی یعنی کوئی 210 ہجری کو، اور 256 ہجری کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تاہم کوچ کرنے سے پہلے انہوں نے کوئی چھ لاکھ احادیث جمع کیں جن میں سے مکرر سمیت محض 7397 احادیث کو صحیح کا رتبہ بخشا!! اتنی چھان پھٹک کے باوجود پھر بھی اس سنتِ صحیحہ میں عجیب وغریب احادیث ملتی ہیں جیسے "محمد ﷺ کی تھوک کو منہ پر مل لینا" (1) چاند کا شق ہو جانا (2) اونٹھ کا پیشاب پینا (3) عورت کا بڑوں کو دودھ پلانا (4) جس کی وجہ سے فقہاء آج تک ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں... کوئی کہتا ہے کہ عورت کو اپنا دودھ گلاس میں ڈال کر دینا چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ مرد کو اس کے پستان سے منہ لگانا چاہیے تو کوئی اسے محض حضرت سالم کے لیے مخصوص معاملہ قرار دیتا ہے.. مزید بر آں اس "صحیح" میں ایک ہی حکم کے لیے کئی متضاد احادیث موجود ہیں جو اب تک جنگ وجدل کا باعث بنی ہوئی ہیں.

سوال یہ ہے کہ کیا دو سو سال بعد محمد ﷺ کے بارے یا ان سے منسوب باتیں درست ہو سکتی ہیں؟؟ خاص طور سے جبکہ انہیں نقل کرنے والے لوگ جنہیں راوی کہا جاتا ہے عام انسان ہی تھے چنانچہ بھولنا، مختلف باتوں کا گڈمڈ ہونا، کسی بات کا اضافہ ہو جانا، اپنی مرضی کی بات کہنا یا سیاسی مفاد کی خاطر کوئی بات شامل کرنا یا گھڑنا سب ممکن ہے.

اسی طرح یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ احادیث کا انتخاب اور ان کی تدوین کس طرح کی گئی؟ کہا جاتا ہے کہ بخاری نے ان احادیث کو سند کی درستگی کی بنیاد پر منتخب کیا جسے عنعنہ کہا جاتا ہے یعنی فلان نے علان سے اور علان نے خلکان سے اور خلکان نے جرمان سے... یوں ایک سے دوسرے جن حضرات کے نام گنوا کر اصل کہنے والے تک پہنچا جاتا ہے یعنی محمد ﷺ، مطلب یہ ہے کہ سند حدیث کے راویوں کا ایک سلسلہ ہے جو کہ بخاری ودیگر کے ہاں حدیث کا ستون ہے، اگر کوئی ستون گر جائے تو حدیث

بھی ساتھ میں زمیں بوس ہو جاتی ہے، اور اگر سند درست ہو تو اس سے قطع نظر کہ حدیث کا مضمون کیا ہے حدیث کو ہر صورت قبول کر لیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے بخاری و دیگر احادیث کی کتابوں میں عجیب و غریب بلکہ بعض اوقات تباہ کن احادیث ملتی ہیں.

یہ بھی فرمایا جاتا ہے کہ بخاری کی کچھ احادیث محض معنی کے حساب سے مروی ہیں یعنی بخاری نے ان احادیث کو ان الفاظ میں پیش نہیں کیا جیسا کہ انہوں نے انہیں نقل کرنے والوں سے سنا تھا، اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ: "کوئی حدیث بصرہ میں سنی اور شام میں لکھی، کوئی حدیث شام میں سنی اور مصر میں لکھی" بلکہ اعلام النبلاء میں تو یہ بات کچھ یوں بیان ہے: "احید بن ابی جعفر والی بخاری نے کہا: محمد بن اسماعیل نے ایک دن کہا: کوئی حدیث بصرہ میں سنی اور شام میں لکھی، اور کوئی حدیث شام میں سنی اور مصر میں لکھی. میں نے ان سے کہا: اے ابا عبد اللہ کیا اسی کمال کے ساتھ؟ کہا: وہ خاموش ہو گئے" (5).

تاہم معمولی سی جانچ سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بخاری و دیگر کی احادیث میں کوئی سچائی نہیں ہے.. کیسے؟

1- اس میں شک نہیں کہ کوئی خبر اگر راویوں کے درمیان طویل عرصے تک گردش کرتی رہے تو اس میں تبدیلی آ جاتی ہے، علم الاعلام میں اسے "خبر کی تحریف" کہا جاتا ہے اور اس کی جانچ کے لیے "سرگوشی کا کھیل" کھیلا جاتا ہے جس میں پہلا شخص کوئی جملہ ایجاد کر کے دوسرے کو سرگوشی میں بتاتا ہے اور دوسرا تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو اور اسی طرح یہ کھیل چلتا رہتا ہے حتی کہ وہ جملہ گھوم پھر کر واپس پہلے شخص کے پاس آتا ہے تب سب پر اصل جملے میں تحریف کا انکشاف ہوتا ہے، اس تحریف کی عام مثال ذرائع ابلاغ ہیں جہاں ایک ہی خبر کو مختلف اخبارات اور چینل اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ اصل خبر بیچ میں ہی کہیں گم ہو جاتی ہے، اور عام آدمی کو پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ اصل خبر یا بیان دراصل تھا کیا؟

2- محمد ﷺ سے احادیث روایت کرنے والے سب سے بڑے راوی کون ہیں؟ یہ ابو ہریرہ اور عبد اللہ بن عباس ہیں، ابو ہریرہ تو محمد ﷺ سے احادیث کی روایت میں سب پر سبقت لے گئے اور کوئی 5374 احادیث روایت کیں، حالانکہ وہ محمد ﷺ کے ساتھ محض تین سال رہے!! جبکہ عبد اللہ بن عباس نے محمد ﷺ سے کوئی 1660 احادیث روایت کیں حالانکہ محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر محض 13 سال تھی!! قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک کی محمد ﷺ سے رفاقت محض 3 سال رہی جبکہ دوسرا محمد ﷺ کی وفات کے وقت محض بچہ تھا تو کیا ان دونوں میں اتنی قدرت تھی کہ وہ ایک طویل عرصے تک اتنا سارا ڈیٹا اپنے دماغ میں لے کر گھومتے رہیں اور محمد ﷺ کی وفات کے بعد اسے محض یادداشت پر انحصار کرتے ہوئے "ری سٹور" کر سکیں؟؟

جدید علمی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی یادداشت میں معلومات کی محفوظگی اور ان کی بحالی نامکمل ہوتی ہے، یہ بہت سارے اندرونی وبیرونی عوامل سے اثرانداز ہوتی ہے، مثلاً انسان اپنی یادداشت میں واقعات کو محفوظ کر سکتا ہے مگر جب انہیں واپس بلاتا ہے تو وہم اور حقیقت میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اصل یادداشت کے بعض عناصر ضائع ہو جاتے ہیں، 1600 طالب عملوں پر کی جانی والی ایک تحقیق سے پتہ چلا کہ ان میں سے 20٪ طالب علموں نے ایسی یادداشتیں محفوظ کر رکھی تھیں جن کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں تھی بلکہ یہ ایسے واقعات تھے جو کبھی وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے یعنی وہم (6).

3- پتہ نہیں ابوہریرہ اور عبداللہ بن عباس کو راویوں کی فہرست میں کیوں شامل کیا گیا جبکہ حدیث کو قبول کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ راوی کی ساکھ اچھی ہونی چاہیے، تاریخ کی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ ابوہریرہ نے بحرین کے مال میں کرپشن کی اور بن عباس نے بصرہ کے مال میں کرپشن کی (7) کیا عوام کا مال کھا کر بھی انسان کی ساکھ باقی رہتی ہے؟ کیا کرپٹ لوگوں سے حدیث لی جاسکتی ہے؟ اگر ان دونوں حضرات سے مروی احادیث ساقط کر دی جائیں تو احادیث کی کتابوں میں کیا بچے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے.

4- سارے قدیم وجدید علمائے حدیث جانتے ہیں کہ 99٪ احادیث "ظنیہ الثبوت" (قیاساً ثابت شدہ) ہیں یعنی کوئی بھی یہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ ساری باتیں محمد ﷺ نے اپنے منہ سے کہی تھیں چاہے اس کی سند درست اور متواتر ہی کیوں نہ ہو.. اس کی وجہ بڑی سادہ سی ہے، کیونکہ محمد ﷺ نے انہیں اپنے دور میں مدون نہیں کیا اور نہ ہی چاروں خلفاء نے انہیں اپنے دور میں مدون کیا اسی وجہ سے یہ ظنی ہیں، یعنی اگر ہم فیصد کے حساب سے شرح نکالنا چاہیں کہ یہ ساری احادیث محمد ﷺ نے ہی اپنی زبان سے کہی ہیں تو یہ شرح انتہائی کم ہوگی (0.001٪).

اتنے کم امکانات کے باوجود بھی احادیث کو اتنی مقدس حیثیت حاصل رہی ہے کہ یہ قرآن کے احکامات تک کو منسوخ کر دیتی ہیں، مختلف اسلامی فرقوں کی بنیاد اور ان کے آپس کے اختلافات بھی انہی احادیث کی وجہ سے ہیں، احادیث ہی مسلم معاشروں کی طرز زندگی کا تعین کرتی ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا محض اندازوں پر معاشروں کو چلایا جاسکتا ہے؟ کیا محض قیاسات پر قوانین وضع کیے جاسکتے ہیں؟ اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا ہم چودہ سو بتیس سال بعد بھی ایسی احادیث پر یقین رکھ سکتے ہیں؟

حوالہ جات:

1- بخاری جلد 3 صفحہ 564-565.

2- بخاری جلد 4 صفحہ 533.

3- بخاری 2855 مسلم 1671.

4- بخاری، حدیث 4698.

5- مکانۃ الصحیحین صفحہ 28، سیر اعلام النبلاء صفحہ 411.

6- ہماری یادداشت کا بیس فیصد حصہ محض وہم ہے!.

7- طبقات ابن سعد، الکامل فی التاریخ، دلیل المسلم الحزین.

فان لم تستیقظوا ولن تستیقظوا

اپنی تحریروں کے متعلق مجھے اکثر وبیشتر ای میلز موصول ہوتی رہتی ہیں، یہ ای میلز کچھ دوست احباب کی طرف سے ہوتی ہیں اور کچھ نامعلوم حضرات کی طرف سے، بعض ای میلز سنجیدہ ہوتی ہیں اور میری تحریروں میں اٹھائی گئی کچھ باتوں کی وضاحت کی طلبگار ہوتی ہیں، ایسی ای میلز کا میں بھی سنجیدگی سے جواب دیتا ہوں اور حتی المقدور اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں، بعض ای میلز بڑی ہلکی پھلکی سی ہوتی ہیں جیسے وہ صاحب جنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اللہ کے حضور میری ہدایت کے لیے دعاء کریں گے، جواب میں، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی دعاء میں فلسطین اور عراق کی یہودیوں اور امریکیوں سے جلد آزادی کی دعاء بھی شامل کر لیں، اسی طرح ایک اور صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے مسجد جاکر توبہ کر لینی چاہیے... کچھ ای میلز کی فکری بالیدگی پر شدید افسوس ہوتا ہے کہ ان کی جہالت بے وقوفی کی حد تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے، تاہم بیشتر ای میلز عتابی ہوتی ہیں اور یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ دوسرے مذاہب کو چھوڑ کر میں صرف اسلامی فکر پر ہی کیوں تنقید کرتا ہوں؟ یورپ میں رہنے والے بعض حضرات کا فرمان ہے کہ ایسی تحریروں سے میں یہودیوں اور امریکیوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں جبکہ بعض حضرات مجھ پر یہودی مشنری ہونے کا مضحکہ خیز الزام لگاتے ہیں!! ہاں جان کی دھمکیاں دینے والے اس کے علاوہ ہیں.

سب سے پہلے تو میں یہ واضح کردوں کہ میں ہر اس فکر پر تنقید کرتا ہوں جو میرے معاشرے اور قوم پر منفی اثرات مرتب کرے اور ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے، اگرچہ میں نے عیسائیت پر بھی تنقید کی ہے تاہم اسلامی فکر پر بالخصوص میں تنقید اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں مسلمان ہوں اور میرا اس فکر سے براہ راست تعلق ہے، یہ فکر میری قوم کی ترقی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے، یہ فکر ریورس آرڈر میں چل رہی ہے جو دوسرے کا انکار کرتی اور عقل اور آزادیء فکر کو پتھراتی ہے اور

میرے معاشرے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن کر اس پر فکری دہشت گردی مسلط کرتی ہے جو بعض اوقات جسمانی دہشت گردی کی حد تک پہنچ جاتی ہے.

اس میں شک نہیں کہ اسلامی فکر کی طرح عیسائی فکر کو بھی تجدید کی اشد ضرورت ہے، فکر جس نوعیت کی بھی ہو اسے تجدید کی ضرورت رہتی ہے ورنہ وہ پتھرا جاتی ہے، تاہم عیسائی فکر پر تنقید اور اس کی تجدید عیسائیوں کی ذمہ داری ہے ناکہ ہماری، اگرچہ ہمیں یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ آج کی عیسائی فکر یورپ کی تجدیدی تحریک کا نتیجہ ہے جس نے اس پر تنقید کے در اس قدر وا کر دیے جو بعض اوقات اس کی مقدس کتاب اور اس کے خدائی مصدر تک پر تشکیک تک پہنچ جاتی ہے مگر نا تو ناقد پر کفر کا فتوی لگایا جاتا ہے اور نا ہی اسے کسی قسم کی جسمانی سزا دی جاتی ہے جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا، عیسائی دین عام طور پر ایک ذاتی مذہب اور عقیدے کی شکل اختیار کر گیا ہے جو نا ہی حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرتا ہے اور نا ہی لوگوں کی روزمرہ زندگی پر، وہ ان کو کوئی خاص عقیدہ رکھنے پر مجبور نہیں کرتا اور نا ہی ان کے کھانے پینے اور روزمرہ کے رہن سہن میں اسلامی فکر کی طرح مداخلت کرتا ہے، عیسائی مذہبی فکر یہ نہیں کہتی کہ نماز چھوڑنے والا کافر ہے جس کی سزا موت ہے وہ عیسائیوں کو روزہ رکھنے پر مجبور نہیں کرتا ورنہ وہ ملت سے خارج ہو جائیں گے، وہ انہیں کوئی شرعی لباس پہننے پر مجبور نہیں کرتا اور نا ہی یہ کہتا ہے کہ عورت ناقصِ عقل و دین اور عورہ ہے جسے دوسروں کی نظروں سے بچا کر رکھنا چاہیے، اگرچہ عیسائیت مسلمان کی عیسائی اور عیسائی کی مسلمان سے شادی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تاہم اگر ایسی کوئی شادی ہو جائے تو وہ اسے باطل بھی قرار نہیں دیتی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک عیسائی کو اپنا مذہب بدلنے یا دہریہ ہونے کی پوری پوری آزادی ہے اور اس جرم کی پاداش میں عیسائیت نہ تو اس کا سر تن سے جدا کرنے کا فتوی دیتی ہے، نا اس کی بیوی کی اس سے طلاق کرواتی ہے اور نا ہی اسے اس کی جائیداد سے بے دخل کرتی ہے.

اس کے مقابلے میں اسلامی فکر حرام اور ممنوع کی فکر ہے، یہ مسلمان کی دقیق تر خصوصیات میں دخل اندازی کرتی ہے، یہ فکر ہمارے بیڈروم تک گھس آتی ہے، یہ ہماری عورتوں، بچوں اور بیٹیوں میں مداخلت کرتی ہے، یہ ہمارے کھانے پینے، پہننے، بیٹھنے، چلنے پھرنے حتی کہ بیت الخلاء میں جانے اور اس سے نکلنے تک میں مداخلت کرتی ہے، یہ ہماری موت میں بھی مداخلت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ہمیں اپنے مردے کس طرح دفن کرنے چاہئیں، قبر کی شکل کیا ہونی چاہیے، اس کا مقام کیا ہونا چاہیے اور قبر میں مردے کی سمت کس طرف ہونی چاہیے، یہ فکر مرنے کے بعد بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی اور عذابِ قبر و آخرت کی صورت میں آنمودار ہوتی ہے، یہ فکر کینسر بن چکی ہے جس کا اللہ اور اس کے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ایک بشری فکر ہے جس کا اللہ اور ایمان سے دور کا بھی واسطہ نہیں، یہ فکر عقل کی دشمن ہے اور دوسرے کو مٹانے پر یقین رکھتی ہے اس لیے اس پر تنقید

کی جانی چاہیے اور اس کی جگہ ایک آزاد فکر کھڑی کی جانی چاہیے جو دین، عقیدے اور آزادیءفکر کے دروازے کھول دے اور مردوزن کو اس کی قید سے آزاد کرے، میرا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ دین کو ہی مٹا دیا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ عقل اور دین کو دین کے ٹھیکیداروں سے آزاد کیا جائے جنہوں نے عقل اور دین کو اپنا غلام بنا رکھا ہے.

بہر حال ای میلز سے ہٹ کر اگر بلاگستان پر نظر دوڑائی جائے تو بعض حضرات کو ایسی تنقید ہضم نہیں ہو پاتی اور وہ ہر طرح سے ایسی باتوں کو رد کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں کہ کہیں لوگ دقیانوسی روایات سے ہٹ کر سوچنا نہ شروع کر دیں، کچھ لوگ تہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کرتے ہیں اور ذاتیات پر نہیں اترتے جیسے ڈاکٹر جواد خان صاحب، ایسے لوگوں کی عزت کی جانی چاہیے، تاہم کچھ لوگ تہذیب کے وہ تمام ضابطے-جو شاید ان کا مذہب انہیں نہیں سکھاتا-توڑ کر ذاتیات، گالم گلوچ اور استہزاء پر اتر آتے ہیں اور اپنے "مقدس" مذہب کا "غیر مقدس" گھٹیا زبان استعمال کر کے دفاع کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دین کے دفاع کا حق ادا کر دیا اور جنت میں ان کی سیٹ پکی ہوگئی!! ایسے ہی عالم لوگوں میں ایک یہ صاحب بھی ہیں جنہوں نے میری اس تحریر کا ایک گھٹیا اور سطحی قسم کا فضول رد لکھ کر اپنی علمیت کا پردہ چاک کیا ہے..
دراصل ان کے رد میں ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں جس کے رد کے لیے مجھے قلم اٹھانا پڑے ساری کی ساری تحریر اپنی جہالت کا منہ بولتا ثبوت آپ ہے، تاہم یہ کشٹ میں نے صرف اس لیے کیا تاکہ ایک مخصوص ٹولے کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مکی صاحب چت ہوگئے اور ان سے جواب نہ بن پڑا، میں پہلے بھی ڈاکٹر جواد خان صاحب کے اس رد پر یہ رد لکھ چکا ہوں اور آج بھی ان کے رد کا منتظر ہوں مگر جواب ندارد..!!
تو ہمارے عالم فاضل صاحب فرماتے ہیں کہ:

"عجم پر ہی نہیں ابن الراوندی صاحب یہ عربوں پر بھی حجت تھا اور ہے، بلکہ عربوں پر پہلے حجت ہے اور صرف آج کے عربوں پر نہیں، نزول قرآن کے وقت جزیرۃ العرب میں بسنے والے عربوں پر بھی حجت تھا جن کا بچہ بچہ شاعری کر رہا تھا اور فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ تھا جن کا آج کے عربوں سے کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ نے قرآن کے اس چیلنج کو صرف عجمیوں کے ساتھ کیوں خاص کیا؟"

موصوف کی خردمندی پر کیا کہیے کہ اتنی سادہ سی بات ان کے پلے نہیں پڑی، عجم پر قرآن کیوں حجت ہو؟ میری دیگر زبانیں جاننے والے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ کسی ایک زبان کی کوئی غزل قصیدہ وغیرہ اردو میں ترجمہ کر کے دیکھیں، مثال کے طور پر اگر آپ کو پشتو آتی ہے تو پشتو زبان کی کسی غزل کا اردو میں ترجمہ کر دیں پھر دیکھیں کہ وہ غزل جو اپنی زبان پشتو میں بڑی فصیح و بلیغ تھی اس کا اردو میں ترجمہ ہو جانے کے بعد کیا حشر ہوتا ہے، اب یہ ترجمہ کسی ایسے شخص کو پیش کریں جسے صرف اردو

آتی ہو اور اسے کہیں کہ یہ بڑا فصیح وبلیغ کلام ہے پھر اس کا رد عمل دیکھیے، آپ کو ساری بات سمجھ آجائے گی جو میرے فاضل دوست کی عقل دانی میں نہ سما سکی.

ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"ٹھیک ہے جی کہ بلیغ باتیں پڑھنے لکنے سے مشروط نہیں ہیں لیکن قرآن متعدد آیات میں لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دیتا ہے جنکو انہوں نے کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا ہوتا مثلا: اذ ہمت طائفتان منکم ان تفشلا، اور: یقولون فی انفسہم لولا یعذبنا اللہ بما نقول۔ اور ظاہر ہو جانے کے بعد متعلقہ لوگوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ انہی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دینے کی وجہ سے بعض لوگوں نے حضور ﷺ کی منشاء کے خلاف کام کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اگر ہم یہ کام کریں گے تو محمد ﷺ کا خدا محمد ﷺ کو سب کچھ بتادے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا صرف فصاحت وبلاغت کے دم پر لوگوں کے دل میں چھپی ہوئی بات کی اطلاع دینا ممکن ہے؟"

میرا خیال ہے کہ انہیں پہلے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے، سائنس کی کتاب ہے یا علم نجوم کے خرافات کی؟! مذہب کوئی بھی ہو، دعوی وہ ہمیشہ ایسا داغے گا جس کی کبھی جانچ نہ کی جاسکتی ہو!! دلوں کے حال کوئی جان سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں، تو اگر میں آپ سے کہوں کہ:

"یقولون لو فعلنا لیکتشفنہ"

"وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے (ایسا) کیا تو وہ جان لے گا"

تو آپ کے پاس یہ جاننے کا کوئی پیمانہ ہے کہ میں دلوں کے حال جانتا ہوں؟ یقیناً نہیں، یہ محض دعوی برائے دعوے کے سوا کچھ نہیں ہے، قرآن نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے جس سے کوئی راز منکشف ہوتا ہو، اس کے برعکس قرآن بلاغی، لغوی اور تکراری غلطیوں سے اس قدر پُر ہے کہ اسے خدائی کلام قرار دینا خود خدا کی توہین ہے، مثلاً اگر میں عربی میں آپ سے کہوں کہ: قال الکاتب انہ ملحد، کیا یہ جملہ آپ کو منطقی لگتا ہے؟ اگر آپ کو واقعی عربی آتی ہے تو آپ کا جواب یقیناً انکار میں ہوگا کیونکہ بولنے والا یعنی "المتحدث" میں ہوں اور "قال" میں ضمیر کو اپنی طرف موڑ رہا ہوں جیسے میں کسی اور کاتب کے بارے میں بات کر رہا ہوں، اصولاً مجھے یوں کہنا چاہیے کہ: انا ملحد، نا کہ: قال الکاتب انہ ملحد... اب نمونے کے طور پر یہ آیت دیکھیے جس میں بظاہر خدا ابلیس سے مخاطب ہے:

"قَالَ مَامَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ" سورہ اعراف آیت 12

یہاں "قال" میں ضمیر کس کی طرف ہے؟ خدا نے اس کا ذکر اس طرح کیوں کیا جیسے وہ کسی اور کے بارے میں بات کر رہا ہو؟ مسئلہ سمجھ میں آیا؟ لگتا ہے یہ مثال کافی نہیں تھی، چلیے کوئی اور آیت پکڑتے ہیں تاہم یاد رہے کہ سارا قرآن خدا کی زبانی ہے:

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴿۲﴾ سورہ ہود آیت 2

کیا معاملات اس سے بھی زیادہ واضح ہو سکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے "انی لکم منہ نذیر وبشیر"؟ یہاں "انی" میں ضمیر کس کی طرف ہے؟ زیادہ ٹینشن نہ لیں، میں بتاتا ہوں کہ "انی" میں ضمیر کس کی طرف ہے، یہاں "انی" میں ضمیر محمد ﷺ کی طرف ہے، اوپر بھی وہی خدا اور ابلیس کا قصہ سنا رہے تھے اور یہاں بھی وہی یہ وعظ کر رہے ہیں، کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ قرآن خدائی پیغام ہے یا انسانی تصنیف؟

اس کے علاوہ قرآن میں بہت ساری تعبیری، نحوی اور بلاغی غلطیاں موجود ہیں جس سے بجا طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ایک انسانی خرافت کے سوا کچھ نہیں، مثلاً خدا کہتا ہے: "إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا" (سورہ بقرہ آیت 26) جبکہ بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے: "بعوضۃ فما اصغر" کیونکہ یہ کہنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ خدا دقیق مثالیں استعمال کرتا ہے نا کہ بر عکس! ورنہ یوں کیوں نہیں کہتا کہ: "فیلاً فما فوق"؟ ایک اور مثال سیاق کے عدم تسلسل کی ہے جیسے: "إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ" (سورہ فاطر آیت 10) جبکہ بلاغی تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ "الیہ یصعد الکلام الطیب والعمل الصالح" کیونکہ "یرفعہ" زیادہ یا فالتو ہے جس کی ضرورت نہیں، یا پھر یہ دیکھیے: "وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا" (سورہ الکہف آیت 22) یہاں "فیہم منہم" کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خدائی منطق ہے!؟ نحوی طور پر تو بات ہی مت کریں اور یہ ایک چلتے چلتے ہے: "وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً" (سورہ بقرہ آیت 80) جو کہ غلط ہے، نحوی طور پر "ایاماً معدودات" درست ہے! بلاغت تو اپنی جگہ رہی ریت کے خدا کو تو یار و نحو بھی نہیں آتی!!

قرآن کے دیگر جھولوں میں ایک ہی سورت میں ایک کہانی کو بیان کرنے والے الفاظ کو دوسری کہانی بیان کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے جسے کہانی کا ٹیمپلیٹ کاپی کرنا کہا جائے تو بے جانہ ہو گا، مثال کے طور پر سورہ اعراف دیکھیے:

آیت 60 جس میں قوم نوح کا بیان ہے:

قَالَ ال◌مَلَاُ مِن◌ قَو◌مِہٖۤ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِی◌ ضَلٰلٍ مُّبِی◌نٍ ﴿۶۰﴾

آیت 66 جس میں قوم ثمود کا بیان ہے:

قَالَ ال◌مَلَاُ الَّذِی◌نَ کَفَرُو◌ا مِن◌ قَو◌مِہٖۤ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِی◌ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ ال◌کٰذِبِی◌نَ ﴿۶۶﴾

آیت 90 جس میں قوم شعیب کا بیان ہے:

وَقَالَ ال◌مَلَاُ الَّذِی◌نَ کَفَرُو◌ا مِن◌ قَو◌مِہٖ لَئِنِ اتَّبَع◌تُم◌ شُعَی◌بًا اِنَّکُم◌ اِذًا لَّخٰسِرُو◌نَ ﴿۹۰﴾

آیت 75 جس میں قوم صالح کا بیان ہے:

قَالَ ال◌مَلَاُ الَّذِی◌نَ اس◌تَک◌بَرُو◌ا مِن◌ قَو◌مِہٖ لِلَّذِی◌نَ اس◌تُض◌عِفُو◌ا لِمَن◌ اٰمَنَ مِن◌هُم◌
اَتَع◌لَمُو◌نَ اَنَّ صٰلِحًا مُّر◌سَلٌ مِّن◌ رَّبِّهٖ ؕ قَالُو◌ۤا اِنَّا بِمَاۤ اُر◌سِلَ بِهٖ مُؤ◌مِنُو◌نَ ﴿۷۵﴾

آیت 88 جس میں قوم شعیب کا بیان ہے:

قَالَ ال◌مَلَاُ الَّذِی◌نَ اس◌تَک◌بَرُو◌ا مِن◌ قَو◌مِہٖ لَنُخ◌رِجَنَّکَ یٰشُعَی◌بُ وَالَّذِی◌نَ اٰمَنُو◌ا مَعَکَ مِن◌
قَر◌یَتِنَاۤ اَو◌ لَتَعُو◌دُنَّ فِی◌ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَو◌ کُنَّا کٰرِهِی◌نَ ﴿۸۸﴾

آیت 109 جس میں قوم فرعون کا بیان ہے:

قَالَ ال◌مَلَاُ مِن◌ قَو◌مِ فِر◌عَو◌نَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِی◌مٌ ﴿۱۰۹﴾ ۙ

آیت 127 اس میں بھی قوم فرعون کا بیان ہے:

وَقَالَ ال◌مَلَاُ مِن◌ قَو◌مِ فِر◌عَو◌نَ اَتَذَرُ مُو◌سٰی وَقَو◌مَهٗ لِیُف◌سِدُو◌ا فِی ال◌اَر◌ضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِهَتَکَ ؕ قَالَ
سَنُقَتِّلُ اَب◌نَآءَهُم◌ وَنَس◌تَح◌یٖ نِسَآءَهُم◌ ۚ وَاِنَّا فَو◌قَهُم◌ قٰهِرُو◌نَ ﴿۱۲۷﴾

آیت 61 جس میں حضرت نوح کا بیان ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾

آیت 67 جس میں حضرت ہود کا بیان ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾

آیت 62 جس میں حضرت نوح کا بیان ہے:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

آیت 68 جس میں حضرت ہود کا بیان ہے:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾

آیت 63 جس میں حضرت نوح کا قصہ ہے:

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ
﴿٦٣﴾

آیت 69 جس میں حضرت ہود کا قصہ ہے:

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ
خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾

یہ سارا عرضِ مکرر صرف ایک ہی سورت کی آگے پیچھے کی آیات میں ہے، ذیل میں کچھ دیگر سورتوں کی آیات کا تشابہ پیش ہے:

سورہ اعراف آیت 83

فَاَن◌ٰ◌جَي◌ٰ◌نٰہُ وَاَه◌ٰ◌لَہٗ　◌ٓ اِلَّا ام◌ٰ◌رَاَتَہٗ◌ٗ◌ كَانَت◌ٰ◌ مِنَ ال◌ٰ◌غٰبِرِي◌ٰ◌نَ ﴿۸۳﴾

سورہ النمل آیت 57

فَاَن◌ٰ◌جَي◌ٰ◌نٰہُ وَاَه◌ٰ◌لَہٗ　◌ٓ اِلَّا ام◌ٰ◌رَاَتَہٗ◌ٗ◌ قَدَّر◌ٰ◌نٰهَا مِنَ ال◌ٰ◌غٰبِرِي◌ٰ◌نَ ﴿۵۷﴾

اب سورہ اعراف کی آیت 60 سے آیت 63 تک کا ٹیمپلیٹ دیکھیے جس میں قوم نوح کا قصہ ہے:

قَالَ ال◌ٰ◌مَلَاُ مِن◌ٰ◌ قَو◌ٰ◌مِہٖ　◌ٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِي◌ٰ◌ ضَلٰلٍ مُّبِي◌ٰ◌نٍ ﴿۶۰﴾

قَالَ يٰقَو◌ٰ◌مِ لَي◌ٰ◌سَ بِي◌ٰ◌ ضَلٰلَۃٌ وَّلٰكِنِّي◌ٰ◌ رَسُو◌ٰ◌لٌ مِّن◌ٰ◌ رَّبِّ ال◌ٰ◌عٰلَمِي◌ٰ◌نَ ﴿۶۱﴾

اُبَلِّغُكُم◌ٰ◌ رِسٰلٰتِ رَبِّي◌ٰ◌ وَاَن◌ٰ◌ صَحُ لَكُم◌ٰ◌ وَاَع◌ٰ◌لَمُ مِنَ اللّٰہِ مَالَا تَع◌ٰ◌لَمُو◌ٰ◌نَ ﴿۶۲﴾

اَوَعَجِب◌ٰ◌تُم◌ٰ◌ اَن◌ٰ◌ جَآءَكُم◌ٰ◌ ذِك◌ٰ◌رٌ مِّن◌ٰ◌ رَّبِّكُم◌ٰ◌ عَلٰى رَجُلٍ مِّن◌ٰ◌كُم◌ٰ◌ لِيُن◌ٰ◌ذِرَكُم◌ٰ◌ وَلِتَتَّقُو◌ٰ◌ا وَلَعَلَّكُم◌ٰ◌ تُر◌ٰ◌حَمُو◌ٰ◌نَ

﴿۶۳﴾

اب بالکل یہی ٹیمپلیٹ الفاظ میں معمولی سے ہیر پھیر کے ساتھ ایک اور کہانی کے لیے استعمال کیا گیا، آیت 66 تا 69 جس میں قوم عاد کے قصے کا بیان ہے:

قَالَ ال◌ٰ◌مَلَاُ الَّذِي◌ٰ◌نَ كَفَرُو◌ٰ◌ا مِن◌ٰ◌ قَو◌ٰ◌مِہٖ　◌ٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِي◌ٰ◌ سَفَاهَۃٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ ال◌ٰ◌كٰذِبِي◌ٰ◌نَ ﴿۶۶﴾

قَالَ يٰقَو◌ٰ◌مِ لَي◌ٰ◌سَ بِي◌ٰ◌ سَفَاهَۃٌ وَّلٰكِنِّي◌ٰ◌ رَسُو◌ٰ◌لٌ مِّن◌ٰ◌ رَّبِّ ال◌ٰ◌عٰلَمِي◌ٰ◌نَ ﴿۶۷﴾

اُبَلِّغُكُم◌ٰ◌ رِسٰلٰتِ رَبِّي◌ٰ◌ وَاَنَا لَكُم◌ٰ◌ نَاصِحٌ اَمِي◌ٰ◌نٌ ﴿۶۸﴾

اَوَعَجِب◌ٰ◌تُم◌ٰ◌ اَن◌ٰ◌ جَآءَكُم◌ٰ◌ ذِك◌ٰ◌رٌ مِّن◌ٰ◌ رَّبِّكُم◌ٰ◌ عَلٰى رَجُلٍ مِّن◌ٰ◌كُم◌ٰ◌ لِيُن◌ٰ◌ذِرَكُم◌ٰ◌ ◌ؕ وَاذ◌ٰ◌كُرُو◌ٰ◌ا　◌ٓ اِذ◌ٰ◌ جَعَلَكُم◌ٰ◌

خُلَفَآءَ مِن◌ٰ◌ ◌ۢ بَع◌ٰ◌دِ قَو◌ٰ◌مِ نُو◌ٰ◌حٍ وَّزَادَكُم◌ٰ◌ فِي ال◌ٰ◌خَل◌ٰ◌قِ بَص◌ٰ◌طَۃً◌ۚ◌ فَاذ◌ٰ◌كُرُو◌ٰ◌ا　◌ٓ اٰلَآءَ اللّٰہِ لَعَلَّكُم◌ٰ◌

تُف◌ٰ◌لِحُو◌ٰ◌نَ ﴿۶۹﴾

حیرت انگیز طور پر خدا کے پاس الفاظ کی شدید قلت ہے اسی لیے وہ کبھی ایک ہی سورت میں آئی ایک کہانی کا ٹیمپلیٹ اسی سورت میں دوسری کہانے کے لیے بڑے دھڑلے سے کاپی کرلیتا ہے تو کبھی کسی ٹیمپلیٹ کو کسی دوسری سورت میں پہنچا دیتا ہے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کوئی احمق سوال نہیں اٹھائے گا کیونکہ اس پر "مقدس" کا لیبل جو چسپاں ہے..!! یہاں ریت

کے خدا کی فصاحت وبلاغت گھاس چرنے چلی جاتی ہے...اور کاپی پیسٹ کا تو پوچھیے ہی مت جس کا قرآن میں ایک انبار موجود ہے، ذیل میں ایک چھوٹا سا نمونہ پیشِ خدمت ہے:

سورہ بقرہ آیت 134

تِلْ◌ْكَ اُمَّةٌ قَدْ◌ْ خَلَتْ◌ْ◌ْ لَهَا مَا كَسَبَتْ◌ْ وَلَكُمْ◌ْ مَّا كَسَبْ◌ْتُمْ◌ْ◌ْ وَلَا تُسْ◌ْـ ٔ◌ َلُو◌ْنَ عَمَّا كَانُو◌ْا يَعْ◌ْمَلُو◌ْ◌ْنَ ﴿۱۳۴﴾

سورہ بقرہ آیت 141

تِلْ◌ْكَ اُمَّةٌ قَدْ◌ْ خَلَتْ◌ْ◌ْ لَهَا مَا كَسَبَتْ◌ْ وَلَكُمْ◌ْ مَّا كَسَبْ◌ْتُمْ◌ْ◌ْ وَلَا تُسْ◌ْـ ٔ◌ َلُو◌ْنَ عَمَّا كَانُو◌ْا يَعْ◌ْمَلُو◌ْ◌ْنَ ﴿۱۴۱﴾

سورہ بقرہ آیت 147

اَلْ◌ْحَقُّ مِنْ◌ْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُو◌ْنَنَّ مِنَ الْ◌ْمُمْ◌ْتَرِي◌ْ◌ْنَ ﴿۱۴۷﴾

سورہ آل عمران آیت 60

اَلْ◌ْحَقُّ مِنْ◌ْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ◌ْ مِّنَ الْ◌ْمُمْ◌ْتَرِي◌ْ◌ْنَ ﴿۶۰﴾

سورہ بقرہ آیت 5

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ◌ْ رَّبِّهِمْ◌ْ ☆ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْ◌ْمُفْ◌ْلِحُو◌ْ◌ْنَ ﴿۵﴾

سورہ لقمان آیت 5

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ◌ْ رَّبِّهِمْ◌ْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْ◌ْمُفْ◌ْلِحُو◌ْ◌ْنَ ﴿۵﴾

سورہ بقرہ آیت 27

الَّذِي◌ْنَ يَنْ◌ْقُضُو◌ْنَ عَهْ◌ْدَ اللّٰهِ مِنْ◌ْ◌ْ بَعْ◌ْدِ مِي◌ْثَاقِهٖ وَيَقْ◌ْطَعُو◌ْنَ مَا ٓ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ ٓ اَنْ◌ْ يُّو◌ْصَلَ وَ
يُفْ◌ْسِدُو◌ْ◌ْنَ فِي الْ◌ْاَرْ◌ْضِ◌ْ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْ◌ْخٰسِرُو◌ْ◌ْنَ ﴿۲۷﴾

سورہ الرعد آیت 25

وَالَّذِي◌ْنَ يَنْ◌ْقُضُو◌ْنَ عَهْ◌ْدَ اللّٰهِ مِنْ◌ْ◌ْ بَعْ◌ْدِ مِي◌ْثَاقِهٖ وَيَقْ◌ْطَعُو◌ْ◌ْنَ مَا ٓ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ ٓ اَنْ◌ْ يُّو◌ْصَلَ وَ
يُفْ◌ْسِدُو◌ْ◌ْنَ فِي الْ◌ْاَرْ◌ْضِ◌ْ لا اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْ◌ْنَةُ وَلَهُمْ◌ْ سُو◌ْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

سورہ بقرہ آیت 162

خٰلِدِی نَ فِی ہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَن ہُمُ ال عَذَابُ وَلَا ہُم یُن ظَرُو نَ ﴿۱۶۲﴾

سورہ آل عمران آیت 88

خٰلِدِی نَ فِی ہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَن ہُمُ ال عَذَابُ وَلَا ہُم یُن ظَرُو نَ ﴿۸۸﴾ ۙ

سورہ آل عمران آیت 11

کَدَا بِ اٰلِ فِر عَو نَ ۙ وَالَّذِی نَ مِن قَب لِہِم ؕ کَذَّبُو ا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَ ہُمُ اللّٰہُ بِذُنُو بِہِم ؕ وَاللّٰہُ شَدِی دُ
ال عِقَابِ ﴿۱۱﴾

سورہ الانفال آیت 52

کَدَا بِ اٰلِ فِر عَو نَ ۙ وَالَّذِی نَ مِن قَب لِہِم ؕ کَفَرُو ا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاَخَذَ ہُمُ اللّٰہُ بِذُنُو بِہِم ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ
شَدِی دُ ال عِقَابِ ﴿۵۲﴾

سورہ آل عمران آیت 182

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَت اَی دِی کُم وَاَنَّ اللّٰہَ لَی سَ بِظَلَّامٍ لِّل عَبِی دِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ

سورہ الانفال آیت 51

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَت اَی دِی کُم وَاَنَّ اللّٰہَ لَی سَ بِظَلَّامٍ لِّل عَبِی دِ ﴿۵۱﴾ ۙ

سورہ الانعام آیت 4

وَمَا تَاتِی ہِم مِّن اٰیَۃٍ مِّن اٰیٰتِ رَبِّہِم اِلَّا کَانُو ا عَن ہَا مُع رِضِی نَ ﴿۴﴾

سورہ یس آیت 46

وَمَا تَاتِی ہِم مِّن اٰیَۃٍ مِّن اٰیٰتِ رَبِّہِم اِلَّا کَانُو ا عَن ہَا مُع رِضِی نَ ﴿۴۶﴾

سورہ الانعام آیت 10

وَلَقَدِ اس تُہ زِیَٔ بِرُسُلٍ مِّن قَب لِکَ فَحَاقَ بِالَّذِی نَ سَخِرُو ا مِن ہُم مَّا کَانُو ا بِہٖ یَس تَہ زِءُو نَ ﴿۱۰﴾

سورہ الانبیاء آیت 41

وَلَقَدِ اس◌ت◌ُہ◌زِیَٔ بِرُسُلٍ مِّن◌ قَب◌لِکَ فَحَاقَ بِالَّذِی◌ن◌َ سَخِرُو◌ا مِن◌ہُم◌ مَّا کَانُو◌ا بِہٖ یَس◌تَہ◌زِءُو◌ن◌َ ﴿۴۱﴾

سورہ ہود آیت 96

وَلَقَد◌ اَر◌سَل◌نَا مُو◌سٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُل◌طٰنٍ مُّبِی◌نٍ ﴿◌۹۶﴾

سورہ غافر آیت 23

وَلَقَد◌ اَر◌سَل◌نَا مُو◌سٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُل◌طٰنٍ مُّبِی◌نٍ ﴿◌۲۳﴾

سورہ ہود آیت 110

وَلَقَد◌ اٰتَی◌نَا مُو◌سَی ال◌کِتٰبَ فَاخ◌تُلِفَ فِی◌ہِ◌ وَلَو◌لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَت◌ مِن◌ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَی◌نَہُم◌◌ وَاِنَّہُم◌ لَفِی◌
شَکٍّ مِّن◌ہُ مُرِی◌بٍ ﴿۱۱۰﴾

سورہ فصلت آیت 45

وَلَقَد◌ اٰتَی◌نَا مُو◌سَی ال◌کِتٰبَ فَاخ◌تُلِفَ فِی◌ہِ◌ وَلَو◌لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَت◌ مِن◌ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَی◌نَہُم◌◌ وَاِنَّہُم◌ لَفِی◌
شَکٍّ مِّن◌ہُ مُرِی◌بٍ ﴿۴۵﴾

سورہ الطور آیت 40

اَم◌ تَس◌ـَٔلُہُم◌ اَج◌رًا فَہُم◌ مِّن◌ مَّغ◌رَمٍ مُّث◌قَلُو◌ن◌َ ﴿◌۴۰﴾

سورہ القلم آیت 46

اَم◌ تَس◌ـَٔلُہُم◌ اَج◌رًا فَہُم◌ مِّن◌ مَّغ◌رَمٍ مُّث◌قَلُو◌ن◌َ ﴿◌۴۶﴾

سورہ طور آیت 41

اَم◌ عِن◌دَہُمُ ال◌غَی◌بُ فَہُم◌ یَک◌تُبُو◌ن◌َ ﴿◌۴۱﴾

سورہ القلم آیت 47

اَم◌ عِن◌دَہُمُ ال◌غَی◌بُ فَہُم◌ یَک◌تُبُو◌ن◌َ ﴿۴۷﴾

سورہ الزخرف آیت 83

فَذَرۡ◌هُمۡ◌يَخُوۡ◌ضُوۡ◌اوَيَلۡ◌عَبُوۡ◌احَتّٰى يُلٰقُوۡ◌ايَوۡ◌مَهُمُ الَّذِىۡ◌يُوۡ◌عَدُوۡ◌نَ ﴿۸۳﴾

سورہ المعارج آیت 42

فَذَرۡ◌هُمۡ◌يَخُوۡ◌ضُوۡ◌اوَيَلۡ◌عَبُوۡ◌احَتّٰى يُلٰقُوۡ◌ايَوۡ◌مَهُمُ الَّذِىۡ◌يُوۡ◌عَدُوۡ◌نَ ﴿◌ۙ۴۲﴾

سورہ الواقعه آیت 67

بَلۡ◌نَحۡ◌نُ مَحۡ◌رُوۡ◌مُوۡ◌نَ ﴿۶۷﴾

سورہ القلم آیت 27

بَلۡ◌نَحۡ◌نُ مَحۡ◌رُوۡ◌مُوۡ◌نَ ﴿۲۷﴾

سورہ الحدید آیت 1

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡ◌اَرۡ◌ضِ◌ۚ وَهُوَ الۡ◌عَزِيۡ◌زُ الۡ◌حَكِيۡ◌مُ ﴿۱﴾

سورہ الحشر آیت 1

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡ◌اَرۡ◌ضِ◌ۚ وَهُوَ الۡ◌عَزِيۡ◌زُ الۡ◌حَكِيۡ◌مُ ﴿۱﴾

سورہ الصف آیت 1

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡ◌اَرۡ◌ضِ◌ۚ وَهُوَ الۡ◌عَزِيۡ◌زُ الۡ◌حَكِيۡ◌مُ ﴿۱﴾

سورہ یونس آیت 48

وَيَقُوۡ◌لُوۡ◌نَ مَتٰى هٰذَا الۡ◌وَعۡ◌دُ اِنۡ◌كُنۡ◌تُمۡ◌صٰدِقِيۡ◌نَ ﴿۴۸﴾

سورہ الانبیاء آیت 38

وَيَقُوۡ◌لُوۡ◌نَ مَتٰى هٰذَا الۡ◌وَعۡ◌دُ اِنۡ◌كُنۡ◌تُمۡ◌صٰدِقِيۡ◌نَ ﴿۳۸﴾

سورہ النمل آیت 71

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۷۱﴾

سورہ سبا آیت 29

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۹﴾

سورہ یس آیت 48

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۸﴾

سورہ الملک آیت 25

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾

اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن خدائی کلام ہے تو کیا خدا ایسی غلطیاں کر سکتا ہے؟ یا وہ اتنا عاجز ہے کہ ایک سادہ سا کلام بغیر کاپی پیسٹ کے اس سے نہیں کہا جاتا؟ میرے فاضل دوست کے سارے تمسخرانہ سوالات یہیں پر ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں، پھر بھی ان کے رد میں ایک بات کی تکرار بڑی دلچسپ ہے کہ اس جیسا کلام لا کر دکھاؤ، مثلاً وہ کہتے ہیں:

"تو لاؤ ناں ایسا کلام رواندی کے بیٹے اور قصہ ختم کرو! ہم بھی لا سکتے ہیں ہم بھی لا سکتے ہیں کی گردان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ الزامی سوالات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس قرآن کے جیسا کلام پیش کرو اور قصہ ختم کرو۔ سامنے والا خود ہی ہار جائے گا۔ اسکی ہار آپ کے اس الزامی سوال کے جواب پر موقوف نہیں ہے۔۔ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے۔۔ یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں"

"تقریباً ناممکن ہوتا ہے سرے سے تو ناممکن نہیں ہوتا۔ اسی لئے فنکار اپنی کاوش کو لیکر غیرت کو للکارنے والا ایسا دعوی نہیں کرتا جیسا قرآن نے کیا ہے۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا: پس اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ایسا کر بھی نہیں سکتے"

"یہاں بھی وہی بات نکالو ناں ان بہترین اشعار بلیغ خطبوں اور خوبصورت رسائل کو اور دنیا کے سامنے پیش کرو۔ انتظار کرتے کرتے ہماری ہڈیاں بوڑھی ہو گئیں اور نہ نضر بن حارث نے پیش کیا اور نہ آپ پیش کر رہے ہیں، خالی دھمکیاں دیتے چلے جا رہے ہیں کہ ہم بھی کر سکتے ہیں ہم بھی کر سکتے ہیں۔ بھائی کرو گے کس دن؟ جلدی پیش کرو کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا"

کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ صاحب، میں اور آپ مسلمان کیوں ہیں؟ کیونکہ اتفاق سے ہم ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوگئے کیونکہ ہمارے پاس اپنی پسند کی جگہ پر پیدا ہونے کا کوئی اختیار نہیں تھا، اسی لیے ہم مسلمان ہوگئے کیونکہ ہمیں بچپن سے ہی یہی "سکھایا پڑھایا" گیا تھا کہ یہی حق ہے اور بس، جس اتفاق سے یہ صاحب ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوئے اسی اتفاق سے اگر یہ کسی عیسائی کے گھر پیدا ہوئے ہوتے تو آج یہ عیسائیت کو حق مان رہے ہوتے اور اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کا دفاع کر رہے ہوتے اور بالکل اسی طرح عیسائیت کے خول میں بند ہوتے جس طرح یہ آج مسلمانیت کے خول میں بند ہیں اور انہیں اس کے باہر کی دنیا دیکھنے کی نا تو فرصت ہے اور نا ہی ضرورت کیونکہ حق سونے کی طشتری پر سجا انہیں "اتفاق" سے پڑا ہوا مل گیا، ایسی جاہلانہ باتیں وہی کر سکتا ہے جسے عربی ادب کے بارے میں ذرا بھی علم نہ ہو، اور ان کے خیال میں اس کی ضرورت ہی کیا ہے، محض قرآن کا بلیغ ہونا کافی ہے، باقی سارے عربی ادب کو کچرے میں ڈال دینا چاہیے اور اسی ایک کتاب کو نسل در نسل طوطے کی طرح رٹتے رہنا چاہیے بھلے اس زبانِ غیر کے بے سمجھ رٹے سے ذہن پراگندہ ہو جائیں اور قوم پستی کی گہرائیوں میں جا گرے۔

عربی ادب اتنا بڑا باب ہے کہ میں تو کیا کوئی بھی اس کا پورا پورا احاطہ نہیں کر سکتا، چاہے وہ اسلام سے پہلے کا ادب ہو، اسلام کے بعد کا ہو یا آج کے دور کا، یہاں میں امیہ بن الصلت نامی ایک شاعر کا کلام پیش کرنا چاہوں گا، شعراء تو بہت ہیں بلکہ شعراء کا ایک انبار ہے تو پھر امیہ بن الصلت ہی کیوں؟ بھئی اس کی بڑی قوی وجہ ہے، یہ وہی امیہ بن الصلت ہے جس کی شاعری میں زمین و آسمان، چاند اور سورج، فرشتے اور انبیاء، حساب و کتاب، جنت و جہنم اور خدا کی وحدانیت کا ذکر تھا اور جس کی شاعری کے نمونے قرآن میں جا بجا پائے جاتے ہیں...!! یہ وہی امیہ بن الصلت ہے نا جس کی شاعری آپ صلی اللہ علیہ و سلم بڑے شوق سے سنا کرتے تھے!! یہ وہی امیہ بن الصلت ہے جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ "کاد ان یسلم" (وہ مسلمان ہونے والا تھا).. بھئی ہوا تو نہیں تھا نا، آپ کیوں یہ بات کر کے اس کے کلام کو کاپی کرنے کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں؟!... اور یہ وہی امیہ بن الصلت ہے جس کا.... ارے بھئی ساری باتیں میں ہی بتاؤں گا یا آپ اپنے دل پر بھی کچھ زخم کھائیں گے؟ میرے لہو سے بہار کب تک! ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ وہی امیہ بن الصلت ہے جس کا میرے حریف نے زندگی میں کبھی نام تک نہیں سنا ہوگا..!!

إلى الله أُهدي مدحتي وثنائيا

وقولاً رصيناً لا يني الدهر باقيا

إلى الملك الأعلى الذي ليس فوقه

إله ولا رب يكون مدانيا

وأشهد أنّ اللـه لا شيء فوقه

عليّاً وأمسى ذكره متعاليا

ألا أيهُّا الإنسان إياک والردى

فإنک لا تخفي من اللـه خافيا

وإياک لا تجعل مع اللـه غيره

فإن سبيل الرشد أصبح باديا

حنانيکَ إن الجنّ کنت رجاءَ هم

وأنت إلـهي ربّنا ورجائيا

رضيت اللـهم بک ربّاً فلن

أرى أدين إلـهاً غيرک اللـه ثانياً

وأنت الذي من فضل منّ ورحمة

بعثت إلى موسى رسولاً مناديا

فقال أعنيّ بابن أُمي فإنني

كثيرٌ به يارب صلِ لي جناحيا

فقلت لـه فاذهب وهارون فادعو

إلى اللـه وفرعون الذي كان طاغيا

وقولا لـه أأنت سويت هذه

بلا وتدٍ حتى اطمأنّتْ كماهيا

وقولا لـه أأنت رفّعتَ هذه

بلا عَمدٍ أرفق إذاً بک بانيا

وقولا لـه أأنت سوَّيت وسطها

منيراً إذا ماجنّه الليل هاديا

وقولا لـه من يرسل الشمس غدوةً

فيصبح مامست من الأرض ضاحيا

فأنبت يقطيناًعليها برحمةٍ

من اللہ لولا اللہ لم يبق صاحيا

و قولا لہ من ينبتُ الحبَّ في الثرى

فيصبح منه البقل يهتز رابيا

ويخرج منه حبه في رؤوسه

وفي ذاک آيات لمن کان واعيا

وأنت بفضل منک نجيت يونساً

وقد بات في أضعاف حوتٍ لياليا

وإني لو سبحت باسمک ربّنا

لأکثر إلّا ما غفرتَ خطائيا

فربَّ العباد أَلقِ سيباً ورحمة

عليَّ وبارک في بنيَّ وماليا

رُشدت وأنعمت ابن عمرو وإنما

تجنبت تنوراً من النار حاميا

بدينک رباً ليس ربٌّ کمثلہ

وترکک أوثان الطواغي کما هيا

وادراک الدين الذي قد طلبته

ولم تک عن توحيد ربک ساهيا

فأصبحت في دار کريم مقامها

تعلل فيها بالکرامة لاهيا

تلاقي خليل اللہ فيها ولم تکن

من النار جباراً إلى النار هاويا

امیہ بن الصلت کے صرف اسی ایک کلام میں جہاں اللہ کی وحدانیت اپنے اعلیٰ ترین مراتب پر نظر آتی ہے وہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا بھی ذکر ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر بھی ہے، حیرت انگیز طور پر امیہ بن الصلت کو یہ بھی

معلوم ہے کہ اللہ نے ہی یونس کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ بر آمد کیا، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ سورج کس کے حکم سے ابھرتا ہے، وہ یہ بھی گواہی دے رہا ہے کہ اللہ سے بڑا اور کوئی نہیں ہے، یعنی امیہ کو پتہ ہے کہ خدا کا نام "اللہ" ہے!! جس سے ثابت ہوتا کہ لفظ "اللہ" دورِ جاہلیت میں بھی مستعمل تھا اور موحدین تب بھی موجود تھے.. غرض کہ صرف اسی کلام سے قرآن کے آدھے احکام بر آمد کیے جاسکتے ہیں.. ایک اور کلام ملاحظہ فرمائیں:

الحمد للہ مُمسانا و مُصبحنا
بالخیر صبَّحنا ربي و مسَّانا
رب الحنيفة لم تنفد خزائنها
مملوءة طبَّق الآفاق سلطانا
ألا نبيٌّ لنا منَّا فيخبرنا
ما بُعدُ غايتنا من رأس مُجرانا
بينا يُرَبِّبُنا آباؤنا هلكوا
وبينما نقتني الأولاد أفنانا
وقد علمنا لَو أنَّ العلم ينفعنا
إن سوف يلحق أُخرانا بأولانا
وقد عجبت وما بالموت من عجب
ما بال أحيائنا يبكون موتانا
يارب لا تجعلنّي كافراً أبداً
واجعل سريرة قلبي الدهرَ إيماناً
واخلط به بُنيَتي واخلِط به بَشَري
واللحمَ والدمَ ما عُمِّرتُ إنسانا
إني أعوذ بمن حج الحجيج لہ
والرافعون لدين اللہ أركانا
مسلِّمين إليه عند حجِّهم
لم يبتغوا بثواب اللہ أثمانا

والناس رَاثَ علیھم أمر ساعتھم

فکل۔ھم قائل للدین أیَّانا

أیام یلقی نصاراھم مسیحَھُم

والکائنین ل۔ہ وُدّاًو قربانا

ھم ساعدوہ کما قالوا ال۔ ھھم

وأرسلوہ یَسُوفُ الغیثَ دُسُفانا

ساحي آیاطل۔ھم لم ینزعوا تفثاً

ولم یسلّوا ل۔ھم قملًاو صئبانًا

لا تخلطنَّ خبیثاتٍ بطیبة

واخلع ثیابک منھا وانجُ عُریانا

کل امریءٍ سوف یجُزی قَرضَہُ حسناً

أو سیئاً و مدیناً کالذي دانا

قالت أراد بنا سوءاًفقلت ل۔ھا

خزیان حیث یقول الزور بھتانا

وشق آذاننا کیما نعیش بھا

وجاب للسمع أصماخاًو آذانا

یالذۃ العیش إذ دام النعیم لنا

ومن یعش یلق روعاتٍ وأحزانا

من کان مکتئباً من سیّءٍ ذَ قطاً

فزاد في صدرہ ما عاش ذقطانا

یہ کلام تو شروع ہی اللہ کی صبح وشام حمد سے ہوتا ہے، اس میں وہ کہتا ہے کہ ”لا تجعلنی کافراً ابداً“ کہ اے رب مجھے کبھی کافر مت بنانا بلکہ میرے دل کو ایمان سے بھر دینا..!!اس میں حج کا ذکر بھی ہے اور یہ کہ حج کرنے والے ”مسلمین“ ہوتے ہیں، یہاں بھی اللہ کی حمد اپنے عروج پر نظر آتی ہے، غرض کہ ہم اگر صرف امیہ بن الصلت کی شاعری کا ہی جائزہ لیں تو قرآن اس کے سامنے چغلی کھاتا نظر آتا ہے، جاہلیت کی شاعری سے قرآن کا اقتباس ایک طویل باب ہے جس پر پھر کبھی سورج کی روشنی ڈالی جائے

گی، فی الحال میں اسی پر اکتفاء کرتا ہوں، اگر آپ کو عربی آتی ہے اور مزید کا شوق ہو تو امیہ بن الصلت کے دیوان کا کچھ حصہ یہاں ملاحظہ فرمائیں اور اپنی بے چارگی پر سر دُھنیں.

اور اب میں اپنے فاضل دوست کی اس للکار کی طرف آتا ہوں کہ: "یہ الزامی سوالات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس قرآن کے جیسا کلام پیش کرو اور قصہ ختم کرو۔ سامنے والا خود ہی ہار جائے گا" صدقے جاؤں اپنے یار کی اس للکار پر، لیجیے آپ کی یہ خواہش بھی پوری کیے دیتا ہوں:

بِسمِ الله الرحمنِ الرحيمْ

قُرْآنا عَرَبيًا أَنْزَلْناهُ على عَبْدِنا أَفَلا تَعْقِلونْ (1) سَيَقولونَ شاعِر كُفْراً بِدين اللهـ وَنُكرانـاً
وَماعَلَمْناهُ الشِعْرَ وَمايَنْبَغى لَهُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمونْ (2) بَلْ هُوَ قُرْآن مُنَزَل مِنْ فَوْقِ سَبع سـمواتِ
طِباق مِنْ عِنْدِ رَبّ رَّحيمْ (3) يا أَيُها الناسُ إنَّ هذا القُرْآنَ هُوَ هَـدْيُكمْ فَمَـنْ تَنَحى عَنْـهُ
مَثلهُ كَمَثَلِ الإِبِل إِذْ ضَلَّتْ وما الله بِهاد لِلْقَوْمِ الظالِمينْ (4) يا أَيُها الناسُ إنا خَلَقْناكُمْ مِنْ
تُراب صَلْصال لَعَلكم تَشْكُرونْ (5) وَفَرَضْنا عَلَيْكُـمُ الصـلاوَةْ والزَّكـوَة لِتُقْرِضـوا اللهـ
قَرْضا حَسَنا يُضاعِفهُ لَكُمْ جَنَّاتِ تَجْرى تَحْتها الأَنْهار وَلَكُمْ فيها ما تَشْـتَهونَ مِـنَ الحـورِ
العينِ نُزَوِجَكمْ إياهُنَّ لايَعْصينَكمْ فِيما تَطْلبونْ (6) تَنْكِحوهنِ مُقْبِلاتِ وَمُدْبِرات كُلما
فُضَتْ بكارَتهُنَّ أَرْجَعناهُنَّ أَبكـارا لَكُـمْ وَكـذلِكَ الفِـرْدَوسَ أَعْـدَدْناها لِلْمُـؤْمِنينْ (7)
يَسْأَلونَكَ عَنِ الحُدود نَحْنُ نُعلِمْكَ حُدودَنا وَلَيْسَ فى الدينِ حَرَج تِلْكَ نِعَمُ اللهـ عَلَيْكُـمْ أَنْ
جَعَلَ لَكُمْ حُدودا فَلا تَقْرَبوها وَالله عَليمُ بِما تُسِرون وَما تُعْلِنونْ (8) فَالعَبْـدُ بِالعَبْـدِ وَإِنْ
قَتَلَ نَفَر عَبْدا لَكُمْ فَجَزائم أَنْ تَقْتُلوا عَبْدا لَهُمْ وَإِنْ عَفَيْتُمْ وَأَصْـلَحْتُمْ فـالله واسِـع عَليـمْ
(9) وكَذلِكَ الأَمةُ بالأَمَةِ فَإِنْ جاروا عَلى مامَلَكَتْ يَمينكمْ فَجَزاء ذلِـكَ أَنْ يُـؤَدوا لَكُـمْ
عَنْ كُل أَمة واحِدَة مِنْ إِمائهم تَسْتَمْتِعونَ بِها شَهْرَيْن أَوْ ثلاثـة ذلكـم حُكْـمُ اللهـ لامـانِعَ
لِحُكْمِهِ هُوَ الحكيمُ (10) ياأَيُها النَبِىُ قُلْ لِلْمُؤْمِناتِ مِنَ الحَـرائِرَ أَنْ يَتَحَجَبْنَ لِنَميزَهُـنَّ عَـن
الإِماء فلا يَقْرَبهُنَّ مَنْ فى نَفْسِهِ مَرَضُ إِنْ هُنَّ ذَهَبْنَ لِلْخَلاءِ لِيَقْضـينَ حَـوائِجَهُنُ لِيُريـد اللهـ
بِكُمْ الستر هُوَ السَّتارُ المَتينْ (11)

صَدق الله العظيمْ

آپ کی ”ہار“ کے لیے کافی ہے یا مزید پیش کروں؟ چلیے کیا یاد کریں گے، ایک اور نمونہ پیشِ خدمت ہے:

بِسمِ الله الرحمنِ الرحيمْ

سُبْحانَ مَنْ يُسَبِحُ بِحَمْدِهِ الإنْسُ والجْانْ (1) يا أَيُها اللذِيـنَ آمَنـوا لاتَسْـمَعوا لأَيِ كافِرٍ فَتـانْ (2)
وَنَبِيَكُمْ فَأَطيعوا ليَزيدَكُمُ اللهُ حَسَناتٍ وَيُدْخِلَكُمْ الجِنانْ (3) وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلاً كَيْفَ سَخَرْنا
مُلْحِداً أَنْ أَقِمْ بَلْدَتِنا وأَسْمَيْناها باكِسْتانْ (4) ثُمَّ بَعْدَ ذلِكَ سَلَّمْنا مَفاتيحَ بَلْدَة اللهِ لِعَبْدِ مِنْ عِبادِنا
الْبَتانْ (5) فَأقامَ فيها حُكْمَ اللهِ وأَطالَ لِحى الرِجالِ ونَقَبَ النِسْوانْ (6) فَرَفَعناهُ عِنْدنا وأَعْطَيْناهُ
جَبَلٌ مِنْ ذَهَبٍ وَجَبَل مِنْ فِضَةٍ بِما أَحْسَنَ وَكانَ بِما رَزَقناهُ فَرْحانْ (7) وَقُلْ لِلْمُؤْمِنينَ هَلْ لَكُمْ
بِتِجارةٍ لاتبورُ بِها رِبْحانْ (8) أَنْ قاتِلوا فِي سَبيلِ اللهِ واقتُلوا كُلَّ كافِرٍ أَثامْ (9) لَكُمْ مَغانِمَ
تَكْسَبونَها ونِسائُهِمْ حِلِ لَكُمْ وَكَذا تَسْتَعْبِدونَ الغِلْمانْ (10) وَفى الآخِرَةِ لَكُمْ جَناتِ عَدْنِ
وماجزاء الإحْسانَ إلآ الإحْسان (11) رَحْمَةٌ مِنَ اللهِ وَغُفرانْ (12) وإذا أَسَرْتُمْ كافِراً وَلَمْ يُسْلِمْ
فاقْتُلوهُ ولا تَأْخُذْكُمْ بِهِ رَأْفَةٌ لِيَرْزُقكم الله جَناتِ وَحورٍ حِسان (13) واحْرُقوا زَرْعَهُمْ أَلا ساء
زَرْعُ مَنْ كَفَرَ بِرَبهِ فَأَصْبَحَ خاسِئاً خَسْران (14) يا أَيُها اللذِينَ آمَنوا إنَّ اليَهودَ كانوا لَكُمْ أَعْداء
فاقْتُلوهُمْ كَبُرَ عِنْدَ اللهِ ما أَتوا بِهِ مِنْ بُهْتانْ (15) وَكَذلِكَ النَصارى لَعَنَهُمْ اللهُ فقاتِلوهُمْ لَعْنَةُ اللهِ
عَلَيْهِمْ إلى يَوْمِ القِيامَةِ بِئْسَ القَوْم أَغْشى اللهُ عَلى أَفِيدَتِهِمْ فَهُمُ العُمْيانْ (16) والهِنْدَوسَ عَبَدَة
البَقَرِ مِنْ دونِ اللهِ أَعْدِموهُمْ بِما افتروا على اللهِ لَهُمْ فى الدنيا خِزْئُ وفِي الآخِرَةِ خُسْران (17) إنَّ الله
عَظيمُ الْمَغْفِرَةِ إنَّهُ الحَنانُ المَنانْ

صَدق الله العظيمْ

جذباتی قسم کے لوگوں کو اتنی سی بات سمجھ نہیں آتی کہ وہ انسان جو اپنی عقل سے چاند پر پہنچ گیا اور اب مریخ کو سر کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے وہ ایک معمولی سی کتاب کے آگے بے بس ہو جائے گا؟

فاعتبروا یا اولی الالباب..!!

ویسے اگلی بار کس کا پنگا لینے کا ارادہ ہے؟

کنواری کا بیٹا

سب سے پہلے تو میں یہ واضح کر دوں کہ میری نظر میں بچوں کا جواز شادی کے بندھن سے مشروط نہیں ہے، ہر انسان کا جواز اس کے اپنے وجود اور ذات میں پوشیدہ ہے لہذا میری انسانیت کی شریعت میں کوئی حرامی یا ابن الزنا نہیں ہے، یہ تحقیری الفاظ جو انسان کی تذلیل اور اس کے انسان ہونے کے حق کی توہین کرتے ہیں خدا کی شریعت میں ہیں جس کا دعوی ہے کہ وہ انسان سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے!!

"تم حق کو جانتے ہو اور حق تمہیں آزاد کرتا ہے" یہ یوحنا کی انجیل کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام) کا فرمان ہے، تو کیا مجھے حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مقدس خاندان کے بارے میں جاننے کا حق ہے؟ کیا یہ خاندان خدا مریم اور مسیح (علیہ السلام) پر مشتمل ہے یا خدا روح القدس اور مسیح (علیہ السلام) پر مشتمل ہے... یا پھر صرف خدا یوسف اور مسیح (علیہ السلام)؟ کیوں نہ ان کی معجزانہ ولادت پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی جائے اگرچہ ان کا وجود ہی ایک تاریخی شخصیت کے طور پر متنازعہ ہے تاہم یہاں مجھے اس سے کوئی دلچسبی نہیں ہے کہ وہ تھے یا محض بولس کے ذہن کی اختراع تھے، سوال یہ ہے کہ کیا وہ واقعی خدا کے بیٹے تھے؟ یا وہ خدا بیٹا اور روح القدس کے مثلث کا حصہ ہیں؟ یا پھر وہ کنواری ولادت کا شاخسانہ ہیں جس میں خدا اور فرشتوں نے اہم کردار ادا کیا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ انتہائی سادہ طریقے سے یوسف بڑھئی کے بیٹے ہوں یا پھر کسی ایسے شخص کے جس نے بدنامی اور معاشرے کے ڈر سے تاریخ کے اندھیروں میں چھپنا منظور کیا؟

بی بی مریم ایک نوجوان دوشیزہ تھیں جن کی منگنی انجیلوں کے مطابق یوسف بڑھئی نامی شخص سے ہوئی تھی، یہاں تک تو سب ٹھیک ٹھاک تھا مگر ایک دن خدا کا ایک فرشتہ ان کے پاس آکر انہیں بتاتا ہے کہ وہ حاملہ ہیں مگر یقیناً یوسف بڑھئی سے نہیں بلکہ براہِ راست خدا سے!! اور وہ انتہائی سادگی سے یہ بات قبول کر لیتی ہیں، رہے یوسف تو جیسے جیسے حمل کی علامات ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں انجیلوں کے مطابق انہیں شک ہونا شروع ہو جاتا ہے، یوسف بڑھئی کو مطمئن کرنے کے لیے وہی فرشتہ انہیں خواب میں آکر حقیقتِ حال سے آگاہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جو بچہ بی بی مریم کے پیٹ میں پل رہا ہے وہ ان کا نہیں بلکہ خدا کا ہے؟؟ کچھ عرصہ بعد بی بی مریم کے ہاں ایک لڑکے کی ولادتِ باسعادت ہوتی ہے جس کا نام وہ یسوع رکھتی ہیں اور یوسف جو اس بچے کے والد نہیں ہیں ان پر اس بچے کی ساری ذمہ داری آن پڑتی ہے.

کیا یسوع (علیہ السلام) کی اس افسانوی ولادت میں کوئی خاص پیغام ہے؟ کیا ان کا کسی کنواری کے بطن سے پیدا ہونے میں کوئی فائدہ ہے؟ اگر وہ باقی ابراہیمی انبیاء کی طرح سادہ اور طبعی طریقے سے پیدا ہوتے تو اس میں کیا نقصان ہوتا؟ یقیناً کچھ نہیں، یہاں

تکلف اور کہانی گھڑنے کی کوشش قطعی واضح ہے، انجیلوں کے مصنفوں کی یہ فنکاری سمجھنے کے لیے کسی فلاسفر کی ضرورت نہیں، جہاں یہ مصنفین ایک فرشتہ گھڑتے ہیں جسے کسی نے نہیں دیکھا جو بی بی مریم کو ایک اچانک اور ناگہانی حمل کی بشارت دیتا ہے وہ بھی ایک ایسے باپ سے جس کی اس نے کبھی خواب میں بھی توقع نہیں کی ہوگی، پھر ایک خواب گھڑا جاتا ہے جو بے چارے یوسف کو دکھایا جاتا ہے اور اسے ایک ایسے بچے کا باپ بنادیا جاتا ہے جو اس کا ہے ہی نہیں، پھر یہودیوں کی ایک کثیر آبادی گھڑی جاتی ہے جو تاریخی طور پر وجود ہی نہیں رکھتی، پھر بی بی مریم اور یوسف کو بیت لحم پہنچا دیا جاتا ہے جہاں مسیح (علیہ السلام) کی آمد کی سابقہ پیشگوئیوں کے عین مطابق نہ صرف ایک ولادت گھڑی جاتی ہے بلکہ ایسے لوگ بھی پیدا کر لیے جاتے ہیں جو اس بچے کو سجدہ کرتے ہیں.. غرض کہ یہ ساری میتھالوجی اس وقت رائج مشرقی مذاہب سے چوری شدہ ہے.

یہ تو تھا وہ افسانوی سا انجیلی قصہ، اس قصے کا دوسرا رخ انتہائی سادہ اور سہل ہے جس کا تعلق ایک ایسی نوجوان دوشیزہ سے ہے جو کسی شخص سے منگنی شدہ یا شادی شدہ ہے، یوں اسے حمل ٹھہر جاتا ہے اور وہ ایک لڑکا پیدا کرتی ہے بالکل جس طرح روزانہ ساری دنیا میں یہ عمل ہوتا ہے، تو پھر کہانی کو اتنا افسانوی ٹچ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس معجزانہ ولادت پر دنیا کے کروڑوں لوگ ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں مگر کیا اس یقین کے پیچھے کسی مقصد کو تلاش کیا جاسکتا ہے؟ یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ ایک کنواری دوشیزہ کے جسم میں انڈہ خود ہی کیسے فیزن کے عمل سے گزرنا شروع ہوگیا؟ اس نے ایک خلیے کے کروموسومز کو 23 سے 46 میں کیسے دگنا کر لیا جو مولود کے زندہ ہونے کے لیے کم سے کم حد ہے؟ اگر معجزانہ طور پر یہ رکاوٹیں ہم پار کر بھی لیں تو بھی سب سے اہم سوال یہ ہے کہ مولود لڑکا کیسے ہوگیا جبکہ جو کروموسوم لڑکے کی جنس کا تعین کرتا ہے وہ صرف باپ کے پاس ہوتا ہے ماں کے پاس نہیں؟

کنواری کا بچہ پیدا کرنا صرف مسیحی کہانی نہیں ہے، یہ افسانہ یسوع (علیہ السلام) کی پیدائش سے بہت پہلے مشرقِ وسطائی وغیر مشرقِ وسطائی مذاہب میں موجود تھا:

1- عراقی خدا تموز کو ایک کنواری نے جنم دیا تھا.

2- مصری خدا اسیرس 25 دسمبر کو ایک کنواری کے ہاں پیدا ہوا تھا.

3- یونان کا ہرکولیس دسمبر کے مہینے میں ایک کنواری سے پیدا ہوا تھا.

4- بھارتی خدا کرشنا بھی دیوکی نامی کنواری سے پیدا ہوا تھا اور صلیب پر مرا تھا.

5- بدھا بھی ایک مایا نامی کنواری سے 25 دسمبر کو پیدا ہوا تھا اور صلیب پر مرا تھا.

اور یوں ہی افسانے تہذیب در تہذیب اور نسل در نسل چلتے رہتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت عقائد کی شکل میں موجود رہتے ہیں، مگر زمانہ کوئی بھی ہو، یہ افسانے ہمیشہ حق سمجھے جاتے ہیں اور ان پر بحث کرنے والا بد بخت ہمیشہ کافر.

نمرود کی بے وقوفی

جب اہلِ عراق نے شاہ نمرود بن کنعان کو یہ شکایت کی کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے سارے بت توڑ دیے ہیں تو نمرود نے ابراہیم (علیہ السلام) کو بلوا کر کہا کہ:

نمرود: تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟

ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: استغفر اللہ کچھ نہیں...

نمرود نے کہا: یہ کون سا خدا ہے جس کا تم دعوی کر رہے ہو؟

ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: اللہ میرا خدا ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے..

نمرود انہیں کونے میں لے گیا اور کہا: زندگی اور موت میں دیتا ہوں..

پھر نمرود نے دو آدمی بلائے، ایک کو مار دیا اور دوسرے کو معاف کر دیا...

ابراہیم (علیہ السلام) کو کچھ جھٹکا لگا، لیکن وہ گویا ہوئے کہ: میرا خدا سورج کو مشرق سے لاتا ہے تم اسے مغرب سے لا کر دکھا دو!!

اب نمرود کو جھٹکا لگا..

پھر کسی وقت ایک آیت نازل ہوئی:

(أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ) سورہ گائے... میرا مطلب ہے سورہ بقرہ

اگر نمرود کے ساتھ ابراہیم (علیہ السلام) کا یہ قصہ درست ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل غیر منطقی تھی بلکہ نمرود گدھا تھا (نمرود بھائی سے معذرت کے ساتھ کہ آپ یقیناً بڑے طاقتور بادشاہ رہے ہوں گے مگر آپ بے وقوف تھے)

ابراہیم (علیہ السلام) کی حجت تھی کہ ان کا خدا سورج کو مشرق سے لاتا ہے آپ اسے مغرب سے لا کر دکھائیں...

ویری گڈ...

نمرود بھائی... آپ نے انہیں یہ کیوں نہیں کہا کہ کیا آپ کا خدا اسے ابھی اسی وقت مغرب سے لا سکتا ہے!!؟

ٹینشن ہو گئی نا...

یو مسڈ اٹ مسٹر نمرود...

اب کوئی فائدہ نہیں... ڈائریکٹر یہی چاہتا تھا کہ: فبہت الذی کفر.

الکلام الفرقان فی خزعبلات الدکتور جواد خان

لگتا ہے اس پانچویں فیل سے بڑے بڑے مومنین کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میری ہر تحریر پر کوئی نہ کوئی مومن لمبا چوڑا رد لکھ مارتا ہے، شروع میں رد بڑے سادہ اور روایتی تھے، لیکن میرے سمجھانے پر کچھ فرق پڑا ہے، خصوصاً میرے عزیز دوست ڈاکٹر جواد خان صاحب کو اب "ردود" لکھنے کا سلیقہ آ گیا ہے اور اب وہ صرف قرآن سے ہی نہیں بلکہ سابقہ مقدس کتابوں کی بھی خوب ورق گردانی کر کے دلائل پیش کرتے ہیں، پہلے کی طرح میری "قرآن اور اسرائیلیات" پر بھی دو عدد ردود منظرِ عام پر آئے، پہلا رد اگرچہ اچھا قرار دیا جا سکتا ہے مگر روایات سے ہٹ کر اس میں کوئی نیا پن نہیں تھا اس لیے میں نے بھی اسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھا، تاہم ڈاکٹر جواد خان صاحب کا رد اتنا کمال کا تھا کہ میں اسے نظر انداز نہ کر سکا، مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انہوں نے "رد" کا حق ادا کر دیا، مگر افسوس کہ انہوں نے میری جس تحریر کا رد لکھا اس کے اصل مقصد کو سمجھا ہی نہیں اور بات کسی اور نہج پر لے گئے، اگر وہ مضمون کے "مضمون" پر رہتے ہوئے بات کرتے اور اصل مدعے کو رد کرتے تو شاید میری بھی کچھ اصلاح ہو جاتی.

بہر حال جو بھی ہے، میرے عزیز جراح کو یقین تھا کہ میں ان کے "رد" کا "رد" ضرور لکھوں گا کیونکہ اپنی تحریر میں وہ جابجا مجھ سے ٹیڑھے میڑھے سوالات کر کے مجھے "رد" لکھنے پر اکسا رہے تھے، اور مجھے یقین ہے کہ عوام کو بھی اس رد کے رد کا بڑی بے صبری سے انتظار ہو گا، اور اتنی عوام کو مایوس کرنا میں گناہِ کبیرہ سمجھتا ہوں

تو چلیے دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی زنبیل میں کیا کیا معجزات ہیں..

پہلا سوال یا اعتراض وہ یوں اٹھاتے ہیں:

"مکّی صاحب نے اپنے مضمون کی ابتدا قرانی آیات سے کی. طرفہ تماشہ یہ کہ انکے مضمون میں قرآن کی آیات جو کہ کفّار کے اظہار لاتعلقی کے طور پر پیش کی جارہی تھیں، موصوف نے انھیں کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کا الزام بنادیا. سورہ الانعام کی آیات ۲۵ یا سورہ الانفال کی آیت ۳۱ میں الزام یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم کوئی الہامی کتاب نہیں ہے اور یہودیوں کی کتاب کا چربہ ہے (نعوذوباللہ) بلکہ کفّار مکّہ کا یہ اظہار لاتعلقی تھا کہ جس میں وہ کہتے تھے کہ یہ تم کیا گئے گزرے زمانوں کی باتیں کرتے ہو اور کیا پرانی داستانیں سناتے رہتے ہو"

کیا مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں کفار نے یہ الزام نہیں لگایا کہ قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اس طرح کا کلام وہ خود بھی کہہ دیں؟ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے تو کیا اس سے یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ یہ کہانیاں انہوں نے پہلے بھی سن رکھی تھیں اور جب قرآن نے آکر وہی کہانیاں دوبارہ دہرا دیں تو انہیں اس میں کوئی نیا پن نظر نہیں آیا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کہا کہ یہ "اساطیر الاولین" پر مشتمل ہے جنہیں وہ خوب جانتے ہیں، یہ بات میرے فاضل دوست بھی مان رہے ہیں اور میرا مقصد بھی اسی بات کی طرف توجہ دلانا تھا.

"پتہ نہیں فاضل مضمون نگار کے یہاں درستگی اور اور خطا کا کیا مفہوم ہے مگر یہ بات سب کو معلوم ہے کہ موجودہ الہامی کتب تحریف شدہ ہیں اور ان کتابوں میں تحریف ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ عیسائی علما بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے. بائبل شاید دنیا کی واحد کتاب ہے جس پر اتنی بار نظر ثانی ہو چکی ہے کہ جس کی نظیر کسی بھی الہامی کتاب کے لئے نہیں ملتی. یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کے حضرت مکّی جیسے فاضل شخص کی علم سے باہر ہو سکتی ہے"

میں نے اس پورے مضمون میں کہاں کہا ہے کہ موجودہ الہامی کتابیں تحریف شدہ نہیں ہیں؟ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے؟

پھر میرے فاضل دوست تفسیر ابن کثیر سے اسرائیلیات کے حوالے سے کچھ اقتباس کر کے فرماتے ہیں:

"یہاں تفسیر ابن کثیر کے اقتباسات پیش کرنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ اسرائیلیات کا دین اسلام میں کہاں تک دخل ہے اور اسکے نقل کرنے میں کن اصولوں کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے"

یہ میرے دوست کی تسلی کے لیے کافی ہوگا میرے لیے نہیں، کیونکہ اسرائیلیات کا دخل اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ میرے فاضل دوست سمجھتے ہیں، میرے مضمون میں جن اسرائیلیات کا تذکرہ کیا گیا تھا میرے فاضل دوست نے ان میں سے ایک کا بھی تسلی بخش جواب دینا ضروری نہیں سمجھا، مثلاً میں نے کہا تھا کہ حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ شاہ سرجون الاکادی کا ہے، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ سورہ مائدہ کی آیت 45 میں وارد قانون در حقیقت حمورابی کے قوانین سے آیا ہے، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کا قانون جاہلیت میں بھی موجود تھا، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ حج جاہلیت کی ایک رسم تھی اور ایسے کئی دیگر الزامات لگائے تھے جن پر سارے مضمون کا دار و مدار تھا مگر میرے فاضل دوست کا یا تو تجاہل عارفانہ کمال کا ہے یا پھر وہ رد کرنے سے قاصر تھے.

اس سے آگے وہ فرماتے ہیں:

"مصدر اور خدائی پیغام ایک ہی ہے لہٰذا واقعات کا ایک جیسا ہونا زیادہ اچھنبے کی بات ہے بجائے واقعات کے ایک جیسا ہونے کے"

نہیں جناب ان دونوں سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ واقعات کے مقامات اور کردار کہیں اور ثابت ہو رہے ہوں..

ڈاکٹر صاحب خاتم الانبیاء پر جہالت کا الزام لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے"

یہ دنیا کا سب سے بڑا مذاق ہے، ایک طرف جس نبی کی شان میں دن رات قصیدے گائے جاتے ہیں اسی نبی کو ان پڑھ جاہل قرار دے کر اسے معجزے کا نام دے دیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت میں انہیں جاہل کہنے والے خود سب سے بڑے جاہل ہیں (تعمیم

ہے تخصیص نہیں)، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے لمبی چوڑی تجارت سنبھال رکھی ہو اور اسے پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو؟ اور کیا "اُمی" کا مطلب ان پڑھ ہے؟ کیا نبوت کا دار و مدار وحی پر ہے یا پڑھنے لکھنے پر؟ جائیے اور ان کے ان پڑھ ہونے کے قوی ترین ثبوت جو آپ کو مل سکیں ڈھونڈ کر لائیے، پھر اس کے بعد میں آپ کو ثابت کر دوں گا کہ وہ ان پڑھ جاہل نہیں تھے پھر بیٹھ کر فیصلہ کریں گے کہ گستاخِ رسول کون ہے اور اس کے معیارات کیا ہیں..!؟

اس کے بعد میرے فاضل دوست کچھ بائبلی خرافات نقل کر کے فرماتے ہیں:

"اگر قرآن کریم کسی بھی کتاب کی نقل ہے تو یہ خرافات قرآن کریم میں کیوں نقل نہیں ہوئیں؟ کیوں یہ کتابیں خدا کا ایک اعلیٰ وارفع اور منطقی تصور پیش کرنے میں قرآن کریم کے برعکس ناکام ہیں؟"

میں نے کب کہا کہ میں ان کتابوں پر یقین رکھتا ہوں؟ اور کیا کسی کتاب میں خرافات کا نہ ہونا اسے مقدس بنا دیتا ہے؟ عجیب منطق ہے..!! اور کیا آپ کے خیال میں قرآن میں خرافات نہیں ہیں؟ اگر آپ کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو ایک نمونہ پیش کرنا چاہوں گا:

وَّاَنَّا لَمَس نَا السَّمَآءَ فَوَجَد نٰہَا مُلِئَت حَرَسًا شَدِی دًا وَّ شُہُبًا ﴿۸﴾ وَّ اَنَّا کُنَّا نَق عُدُ مِن ہَا مَقَاعِدَ لِلسَّم عِ ؕ فَمَن
یَّس تَمِعِ ال اٰنَ یَجِد لَہٗ شِہَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ سورہ جن، آیت 8 اور 9
اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسکو مضبوط چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا۔ اور یہ کہ پہلے ہم وہاں بہت سے مقامات پر فرشتوں کی باتیں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ اب کوئی سننا چاہے تو اپنے لئے انگارہ تیار پاتا ہے۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّن یَا بِزِی نَۃِ ال کَوَاکِبِ ﴿۶﴾ وَحِف ظًا مِّن کُلِّ شَی طٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾ لَا یَسَّمَّعُو نَ اِلَی
ال مَلَاِ ال اَع لٰی وَیُق ذَفُو نَ مِن کُلِّ جَانِبٍ ☆ ﴿۸﴾ دُحُو رًا وَّ لَہُم عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَن خَطِفَ
ال خَط فَۃَ فَاَت بَعَہٗ شِہَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾
بیشک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے سجایا۔ اور ہر شیطان سرکش سے اسکی حفاظت کی۔ کہ اوپر کی مجلس کی طرف کان نہ لگا سکیں اور ہر طرف سے ان پر انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ یعنی وہاں سے نکال دینے کو اور انکے لئے ہمیشہ کا عذاب ہے۔ ہاں جو کوئی فرشتوں کی کسی بات کو چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے تو جلتا ہوا انگارہ اسکے پیچھے لگ جاتا ہے۔

وَلَقَد ◌ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّن ◌ يَا بِمَصَابِي ◌ حَ وَجَعَل ◌ نٰهَا رُجُو ◌ مًا لِّلشَّيٰطِي ◌ نِ وَاَع ◌ تَد ◌ نَا لَهُم ◌ عَذَابَ السَّعِي ◌ رِ ﴿۵﴾

اور ہم نے قریب کے آسمان کو تاروں کے چراغوں سے زینت دی اور انکو شیطانوں کے مارنے کا آلہ بنایا اور ان کے لئے دہکتی آگ کا عذاب تیار کرر کھا ہے۔

چلیے کسی فلکیات دان کے پاس چلتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ ہمارا قرآن کہتا ہے کہ ستارے اور شہابیے محض شیطانوں کو مار بھگانے کے آلوں کے سوا کچھ نہیں ہیں پھر دیکھتے ہیں کہ ہمیں کتنے جوتے پڑتے ہیں..!؟(ہم سے مراد میں بھی جوتے کھانے والوں میں شامل ہوں)

رہی بات کہ "کیوں یہ کتابیں خدا کا ایک اعلیٰ و ارفع اور منطقی تصور پیش کرنے میں قرآن کریم کے برعکس ناکام ہیں" تو قرآن کون سا کامیاب رہا؟ ایک پتھر کے گرد چکر لگانے اور اسے چومنے چاٹنے میں اور کرشن بھگوان اور گائے ماتا کے آگے سر نگوں ہونے میں کیا فرق ہے؟ اور کیا اس صورت میں گائے ان پتھروں سے زیادہ فائدہ مند نہیں؟

پھر میرے فاضل دوست نے بائبل سے بقول ان کے کچھ "فحش" اقتباسات پیش کر کے فرمایا:

"کیا فاضل مضمون نگار کو انبیا علیہم صلواۃ السلام سے منسوب گھناؤنی، بیہودہ اور انتہائی فحش داستانیں، (معاذ اللہ) قرآن مجید میں نظر آتی ہیں"

کیا آپ واقعی ایسا سمجھتے ہیں؟ یا آپ کی آنکھوں پر تقدس کی پٹی اس قدر کس کے بندھی ہے کہ آپ کو کچھ نظر نہیں آتا؟ آپ کی اجازت سے ایک اور نمونہ پیشِ خدمت ہے:

وَجَآءَ اَه ◌ لُ ال ◌ مَدِي ◌ نَةِ يَس ◌ تَب ◌ شِرُو ◌ نَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ ھٰٓ ؤُلَآءِ ضَي ◌ فِي ◌ فَلَا تَف ◌ ضَحُو ◌ نِ ﴿۶۸﴾ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخ ◌ زُو ◌ نِ ﴿۶۹﴾ قَالُو ◌ ا اَوَلَم ◌ نَن ◌ هَكَ عَنِ ال ◌ عٰلَمِي ◌ نَ ﴿۷۰﴾ قَالَ ھٰٓ ؤُلَآءِ بَنٰتِي ◌ اِن ◌
كُن ◌ تُم ◌ فٰعِلِي ◌ نَ ﴿۷۱﴾

اور آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے[۵۶] لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھ کو رسوا مت کرو[۵۷] اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ[۵۸] بولے کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا جہان کی حمایت سے[۵۹] بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے[۶۰] (سورہ الحجر)

یہ کیسے نبی ہیں جو لونڈوں کو بچانے کے لیے اپنی بیٹیاں اجتماعی آبروریزی کے لیے مسٹنڈوں کو پیش کر رہے ہیں؟ کیا یہ بے ہودہ اور انتہائی فحش داستان نہیں؟ مجھے پتہ ہے کہ آپ سورہ حجر کی آیت نمبر 71 کی کیا تاویل پیش کریں گے، میں چاہتا ہوں کہ آپ وہ تاویل پیش کریں کیونکہ لغوی، منطقی، اور سیاقی لحاظ سے اس احمقانہ تاویل کی دھجیاں بکھیرنے میں تبھی مزہ آئے گا.. اور ہاں یہ کہانی سابقہ مقدس کتابوں کے عین مطابق ہے.

میرے دوست مزید فرماتے ہیں:

"ان الزامات کو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے نہایت خوبصورت اور محکم دلائل کے ساتھ رد کیا ہے. ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر آپ قرآن اور بائبل کا جائزہ لیں تو کئی مقامات پر ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے. لیکن اگر آپ انکا گہرائی سے تجزیہ کریں تو ان میں خفیف سا فرق نظر آئے گا. اس فرق کو اگر آپ سائنسی معلومات کی روشنی میں دیکھیں تو یہ ۲ باتیں ثابت ہو جائیں گی. ایک قرآن کریم نے قصّوں کو نقل نہیں کیا ہے اور دوسری سائنسی معلومات کی روشنی میں قرآن کریم کی حقانیت بھی کھل کر ثابت ہو جاتی ہے"

ڈاکٹر ذاکر نائک کی میں عزت کرتا ہوں، لیکن جہاں بات قرآن سے سائنس کشید نے کی آتی ہے تو ان میں اور ہارون یحیی جیسے جعلساز میں کوئی فرق نہیں رہتا، ایسے لوگ ہمہ وقت ہر جدید سائنسی دریافتوں کو کیچ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، اور پھر اپنا سارازور قرآن میں ایسی کسی آیت کی تلاش میں لگا دیتے ہیں تا کہ یہ ثابت کر سکیں کہ قرآن میں یہ جدید ترین علمی دریافت اگر ازل سے نہیں تو کم سے کم چودہ سو سال پہلے سے ضرور موجود تھی!! میرے خیال سے ماہرین علوم ارض (Geology) حضرت موسی علیہ السلام کے سمندر کو اپنے عصا سے چیر دینے کے عمل کو سائنسی طور پر بیان کر کے انتہائی راحت محسوس کریں گے، نا ہی طبیعات دانوں اور کیمیاء دانوں کو سائنسی طور پر یہ سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ اچانک "برد و سلام" کیسے ہو گئی، نا ہی فلکیات دانوں کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی پش و پیش ہو گا کہ شہابیے اور دمدار ستارے دراصل شیطانوں کو مار بھگانے کے لیے کام آتے ہیں تا کہ وہ فرشتوں اور خدا کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکیں..!؟

ہر جدید سائنسی دریافت منظر عام پر آنے کے بعد ہی قرآن سے کیوں بر آمد ہوتی ہے؟ اسے دن رات طوطے کی طرح رٹنے والے ایسی سائنسی دریافتیں کیوں نہیں کر سکے؟ کیا سائنسدان قرآن کو پڑھ کر یہ سائنسی دریافتیں کرتے ہیں؟ نہیں جناب وہ تو قرآن کو مانتے ہی نہیں، تو پھر وہ ایسے کارنامے کیسے انجام دے لیتے ہیں؟ کیونکہ وہ اپنی عقل کا استعمال کرتے ہیں جو اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے پاس نہیں ہے، جب انسان نے ترقی کی منزلیں اپنی عقل کے استعمال سے ہی طے کرنی ہیں تو مقدس

کتابوں میں سائنس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہندو بھی اپنی مقدس کتابوں سے سائنس بر آمد کر لیتے ہیں تو کیا آپ مان لیں گے کہ یہ خدا کی اتاری ہوئی کتابیں ہیں؟ یہودی اور عیسائی بھی اپنی اپنی مقدس کتابوں سے سائنس بر آمد کرتے ہیں تو پھر آپ انہیں کیوں نہیں مانتے؟

ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں:

"بائبل (پیدائش ۱:۳-۵) کہتی ہے کہ خدا نے دن اور رات کی تخلیق پہلے دن کی. دوسری طرف بائبل کے ہی مطابق (پیدائش-۱:۱۴-۱۹) ستارے چوتھے دن تخلیق کے گئے. جو کہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے. اگر ستارے نہیں ہوں تو دن اور رات کا ہونا ممکن نہیں. دن اور رات کا ہونا سورج کے بغیر ممکن نہیں. قران کریم اس کے بر عکس اس طرح کا کوئی بیان دیتا نظر نہیں آتا. اگر فاضل مضمون نگار کو اس طرح کے کسی بیان کا علم ہوتا تو مجھے قوی یقین تھا کہ وہ ایک لمحہ ضایع نہیں کرتے اپنا فیصلہ سنانے میں. سوال پھر وہیں آجاتا ہے کہ اگر قران کریم کسی کتاب کی نقل ہے تو یہ مضحکہ خیزیاں قران میں کیوں نہیں؟"

بھئی دوسرے کی آنکھ میں تنکا بھی ہو تو نظر آجایا کرتا ہے، اور اپنی آنکھ میں شہتیر بھی ہو تو نظر نہیں آتا، چلیے میں آپ کو ایسی ہی ایک مضحکہ خیزی قرآن سے نکال کر دیتا ہوں:

قُل ◌ اَئِنَّکُم ◌ لَتَک ◌ فُرُو ◌ نَ بِالَّذِی ◌ خَلَقَ ال ◌ اَر ◌ ضَ فِی ◌ یَو ◌ مَی ◌ نِ وَتَج ◌ عَلُو ◌ نَ لَہٗ ◌ اَن ◌ دَادًا ◌ ذٰلِکَ رَبُّ
ال ◌ عٰلَمِی ◌ نَ ◌ ﴿۹﴾ وَجَعَلَ فِی ◌ ہَارَوَاسِیَ مِن ◌ فَو ◌ قِہَاوَبٰرَکَ فِی ◌ ہَاوَقَدَّرَفِی ◌ ہَا ◌ اَق ◌ وَاتَہَافِی ◌ اَر ◌ بَعَۃِ اَیَّامٍ
◌ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِی ◌ نَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اس ◌ تَو ◌ یٰ اِلَی السَّمَآءِ وَہِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَہَا وَلِل ◌ اَر ◌ ضِ ائ ◌ تِیَا طَو ◌ عًا اَو ◌ کَر ◌ ہًا ◌
قَالَتَا ◌ اَتَی ◌ نَا طَآئِعِی ◌ نَ ﴿۱۱﴾ فَقَضٰہُنَّ سَب ◌ عَ سَمٰوَاتٍ فِی ◌ یَو ◌ مَی ◌ نِ وَاَو ◌ حٰی فِی ◌ کُلِّ سَمَآءٍ اَم ◌ رَہَا ◌ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ
الدُّن ◌ یَا بِمَصَابِی ◌ حَ ☆ ◌ وَحِف ◌ ظًا ◌ ذٰلِکَ تَق ◌ دِی ◌ رُ ال ◌ عَزِی ◌ زِ ال ◌ عَلِی ◌ مِ ﴿۱۲﴾

کہو کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور بتوں کو اس کا مد مقابل بناتے ہو۔ وہی تو تمام جہانوں کا مالک ہے۔ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا سب چار دن میں۔ اور تمام طلبگاروں کے لئے یکساں۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر اس نے دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اسکے کام کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں یعنی ستاروں سے سجایا اور شیطانوں سے محفوظ رکھا۔ یہ اسی زبردست باخبر کے مقرر کئے ہوئے اندازے ہیں۔

یہاں پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمین دو دن میں بنائی گئی، پھر پہاڑ اور سامان معیشت چار دن میں بنائے گئے، (یعنی وہ دو دن جو زمین کو بنانے میں صرف ہوئے ان میں حیرت انگیز طور پر پہاڑ شامل نہیں تھے!!)، پھر سات آسمان دو دن میں بنائے، یعنی زمین، پہاڑ اور سامانِ معیشت چھ دن میں بنائے گئے جبکہ سات آسمان دو دن میں بنائے گئے، کیا یہ معقول بات ہے کہ زمین جیسا ادنی سا سیارہ جس کی اس کائنات کی وسعت کے سامنے کوئی وقعت نہیں کو بنانے میں چھ دن صرف ہوئے جبکہ سات آسمان بشمول اپنی وسعتوں اور کہکشاؤں کے صرف دو دن میں بنا لیے گئے!؟ اور اگر زمین اور تمام طلبگاروں (مخلوقات) کے لیے سامانِ معیشت آسمانوں سے پہلے بنائے گئے تو بغیر سورج کے وہ کیسے زندہ تھے!؟ چلیے اسی تناظر میں ایک اور تضاد دیکھتے ہیں:

ءَان◌ تُم◌ اَشَدُّ خَل◌ قًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ◌ بَنٰہَا ﴿◌ ۲۷﴾ رَفَعَ سَم◌ کَہَا فَسَوّٰىہَا ﴿◌ ۲۸﴾ وَاَغ◌ طَش لَی◌ لَہَا وَاَخ◌ رَجَ ضُحٰہَا ﴿◌ ۲۹﴾ وَال◌ اَر◌ ضَ بَع◌ دَ ذٰلِکَ دَحٰىہَا ﴿◌ ۳۰﴾ اَخ◌ رَجَ مِن◌ ہَا مَآءَہَا وَمَر◌ عٰہَا ﴿◌ ۳۱﴾ وَال◌ جِبَالَ اَر◌ سٰىہَا ﴿◌ ۳۲﴾ مَتَاعًا لَّکُم◌ وَلِاَن◌ عَامِکُم◌ ﴿◌ ۳۳﴾

بھلا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا؟ اللہ نے اسکو بنایا۔ اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کر دیا۔ اور اسی نے رات تاریک بنائی اور دن کو دھوپ نکالی۔ اور اسکے بعد زمین کو پھیلا دیا۔ اسی نے زمین میں سے اسکا پانی نکالا اور چارہ اگایا۔ اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدے کے لئے کیا۔

اب یہاں آسمان زمین سے پہلے بنایا گیا!! مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کھلے تضاد ان شاء اللہ میرے جراح کے ایمان کو قطعی متزلزل نہیں کر سکتے کیونکہ وہ الحمد للہ وراثتی مسلمان ہیں، اور عقل استعمال کرنے سے خدا نے سختی سے منع کر رکھا ہے.

”چاند اور سورج دونوں روشنی دیتے ہیں“ کے عنوان کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

”بائبل کے مطابق (پیدائش–۱:۱۶)”خدا نے دو روشنیاں تخلیق کیں. بڑی روشنی دن میں اجالا کرتی ہے اور چھوٹی روشنی رات میں“ جبکہ سائنسی طور پر یہ بات صاف ہے کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں لہٰذا اسکی روشنی کے بارے میں تخلیق کا لفظ استعمال کرنا غلط ہے. کیا فاضل مضمون نگار جانتے ہیں کہ قران کریم چاند اور سورج کی روشنیوں کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ قرآن کریم سورہ نوح میں کہتا ہے کہ:

وَجَعَلَ الۡقَمَرَ فِیۡہِنَّ نُوۡرًا وَّجَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا (۷۱:۱۶)

اور چاند کو ان میں (زمین) کا نور بنایا ہے اور سورج کو چراغ ٹھیرایا ہے.

کیا عربی میں مہارت رکھنے والے مّلی صاحب بتانا پسند کریں گے کے قرآن کریم میں سورج اور چاند کی روشنیوں کے حوالے سے الگ الگ الفاظ کیوں استعمال ھوئے؟ چاند کے لئے قران کریم میں قمر کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسکی روشنی کے لئے "منیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ عکسی روشنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے. کیا فاضل مضمون نگار بتانا پسند کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چودہ سو سال پہلے یہ حقیقت کس نے بتائی تھی کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہے؟ پھر وہی سوال کہ اگر قرآن کریم نقل ہے تو یہ کیسی نقل ہے کہ جو سائنسی غلطیوں کو نقل نہیں کرتی؟"

یہاں جراح صاحب نہ صرف مجھے چونا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اپنی ہی باتوں میں تضاد کا شکار ہیں، آیت کے ترجمہ میں وہ کہتے ہیں کہ چاند زمین کا نور ہے تو دوسری طرف کہتے ہیں کہ "اسکی روشنی کے لئے "منیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے"، کوئی مجھے بتائے گا کہ مذکورہ آیت میں لفظ "منیر" کہاں ہے؟

اور چونا مجھے یوں لگا رہے ہیں کہ ترجمہ میں قوسین میں لفظ "زمین" فٹ کر رہے ہیں جو کہ سیاق وسباق کے لحاظ سے بالکل غلط ہے،

یہ تو وہی بات ہوگئی کہ "فویل للمصلین" کہ نمازیوں کی خیر نہیں ، اس آیت کا مفہوم پچھلی آیت کے بغیر ناقص ہے، دیکھیے:

اَلَمۡ تَرَوۡا كَيۡفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الۡقَمَرَ فِيۡهِنَّ نُوۡرًا وَّجَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾

(سورہ نوح)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے سات آسمان کیسے اوپر تلے بنائے ہیں۔ — اور چاند کو ان میں روشن بنایا ہے اور سورج کو چراغ بنادیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ جو اوپر تلے سات آسمان بنائے گئے ہیں چاند کو "ان میں" (فِيۡهِنَّ) روشن بنایا ہے اور سورج کو چراغ، یعنی یہاں جو چاند اور سورج ہیں وہ ان ساتوں آسمانوں کے درمیان کہیں پر واقع ہیں اور انہیں روشن اور منور کر رہے ہیں!! یہ ہمارے جانے پہچانے چاند اور سورج نہیں ہیں، سو یہ قرآنی تضادات میں سے ایک اور تضاد ہے، روشنیوں کے حوالے سے الگ الگ الفاظ کے استعمال کو تو رہنے ہی دیجیے.

ڈاکٹر صاحب "آدم پہلے انسان تھے جو ۵۸۰۰ سال پہلے دنیا میں تھے" کے عنوان کے ذیل میں فرماتے ہیں:

”جبکہ علوم آثار قدیمہ اور ارضیات کے مطابق ۱۰ ہزار سال یا اس سے بھی پہلے تک انسان کی اس زمین پر موجودگی کے شواہد موجود ہیں. بائبل کے اس بیان کے برعکس قرآن کریم میں اس طرح کا کوئی بیان نہیں جس میں انبیاء کے درمیان زمانوں کا درست وقت بتایا گیا ہو. کیا فاضل مضمون نگار یہ بتانا پسند کریں گے کہ کیا چیز تھی جسے قرآن کریم کو اس بظاہر دلچسپ تاریخ کو نقل کرنے سے روکا؟“

بڑا ہی سادہ سا جواب ہے، یقیناً بائبل کی کاربن کاپی بنانا مقصود نہیں تھا... ہے نا..! اور کیا پتہ اس وقت یہ باتیں بائبل میں ہوں ہی نا، بعد میں ڈالی گئی ہوں!

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور قابلِ غور اعتراض کہ:

”تلمودی اور مدراشی اسرائیلیات کے ذیلی عنوان میں حضرت مکّی نے سورہ نمل کی آیت ۱۸ کے حوالے سے ابن کثیر سے متعلق آدھی بات نقل کی ہے حالانکہ اگر پوری تحریر کا حوالہ دیتے تو بات صاف ہو جاتی کہ ابن کثیر نے کیا بات اور کیوں کی. آگے چل کے ابن کثیر اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”نوف بکالی کہتے ہیں یہ بھیڑیے کے برابر تھی. ممکن ہے کہ اصل لفظ ذباب ہو یعنی مکھی کے برابر اور کاتب کی غلطی سے وہ ذیاب لکھ دیا گیا ہو یعنی بھیڑیا“

پہلی بات تو یہ ہے کہ کتابت کی یہ غلطیاں کہاں کہاں واقع ہوئی ہیں؟ کوئی اس کی ضمانت دے سکتا ہے؟ اس طرح جملہ تفاسیر واحادیث اپنے آپ ہی مشکوک ہو جاتی ہیں کہ ان میں کتابت کی غلطیوں کی کوئی ضمانت نہیں، دوسری بات یہ کہ جہاں ڈاکٹر صاحب کا منقولہ بیان موجود ہے وہیں پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

ومن قال من المفسرين: إن هذا الوادي كان بأرض الشام أو بغيره، وإن هذه النملة كانت ذات جناحين كالذباب، أو غير ذلك من الأقاويل، فلا حاصل لها.

”مفسرین میں سے کچھ نے کہا: کہ یہ وادی شام کی زمین یا کہیں اور تھی، اور یہ کہ اس چیونٹی کے مکھیوں کی طرح پر تھے، اور اس طرح کی دیگر باتیں، تو یہ باتیں غلط (لا حاصل) ہیں.

یعنی ابن کثیر خود ہی دیگر مفسرین کی اس تفسیر کو کہ یہ چیونٹی مکھی کے برابر تھی مسترد کر رہے ہیں اور بھیڑیے والی بات پر قائم ہیں، اس طرح میں نے درست ترین تفسیر پیش کی جسے میرے فاضل دوست ناقص بیان نقل کر کے قاری کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، ثبوت کے طور پر تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر دیکھیے.

ڈاکٹر صاحب اسی طرح کا ایک اور الزام بھی لگاتے ہیں کہ:

"پھر آگے چل کر صحیح مسلم کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے گول مول بات کی ہے کاش جناب مکّی اس حدیث کا حوالہ بھی دے دیتے تو کتنا اچھا ہوتا؟"

شاید میرے فاضل دوست کو حدیث کے آخر میں بارہ(12) کا عدد نظر نہیں آیا جو حوالے کے لیے تھا، خیر جب آپ جانتے ہی ہیں کہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے تو پھر اعتراض کس بات کا؟ اس طرح تو حدیث اور قوی ہو رہی ہے اور میری بات کو مزید اثبات مل رہا ہے.

حضرت نوح کی عمر کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب گویا ہیں کہ:

"میرا سوال جناب مکّی سے سائنس کے ادنٰی طالبعلم کی حثیت سے یہ ہے کہ عقل ۹۵۰ سال زندہ رہنے کو کیوں تسلیم نہیں کرتی؟ کیا انکے پاس کچھ ایسے سائنسی حقائق ہیں جن کی مدد سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ ۹۵۰ سالہ زندگی ناممکنات میں سے ہے"

یہی سوال میرا ان سے ہے کہ کیا آپ ایسے سائنسی دلائل پیش کر سکتے ہیں کہ کسی انسان کا 950 سال زندہ رہنا ممکن ہے؟ جہاں تک عقل کے تسلیم کرنے کی بات ہے تو آپ قرآن میں آئی کس کس چیز کو عقلیا سکتے ہیں؟

اب ڈاکٹر صاحب کے سب سے بڑے ایمان افروز جھوٹ کی طرف آتے ہیں جسے وہ "فرعون اور اسکے لشکر کی غرقابی" کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں اور جسے وہ بقول ان کے "رعمسیس دوئم (Merneptah) کی لاش کی دریافت اور اسکی موت کے سلسلے میں ہوئی جدید طبّی تحققات" قرار دیتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رمسیس دوم کی ممی ہی دراصل موسیٰ (علیہ السلام) کا فرعون ہے اور یہ کہ رمسیس دوم کی لاش فرانس لے جائی گئی جہاں ڈاکٹر موریس بوکلے نے جو مسلمان ہوگئے تھے لاش پر تحقیق کر کے یہ ثابت کیا کہ "اسکی موت کھوپڑی اور گردن کی ہڈیاں ٹوٹنے سے ہوئی ہے. لاش پر نمک کی تہہ اس بات کا ثبوت تھی کہ اسکی موت ڈوبنے اور پانی کے انتہائی شدید دباؤ کا نتیجہ تھی" جس سے علمی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نہ صرف

رمسیس دوم ہی فرعون ہے بلکہ سورہ یونس کی آیت نمبر 92 کی حقانیت بھی ثابت ہو جاتی ہے چنانچہ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن بالیقین اللہ تعالی کی ہی اتاری ہوئی کتاب ہے.

جس کسی نے بھی یہ "ایمان افروز" قصہ گھڑا اسے داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایمان اندھا ہوتا ہے، اور جب انسان کی بنیاد ہی خرافات کے یقین پر کھڑی ہو تو ایسے لوگوں کو کسی بھی طرح الزام نہیں دیا جا سکتا کہ جب ان کا خدا ہی عقل سے فارغ ہو تو اس کے "عباد" پر کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنی عقل استعمال نہ کریں..!!

کیا قرآن کی حقانیت کے ثبوت کے لیے فرعون کی لاش کا دریافت ہونا لازمی تھا؟ اگر لاش دریافت نہ ہوتی تو کیا قرآن پر شبہات کے سائے منڈلاتے رہتے؟ اور اگر اب یہ ثابت ہو جائے کہ رمسیس دوم موسی (علیہ السلام) کا فرعون نہیں ہے تو کیا آپ قرآن کو مسترد کر دیں گے؟

میرے جراح کا دعوی ہے کہ وہ سائنس کے طالب علم ہیں مگر اس جھوٹ کو داغتے اور لوگوں میں جہالت تقسیم کرتے وقت انہوں نے اس بات کی تصدیق کرنے کی ذرا بھی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ ایمان ہی کافی ہے بھلے وہ جھوٹ پر کھڑا ہو..

چلیے اس ایمان افروز جھوٹ کا بھی پردہ فاش کیے دیتے ہیں:

لندن سے شائع ہونے والے سعودی عرب کے مشہور اخبار الشرق الاوسط کی 5 فروری 2005 کی خبر کے مطابق مصر کے وفاقی وزیر برائے آثارِ قدیمہ ڈاکٹر زاہی حواس نے کہا ہے کہ:

"واضاف انه بحسب دراسة القرآن الكريم، يتبين ان فرعون الخروج هو «رمسيس الثاني»، بالرغم من النتيجة التي توصل اليها الفرنسيون، عندما قاموا بفحص المومياء في الثمانينيات، والتي اشارت الى انه ليس فرعون الخروج، لعدم وجود آثار للغرق في موميائه."

"انہوں نے مزید کہا کہ اگرچہ قرآنِ کریم کے مطابق فرعون «رمسیس دوم» ہے تاہم اسی کی دہائی میں فرانسیسیوں کی جانب سے ممی کی جانچ سے یہ پتہ چلا کہ وہ فرعون نہیں ہے کیونکہ اس کی ممی میں ڈوبنے کے کوئی آثار نہیں پائے گئے تھے"

یہی خبر عربیک نیوز آرکائیو میں دیکھیے

ڈاکٹر زاہی حواس علوم آثار قدیمہ کے مایہ ناز عالم ہیں، مصریات کے حوالے سے کوئی بھی دستاویزی فلم ان کی موجودگی کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہے، نیشنل جیوگرافک پر انہیں اکثر دیکھا جا سکتا ہے، اور میرے خیال سے وہ ڈاکٹر موریس بوکلے جیسے

جعلساز سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں، یہ جعلساز کتنا بڑا مسلمان تھا، کتنے حج کیے، کتنے عمرے کیے، کتنی نمازیں پڑھیں یہ ایک الگ موضوع ہے جسے یہاں زیرِ بحث لانا بے محل ہے، تاہم ڈاکٹر زاہی حواس کے الفاظ قابل غور ہیں کہ قرآن کے مطابق فرعون رمسیس دوم ہی بنتا ہے لیکن درحقیقت وہ فرعون ہے ہی نہیں، اب یہاں مومنین کی قرآن کی حقانیت کے بارے میں کیا رائے ہو گی؟

عقیدے پر پڑنے والی اس ضربِ کاری کے لیے معافی چاہتا ہوں مگر سچ سچ ہوتا ہے اور سر چڑھ کر بولتا ہے.

مجھے احساس ہے کہ یہ تحریر انتہائی قابلِ اعتراض ہے، مقصد کسی کے جذبات یا عقیدے کا مذاق اڑانا نہیں تھا، اگر کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو میں دلی طور پر ان سے معذرت چاہتا ہوں، میرا مقصد محض میرے محترم دوست ڈاکٹر جواد خان کی "بحث برائے بحث" کے لیے شروع کی گئی تحریر کا جواب دینا تھا جس میں انہوں نے بجائے سابقہ تحریر کے "مضمون" کا رد کرنے کے بے وجہ اور بے دلیل الزامات لگائے اور میری تحریر کے مقصد کو نہیں سمجھا، مزید یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ اگر کیڑے ہی نکالنے ہوں تو انسان خدا میں بھی کیڑے نکال سکتا ہے، میری ڈاکٹر صاحب سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں ہے، وہ میرے لیے اب بھی محترم ہیں، مجھے یقین ہے وہ دل پر نہیں لیں گے.

وماعلینا الا البلاغ

نوٹ: میں نے اس تحریر میں موجود کسی بھی قرآنی آیت کا خود سے ترجمہ نہیں کیا ہے، سارا ترجمہ یہاں سے لیا گیا ہے.

کائنات اور ابن رشد

شاید میری یہ پوسٹ پڑھ کر کافی لوگوں کو جھٹکا لگا ہو گا کہ اس کا دماغ ""سٹک"" گیا ہے، دل ہی دل میں ملحد تو قرار دیا ہی ہو گا، کفر کا فتوی لگانے کے لیے بھی کچھ لوگوں نے کمر کس لی ہو گی، کچھ کرم فرماؤں نے تو ای میل بھیج کر اپنے ایسے خیالات کا باقاعدہ اظہار بھی کیا، لیکن یہ کوئی نئی بحث نہیں ہے بلکہ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان پرانا ہے، ہماری اسلامی تاریخ بھی ان مباحث سے خالی نہیں ہے، غزالی، ابن سیناء، ابن رشد، الفارابی ودیگر نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے بھی لگائے ہیں، میں نے اپنی مذکورہ پوسٹ میں کہا تھا کہ:

اقتباس:

""یادرہے کہ قدیم فلاسفروں بشمول مسلمانوں کے ہمیشہ یہی رائے رہی ہے اور انہوں نے دنیا کے قدیم ہونے کا اعتراف کیا ہے لیکن مذہبی تعصب کی وجہ سے وہ بات کو گھماتے رہے""

لیکن شاید میرے اس نکتے پر کسی نے غور نہیں کیا، اور کریں بھی تو کیسے کریں، کچھ پتہ ہو تو کریں، میں شرط لگا سکتا ہوں کہ پورے بلاگستان میں کسی نے امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد کی تہافت التہافت پڑھی ہو؟ ان کتابوں میں خدا پر ایسے ایسے مباحث ہیں کہ سن کر ماں کے پیٹ میں ہی بچے کے بال سفید ہو جائیں، میری وہ تحریر تو کچھ بھی نہیں، بلکہ میں نے تو ان کے مطالعے سے اخذ کردہ نتائج پر ہی اپنی بات کی تھی، مجھے اندازہ تھا کہ ایسی بات یہاں کسی کو ہضم نہیں ہوگی کیونکہ ہمارے ہاں مذہب کو روایتی انداز میں پڑھنے اور سمجھنے کا چلن ہے جو صدیوں سے ایسے ہی چلا آرہا ہے، ایسے میں اگر کوئی اس ڈگر سے ہٹ کر کوئی بات کہہ دے تو وہ اور اس کی بات دونوں چبھنے لگتے ہیں، ہمارے ہاں صرف ندویوں، تھانویوں، کروڑویوں، ہزارویوں، نانوتویوں، عطاریوں، قادریوں، بریلویوں، چشتیوں، ملنگیوں اور نقویوں کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ہمارے بچوں تک کو ان غداروں کے نام ازبر ہیں، کسی بچے سے ابن بطہ کے بارے میں پوچھ لیں، العزابن عبدالسلام کے بارے پوچھ لیں انہیں کچھ نہیں پتہ ہوگا، چنانچہ ایسے وراثتی مسلمانوں سے مجھے بھی کسی طرح کی کوئی امید نہیں ہے، اب چاہے کفر کے فتوے لگائیں یا آکر گولی ماردیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں وہی لکھوں گا جو میرا دل چاہے گا کیونکہ میں آزاد پیدا ہوا تھا اور آزاد ہی مروں گا، میں بلاگنگ صرف اس لیے کرتا ہوں کہ میں بلاگنگ کرنا چاہتا ہوں، میں لوگوں کے لیے نہیں لکھتا، اگر کسی کو میرے خیالات پسند نہیں ہیں تو وہ یہاں تشریف لانے اور تبصرہ کرنے کی زحمت نہ کیا کریں.

تو دنیا کے قدیم ہونے کا خیال کوئی نیا نہیں ہے، ابن رشد کا بھی یہی خیال ہے کہ دنیا قدیم ہے یعنی اس کا کوئی آغاز نہیں ہے اور یہ ازل سے خدا کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے جیسے سورج اور روشنی کا ساتھ، اور وقت میں اس سے (یعنی خدا) پرانی نہیں ہے، خدا کا کائنات سے برتر ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ علت کا معلول سے برتر ہونا جو کہ ذات اور رتبے کی برتری ہے نا کہ زمان کی اور اس کے لیے ان کی دلیل ہے:

1- اگر خدا وقت کے لحاظ سے کائنات سے پرانا ہوتا تو وقت سے پہلے بھی وقت ہوتا جو ناممکن ہے.

2- مطلق قدیم سے کوئی واقعہ رونما ہونا ناممکن ہے.

3- دنیا کا امکان موجود تھا چنانچہ دنیا ابھی تک ممکن الوقوع ہے.

4- ہر واقعے سے پہلے مادہ ہوتا ہے کیونکہ کوئی واقعہ مادے کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوسکتا چنانچہ مادہ قدیم ہے سو دنیا بھی قدیم ہے.

امام غزالی ابن رشد کے دلائل کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر ابن رشد اپنے موقف کا دفاع کرتے ہوئے بڑی مہارت سے ان کے دلائل کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ (امام غزالی) دراصل معاملے کو شکوک وشبہات سے حل کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو مسئلے کو حل کرنے سے قاصر ہے اور خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر فلکیاتی اجسام (سیارے وستارے وغیرہ) کسی ازلی موجود (خدا) کا کام ہے جس کا وجود ماضی کے وقت میں داخل نہیں ہے تو اس کے افعال بھی ماضی کے وقت میں داخل نہیں ہونے چاہئیں !!.

اسی نہج پر چلتے ہوئے ابن رشد کہتے ہیں کہ جس طرح کائنات یا دنیا ازلی ہے جس کا کوئی آغاز نہیں ہے اسی طرح یہ ابدی بھی ہے جس کا کوئی آخر یا خاتمہ نہیں ہے، وہ اس کے خراب اور فناء ہونے کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہمیشہ قائم رہے گی، وہ کائنات کی ازلیت پر مندرجہ بالا دلائل اس کی ابدیت پر بھی لاگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات کی علت معلول ہے اور یہ ازلی ابدی ہے یعنی علت معلول کے ساتھ رہے گی اور یہ کہ اگر علت تغیر پذیر نہ ہو تو معلول بھی نہیں بدلے گا.

اب ایک روایتی مولوی کو ابن رشد کی ایسی باتیں مجذوب کی بڑ لگیں گی کیونکہ وہ یہ ثقیل باتیں ہضم نہیں کر پائے گا، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا اور کائنات ہمیشہ سے ایک ساتھ چلے آرہے ہوں؟ دنیا قدیم کیسے ہو سکتی ہے؟ وقت کیا بلا ہے؟ چنانچہ مولوی پہلا کام یہی کرے گا کہ ابن رشد پر کفر کا فتوی لگا دے گا اور یہی ہوا بھی، ابن رشد پر کفر کے فتوی لگائے گئے، انہیں ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا.

لیکن ابن رشد ایک سچا مسلمان تھا، اس کے فلسفے کی بنیاد صرف منطق پر ہی نہیں کھڑی تھی بلکہ اسے مذہب کا بھی سہارا تھا، اس نے اپنے فلسفے کو قرآن سے بھی ثابت کیا:

(وهو الذي خلق السماوات والأرض في ستة أيام، وكان عرشه على الماء) (سورہ ہود آیت 7)

(اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں اور تھا اس کا تخت پانی پر)

صاف ظاہر ہے کہ اس وجود سے پہلے بھی کوئی وجود تھا جو کہ عرش اور پانی ہے چنانچہ وقت بھی موجود ہے.

(يوم تبدّل الأرض غير الأرض والسماوات) (سورہ ابراہیم آیت 48)

(جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان)

یہاں بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وجود کے بعد بھی کوئی وجود ہو گا.

(ثم استوى إلى السماء وهي دخان)(سورہ فصلت آیت 11)

(پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا)

یہاں پتہ چلتا ہے کہ آسمان کو کسی چیز سے بنایا گیا جس کے لیے مادے کا پہلے سے موجود ہونا لازم ہے

یہ اور ایسی کئی قرآنی دلیلوں سے ابن رشد دنیا کے قدیم ہونے کو ثابت کرتے ہیں کیونکہ شریعت میں ایسا کوئی متن موجود نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ خدا مطلق عدم میں موجود تھا!! چنانچہ ابن رشد کے خیال میں دنیا کا قدیم ہونا شریعت کے عین مطابق ہے مخالف نہیں.

مزید بر آں وہ یہ تک کہتے ہیں کہ خدا کلیات جانتا ہے جزئیات نہیں جانتا جو بہر حال اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں ہے.

اس ضمن میں میرا موقف صرف اتنا عرض کرنا تھا کہ جب دنیا قدیم ہے اور مادہ ازل سے موجود ہے تو پھر یہاں خدا کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

انسانی مشینیں

جب انسان ممنوع و مجاز، مستحب اور مکروہ کے نظام پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے تو گویا اس طرح وہ اپنی عقل کو ایک طرف رکھ کر اپنی پروگرامنگ کے عمل کی طرف پہلا قدم بڑھا دیتا ہے، پوری طرح پروگرام شُدہ ہونے کے لیے صرف کچھ وقت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے.

یقیناً یہاں بات اخلاقیات کی نہیں ہو رہی، بلکہ ان معاملات کی ہے جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے جو ہر انسان اور معاشرے میں مختلف ہوتی ہیں، یا بعض اوقات محض ذاتی عمل ہوتا ہے.

ایسے انسان کو کیا کہیں جس کے پاس کچھ مخصوص الفاظ کا ایک مجموعہ ہے جنہیں اس نے ہر وقت بڑبڑاتے رہنا ہے، صبح اٹھتے وقت، رات کو سونے سے پہلے، کھانے سے پہلے اور بعد میں... بازار میں جانے سے پہلے... بیت الخلاء میں جانے سے پہلے.. سواری، سفر، مرض، کپڑے بدلنا، نہانا، خرید و فروخت.... غرض کہ دنیا کا ایسا کوئی کام نہیں جسے کرنے سے پہلے یہ الفاظ نہ بڑبڑائے جائیں...

صرف اس پر ہی بس نہیں، اس کے پاس کچھ قاعدے بھی ہیں جو باقی چیزوں کا تعین کرتے ہیں مثلاً کھانا کس ہاتھ سے کھایا جائے، گھر میں اور بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے کون سا قدم بڑھایا جائے، کس طرح بیٹھا جائے اور بیٹھنے کے کن طریقوں سے اجتناب برتا جائے، بیوی کے ساتھ ہمبستری کس طرح کی جائے، بات کس طرح کی جائے، اپنے ارد گرد کے لوگوں کو کس طرح دیکھا جائے... اس کے پاس اپنے لباس، بال، داڑھی، ظاہری حلیہ، روزانہ نہانے کی تعداد، کس ٹوتھ برش سے اجتناب برتنا ہے اور کیا کھانا پینا ہے، حتی کہ ان خوشبوؤں کے بارے میں بھی اس کے پاس ہدایات موجود ہیں جنہیں اس نے استعمال کرنا اور جن سے اجتناب برتنا ہے..؟!

اس کے پاس اپنے خوابوں، مستقبل، اپنے گھر، بیوی، بچوں، دوستوں، پڑوسیوں، جنہیں وہ جانتا ہے اور جنہیں وہ نہیں جانتا ہے سب کے لیے ایک تیار پلان موجود ہے.

اس کے پاس اس کے لیے ایک سوچنے والا موجود ہے (پہلے سے پروگرام شُدہ پروگرامر) جو اسے ہر قسم کے معاملات کے لیے احکامات جاری کرتا رہتا ہے...

اس کی زندگی میں اگر کوئی چیز ہے جس پر کوئی قدغن نہیں ہے تو وہ صرف اس کی جنسی شہوت ہے جسے زمین پر پوری چھوٹ دے دی گئی ہے جس طرح کہ آسمان پر چھوٹ ہوگی.

یہ ساری مشقت محض ایک نگران کو راضی کرنے کے لیے کی جاتی ہے جو مثلاً سر کے بال غلط طرح سے بنوانے پر بری طرح سیخ پا ہو جائے گا.

کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ نگران بجائے ہمیں بغیر سمجھ کے پروگرام کرنے کے ہمیں انتخاب کرنا سکھاتا؟

پتہ نہیں ذہنی طور پر کون زیادہ پختہ اور اچھے برے کی بہتر تمیز کرنے والا ہوگا؟ وہ بچہ جس کے والدین نہ اسے سکھایا ہو کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے، اسے سکھایا ہو کہ بازار میں موجود اچھی اور مفید چیزوں کا انتخاب کیسے کرے؟ یا وہ بچہ جس کے والدین نے اسے محض یہ بتایا ہو کہ یہ منع ہے اور یہ مجاز ہے، یہ مستحب ہے اور یہ مکروہ ہے، اور اس سے زیادہ مت پوچھنا ورنہ......؟؟؟؟؟ اور نہ جانے ان میں کون سے والدین بہتر ہیں؟؟

اگر انسان سے مشابہ مشین کو روبوٹ کہا جاتا ہے، تو کیا ہم اسی منطق کو استعمال کرتے ہوئے پہلے سے پروگرام شدہ انسان کو انسانی مشین نہیں کہہ سکتے؟

ایسے نظام پر عمل پیرا لوگوں کی ایک جیسی شکل، ایک ہی جیسی بو، ایک ہی طریقہ کلام اور ایک ہی جیسا ردِ عمل کیوں ہونا چاہیے؟ اور کیا اسے اتحاد کہنا چاہیے یا انتشار؟ یا جماعت کی چھاپ دکھانے کے لیے فرد کی شخصیت کا قتل؟ اور کیا عقل مند باپ اپنے تمام بچوں پر ایک ہی چھاپ لگائے گا یا ہر بچے کی اپنی اپنی شخصیت کو پروان چڑھنے اور اسے پختہ کرنے میں مدد کرے گا؟

جب "کسی بھی" مذہب میں ممنوعات اور مجازات کا اس طرح کا نظام شامل ہو جائے تو وہ ایسی انسانی مشینوں کی پروڈکشن لائن بن جاتا ہے جن پر وہی ڈیزائننگ کی تاریخ، وہی ماڈل نمبر اور وہی آپریٹنگ سسٹم نصب ہوتا ہے، اور پروڈکشن کا عمل انہی خواص کے ساتھ زمانوں تک چلتا رہتا ہے، چنانچہ ہم ایسی کسی بھی انسانی مشین کی خواص کو کچھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

ماڈل نمبر.........پتھر کا زمانہ، اگرچہ پروڈکشن کی تاریخ انتہائی جدید ہے.
ڈائناسار آپریٹنگ سسٹم، اگرچہ یہ اکیسویں صدی ہے اور یہ آپریٹنگ سسٹم آج کے زمانے میں کام نہیں کرتا.
جنگلوں، پہاڑوں، سمندر کی گہرائیوں، خلاء، غرض کہ ہر طرح کے ماحول میں چلنے کے قابل.

اگر انسان اپنی عقل اور دل سے ہے، اور اس طرح کا نظام اسے انسانی مشین بنا دیتا ہے، تو عقل و دل کے تحلیل ہو جانے کے بعد ایسی مشین کو کیا کہنا چاہیے...؟!

مقدس متن

کسی متن کے مقدس ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ انسانی زندگی اور آزادی کو کس قدر مقدس قرار دیتا ہے.

کوئی متن اپنے آپ میں مقدس نہیں ہوتا.. بلکہ ایک متن ہوتا ہے جو انسان کی تقدیس اور احترام کرتا ہے چنانچہ انسان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ بھی اس مقدس متن کی تقدیس کرے اور اس کا احترام کرے، یہاں پر لازم ہے کہ ہر مقدس یا آسمانی یا خدائی متن کو خُردبین کے نیچے رکھا جائے خاص طور سے جبکہ کسی متن کی اپنے آپ کے لیے یہ گواہی کہ وہ مقدس ہے ناکافی ہے اور حقیقی محقق کو قائل نہیں کر سکتی.

متن کے انسانی نہ ہونے کا یہ لازمی مطلب نہیں ہے کہ وہ آسمانی ہے، اسی طرح اس کے انسانی ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس میں ”آسمانی حس“ نہیں ہے.

یہاں لفظ ”آسمانی“ سے یہ مطلب اخذ کرنا ضروری نہیں ہے کہ میں اس کائنات کے کسی خدا کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جس نے یہ متن وضع کیا ہے، یہ صرف ایک اصطلاح ہے جسے میں ان تعلیمات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کر رہا ہوں جو انسان کی زندگی کو ترقی دیتے ہوئے اسے آگے بڑھاتی ہیں، چنانچہ انسانی ترقی پر مشتمل تعلیمات اور ہدایات پر مشتمل کوئی بھی انسانی متن آسمانی ہو سکتا ہے.

پسماندہ متن وہ متن ہے جس کی تعلیمات انسان کو اپنے تعلقات کے ان ابتدائی ادوار میں واپس لے جاتی ہیں جہاں خواہشات کو انسان کی زندگی اور اس کی اہمیت پر برتری حاصل تھی، ایسے متن اس قابل نہیں ہیں کہ ہم انہیں کوئی انسانی نام دیں کیونکہ یہ ایسی مخلوقات کے وضع کردہ ہیں جن میں ذرا بھی انسانی حس نہیں تھی چنانچہ کوئی بھی ایسا پسماندہ متن (یہ ناکافی اصطلاح ہے مگر دستیاب اختیارات میں سے مہذب ترین ہے) انسانی نہیں ہو سکتا کجا یہ کہ اسے آسمانی کہا جائے.

کسی متن کے مقدس ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہر زمان و مکان کے لیے کارآمد ہے، ہر زمانے کے اپنے حالات ہوتے ہیں اور ہر مکان کے اپنے قوانین، چنانچہ مقدس متن کو چاہیے کہ وہ ان حالات اور قوانین کا احترام کرے اور زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرے ورنہ اس کی قدسیت آثارِ قدیمہ بن جائے گی، یہاں مقدس کہلائے جانے والے مُتون (متن کی جمع) کے نقص ابھر کر سامنے آتے ہیں، اب جس متن کا مقصد صرف اپنے الفاظ کی حفاظت ہو تو ایسا متن وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھوتا چلا جائے گا جبکہ جو متن اپنے الفاظ کی بجائے زندگی کی ترقی کو اہمیت دے گا وہ زیادہ احترام حاصل کرے گا چاہے بعض لوگ اسے مقدس نا بھی سمجھتے ہوں، کیونکہ متن اپنے تمام تر اجزاء یعنی زبان، مفہوم اور تعلیمات کے کسی خاص زمان و مکان کی پیداوار ہوتا ہے، چنانچہ پسماندہ وقت کے ساتھ ساتھ مزید پسماندہ ہوتا چلا جائے گا جبکہ آسمانی کی اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی چاہے کسی دن انسانیت اس سے کہیں آگے نکل جائے لیکن وہ ہمیشہ بنیاد اور محبت، احترام اور مساوات کی علامت رہے گا.

چنانچہ مقدس متن وہ متن ہے جو آپ کو اپنے حروف کی حدوں سے آگے بڑھنے میں مدد کرے اور آپ کو اپنا اسیر نہ بنائے، آپ اپنے حال کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکیں، وہ آپ کو پیچھے لے جا کر آپ پر ایسی زندگی کا بوجھ نہ ڈالے جس سے انسانیت نوری سالوں کے حساب سے آگے جا چکی ہے!؟

مقدس متن آپ کی اور آپ کے ارد گرد کے لوگوں کی تقدیس کرتا ہے سو آپ کے پاس اس کی تقدیس کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا، تب دوسرے بھی اس کا احترام کریں گے چاہے وہ اس کی آسمانیت کے معترف نہ بھی ہوں.

انسانیت

کسی کو بھی انسان کو آزاد کرنے والے مذہب پر بات کرنے سے پہلے یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس مذہب نے گر انسان کو کسی چیز سے آزاد کیا ہے تو بدلے میں اسے دوسری کسی چیز کا غلام نہیں بنایا ہے...

ہر وہ جو آسمان سے کوئی پیغام لاتا ہے نبی نہیں ہوتا ہے... ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں انسانیت کے لیے بڑے بڑے پیغامات چھوڑے مگر نبوت کا دعوی نہیں کیا... اس کے باوجود دنیا ان عظیم لوگوں کا احترام اور قدر کرتی ہے...

اس سے پہلے کہ ہم دنیا کی مصیبتوں کے ذمہ دار کے تعین پر خدا اور شیطان کے درمیان اختلاف کریں ہمیں پہلے بطور انسان کے اپنی ذمہ داری کا تعین کرنا ہوگا...

جو ہم انسانوں کو اُلوہیت کے مسئلے پر آپس میں اختلاف کرتے پاتا ہے، جو ہمارے ادراک سے ماوراء بھی ہے، ہمیں اپنی انسانیت پر متفق ضرور پاتا ہے جو ہمارے وجود کا جوہر ہے...

ہماری سب سے بڑی غلطی اُن ہستیوں کی غلطیوں کی پردہ پوشی کے لیے مختلف توجیہات کی تلاش ہے جنہیں ہم انبیاء کہتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم ان غلطیوں کا اعتراف کر لیں... کیونکہ اس طرح ہم انہیں خدا بنا بیٹھیں گے اور کسی مخصوص صورت میں ان کی غلطیوں کو قانون، جبکہ دوسری صورت میں ہم اس سے بہتر فیصلہ کرنے کے قابل ہوتے.. یہ بات مدِ نظر رہے کہ ان غلطیوں کا اعتراف کرنا دراصل ہماری ذہنی پختگی کی دلیل ہوگی، ہم ان گزرے لوگوں کی سیرت سے بہتر انتخاب کر سکیں گے جنہیں ہم انبیاء کہتے ہیں...

خدا کے وجود کی صورت میں اس کی طاقت کا تعین اس بات سے نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے قابل ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں.. بلکہ اس کی طاقت کا تعین اس بات میں ہے کہ وہ کس قدر مُردوں جیسی زندگی گزارنے والوں کی زندگی کو حقیقی زندگی میں بدل سکتا ہے، وہ کس قدر دلوں کی نفرتوں کو محبتوں میں تبدیل کر سکتا ہے..

ایسے انسان کو ہم کیا نام دیں گے جس نے اپنی خواہشات کو بے لگام کر دیا.. پھر انہیں بچانے کے لیے اپنے فرضی قوانین وضع کیے.. اور پھر لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی تقدیس کریں؟!

کون زیادہ طاقتور ہے؟

وہ خدا جو اپنی کتابوں کو تبدیلی سے محفوظ نہ رکھ سکا؟! یا وہ انسان جس نے اس خدا کی کتابوں کے ساتھ جیسا چاہا کھلواڑ کیا اور اس میں اپنی من پسند تبدیلیاں کر دیں؟!

اگر مقدس کہلائے جانے والے متن کا مقصود انسان ہی ہے تو پھر انسان کو اس بات کی اجازت کیوں نہیں ہے کہ وہ اپنی بھلائی کے لیے جیسا چاہے مقدس متن وضع کر لے؟

اگر آپ خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں تو اس سے پہلے کہ آپ یہ سوال کریں کہ اے خدا تو کہاں ہے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ یہ سوال کریں کہ اے انسانیت تو کہاں ہے؟

آپ پر لازم نہیں ہے کہ آپ اس پر یقین کریں جس پر میں ایمان رکھتا ہوں... لیکن مجھ پر لازم ہے کہ آپ جس چیز پر ایمان رکھتے ہیں میں اس کا احترام کروں...

آپ کے خدا کو میں صرف آپ کے ذریعے سے ہی دیکھ سکتا ہوں، لہذا اپنے قول و فعل میں احتیاط برتیں کیونکہ اس طرح آپ مجھے اپنے خدا کا تعارف دے رہے ہوتے ہیں جس کی تاویل کے لیے آسانی کہے جانے والے کسی متن کی شہادت کی ضرورت نہیں ہے.

کسی پیغام کو ہم زندگی کا پیغام کیسے قرار دیں جبکہ اس کے گرد ہر وقت موت ہی ناچ رہی ہو؟!

خدا آکر ہمارے لیے کیوں نہیں مر جاتا بجائے اس کے کہ وہ ہم سے اپنے لیے مرنے کا مطالبہ کرے؟

جب دو کتابوں میں آپس میں تضاد ہو تو یہ بات یقینی ہے کہ ان کا مصدر ایک نہیں ہے...

اگر کوئی نبی سب کے لیے ایک مثالی نمونہ ہوتا ہے تو پھر کچھ چیزیں صرف اس کے لیے ہی کیوں جائز ہوتی ہیں؟!

انسان کو کیا فائدہ ہو گا اگر وہ ساری دنیا جیت کر خود کو ہار دے؟

اگر آپ نظر آنے والے اپنے انسان بھائی سے محبت نہیں کرتے تو میں کیسے مان لوں کہ آپ اپنے اُس خدا سے محبت کرتے ہیں جو آپ کو نظر نہیں آتا؟!

کسی بات پر اختلاف ہی ایک دوسرے کو سننے اور سمجھنے کا بہترین وقت ہے... یہ وہ وقت ہے جب ہم اپنے اختلافات بھلا کر ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے نکلیں...

حقیقی انسان وہ ہے جو اُن سے بھی انسانی سلوک کرے جو اپنی انسانیت کھو چکے ہیں.. یہی حقیقی انسان کا امتحان ہے.

قرآنیات

قرآن کے اندھے

امام الشعراء، بشار بن برد، وفات 715ء

فلسفیوں کا شاعر اور شاعروں کا فلسفی، ابو العلاء المعری، وفات 1057ء

جدید عربی ادب کا بانی، طہ حسین، وفات 1973ء

عربی ادب کی تین نابغہ روزگار شخصیات جو نظر سے محروم تھیں بصیرت سے نہیں۔

بصارت سے محروم ایسے ہی ایک شخص سے گفتگو ہوئی، شکایت بھرے لہجے میں گویا ہوئے کہ: قرآن ہم اندھوں کی اتنی بے عزتی کیوں کرتا ہے؟ ہمارے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے قرآن کا لہجہ اتنا سخت اور مضحکہ خیز کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا اتنا کافی نہیں کہ اللہ نے ہمیں بصارت کی نعمت سے محروم رکھا؟

وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا میں نے کبھی اس موضوع پر تحقیق کی؟ یہ سوال کر کے اس نے میری توجہ ایک ایسے موضوع کی طرف مبذول کرائی جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

یقیناً قرآن نے جانوروں کا ذکر کچھ اچھے انداز میں نہیں کیا خاص کر گدھا اور کتا، گدھے نے تو انسان کے لیے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں اور انسان کے ساتھ کتے کی وفاداری پر تو پوری ایک تاریخ رقم کی جا سکتی ہے۔

یہ تو میرے علم میں تھا کہ قرآن نے سیاہ رنگت کے ساتھ نسل پرستانہ سلوک کیا ہے جس کی وجہ سے سیاہ رنگت والے حضرات میں غم وغصہ پایا جاتا ہے، ذیل کی آیات ملاحظہ فرمائیں:

1- حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے (سورہ النحل 58)

2- حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو انہوں نے خدا کے لئے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا اور وہ غم سے بھر جاتا ہے (سورہ الزخرف 17)

3- اور جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا تم قیامت کے دن دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہو رہے ہوں گے۔ کیا غرور کرنے والوں کو ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے (سورہ الزمر 60)

4- جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں گے (ان سے خدا فرمائے گا) کیا تم ایمان لا کر کافر ہو گئے تھے؟ سو (اب) اس کفر کے بدلے عذاب (کے مزے) چکھو (سورہ آل عمران 106)

تاہم جسمانی طور پر معذور افراد کے ساتھ قرآن کے سلوک کی طرف میری توجہ کبھی نہیں گئی جن میں نابینا پن بھی شامل ہے، قرآن میں نابینا پن کا ذکر 30 مقامات پر آیا ہے، انداز خطابت ملاحظہ کریں:

1-سورہ البقرہ17-18:ان کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جس نے (شبِ تاریک میں) آگ جلائی۔جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو خدا نے ان کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے–(یہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ (کسی طرح سیدھے رستے کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے

2-سورہ البقرہ171:جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ سن نہ سکے۔(یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں کہ (کچھ) سمجھ ہی نہیں سکتے

3-سورہ المائدہ71:اور خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی تو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی (لیکن) پھر ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہوگئے اور خدا ان کے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے

4-سورہ الانعام50: کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (خدا کی طرف سے) آتا ہے۔کہہ دو کہ بھلا اندھا اور آنکھ والے برابر ہوتے ہیں؟ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے

5-سورہ الانعام104:(اے محمد ﷺ!ان سے کہہ دو کہ) تمہارے (پاس) پروردگار کی طرف سے (روشن) دلیلیں پہنچ چکی ہیں تو جس نے (ان کو آنکھ کھول کر) دیکھا اس نے اپنا بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا اس نے اپنے حق میں برا کیا۔اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں

6-سورہ الاعراف64:مگر ان لوگوں نے ان کی تکذیب کی۔تو ہم نے نوح کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے ان کو تو بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا انہیں غرق کر دیا۔کچھ شک نہیں کہ وہ اندھے لوگ تھے

7-سورہ یونس43:اور بعض ایسے ہیں کہ تمھاری طرف دیکھتے ہیں۔تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں

8-سورہ ہود24:دونوں فرقوں (یعنی کافر و مومن) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرا ہو اور ایک دیکھتا سنتا۔بھلا دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟

9-سورہ ہود28:اس نے کہا "اے برادران قوم، ذراسوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپیک دیں؟

10-سورہ الرعد16:ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟(تم ہی ان کی طرف سے) کہہ دو کہ خدا۔ پھر (ان سے) کہو کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کو کیوں کارساز بنایا ہے جو خود اپنے نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے (یہ بھی) پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں؟ یا اندھیرا اور اُجالا برابر ہو سکتا ہے؟ بھلا ان لوگوں نے جن کو خدا کا شریک مقرر کیا ہے۔ کیا انہوں نے خدا کی سی مخلوقات پیدا کی ہے جس کے سبب ان کو مخلوقات مشتبہ ہو گئی ہے۔ کہہ دو کہ خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا (اور) زبردست ہے

11-سورہ الرعد19:بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے اور سمجھتے تو وہی ہیں جو عقلمند ہیں

12-سورہ الاسراء72:اور جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔ اور (نجات کے) رستے سے بہت دور

13-سورہ الاسراء97:اور جس شخص کو خدا ہدایت دے وہی ہدایت یاب ہے۔ اور جن کو گمراہ کرے تو تم خدا کے سوا اُن کے رفیق نہیں پاؤ گے۔ اور ہم اُن کو قیامت کے دن اوندھے منہ اندھے گونگے اور بہرے (بنا کر) اٹھائیں گے۔ اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جب (اس کی آگ) بجھنے کو ہو گی تو ہم ان کو (عذاب دینے کے لئے) اور بھڑکا دیں گے

14-سورہ طٰہ124:اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے

15-سورہ طٰہ125:وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو دیکھتا بھالتا تھا

16-سورہ الحج46:کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے۔ اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں

17-سورہ النور 61:نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر اور نہ خود تم پر کہ اپنے گھروں سے کھانا کھاؤ یا اپنے باپوں کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اس گھر سے جس کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہوں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (اور اس کا بھی) تم پر کچھ گناہ نہیں کہ سب مل کر کھانا کھاؤ یا جدا جدا۔ اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو۔ (یہ) خدا کی طرف سے مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔ اس طرح خدا اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو

18-سورہ الفرقان 73:اور وہ کہ جب ان کو پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو اُن پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ غور سے سنتے ہیں)

19-سورہ النمل 66:بلکہ آخرت (کے بارے) میں ان کا علم منتہی ہو چکا ہے بلکہ وہ اس سے شک میں ہیں۔ بلکہ اس سے اندھے ہو رہے ہیں

20-سورہ النمل 81:اور نہ اندھوں کو گمراہی سے (نکال کر) رستہ دیکھا سکتے ہو۔ تم ان ہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور وہ فرمانبردار ہو جاتے ہیں

21-سورہ القصص 66:تو وہ اس روز خبروں سے اندھے ہو جائیں گے، اور آپس میں کچھ بھی پوچھ نہ سکیں گے

22-سورہ الروم 53:اور نہ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے (نکال کر) راہ راست پر لا سکتے ہو۔ تم تو انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں سو وہی فرمانبردار ہیں

23-سورہ فاطر 19:اور اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں

24-سورہ غافر 58:اور اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں۔ اور نہ ایمان لانے والے نیکوکار اور نہ بدکار (برابر ہیں) (حقیقت یہ ہے کہ) تم بہت کم غور کرتے ہو

25-سورہ فصلت 17:رہے ثمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا آخر اُن کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا

26-سورہ فصلت 44:اور اگر ہم اس قرآن کو غیر زبان عرب میں (نازل) کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں (ہماری زبان میں) کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں۔ کیا (خوب کہ قرآن تو) عجمی اور (مخاطب) عربی۔ کہہ دو کہ جو ایمان لاتے ہیں ان کے لئے (یہ) ہدایت اور شفا ہے۔ اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرا پن) ہے اور یہ ان کے حق میں (موجب) نابینائی ہے۔ گرانی کے سبب ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے

27-سورہ الزخرف 40: کیا تم بہرے کو سنا سکتے ہو یا اندھے کو رستہ دکھا سکتے ہو اور جو صریح گمراہی میں ہو (اسے راہ پر لا سکتے ہو)

28-سورہ محمد 23: یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان (کے کانوں) کو بہرا اور (ان کی) آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے

29-سورہ الفتح 17: اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے اُن جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا"

30-سورہ عبس 1-2: ترش رو ہوا، اور بے رخی برتی—اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آ گیا

ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے اندھے پن کی تیس مرتبہ تحقیر کی اور صرف ایک مرتبہ اس سے حرج کو رفع کیا ہے، میرے نابینا دوست کی یہ آیات سن کر کیا حالت ہوتی ہوگی میں سمجھ سکتا ہوں، سیاہ فام حضرات کا غم و غصہ بھی مندرجہ بالا آیات سے سمجھا جا سکتا ہے جس سے قرآن کی نسل پرستانہ فطرت آشکار ہوتی ہے۔ قرآن کے اندھے

قرآن اور قمری کیلنڈر

رمضان "رمض" سے مشتق ہے، اس کا معنی شدید گرمی، دھوپ کی شدت سے گرم ہو جانے والی زمین، "رمضاء" صحراء کی تپتی ہوئی ریت کو کہتے ہیں، ماہ رمضان کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے علماء لغت نے صراحت کی ہے کہ رمضان کا مہینہ انتہائی سخت گرمی میں آیا کرتا تھا اسی لئے اس ماہ کا نام رمضان پڑ گیا۔ اسی طرح "ربیع" کا معنی عربی میں بہار کا ہے، ربیع الاول اور ربیع الثانی کے مہینے بہار کے موسم میں آیا کرتے تھے اسی لئے ان کے نام ربیع الاول اور ربیع الثانی رکھے گئے۔ پیغمبر اسلام کی ولادت قمری مہینے ربیع الاول میں ہوئی، جو شمسی کیلنڈر کے مطابق اس سال اپریل کا مہینہ تھا، موسم بہار، ہمیشہ اپریل کے مہینے میں ہی آیا کرتا ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی مہینے ہر طرح کے موسموں آن وارد ہوتے ہیں، آج سے کوئی پندرہ سال قبل کی بات ہے، بہت سے لوگوں کو اچھی طرح یاد ہو گا کہ رمضان کا مہینہ دسمبر اور جنوری کی سخت سردیوں میں آیا کرتا تھا۔ وجہ بالکل واضح ہے کہ قمری سال، شمسی سال کی نسبت 10 دن چھوٹا ہوتا ہے، تین سالوں میں یہ فرق تیس دن یعنی ایک ماہ کے برابر واقع ہو جاتا ہے اور چھتیس سال کے عرصے میں، یہ فرق ایک سال کے برابر جا کر واقع ہو جاتا ہے۔ اور کوئی بھی قمری مہینہ چھتیس سال کے عرصے میں سال کے تمام موسموں کا چکر لگا پہلی حالت میں لوٹ آتا ہے۔

اگر ایسا تھا کہ رمضان کی آمد گرمی، سردی، خزاں اور بہار میں آتی جاتی رہتی تھی، اسی طرح ربیعین کے مہینے بھی گرمی، سردی، خزاں اور بہار میں آتے جاتے رہتے تھے، تو یہ وجہ تسمیہ بالکل فضول معلوم ہوتی ہے۔ اگر مہینوں کے نام موسموں کی مناسبت سے رکھے گئے تھے تو کیا یہ نام رکھنے والے عقل سے اتنے ہی گئے گذرے تھے کہ انہیں اس بات کا ادراک نہیں تھا یا اس کے درپردہ کوئی اور کہانی تھی؟ آج کی اس پوسٹ میں اسی بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام سے قبل ہی عربوں میں قمری کیلنڈر رائج تھا، عربوں کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ قمری سال، شمسی سال کی نسبت 10 دن کم ہونے کی وجہ سے سال کے مختلف موسم، متعین مہینوں میں آنے کے بجائے مختلف مہینوں میں آتے تھے، اس پریشانی کے باعث ذوالحج کا مہینہ جو حج کی وجہ سے ان کی معیشت کیلئے بہت اہمیت کا حامل تھا کبھی مناسب موسم میں آتا، کبھی سخت سردی میں اور کبھی سخت گرمی کے موسم میں، حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ ذوالحج کا مہینہ ہر سال مناسب موسم میں آئے تاکہ زائرین کو موسم کی سختی نہ جھیلنا پڑے۔ اس وجہ کے علاوہ بھی موسموں کا مخصوص مہینوں میں وارد نہ ہونے کی وجہ سے دیگر مسائل بھی پیش آتے تھے، اس مسئلہ کا منطقی حل عربوں نے اس طرح نکالا کہ وہ ہر تیسرے سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیتے تھے، اس سال 12 کے بجائے 13 ماہ کا ہوتا تھا کیونکہ قمری سال 10 دن کم ہونے کی وجہ سے تین سال میں ایک مہینے یعنی 30 دنوں کا فرق واقع ہو جایا کرتا تھا، اس طرح تین سالوں میں جو ایک ماہ کا فرق واقع ہوا کرتا تھا وہ تیسرے سال میں کھپ جاتا تھا۔ چنانچہ اس طریقہ کار کی وجہ سے مخصوص موسم، مخصوص مہینوں میں ہی آتے تھے، اس طریقہ کار کو وہ "نسيئ" کہا کرتے تھے، "نسيئ" کا معنی بھول چوک ہے۔ گویا یہ ایک طرح کی تصحیح Correction تھی۔ یہ ایک بالکل منطقی طریقہ تھا جس کے ذریعے قمری کیلنڈر کی اس خرابی کو دور کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے عربوں کو مخصوص مہینوں کا مخصوص موسم میں نہ آنے کی پریشانی لاحق تھی۔

معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اپنی تصنیف "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" میں صفحہ ۷۴ پر رقمطراز ہیں کہ "نسيئ (کبیسہ سال اور لوند کا مہینہ بڑھا کر قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے) کا رواج مکہ میں پایا جاتا تھا، اور وہ حجۃ الوداع یعنی ۱۰ ہجری سے قبل منسوخ نہ ہوا تھا۔

روایات کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیرہواں مہینہ سال کے مہینوں میں کس مہینے کے بعد شامل کیا جائے اس کیلئے عرب کے قبیلہ مضر کو اختیار دیا گیا تھا، جسے اسی وجہ سے اس قبیلہ کو مضر رجب بھی کہا جاتا تھا.

یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ قبل مسیح کے زمانے سے ہی حساب دانوں نے شمسی کیلنڈر بنالیا تھا اور دنیا کی کئی اقوام تاریخوں کے تعین کیلئے چاند کی مختلف حالتوں کے بجائے، موسموں کی تبدیلی کا باریک بنی سے مشاہدہ کرکے 365 دنوں پر مشتمل کیلنڈر استعمال کر رہی تھیں، جولیس سیزر نے بھی شمسی کیلنڈر میں اصلاحات متعارف کرائی تھیں، اسی کیلنڈر کی آخری تصحیح پوپ گریگوری ہشتم نے ۱۵۸۲ء میں کی جو آج تک رائج ہے، اور رائج الوقت عیسوی کیلنڈر اصطلاحی طور پر گریگورین Gregorian کیلنڈر کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں رائج بکرمی کیلنڈر بھی شمسی کیلنڈر رہے۔ یہ کیلنڈر صدیوں کے تجربوں کا نچوڑ ہے اور مکمل ترین کیلنڈر ہے جس میں لیپ یعنی لوند کے سال تک شامل ہیں۔ ہندوستان میں رائج بکرمی کیلنڈر، عیسوی کیلنڈر سے بھی قدیم ہے۔

اس موقع پر اشہر حرم یعنی حرمت والے مہینوں کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ "نسیئ" کا اشہر حرم سے گہرا تعلق ہے۔ عرب قبائل اپنی تجارتی و معاشی سہولت کیلئے اشہر حرم میں جنگ نہیں لڑا کرتے تھے، یہ کل چار مہینے ہیں جن میں سے تین مہینے یکے بعد دیگرے آتے ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجۃ اور محرم، جو بالترتیب قمری سال کا گیارہواں، بارہواں اور پہلا مہینہ ہیں اور چوتھا مہینہ رجب ہے جو کہ ترتیب کے اعتبار سے ساتواں مہینہ ہے۔ قبل اسلام جب بھی تیسرا سال آتا جس میں تیرہواں مہینہ زائد کرنا ہوتا تھا تو اس تیرہویں مہینے کو عرب اپنی معاشی، تجارتی اور سماجی ضروریات کی بناء پر تیسرے سال میں کہیں بھی کھپادیا کرتے تھے، اس تیرہویں مہینے کا کوئی متعین مقام نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے تیسرے سال میں اشہر حرم تقدیم و تاخیر کا شکار ہوا کرتے تھے۔

اب یہاں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نسیئ کا نظام اپنانے کی اصل وجہ قمری سال کو شمسی سال کے برابر لانا تھا، نہ کہ اشہر حرم کو آگے پیچھے کرنا، اب چونکہ عربوں کو ہر تیسرے سال ایک اضافی (تیرہویں) مہینے کا ایڈوانٹیج ملتا تھا تو وہ اس تیرہویں مہینے کو اپنی سہولت کے مطابق سال کے بارہ مہینوں میں کبھی شروع کے مہینوں کے درمیان، کبھی آخر کے مہینوں کے درمیان کھپاکر تیسرا سال 13 ماہ کا کرلیا کرتے تھے، اور اس زائد مہینے کو نسیئ کے مہینے کا نام دیا کرتے تھے۔ لیکن اس تیرہوں مہینے کو زائد کرنے کا اصل مقصد اشہر حرم کی تقدیم و تاخیر ہرگز نہ تھا۔

یہ سلسلہ اسلام کی آمد تک جاری رہا، یہاں تک کہ قرآن نے "نسیئ" کو کفر قرار دے کر تیسرے سال میں ایک ماہ کے اضافے کو منسوخ کر دیا، اور کہا کہ:

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّـهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّـهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا

فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ٣٦ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ٣٧

سورۃ التوبۃ

حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے، اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں یہی ٹھیک ضابطہ ہے لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے (۳۶) نسیٔ تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اُس کو حرام کر دیتے ہیں، تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کا حرام کیا ہوا حلال بھی کر لیں ان کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (۳۷) (ترجمہ ابو الاعلیٰ مودودی)

یومِ آفرینش سے مہینوں کی گنتی اللہ کی کتاب میں 12 ہی درج ہے، یہ تین سال بعد تصحیح کے 13 ویں مہینے یعنی نسیٔ کے مہینے کی نفی تھی۔ نیز ان آیات میں نسیٔ کی تنسیخ کی وجہ اشہر حرم کی تقدیم و تاخیر کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ عرب ہر سال ایسا نہیں کیا کرتے تھے بلکہ صرف تیسرے سال ایسا کیا کرتے تھے، ہر سال ان کیلئے ایسا کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ یہ پورا تجزیہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن نسیٔ کو سمجھنے میں غلط فہمی کا شکار ہوا، نسیٔ کا مقصد اشہر حرم کی تقدیم و تاخیر یا کسی مہینے کو حلال یا حرام قرار دینا ہرگز نہیں تھا، بلکہ نسیٔ کا اصل مقصد ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ اشہر حرم میں سے صرف رجب کے مہینے کو ضرور مقدم یا مؤخر کیا جاتا تھا جو تیرہویں مہینے کو زائد کرنے کی وجہ سے مجبوری تھی۔ چنانچہ نسیٔ کی منسوخی کے حکم کے باعث قمری کیلنڈر پھر اسی خرابی کا شکار ہو گیا جس سے بچنے کیلئے قبل اسلام کے عربوں نے تیسرے سال میں 13 ویں مہینے کا اضافہ کیا تھا۔

قرآن کا نسیٔ کی اصل حکمت کو سمجھنے میں غلط فہمی کا شکار ہونے کی وجہ اس حدیث سے بھی سمجھ آسکتی ہے:

عَنِ النَّبِيِّ أَنَّهُ قَالَ " إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لاَ نَكْتُبُ وَلاَ نَحْسُبُ الشَّهْرُ هَكَذَا وَهَكَذَا " . يَعْنِي مَرَّةً تِسْعَةً وَعِشْرِينَ وَمَرَّةً ثَلاَثِينَ .

نبی کریم نے فرمایا، ہم ایک ان پڑھ قوم ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب کرنا۔ مہینہ یوں ہے اور یوں ہے۔ آپ کی مراد ایک مرتبہ انیتس (دنوں سے) تھی اور ایک مرتبہ تیس سے۔ (آپ نے دسوں انگلیوں سے تین بار بتلایا)۔ صحیح البخاری، کتاب الصوم، حدیث ۱۹۱۳

کیا واقعی قرآن محفوظ ہے؟

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن آج جس شکل میں ہم تک موجود ہے یہ بعینہ ویسا ہی ہے جیسا کہ خود محمد صلعم پر نازل ہوا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہؐ نے اٹھا رکھا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کا ہی شیعہ فرقہ اپنی روایات کی روشنی میں اس عقیدے کا قائل نہیں لیکن اہل سنت کے تمام فرقے قرآن کی حفاظت و تدوین کو اللہؐ کی براہ راست ذمہ داری ہی سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند روایات پیش خدمت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن جس موجودہ شکل میں موجود ہے یہ بالکل اس شکل میں نہیں ہے جو خود پیغمبر اسلام کی زندگی تک پایا جاتا تھا اور یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خدا کی اس آخری الہامی کتاب کے دعویٰ ہونے کے باوجود، اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اپنی پیشرو کتب کی طرح پوری نہیں کی جا سکی۔

1- حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ "اللہؐ نے قرآن میں پہلے یہ نازل کیا تھا کہ دس رضعات سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ (دس بار دودھ پینے سے)۔ پھر اسے پانچ رضعات سے منسوخ کر دیا گیا۔ اور جب رسول اللہؐ کی وفات ہوئی تو یہ الفاظ قرآن میں قراءت کئے جا رہے تھے۔"

(سنن ابو داود، کتاب النکاح، باب ھل یحرم مادون خمس رضعات، حدیث:۲۰۶۲، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب التحریم بخمس رضاعت، حدیث:۳۵۹۷)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی زندگی میں وفات تک رضاعت والی آیات قرآن میں تلاوت ہو رہی تھیں لیکن آج ہمیں یہ آیات پورے قرآن میں کہیں نظر نہیں آتیں۔

مشہور خادمِ رسول حضرت انس بن مالک نے گواہی دے رکھی ہے کہ "اللہؐ نے رسول اللہؐ کی وفات سے پہلے مسلسل وحی اتاری اور آپ کی وفات کے قریبی زمانے میں تو بہت وحی نازل ہوئی، پھر اس کے بعد رسول اللہؐ وفات پا گئے۔" (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزول الوحی واول مانزل، حدیث:۴۹۸۲)

افسوس کہ وفات النبی کے انتہائی قریب نازل ہونے والی وحی اور آیات کی حفاظت کا مناسب انتظام نہ ہو سکا اور وہ

مختلف حادثات کا شکار ہو کر ضائع ہوتی رہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی حادثہ میں وہ آیات بھی ضائع ہوئیں جو کہ نبی کی وفات کے وقت لکھی ہوئی آپ کے بستر پر موجود تھیں۔

2- حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ "آیت رجم اور دس بار دودھ پلانے سے رضاعت کبیر ثابت ہونے پر (قرآن مجید میں) آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ دونوں آیتیں ایک کاغذ پر لکھی ہوئی میرے بستر پر پڑی تھیں۔ جب رسول اللہؐ کی وفات ہوئی اور ہم آپ کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے تو ایک بکری آئی اور اس کاغذ کو کھا گئی۔"

(سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب رضاع الکبیر، حدیث: ۱۹۴۴، مسند احمد: ۶/ ۲۲۹، مسند ابی یعلیٰ: ۴۵۸۸، ۴۵۸۷)

اس روایت سے تو مزید واضح ہے کہ آیت رضاعت کے علاوہ آیت رجم بھی نبی صلعم کی زندگی میں نہ صرف یہ کہ تلاوت ہو رہی تھی بلکہ یہ دونوں آیات، محمد صلعم کی وفات تک کاشانہ نبوی میں ایک کاغذ پر لکھی ہوئی موجود تھیں۔ مگر اس بکری کو چونکہ اس بات کی سمجھ ہی نہ تھی کہ یہ قرآن کی آیات براہ راست حفاظت الٰہی میں ہیں، اس لئے وہ اس کاغذ کو ہی کھا گئی جس پر یہ آیات لکھی ہوئی موجود تھیں اور آج کا موجودہ قرآن ان آیات سے محروم رہ گیا۔

صرف یہی نہیں کہ نبی صلعم کی حیات کے فوراً بعد جو آیات حفاظت الٰہی کے زیر اثر نہ رہ سکیں وہی اس حادثے کا شکار ہوئیں بلکہ یہ سلسلہ اس کے کافی بعد بھی جاری رہا۔ اس سلسلے کی روایات ملاحظہ فرمائیں:

3- حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: "جب یہ آیت نازل ہوئی وَ أَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ وَ

رَ خْطَکَ مِنْھُمِ الْمُخْلَصِیْنَ۔۔۔۔۔الخ

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت ید ابی لھب، حدیث:۴۹۷۱)

عبد اللہؓ ابن عباس نبی کریم کے مشہور صحابی ہیں، جن کے لئے خود نبی کریم نے اپنے سینے سے لگا کر دعا کی تھی کہ "اے اللہؐ! اسے اپنی کتاب (قرآن) کا علم عطا فرما"(صحیح بخاری: حدیث ۷۵)۔ اوپر پیش کی گئی روایت میں جس آیت کے نازل ہونے کو ابن عباس نے پیش کیا ہے وہ سورۃ شعراء کی آیت (نمبر ۲۱۴) ہے لیکن ہمارے موجودہ قرآن کے نسخوں میں یہ آیت صرف وَ أَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ کے الفاظ تک ہی ہے اور اس کے آگے کے الفاظ وَ رَ خْطَکَ مِنْھُمِ الْمُخْلَصِیْنَ موجود نہیں ہیں۔

ابن عباس کا اِس آیت کو ان الفاظ کے ساتھ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس آیت میں وَ رَ خْطَکَ مِنْھُمِ الْمُخْلَصِیْنَ کے الفاظ بھی شامل تھے۔ اگر سلسلہ سند کو دیکھا جائے تو ابن عباس نے یہ روایت اور یہ آیت مشہور تابعی، اپنے شاگرد سعید بن جبیر کے سامنے بیان کی ہے، جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ابن عباس، دور تابعین تک اور سعید بن جبیر اپنے دور تک سورۃ الشعراء کی اس آیت کو وَرَ خْطَکَ مِنْھُمِ الْمُخْلَصِیْنَ کے اضافے کے ساتھ بیان کرتے تھے، جو بعد میں نہ جانے کس وقت قرآن سے مکمل طور پر محو کر دی گئی اور یہ بھی قرآن کی انہیں آیات میں شامل ہو گئی کہ جن پر اللہؐ کی حفاظت میں ہونے کی ذمہ داری پوری نہ ہو سکی۔

4- موجودہ قرآن میں سورۃ النساء کی ایک آیت کچھ یوں درج ہے: لَّا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّـهِ- مگر کچھ راویوں کے نزدیک یہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی: لَّا يَسْتَوِي ٱلْقَٰعِدُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُجَٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ غَيْرُ أُوْلِي ٱلضَّرَرِ

(صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کاتب النبی، حدیث:۴۹۹۰)

یعنی "غَيْرُ أُوْلِي ٱلضَّرَرِ" کے الفاظ کچھ ثقہ رواۃ کے نزدیک آیت کے درمیان میں نہیں بلکہ آخر میں تھے۔

5- محمد صلعم اور صحابہ کرام کا عام دستور تھا کہ کسی سورت کا نام لینے کی بجائے اس کی کسی آیت کو بطور پہچان بیان کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابو سعید خدری کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے سحری میں کھڑے ہو کر قُلْ هُوَ

اللَّـهُ أَحَدٌ کو پڑھا۔"(صحیح بخاری:۵۰۱۴)اس طرح کی اور روایات بھی بطور ثبوت پیش کی جا سکتی ہیں کہ سورت کی آیت کو بطور پہچان بیان کیا گیا۔اس بات کو سمجھنے کے بعد دیکھئے کہ محمد صلعم نے خود بیان کیا کہ "اَللّٰہُ الوَاحِدُ الصَّمَدُ" قرآن مجید کا ایک تہائی حصہ ہے۔"

(صحیح بخاری،کتاب فضائل القرآن،باب فضل قل ھو اللّٰہ احد،حدیث:۵۰۱۵)

اب صرف اتنا غور فرمایئے کہ "اَللّٰہُ الوَاحِدُ الصَّمَدُ"کون سی سورت کی آیت ہے؟ دوسری روایات سے پتا چلتا ہے کہ یہ فضیلت سورہ اخلاص کی ہے تو پھر سورۃ اخلاص میں یہ آیت کہاں گئی جس کی طرف محمد صلعم)نے بطور خاص اشارہ کیا؟کیا یہ بھی تو انہیں آیات میں سے نہیں جو تدوینِ قرآن کے وقت لکھنے سے رہ گئیں؟

6-حضرت عبداللّٰہ بن عباس نے ایک آیت کے متعلق گواہی دے رکھی ہے کہ یوں نازل ہوئی تھی: لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلًا مِّن رَّبِّكُمۡ فِي مَوَاسِمِ الۡحَجِّ

(صحیح بخاری،کتاب الحج،باب التجارۃ ایام الموسم،حدیث:۱۷۷۰)

ابن عباس ہی کی گواہی سے یہ آیت صحیح بخاری میں تین اور مقامات پر بھی اسی طرح پیش ہوئی ہے۔دیکھئے صحیح بخاری(حدیث:۲۰۵۰،۲۰۹۸،۴۵۱۹)

موجودہ قرآن پاک میں یہ آیت سورۃ البقرۃ(آیت:۱۹۸)کا حصہ ہے مگر وہاں پر فِي مَوَاسِمِ الۡحَجِّ کے الفاظ موجود نہیں جو کہ ابن عباس کی گواہی کے مطابق نازل ہوئے تھے اور وہ اس آیت کو تابعین کے دور میں بھی اسی طرح بیان کرتے تھے۔صاف ظاہر ہے کہ یہ الفاظ بھی حفاظتِ قرآن کے دعوٰی پر پورا نہ اتر سکے۔

محمد صلعم کی وفات کے بعد اور بھی کئی آیات پر صحابہ کرام کا آپس میں شدید اختلاف تھا کہ کچھ کے نزدیک کچھ آیات قرآن میں شامل تھیں اور کچھ کے نزدیک وہی آیات قرآن میں شامل نہ تھیں بلکہ منسوخ ہو چکی تھیں، ملاحظہ فرمائیں:

7-حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عمر نے فرمایا:ابی بن کعب ہم میں سب سے بڑے قاری ہیں لیکن جہاں حضرت ابی بن کعب غلطی کرتے ہیں اس کو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ میں

نے تو قرآن مجید کو رسول اللہؐ کے دہن مبارک سے سنا ہے، اس لئے میں تو کسی کے کہنے پر اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: "ہم جو بھی آیت منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور لے آتے ہیں۔"

(صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب رسول اللہؐ، حدیث: ۵۰۰۵)

اس روایت سے کھل کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ صحابہ کرام محمد صلعم کی وفات کے بعد قرآن مجید پر ہرگز متفق نہ تھے۔ بہت سی آیات ایسی تھیں جنہیں ابی بن کعب جیسے جید صحابی قرآن میں شامل سمجھتے تھے جبکہ حضرت عمر کا خیال یہ تھا کہ وہ آیات منسوخ ہو چکی ہیں، لہٰذا قرآن کا حصہ نہیں۔ گویا حضرت ابی بن کعب کے مؤقف کے مطابق حضرت عمر کچھ آیات قرآن کو تسلیم نہ کرتے تھے اور حضرت عمر کے مؤقف کے مطابق حضرت ابی بن کعب کچھ ایسی آیات کو قرآن تسلیم کروانے پر بضد تھے جو قرآن کا حصہ نہ رہی تھیں۔

8- معاملہ صرف حضرت عمر یا ابی بن کعب تک کا نہ تھا بلکہ دیگر صحابہ اور تابعین بھی موجودہ قرآن سے اختلاف کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور صحابی عبداللہؐ بن مسعود کے چند تابعین شاگردوں نے ایک اور صحابی ابو درداء کے سامنے سورۃ الیل کی آیات یوں تلاوت کی: وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ﴿۱﴾ وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾ وَالذَّکَرِ وَالْاُنْثٰی اور گواہی دی کہ عبداللہؐ بن مسعود اسی طرح تلاوت کرتے تھے۔ ابو درداء نے اس پر فرمایا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے بھی نبی کریم کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے لیکن یہ شام کے لوگ چاہتے ہیں کہ میں وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی پڑھوں۔ اللہؐ کی قسم! میں کسی صورت میں ان کی پیروی نہ کروں گا۔"

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب والنھار اذا تجلّٰی، حدیث: ۴۹۴۴، ۴۹۴۳)

موجودہ قرآن میں سورۃ الیل کی یہ آیت وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی کے الفاظ کے ساتھ ہے جبکہ عبداللہؐ بن مسعود اور ابو درداء جیسے اصحاب رسول اور ان کے شاگرد تابعین اس آیت کو "مَاخَلَقَ" کے الفاظ کے بغیر پڑھتے تھے اور اسی کو محمد صلعم کی تلاوت قرار دیتے تھے۔ صحابی رسول ابو درداء کے الفاظ کی شدت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ موجودہ قرآن کے مطابق اس آیت کو پڑھنے کا کھلم کھلا انکار کرتے بلکہ اسے شام کے لوگوں کا اضافہ قرار دیتے۔

9-حضرت عائشہ کے آزاد کردہ غلام ابویونس سے روایت ہے کہ "حضرت عائشہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کے لئے قرآن لکھوں اور فرمایا: جب تم اس آیت پر پہنچو حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ تو مجھے بتانا، چنانچہ جب میں اس آیت پر پہنچاتو انہیں آگاہ کیا، انہوں نے مجھے لکھوایا: حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ حضرت عائشہ نے فرمایا: میں نے اسے رسول اللہؐ سے ایسے ہی سنا۔"

(صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب الدلیل لمن قال: الصلاۃ الوسطیٰ ھی صلاۃ العصر، حدیث: ۱۴۲۷)

ہمارے پاس موجود قرآن میں یہ سورۃ بقرۃ کی ۲۳۸ نمبر آیت ہے اور حضرت عائشہ کے تاکید کے ساتھ لکھوائے ہوئے اسی آیت کے الفاظ وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ کے بغیر ہے۔ حضرت عائشہ نے جو نسخہ قرآن اپنے لئے لکھوایا اس میں ان الفاظ کا اضافہ کروایا اور یہ بھی گواہی دی کہ انہوں نے اس آیت کو ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ ہی رسول اللہؐ سے سنا تھا، مگر افسوس کہ موجودہ قرآن میں آج یہ الفاظ بھی موجود نہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یا تو موجودہ قرآن حضرت عائشہ کے مطابق الفاظ کی کمی کا شکار ہے یا حضرت عائشہ کے قرآن میں کچھ الفاظ موجودہ قرآن سے زیادہ تھے۔ دونوں صورتوں میں حفاظت قرآن کا اسلامی عقیدہ و نظریہ طوفانوں کی زد میں ہے۔

10- مشہور تابعی سعید بن جبیر نے کہا حضرت ابن عباس اس طرح آیت کی تلاوت کرتے تھے: وَكَانَ أَمَامَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ صَالِحَةٍ غَصْبًا اور اس آیت کی بھی یوں تلاوت کرتے تھے: وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ كَافِرًا وَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب {وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ: لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا}، حدیث: ۴۷۲۵)

ہمارے پاس موجود قرآن کے مطابق یہ سورۃ الکہف کی آیات ۷۹، ۸۰ ہیں لیکن ابن عباس ان آیات کو ہمارے قرآن کے مطابق تلاوت نہیں کرتے تھے بلکہ آیت ۷۹ میں أَمَامَهُمْ پڑھتے جبکہ ہمارے قرآن میں اس کی جگہ لفظ وَرَاءَهُمْ ہے، اسی طرح اسی آیت میں ابن عباس سَفِينَةٍ صَالِحَةٍ پڑھتے جبکہ ہمارے قرآن میں سَفِينَةٍ کا لفظ سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس سے اگلی آیت ۸۰ میں بھی ہمارے موجودہ قرآن میں كَافِرًا وَكَانَ کے الفاظ غائب

ہیں جو ابن عباس کے مطابق موجود تھے اور وہ تلاوت بھی کرتے تھے۔

11-مشہور محدث ومفسر علامہ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں:

"امام عبد بن حمید اور محمد بن نصر المروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں اور ابن الانباری نے المصاحف میں محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب فاتحۃ الکتاب اور معوذ تین، اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَسۡتَعِینُ لکھتے تھے لیکن حضرت ابن مسعود ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہ لکھتے تھے۔ حضرت عثمان بن عفان نے مصحف میں فاتحۃ الکتاب اور معوذ تین لکھوائے تھے۔"

(تفسیر درِ منثور مترجم، ج1 ص27، مکتبہ ضیاء القرآن لاہور)

ان روایات سے ثابت ہے کہ سورۃ فاتحہ جو قرآن کی پہلی سورت ہے، سے لے کر معوذ تین یعنی سورۃ الفلق و الناس تک کے بارے میں صحابہ کا اختلاف موجود تھا کہ قرآن میں شامل ہیں کہ نہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان جن کا جمع کردہ قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے، وہ سورۃ فاتحہ اور معوذ تین کو قرآن میں لکھتے تھے، اسی طرح حضرت ابی بن کعب بھی لکھتے تھے لیکن سورۂ فاتحہ کی کچھ آیات کو موجودہ قرآن سے الگ طرح پڑھتے اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود سرے سے ہی قرآن میں سورۃ فاتحہ کو لکھتے نہ معوذ تین کو۔

مسلمان کبھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو محمد صلعم پر اترنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ کا آپس میں مختلف آیات کا شدید اختلاف تھا کہ وہ قرآن ہے یا نہیں۔

اس ضمن میں پہلوں کا جو اختلاف تھا کبھی بھی مسلمان حل نہیں کر پائے لیکن ایک اور دعویٰ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ تیسرے خلیفہ عثمان نے اپنے دور میں جو قرآن جمع کروایا، پھر اس پر اجماع ہو گیا کیونکہ باقی تمام مختلف مصاحف انہوں نے جلوا دیئے تھے۔ اس بیان پر جو جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان سے قطع نظر یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ اس عثمانی مصحف پر اجماع ہو گیا تھا کیونکہ عبداللہؓ بن مسعود اور ان کے شاگردوں نے سارے مصحف جمع کر کے جلوانے اور صرف ایک کو رائج کرنے کے عمل کی شدید مخالفت کی اور اسی مصحف پر قائم رہے جو ان کے پاس موجود تھا۔ اب پتا نہیں یہ کون سا اجماع ہے جس میں عبداللہؓ بن مسعود جیسا جلیل القدر صحابی اور ان کے

شاگرد شامل نہیں۔

12-چنانچہ خمیر بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکاری حکم جاری ہوا کہ مصاحف قرآنی کو بدل دیا جائے (حضرت عثمان غنی کے جمع کردہ مصاحف کے علاوہ کسی اور ترتیب کو باقی نہ رکھا جائے) حضرت ابن مسعود کو پتا چلا تو فرمایا:

"تم میں سے جو شخص اپنا نسخہ چھپا سکتا ہو، چھپالے، کیونکہ جو شخص جو چیز چھپائے گا قیامت کے دن اس کے ساتھ ہی آئے گا، پھر فرمایا کہ میں نے نبی کریم کے دہن مبارک سے ستر سورتیں پڑھی ہیں، کیا میں ان چیزوں کو چھوڑ دوں جو میں نے نبی کریم کے دہن مبارک سے حاصل کی ہیں۔"

(مسند احمد، مترجم، جلد دوم ص ۶۱۹-۶۲۰، حدیث ۳۹۲۹، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

یاد رہے کہ عبداللہؓ بن مسعود ان چار صحابہ میں سے ایک ہیں، جن سے خود پیغمبر اسلام نے قرآن سیکھنے کا حکم دیا تھا (صحیح بخاری: رقم الحدیث ۴۹۹۹)۔

مگر افسوس کہ جن سے قرآن سیکھنے کا حکم خود پیغمبر اسلام نے دیا بعد والوں نے اس مصحف کو ضائع کر دیا اور ان لوگوں کا جمع کردہ مصحف رائج کر دیا گیا جن کی ان لوگوں نے مخالفت کی تھی۔

ان تمام روایات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ قرآن کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ یہ بعینہ وہی قرآن ہے جو محمد صلعم چھوڑ کر گئے تھے، محض دوسروں کو اور خود کو دھوکہ دینا ہے۔ قرآن کی حفاظت الٰہی کا دعویٰ تو محمد کی وفات کے فوراً بعد ہی اپنا اثر چھوڑ گیا تھا اور بہت سی ایسی آیات جو وفاتِ نبی تک موجود تھیں، پڑھی جارہی تھیں، قرآن کی تدوین کے وقت شامل نہ ہو سکیں کیونکہ وہ مختلف واقعات میں ضائع ہو چکی تھیں۔ پھر کئی آیات ایسی تھیں جو مختلف صحابہ کے درمیان مختلف فیہ تھیں کہ ایک کے نزدیک قرآن اور دوسرے کے نزدیک غیر قرآن، ایک کے نزدیک دوسرا قرآن کی کچھ آیات کا منکر بن رہا تھا اور دوسرے کے نزدیک پہلا کچھ زائد آیات قرآن میں شامل سمجھ رہا تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت سی آیات ایسی تھیں جو مختلف صحابہ دور تابعین میں بھی اس طرح پڑھتے تھے کہ موجودہ قرآن میں ان آیات کے کچھ الفاظ موجود نہیں یا زائد ہیں۔ اسی طرح بعد میں جس قرآن

کو تیسرے خلیفہ نے سرکاری سرپرستی میں رائج کروایا اس سے بھی کئی ایک صحابہ و تابعین کا اختلاف تھا اور ان مختلف قرآن کے نسخوں کو زبردستی ضبط کر کے ضائع کیا جاتا رہا تا کہ قرآن کے اس شدید اختلاف پر پردہ ڈالا جا سکے۔

یہ تو محض (راقم کے علم کی حد تک) وہ روایات پیش کی گئی ہیں جن میں موجودہ قرآن کی پوری پوری آیات یا الفاظ کا فرق ہے، اگر صحابہ و تابعین کے درمیان قرآن کی مختلف آیات کے پڑھنے کا اختلاف سامنے لایا جائے تو اس کے لئے الگ کتاب چاہیئے اور کوشش ہوگی کہ اس پر الگ سے کچھ لکھا جا سکے۔ وَمَاعَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِیْن۔

قرآن میں انسانی تصرف کی نشاندہی

سادہ سا سوال ہے کہ اگر اللہ نے اپنے ماننے والوں کو ایک حکم دے رکھا ہو، پھر اللہ کے ماننے والے ہی اس کی حکم عدولی کر کے ایک ایسے حکم کو پامال کر کے رکھ دیں جس کا تعلق شعائر اللہ سے ہو، تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اس پر اللہ کا کیا ردِ عمل ہونا چاہیئے؟ اسلام سے قبل مشرکین مکہ کے ہاں حج رائج تھا، جس میں کچھ رسومات میں ترامیم کر کے اسلام نے اسے جوں کا توں برقرار رکھا، حج کے موقع پر حجاج کے قافلوں کی آمد کے دوران امن و امان کو قائم رکھنے کیلئے اسلام سے قبل ہی چار مہینوں کو "حرام" یعنی حرمت والے مہینے قرار دیا گیا تھا، کیونکہ حج نہ صرف ایک مذہبی رسم تھی بلکہ قریش کی معیشت کا بنیادی ستون بھی تھا، جیسا کہ آج بھی ہے۔ قریش ان چار مہینوں میں جنگ و جدال سے مکمل احتراز برتا کرتے تھے، تا کہ دوران حج ان کی کاروباری سرگرمیاں محفوظ طور پر جاری رہ سکیں۔ ان چار مہینوں میں سے تین مہینے تو تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے آتے ہیں یعنی ذو القعدۃ، ذوالحجۃ اور محرم الحرام، جو بالترتیب سال کا گیارہوں، بارہواں اور پہلا مہینہ ہیں اور ان تین ماہ کے علاوہ رجب بھی ان حرمت والے مہینوں میں شامل تھا، جو ساتواں مہینہ ہے۔ عربی میں ان چار مہینوں کو "اشہر حرم" کہتے ہیں۔ اسلام نے بھی ان شہروں کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے ان مہینوں میں جنگ و جدال کو حرام قرار دیا۔

حرمت کے مہینوں میں جنگ و جدال سے ممانعت کا حکم جس آیت میں بیان کیا گیا وہ درج ذیل آیت ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰہِ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْھَدْیَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرِضْوَانًا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿ المائدۃ ۲ ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کو حلال نہ سمجھو اور نہ حرمت والے مہینے کو اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو اور نہ ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے ہوں اور نہ حرمت والے گھر کی طرف آنے والوں کو جو اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشی ڈھونڈتے ہیں اور جب تم احرام کھول دو پھر شکار کرو اور تمہیں اس قوم کی دشمنی جو کہ تمہیں حرمت والی مسجد سے روکتی تھی اس بات کا باعث نہ بنے کہ زیادتی کرنے لگو اور آپس میں نیک کام اور پرہیز گاری پر مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس آیت میں ہمارے موضوع کے اعتبار سے دو باتیں بہت اہم ہیں:

1- حرمت والے مہینوں کو حلال سمجھنے یعنی ان میں جنگ و جدال کرنے کی ممانعت۔

2- قریش کے ساتھ دشمنی کے باعث مسلمانوں کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا کہ تمہاری طرف سے ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے، اور ظلم پر ظالم کی مدد نہ کرنا۔

قران میں "اشہر حرم" سے متعلق دیئے گئے حکم کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئندہ سطور میں بیان کئے واقعہ کا مطالعہ کیجئے، اور پھر دماغ کی بتی جلا کر اس بات کا جائزہ لیجئے کیا خدا اپنے متبعین کو کسی ایسی بات کا حکم دے گا کہ بعد میں خود خدا کو اپنی حکم عدولی پر بجائے ان متبعین کو متنبہ اور سرزنش کرنے کے شاباشی دینی پڑے، کیا خدا واقعی عالم الغیب ہے اور اسے مستقبل میں آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہے؟ اس جائزے میں صرف عقل والوں کیلئے سوچ کے نئے راستے ہیں، جو لوگ عقیدت کا حصار توڑنے کی جرأت نہیں رکھتے، مقدس بتائی گئی باتوں پر شک کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، ان پر سوال اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے وہ صرف اندھی اطاعت ہی کر سکتے ہیں، ذہنی غلامی پر صابر و شاکر رہ کر فریب زدگی کو عبادت اور اطاعت سمجھتے ہیں۔

نیچے سیرت ابن ہشام سے ایک واقعہ ذکر کر رہا ہوں جو مسلمانوں کے مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کے 16 ماہ بعد، اور غزوہ بدر سے ڈھائی ماہ قبل کا ہے، یہ واقعہ قرآن کی ایک اہم ترین آیت کا شان نزول بنا، اور اسلامی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کئے:

سریہ عبداللہ بن جحش: رسول اللہ نے رجب (۲ ہجری) کے مہینے میں عبداللہ بن جحش بن رہاب اسدی کو مع آٹھ مہاجرین کے روانہ فرمایا اور ایک کاغذ لکھ کر ان کو عنایت کیا اور فرمایا دو منزل راہ طے کر کے اس کاغذ کو دیکھنا، چنانچہ عبداللہ بن جحش نے ایسا ہی کیا اور عبداللہ بن جحش کے ساتھی یہ لوگ تھے:

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے **ابو حذیفہ بن عقبہ** بن ربیعہ بن عبد شمس اور ان کے حلفاء میں سے **عبداللہ بن جحش** جو سردار تھے، اور **عکاشہ بن محصن** بن حرثان اسدی، اور بنی نوفل بن عبد مناف میں سے **عتبہ بن غزوان** ابن جابر ان کے حلیف اور بنی زہرہ بن کلاب میں سے **سعد بن وقاص**، اور بنی عدی بن کعب میں سے **عامر بن ربیعہ** ان کے حلیف جو عشر بن

وائل کے قبیلہ سے تھے اور **واقد بن عبد اللہ** بن عبد مناف بن عربد بن ثعلبہ بن یربوع بنی تمیم میں سے ان کے حلیف اور **خالد بن بکیر** بنی سعد بن لیث میں سے ان کے حلیف، اور بنی حرث بن فہر میں **سہیل بن بیضاء**۔

نخلہ جانے کا حکم: راوی کہتا ہے کہ جب عبد اللہ دو دن راہ طے کر چکے تب انہوں نے نبی کریم کے کاغذ کو کھول کر دیکھا اس میں لکھا تھا کہ جب تم میرا یہ کاغذ دیکھو تو سیدھے مقام نخلہ میں جو طائف اور مکہ کے درمیان ہے جا پہنچنا اور وہاں قریش کے قافلہ کا انتظار کرنا اور ہم کو اس کی خبر دینا۔ جب عبد اللہ بن جحش نے یہ حکم دیکھا، کہا میں ہر طرح حکم کا مطیع ہوں، پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے اس کو بیان کیا اور کہا رسول اللہ نے مجھ کو حکم فرمایا ہے کہ تم اپنے ساتھیوں پر زبردستی نہ کرنا۔ لہذا جو تم میں سے شہادت کی آرزو رکھتا ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جو واپس جانا پسند کرے وہ چلا جائے۔ مگر ان کے ساتھیوں میں سے کوئی واپس نہ پھرا اور سب حجاز کی طرف روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب یہ مقام بحران میں پہنچے سعد ابن و قاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا، یہ دونوں ایک ہی اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ اس کی تلاش میں یہ پیچھے رہ گئے اور عبد اللہ بن جحش باقی ساتھیوں کے ساتھ مقام نخلہ میں پہنچ گئے، وہاں قریش کے سوداگروں کا قافلہ ان کے پاس سے گذرا جس میں کشمش اور چمڑا و غیرہ مال تجارت کثرت کے ساتھ تھا اور عمرو بن حضرمی بھی قافلہ میں تھا۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ حضرمی کا نام عبد اللہ بن عباد تھا اور یہ صدف کی اولاد میں سے تھا اور صدف کا نام عمرو بن مالک ہے اور یہ سکون بن مغیرہ بن اشرس بن کندہ کی اولاد سے تھا اس واسطے اس کو کندی بھی کہتے ہیں۔

قافلہ قریش سے جھڑپ: ابن اسحاق کہتے ہیں: عثمان بن عبد اللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبد اللہ مخزومی اور حکم بن کیسان، ہشام بن مغیرہ کا غلام، یہ سب لوگ اس قافلہ میں تھے۔ جب ان کفار نے مسلمانوں کو دیکھا تو خوف زدہ ہوئے، عکاشہ بن محصن نے سر منڈا رکھا تھا، یہ کفار کے سامنے ایک ٹیلے پر چڑھے۔ کفار ان کو دیکھ کر مطمئن ہوئے اور کہنے لگے کچھ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔۔ پھر مسلمانوں نے باہم مشورہ کیا کہ آج رجب کا آخری دن ہے اگر تم ان سے لڑتے ہو اور ان کو قتل کرتے ہو تو یہ مہینہ حرام ہے اور اگر آج انتظار کرتے ہو تو راتوں رات یہ حرم میں داخل ہو کر پھر تمہارے ہاتھ نہ آئیں گے۔

آخر انہوں نے اپنے دل قوی کئے اور جنگ ہی پر سب کا اتفاق ہوا اور واقد بن عبد اللہ تمیمی نے ایک تیر ابن حضرمی کے ایسا مارا جس سے وہ جہنم رسید ہو گیا۔ اور عثمان بن عبد اللہ اور حکم بن کیسان کو مسلمانوں نے قید کر لیا اور نوفل بن عبد اللہ بھاگ گیا۔ ہر چند اس کو تلاش کیا، مگر کہیں نہ ملا۔ پھر عبد اللہ بن جحش ان دونوں قیدیوں اور مال غنیمت کو لے کر مدینہ میں رسول اللہ کے پاس حاضر ہوئے۔

مدینہ منورہ واپسی: روایت ہے کہ عبد اللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ یہ جس قدر مال غنیمت ہمارے ہاتھ لگا ہے اس میں سے پانچواں حصہ ہم رسول اکرم کی نذر کریں گے۔ اور یہ واقعہ خمس کے فرض ہونے سے پہلے کا ہے، چنانچہ عبد اللہ بن جحش نے آنحضرت کے واسطے خمس نکالا۔

ابن ہشام کہتے ہیں جب عبد اللہ بن جحش مدینہ میں آئے تو رسول پاک نے ان سے فرمایا کہ: "میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ تم حرام مہینہ میں جنگ کرو" اور آنحضرت نے اس خمس کو بھی نہیں لیا۔ اور سب مال اور دونوں قیدیوں کو رہنے دیا۔ عبد اللہ اور ان کے ساتھی بہت رنجیدہ تھے اور خیال کرتے تھی کہ ہم ہلاک ہوگئے اور مسلمان بھی ان کی اس حرکت کو برا کہتے تھے اور قریش یہ کہتے تھے کہ محمد نے حرام مہینہ کو بھی حلال کرلیا اور اس میں خون بہایا اور مال لوٹا اور لوگوں کو قید کیا۔ مکہ کے مسلمان ان کو یہ جواب دیتے تھے کہ وہ دن شعبان کا تھا رجب کا نہیں۔

ارشاد قرآن مجید: جب لوگوں نے اس واقعہ میں بہت قیل و قال کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا

ترجمہ: آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دو اس میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس میں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے اور وہ تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تب مسلمانوں کی بے چینی اور تردد رفع ہوا اور رسول اللہ نے خمس بھی قبول فرمایا اور قیدیوں کو اپنے قبضے میں کیا۔ قریش نے عثمان بن عبد اللہ اور حکم کیسان کو چھڑانے کیلئے آنحضرت کے پاس فدیہ بھیجا۔ رسول پاک نے فرمایا ابھی میں ان کو نہیں چھوڑ تا جب تک کہ سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان واپس نہ آجائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے ہاتھ آجائیں اور تم ان کو قتل کردو۔ اگر تم ایسا کروگے تو میں ان دونوں کو قتل کردوں گا۔ چنانچہ جب سعد اور عتبہ اپنا اونٹ لے کر آگئے تو رسول اللہ نے عثمان اور حکم کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ حکم بن کیسان تو مسلمان ہوگئے اور ان کا اسلام بہت اچھا ہوا اور رسول اللہ ہی کے پاس مدینہ میں رہے یہاں تک کہ بیر معونہ کی جنگ میں شہید ہوئے، اور عثمان بن عبد اللہ مکہ چلا آیا۔ اور کفر ہی کی حالت میں مر گیا۔

اللہ کی رحمت: جب عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو آیت یَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ کے نازل ہونے سے اطمینان ہوا، تب انہوں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس ہمارے غزوے کا ہم کو ثواب بھی ملے گا یا نہیں جو مجاہدین کو ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَـٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿سورۃ البقرۃ۲۱۸﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔

مال غنیمت: ابن اسحاق کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے عبد اللہ بن جحش کی رائے کے موافق مال غنیمت کا فیصلہ فرمایا۔ یعنی تمام مال کے پانچ حصے کرکے چار حصے ان مجاہدین کے مقرر کئے جنہوں نے وہ مال حاصل کیا ہے اور پانچوں حصہ خدا اور رسول کا مقرر کیا۔

ابن ہشام کہتے ہیں یہ پہلی غنیمت تھی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور عمرو بن حضرمی پہلا شخص تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اور عثمان بن عبد اللہ اور حکم بن کیسان پہلے قیدی تھے جو مسلمانوں نے گرفتار کئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں بعض لوگوں کا قول ہے بیت المقدس کی طرف قبلہ ماہ شعبان میں رسول مقبول کے مدینہ تشریف لانے کے اٹھارہ مہینے بعد مقرر ہوا۔

(سیرت ابن ہشام، اردو مترجم جلد اول، نسخہ ادارہ اسلامیات لاہور)

تنقیدی جائزہ:

اب اس ساری صورت حال کا تنقیدی جائزہ لیجیے، عقیدت کے خول سے تھوڑی دیر کیلئے باہر نکل آیئے، کیا ایسا ممکن ہے کہ اللہ نے ایک حکم جاری کیا ہو، مسلمانوں کو کسی کام سے سختی سے منع کیا ہو، پھر مسلمان ہی اس حکم خداوندی کو پامال کریں، اس کی خلاف ورزی کریں، اور اللہ تعالیٰ بجائے ان مسلمانوں کی سرزنش کرنے کے اپنی اس حکم عدولی کو وحی کے ذریعے "سند جواز" جاری فرمائے؟ اور نہ صرف سند جواز عطا کرے بلکہ انعام کے طور پر لوٹ مار اور رہزنی کے مال کو مسلمانوں کو حلال قرار دے، اور رسول اللہ کیلئے بھی اس میں سے تاحیات ایک حصہ مقرر کرے؟ ایک ایسا زود رنج خدا جو معمولی باتوں پر ناراض ہو کر ہمیشہ کے عذاب سے ڈراتا ہو، اتنی بڑی حکم عدولی سے چشم پوشی کرے گا؟

یہ ساری صورت حال اس بات کی غماز ہے کہ نہ تو "اشہر حرم" میں جنگ کی پابندی والا حکم، حکم الہٰی تھا، اور نہ ہی بعد میں اسے سند جواز عطا کرنے والی وحی، وحی الہٰی تھی، بلکہ یہ سارا معاملہ انسانی فیصلوں میں وقت کے ساتھ تبدیلی کا آئینہ دار ہے۔

"اشہر حرم" میں جنگ کی ممانعت کے متعلق آیت اور درج بالا واقعہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد بہت سے شکوک وشبہات انسان کے ذہن میں سر اٹھاتے ہیں کہ:

حرمت کے مہینوں میں جنگ کی واضح ممانعت کے باوجود رسول اللہ نے رجب کے مہینے میں ہی ایک مسلح دستے کو قریش کے تجارتی قافلے کی جاسوسی کیلئے کیوں روانہ فرمایا؟ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے تجارتی قافلوں کی خبر رسول اللہ کو جبرائیل امین عالم بالا سے تشریف لا کر دیا کرتے تھے، یہاں بھی یہی فرض کر لیتے ہیں کہ اس قافلے کی خبر بھی رسول اللہ کو جبرائیل امین نے ہی عالم بالا سے تشریف لا کر دی، تو کیا اس ساری صورت حال سے اللہ تعالیٰ بے خبر تھا؟ کیا اللہ کو پہلے سے ہی معلوم نہیں تھا کہ یہ مسلح دستہ رجب کے حرمت والے مہینے میں ہی قریش کے تجارتی قافلے کا سامنا کرے گا اور یہ مسلمان حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت کے واضح حکم خداوندی کے باوجود حکم الٰہی پر مال غنیمت کی چاہت کو ترجیح دیتے ہوئے اس پر حملہ کر بیٹھیں گے، جو مسلمانوں کی جگ ہنسائی کا سبب بنے گا؟

واقعہ میں مذکور ہے کہ جب عبداللہ بن جحش نے واپس آ کر اپنی کارگزاری کی رسول اللہ کو اطلاع دی تو رسول اللہ نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور مالِ غنیمت تک لینے سے انکار کر دیا، رسول اللہ، اللہ کی محبوب ترین ہستی، جن کیلئے اس ساری کائنات کو اللہ نے تخلیق کیا، ان کی ناگواری کا تقاضا تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی حکم عدولی اور رسول اللہ کی ناگواری کا سبب بننے والے ان صحابہ کو تا قیامت نشانہ عبرت بنا دیتا، اور انہیں کڑی سے کڑی سزا دیتا جو رسول اللہ کو ایذاء پہنچانے کا باعث بنے (قرآن کی آیت الذین یؤذون اللّٰہ ورسولہ کو ذہن میں رکھئے، جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، اور جس سے بہت سے علماء کرام نے مرتد کی سزا قتل کا استدلال بھی کیا ہے) لیکن یہاں اللہ تعالیٰ اپنی محبوب ترین ہستی کے بجائے ان نافرمان اور رسول اللہ کی ناراضگی کا سبب بننے والے صحابہ کی طرف داری کرتے ہوئے ان کے اس فعل کو سند جواز بذریعہ وحی الٰہی عطا فرمائی۔

ان صحابہ کے اس فعل کو اللہ نے بذریعہ وحی الٰہی سند جواز عطا کرتے ہوئے یہ توجیہ بیان کی کہ الفتنۃ اشدّ من القتل، یعنی فتنہ کسی کو قتل کر دینے کی نسبت زیادہ بڑی برائی ہے۔ فتنہ سے مراد مسلمان مفسرین کے نزدیک قریش مکہ کی سازشیں ہیں جو وہ مسلمانوں کے خلاف گھڑا کرتے تھے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ محض کسی پر سازش کا الزام لگا کر کیسے اس کے خلاف عسکری کارروائی کی جاسکتی ہے؟ اور وہ بھی براہ راست سازش کے مرکز پر نہیں بلکہ ایک تجارتی قافلے پر حملہ کرکے تجارتی شاہراہ کا امن وامان پامال کیا جارہا ہے۔ یاد رہے یہ وہی تجارتی شاہراہ ہے جس کا قرآن سورۂ قریش میں ذکر کرتے ہوئے اس تجارتی شاہراہ کا پرامن اور بے خطر ہونا قریش پر بطور نعمت خداوندی ذکر کرتا ہے اور پھر اللہ اپنے ہی بندوں کے ہاتھوں اس شاہراہ کو پرخطر بھی بناڈالتا ہے۔

قرآن کی جس آیت میں مسلمانوں کو حرمت کے مہینوں میں جنگ سے منع کیا گیا تھا اسی آیت میں مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کی گئی تھی کہ قریش کی ساتھ تمہاری دشمنی تمہاری جانب سے ان پر زیادتی کا باعث نہ بن جائے، یہاں بھی مسلمانوں نے حکم خداوندی کی لاج نہ رکھتے ہوئے نہ صرف زیادتی کی بلکہ اس زیادتی میں قریش پر سبقت بھی لے گئے۔ اگر اس واقعہ سے قبل قریش کی جانب سے کوئی زیادتی اہل مدینہ پر ہوئی ہوتی تو مسلمان یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ چونکہ ابتداء قریش کی جانب سے ہوئی تھی اس لئے ہماری طرف اسے جوابی کارروائی سمجھ لیا جائے، لیکن مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد مسلح کارروائیوں کے ذریعے تجارتی شاہراہ پر قریش کے تجارتی قافلوں کو نشانہ بنانے کا اعزاز بھی قرآن کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرنے کی صورت میں مسلمانوں کو ہی حاصل ہوا، اسی لئے ابن ہشام گواہی دے رہے ہیں کہ:

"یہ پہلی غنیمت تھی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور عمرو بن حضرمی پہلا شخص تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان پہلے قیدی تھے جو مسلمانوں نے گرفتار کئے"

قرآن اور دعوائے بلاغت

جب بات قرآن کی بلاغت کی ہوتی ہے تو مسلمان عام طور پر اپنے دلائل مندرجہ ذیل چار بنیادی مفروضوں پر رکھتے ہیں:

1- عربوں کا محمدی قرآن پر حیرت زدہ ہونا۔
2- قرآن کا عربوں کو چیلنج کہ وہ اس کے جیسا لا کر دکھائیں۔
3- قرآنی چیلنج کی ہمسری کرنے میں عربوں کی ناکامی۔
4- مسلم بن حبیب (مسیلمہ) کی قرآن کی ہمسری کرنے کی احمقانہ کوشش۔

ان چار باتوں کو بنیاد بنا کر آخری نتیجہ یہی نکالا جاتا ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے، آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟۔

1- عربوں کا محمدی قرآن پر حیرت زدہ ہونا۔

جب بات قرآن پر حیرت زدہ ہونے کی آتی ہے تو عام طور پر الولید بن المُغیرہ کا یہ قول بڑے فخر سے اور چھاتی ٹھوک کر نقل کیا جاتا ہے کہ:

"ان لہ لحلاوۃ، وان علیہ لطلاوۃ، وان اعلاہ لمثمر، وان اسفلہ لمغدق، وانہ لیعلو ولا یعلی علیہ" (بخاری)

ترجمہ: اس میں ایک چاشنی ہے، اور بے بہار ونق ہے، اس کا اوپر کا حصہ پھلدار ہے، اور نیچے کا حصہ راحت بخش ہے، بے شک یہ غالب ہے اور اس پر غالب نہیں ہوا جاسکتا۔

تقدیر کا مذاق یہ ہے کہ الولید بن المُغیرہ نامی یہ شخص جس کی لغوی اور بلاغی فصاحت کی مثالیں دی جاتی ہیں محمد پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں تھا، اس کے بر عکس قرآن نے اس غریب کا ذکر بڑی حقارت سے کیا ہے، مگر کیا واقعی الولید بن المُغیرہ نے قرآن کی مدح کی تھی جیسا کہ حدیث اور اسلامی تاریخ کی کتابیں کہتی ہیں یا قرآن کے بارے میں اس کی رائے کچھ اور تھی؟ یہاں پر بھی تقدیر کا ایک اور گھناؤنا مذاق یہ ہے کہ قرآن نے الولید بن المُغیرہ کی قرآن کے بارے میں رائے نقل کی ہے، آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن الولید بن المُغیرہ کی اُس کے اپنے بارے میں رائے کی بابت کیا کہتا ہے خاص طور سے جبکہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن تاریخ سے زیادہ صحت کا حامل ہے کیونکہ یہ براہ راست اللہ کا کلام ہے:

اِنَّہٗ فَکَّرَ وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ کَیۡفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ کَیۡفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾
ثُمَّ اَدۡبَرَ وَاسۡتَکۡبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ یُّؤۡثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ
﴿۲۵﴾ (المدثر 18 تا 25)

اس نے غور و فکر کیا اور ایک بات ٹھہرالی۔ یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔ پھر یہ مارا جائے اس نے یہ کیسی تجویز کی۔ پھر اس نے نگاہ کی۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑا۔ پھر پیٹھ کر چلا اور تکبر کیا۔ پھر کہنے لگا یہ تو جادو ہے جو پہلے لوگوں سے برابر ہوتا آیا ہے۔ پھر بولا یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔

تو گویا الولید بن المُغیرہ –جس کی لغوی معرفت پر مسلمان فخر کرتے ہیں– کی قرآن کے بارے میں رائے یہ تھی کہ یہ ایک بشر کا کلام ہے، اور یہ رائے بھی اس نے بڑے غور و خوض کے بعد قائم کی تھی جیسا کہ آیات سے واضح ہے، اور اگر یہی بات ہے تو پھر اس نے یہ کب کہا کہ بے شک یہ غالب ہے اور اس پر غالب نہیں ہوا جاسکتا؟ اسے کہتے ہیں تاریخ سے اندھی نقل، یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اسلامی تاریخ خود مسلمانوں نے ہی لکھی ہے، کیا ایسی کسی تاریخ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے جو کسی قوم نے اپنے اوپر حکم صادر کرنے کے لیے خود ہی لکھی ہو؟! اور پھر یہاں تو حدیث قرآن سے ہی ٹکرا رہی ہے؟!

میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ قرآن عربوں کے لیے حیرت کا باعث تھا، لیکن یہ وہ حیرت نہیں ہے جو مسلمان عام طور پر سمجھتے ہیں، عرب اپنی ادبیات میں صرف شعر، نثر اور سجع سے واقف تھے، شاعری جانی پہچانی تھی، نثر خطبوں میں استعمال ہوتی تھی جبکہ سجع کاہنوں کے کلام اور خطبوں میں بھی مستعمل تھی، مگر قرآن نے آکر اس سب کی کھچڑی بناڈالی، اس

طرح ان کے لیے یہ ایک نئی ادبی جنس تھی، عربوں کی حیرت کی وجہ صرف یہی تھی، قرآن کی اس شکل میں محمد کی توراتی، انجیلی اور قدیم معارف کی اچھی معلومات نے اہم کردار ادا کیا، تاہم لغوی ڈھانچہ اس ضمن میں رتی بھر اہمیت کا حامل نہیں ہے، سوال ابھی بھی اپنی جگہ پر قائم ہے کہ کیا عرب واقعی یہ سمجھتے تھے کہ قرآن کی زبان بلیغ ہے؟

یہ جاننے کے لیے کہ کیا کسی خاص متن میں بلاغت ہے یا نہیں ہمیں اسے اہلِ بلاغت کے سامنے پیش کرنا ہوگا، قریش کسی بھی حال میں اہلِ بلاغت نہیں تھے، وہ چاہے جتنے بھی بلیغ ہوں ان اعراب سے زیادہ بلیغ ہو ہی نہیں سکتے جو بادیہ میں رہتے تھے، خود عرب اپنے بچوں کو بادیہ کی طرف فصاحت وبلاغت سیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، لہذا اگر قرآن واقعی اس قدر بلیغ ہے کہ کوئی بھی اس کے سامنے عاجز ہو جائے تو سب سے پہلے جو لوگ اس بات کو سمجھتے وہ بادیہ کے اعراب (بدو) ہوتے، اب سوال یہ ہے کہ قرآن کے حوالے سے اعراب کا کیا موقف تھا؟ کیا قرآن کی لغوی فصاحت وبلاغت سے متاثر ہو کر یہ اعراب جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے جیسا کہ ہونا چاہیے؟ یہاں بھی تقدیر کا ایک اور مذاق یہ ہے کہ خود قرآن ہی اسلام اور قرآن کے بارے میں اعراب کی رائے نقل کرتا ہے:

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۹۷﴾ (التوبۃ 97)

دیہاتی لوگ پکے کافر اور پکے منافق ہیں اور ایسے ہیں کہ جو احکام شریعت اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں ان سے واقف ہی نہ ہو پائیں۔ اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

تو گویا اعراب جو اہلِ لغت تھے اور قرآن کی فصاحت وبلاغت کا اعتراف کرنے والا سب سے اہلِ طبقہ تھا انہیں قرآن میں کوئی فصاحت اور بلاغت نظر نہیں آئی اور یہی شروع میں ان کے اسلام قبول نہ کرنے کی اہم وجہ تھی، اور بعد میں جب وہ ایمان لے بھی آئے، قرآن نے ان کے ایمان کو مسترد کرتے ہوئے ان کے ایمان کی حقیقت چاک کر دی اور ہمیں بتایا کہ ان کا ایمان سچا نہیں تھا بلکہ محض ظاہری تھا:

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾
(الحجرات 14)

دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ابھی

تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اسکے رسول کی فرمانبرداری کروگے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔ بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔

یہ اعراب یعنی اہلِ لغت وفصاحت وبلاغت کا قرآن کے تئیں موقف تھا، قریش اور عرب کے دیگر دھڑے محض اس مالِ غنیمت کی لالچ میں مسلمان ہوئے تھے جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا:

لَقد رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ ال مُؤ مِنی نَ اِذ یُبَایِعُو نَک تَح تَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِی قُلُو بِہِم فَاَن زَلَ السَّکِی نَۃ
عَلَی ہِم وَ اَثَابَہُم فَت حًا قَرِی بًا ﴿۱۸﴾ وَّ مَغَانِمَ کَثِی رَۃً یَّا خُذُو نَہَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِی زًا حَکِی مًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَکُمُ
اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِی رَۃً تَا خُذُو نَہَا فَعَجَّلَ لَکُم ہٰذِہٖ وَکَفَّ اَی دِیَ النَّاسِ عَن کُم ۚ وَلِتَکُو نَ اٰیَۃً لِّل مُؤ مِنِی نَ وَ
یَہ دِیَکُم صِرَاطًا مُّس تَقِی مًا ﴿۲۰﴾ (الفتح 18 تا 20)

اے پیغمبر جب مومن تم سے اس درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا۔ اور جو صدق وخلوص انکے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسکین نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔ اور بہت سی غنیمتیں وہ آئندہ بھی حاصل کریں گے۔ اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے کہ تم انکو حاصل کروگے پھر اس نے یہ غنیمت تمہیں جلدی سے دلوادی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے۔ غرض یہ تھی کہ یہ مومنوں کے لئے اللہ کی قدرت کا نمونہ بن جائے اور وہ تمکو سیدھے رستے پر چلائے۔

خود اسلامی تاریخ کی کتابیں ہی اس بات کی گواہ ہیں کہ کس طرح محمد کی موت کے بعد عرب اسلام سے مرتد ہوگئے تھے اور مسلمان صرف مکہ اور مدینہ میں ہی باقی رہ گئے تھے یا اِدھر اُدھر کچھ چھوٹے چھوٹے قبیلے جبکہ عرب کی اکثریت مرتد ہوگئی تھی تو کیا وہ لوگ جو قرآن کی فصاحت اور بلاغت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے وہ مرتد ہو سکتے تھے؟ کیا ان کی رِدت اس بات کا ثبوت نہیں کہ ان کا اسلام لالچ اور موقع پرستی پر مبنی تھا جس کا قرآن اور اس کے نام نہاد معجزے سے کوئی تعلق نہیں تھا؟

2- قرآن کا عربوں کو چیلنج کہ وہ اس کے جیسا لا کر دکھائیں۔

سچ تو یہ ہے کہ چیلنج کا یہ آئیڈیا کچھ عجیب سا ہے، اللہ کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے تقدس اور مقام سے گرتے ہوئے انسانوں سے کسی بھی میدان میں مقابلے کا محاذ کھولے، خاص کر جبکہ چیلنج کا تعلق خالصتاً ایک بشری معاملے سے ہے، زبان خالصتاً انسانی صنعت ہے خدائی نہیں، زبانوں کی تشکیل انسانی معاشرے کرتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اور بلاتوقف ترقی کرتی رہتی ہیں

اور تبدیل ہوتی رہتی ہیں، کیا ہم میں سے کسی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی چار سالہ بچے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے کسی چیز کا چیلنج کرے؟ بہر حال آیئے دیکھتے ہیں کہ اس صورت میں چیلنج کا کیا مطلب ہے؟ کیا واقعی کوئی شخص کسی چیز جیسی کوئی دوسری چیز لا سکتا ہے جب تک کہ وہ بالکل ویسی نہ ہو؟ مِثل اور مماثلت کیا ہے؟ اگر میں کسی سے یہ مطالبہ کروں کہ وہ اس جیسی کوئی عبارت لا کر دکھائے:

"القاعدون علی الجمر"

تو اس کے جیسی عبارت بھی اسی کے جیسی ہی ہوگی:

"القاعدون علی الجمر"

اگر کوئی یہ عبارت لے آئے:

"القاعدون علی الحصی"

یا:

"القاعدون علی الصخر"

تو یہ اس کی جیسی یا مثل نہیں ہے بلکہ یہ الگ عبارتیں ہیں جن کا میری اصل عبارت سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ ان دونوں عبارتوں کو ہمسری کے باب میں لیا جا سکتا ہے، جیسے قرآن کہتا ہے کہ:

"لیس کمثلہ شیء" (الشوری 11)
اس کے جیسی کوئی چیز نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے جیسی کوئی چیز کبھی نہیں ہوتی، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مراد اس کے جیسی بلاغت ہے مگر یہاں مذہبی جذباتیت یہ تعین کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی کہ کیا نیا متن اصل متن کے ہمسر ہے یا نہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمان ایسے کلام کا مذاق اڑاتا ہے:

"والزارعات زرعا، والحاصدات حصداً" (مسلم بن حبیب سے منسوب)

مگر اس کا مذاق نہیں اڑاتا:

"والعادیات ضبحاً، فالموریات قدحاً" (العادیات 1 اور 2)

آخر ان دونوں میں نوعیتی اور بلاغی فرق کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں میں قطعی کوئی فرق نہیں ہے، فرق صرف تقدس کا ہے، مسلمان دوسرے کو اللہ کا کلام سمجھتا ہے لہذا وہ بلیغ ہے چاہے وہ نا بھی ہو اور پہلا چونکہ اس کی نظر میں انسانی کلام ہے لہذا وہ لازماً مضحکہ خیز ہے چاہے وہ نا بھی ہو۔۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ دونوں ہی انتہائی سادہ اور ناپختہ کلام ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے کو تقدس حاصل ہے جبکہ پہلے کو وہ تقدس حاصل نہیں ہے۔

3- قرآنی چیلنج کی ہمسری کرنے میں عربوں کی ناکامی۔

مسلمانوں کا دعوی ہے کہ قرآن کی ہمسری کرنے کا چیلنج اب بھی قائم ہے جو بڑی حیرت کی بات ہے کیونکہ اس چیلنج کو کچھ عہدِ نبوی اور کچھ بعد کے دور میں پورا کر دیا گیا تھا، عہدِ نبوی کی اگر بات کی جائے تو عبد اللہ بن ابی السرح اور مسلم بن حبیب اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں، قرآن ہی کی زبانی سنیے:

وَمَن اَظ لَم مِمَّن اف تَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَو قَالَ اُو حِیَ اِلَیَّ وَلَم یُو حَ اِلَی ہِ شَی ءٌ وَّمَن قَالَ سَاُن زِلُ
مِث لَ مَا اَن زَلَ اللّٰہ (الانعام 93)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔ اور جو یہ کہے کہ جس طرح کی کتاب اللہ نے نازل کی ہے اسی طرح کی میں بھی بنالیتا ہوں

اس کے علاوہ عربوں کو قرآن کی ہمسری کرنے میں قطعاً کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں کیونکہ ان کی نظر میں اس میں ایسا کچھ الگ اور ناقابلِ ہمسری تھا ہی نہیں جس کی ہمسری کرنے کی کوشش کی جائے، وہ تو اسے محض ایک ایسی کتاب کی صورت میں دیکھتے تھے جو پرانے قصے کہانیاں اور خرافات دہراتی چلی جاتی تھی، اسی لیے النضر بن الحارث نے کہا کہ:

وَاِذَا تُت لٰی عَلَی ہِم اٰیٰتُنَا قَالُو ا قَد سَمِع نَا لَو نَشَآءُ لَقُل نَا مِث لَ ہٰذَاۤ ۙ اِن ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِی رُ
ال اَوَّلِی نَ ﴿۳۱﴾ (الانفال 31)

اورجب انکو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔تو کہتے ہیں یہ کلام ہم نے سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کا کلام ہم بھی کہدیں اور یہ ہے ہی کیا صرف اگلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔

جہاں تک بعد کے زمانوں کی بات ہے تو چلیے ایک عرب شاعر، ادیب اور فلسفی کی بات کرتے ہیں جس کی کتاب "رسالۃ الغفران" کا موازنہ دانتے کی "خدائی کامیڈی" سے کیا جاتا ہے اور جو گزشتہ ہزاریے کی دس بہترین ادبی فن پاروں میں محض اس لیے شامل ہونے سے رہ گئی کیونکہ وہ پہلے ہزاریے میں منظرِ عام پر آئی تھی!! اور جس کی کتاب "فقرات وفترات" کا شعری انداز ناقدین ادب کے نزدیک قرآن کے ہمسر ہے، بعض ادبی نقاد کا خیال ہے کہ اس نے یہ کتاب محض اس لیے لکھی تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ قرآن معجزہ نہیں ہے بلکہ یہ ایسا اس لیے لگتا ہے کیونکہ صدیوں سے اس کے گرد تقدس کی چادر لپٹی رہی ہے، اس کے باوجود کہ یہ شخص محض چار سال کی عمر میں اندھا ہو گیا تھا!! اس نابغہ روزگار کا نام ہے "ابو العلاء المعری" (363–449 ہجری)، (973–1057 عیسوی)، یعنی محض ایک اندھے نے قرآن کی ہمسری کر کے دکھادی۔
سابق الذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ مماثلت ناممکن ہے البتہ ہمسری یقیناً ممکن ہے، لیکن اس کے بعد تقدس کو بائی پاس کرنے کی ہماری صلاحیت رہ جاتی ہے تاکہ ہم فیصلہ کر سکیں کہ کیا کوئی متن واقعی قرآن کی ہمسری کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں، تاہم ایک سوال یہ بھی ہے کہ قرآن کی ہمسری کرنے کا دراصل مطلب کیا ہے؟ اور اس کی حقیقی قدر کیا ہے؟ کیا ایسی آیت:

لَی ◌س عَلَی ال◌اَع◌مٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی ال◌اَع◌رَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی ال◌مَرِی◌ضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰ◌ی اَن◌فُسِکُم◌اَن◌
تَا◌کُلُو◌امِن◌◌بُیُو◌تِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ اٰبَآئِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ اُمَّہٰتِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ اِخ◌وَانِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ اَخَوٰتِکُم◌
اَو◌بُیُو◌تِ اَع◌مَامِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ عَمّٰتِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ اَخ◌وَالِکُم◌اَو◌بُیُو◌تِ خٰلٰتِکُم◌اَو◌مَامَلَک◌تُم◌مَّفَاتِحَہٗ
اَو◌صَدِی◌قِکُم◌◌ؕلَی◌س عَلَی◌کُم◌جُنَاحٌ اَن◌تَا◌کُلُو◌ا جَمِی◌عًا اَو◌اَش◌تَاتًاؕ فَاِذَادَخَل◌تُم◌بُیُو◌تًا فَسَلِّمُو◌ا
عَلٰ◌ی اَن◌فُسِکُم◌تَحِیَّۃً مِّن◌عِن◌دِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃًؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ ال◌اٰیٰتِ لَعَلَّکُم◌تَع◌قِلُو◌نَ ﴿۶۱﴾ (النور 61)

کو عاجز کر دینے والا ایسا خدائی متن قرار دیا جا سکتا ہے کہ لوگ اس کی ہمسری کرنے میں ناکام ہو جائیں؟ گالی گلوچ جیسا کلام لانے کے چیلنج میں کیا حقیقی وجاہت ہے؟ عُتُلٍّ ◌بَع◌دَ ذٰلِکَ زَنِی◌مٍ (سخت خو اور اس کے علاوہ بد ذات ہے۔—القلم 13) ہم سمجھتے ہیں کہ گالیاں کبھی خدائی قول ہو ہی نہیں سکتیں، لیکن یہاں سارا مسئلہ تقدس کا ہے جس کا تعلق قلبی اور وجدانی ایمان سے ہے عقلی منطق سے نہیں، ایسے میں چاہے متن کی قدر کچھ بھی ہو وہ ہمیشہ ہمسری کی سطح سے کم ہی قرار پائے گا، لیکن جیسے ہی

ہم اس تقدس سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں گے تب ہم منصفانہ انداز میں ایسے مُتون پر عادلانہ حکم صادر کر سکیں گے۔

4- مسلم بن حبیب (مسیلمہ) کی قرآن کی ہمسری کرنے کی احمقانہ کوشش۔

میں نے مسلم بن حبیب سے منسوب مُتون کا کافی مطالعہ کیا ہے جو سارا کا سارا اسلامی تاریخ کی کتابوں میں درج ہے اور کوئی ایک بھی ایسا مخطوطہ آج تک دریافت نہیں ہوا جو یہ تصدیق کر سکے کہ یہ کلام واقعی مسلم بن حبیب کا ہے، اور ظاہر ہے کہ اسلام کے مخالفین کا ذکر اسلامی کتابوں میں تحقیر سے ہی کیا جائے گا اور کیا جاتا بھی ہے، تو کیا یہ مُتون واقعی مسلم بن حبیب کے ہیں یا اُس سے بُہتاناً منسوب ہیں؟ اس سوال کی وجاہت اس اعتقاد کی سادہ لوحی میں مضمر ہے کہ یہ مُتون واقعی مسلم بن حبیب کے ہیں، اپنے قرآن کی بے ہودگی کے باوجود جیسا کہ مسلمان سمجھتے ہیں مسلم بن حبیب عربوں کے ایک بہت بڑے طبقے کو اپنی نبوت کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اسلامی تاریخ خود ہی ردت کی جنگوں میں مسلم بن حبیب کی فوج کے سامنے اسلامی فوج کی شکست کا ذکر کرتی ہے، مسلمانوں کے خلیفہ ابو بکر کے دور میں عکرمہ بن عمرو المخزومی کی قیادت میں ایک فوج مسلم بن حبیب سے لڑنے کے لیے بھیجی گئی مگر اسے بدترین شکست کا سامنا ہوا اور عکرمہ کو اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ وہاں سے بھاگنا پڑا اور تب تک انتظار کرنا پڑا جب تک خالد بن الولید کی قیادت میں ایک نئی فوج نہیں بھیج دی گئی، اسلامی مؤرخین کے مطابق اس جنگ میں مسلم بن حبیب کی فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی!! یہ تو محض اس کی فوج کی تعداد ہے، اس پر ایمان لانے والوں کی کُل تعداد کتنی رہی ہوگی؟ مسلم بن حبیب کی نبوت کو ماننے والوں کو اپنے ایمان کے دفاع میں موت تک منظور تھی، اسی طرح جس طرح مسلمانوں کو تھی، یہ بھلا کون سا ایمان ہے جو مسلم بن حبیب جیسے احمق نے ان کے دلوں میں ڈال دیا تھا؟ کیا اس زمانے میں لوگوں کو بے وقوف بنانا اتنا ہی آسان تھا کہ مسلم بن حبیب جیسا شخص جو اسلامی مؤرخین کے مطابق چار شعر ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا تھا لوگوں کو بے وقوف بنا سکتا تھا؟ اگر معاملات ایسے ہی ہیں تو پھر اس دور کے اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے بارے میں بھی کئی سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے کہ کیا وہ لوگ جہلاً ایمان لائے تھے، لالچ کی وجہ سے ایمان لائے تھے یا دلیل کی وجہ سے؟ مسلم بن حبیب اتنے سارے لوگوں کو اپنی نبوت کا اس طرح قائل کرنے میں کامیاب کیسے ہو گیا کہ وہ اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر ڈالیں؟، یہاں دو ہی امکان ہیں:

1- عربوں کی فصاحت وبلاغت کے بارے میں ہماری معلومات درست نہیں ہیں اور ان کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

2- مسلم بن حبیب سے منسوب وہ قرآن جو ہم تک پہنچا ہے جعلی ہے۔

اس سب میں اگر ہم یہ بات بھی شامل کر لیں کہ مسلم بن حبیب الحنفی کی نبوت محمد کی نبوت سے پہلے تھی، اور یہ کہ مسلم بن حبیب عربوں میں "رحمن الیمامۃ" کے نام سے مشہور تھا اور یہ کہ جب محمد نے مشرکینِ قریش سے کہا کہ: "اسجدواللرحمن" (رحمن کو سجدہ کرو) تو انہوں نے کہا کہ: "مانعرف الارحمن الیمامۃ" (ہم تو صرف یمامہ کے رحمن کو جانتے ہیں۔یعنی مسلم بن حبیب) تو ہم یہ سوال کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ محمد اپنی نبوت کہاں سے اور کیسے لایا؟ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کے معاملے میں کون کس کی نقل کر رہا تھا، محمد مسلم کی یا مسلم محمد کی، لیکن اگر ہم یہ جان لیں کہ مسلم بن حبیب کی نبوت محمد کی نبوت سے پہلے تھی تو ہم یہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ کون سا متن زیادہ پرانا ہے، ایسی صورت میں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ کیا محمد مسلم کے قرآن کی نقل کر رہا تھا؟ تاریخ کی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ مسلم بن حبیب نامی یہ شخص عربوں میں بہت محبوب شخص تھا، اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ عرب کے مشہور شاعر عبد الرحمن بن مصطفی العیدروس الحسینی نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے:

بدیعاً احوماً غنجاً لعوباً

ظریفاً وجہہ حاز الوسامۃ

بمفرق شعرہ والحسن یبدی

صباحی والدجی من فوق ہامۃ

رناریماً واسفر بدر تم

وصال مثقفاً وشد احمامۃ

وصدق العشق اوقفنی علیہ

فسلوانی مسیلمۃ الیمامۃ

تو گویا وہ کوئی برا شخص نہیں تھا بلکہ عربوں میں اس کی ایک الگ شان اور اعلی مقام تھا، تو کیا ایک ایسے شخص سے ایسے فرسودہ مُتون منسوب کیے جاسکتے ہیں؟ یا عرب اتنے اُلو کے پٹھے تھے کہ اس کے ایسے بے ہودہ کلام سے ہی متاثر ہو کر اس پر ایمان لے آئے تھے جیسا کہ اسلامی تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے؟

عقل مندوں کو سلام!

کیا یہ قرآن کا کھلا تضاد نہیں؟

ایک عام مسلمان قرآن کے بارے میں محض اپنے علماء کرام سے کچھ بیانات سن کر یا قرآن کی شان میں بیان کردہ کچھ قصائد سن کر یہ گمان کرنے لگ جاتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، قرآن پڑھنے سے انسان کو ہدایت مل جاتی ہے اور قرآن انسان کو اللہ کی پہچان کراتا ہے، لیکن ایک عام مسلمان کبھی یہ زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ خود قرآن کو پڑھے، سمجھے، اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ اس قرآن میں خود اس کی ذات کیلئے کیا پیغام موجود ہے۔ اسی طرح یہ عام مسلمان پنے علماء سے قرآن کی شان میں سنے ہوئے قصیدوں کو کبھی علمی کسوٹی اور تشکیک کے معیار پر پرکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا، اور اپنے علماء کے بیان کردہ دعوؤں کو محض اپنی عقیدت کی وجہ سے ان پر اندھا اعتقاد رکھتے ہوئے اپنے ایمان کا جزو لاینفک بنالیتا ہے۔ حالانکہ قرآن کو پڑھ کر ایک معمولی سمجھ بوجھ کا حامل فرد بھی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے بھی یا نہیں؟۔

اس سلسلے میں "کیا قرآن اللہ کا کلام ہے؟" اور "قرآن اور اس کے تضادات" کے عنوان سے میں دو تحریریں قارئین کی نظر کر چکا ہوں، آج کی اس تحریر میں بھی قرآن کے ایک اور تضاد کو واضح کر کے یہ ثابت کرنا چاہوں گا کہ خود قرآن نے اپنے کلام الٰہی ہونے یا نا ہونے کے بارے میں جو معیار مقرر کیا ہے کیا قرآن خود اپنے ہی وضع کردہ معیار پر بھی پورا اترتا ہے یا نہیں؟ میں یہاں قرآن کے بیان کردہ معیار کا اجمالی ذکر کر دیتا ہوں تا کہ قاری کے ذہن میں قرآن کے بیان کردہ معیار کا اعادہ ہو جائے۔

قرآن کہتا ہے کہ:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّـهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿سورۃ النساء:82﴾

ترجمہ: بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا (کلام) ہوتا تو اس میں (بہت سا) اختلاف پاتے

۔

چنانچہ اب اگر قرآن سے صرف ایک تضاد ہی نہیں بلکہ متعدد تضادات نکال کر دکھا دیئے جائیں تو قرآن کے کلام الٰہی نا ہونے کا دعویٰ خود قرآن کے اپنے مقرر کردہ معیار سے ہی ثابت ہو جائے گا۔ اس ثبوت کے بعد بھی اگر کوئی شخص قرآن کو اللہ کا کلام ماننے پر مصر ہو تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، ہر شخص اپنے درست اور صحیح فیصلے کا خود ذمہ دار ہے، اور بحیثیت سیکولر ہونے کے ہم اس کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اگر اپنے لئے کوئی عقیدہ اختیار کرنا چاہے تو اسے پورا حق ہے، لیکن ہمیں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس قدر واضح ثبوت کے بعد اگر کوئی شخص قرآن کے کے بیان کردہ معیار اور اصول کے تحت قرآن میں تضادات دیکھ کر اس کے کلام الٰہی ہونے سے انکار کر دے تو ایسے شخص کو کیسے واجب القتل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے لئے کنویں میں گرنا پسند کر لیا ہے تو یہ آپ کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے، ہم آپ کے اس حق کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کے

فیصلہ پر کوئی اعتراض نہیں کرتے تو آپ کو کیسے اختیار حاصل ہو گیا کہ آپ دوسروں کو بھی اسی کنویں میں گرنے کی دعوت دیتے پھریں، اور جو اس کنویں میں گرنے سے انکار کر دے تو آپ اسے زبردستی اس کنویں میں دھکیلنے پر مصر ہوں۔

اب آپ قرآن میں موجود تضاد ملاحظہ فرمائیں:

قیامت کے دن کی طوالت کو بیان کرتے ہوئے قرآن سورۃ الحج میں بیان کر رہا ہے کہ:

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّـهُ وَعْدَهُ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿47﴾

ترجمہ: اور (یہ لوگ) تم سے عذاب کے لئے جلدی کر رہے ہیں اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا۔ اور بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے رو سے ہزار برس کے برابر ہے۔

سورۃ السجدۃ میں بیان ہے کہ:

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿سورۃ السجدۃ:5﴾

وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے پھر اس دن بھی جس کی مقدار تمہاری گنتی سے ہزار برس ہو گی وہ انتظام اس کی طرف رجوع کرے گا۔

ان دونوں آیات کے مقابلے میں اب ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیں:

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (سورۃ المعارج:4)

فرشتے اور اہلِ ایمان کی روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں (اور وہ عذاب) اس دن ہو گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔

ان تینوں آیات میں قیامت کے دن کا ذکر ہے، جس کی تائید متعدد احادیث صحیحہ اور مفسرین کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن ان آیات میں ایک ہی دن کی کیفیت کا بیان کر رہا ہے، اور ان آیات کا موضوع ایک ہی دن ہے کوئی الگ الگ دن نہیں ہیں، جیسا کہ نفس مضمون سے بالکل واضح ہے۔ اب آپ یہ ملاحظہ کریں کہ سورۃ الحج اور سورۃ السجدۃ کی آیات میں تو قیامت کا دن ایک ہزار برس کا قرار دیا جا رہا ہے لیکن سورۃ المعارج کی آیت میں قیامت کی طوالت پچاس ہزار سال کے برابر بیان کی جارہی ہے، گویا قیامت کے دن کو قرآن کو ایک مقام (سورۃ الحج:47، اور السجدۃ:5) پر ایک ہزار سال کے برابر بیان کر رہا ہے اور دوسرے مقام (سورۃ المعارج:5) پر پچاس ہزار سال کے برابر قرار دے دیا۔ یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح اور روشن بات ہے کہ قرآن کے اپنے بیان میں تضاد پایا جارہا کیونکہ قرآن ایک ہی دن (قیامت کا دن) کی مقدار ایک مقام پر دنیاوی ایک ہزار برس کے برابر بیان کر رہا ہے اور ایک دوسرے مقام پر اپنے ہی بیان کی تردید کرتے ہوئے اسے پچاس ہزار سال کا قرار دے رہا ہے۔

میں نے اپنی مقدور بھر کوشش صرف کر کے تمام اہم تفاسیر کو کنگھالا کہ شاید کسی مفسر نے اس مقام پر کوئی ایسی عقلی اور قابل قبول توجیہ بیان کی ہو کہ جس سے یہ تضاد رفع ہو سکتا ہو، لیکن مجھے تمام اہم تفاسیر کے مصنفین اس مقام پر انتہائی مشکل میں گرفتار نظر آئے، اور ان کے بیانات سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اس تضاد کو رفع کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں، اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اللہ یا قرآن کے مصنف کی اس غلطی کو درست کرنے کی ناکام کوشش کے بعد "واللہ اعلم بالصواب" کا سہارا لے کر دوبارہ سارا ملبہ اللہ پر ڈال کر اپنے دامن جھاڑتے ہوئے اگلی آیات کی مرمت میں جت جاتے ہیں۔

ایک بات کی مزید وضاحت بیان کر دوں کہ میری پچھلی تحریروں پر بعض کرم فرماؤں نے تبصروں میں مختلف مفسرین کی تفسیروں سے ان کے بیانات کاپی پیسٹ کر کے اپنا دینی فریضہ انجام دینے کی کوشش کی کہ شاید میں ان مفسرین کی وضاحت سے ناواقف ہوں اور اسی ناواقفیت کی بنیاد پر میں قرآن کی آیات کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا اور اسلئے مجھے ان آیات میں تضاد نظر آ رہا ہے، ایسے کرم فرماؤں کی خدمت میں عرض ہے نہ صرف میں بلکہ "جرات تحقیق" کی پوری ٹیم ایک ایک تحریر لکھنے میں انتہائی عرق ریزی سے کام لیتی ہے اور متعلقہ مواد کی پوری تحقیق کرنے کے بعد اپنے قارئین کی خدمت میں پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

اس وضاحت کے باوجود کسی قاری کو لگتا ہے کہ کسی مفسر نے اس تضاد کو بہترین انداز میں رفع کیا ہے تو براہ کرم کاپی پیسٹ کے بجائے اُس مفسر کے بیان کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بحث کا آغاز کریں، کاپی پیسٹ کرنا اس امر کی دلالت ہو گی کہ قارئ خود معاملہ کو پوری طرح نہیں سمجھتا ہے اور نا سمجھنے کے موڈ میں ہے، اور مفسر پر اندھا اعتقاد رکھتے ہوئے کہ مذکورہ مفسر نے ضرور اس مسئلہ کو حل کر دیا ہو گا ، مفسر کا بیان تبصرہ میں کاپی پیسٹ کر دیا ہے۔

قرآنی بازار

مصر میں مولویوں کی قیامت اٹھی۔۔ کیونکہ مصری مفکر ڈاکٹر حسن حنفی جن کا کچھ سالوں سے ایک پیر اسلام کے اندر اور دوسرا سیکولرازم کے اندر ہے۔۔ انہوں نے قرآن کو بازار کہہ ڈالا۔۔ چنانچہ مولوی اچھل پڑے اور تکفیر کی چھریاں اپنی اپنی جیبوں سے نکال لیں حالانکہ قرآن کو بازار کہنا مبالغہ آرائی کی حد تک مہذبانہ ہے اور قرآن کی حقیقت کا پوری طرح احاطہ ہی نہیں کرتا۔۔

کیونکہ بازار میں آپ کو شدید متضاد چیزیں مل سکتی ہیں، جیسے آپ کو بازار میں نمک اور چینی مل سکتی ہے۔۔ جسے شہد چاہیے اسے بازار میں آسانی سے دستیاب ہو جائے گا اور جسے پیاز چاہیے وہ بھی اسے آسانی سے بازار میں مل جائے گا۔۔ در حقیقت متضاد

چیزوں کی ایک طویل فہرست ہے جو آپ کو بازار سے مل سکتی ہیں اور جو چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے۔۔ مگر بغیر کسی فتوے، تاویل، تفسیر، حدیث کے ہر کوئی جانتا ہے کہ بازار سے لی گئی ان متضاد چیزوں کا کس طرح استعمال کرنا ہے سوائے قرآن کے۔۔

کیونکہ اس میں ایسا کوئی حکم نہیں جس پر اتفاق کیا جاسکے اور نا ہی ایسا کوئی حکم ہے جس کا بالکل الٹ اور متضاد قرآن میں موجود نہ ہو! تشریحات، تفسیرات، تاویلات، اجتہادات اور مباحثے چلتے رہتے ہیں مگر فیصلہ نہیں ہو پاتا۔۔۔ کسی بھی معاملے کا۔۔ کوئی ایک ایسا مسئلہ نہیں جس پر نا ختم ہونے والے طویل مناظرے اور مباحثے نہ چلتے رہے ہوں اور چل رہے ہوں۔۔ نتیجتاً لوگ کبھی بھی پُر یقین نہیں ہوتے کہ وہ کس حکم پر عمل کریں اور کس پر نہ کریں۔۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ لوگ کنفیوژن میں کسی حکم پر عمل کر رہے ہوتے ہیں جبکہ اسی دوران اس حکم کی شرعی حیثیت پر ابھی مناظرے اور مباحثے چل رہے ہوتے ہیں کہ یہ جائز بھی ہے یا ناجائز!!

مثال کے طور پر حجاب کا ڈرامہ جس پر ساتوی صدی عیسوی کے نصف سے بحث جاری ہے کہ یہ فرض ہے یا نہیں؟ آج اکیسوی صدی میں بھی اس کا فیصلہ نہ ہو سکا! یہ تو محض اس ڈرامے کا زمانی پہلو ہے، اگر اس فضول بحث کے مکانی و جغرافیائی پہلو کی بات کی جائے تو اس کا پھیلاؤ مکہ، مدینہ اور ریاض سے لے کر پیرس تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے جہاں فرانسیسیوں اور ان کے صدر کی اس ڈرامے کے ساتھ ایک المناک جنگ کی کہانی ملتی ہے جس کے نتیجے میں فرانس جیسی ترقی یافتہ اور مہذب قوم نے اس ڈرامے کو نمٹانے کے لیے اپنے سارے کام روک کر اس پر ریفرینڈم کروایا کہ اس کی اجازت دی جائے یا نہیں!!!! آج بھی اسلام کے تمام عماموں، جبوں اور جدید ٹائیوں کا اس حجاب و نقاب و دردِ دماغ پر اختلاف جاری ہے، اب بھی تاویلوں تفسیروں اور تشریحات کا ایک کوہِ گراں اس ڈرامے کے گرد گھوم رہا ہے اور شاید قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا!!

آج بھی صلعم پر زور و شور سے یہ بحث جاری ہے کہ وہ انسان تھا یا نور؟! آج بھی اس امت کے ظلماء اس بحث میں اپنا اور امت کا وقت اور دماغ برباد کر رہے ہیں اور اس کے باوجود نتیجہ صفر ہے کیونکہ ہر کسی کو اس قرآنی بازار سے اپنے اپنے مطلب کی آیات مل جاتی ہیں۔۔ اگر آپ ایک سے زائد شادیوں کے قائل نہیں تو آپ کو قرآن سے اس کے لیے بڑے آرام سے دلیل مل جائے گی:

وَلَن ْتَس ْتَطِی ْعُو ْ ۤا اَن ْتَع ْدِلُو ْابَی ْنَ النِّسَآءِ وَلَو ْحَرَص ْتُم ْفَلَا تَمِی ْلُو ْاکُلَّ ال ْمَی ْلِ
فَتَذَرُو ْهَا کَال ْمُعَلَّقَةِ (النساء129)

اور تم خواہ کتناہی چاہو بیویوں میں ہر گز عدل نہیں کر سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی کی طرف ڈھل جاؤ۔ اور دوسری کو ایسی حالت میں چھوڑ دو کہ گویا ادھر میں لٹک رہی ہے۔

یعنی ایک سے زائد بیویوں کے درمیان انصاف ناممکن ہے چنانچہ ظلم سے بچنے کے لیے ایک سے زائد شادی جائز نہیں۔۔ اور اگر آپ چار شادیوں کے قائل ہیں بمع کنیزوں اور لونڈیوں کے تو بھی آپ کو اس قرآنی بازار سے اپنے مطلب کی آیات ایک سے زائد مقامات پر مل جائیں گی مثلاً:

فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (النساء 3)

جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کر لو

مگر کیا قرآن دونوں احکامات میں سے کسی پر فیصلہ کن حکم صادر کرتا ہے؟ قطعاً نہیں بلکہ یہ ایک ایسے قرآنی مسئلے کی صورت اختیار کر جاتا ہے جس پر دیگر قرآنی آیات کو لے کر ایک نا ختم ہونے والی بحث شروع ہو جاتی ہے جو شاید روزِ قیامت کو بھی اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچ سکے!! اس کے باوجود مطلوب یہ ہے کہ ایسی بازاری کتاب کو ڈیڑھ ارب انسانوں کی تشریع کے لیے استعمال کیا جائے!!!!

اگر آپ قرآن سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ صلعم کی اللہ کے ہاں کوئی وقعت و عزت نہیں تو آپ کو ایک ایسی آیت مل جائے گی جہاں اس کی شفاعت و استغفار اللہ کے ہاں مردود ہے:

اِسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ سَبۡعِیۡنَ مَرَّۃً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ!! (التوبہ 80)

تم انکے لئے بخشش مانگو یا نہ مانگو برابر ہے اگر انکے لئے ستر دفعہ بھی بخشش مانگو گے تو بھی اللہ انکو نہیں بخشے گا۔

اور اگر آپ کو کسی ایسی آیت کی تلاش ہے جس سے آپ یہ ثابت کر سکیں کہ صلعم کی اللہ کے ہاں بڑی قدر و منزلت ہے تو بھی آپ کو ایک ایسی آیت مل جائے گی:

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ (الاحزاب 56)

اللہ اور اسکے فرشتے اس پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔

عجیب طرح کا بازار ہے!!

اور اگر کوئی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مسیح اور اللہ میں کوئی بڑا فرق نہیں اور وہ تمام خدائی کام سرانجام دے سکتا ہے جو اللہ کے سوا کوئی نبی نہیں کر سکتا اور وہ اللہ کی روح ہے جو تخلیق کر سکتا ہے، شفاء دے سکتا ہے اور مردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو اسے قرآن سے یہ سب مل جائے گا:

اِذ قَالَتِ ال مَلٰٓئِکَۃُ یٰمَر یَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّن ہُ ☆ اس مُہُ ال مَسِی حُ عِی سَی اب نُ مَر یَمَ وَجِ ہًا
فِی الدُّن یَا وَال اٰخِرَۃِ وَمِنَ ال مُقَرَّبِی نَ ﴿۴۵﴾ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی ال مَہ دِ وَکَہ لًا وَّمِنَ الصّٰلِحِی نَ ﴿۴۶﴾
قَالَت رَبِّ اَنّٰی یَکُو نُ لِی وَلَدٌ وَّلَم یَم سَس نِی بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخ لُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰی اَم رًا فَاِنَّمَا
یَقُو لُ لَہٗ کُن فَیَکُو نُ ﴿۴۷﴾ وَیُعَلِّمُہُ ال کِتٰبَ وَال حِک مَۃَ وَالتَّو رٰیۃَ وَال اِن جِی لَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُو لًا
اِلٰی بَنِی اِس رَآءِی لَ اَنِّی قَد جِئ تُکُم بِاٰیَۃٍ مِّن رَّبِّکُم اَنِّی اَخ لُقُ لَکُم مِّنَ
الطِّی نِ کَہَی ۔ ۃِ الطَّی رِ فَاَن فُخُ فِی ہِ فَیَکُو نُ طَی رًا بِاِذ نِ اللّٰہِ وَاُب رِیُٔ ال اَک مَہَ وَ
ال اَب رَصَ وَاُح یِ ال مَو تٰی بِاِذ نِ اللّٰہِ وَاُنَبِّئُکُم بِمَا تَا کُلُو نَ وَمَا تَدَّخِرُو نَ فِی بُیُو تِکُم اِنَّ
فِی ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُم اِن کُن تُم مُّؤ مِنِی نَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَی نَ یَدَیَّ مِنَ التَّو رٰیۃِ وَلِاُحِلَّ لَکُم بَع ضَ
الَّذِی حُرِّمَ عَلَی کُم وَجِئ تُکُم بِاٰیَۃٍ مِّن رَّبِّکُم فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِی عُو نِ ﴿۵۰﴾ (آل عمران 45–50)

وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب فرشتوں نے مریم سے کہا کہ مریم اللہ تم کو اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح اور مشہور عیسٰی ابن مریم ہو گا اور جو دنیا اور آخرت میں آبرو مند اور مقربین میں سے ہو گا۔

اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر دونوں حالتوں میں لوگوں سے یکساں گفتگو کرے گا اور نیکو کاروں میں ہو گا۔

مریم نے کہا کہ پروردگار میرے ہاں بچہ کیونکر ہو گا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک تو لگایا نہیں فرمایا کہ اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

اور وہ اسے کتاب و حکمت اور تورات اور انجیل کا علم عطا کرے گا۔

اور عیسٰی بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر ہو کر جائیں گے اور کہیں گے کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ وہ یہ کہ تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے سچ مچ پرندہ ہو جاتا ہے۔ اور پیدائشی اندھے اور ابرص کو تندرست کر دیتا ہوں۔ اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو سب تم کو بتا دیتا ہوں اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لئے نشانی ہے۔

اور مجھ سے پہلے جو تورات نازل ہوئی تھی اس کی تصدیق بھی کرتا ہوں اور میں اس لئے بھی آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام

تھیں ان کو تمہارے لئے حلال کر دوں اور میں تو تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

اور اگر کوئی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مسیح محض اللہ کا ایک بندہ ہے اور تمام دیگر انبیاء کی طرح محض ایک نبی ہے تو اسے بھی اسی قرآن سے اس بات کی دلیل مل جائے گی:

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿ۙ۳۰﴾ (مریم 30)

بچے نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

عجیب طرح کا بازار ہے!!

اگر کوئی قرآن سے مسیح کا مرنا اور کوئی دوسرا اس کا نہ مرنا ثابت کرنا چاہے تو ان دونوں کو یہ سب قرآن میں مل جائے گا! ایک آیت کہتی ہے: وَمَا قَتَلُوۡہُ وَمَا صَلَبُوۡہُ وَلٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ (انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور نہ انہیں سولی پر چڑھا پائے لیکن ان لوگوں کو انکی سی صورت معلوم ہوئی۔) (النساء 157) اور دوسری آیت کہتی ہے: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا تو تو ان کا نگران تھا) (المائدہ 117) اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ (جس وقت اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! بے شک میں تمہیں وفات دینے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں) (آل عمران 55)۔۔

سب قرآن میں موجود ہے۔۔ مصلوب ہوا نہیں ہوا تمام چیزیں انشاء اللہ دستیاب ہیں۔۔!!

اس بازار میں تمام گاہکوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں!

اگر آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بیوی کے ساتھ آنکھ، ناک، کان کسی بھی جگہ سے سیکس کیا جاسکتا ہے تو یہ بھی آپ کو قرآن میں سے مل جائے گا:

نِسَآؤُکُمۡ حَرۡثٌ لَّکُمۡ ۪ فَاۡتُوۡا حَرۡثَکُمۡ اَنّٰی شِئۡتُمۡ (تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔) (البقرہ 223)

اور اگر آپ صرف فطری مقام سے ہی سیکس کے قائل ہیں نا کہ ہر جگہ سے جیسا کہ سابقہ آیت کہتی ہے تو بھی آپ کو یہ مل جائے گا:

فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ!(توان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے)(البقرہ 222)یعنی سابقہ آیت سے پہلے والی آیت، یعنی ایک چیز اور اس کا متضاد آگے پیچھے ایک ہی سطر میں!! گاہکوں کی خدمت میں تمام اشیاء دستیاب ہیں۔۔!

اگر کسی نے قرآن سے یہ ثابت کرنا ہے کہ صلعم کا لوگوں پر کوئی تسلط نہیں اور وہ لوگوں کو اسلام میں زبردستی داخل کرنے اور ان سے زبردستی زکات اور جزیہ وصول نہیں کر سکتا تو یہ بھی قرآن سے مل جائے گا:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ (پس آپ نصیحت کیجئے بے شک آپ تو نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں)(الغاشیہ 21-22)

بلکہ ایسا ایک سے زائد سورت میں مل جائے گا جیسے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (اور ہم نے تجھے صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)(الاسراء 105)

اور اگر کسی نے قرآن سے یہ ثابت کرنا ہے کہ کافروں کا قتل جہاد فی سبیل اللہ ہے اور صلعم اور تمام مسلمانوں پر فرض ہے تو یہ بھی ایک سے زائد آیات میں مل جائے گا جیسے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (پس جب تم ان کے مقابل ہو جو کافر ہیں تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب مغلوب کر لو تو ان کی مشکیں کس لو)(محمد 4)

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور سچا دین قبول نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جو اہلِ کتاب ہیں یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں)(التوبہ 29)

یہاں بڑے بڑے عماموں، جبوں اور ایڈوانس ٹائیوں والے اپنے پنجے نکال کر چیخ کر کہیں گے کہ: آخر ناسخ و منسوخ بھی کوئی چیز ہوتی ہے!!

مگر آپ ناسخ و منسوخ چھوڑتے ہی کیوں ہیں؟؟!! یا تو ناسخ کو رہنے دیں اور منسوخ کو حذف کر دیں یا منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ کو ختم کر دیں تاکہ تمہارا قرآن اس طرح مضحکہ خیز نہ لگے۔۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ اسے بازار کی طرح چیز اور اس کے متضاد سمیت ایسے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر انکل حسن حنفی جیسا کوئی شخص اسے بازار کہہ ڈالے تو یہ اس پر چیخ اٹھتے ہیں: مرتد کو پکڑو۔۔۔ توبہ یا قتل؟!۔۔۔

یہاں آکر ہم ایک بار پھر ایک اسلامی قرآنی گیم کا شکار ہو جاتے ہیں جن کی کسی بھی دور میں کبھی کمی نہیں رہی۔۔ یہ گیم ردت اور مرتد کی ہے۔۔ کیا قرآن میں ردت کی کوئی حد یا نہیں؟

چنانچہ اگر کسی کو قرآن سے مرتد کو قتل کرنے کا حکم درکار ہے تو یہ اسے بڑے آرام سے مل جائے گا:

اَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ (کیا تم نہ لڑوگے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں)(التوبہ 13)
اور اگر آپ نے اس کا الٹ ثابت کرنا ہے تو یہ بھی بہت آسان ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے)(البقرہ 256)
اب یقیناً یہاں آکر اختلاف کا واقع ہونا طے ہے کیونکہ اس کتاب میں احکامات نا تو فیصلہ کن ہیں اور نا ہی واضح بلکہ احکامات میں ٹکراؤ کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تا کہ گاہکوں کو ہر قسم کی چیزیں ایک ہی جگہ دستیاب ہو جائیں اور انہیں اس بازار کو چھوڑ کر کسی اور بازار سے رجوع نہ کرنا پڑے!!

ردت پر فیصلے کے لیے پرانی تفاسیر دیکھی جائیں گی پھر نئی تاویلی تفاسیر سے رجوع کیا جائے گا مگر پھر بھی حقیقت کا کوئی مختصر راستہ کسی کو نہیں ملے گا چنانچہ بالآخر صحیح و غیر صحیح احادیث کھولی جائیں گی، سیرت کی کتابوں کو کھنگالا جائے گا اور قرضاوی، طنطاوی، شعراوی، بن باز، بن جاز وغیرہ کے فتاوی کی پڑتال کی جائے گی۔۔۔ مگر۔۔۔۔ مگر اس سے پہلے کہ کسی چیز پر اتفاق ہونے پائے جنت کی بہتر حوروں کی جلدی میں کوئی جلد باز مجاہد انکل حسن حنفی کو قتل کر ڈالے گا اور انسانی خون کا پیاسا اللہ خوشی سے جھوم اٹھے گا!!

الاتقان فی تدمیر القرآن – جمع القرآن

الاتقان فی تدمیر القرآن–جمع القرآن

جب پیغمبر اسلام نے نبوت کا دعوی کیا تب حضرت کی عمر چالیس سال تھی جو تریسٹھ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئی، پیغمبر اسلام پر تئیس سال تک نام نہاد "وحی" کا نزول ہوتا رہا، یہ وحی مختلف مواقع پر نازل ہوتی جیسے اگر کوئی کسی مخصوص چیز کے بارے میں سوال کرتا کہ روح یا ہلال وغیرہ کیا ہے یا پھر کوئی مسئلہ درپیش آجاتا یا پھر اگر وہ کوئی سنت قائم کرنا چاہتے ہوں۔۔ یوں قرآن کا یہ "نزول" متفرق آیات کی صورت میں تھا جو کچھ مکہ میں نازل ہوئیں اور کچھ یثرب یا مدینہ میں۔۔ پیغمبر اسلام کی

زندگی میں زید بن ثابت وحی کے مرکزی کاتب تھے، پیغمبر اسلام وقتاً فوقتاً اسے اپنی وحی سناتے اور وہ اسے دستیاب چمڑوں، ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر لکھتے، عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح نے بھی کچھ عرصہ تک وحی کی کتابت کی مگر وہ مرتد ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ پیغمبر اسلام نہ صرف ان کے منہ سے ادا کئے ہوئے الفاظ کو وحی میں شامل کر دیتے تھے بلکہ وحی کی کتابت کے دوران جب وہ پیغمبر اسلام کو کچھ تبدیلیاں تجویز کرتے تو پیغمبر اسلام مان جاتے، یوں عبد اللہ ابی سرح کو کہنا پڑا کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے وحی ہوتی تو وہ اس کی تبدیلیوں کی تجاویز کبھی نہ مانتے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علی بن ابی طالب قرآن کو جمع کرتے اور اپنے مخصوص صحیفوں میں اسے لکھتے تھے تاہم پیغمبر اسلام نے کبھی بھی اپنی زندگی میں قرآن کی جمع و تدوین کا حکم نہیں دیا اور محض لوگوں کو یاد کروانے پر ہی اکتفاء کیا۔ پیغمبر کے انتقال کے بعد جمع قرآن کی ضرورت خود اس بات کی گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام کو اپنی زندگی میں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کے انتقال کے بعد جمع قرآن کی ضرورت پیش آئے گی، اگر انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنی زندگی میں یہ قدم ضرور اٹھاتے، درحقیقت اس زمانے میں خصوصاً عربوں کے ہاں لکھ کر محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا اور عرب اپنا ثقافتی ورثہ یاد کر لیا کرتے تھے، اور اسی طرح یہ ورثہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا۔ اس لئے پیغمبر اسلام کو بھی یہی اندازہ تھا کہ عربوں کے ثقافتی ورثہ کی طرح قرآن بھی محض "حافظہ" کی بنیاد پر آئندہ نسلوں میں منتقل ہو جائے گا، لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ پیغمبر اسلام کا یہ "اعتماد" درست ثابت نہ ہوا، عربوں کے حالات تبدیل ہو گئے، اور ابو بکر کے زمانے سے ہی "جمعِ قرآن" کی ضرورت پیش آنا شروع ہو گئی۔

ابو بکر کی خلافت میں عمر نے ابو بکر کو قرآن کو جمع کر کے کتابی شکل دینے کی تجویز پیش کی کیونکہ پیغمبر اسلام کے ہمعصروں کی ایک بڑی تعداد جنہیں قرآن حفظ تھا مختلف جنگوں میں ہلاک ہو چکے تھے خاص طور سے مسیلمہ بن حبیب (جسے مسلمان نبوت کے بغض میں مسیلمہ کذاب کے نام سے یاد کرتے ہیں) کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں جسے "معرکۃ الیمامۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اب ظاہر ہے پیغمبر اسلام نے تو کبھی قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیا ہی نہیں تھا چنانچہ ابو بکر نے اس کی مخالفت کی اور موقف اختیار کیا کہ ایسا کام کیوں کیا جائے جسے "اللہ کے رسول" نے اپنی زندگی میں بقلم خود نہ کیا؟ تاہم عمر کی ضد کے سامنے ابو بکر کو ہتھیار ڈالنے پڑے چنانچہ اس نے زید بن ثابت کو یہ بارِ ثقیل سونپا، زید سے منسوب ہے کہ اس نے کہا کہ مجھے ابو بکر نے بلا کر کہا کہ عمر نے مجھ پر زور دیا ہے کہ میں قرآن کو جمع کروں مگر مجھے اس پر اعتراض تھا کیونکہ رسول نے اسے اپنی زندگی میں جمع نہیں کیا اور اگر اس کو جمع کرنا ضروری اور اہم ہوتا تو وہ اس کو جمع کرنے کا حکم دیتے مگر چونکہ یمامہ کے واقعے میں نبی کے صحابہ کی ایک کثیر تعداد قتل ہو چکی ہے جن کے ساتھ ان کا حفظ کیا ہوا بھی ضائع ہو گیا ہے چنانچہ مجھ ڈر ہے کہ کہیں یہ سارا ہی ضائع نہ ہو جائے اس لیے میں نے عمر کی بات مان لی۔

ابو بکر نے قرآن کو جمع کرنے کی ذمہ داری کچھ حضرات کو سونپی جن کی سربراہی زید بن ثابت کر رہے تھے جو اس وقت اپنے عین شباب پر تھے، اور جیسا کہ اسلامی رواج ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہوتا ہے، سیرت کے مصنفین نے زید کی معاونت کرنے والے ان حضرات کے ناموں اور تعداد میں اختلاف کیا ہے، زید نے قرآن جمع کیا، اسے سورتوں کی شکل دی اور ابو بکر کے حوالے کر دیا، ابو بکر دو سال حکومت کر کے اپنے خالقِ غیر حقیقی سے جا ملے، ان کے انتقال کے بعد زید بن ثابت کا جمع کیا ہوا قرآن نئے خلیفہ عمر بن خطاب کی تحویل میں چلا گیا اور ان کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی اور پیغمبر اسلام کی بیوہ حفصہ بنتِ عمر کی تحویل میں چلا گیا۔

تاہم قرآن کب جمع کیا گیا یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کیونکہ قرآن کو جمع کرنے کے حوالے سے سب سے پہلی تحریر ابن سعد کے طبقات میں 844ء عیسوی کو ملتی ہے، پھر 870ء عیسوی کو بخاری اور 874ء عیسوی کو مسلم میں، اور اگر ہم 632ء عیسوی کو پیغمبر اسلام کی وفات کو مدِ نظر رکھیں تو اس تاریخ کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے جو دو سو سال سے بھی زیادہ عرصے بعد احاطہء تحریر میں لائی گئی اور وہ بھی ساری کی ساری اسناد پر قائم ہے یعنی ایک اصغر نے اکبر سے سنی اور اکبر نے زید سے اور زید نے غفران سے اور یوں چلتے چلے جایئے۔۔اب چونکہ اُس عرصے کی لکھی ہوئی کوئی تاریخ دستیاب نہیں چنانچہ اسناد پر انحصار قاری کو مطمئن نہیں کر پاتا۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اچھی اور صحیح سند سے پیغمبر اسلام سے منسوب جعلی احادیث کی کمی نہیں۔ صحیح بخاری (وفات 238 ہجری) جیسی حدیث کی مشہور کتابوں پر بھی بھروسہ کرنا مشکل ہے کیونکہ اس میں شامل احادیث بھی بخاری نے پیغمبر اسلام کی وفات کے دو سو سال بعد جمع کی تھیں، معروف مستشرق گولڈزیہر Goldziher کہتا ہے کہ کسی بھی حدیث کو ایسی صحیح حدیث قرار نہیں دیا جاسکتا جو پیغمبر اسلام نے کہی ہو کیونکہ عباسی خلافت کے دور میں حدیث کی انڈسٹری اپنے عروج پر تھی جس کے خلفاء نے امویوں سے اقتدار چھیننے کو جواز دینے کے لیے اپنے علماء کو ایسی احادیث گھڑنے پر مامور کیا جن سے انہیں اقتدار کا جواز ملے اور علویوں کی مذمت ہو (1)۔ حدیث کے بعض راویوں نے تین لاکھ سے زیادہ احادیث جمع کیں جن کی اکثریت ایک دوسرے سے متضاد تھی، بخاری نے احادیث کے اس جنجال پورے سے محض دو ہزار احادیث کو صحیح قرار دیا اور باقی کو جعلی قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا، اگر لوگ ایک نبی سے منسوب احادیث میں جھوٹ بول سکتے ہیں تو قرآن کو جمع کرنے کی انہی لوگوں کی روایات پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟

مثال کے طور پر ابن سعد پیغمبر اسلام کی زندگی میں قرآن جمع کرنے والے صحابہ کے یہ نام بتاتا ہے: اُبی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابو زید، ابو الدرداء، تمیم الداری، سعد بن عبید، عبادہ بن الصامت، ابو ایوب اور عثمان بن عفان، مگر پھر یہی

مصنف اپنی طبقات کے صفحہ 113 میں لکھتا ہے کہ عمر کی خلافت کے دور میں عثمان بن عفان نے قرآن جمع کیا تھا کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں جیسا کہ اس نے پہلے ذکر کیا تھا(2)۔ ایک اور حدیث میں ابن سعد کہتا ہے کہ عمر بن الخطاب نے قرآن کو صحیفوں میں جمع کیا۔

بخاری بتاتے ہیں کہ قرآن پیغمبر اسلام کی زندگی میں جمع کیا گیا اور یہ کارنامہ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید نے انجام دیا جبکہ ایک اور حدیث میں کہتے ہیں کہ اسے ابو الدرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید نے جمع کیا، صفحہ 392 میں بخاری کہتے ہیں کہ قرآن ابو بکر کے دور میں جمع کیا گیا نا کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں، بخاری کہتے ہیں: ہمیں موسی بن اسماعیل نے ابراہیم بن سعد سے بتایا، انہوں نے ابن شہاب، انہوں نے عبید بن السباک اور انہوں نے زید بن ثابت سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا کہ: یمامہ کی جنگ کے بعد ابو بکر نے مجھے بلایا، اس کے پاس عمر بن الخطاب بھی تھا، ابو بکر نے مجھ سے کہا کہ: یمامہ میں قرآن کے بہت سارے حافظ قتل ہو چکے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ لوگ اور قتل نہ ہو جائیں اور قرآن میں سے کچھ ضائع ہو جائے، میں چاہتا ہوں کہ تم قرآن کو جمع کرو، تو میں نے عمر سے کہا: تم ایسا کام کیسے کر سکتے ہو جو رسول اللہ نے نہیں کیا؟ عمر نے کہا: واللہ یہ ایک عظیم کام ہے، عمر اسے دہراتا رہا تا آنکہ میرا دل اسے جمع کرنے کی بابت مطمئن ہو گیا(3)۔

اس کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر کے دور میں زید بن ثابت نے قرآن جمع کیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حذیفہ بن یمان جس نے فتح آرمینیا میں اہلِ شام کے ساتھ اور آذربائیجان میں اہلِ عراق کے ساتھ جنگیں لڑیں تھیں کو قرآن کی قراتوں کی تعداد نے حیران کر دیا تھا، چنانچہ اس نے عثمان سے کہا: اے امیر المؤمنین، اس امت کا معاملہ جمع کرو اس سے پہلے کہ ان میں اللہ کی کتاب میں اختلاف پیدا ہو جائے جیسا کہ یہود و نصاری کے ساتھ ہوا، چنانچہ عثمان نے حفصہ کو کہلوا بھیجا کہ: ہمیں صحیفے بھیج دو تا کہ ہم انہیں صحیفوں میں لکھ لیں اور تمہیں واپس کر دیں(4) چنانچہ حفصہ نے عثمان کو صحیفے بھیج دیے پھر عثمان نے زید بن ثابت، عبد اللہ بن الزبیر، سعید بن العاص اور عبد الرحمن بن الحارث بن ہشام کو قرآن کو صحیفوں میں جمع کرنے کا حکم دیا اور کہا: اگر کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے قریش کی زبان میں لکھنا کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا۔ پھر جب ان حضرات نے قرآن کو صحیفوں میں جمع کر لیا تو عثمان نے حفصہ کے صحیفے واپس کر دیے اور ایک ایک نسخہ کوفہ، بصرہ، دمشق اور مصر بھجوا دیا اور ایک نسخہ مدینہ میں رہنے دیا اور حکم دیا کہ باقی تمام نسخے جلا دیے جائیں۔

الفہرست میں درج ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں قرآن جمع کرنے والے یہ ہیں: "علی بن ابی طالب، سعد بن عبید، ابو الدرداء، معاذ بن جبل، ابوزید، ابی بن کعب اور عبید بن معاویہ"۔ نوٹ کریں کہ "الفہرست" کے مصنف نے بخاری اور ابن سعد کے مذکورہ ناموں میں علی بن ابی طالب اور عبید بن معاویہ کے ناموں کا اضافہ کر دیا (5)۔

قرآن کو جمع کرنے کے حوالے سے ایک اور روایت کہتی ہے کہ اسے اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان (684-704) نے حجاج بن یوسف کی مدد سے جمع کیا، روایت ہے کہ خلیفہ عبد الملک بن مروان نے کہا کہ: مجھے ماہِ رمضان میں مرنے کا ڈر ہے، میں اسی میں پیدا ہوا، اور اسی میں میرا دودھ چھڑایا گیا، اور اسی میں میں نے قرآن جمع کیا، اور اسی میں مسلمانوں کا خلیفہ منتخب ہوا (6)، عبد الملک کے اس قصے کا ذکر ثعالبی اور جلال الدین السیوطی نے کیا ہے۔

معجم یاقوت میں درج ایک دلچسپ کہانی بھی اس اختلاف کو واضح کرتی ہے، کہتے ہیں: "اسماعیل بن علی الخطبی نے کتاب التاریخ میں بغداد کے شمبوذ نامی ایک شخص کا قصہ لکھا ہے جو عثمان کے مصحف سے مختلف قراءت پڑھتا اور پڑھاتا تھا، وہ نہ صرف عبد اللہ بن مسعود اور ابی بن کعب و دیگر قراتوں میں قرآن پڑھتا تھا بلکہ دیگر قاریوں سے بحث کرتا اور ان پر غالب آجاتا حتی کہ اس کی شہرت ہر طرف پھیل گئی اور اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا، 828 کو سلطان نے اسے بلوا بھیجا اور اسے وزیر محمد بن مقلہ کے گھر لایا گیا جس نے اس پر مقدمہ کرنے کے لیے قاضیوں اور قاریوں کو جمع کر رکھا تھا، شمبوذ نے جو کچھ وہ پڑھاتا تھا اس سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کا دفاع کیا، وزیر نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ عثمان کے مصحف سے مختلف قراتیں پڑھانا چھوڑ دے مگر اس نے انکار کر دیا، حاضرین نے اسے سزا دینے پر اصرار کیا تاکہ وہ ان قراتوں سے باز آجائے تب وزیر نے حکم دیا کہ اسے ننگا کر کے تب تک کوڑے مارے جائیں جب تک کہ وہ مان نہ جائے، پیٹھ پر دس کوڑے کھانے کے بعد وہ مان گیا، شیخ ابو محمد السرفی نے کہا کہ اس شمبوذ نامی شخص نے قرآن کی کئی قراتیں محفوظ کیں" (7)۔

830 عیسوی میں مامون کی خلافت کے دور میں یعنی بخاری کے لکھنے سے چالیس سال پہلے کندی جو کہ ایک عیسائی تھا (یہ مسلمان ابن الکندی نہیں ہے) نے اپنے ایک مسلمان دوست کو لکھا کہ: "راہب بحیری جس کا اصل نام سرجیاس Sergius تھا ایک نسطوری راہب تھا جسے اپنے کلیسا سے کسی گناہ کی وجہ سے نکال دیا گیا تو وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے جزیرہ ہائے عرب چلا آیا جہاں اس نے محمد سے ملاقات کی اور بحث بھی کی، اس راہب کے مرنے کے بعد عبد اللہ اور کعب نامی دو یہودی طبیبوں نے محمد سے ملاقات کی اور ان دونوں کا محمد پر بڑا اثر ہوا، رسول کی موت کے بعد یہودیوں کے کہنے پر علی بن ابی طالب نے خلافت کیلئے ابو بکر سے بیعت نہیں کی اور جب وہ خلافت سے مایوس ہو گیا تو رسول کی موت کے چالیس روز بعد وہ ابو بکر کے سامنے پیش ہوا اور بیعت کی، جب اس نے بیعت کر لی تو علی سے پوچھا گیا کہ: اے ابا الحسن تمہیں اب تک کس چیز نے روک

رکھا تھا؟ تواس نے جواب دیا: میں اللہ کی کتاب جمع کرنے میں مصروف تھا جس کی ذمہ داری مجھے رسول اللہ نے سونپی تھی، کچھ حاضرین نے کہا کہ ان کے پاس قرآن کے کچھ حصے موجود ہیں، حاضرین نے سارے قرآن کو ایک کتاب میں جمع کرنے پر اتفاق کیا، چنانچہ انہوں نے لوگوں کے سینوں سے جو کچھ جمع کر سکتے تھے کیا جیسے "براءۃ" نامی سورت جسے ایک دیہاتی اعرابی بدو نے انہیں سنائی اور کچھ دوسری آیات کچھ دیگر لوگوں سے، اور جو کچھ بھی انہیں لوحوں، ہڈیوں، کھجور کے پتوں اور پتھروں پر لکھا ہوا ملا"۔

کندی آگے لکھتا ہے: "شروع میں یہ کتاب میں جمع نہیں کیا گیا بلکہ ایسے ہی لوحوں پر لکھا ہوا چھوڑ دیا گیا، پھر قراءتوں پر لوگوں میں اختلاف پھیلنا شروع ہو گیا، کچھ لوگ علی کی قرات سے پڑھتے، اور کچھ لوگ مذکورہ لوحوں میں جمع کیے گئے کی قرات پر پڑھتے، کچھ ابن مسعود اور کچھ اُبی بن کعب کی قرات پر پڑھتے، اور جب عثمان خلیفہ بنا تو قراءتیں ہر طرف مختلف تھیں، ایک ہی آیت کو کوئی کچھ پڑھتا تو کوئی کچھ، جب قراتوں اور مصاحف کے اس اختلاف کی بابت عثمان کو بتایا گیا تو وہ انتشار سے ڈر گیا اور جو کچھ جمع ہو سکتا تھا اسے جمع کرنے کا حکم دیا بشمول ان صحیفوں کے جو پہلے اس کی خلافت کے آغاز میں جمع کیے گئے تھے، مگر انہوں نے جو کچھ علی کے پاس تھا جمع نہیں کیا، اُبی بن کعب مر چکا تھا اور ابن مسعود نے اپنا مصحف دینے سے انکار کر دیا تھا تب عثمان نے زید بن ثابت اور عبد اللہ بن عباس کو حکم دیا کہ وہ قرآن کو جمع کریں اور اس میں درستگی کرتے ہوئے مشتبہ تحریروں کو نکال دیں، جب یہ کام مکمل ہو گیا تو بڑے خط میں چار نسخے لکھے گئے جو ایک مکہ، ایک مدینہ، ایک شام اور چوتھا نسخہ کوفہ بھیجا گیا"۔

"مکے والا نسخہ دو سو ہجری تک جب ابو سرایہ نے مکہ پر حملہ کیا وہیں تھا مگر پھر یہ نسخہ کھو گیا، خیال کیا جاتا ہے کہ اسے جلا دیا گیا، مدینے والا نسخہ یزید بن معاویہ کے دور میں گم ہو گیا، عثمان نے اپنے نسخے کے علاوہ باقی دیگر تمام نسخوں کو جلانے کا حکم دیا تھا مگر اس کے باوجود ادھر ادھر کچھ حصے موجود رہے، ابن مسعود نے اپنا نسخہ اپنے گھر پر محفوظ رکھا جو اس کی نسلوں میں وراثتاً منتقل ہوتا رہا، یہی حال علی کے مصحف کا ہوا، پھر حجاج بن یوسف آیا اور تمام مصاحف کو جمع کر کے آگ لگا دی اور ایک نیا مصحف لکھا جس میں سے بہت سارے حصے حذف کر دیے جو عثمان کے مصحف میں موجود تھے جس میں امویوں کے متعلق کچھ آیات تھیں اور بنی امیہ کے کچھ لوگوں کے نام تھے" (8)۔

حجاج نے نئے قرآن کے چھ عدد نسخے مصر، شام، مدینہ، مکہ، کوفہ اور بصرہ بھجوائے، ابو بکر اور علی، اور عمر اور عثمان کے بیچ کی دشمنی کے بارے میں سب لوگ جانتے تھے، اس دشمنی کے نتیجے میں ہر کسی نے قرآن میں ایسی آیات شامل کیں جو اس کے

موقف کو مضبوط اور دوسرے کے موقف کو کمزور کرتی تھیں اور ایسی آیات حذف کر دیں جن سے انہیں نقصان ہو تا چنانچہ اصل اور اضافے میں کیسے تفریق کی جائے؟ان حصوں کا کیا جنہیں حجاج بن یوسف نے حذف کر دیا؟

کندی اپنے مسلمان دوست کو مخاطب کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ:"جو کچھ بھی میں نے ذکر کیا ہے وہ مسلمانو کے ثقات (بھروسہ مند) سے ماخوذ ہے اور میں نے اپنی طرف سے کوئی رائے شامل نہیں کی بلکہ صرف اس کا ذکر کیا ہے جو آپ کے ہاں قابلِ قبول دلائل پر مبنی تھا"۔

خلیفہ المتوکل نے جب الکندی کا یہ خط دیکھا تو عرب مسلم طبیب علی بن ربان الطبری سے 855ء عیسوی کو یعنی کندی کے خط کے بیس سال بعد اس خط پر اسلام کا رد لکھنے کو کہا جس پر طبری نے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے "کتاب الدین والدولۃ" لکھی، مگر جب طبری قرآن کو جمع کرنے کے حوالے سے کندی کے دلائل کا جواب لکھنے تک پہنچا تو کوئی حُجت پیش نہ کر سکا اور محض اتنا کہا کہ:

"لوکان من المعقول الادعاء بان اصحاب رسول اللہ الورعین یمکن ان یزیفوا القرآن فاذا یمکن ان نقول نفس الشیء عن تباع النبی عیسی بن مریم"

ترجمہ:

"اگر یہ دعویٰ کرنا معقول ہے کہ رسول کے نیک صحابہ قرآن میں جعلسازی کر سکتے ہیں تو یہی بات ہم نبی عیسی بن مریم کے تابعین کے حوالے سے بھی کہہ سکتے ہیں"۔

یہ انتہائی کمزور جواب تھا کیونکہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ انجیل اور توریت تحریف شدہ ہیں سب جانتے ہیں ایسے میں طبری نے ایسی کون سے نئی بات کر کے کندی کے دعوے کو رد کیا؟۔

قرآن کے مختلف نسخوں کا آپس میں کافی اختلاف تھا، کسی میں کچھ آیات زیادہ تھیں اور کسی میں کم اور کسی میں آیات میں فرق تھا، مثلاً سورہ المائدہ آیت 89 لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ ۖ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۚ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ۚ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ طبری کہتا ہے کہ اُبی بن کعب اور عبد اللہ بن مسعود نے لفظ "ثلاثۃ ایام" کے بعد لفظ "متتالیۃ" (مسلسل) شامل کر دیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام لوگوں کے سوال کرنے یا شکایت کرنے پر آیات بدل دیتے تھے، مثال کے طور پر بخاری کہتا ہے کہ جب سورہ نساء کی آیت 95 نازل ہوئی لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ایک اندھے (ابن ام مکتوم) نے نبی سے یہ کہتے ہوئے شکایت کی کہ: میں اندھا ہوں اور جہاد نہیں کر سکوں گا اس لیے اللہ مجھ پر مجاہدین کو فضیلت دے گا، تو آیت میں "غیر اولی الضرر" کا اضافہ کر دیا گیا اور آیت یوں ہو گئی: "لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ"۔

اس آیت سے متعلق ایسی ہی ایک روایت الواحدی النیسابوری نے بھی نقل کی ہے (9) یہ وہی ابن ام مکتوم ہے جو پیغمبر اسلام کو زیرِ عتاب کرنے آیا اور اس نے اسے نظر انداز کر دیا اور "عبس وتولی ان جاءہ الاعمی" آیت نازل ہوئی (10)۔

ابن عباس کہتا ہے (11) کہ جب سورہ بقرہ کی آیت 228 نازل ہوئی: "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ" تو معاذ بن جبل نے کہا: اے اللہ کے رسول جو حیض سے مایوس ہو گئیں ان کی عدت کیا ہے؟ ایک اور شخص کھڑا ہوا اور بولا: اے اللہ کے رسول جن کو کمسنی کی وجہ سے حیض ابھی نہیں آیا ان کی عدت کیا ہے؟ ایک اور شخص کھڑا ہوا اور کہا: اے اللہ کے رسول حاملہ عورتوں کی عدت کیا ہے؟ تو نازل ہوئی "وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ ۚ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (12)۔

ان روایات کے تناظر میں یہ سمجھنا چنداں مشکل نہیں کہ ایک ہی آیت قرآن کے مختلف نسخوں میں مختلف کیوں تھی، کسی لکھنے والے نے ویسے ہی لکھی جیسی کہ اس نے پہلے سنی مگر اس میں بعد میں کیا جانے والا اضافہ نہ سن سکا جبکہ کچھ دوسرے لوگوں نے یہ اضافہ شدہ آیت سن لی، اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی حالیہ شکل میں قرآن کب جمع کیا گیا اس پر کوئی اجماع نہیں ہے، اور جیسا کہ ہم نے دیکھا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی موت کے فوراً بعد علی نے اسے جمع کیا جبکہ کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ اسے زید بن ثابت نے ابو بکر کے دور میں جمع کیا اور اسے حفصہ بنت عمر کے ہاں رکھوایا جبکہ ایک تیسرا فریق کہتا ہے کہ عثمان نے زید بن ثابت کو یہ ذمہ داری سونپی، چوتھا فریق کہتا ہے کہ حجاج بن یوسف نے حالیہ قرآن لکھا، یہ آخری قول اس لیے بھی زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اموی خلافت تک عربی تحریر کے حروف پر نہ تو نقطے ہوتے تھے اور نہ ہی ہمزہ اور تنوین موجود تھی، سیبویہ نے آکر ترقیم کی علامات داخل کیں۔

یہ سمجھنا بھی چنداں مشکل نہیں کہ نقطوں کی غیر موجودگی میں قرآن پڑھنے والے کو کس قدر کنفیوژن ہوتی ہوگی کیونکہ ب، ت اور ث میں فرق کرنا اتنا آسان نہیں تھا، اسی طرح ط اور ظ، د اور ذ، س اور ش، ر اور ز میں فرق کرنا بھی انتہائی مشکل ہوتا

ہو گا، کہا جاتا ہے کہ حمزہ نامی ایک قاری سورہ بقرہ کی آیت 2 (ذلک الکتاب لاریب فیہ۔ اس کتاب میں کوئی شک نہیں) کو نقطے نہ ہونے کی وجہ سے "ذلک الکتاب لازیت فیہ۔ اس کتاب میں کوئی تیل نہیں" پڑھتا تھا چنانچہ اس کا نام "حمزہ الزیات" (حمزہ تیل والا) پڑ گیا، اسی وجہ سے قرآن قاریوں کے ذریعے زبانی پڑھایا جاتا تھا تاکہ بغیر نقطوں کے تحریری الفاظ میں مکسنگ اور غلط فہمیوں سے بچا جاسکے یہی وجہ تھی کہ لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا کیونکہ ہر شخص اپنے استاد کی تعلیم کے مطابق پڑھتا تھا اور استاد کے پڑھائے ہوئے کی تصدیق ناممکن تھی کیونکہ لکھے ہوئے قرآن کے الفاظ پر نقطے نہیں تھے اور بغیر نقطوں کے الفاظ یقیناً قابلِ تاویل ہیں۔

مثال کے طور پر سورۃ فرقان کی آیت 48: "وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۚ وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا" کو بعض روایات میں "وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ نُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ" پڑھا جاتا ہے (13) اور ظاہر ہے کہ لفظ "بشرا" اور "نشرا" میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہی وجہ ہے احمد بن موسی بن مجاہد نے نو مختلف قراتیں شمار کیں، بخاری کہتا ہے: عمر بن الخطاب سے روایت ہے کہ نبی کریم کی زندگی میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورۃ الفرقان نماز میں پڑھتے سنا، میں نے ان کی قرات کو غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ وہ سورۃ میں ایسے حروف پڑھ رہے ہیں کہ مجھے اس طرح آں حضرت نے نہیں پڑھایا تھا، قریب تھا کہ میں ان کا سر نماز میں ہی پکڑ لیتا لیکن میں نے بڑی مشکل سے صبر کیا، اور جب انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے ان کی چادر سے ان کی گردن باندھ کر پوچھا یہ سورت جو میں نے تمہیں ابھی پڑھتے ہوئے سنا ہے تمہیں کس نے اس طرح پڑھائی ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے مجھے اسی طرح پڑھائی ہے، میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو خود حضور اکرم نے مجھے اس سے مختلف دوسرے حرفوں سے پڑھائی جس طرح تم پڑھ رہے تھے، آخر میں انہیں کھینچتا ہوا آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اس شخص سے سورۃ الفرقان ایسی حرفوں میں پڑھتے سنی جس کی آپ نے مجھے تعلیم نہیں دی ہے، آپ نے فرمایا عمر تم پہلے انہیں چھوڑ دو اور اے ہشام تم پڑھ کے سناؤ، انہوں نے آں حضرت کے سامنے بھی انہی حرفوں میں پڑھا جن میں میں نے انہیں نماز میں پڑھتے سنا تھا، آں حضرت نے سن کر فرمایا کہ یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے، پھر فرمایا عمر اب تم پڑھ کر سناؤ، میں نے اس طرح پڑھا جس طرح آں حضرت نے مجھے تعلیم دی تھی، آں حضرت نے اسے بھی سن کر فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے، یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے پس تمہیں جس طرح آسانی ہو پڑھو۔ (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف۔ حدیث نمبر 4992)۔

یہاں اظہر من الشمس ہے کہ خود پیغمبر اسلام کو یادداشت دھوکہ دے جاتی تھی اور وہ خود ہی آیات کو یادداشت کے مطابق وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے، اس حدیث کی ہی مثال لے لیں کہ پہلے ہشام نے پیغمبر اسلام سے سورہ فرقان ایک خاص قرات میں سنی اور یاد کی، پھر کسی اور وقت میں عمر آئے اور پیغمبر اسلام سے وہی سورت ایک قطعی مختلف قرات میں سنی، یعنی خود پیغمبر اسلام

کے دور میں اور اسی کی رضامندی سے قرآن مختلف قراتوں میں پڑھا جاتا تھا ایسے میں اس کے مرنے کے بعد کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ قرآن حجاج کے دور تک مختلف قراتوں میں پڑھا جاتا رہا تا آنکہ حجاج نے مُرقم مصحف تحریر کیا اور علمائے اسلام نے محمد کے بتائے ہوئے سات حروف پر اتفاق کر لیا۔

اور اگر یہ درست ہے کہ ابو بکر نے زید بن ثابت، اُبی بن کعب، معاذ بن جبل اور ابازید کو قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی اور وہ جمع بھی کیا گیا اور حفصہ بنتِ عمر کے پاس محفوظ بھی کیا گیا تو پھر عثمان نے ایک بار پھر کیوں زید بن ثابت کو قرآن جمع کرنے پر مامور کیا؟ عثمان نے حفصہ کے ہاں محفوظ نسخہ لے کر اسے ہر طرف ارسال کیوں نہ کیا؟ جبکہ اسے علم بھی تھا کہ حفصہ کے پاس ابو بکر کے دور کا زید ہی کا جمع کیا ہوا قرآن کا نسخہ موجود ہے کیونکہ اس نے حفصہ سے یہ نسخہ طلب بھی کیا تھا؟ اور پھر جب عثمان نے زید کو قرآن جمع کرنے پر مامور کیا تو زید نے اپنے ہی ہاتھوں ابو بکر کے دور میں جمع کیا ہوا قرآن لے کر عثمان کو کیوں پیش نہیں کیا؟ کیا ہوا کام دوبارہ کیوں کیا؟ دوسری بار قرآن کو جمع کرنے میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا سالوں تک وقت کیوں برباد کیا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ابو بکر کے دور میں جمع کیا ہوا قرآن نامکمل تھا؟ کیا اس میں جعلی آیات تھیں؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یا تو عثمان کے دور میں جمع کیا ہوا زید کا قرآن اس قرآن سے مختلف تھا جو اس نے ابو بکر کے دور میں جمع کیا تھا، جس سے بجاطور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تمام تر دستیاب نسخوں میں اختلاف تھا یا پھر زید نے ابو بکر کے دور میں قرآن جمع ہی نہیں کیا تھا جس سے نہ صرف احادیث کے اسناد کے تمام مسائل مشکوک ہو جاتے ہیں بلکہ تمام صحیح حدیثیں بھی مشکوک ٹھہرتی ہیں کیونکہ ابو بکر کے دور میں قرآن جمع کرنے کے قصے کی سند اتنی قوی ہے کہ اس پر کبھی شک نہیں کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ سالوں میں جمع کیے گئے قرآن کے مختلف نسخوں میں کثیر اختلاف پایا جاتا تھا، 154 ہجری کو پیدا ہونے والے ابو عبید القاسم بن سلام جس نے کوفہ اور بصرہ کے بڑے بڑے اساتذہ سے تلمذ کیا اور بغداد کے مشہور ترین معلم، لغت دان اور قاضی ہوئے نے اپنی کتاب "فضائل القرآن" میں کہا ہے کہ: ہمیں اسماعیل بن ابراہیم نے ایوب اور انہوں نے نافع اور انہوں نے ابنِ عمر سے کہ انہوں نے کہا: کوئی یہ نہ کہے کہ اس نے سارا قرآن حاصل کیا ہے، اور اسے کیا پتہ کہ اس کا سارا کیا ہے، اس میں سے بہت سارا قرآن ضائع ہو گیا، بلکہ اسے کہنا چاہیے: میں نے اس سے (قرآن سے) وہی کچھ لیا ہے جو ظاہر ہوا ہے (یعنی جو بچ گیا ہے) (14)۔

مزید کہا کہ: ہمیں ابن ابی مریم نے ابن الہیعہ سے اور انہوں نے ابی الاسود سے اور انہوں نے عروۃ بن الزبیر سے اور انہوں نے عائشہ سے کہ اس نے کہا: رسول اللہ کے دنوں میں سورۃ الاحزاب پڑھی جاتی تھی اور اس میں دو سو آیتیں ہوتی تھیں مگر جب عثمان نے قرآن جمع کیا تو اس سے زیادہ جمع نہ کر پایا جتنا کہ اس میں اب ہے (15)۔

زیر بن حُبیش سے مزید روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: اُبی بن کعب نے مجھ سے کہا: اے زیر تم نے سورۃ الاحزاب میں کتنی آیات شمار کیں اور پڑھیں؟ میں نے کہا: بہتر یا تہتر، اس نے کہا: یہ طوالت میں سورۃ بقرۃ جتنی تھی اور ہم اس میں رجم کی آیت بھی پڑھا کرتے تھے، تو میں نے اس سے کہا: رجم کی آیت کیا ہے؟ اس نے کہا: "الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموہما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم" اور یہ آیت ضائع ہونے والی آیات میں ضائع ہوگئی (16)۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں: ہمیں عبد اللہ بن صالح نے لیث سے اور انہوں نے خالد بن یزید سے اور انہوں نے صائب بن ابی ہلال اور انہوں نے ابی امامۃ عثمان بن سہل اور انہوں نے خدیجہ سے روایت کیا کہ خدیجہ نے کہا: "رسول اللہ ہمیں رجم کی آیت پڑھ کر سنایا کرتے تھے". اور ابن کثیر نے عتبۃ بن مسعود سے ذکر کیا کہ ابن عباس نے اسے بتایا کہ عمر بن الخطاب مجلس میں کھڑا ہوا اور اللہ کی حمد وثناء کی اور کہا: "اے لوگو اللہ تعالی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق پر بھیجا اور اس پر کتاب نازل کی، اس پر جو نازل ہوا تھا اس میں رجم کی آیت بھی تھی، تو ہم نے اسے پڑھا اور سمجھا اور مجھے اندیشہ ہے کہ لوگوں پر طویل وقت گزر جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہے کہ واللہ ہمیں اللہ کی کتاب میں رجم نہیں ملتا اور اس طرح وہ اللہ کی طرف سے اتارا ہوا ایک فرض چھوڑ کر بھٹک جائیں، اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے اللہ کی کتاب میں ایسا اضافہ کر دیا جو اس میں نہیں تھا تو میں اسے قرآن میں وہیں شامل کر دیتا جیسے کہ یہ اتری تھی" (17)۔

اور عبد الغفار بن داود نے لحی سے اور اس نے علی بن دینار سے روایت کیا کہ عمر بن الخطاب ایک آدمی کے پاس سے گزرا جو ایک مصحف میں پڑھ رہا تھا، اس نے پڑھا: "النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم وازواجہ امہاتہم وہو ابوہم" (سورۃ احزاب آیت 6)، تو عمر نے اس سے کہا: جب تک اُبی بن کعب نہ آجائے تم مجھے چھوڑ کر مت جانا، اور جب اُبی آگیا تو عمر نے اس سے کہا: اے اُبی یہ آیت پڑھ کر سناؤ؟ تو اُبی نے یہ آیت بغیر "وہو ابوہم" کے پڑھی اور عمر سے کہا: یہ ان چیزوں میں سے ہے جو ساقط ہوگئیں. ایسی ہی روایت معاویہ اور مجاہد اور عکرمہ اور الحسن سے بھی مروی ہے (18)۔

تفسیر القرطبی کے مطابق اُبی کے مصحف میں یہی آیت یوں ہے: "النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم وازواجہ امہاتہم وہو اب لہم" ابن عباس کی قرات ہے: "النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم وہو اب لہم وازواجہ امہاتہم" (19) یہاں الفاظ کی ترتیب میں اختلاف

واضح ہے جو سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ قرآن بغیر کسی ایسی کتاب کے جس سے رجوع کیا جائے ایک طویل عرصے تک محض زبانی یاد کیا جاتا رہا، انسان کی یادداشت چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اسے دھوکہ دے ہی جاتی ہے۔

ابو عبید نے کہا کہ ہمیں ابن ابی مریم نے ابن الہیعۃ سے اور انہوں نے یزید بن عمرو المغافری سے اور انہوں نے ابی سفیان الکلاعی سے روایت کیا کہ مسلمۃ بن مخلد الانصاری نے انہیں ایک دن کہا: مجھے قرآن کی ایسی دو آیتیں بتاؤ جو مصحف میں نہیں لکھی گئیں تو انہوں نے اسے نہیں بتایا، ان کے ہاں ابوالکنود سعد بن مالک موجود تھا تو ابو مسلمۃ نے کہا: "ان الذین آمنوا وہاجروا وجاہدوا فی سبیل اللہ باموالہم وانفسہم الا ابشروا وانتم المفلحون" اور "الذین آووہم ونصروہم وجادلوا عنہم القوم الذین غضب اللہ علیہم اولئک لا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون" (20)۔ غور کیجیے کہ یہاں ابو عبید یہ دعوی کر رہا ہے کہ یہ دو آیتیں مصحف سے ساقط ہو گئیں جبکہ اسے زبانی یاد تھیں۔

ابو عبید مزید کہتے ہیں کہ: "یہ آیات جن کا ہم نے ان صفحات میں ذکر کیا ہے زائد چیزوں میں سے ہیں جنہیں علماء نے نہیں لیا کیونکہ انہوں نے کہا کہ یہ جو کچھ کتاب میں موجود ہے اس سے شباہت رکھتے ہیں مگر وہ انہیں نماز میں پڑھا کرتے تھے اسی لیے انہوں نے ان زائد حروف کے انکار کرنے والوں کو کافر قرار نہیں دیا کیونکہ ان کی نظر میں کافر وہ ہے جو اس کا انکار کرے جو کتاب میں ہے" (21)۔

کچھ ایسی آیات بھی ہیں جیسا کہ دعوی کیا گیا ہے وحی کے طور پر نازل ہوئیں، کچھ عرصہ پڑھی جاتی رہیں پھر غائب ہو گئیں، محمد بن مرزوق ایسی ہی ایک آیت کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے: ہمیں عمرو بن یونس نے عکرمہ سے روایت کیا کہا: ہمیں اسحاق بن طلحہ نے بتایا کہ مجھے انس بن مالک نے نبی کے ان صحابہ کے بارے میں بتایا جنہیں انہوں نے بئر معونہ کے لوگوں کے لیے بھیجا، کہا: نبی نے چالیس یا ستر آدمی بئر معونہ بھیجے، اس کنویں پر عامر بن الطفیل الجعفری تھا، رسول کے صحابہ چل پڑے اور پانی کے پاس واقع ایک غار تک پہنچے اور اسی میں بیٹھ گئے، پھر ابن ملحان الانصاری بئر معونہ کے لوگوں کو رسول اللہ کا پیغام دینے نکلے تو ایک گھر سے ایک آدمی تیر کے ساتھ نکلا اور اس تیر سے اسے اس طرح مارا کہ تیر اس کے آر پار نکل گیا اور کہا: اللہ اکبر کعبے کے رب کی قسم میں جیت گیا، اور واپس اپنے اصحاب کی طرف پلٹ گیا تو انہوں نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے دوستوں کو غار میں جا ملے اور سب کو قتل کر دیا، تو اللہ نے ان پر قرآن نازل کیا "بلغوا عنا قومنا انا قد لقینا ربنا فرضی عنا ورضینا عنہ" (22)، پھر یہ آیت منسوخ ہو گئی اور کتاب سے اٹھالی گئی جبکہ ہم نے اسے زمانوں تک پڑھا تھا اور اللہ نے اس کی جگہ یہ آیت اتاری: "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربہم یرزقون" (23)۔

ایسی سورتیں بھی موجود ہیں جنہیں پڑھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں بعد میں کچھ اضافے کیے گئے چاہے یہ اضافے تب کیے گئے جب زید بن ثابت نے قرآن جمع کیا یا بعد میں تاہم اس بابت کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن اہم بات یہ ہے کہ ایسی سورتیں یہ واضح کرتی ہیں کہ قرآن اس طرح نہیں لکھا گیا جس طرح کہ پیغمبر اسلام نے اپنے اصحاب کو پڑھ کر سنایا تھا، مثال کے طور پر سورۃ المدثر "ر" پر مسجوع چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہے مگر اس کے وسط میں آیت نمبر 31 سورت کی باقی تمام تر آیات کی طوالت سے میل نہیں کھاتی اگرچہ سجع سے مطابقت رکھتی ہے:

فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ[24]

إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ[25]

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ[26]

وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ[27]

لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ[28]

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ[29]

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ[30]

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۙ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ[31]

كَلَّا وَالْقَمَرِ[32]

وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ[33]

وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ[34]

إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ[35]

یہ انتہائی واضح ہے کہ آیت نمبر 31 باقی آیات سے کسی طور میل نہیں کھاتی اور یہ بعد میں کسی وقت اس جگہ پر فٹ کی گئی ہے جو واضح دلیل ہے کہ قرآن میں ایسی آیات داخل کی گئی ہیں جو اصل میں سورتوں کا حصہ تھیں ہی نہیں اور کچھ دیگر آیات حذف

کر دی گئیں، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں موجود قرآن حرف بہ حرف وہ قرآن نہیں ہے جو پیغمبر اسلام نے کہا تھا۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ قرآن وحی کے تمام عرصہ تک لوگوں میں زبانی کلامی ہی منتقل ہوتا رہا جو کہ 23 سال بنتے ہیں، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن کو عثمان کے دور میں جمع کر کے ایک کتاب کی شکل دی گئی تو محمد کے دعوائے نبوت سے لے کر عثمان کے دور تک تقریباً چالیس سال بنتے ہیں اور اگر 95 ہجری کو اموی دور میں حجاج بن یوسف نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا اور قرآن کو وہ شکل دی جس میں یہ آج دستیاب ہے تو کیا یہ قرین عقل ہے کہ اتنی ساری متشابہ آیات اتنے طویل عرصے تک لوگوں کے ذہنوں میں بغیر کسی نسیان اور ملاوٹ کا شکار ہوئے محفوظ رہیں؟ شاید یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ انسان کی یادداشت پر اتنے طویل عرصے تک بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً جب خلیفہ المنصور کا علویوں میں سے کسی کے ساتھ اختلاف ہوا اور اس نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ چچا کو باپ یعنی "اب" کہا جا سکتا ہے تو اس نے سورۃ یوسف کی آیت 38 استدلال کے طور پر پیش کی مگر کہا: "واتبعت ملۃ آبائی ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب" مگر حالیہ قرآن میں یہ درج ہے "واتبعت ملۃ آبائی ابراہیم واسحاق ویعقوب" یعنی اسماعیل کا ذکر نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ منصور کی مراد سورۃ بقرۃ کی آیت 133 تھی: "ام کنتم شہداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الٰہک والہ آبائک ابراہیم واسماعیل واسحاق" (25)، یہ آیت منصور کے قول کو ثابت کرتی ہے کیونکہ یعقوب کا باپ اسحق تھا مگر یعقوب کے بیٹوں نے اس سے کہا کہ ہم تمہارے آباء کے خدا کی عبادت کریں گے اور اس کے چچا اسماعیل کا ذکر اس کے باپ سے پہلے کیا۔

تعجب خیز امر یہ ہے کہ مبرد اور ابن خلدون جنہوں نے یہ قصہ نقل کیا ہے اور مذکورہ آیات پیش کیں سورۃ یوسف کی آیت 38 کی اس غلطی کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی، البتہ طبری کی توجہ اس طرف گئی مگر اس نے سورۃ بقرۃ کی مقصود آیت کا ذکر نہیں کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یادداشت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے قرآن میں اتنی تکرار ملتی ہے کیونکہ قرآن کو حالیہ شکل دینے سے قبل مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ تک صرف اپنی یادداشت پر انحصار کرنے کی کوشش کی۔

جاری ہے------

حوالہ جات:

Ibn Warraq،The Origins of the Koran, 1998،Prometheus Books, p 20-1

Prometheus Books, p 152،The Origins of the Koran, 1998،Ibn Warraq-2

Prometheus Books, p 99،The Origins of the Koran, 1998،Ibn Warraq-3

Richard Bell&Introduction to The Quran, Montgomery Watt-4

Richard Bell&Introduction to The Quran, Montgomery Watt-5

The Origins of Koran, p ،p 194 / Quoted by Ibn Warraq،Chron. Arab. Edit. Beirut-6 102

Dictionary of Learned Men of Yakut VI p 301 (Edit. D. S. Margoliouth) Quoted -7 p 103،Origins of the Koran،by Ibn Warraq

،Decline and Fall (1915) Quoted by Ibn Warraq،The Caliphate : Its Rise،W Muir-8 p 108،The Origins of the Koran

9-اسباب النزول للواحدی، ایڈیشن 1968، مؤسسۃ الحلبی مصر، صفحہ 117

10-سورۃ عبس آیت 1 و 2

11-تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس للفیروزی، دوسرا ایڈیشن 1950 صفحہ 358 مکتبۃ مصطفی البابی الحلبی مصر

12-سورۃ الطلاق آیت 4

13-تفسیر الجلالین، دوسرا ایڈیشن، صفحہ 3 مؤسسۃ الرسالۃ بیروت

14-الناسخ والمنسوخ، صفحہ 32 تصنیف ہبۃ اللہ سلامۃ بن نصر بن علی البغدادی / تحقیق ڈاکٹر موسی بنای علوان العلیلی، الدار العربیۃ للموسوعات بیروت

15-الناسخ والمنسوخ، صفحہ 29 تصنیف ہبۃ اللہ سلامۃ بن نصر بن علی البغدادی / تحقیق ڈاکٹر موسی بنای علوان العلیلی، الدار العربیۃ للموسوعات بیروت

16-الناسخ والمنسوخ، صفحہ 28 تصنیف ہبۃ اللہ سلامۃ بن نصر بن علی البغدادی / تحقیق ڈاکٹر موسی بنای علوان العلیلی، الدار العربیۃ للموسوعات بیروت

17-الناسخ والمنسوخ، صفحہ 28 تصنیف ہبۃ اللہ سلامۃ بن نصر بن علی البغدادی / تحقیق ڈاکٹر موسی بنای علوان العلیلی، الدار العربیۃ للموسوعات بیروت
18- تفسیر ابن کثیر، سورۃ الاحزاب کی آیت 6 کی تفسیر
19- تفسیر القرطبی، سورۃ الاحزاب کی آیت 6 کی تفسیر
20-الاتقان فی علوم القرآن، جلال الدین السیوطی، المطبعۃ الازہریۃ بالقاہرۃ 1318 جلد 2 صفحہ 25 بغدادی کی الناسخ والمنسوخ صفحہ 31 سے نقل کرتے ہوئے
Prometheus Books, p 153،The Origins of the Koran, 1998،Ibn Warraq-21
22- تاریخ الطبری، جلد 2 صفحہ 83
23-سورۃ آل عمران آیت 169
24-الاتقان فی علوم القرآن، جلال الدین السیوطی، جلد دوم صفحہ 25 بغدادی کی الناسخ والمنسوخ صفحہ 30 سے نقل کرتے ہوئے
Prometheus Books, p 156،The Origins of the Koran, 1998،Ibn Warraq-25

شیطانی آیات

مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن الہامی کتاب ہے، اور نزول قرآن کے وقت سے لے کر اب تک ﴿یعنی ۱۴۰۰ سال﴾ اور اب سے مزید رہتی دنیا تک یہی کتاب انسانوں کو رہنمائی فراہم کرے گی، حالات چاہے جتنے تبدیل ہو جائیں، تہذیبوں میں چاہے جتنی جدت آ جائے، علوم چاہے جتنی ارتقائی منازل طے کر لیں، انسانی شعور و آگہی چاہے جتنی بیدار ہو جائے، رشد و ہدایت کا منبع اب صرف قرآن ہی رہے گا، اور اگر قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کیلئے تیار نہیں تو دوسرے درجے کے شہری بن کر ذلت و خواری اختیار کرتے ہوئے جزیہ ادا کرو، ورنہ گردن زنی کیلئے تیار ہو جاؤ (ملاحظہ کیجئے سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۲۹)
اس قدر کڑی شرائط کہ جہاں تخت یا تختہ کے سوا کوئی اور راستہ نہ ہو، اس بات کا متقاضی ہے عقل سلیم کسی طور پر بھی ایسے منبع رشد و ہدایت کو رد نہ کر سکے، لیکن جب ہم اس منبع رشد و ہدایت قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انتہائی مایوسی ہوتی ہے، خود قرآن میں ہمیں ایسی آیات ملتی ہیں جو نہ صرف ایک طرف بذات خود قرآن کی حجیت و حقانیت کو مشکوک بناتی نظر آتی ہیں، تو دوسری جانب قرآن کے مطالعہ کرنے والے کو بہت سے امور پر سوچنے پر مجبور کرتی ہیں آخر حقیقت کیا ہے؟۔
سر سلمان رشدی **شیطانی آیات** نامی کتاب لکھ کر دنیا بھر کے مسلمانوں کی نظر میں انتہائی معتوب ٹھہرے، اور عالم اسلام میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی، شیعہ مذہبی پیشوا خمینی صاحب نے سر سلمان رشدی کے واجب القتل قرار دیئے جانے کا فتویٰ بھی صادر

کیا، آخر یہ **شیطانی آیات** ہیں کیا؟؟؟؟عام مسلمان اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، کیونکہ علماء حضرات عام مسلمانوں کے سامنے اس بارے میں بات کرنے سے گھبراتے ہیں حالانکہ یہ معاملہ قرآن میں مذکور ہے، تو آخر ایسی کیا خاص بات ہے جو قرآن میں مذکور ہونے کے باوجود مسلمانوں سے پوشیدہ رکھنے میں ہی عافیت سمجھی جاتی ہے؟؟؟

آیئے آج ہم آپ کا تعارف ان شیطانی آیات سے کراتے ہیں، جن کا ذکر ڈھونڈنے سے آپ کو ہر قابل ذکر تفسیر میں بآسانی مل جائے گا۔ان آیات سے متعلق شان نزول تفاسیر میں کچھ یوں مذکور ہے کہ:

حضرت عبد اللہ بن عباس اور محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ رسول اللہ قریش کی اسلام سے بے رغبتی پر انتہائی افسردہ وغمگین تھے،اور قریش کے جانب سے دعوت اسلام کو پزیرائی حاصل نہ ہونے پر سخت مایوس تھے،ان کے دل میں شدت میں سے یہ چاہت تھی کہ اللہ کی جانب سے کوئی ایسا کلام نازل ہو جو موحدین اور مشرکین کے درمیان دوری کو قربت میں تبدیل کردے۔ایک مرتبہ پیغمبر اسلام بیت اللہ میں قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر اللہ کی جانب سے وحی کا نزول شروع ہوا اور آپ نے سورۃ النجم کی قراءت شروع کی اور جب ان آیات تک پہنچے افر أیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰتو شیطان نے آپ صلعم کی زبان سے یہ الفاظ جاری کرادیئے تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی ﴿یعنی یہ لات اور منات بہت بلند پایہ کے بت ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت بھی اللہ کے ہاں قبول کی جائے گی﴾ مشرکین آپ کی زبان سے اپنے معبودین کے لئے یہ الفاظ سن کر انتہائی مسرور ہوئے پیغمبر اسلام نے اپنی تلاوت مکمل کرنے کے بعد سجدہ تلاوت کیا تو اس مجلس میں موجود تمام مشرکین بھی سجدہ ریز ہوگئے اور بیت اللہ میں موجود کوئی بھی مومن اور مشرک ایسا نہ بچا جو سجدہ ریز نہ ہوا ہو۔اس مجلس میں موجود ولید بن مغیرہ اور ابو احیحہ سعید بن العاص جو دونوں انتہائی ضعیف تھے اور سجدہ کرنے پر قادر نہ تھے اس لئے دونوں نے زمین سے مشت بھر مٹی اٹھا کر پیشانی سے تک لے گئے اور اس پر سجدہ کیا۔اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی اور قریش کے لوگ بے حد خوش ہوئے کہ آج محمد نے پہلی دفعہ قریش کے معبودین کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا اور انہوں نے کہا کہ آج ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ ہی زندگی اور موت دیتا ہے وہی رزق دیتا ہے اور تخلیق کرتا ہے اور ہمارے یہ معبود یعنی لات و منات اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے، پس اگر محمد ہمارے معبودوں کو ایسے بہتر الفاظ کے ساتھ یاد کرے گا تو ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔پھر شام کو جبرائیل پیغمبر محمد کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد آج تم نے کیا کیا؟ آج تم نے قریش کے سامنے وہ کلام تلاوت کیا جو تم پر اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوا تھا، یہ سن کر تو محمد بے حد غمگین ہوگئے اور ان پر خشیت الٰہی کی کیفیت طاری ہوگئی۔تو اللہ کو محمد پر رحم آیا اور محمد کی تسلی کیلئے یہ آیت نازل کی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّـهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّـهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّـهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے قبل بھی جتنے رسول اور پیغمبر بھیجے ان میں سے ہر ایک ﴿کے ساتھ یہ واقعہ ضرور پیش آیا کہ﴾ جب انہوں نے ﴿اللہ کے کلام کو﴾ پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں اپنی جانب سے الفاظ شامل کر دیئے، پھر اللہ شیطان کے شامل کئے ہوئے الفاظ کو تو ختم کر دیتا ہے اور آپنی آیات کو بر قرار رکھتا ہے اور اللہ تو بہت ہی خبر رکھنے والا اور سیانا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرکین مکہ نے کہا محمد ہمارے معبودوں کا اچھے الفاظ میں تذکرہ کرنے پر شرمندہ ہے اس لئے اس نے اپنا کلام بدل لیا۔﴿بحوالہ تفسیر بغوی در تفسیر سورۃ الحج آیت نمبر ۵۲﴾

قارئین کرام میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے تفسیر بغوی میں یہ واقعہ جس طرح مذکور ہے اس کی اصل روح کو بر قرار رکھتے ہوئے صرف اردو کے قالب میں ڈھال کر آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر دوں، آپ حضرات یہ پوری تفصیل مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ فرماسکتے ہیں کہ اللہ اپنے رسولوں اور انبیاء کی غلطیوں کی کیسے پردہ داری کر تا ہے۔ اور شیطان کو اللہ نے کس قدر بااختیار کردار سونپا ہوا ہے کہ پہلے تو شیطان اللہ کے عطا کردہ اختیار کی بدولت رسولوں اور انبیاء پر بھی اتنا تصرف اور اختیار رکھتا ہے کہ ان پر نازل ہونے والے اللہ کے کلام میں تصرف پر بھی قادر ہے۔ اور نہ صرف تصرف پر قدرت بلکہ اگر شیطان چاہے تو وہ اللہ کے کلام میں شرک کی ملاوٹ کر کے رسول کی زبان سے ملاوٹی کلام بھی ادا کروا سکتا ہے۔

تقریباً تمام مشہور اور متقدمین کی تفاسیر میں اس واقعہ پر طویل مباحث قائم کئے گئے ہیں، تفسیر بغوی، تفسیر جلالین، احکام القرآن لابن العربی، تفسیر قرطبی، تفسیر ابن کثیر، سمیت تمام قابل ذکر مفسرین نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد علم حدیث کی بنیاد پر اس واقعہ کی صحت پر شکوک وشبہات کا اظہار ضرور کیا ہے۔ مگر کلیتاً کسی نے بھی رد نہیں کیا۔ یہاں یہ نقطہ ضرور ذہن میں رکھیں کہ قرآن کے ذو معنی الفاظ اور علم حدیث میں راویوں کی جرح وتعدیل کی آڑ میں مسلمانوں نے اپنے لئے نہایت گنجائش بنا رکھی ہے، کہ جہاں لاجواب ہو جائیں وہاں قرآن کے غیر صریح الفاظ اور راویوں کی جرح وتعدیل کی چھتری تلے پناہ لے لیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس واقعہ کہ بعینہ ایسے ہی کیوں نہ سمجھیں جیسا کہ مفسرین نے اس کو بیان کیا ہے، جس کے نتیجے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو انتہائی حکیم ہے اور اس کا کوئی اقدام حکمت بالغہ سے خالی نہیں ہوتا، تو آخر اس امر میں اللہ کی کیا حکمتِ خاص پوشیدہ ہے کہ نہ صرف سید الانبیاء والمرسلین حضرت محمد بلکہ ان سے قبل گذرنے والے تمام انبیاء اور رسولوں پر شیطان کو اس قدر اختیار عطا فرمادیا کہ اللہ کے ان خاص الخاص بندوں کے کلام میں تصرف کر کے لوگوں تک شیطانی پیغام یا شیطانی آیات کی رسائی کو ممکن بنادیا، پہلے تو یہ انتہائی ناقابل فہم اور مکروہ عمل انجام دینے کا شیطان کو پورا پورا موقع فراہم کیا جاتا ہے اور پھر واردات کی تکمیل کے بعد اللہ سر گرم عمل ہوتا ہے، اور شیطان کے پھیلائے ہوئے گند کو صاف کرنے میں جُت جاتا ہے اور اس گندگی کی صفائی کے بعد اللہ اعلان کرتا ہے کہ لوگو دیکھو میری قدرت اور حکمت کہ میں شیطان کے پھیلائے

ہوئے گند کو بھی صاف کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتاہوں،﴿بندہ پوچھے تم نے گند پھیلانے کا موقع ہی کیوں فراہم کیا؟﴾ کیااب بھی تمہیں میری قدرت اور طاقت پر شک ہے؟اور تم میری کون کون سی صلاحیتوں سے انکار کروگے؟ سبحان ربک رب العزۃ عما تصفون و"سلام" علی المرسلین۔

سورۃ الحج کی یہ آیت سورۃ النجم کی ہی ان ابتدائی آیات وما ینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحی جیسے قطعی طورپر متصادم ہے،سورۃ النجم کی ان آیات میں کہا جارہاہے نبی کی زبان سے سوائے وحی الٰہی کے کوئی اور الفاظ ادا نہیں ہوتے۔اور سورۃ الحج کی آیات میں نبی کی صفائی بیان ہورہی ہے کہ اگر شیطانی تصرف سے آپ کی زبان پر اصنام قریش کی تعریف میں بطور وحی کچھ الفاظ ادا ہوگئے ہیں تو فکر اور پریشانی کی قطعا کوئی ضرورت نہیں ہے،کیونکہ اللہ نے شیطان کو ایسا اختیار و طاقت صرف آپ پر نہیں بلکہ آپ سے پہلے آنے والے تمام انبیاء اور رسولوں پر بھی عطا فرمایا تھا۔کیا اولاً ایسی طاقت اور اختیار شیطان کو عطا کرنا اور پھر جب شیطان اپنی شیطانی کرجائے تو پھر شیطانی اثرات کو ختم کرنے کی محنت پر لگ جانا کسی حکمت کی نشاندہی کرتا ہے؟

ان آیات کے شان نزول کے واقعہ کی تفصیل میں خود مفسرین نے بیان کیا کہ جب پیغمبر اسلام بیت اللہ میں قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران وحی کا نزول شروع ہوا،﴿یقیناً یہ وحی خود جبرئیل لے کر آئے ہوں گے﴾اور پیغمبر نے سورۃ النجم کی تلاوت شروع کی،اور اسی دوران شیطان نے آپ کی زبان سے وہ الفاظ ادا کرادیئے جن کو شیطانی آیات کہا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ جبرائیل بھی تو اس وقت وہاں موجود تھے،انہوں نے اسی وقت پیغمبر کو تنبیہ کیوں نہ کی،اور پیغمبر کی غلطی کی اصلاح کیلئے شام تک کا انتظار کیوں کیا؟

آخر کیا وجہ ہے مفسرین کرام تو ایسے واقعات اپنی تفاسیر میں درج کرکے داد و تحسین کے مستحق قرار پائیں اور انہی واقعات کو جب سر سلمان رشدی اپنی کتاب شیطانی آیات میں،لالہ چمپت رائے عرف چوپتی اپنے کتابچہ رنگیلا رسول میں اور حالیہ دنوں میں عیسائی عقیدے سے تعلق رکھنے والے نکولا باسیلی عرف سام باسل نامی شخص دی انوسینس آف مسلمز نامی فلم کی شکل میں دنیا کے سامنے لاتے ہیں تو قابل گردن زنی قرار پاتے ہیں،آخر وہ مفسرین جنہوں نے اپنی بڑی بڑی مقدس تفاسیر میں بڑے مزے لے لے کر یہ قصے اور واقعات بیان کئے اور اپنی تفاسیر کی ضخامت اور اپنے علمی مرتبے بلند کئے وہ قابل گردن زنی قرار کیوں نہیں پائے؟؟؟ یہ کیا معیار ہے وہی قصہ سر سلمان رشدی بیان کرے تو شیطان رشدی جیسے مکروہ لقب سے پکارا جائے، اور تفسیر بغوی، تفسیر جلالین، احکام القرآن لابن العربی، تفسیر قرطبی، تفسیر ابن کثیر کے مصنفین بیان کریں تو ان پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جائیں۔میں مسلمان علماء سے سوال کرتاہوں کہ ان کی خود ساختہ قیامت کے دن کس معیار پر سر سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، پنڈت چوپتی، ایان حرسی، مریم نمازی، ابن وراق۔ شیخ ذکی امین، شیخ عبد اللہ القصیمی، تو جہنم رسید ہوں

گے اور علامہ بغوی اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ جنت کے مستحق قرار پائے جائیں گے؟ ہمیں تمہارے پرورد گار کے اس بھونڈے انصاف اور دہرے معیار کے برخلاف جہنم منظور ہے، انسانیت کی تذلیل اور تحقیر نامنظور

آخر کیا وجہ ہے کہ قرون اولٰی کے مفسرین تو سورۃ الحج کی اس آیت کو واقعہ غرانیق سے منسلک کرتے ہیں اور عہد جدید کے مفسرین ان کی تردید کرتے نظر آتے ہیں؟ ہم کس معیار پر متقدمین کی تفسیر کو غلط اور متاخرین کی تفسیر کو صحیح قرار دیں؟ حالانکہ علم حدیث میں ہمیشہ علماء متقدمین کو علماء متاخرین پر ترجیح دی جاتی ہے، یہاں اس معیار کی قربانی کیوں دی جاتی ہے؟
اگر ہم متاخرین کی تفسیر کی روشنی میں بھی سورۃ الحج کی آیت کا مطالعہ کریں تو اس آیت سے ہمیں آخر کار کیا پیغام دیا جارہا ہے؟؟؟ کس بات کی صفائی بیان کی جارہی ہے؟ آخر کچھ تو ہے جس کی پردہ داری کی جارہی ہے۔

للکارِ خداوندی

جراتِ تحقیق کے ایک محترم قاری ابن خیام صاحب نے ایک تحریر کے جواب میں تبصرہ فرمایا کہ جو کافی مدلل نظر آتا ہے اور اپنی جگہ بجائے خود ایک سوال اور موضوع ہے، چنانچہ انکی اجازت سے ہم اسکو ایک الگ عنوان سے یہاں شائع کررہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکے اور اگر تاریخ، تفاسیر واحادیث اور عقل ومنطق کی روشنی میں انکا جائزہ لیا جائے تو کیا کچھ سامنے آتا ہے۔
ابن خیام صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم انکی تحریر آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

عرب کے فصیح وبلیغ شاعروں کو اللہ اور پیغمبرِ اسلام کا چیلنج:

پیغمبرِ اسلام کے فرسودہ صحرائی پیغام کو جہاں عام لوگوں نے رد کیا تھا وہاں وادیء مکہ کے شاعر بھی پیچھے نہیں تھے، صد افسوس کہ ان شاعروں کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریک نے ان کی شاعری بھی ضائع کردی. آج ہم قرآن سے اس شاعرانہ مقابلے کا یک طرفہ احوال دیکھیں گے کہ جب پیغمبرِ اسلام کی من گھڑت آیات کو شاعروں نے ٹھکرا دیا تو پیغمبر کے اللہ نے انہیں قرآن کے جیسی ایک سورت بناکے پیش کرنے کو کہا.

قرآن 2:23 **"اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا، تو اس جیسی ایک سورہ تو لے آؤ. اور اللہ کے سوا اپنے سب حماتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو"**
شاعروں نے چیلنج قبول کیا اور ایک سورت بنالائے.. رسول کا اللہ کچھ پریشان سا ہوا اور پھر ایک اور چیلنج دے دیا:

قرآن 10:38 "کیا یہ کہتے ہیں کے انہوں نے خود اسے بنالیا ہے، تم فرماؤ تو اس جیسی ایک سورہ لے آؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جو مل سکیں سب کو بلالاؤ اگر تم سچے ہو"

عرب کے بلیغ شعراء نے یہ چیلنج بھی مان لیا اور سورت بنا کر لے آئے، اب تو اللہ اور اس کے رسول کے پسینے نکل آئے کیونکہ شاعر انہیں مات دے چکے تھے، اب اللہ نے ڈیمانڈ کو کچھ طول دیا اور شاعروں پر دس (10) سورتیں بنانے کا بڑا چیلنج رکھا:

قرآن 11:13 "کیا یہ کہتے ہیں کے انہوں نے اس جیسا بنالیا، تم فرماؤ کہ تم ایسی بنائی ہوئی دس (10) سورہ لے آؤ، اور اللہ کے سوا جو مل سکیں سب کو بلالو اگر تم سچے ہو"

شاعر تو شاعر تھے فوراً دس سورتیں بنالائے اور دعویٰ کیا کہ آپ کے سب چیلنج پورے ہوئے چنانچہ آپ ہار گئے ہیں، اللہ کو ہوٹنگ اور اس کھلی شکست پر ہمیشہ کی طرح شدید غصہ آیا اور بات گالیاں دینے کی سطح تک پہنچ گئی:

قرآن 22:51 "اور وہ جو کوشش کرتے ہیں ہماری آیتوں میں ہار جیت کے ارادہ سے وہ جہنمی ہیں".

شاعروں نے کہا کہ چیلنج آپ نے دیا تھا اب ہار گئے ہو تو گالیاں دیتے ہو؟ چنانچہ (خیالی) اللہ اور اسکے پیغمبر نے آخری چیلنج دیا:

قرآن 28:49 "تم فرماؤ تو اللہ کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت کی ہو میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو."

یعنی شاعروں کی ہر بار کی کامیابی سے تنگ آکر اللہ نے شاعروں سے پوری کتاب ہی مانگ لی، شاعروں نے یہ چیلنج قبول کیا تو اللہ کے ناک تک پانی آگیا، اسے پتہ تھا کے عرب کے یہ بلیغ شعراء کچھ بھی کر سکتے ہیں، اللہ اور اسکا پیغمبر یہ چیلنج دے کر فلم نائک کے امریش پوری کی طرح پھنس گئے.. شاعروں نے پیغمبرِ اسلام کو سارے چیلنج یاد دلائے اور خوب مذاق اڑایا، اپنے رسول کو بے بس ولاچار دیکھ کر اللہ کی قہر آلود آنکھیں سرخ ہو گئیں اور ارشاد ہوا:

قرآن 34;5 " اور جنہوں نے ہماری آیتوں میں ہرانے کی کوشش کی ان کے لیئے سخت عذاب دردناک میں سے عذاب ہے".

قارئین! اس آیت سے ان شاعروں کا کوئی سماجی جرم بھی ثابت نہیں ہوتا، محض رسول اور نام نہاد اللہ کی آیات کو منطقی اور استدالی طریقے سے غلط ثابت کرنے پر ان کے لئے اتنا دردناک عذاب!؟ اللہ و رسول کی لاچاری و بے بسی کا عالم تو دیکھیے:

قرآن 10:41 " اور اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو فرمادو کہ میری کرنی میرے لیئے اور تمہارے لیئے تمہاری کرنی تمہیں میرے کام سے علاقہ نہیں اور مجھے تمہارے کام سے تعلق نہیں".

تو پھر اس تیغ کا استعمال کس لیے؟ ان شاعروں میں کعب بن اشرف بھی تھا جسے اسلام کے غلبے کے بعد رسول کے کہنے پر محمد بن اسلمہ نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اس کے گھر میں دھوکے اور دولاب سے قتل کر دیا اور اس قتل پہ اللہ کا رسول اس قدر خوش ہوا جتنا حضرت عائشہ کے ساتھ شادی پر ہوا تھا. (بخاری: کتاب غزوات).

نوٹ! جس جس نے رسول کا مزاق اڑایا تھا اسے بعد از غلبے یا تو قتل کیا گیا یا پھر اسے پاؤں چاٹنے پر مجبور کیا گیا.
کیا یہ وہی رسول اللہ ہے جس کی حمد و ثناء کرتے مسلمان تھکتے نہیں.؟

تمت بالخیر. ابن خیام

قرآنی جائزہ 1

دیگر علوم کی طرح علمِ تاریخ کے بھی اصول ہیں اور یہ جانچ پڑتال کے عمل سے گزرتا ہے، ہر تاریخی خبر کی کوئی نہ کوئی تحریری یا تصویری سند ہونی چاہیئے تاکہ اس کی جانچ سے اس خبر کی درستگی کا تعین کیا جا سکے، جب ہم قدیم مصر کے حکمران خاندانوں کی بات کرتے ہیں تو ان کی تاریخ کے حوالے سے ہمارے پاس تاریخی دستاویزات ہونی چاہئیں جو کہ موجود ہیں اور تحقیق کاروں نے انہیں اہرام مصر اور دیگر فرعونوں کی قبروں سے دریافت کیا ہے اور یہ ساری دستاویزات مصر کی لائبریریوں میں موجود ہیں. یہی بات قدیم یونانی یا فارسی تاریخ پر بھی لاگو ہوتی ہے.

اور اگر کھدائیاں اور مخطوطے کسی تاریخی حادثہ یا واقعے کے تمام پہلو اجاگر نہ کریں تو اس صورت میں ہم اس واقعہ یا حادثہ سے متعلق قیاس سے کام لے سکتے ہیں، مثلاً اگر ہم دوسری عالمی جنگ سے مثال لیں اور نازی دور حکومت اور اس کے دیگر ملکوں پر طاقت کے ذریعے قبضے پر نظر ڈالیں کہ کس طرح ہٹلر کی گستاپو Gestapo فورس نے یہودیوں اور دیگر لوگوں پر مظالم ڈھائے اور ان کا قتل عام کیا تو ہمیں ان واقعات کی تصاویر اور دستاویزی فلمیں میسر ہیں مگر یہ دستاویزات ہمیں یہ نہیں بتاتیں کہ وہ کون کون لوگ تھے جو یہودیوں کو مقتل کی طرف لے جا رہے تھے اگرچہ ہم گستاپو فورس کے سربراہان اور کچھ دیگر ذمہ داروں کے نام جانتے ہیں جو اس قتل عام کی سرپرستی کر رہے تھے، اس صورت میں ہم قیاس سے کام لیتے ہوئے خود سے سوال کریں گے کہ جیسے ہی اتحادی فوج برلن کے نزدیک پہنچی تو نازی فوج کا ایک ڈاکٹر کیوں بھاگ کھڑا ہوا؟ ڈاکٹر جوزف منگلی Josef Mengele بھیس بدل کر ارجنٹائن بھاگ گیا تھا اور وہاں اس نے اپنا چہرہ بدلنے کیلئے کئی آپریشن کرائے. اور جب قتلِ عام سے بچ جانے والے کچھ لوگوں نے بتایا کہ کچھ ڈاکٹر قیدیوں پر تجربات کر رہے تھے تو یہاں ہم ایک پُریقین قیاس کر سکتے ہیں کہ

ڈاکٹر منگلی ان تجربات میں ملوث تھا اور نہ وہ بھاگ نہ کھڑا ہوتا کیونکہ وہ فوجی نہیں تھا. اسلامی تاریخ پر بات کرتے ہوئے ہم اسی طرح کے قیاسات روبہ عمل لائیں گے.

جزیرہ نما عرب کی زیادہ تر تاریخ ابھی تک دستاویز شدہ نہیں ہے ماسوائے یمن جس کے ایک ہزار سال قبل از عیسوی کے زمانے کے مخطوطے اور پتھری نقوش ہمیں میسر ہیں جن سے ہمیں وہاں کی تاریخ کی اچھی معلومات میسر ہیں جیسے معینی سلطنت اس کے شاہوں خداؤں اور عبادتگاہوں کے بارے یا حضر موت اور سلطنتِ سبا یا پھر مارب کے ڈیم اور حبشی حاکم ابرہہ کی اس ڈیم کی ترمیم کی معلومات وغیرہ..

حجاز اور وسطی جزیرہ عرب میں تحقیق کاروں کو قبل از اسلام کے زمانے کے کوئی خاص مخطوطے نہیں ملے ماسوائے چند ٹکڑوں کے جن سے پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان لوگوں کے بول چال کی زبان ضرور تھی مگر اس میں نقطے، تنوین کی علامتیں اور حروفِ علت vowels نہیں تھے جن کے متبادل کے طور پر بعد میں تشکیل یعنی زیر زبر تشدید پیش وغیرہ سے کام چلایا گیا، اعداد بھی عربوں نے اسلام کے بعد آرامی یا سریانی زبان سے لیئے. اب تک دریافت ہونے والا سب سے پرانا مخطوطہ "الرقش" یا "الرقشہ" ہے جس کی تاریخ 267 عیسوی کی ہے (تصویر کا منبع the Alleged Syriac Origins &Arabic Script of the Quran):

مخطوطے کے بائیں طرف کی تحریر عربی اور نبطی کا ایک آمیزہ ہے جس میں کوئی نقطے یا اعداد وغیرہ نہیں ہیں، اس کے ساتھ کی تحریر ثمودی ہے جبکہ دائیں طرف کی تحریر عربی اور نبطی تحریر کی جدید عربی میں ڈیکوڈنگ ہے، اس مخطوطے سے پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان آج کی طرح لکھی جانے والی زبان نہیں تھی.

اگر 267 عیسوی تک یعنی قرآن کے منظرِ عام پر آنے سے کوئی تین سو سال پہلے عربی تحریر کا یہ عالم ہے تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عربی لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں تھی بلکہ محض بول چال کی زبان تھی، کچھ زبان دانوں کا خیال ہے کہ قرآن کے زمانے میں عربی زبان آرامی اور سریانی حروف سے لکھی جاتی تھی کیونکہ آرامی اور سریانی زبانیں ہی اس زمانے کی تحریری زبانیں تھیں.

اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساری اسلامی تاریخ محض زبانی تاریخ ہے جو تب احاطہ تحریر میں لائی گئی جب عربی زبان پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے وسط میں ترقی کر گئی اور اس میں نقطے اور اعداد شامل کیئے گئے، جس تاریخ کا

انحصار سو سال یا اس سے بھی زائد عرصہ تک راویوں کی یاداشت پر رہا ہو کسی طور قابلِ اعتبار نہیں ہے. اس صورت میں صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے.

لیکن عالمِ اسلام کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی مولویوں سے سنتے ہیں اسے نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں اور اسے عین حقیقت سمجھتے ہیں جس پر کوئی دوسری بات ہو ہی نہیں سکتی اس سنی سنائی پر غور و فکر یا تنقید کرنا تو بہت دور کی بات ہے، مثال کے طور پر اگر ہم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے حضرت محمد ﷺ کا عقد اور ان سے بچوں کی تعداد کو ہی لے لیں تو ہمیں اس تاریخ کی فرسودگی اور اس کا تضادات کا اندازہ ہو جاتا ہے، سیرت کی تمام کتابیں بشمول بخاری اور دیگر کے سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے پچیس سال کی عمر میں نکاح کیا جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر مبارک چالیس سال تھی اور اِس سے پہلے وہ دو عقد کر چکی تھیں جن میں سے ان کے کچھ بچے بھی تھے مگر کوئی بھی راوی ان بچوں کی تعداد یا ترتیب پیدائش پر متفق نہیں ہے، ابن کثیر مختصر السیرہ النبویہ میں کہتا ہے "ابن عباس نے کہا کہ رسول اللہ کا سب سے بڑا بیٹا القاسم تھا، پھر زینب، پھر عبد اللہ، پھر ام کلثوم، پھر فاطمہ، پھر رقیہ" (ص 512). اور ابو الفرج المعافی بن زکریا الجریری نے ابن عباس سے روایت کیا "حضرت خدیجہ نے نبی ﷺ سے ان کا بیٹا عبد اللہ پیدا کیا، پھر ان کیلئیے زینب پیدا کی، پھر رقیہ، پھر القاسم، پھر الطاہر، پھر المطہر، پھر الطیب، پھر المطیب، پھر ام کلثوم، پھر فاطمہ پیدا کی جو سب سے چھوٹی تھی" (وہی سابقہ منبع اور سابقہ صفحہ) اس روایت میں حضرت خدیجہ نے محمد ﷺ کیلئیے دس بچے پیدا کئیے جبکہ دونوں روایتیں ابن عباس کی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو ابن عباس اپنی یاداشت پر انحصار کرتے تھا جو انہیں اکثر دھوکہ دے جاتی تھی یا پھر ان سے روایت کرنے والے غلط بیانی کر گئے۔

علمِ فعلیات physiology کے ذریعے ہمیں معلوم ہے کہ چالیس سال کی عمر کے بعد عورت کے زنانہ ہارمون میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے اور سِن یاس menopause شروع ہو جاتا ہے جس میں ماہواری کا نظام خراب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے حمل کے امکانات کم ہو جاتے ہیں، زیادہ تر خواتین میں پینتالیس سال کی عمر میں ماہواری بند ہو جاتی ہے اور اس کے بعد حمل ناممکن ہو جاتا ہے، اگر حضرت محمد ﷺ کی ایک چالیس سالہ خاتون (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سے اتنی اولاد تھی تو سوال یہ ہے کہ باقی تین درجن امہات المومنین سے اُنکی کوئی اولاد کیوں نہیں ہوئی؟ نہ حضرت عائشہ صدیقہ نہ نوجوان حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جن سے انہوں نے اسی رات عقد مبارک فرمایا جس رات حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا شوہر قتل ہوا تھا اور نا ہی کسی کنیز سے جیسے ریحانہ جبکہ ان کی اکثر ازدواجِ مطہرات کے اپنے سابقہ شوہروں سے بچے تھے؟

اسلامی مؤرخین نے حضرت خدیجہ سے جن بچوں کی ولدیت حضرت محمد ﷺ سے منسوب کی ہے قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ اُن کے نہیں تھے، ممکنہ طور پر حضرت خدیجہ کے یہ سارے بچے اُن کے سابقہ شوہروں سے تھے، اگر ہم راویوں کی اس تاریخ پر تھوڑی دیر کیلئیے اعتبار کر لیں تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو محمد ﷺ کی سب سے چھوٹی اولاد ہے اُن سے حضرت علی بن ابی طالب نے سنہ 2 ہجری کو شادی کی تھی اور اس وقت اُن کی عمر 15 سال تھی (العجاب فی بیان الاسباب، ابن حجر العسقلانی، ص 77) جبکہ حضرت خدیجہ کا انتقال رسالت کے آغاز کے دسویں سال میں ہوا تھا یعنی ہجرت سے تین سال پہلے، اگر ماں کی وفات کے وقت حضرت فاطمہ کی عمر دس سال تھی اور حضرت خدیجہ کی وفات 65 سال کی عمر میں ہوئی تھی تو اس طرح حضرت فاطمہ کی پیدائش کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر 55 سال تھی جو کہ علمی طور پر نا قابلِ قبول امر ہے، مگر اس حقیقت کے محض ذکر سے ہی آدمی مرتد اور شاتمِ رسول بن جاتا ہے جس کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی جیسا کہ ابن تیمیہ "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" میں کہتا ہے.

اسلام کی ساری تاریخ بشمول قرآن کے نزول اور اس کی جمیع و تدوین کے ساری کی ساری جعلی تاریخ ہے جسے راویوں نے اسلام کے ظہور کے دسیوں سالوں بعد لکھا وہ بھی غیر جانبدارانہ تاریخ کے طور پر نہیں بلکہ محض محمد ﷺ اور کچھ مذہبی تعلیمات و رسومات جسے اسلام کا نام دیا گیا کو خدا بنانے کیلئیے، تحریر کے اگلے حصہ میں ہم بتائیں گے کہ جس قرآن کو مسلمان دیوانوں کی طرح پوجتے ہیں وہ جبریل کے ذریعے محمد ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن ہو ہی نہیں سکتا.

قرآنی جائزہ 2

گزشتہ سے پیوستہ

قبل از اسلام کے عربوں کے عربی زبان میں لکھے ہوئے کوئی مخطوطے نہیں ملتے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان غیر تحریری زبان تھی، ایسی کثیر زبانیں ہیں جن کے بولنے والے ختم ہو گئے یا ہونے کے قریب ہیں، یہ لوگ ایسی زبانیں بولتے ہیں جو آج بھی نہیں لکھی جاتیں، اس وقت دنیا میں چھ ہزار سے زیادہ زندہ زبانیں موجود ہیں تاہم ان کی اکثریت تحریری نہیں ہے، ان میں سے 473 زبانیں ناپید ہونے کے قریب ہیں کیونکہ یہ غیر تحریری زبانیں ہیں اور چونکہ ان کے بولنے والے اقلیت میں ہیں.

http://www.ethnologue.com/nearly_extinct.asp

تحریر کے پہلے حصہ میں دکھائے جانے والے مخطوطے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی ان حروف میں جنہیں آج ہم پہچانتے ہیں نہیں لکھی جاتی تھی ماسوائے یمن کے (مملکتِ معین، سبا، حضرموت) اور یہ حال اسلام کے ظہور سے تین سو سال پہلے تک تھا چنانچہ ڈاکٹر طہ حسین کے مطابق اسلامیوں کے یہ دعوے کہ جاہلیت کی شاعری لکھ کر کعبے کی دیواروں پر لٹکائی جاتی تھی جنہیں معلقات کا نام دیا گیا محض اسلامی اختراع ہے جس کی کوئی عملی اور عقلی دلیل نہیں ہے کیونکہ عربی زبان لکھی ہی نہیں جاتی تھی پھر شعراء اپنی طویل معلقات کیسے لکھتے تھے؟ اور کعبے کی دیواروں پر لٹکانے سے پہلے انہیں کس پر لکھا جاتا تھا جبکہ جاہلیت کے بعد آنے والا قرآن ہڈیوں، پتوں اور چمڑے پر لکھا جاتا تھا؟ امری ءالقیس کے معلقہ کو کتنی بھیڑوں کے چمڑے کی ضرورت پڑے گی اور اسے کعبے پر کیسے لٹکایا گیا؟

محمد کی اپنی دعوت شروع کرنے کے بعد بھی عربی لکھنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے جبکہ حروف کے نقطے اور تنوین اس وقت متعارف نہیں تھے، بعض لغت دانوں کا تو خیال ہے کہ عربی آرامی حروف سے لکھی جاتی تھی جسے شام کے عیسائیوں سے سیکھا گیا تھا (جس طرح آج ہم رومن اردو لکھتے ہیں اور عربی حروف کی بجائے رومن حروف استعمال کرتے ہیں جیسے السلام علیکم کی بجائے assalam-o-alaikum)، مسلمان دعوی کرتے ہیں کہ محمد اپنی وحی زید بن ثابت اور معاویہ بن ابی سفیان جیسے وحی کے کاتبوں کو لکھنے کیلئے سناتے تھے اگرچہ معاویہ بن ابی سفیان ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوا تھا وہ بھی زبردستی لہذا اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نے وہ کچھ لکھا ہو جو محمد نے کبھی کہا ہی نہ ہو اگر وہ واقعی کاتب تھا، راوی کہتے ہیں کہ محمد انہیں کوئی آیت سنا کر کہتا تھا کہ اسے ان آیات کے ساتھ لگا دیا جائے جس میں بقرہ کا ذکر ہوا ہے یا نجم کا، کیا ان کے پاس آرکائیو archive کا کوئی نظام تھا تا کہ اس سے رجوع کر کے بقرہ والی آیات تلاش کی جاسکیں؟ اور وہ مسلمان کیا کرے گا جس نے کچھ سال پہلے ان آیات کو یاد کیا پھر اس میں نئی آیات شامل کر دی گئیں؟

پھر مسلمان مؤرخوں اور "اخباریوں" نے — جیسا کہ انہیں ڈاکٹر جواد علی اپنی کتاب تاریخ العرب قبل الاسلام میں مخاطب کرتا ہے کیونکہ انہوں نے خبروں کو بغیر کسی تبدیلی کے بالکل ویسا ہی نقل کیا جیسا کہ انہوں نے سنا تھا اور اسے تاریخ قرار دیا — ان لوگوں نے دعوی کیا کہ سارا قرآن محمد کے مرنے سے پہلے ہی لکھا جاچکا تھا، پھر دعوی کیا کہ ابو بکر نے یہ ساری تحریریں ایک مصحف میں جمع کیں اور حفصہ بنتِ عمر جو کہ محمد کی بیوی تھی اس کے پاس رکھوا دیا، پھر بتاتے ہیں کہ عثمان نے معاذ بن جبل کے اصرار پر — جس نے عراق میں ایک ہی سورت کی مختلف قراتیں سنی تھیں اور اسے اس اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں میں تفرقے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا — قرآن کو جمع کرنے کی ذمہ داری نوجوان زید بن ثابت کو سونپی تھی جس نے عثمان سے کہا: "میں وہ جمع کیسے کروں جو رسول اللہ نے اپنی زندگی میں جمع نہیں کیا"..... اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ابو بکر نے قرآن جمع کر لیا تھا تو عثمان

کو اسے دوبارہ جمع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور پھر عثمان نے یہ ذمہ داری نوجوان زید کو ہی کیوں سونپی جبکہ ابی بن کعب جیسے بڑے بڑے صحابہ موجود تھے جسے محمد نے کہا تھا: "میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں قرآن پڑھاؤں" تو اس نے کہا: "کیا اللہ نے آپ کو میرا نام لیا" کہا: "ہاں" تو اس کی آنکھیں بھر آئیں (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، حدیث 4676) اور عبداللہ بن مسعود جو دن رات محمد کے ساتھ سائے کی طرح رہتا تھا اور نوے سورتوں کا حافظ تھا ایسے صحابہ کو چھوڑ کر عثمان نے نوجوان زید بن ثابت کا انتخاب کیوں کیا جبکہ اللہ نے ابی بن کعب کو نام سے یاد کیا تھا؟

اور اگر عثمان نے قرآن کو ایک مصحف میں جمع کر کے اس کی چھ کاپیاں بنا کر مختلف ملکوں میں تقسیم کر دی تھیں جیسا کہ روایات کہتی ہیں تو اب تک ہمیں ان قرآنوں میں سے ایک بھی قرآن کیوں نہیں ملا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو مسلمان محمد کی تھوک، اس کے وضوء کے پانی اور سر منڈاتے وقت اس کے سر کے بالوں تک کے حصول کیلئیے بے تاب رہتے تھے وہ اس کے قرآن کے پہلے باقاعدہ نسخے کی حفاظت نہ کریں؟ سعودیہ میں اب بھی نبوی آثار کی سیل کیلئیے بولیاں لگتی ہیں، 2005 میں محمد کی قبر پر رکھی جانے والی ایک جائے نماز کو 17 ملین ریال میں فروخت کیا گیا (حلیمہ مظفر – الشرق الاوسط 7-10-2005).

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو جمع کرنے کی ساری تاریخ محض خیالی قصے ہیں جنہیں مسلمان اخباریوں نے دوسری صدی ہجری میں گھڑا ہے، اس وقت دستیاب قرآن کوفی خط میں لکھا ہوا ہے یہ خط جیسا کہ ماہرین لغات کہتے ہیں پہلی صدی ہجری کے خاتمے اور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں اس حالت تک پہنچا تھا جس میں کہ یہ قرآن لکھا ہوا ہے (The Qur'an : Catalogue of Exhibition of Quranic Manuscripts At The British Library)

خود کوفہ شہر کی بنیادیں محمد اور ابو بکر کے مرنے کے بعد ہجرت کے 17 ویں سال کو رکھی گئی تھیں جو کہ عمر کا دور تھا، اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کوفی خط آہستہ آہستہ متعارف ہوا اور سینکڑوں سالوں بعد جا کر مکمل ہوا اور پہچان کیلئے اسے کوفی خط کہا جانے لگا تا کہ حجازی خط سے اس کی پہچان ہو سکے، اس کوفی خط میں بھی نقطے اور اعداد نہیں تھے جیسا کہ اس قرآن میں ہیں جسے "مصحف عثمان" کہا جاتا ہے.

اخباریوں کے قصوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمد کی زندگی میں قرآن لکھنے والے کئی لوگ تھے اور سب کا اپنا ایک مصحف ہوتا تھا. ابن مسعود کا اپنا ایک مصحف تھا، ابی بن کعب کا اپنا تھا، علی بن ابی طالب کا اپنا اور عائشہ کا مصحف اپنا تھا تو یہ سارے مصحف کہاں گئے؟ 1965 میں یمن کے دار الحکومت صنعاء میں الجامع الکبیر نامی مسجد کی چھت گرنے پر جو قرآنی مخطوطے دریافت ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں قرآن کو ایک متفقہ نسخے میں یکجا کرنے کی کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی تھی،

اگر سارے مسلمان عثمان کے جمع کردہ قرآن پر متفق تھے تو انہوں نے مسجد کی ایک اضافی چھت بنا کر اس میں سینکڑوں قرآنی مخطوطے چھپانے کی کوشش کیوں کی؟ چھت بھی اتنی مضبوط بنائی کہ 1965 تک چھت کے گرنے تک کسی کو خبر تک نہ ہو سکی کہ اس چھت کی ایک اضافی درز میں قرآنی مخطوطے چھپے ہوئے ہیں! مسجد کی چھت میں قرآنی مخطوطے چھپانے کی کوشش سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چھپانے والوں کو عثمان کے قرآن پر اعتبار نہیں تھا کہ یہی درست قرآن ہے، چنانچہ جس قرآن کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس ڈر سے کہ اسے ان سے ضبط نہ کر لیا جائے انہوں نے اسے مسجد کی چھت میں چھپا دیا.

یہ مخطوطے جنہیں یمن کی حکومت نے چھپانے اور مستشرقین کو ان کی جانچ سے روکنے کی بھرپور کوشش کی، قرآن کے قدیم مخطوطوں کے اختلاف کو ثابت کرتے ہیں، ان مخطوطوں میں بھی کاتبوں کی آیات کو مٹا کر ان کے اوپر دوسری آیات لکھنے کی کوشش واضح نظر آتی ہے، اس مضمون میں ہم ان مخطوطوں کی کچھ تصاویر پیش کر کے آج کے قرآن جو عثمان کے قرآن پر مبنی ہے میں فرق دکھائیں گے، تاہم سب سے پہلے چھٹی صدی عیسوی میں محمد کی پیدائش کے وقت کی تحریر کی نوعیت سے آغاز کرتے ہیں:

(منبع

(http://www.islamic-awareness.org

یہ عربی مخطوطہ چھٹی صدی عیسوی کا ہے، اس مخطوطے کی جرمن مستشرق اینو لیٹمن Enno Littmann نے دستاویز بندی کی ہے، اس میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نہ تو اس میں نقطے ہیں اور نا ہی تنوین کی علامات اور یہ اس وقت رائج سریانی تحریر سے ملتا جلتا ہے. اور چونکہ اس وقت زیادہ تر لکھنے والے شام کے عیسائی تھے جو سریانی بولتے تھے اور انہوں نے انجیل اور تمام دینی ڈیٹا اسی میں لکھ رکھا تھا جسے عام لوگ نہ تو پڑھ سکتے تھے اور نا ہی سمجھ سکتے تھے لہذا انہوں نے جیکب آف ایڈیسا Jacob of Edessa جس کی وفات 708 عیسوی میں ہوئی تھی سے درخواست کی کہ وہ یونانی زبان کی طرح سریانی زبان کیلئے حروف علت

vowels ایجاد کرے تاکہ یہ زبان پڑھنے میں آسان ہو جائے، پہلے تو اس نے اس ڈر سے منع کر دیا کہ اس طرح تمام دینی کتابیں جو حروف علت کے بغیر لکھی ہوئی تھیں ضائع ہو جاتیں.. لیکن بالآخر اس نے ایک درمیانہ حل نکالا اور ایسے حروف ایجاد کیئے جو سطر کے اوپر نیچے لکھے جاسکیں تاکہ لکھے ہوئے الفاظ پر اثر انداز نہ ہو سکیں. اس سے پہلے مختلف آوازوں کی پہچان کیلئیے حروف پر رنگین نقطے لگائے جاتے تھے تاکہ حروف کے اپنے نقطوں سے ان کی الگ پہچان ہو سکے، لفظوں پر لکھے جانے والے ان چھوٹے حروف کا یہ طریقہ کوفی خط میں لکھے جانے والے قرآن میں بھی موجود ہے اور رنگین نقطے بھی. قرآن کو کوفی خط میں لکھنے والے کاتب زبر کی آواز کیلئیے لفظ کے دائیں طرف سرخ نقطہ لگاتے تھے اور پیش کی آواز کیلئیے بائیں طرف نقطہ لگاتے تھے.

یہ مصر میں دریافت ہونے والا ایک مخطوطہ ہے جو 24 ہجری کو لکھا گیا:

اس مخطوطے سے پتہ چلتا ہے

کہ عمر کے زمانے میں بھی عربی زبان میں نقطے تقریباً ناپید تھے جبکہ تنوین تو سرے سے تھی ہی نہیں. اور جیسا کہ واضح ہے حرف "ر" حرف "د" کی طرح لکھا گیا ہے اور لفظ زمن میں حرف "ز" حرف "ذ" کی طرح لکھا ہوا ہے. لفظ عشرین میں حرف "ن" حرف "ز" سے مشابہ ہے. اگر عمر کے زمانے میں عربی تحریر کا یہ عالم ہے تو محمد کے زمانے میں کیا عالم رہا ہوگا؟

ہم نہیں جانتے کہ عربی زبان میں نقطے کس نے شامل کیئے اگرچہ عرب مؤرخین کا دعوی ہے کہ یہ ابو الاسود الدؤلی تھا جس کی وفات 69 ہجری کو ہوئی. تاہم ان نقطوں کے پھیلاؤ میں سب سے بڑا کردار دو لوگوں کا رہا ہے جو یحیی بن یعمر ہے جس کی وفات 90 ہجری کو ہوئی اور ناصر بن عاصم اللیثی ہے جس کی وفات 100 ہجری کو ہوئی. پھر خلیل بن احمد الفراہیدی نے جس کی وفات 170 ہجری میں ہوئی عربی زبان میں تنوین (زیر زبر پیش وغیرہ) شامل کی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ "مصحف عثمان" جس پر آج کا قرآن مبنی ہے اور جس میں نقطے اور تنوین کی علامات موجود ہیں یقیناً خلیل بن احمد کی وفات کے بعد لکھا گیا ہوگا یعنی تقریباً دوسری صدی ہجری کے اختتام اور تیسری صدی ہجری کے آغاز پر، اور یہی مستشرقین کی تحقیق کا نتیجہ ہے.

تحریر کے اگلے حصہ میں ہم قرآن کی بعض آیات کا فرق پیش کریں گے جس کے بارے میں مسلمانوں کا دعوی ہے کہ یہ "ذکرِ محفوظ" ہے.

قرآنی جائزہ 3

گزشتہ سے پیوستہ: قسط1 قسط2

جب محمد قرآن لایا اس وقت عربی زبان کی ترقی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، اور چونکہ وحی لکھنے والے اپنی دستیابی اور عدم دستیابی کے باعث ایک دوسرے کی جگہ قرآن لکھتے تھے جب محمد انہیں بتاتا تھا کہ جبریل نے آکر اسے کچھ آیتیں دی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو کچھ بعض کاتبوں نے لکھا دوسروں نے نہیں لکھا، اور چونکہ ہر ایک دو آیتیں ہڈیوں اور چمڑوں پر پر لکھی جاتی تھیں جبکہ قرآن تیئس سالوں کے عرصے میں نازل ہوا چنانچہ یہ بات یقینی ہے کہ اسے ایک مصحف میں جمع کرنے والوں کو اسے جمع کرنے اور لکھنے میں دشواری کا سامنا رہا ہوگا کیونکہ کاتبوں میں لکھنے کی صلاحیت ایک دوسرے سے کافی مختلف تھی جبکہ لکھنے کا طریقہ بھی ہر ایک کا اپنا تھا، اس لیے جب زید اور اس کے ساتھی قرآن لکھنے کیلئے آئے تو ہر ایک نے بغیر نقطوں کے الفاظ اپنے اندازے یا یاد کرنے کے حساب سے پڑھے، اس وجہ سے نئے مصحف کے الفاظ میں دیگر دستیاب مصاحف کے مقابلے میں فرق آگیا جیسے ابی بن کعب کا مصحف یا ابن مسعود کا مصحف وغیرہ.. اس وجہ سے بعد میں آنے والے فقہاء نے مختلف قراتوں کا شوشہ چھوڑا اور دعوی کیا کہ جب عمر محمد کے پاس ایک ایسا شخص لے کر آیا جو قرآن کو اس طرح سے نہیں پڑھتا تھا جیسا کہ اسے یاد تھا، تو محمد نے اس سے کہا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے، چنانچہ قراتیں بھی سات ہوگئیں، پھر دس ہوئیں، اور آخر کار پچیس قراتوں تک جا پہنچیں (النشر فی القراءات العشر، ابن الجوزی ص 18)، یہ سب بغیر نقطوں کے حروف کی وجہ سے ہوا جس کی وجہ سے ہر شخص تحریر کو اپنے اندازے سے پڑھتا تھا.

جب قرآن کی سورتوں کی ترتیب کی باری آئی تو ہر سورت کی طوالت اور اس کی آیتوں کی تعداد پر اختلاف ہوگیا، اسی طرح ان دعاؤں کا بھی مسئلہ کھڑا ہوگیا جو محمد پڑھا کرتا تھا کہ یہ قرآن میں سے تھیں یہ محض دعائیں تھیں، نتیجتاً "مصحف عثمان" بے ترتیب آیات کا ایسا ملیچر بن گیا جس میں مکی آیات مدنی سورتوں کے بیچ ٹھنسی ہوئی نظر آتی ہیں اور برعکس بھی، پھر سورتوں کی ترتیب نزول کے تسلسل کے حساب سے نہیں تھی بلکہ زید بن ثابت نے سورتوں کو ان کی طوالت کے حساب سے شامل کرنے کا فیصلہ کیا یہاں بھی سورتوں کی طوالت پر صحابہ میں اختلاف ہوگیا، مثال کے طور پر سورہ احزاب جو "مصحف عثمان" میں صرف تہتر آیات پر مشتمل ہے، عائشہ، ابی بن کعب اور ابن مسعود کا اصرار تھا کہ زید کے "مصحف عثمان" جمع کرنے سے پہلے یہ سورہ بقرہ کے جتنی طویل تھی.

مزید بر آں قرآن کی سورتوں کی تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، مصحف عثمان میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں جبکہ ابی بن کعب کے مصحف میں دو اضافی سورتیں ہیں جو سورہ الحفد اور سورہ الخلع ہیں، جبکہ ابن مسعود کے مصحف میں صرف ایک سو بارہ سورتیں ہیں، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ معوذتین قرآنی سورتیں نہیں تھیں بلکہ محض دعائیں تھیں جو محمد دہرا تا رہتا تھا.

اور نہ جانے کیوں اللہ محمد سے یہ کہتا ہے کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے جبکہ قرآن اسے کہتا ہے (فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا—اے پیغمبر صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہم نے یہ قرآن تمہاری زبان میں آسان بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم اس سے پرہیزگاروں کو خوشخبری پہنچا دو اور جھگڑالوؤں کو ڈر سنا دو۔—سورہ مریم آیت 97) یسر یقینا عسر کا عکس ہے جب کہتا ہے کہ "یسر ناہ بلسانک" تو اس کا مطلب ہے کہ معاملات کو آسان کرنے کیلئیے قرآن محمد کی زبان میں نازل ہوا جو کہ اہل مکہ کی زبان تھی، ایک طرف آسانی کا دعوی تو دوسری طرف اسے کہتا ہے کہ ہم نے اسے سات حروف پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی قرات پر اختلاف کریں؟ عمر بن الخطاب کی ایک روایت میں دعوی کیا گیا ہے کہ اس نے ایک آدمی کو سورہ یوسف پڑھتے سنا جس نے ایک آیت کو یوں پڑھا (لیسجننہ عتی حین) جبکہ یہ آیت عثمان کے مصحف میں (لیسجننہ حتی حین) ہے، تو عمر نے اس پوچھا کہ تمہیں یہ کس نے پڑھائی ہے؟ تو اس نے کہا کہ ابن مسعود نے، چنانچہ عمر نے ابن مسعود کو خط لکھ بھیجا جس کا متن کچھ یوں ہے (تم پر سلام ہو، اس کے بعد کہ اللہ نے قرآن صاف عربی زبان میں نازل کیا ہے اور اسے اس قریس کے لہجے میں نازل کیا ہے، اگر تمہیں میرا یہ خط ملے تو لوگوں کو قریش کی زبان میں پڑھانا نا کہ ہذیل کی زبان میں—بحوالہ المنثور فی التفسیر بالماثور، جلال الدین السیوطی ج4، سورہ یوسف آیت 35)، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کے سات حروف میں نازل ہونے کا مقولہ فقہائے اسلام نے قرآن کی قرات میں اختلاف کی پریشان کن صورتحال سے بچنے کیلئیے ایجاد کیا کیونکہ محمد وقت کے ساتھ ساتھ آیات بھول جاتا تھا اور اس وجہ سے نماز میں اپنی یاداشت کے حساب سے مختلف طریقے سے پڑھ جاتا تھا اور نئے مسلمان اس سے سنی ہوئی آیات کو یاد کر لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں قرآن کی قرات میں اختلاف پایا جاتا ہے.

عثمانی مصحف سے ایسی بہت ساری آیات ساقط ہوئیں جو مسلمانوں کو یاد تھیں، ڈاکٹر این مری شمل Annemarie Schimmel کے مطابق یہ بات صنعاء میں دریافت ہونے والے مخطوطوں سے واضح طور پر عیاں ہے جن کی تاریخ پہلی صدی ہجری کی ہے:

اس یمنی مخطوطے میں ساتویں سطر تقریباً مٹ
چکی ہے، جبکہ آٹھویں سطر سے سورہ البروج شروع ہورہی ہے، مصحف عثمان میں یہ سورت کچھ یوں شروع ہوتی ہے:
والسماءذات البروج (1) والیوم الموعود (2) وشاہد ومشہود (3) قتل اصحاب الاخدود (4) النار ذات الوقود (5) اذ ہم علیہا قعود (6)

جبکہ بغیر نقطوں کے اس یمنی مخطوطے میں یہ سورت اس طرح سے درج ہے:

والسماءذات البروج (1) والیوم الموعود (2) وشاہد ومشہود (3) قتل اصحاب الاخدود (4) الافی کتاب الوفود (الوقود) (5) اذ ہم علیہا قعود (6)
یعنی آیت نمبر پانچ بالکل ہی تبدیل ہے اور عثمانی نسخہ میں قطعی وجود نہیں رکھتی!؟

چونکہ لوگ بغیر نقطوں کے الفاظ کو اندازوں سے پڑھا کرتے تھے لہذا مصحف عثمان میں ملتا ہے (والشمس تجری لمستقرلہا–سورہ یس آیت 8) جبکہ ابن عباس یوں پڑھتا ہے (والشمس تجری لا مستقرلہا)، سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں الخلیل بن احمد کے حوالے سے کہتا ہے کہ آیت (فجاسوافی الارض) کو کچھ لوگوں نے (فحاسوافی الارض) پڑھا تھا. سورہ اسراء کی آیت (وقضی ربک الا تعبدواالا ایاہ وبالوالدین احسانا) کو کچھ لوگوں نے (وصی ربک الا تعبدواالا ایاہ وبالوالدین احسانا) پڑھا تھا، ایسے ہی سورہ بقرہ کی آیت (وانظر الی العظام کیف ننشزہا) کو کچھ لوگوں نے یوں پڑھا تھا (وانظر الی العظام کیف ننشرہا) الغرض کہ اندازے کی قرات کی اتنی مثالیں ہیں کہ انہیں اس مضمون میں سمویا نہیں جاسکتا تاہم اس سب سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ قرآن کو جمع کرنے کی تاریخ کسی طور قابلِ اعتبار نہیں ہے.

اور اب قرآن کے مواد اور اس کے فائدے کی طرف آتے ہوئے خود سے سوال کرتے ہیں کیا اسلام ایسی کوئی نئی چیز لایا ہے جس کے لیے موسی اور عیسی کے بعد ایک اور نبی بھیجنے کی ضرورت پڑے؟ جواب یہ ہے کہ اسلام میں یہودیت اور عیسائیت سے صرف مندرجہ ذیل باتوں کا فرق ہے:

1- محمد اور اس کے گینگ کو قتل عام اور لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت جس پر محمد کو فخر بھی تھا، ایک حدیث میں وہ اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ مجھے دوسرے انبیاء پر چھ چیزوں سے فضیلت ہے- جس میں "مجھ پر مال غنیت حلال کر دیا گیا" شامل ہے (الجامع لاحکام القرآن، القرطبی، ج 7، سورہ الانفال آیت 1)

2- لوگوں سے تب تک جنگ کرنا جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں یا جزیہ ادا نہ کریں

3- عورت کی بے قدری کرتے ہوئے اسے گھر کا قیدی اور شوہر کا غلام بنانا

4- خدا کو ایک نکاح خواں بنا دینا جو محمد کی من پسند عورتوں سے اس کی شادیاں کراتا پھرتا ہے اور محمد کی اپنی بیویوں کے ساتھ جھگڑے نمٹانے کیلئیے آیات نازل کرتا پھرتا ہے جیسے عائشہ، زینب، حفصہ اور زمعہ

اس کے سوا اسلام کی ہر چیز جیسے روزہ، نماز، زکات، حج، سود کی ممانعت، معبود کی وحدانیت، والدین اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک، تجارت اور تولنے میں ایمان داری، طلاق، شادی، میراث، چور اور زانی کی سزا، یہ سب دونوں سابقہ ابراہیمی مذاہب میں سے کسی ایک یا دونوں میں موجود ہیں بلکہ بعض قوانین پر تو باقاعدہ "جاہلیت" میں عمل بھی کیا جا رہا تھا، پھر اس نئے دین سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا؟ ایسی کتاب بھیجنے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے جو خود خدا کو ہی انتہائی خود غرض قسم کی ہستی کے طور پر پیش کرتی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ اس نے انسانوں کو محض اپنی عبادت کیلئیے پیدا کیا ہے اور زمین و آسمان پر ہر چیز اسی کی حمد و ثناء کر رہی ہے، پھر اپنے آپ کو مکار اور سخت ترین سزا دینے والا قرار دیتے ہوئے کہتا کہ وہ جہنم کو جن و انس سے بھر دے گا کیونکہ انہوں نے نئے دین کو قبول نہیں کیا جس میں کچھ نیا نہیں تھا؟ انسانیت کو ایسی کتاب سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے جس نے غلامی کو قانونی حیثیت دے دی اور ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنا دیا اور ان دونوں کو ایک اور خود غرض خدا کا غلام بنایا جسے صرف منت سماجت کرتے اور نمازیں پڑھ کر گڑگڑاتے اور اس سے ایسے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے لوگوں کی آوازیں ہی اچھی لگتی ہیں جو گناہ انہوں نے کیے ہی نہیں جبکہ وہ خود اپنے فرشتوں کے ساتھ ایک بشر پر درود و سلام پڑھنے میں از حد مصروف ہے؟!

قرآن کی زبان—کچھ خوبصورت کلام کے باوجود—ایک کمزور کلام ہے اور بورنگ تکرار سے بھرا ہوا ہے جس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ تکرار قرآن کے کاتب کو مغالطوں میں ڈال دیتی ہے جن سے آسانی سے بچا جاسکتا تھا جیسے عاد اور ثمود کا قصہ جس میں پہلے کہا گیا کہ انہیں ایک چیخ (الصیحہ) سے ہلاک کیا گیا، پھر کہا کہ ایک تھرتھراہٹ (الرجفہ) سے ہلاک کیا گیا پھر کہا کہ طوفان (ریح عاتیہ) سے ہلاک گیا گیا، اگر تکرار نہ ہوتی تو یہ اضطراب پیدا نہ ہوتا، غیر مفید تکرار کی ایک اور مثال دیکھیں:

پہلے نوح سے کہا کہ وہ اپنی قوم سے کہے:
(قُل لَّا اَقُول لکُم عِن دِی خزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَا اَع لَمُ ال غَی بَ وَلَا اَقُول لکُم اِنِّی ملکٌ اِن اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُو حٰ ی اِلَیَّ قُل ہَل یَس تَوِی ال اَع مٰی وَال بَصِی رُ اَفَلَا تَتَفَکَّرُو نَ—کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ کہہ دو کہ بھلا اندھا اور آنکھ والا برابر ہوتے ہیں؟ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟) (الانعام 50)

پھر محمد سے کہا کہ وہ اپنی قوم سے کہے:
(وَلَا اَقُول لکُم عِن دِی خزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَا اَع لَمُ ال غَی بَ وَلَا اَقُول اِنِّی ملکٌ—اور میں نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں) (ہود 31)

اور اگر فضول تکرار کا کوئی شاہکار درکار ہو تو سورہ رحمن پڑھ لیجیئے جس میں "فبای آلاء ربکما تکذبان" کی گردان ہے، ایک اور بے معنی تکرار کا شاہکار دیکھیں:

(کَالَّذِی نَ مِن قَب لِکُم کَانُو اَشَدَّ مِن کُم قُوَّۃً وَّاَک ثَرَ اَم وَالًا وَّاَو لَادًا فَاس تَم تَعُو ا بِخَلَاقِہِم فَاس تَم تَع تُم بِخَلَاقِکُم کَمَا اس تَم تَعَ الَّذِی نَ مِن قَب لِکُم بِخَلَاقِہِم—تم منافق لوگ ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں۔ وہ تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں کہیں زیادہ تھے تو وہ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے سو جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اسی طرح تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا) (التوبہ 69)

اس آیت نے تو ساری بلاغت کو دیوار پر دے مارا ہے، چنانچہ یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ یہ کسی ایسے آسمانی خدا کی طرف سے آئی ہے جس نے عربی زبان تخلیق کی ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اور اسے آدم اور جنت کی زبان بنایا ہے.

قرآن کی کمزور زبان دانی کی ایک چھوٹی سی مثال کے طور پر پیش ہے:

(وَإِذْ ◌ قُلْ ◌ نَالَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ◌ وَمَاجَعَل ◌ نَاالرُّءْ ◌ یَاالَّتِیْ ◌ ٓ اَرَیْ ◌ نٰکَ اِلَّافِت ◌ نَۃًلِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَۃَ ال ◌ مَل ◌ عُو ◌ نَۃَ فِی ال ◌ قُرْ ◌ اٰنِ ؕ◌ وَنُخَوِّفُھُم ◌ ؕ◌ فَمَایَزِیْ ◌ دُ ھُم ◌ اِلَّاطُغ ◌ یَانًا کَبِیْ ◌ رًا— اور جب ہم نے تم سے کہا کہ تمہارا پرورد گار لوگوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور جو منظر ہم نے تمہیں دکھایا اسکو لوگوں کے لئے آزمائش کیا اور اسی طرح تھوہر کے درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی۔ اور ہم انہیں ڈراتے ہیں تو اس سے انکی سرکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔)(الاسراء 60)

علم نفس میں ایسے شخص کیلیئے جو ایک موضوع پر فوکس نہ کر سکتا ہو اور رکے بغیر ایک خیال سے دوسرے کی طرف چھلانگ لگا دیتا ہو، ایسے شخص کیلیئے کہا جاتا ہے کہ وہ flight of ideas کا شکار ہے، قاری کو اس آیت سے پلے ہی کیا پڑتا ہے جو ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف بغیر رکے کود جاتی ہے؟ پھر قرآن نے اس آیت سے پہلے یا بعد میں کسی ملعون درخت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا!

کمزور زبان دانی اور انسانی غلطی کی ایک اور مثال دیکھیے:

(لَیْ ◌ سَ عَلَی ال ◌ اَع ◌ مٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی ال ◌ اَع ◌ رَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی ال ◌ مَرِیْ ◌ ضِ حَرَجٌ وَّلَاعَلٰی اَن ◌ فُسِکُم ◌ اَن ◌ تَا ◌ کُلُو ◌ امِن ◌ ◌ بُیُو ◌ تِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ اٰبَآئِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ اُمَّھٰتِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ اِخ ◌ وَانِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ اَخَوٰتِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ اَع ◌ مَامِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ عَمّٰتِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ اَخ ◌ وَالِکُم ◌ اَو ◌ بُیُو ◌ تِ خٰلٰتِکُم ◌ اَو ◌ مَامَلَک ◌ تُم ◌ مَّفَاتِحَہٗ ٓ اَو ◌ صَدِیْ ◌ قِکُم ◌ ◌ ؕ لَیْ ◌ سَ عَلَیْ ◌ کُم ◌ جُنَاحٌ اَن ◌ تَا ◌ کُلُو ◌ اجَمِیْ ◌ عًا اَو ◌ اَش ◌ تَاتًا— نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر اور نہ خود تم پر کہ اپنے گھروں سے کھانا کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اس گھر سے جسکی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہوں۔ یا اپنے دوستوں کے گھروں سے اور اس کا بھی تم پر کچھ گناہ نہیں کہ سب مل کر کھانا کھاؤ یا جدا جدا)(النور 61).

آیت اندھوں لنگڑوں اور بیماروں کو جنگوں سے مستثنیٰ قرار دینے سے شروع ہوئی اور پھر اچانک گنوائے گئے گھروں سے کھانے پینے کی طرف نکل گئی وہ بھی ایک بے معنی تکرار کے ساتھ حالانکہ بڑی آسانی سے کہا جاسکتا تھا کہ "من بیوت عوائلکم واصد قائکم" مگر وہ رشتہ دار گنوانے بیٹھ گیا، مگر کیونکہ وہ دوسروں کی طرح بشر ہے جو غلطیاں کر سکتے ہیں "بیوت اولادکم" اور "بیوت اجدادکم" کا ذکر کرنا بھول گیا، اگر آیت میں مذکور لوگوں کی پابندی کی جائے تو مسلمانوں پر اپنی شادی شدہ اولاد اور دادا اور دادی کے گھر میں کھانا حرام ہوگا کیونکہ قرآن نے ان کا ذکر نہیں کیا.

اور سب سے بڑی بات جو یہ ثابت کرتی ہے کہ قرآن کسی اللہ کا کلام نہیں ہے اس میں ناسخ اور منسوخ کی موجودگی ہے، وہ خدا جو اپنے رسول کو ایسی کتاب دے کر بھیجتا ہے جس کا متن تمام خلقت کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا تھا اس نے یقیناً اسے سوچ سمجھ کر لکھا ہوگا اور یہ یقین کر لیا ہوگا کہ اس میں کوئی تضادات نہیں ہیں، مگر اس میں کوئی دو سو سے زائد آیات ایک دوسرے سے متضاد ہیں، چنانچہ قرآن کے مصنف نے فرمایا کہ یہ منسوخ ہیں، اگر منسوخ ہیں تو خدا نے انہیں اپنے رسول پر اتارا ہی کیوں جبکہ وہ جانتا بھی ہے کہ یہ منسوخ ہیں؟ اور پھر قیامت تک گردان کے لیے انہیں قرآن میں کیوں چھوڑ دیا گیا جبکہ ان کا کوئی فائدہ ہی نہیں؟

حقیقت میں قرآن نا ہی ذکرِ محفوظ ہے اور نا ہی کسی اللہ کا کلام ہے جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں ہے سوائے انسانی تصور کے، بلکہ یہ ایک بشری تصنیف ہے جو تدوین و تحریف کے کئی مراحل سے گزر کر ساتوی صدی عیسوی کے آخر یا آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کہیں جا کر مکمل ہوئی.

قرآن اور اس کے تضادات

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّـهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿النساء:۸۲﴾

﴿ترجمہ﴾ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے، اور دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کلام انسانی ہوتا تو یقیناً اس میں بہت سے تضادات پائے جاتے۔ کیونکہ وہ ذات جو کائنات جیسے منظّم نظام کو بغیر کسی سقم کے قائم کئے ہوئے ہے ﴿بقول قرآن﴾ یقینی طور پر اس کا کلام بھی ہر قسم کے سقم سے پاک ہونا چاہئے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا واقعتاً قرآن میں کسی بھی قسم کا کوئی تضاد پایا جاتا ہے یا نہیں؟ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ اگر

حقیقتاً قرآن میں کوئی تضاد نہ بھی پایا جاتا ہو تو بھی یہ کلام الٰہی ہونے کیلئے کافی ثبوت ہے یا نہیں؟ ہم قرآن کے عمومی دعویٰ کو لے کر بات آگے بڑھاتے ہیں کہ قرآنی دعویٰ کے مطابق اس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا، لہٰذا اگر ہم قرآن میں تضادات تلاش کر لیتے ہیں تو قرآنی فارمولے کے تحت ہی قرآن کا انسانی تصنیف ہونا ثابت ہو جائے گا۔

اصول فقہ کی تشریح کے مطابق اس آیت میں لفظِ اختلافاً عام ہے جس میں کوئی تخصیص نہیں پائی جاتی اور اس لفظ کا عموم داخلی و خارجی دونوں قسم کے تضادات کو شامل ہے، داخلی تضاد سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے اپنے متن میں ایسے بیانات موجود ہوں جو باہم متصادم ہوں اور بیک وقت ان کا تسلیم کیا جانا ممکن نہ ہو۔ اور خارجی تضاد سے مراد یہ ہے کہ قرآن کا کوئی بیان کسی حقیقتِ مسلّمہ سے متصادم و معارض ہو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن ان دونوں اقسام کے تضادات سے خالی نہیں ہے اور قرآن میں داخلی و خارجی تضادات پائے جاتے ہیں، فی الوقت ہم خارجی تضادات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے قرآن کے داخلی تضاد کو بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

﴿هُوَالَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (البقرة ٢٩)

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے

اس آیت میں یقینی طور پر زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہو رہا ہے، ﴿حوالے کے طور پر مومنین کے سلفِ صالحین کی کسی بھی تفسیر کا مطالعہ کریجئے﴾ اس آیت کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل امور کا علم ہوتا ہے کہ:

☆ اللہ نے زمین اور اس کے متعلقات کو تخلیق کیا یا بالفاظِ دیگر زمین اور اس سے متعلقہ ضروری اسباب کو عدم سے وجود میں لایا۔

☆ اللہ نے زمین اور اس کے متعلقات کو تخلیق کرنے کے بعد تخلیق کے دوسرے منصوبے یعنی آسمان کی تخلیق کی جانب رخ کیا اور سات آسمان تخلیق فرمائے۔

خلاصہ یہ کہ یہ آیت ترتیب تخلیق کی وضاحت کا فائدہ دے رہی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں کسے پہلے پیدا کیا گیا اور کسے بعد میں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ خود قرآن یہاں لفظ ثُمَّ استعمال کر رہا ہے اور عربی داں حضرات کے لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ لفظِ ثُمَّ تعقیب کا فائدہ دیتا ہے، لفظِ تعقیب کا مادّہ عقب ہے جس کا مطلب پیچھے ہے، اس لئے ثُمَّ جس جملے میں استعمال ہوتا ہے وہاں وقت کی تدریج کا علم ہوتا ہے کہ پہلے کیا واقعہ وجود میں آیا اور اس کے پیچھے یا بعد میں کیا واقعہ وجود میں آیا۔ مثلاً ہم عربی میں کہتے ہیں کہ جاءزید ثُمَّ بکر تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ زید آیا اور اس کے بعد بکر آیا۔ بکر کے بعد میں آنے پر لفظِ ثُمَّ دلالت کر رہا ہے اس جملہ سے کسی طور پر یہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ زید اور بکر کا آنا متوازی تھا اور دونوں کی آمد بیک وقت صادر ہوئی۔

اس تشریح وتوضیح کے بعد اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا قرآن یہی بات بیان کررہاہے کہ تخلیق زمین و آسمان میں اولاً زمین کو تخلیق کیا گیااور پھر اس کے بعد ﴿ثمّ﴾ آسمان کو تخلیق کیا گیا۔ مزید وضاحت وتصریح کیلئے ہم یہاں سورۃ فصّلت کی آیات نمبر ۹ تا ۱۲ کو بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت سند رہے۔

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٩﴾ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴿١١﴾ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿١٢﴾

ترجمہ: کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور (بتوں کو) اس کا مد مقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہان کا مالک ہے اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلبگاروں کے لئے یکساں۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس. نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ (خواہ) خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور (شیطانوں سے) محفوظ رکھا۔ یہ زبردست (اور) خبردار کے (مقرر کئے ہوئے) اندازے ہیں۔

ان آیات میں تو باقاعدہ ایام کی تقسیم کے ذریعے بالکل وضاحت کے ساتھ تخلیق کے مراحل کی مکمل تفصیل بیان کردی کہ اللہ نے پہلے زمین کو تخلیق کیا اور پھر متعلقاتِ زمین کو پیدا کیا اور یہ مرحلہ پایہ تکمیل تک پہنچا کر اللہ نے آسمانوں کو بنانے کا ارادہ کیا اور سات آسمانوں کو تخلیق کیا۔

اگر سورۃ البقرۃ کی آیات کے متعلق کوئی مؤمن یہ تصحیح کرنے کی کوشش بھی کرتا کہ سورۃ البقرۃ کی آیات میں مطلقاً تخلیق کا ذکر ہے، تخلیق کے مراحل کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ تو سورۃ الفصلت کی مذکورہ آیات نے اس غیر ضروری تصحیح کا باب بھی ہمیشہ کیلئے بند کردیا ہے کہ جب باقاعدہ تاریخ وار بیان کیا جارہا ہے کہ کب کس چیز کی تخلیق کی گئی ہے تو تخلیق میں جو تقدیم وتاخیر ہے وہ اب بالکل واضح ہوگئی ہے

اب آپ حضرات کی خدمت میں قرآن کی وہ آیات پیش کرتا ہوں جن کا مذکورہ بالا آیات کے ساتھ واضح طور پر تصادم اور تضاد ہے:

أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا ﴿٢٨﴾ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ﴿٢٩﴾ وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ﴿٣٠﴾ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا ﴿٣٢﴾

ترجمہ بھلا تمہارا بنانا آسان ہے یا آسمان کا؟ اسی نے اس کو بنایا☆ اس کی چھت کو اونچا کیا اور پھر اسے برابر کر دیا☆ اور اسی نے رات کو تاریک بنایا اور (دن کو) دھوپ نکالی☆ اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا☆ اسی نے اس میں سے اس کا پانی نکالا اور چارا اگایا☆ اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا☆

اب آپ خود ملاحظہ فرمایئے کہ سورۃ النازعات کی ان آیات میں تخلیق کا عمل بالکل الٹ گیا ہے اور اللہ واضح طور پر بیان کر رہا ہے کہ اللہ نے پہلے آسمان کو بنایا اور اس کی چھت کو اونچا کیا دن اور رات بنائے اور اس مرحلہ کی تکمیل کے بعد زمین کو بچھایا۔

سورۃ البقرۃ اور سورۃ الفصلت کی مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلے زمین کی تخلیق ہوئی اور بعد میں آسمان کی اور سورۃ النازعات کی ان آیات میں بیان کیا جارہا ہے کہ پہلے آسمان کی تخلیق ہوئی اور بعد میں زمین کی۔ ان آیات میں اللہ یا مصنفِ قرآن نے لفظِ ثمّ ذکر کرنے کا بھی تکلف نہیں فرمایا بلکہ صراحتاً بعد ذالک ﴿یعنی اور اس کے بعد﴾ کے الفاظ ذکر کر کے اپنی فاش غلطی پر مزید مہر تصدیق ثبت کر کے مومنین کی تمام تر تاویلات کا راستہ بھی بند کر دیا ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق کی ترتیب میں یہ انتشار آخر کہاں سے وقوع پذیر ہوا؟ خطائے انسانی یا عطائے ربّانی؟

آیا یہ انسانی نسیان ہے یا اللہ بھی بڑھاپے کے اثرات کی وجہ سے الزائمر کا شکار ہو جاتا ہے؟

اب کوئی بتلائے تو سہی کہ ہم بتلائیں کیا؟

کیا قرآن کے اپنے ہی بیان کردہ فارمولے کے تحت قرآن کا غیر اللہ کی جانب سے ہونا ثابت نہیں ہو جاتا؟

اور یہ تو ابھی مشت از خروارے کے مصداق ایک نمونہ بیان کیا ہے۔ مزید تضادات داخلی و خارجی اور تضادات عقلی و نقلی کیلئے انتظار فرمایئے۔

شوا بھی جاری ہے۔

کیا قرآن اللہ کا کلام ہے؟

سورۃ الآنفال

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ:

"اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے اس لیے کہ وہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے
اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا اور معلوم کر لیا کہ تم میں کس قدر کمزوری ہے پس اگر تم سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"

مذکورہ آیت میں ہمارے اعتراض کی بنیاد لفظ عَلِمَ ہے، جس کا مطلب معلوم ہونا ادراک کرنا اور جاننا ہے، یہ فعل انسانی خاصہ ہے، مومنین کا بیان کردہ خالق کائنات تو عالم الغیب ہے اور اسے تخلیق کائنات کے روز اول ہی سے آئندہ آنے والے تمام حالات بمعہ تمام تر تفصیلات کے معلوم ہیں، اسکے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، وہ پہلے سے سب کچھ جانتا ہے۔

آیت نمبر 66 کا ابتدائی حصہ قابل غور ہے جس میں کہا جارہا ہے کہ: اب اللہ نے تمہارے اوپر سے بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور اللہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ مسلمانوں میں کس قدر کمزوری آگئی ہے۔ یہ آیت واضح طور پر بیان کر رہی ہے جب اللہ نے اپنے سے دس (10) گنا زیادہ دشمن پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی تو اس وقت اللہ کے علم میں نہیں تھا کہ یہ حکم مسلمانوں کے لئے بھاری پڑ جائے گا، لہٰذا کچھ عرصہ کے بعد اللہ نے اس غلطی کا ادراک کرتے ہوئے اپنے پہلے حکم سے رجوع کر کے اپنی غلطی کی اصلاح کر لی، اور مسلمانوں کی استعداد کے مطابق نیا حکم جاری کیا کہ اب مسلمان اپنے سے دگنے دشمن پر حملہ کرتے وقت ثابت قدم رہیں اور پیٹھ نہ پھیریں۔

خالق کائنات کی جو صفات قرآن و حدیث میں بیان کی جاتی ہیں کہ وہ حکیم ہے، خبیر ہے، اول ہے آخر ہے، عالم الغیب ہے تو یہ آیت ان تمام صفات کا انکار کرتی ہے کیونکہ جس ذات میں مذکورہ صفات موجود ہوں وہ اس قدر فاش غلطی نہیں کر سکتی اس آیت سے واضح ہوتا ہے قرآن کا بیان کردہ کائنات کا خالق ایک اچھے منتظم ہونے کی بنیادی صلاحیت سے محروم ہے اور اسے اپنی غلطی کے ادراک کے بعد اپنے فیصلے تبدیل کرنا پڑتے ہیں۔ ایک عظیم منتظم اور مدبر حکیم جسے علم الغیب بھی حاصل ہو کبھی بھی ایسا حکم جاری نہیں کرے گا جو ماتحت افراد کی استطاعت پر گراں ہونے کے باعث ناقابل عمل ہو۔

تمام مسلمان اور مسلمان علماء یہ ایمان رکھتے ہیں اور خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ قرآن فصاحت اور بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور قرآن کا طرز بیان ہی دراصل قرآن کا اصل معجزہ ہے، اور قرآنی فصاحت وبلاغت پر کوئی حرف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ معذرت کے ساتھ عرض ہے ایسے فصیح و بلیغ متکلم کو اپنے اس اقدام کو بہتر پیرائے میں بیان کرنا نہیں آیا اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے سے عاجز رہا کیونکہ اگر اللہ کو پہلے سے ہی علم تھا کہ آیت نمبر 65 میں بیان کردہ حکم بعد میں تبدیل کر دیا جائے گا، تو آیت

نمبر66 میں موقع محل کی مناسبت سے آیت کو یوں بیان کیا جانا چاہیئے تھا کہ: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا ؕ صیغہء ماضی مطلق کی جگہ صیغہء ماضیٔ استمراری استعمال کیا جاتا جس کا ترجمہ پھر یوں ہوتا کہ: اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا اور اسے معلوم تھا کہ تم میں کس قدر کمزوری ہے۔ لیکن یہاں قباحت یہ ہے کہ اس ترمیم سے اللہ کے عالم الغیب ہونے پر جو اعتراض واقع ہو رہا تھا وہ تو ختم ہو جائے گا، مگر اللہ کی حکمت پر اعتراض کھڑا ہو جاتا ہے کہ اگر اللہ کو پہلے سے ہی اس بات کا علم تھا کہ یہ حکم مخاطبین کی استطاعت سے باہر ہے تو اولاً ایسا حکم جاری ہی کیوں کیا گیا۔ یہ تو سانپ کے گلے میں چھچھوندر والا معاملہ ہو گیا کہ نہ نگلی جائے نہ اگلی جائے۔

ہمارا نقطہ یہ نہیں ہے کہ نسخ و منسوخ خلاف عقل ہے، بلکہ عقل سلیم اس بات کا ادراک رکھتی ہے کہ ریاست کے قوانین میں بتدریج بہتری آتی ہے، ایک ریاست کے بہترین اذہان باہم مل کر ایک قانون کی منظوری دیتے ہیں اور پھر کچھ مختلف وجوہات کی بنیاد پر اس میں ترامیم بھی کرتے ہیں، یہ ترامیم ہر گز یہ دلالت نہیں کرتیں کہ قانون بنانے والے بہترین اذہان پہلے غلطی پر تھے، کیونکہ اگر قانون بنانے والے انسان ہوں گے تو ترامیم لازماً ہوں گی، یہی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ہمارا نقطہ یہ ہے کہ یہاں قانون سازی کوئی انسان انجام نہیں دے رہا بلکہ کائنات کی عظیم ترین ذات، رب العالمین، خالق دو جہاں، قادر مطلق جسے ہم اللہ تعالی کے نام سے جانتے ہیں اپنی عظیم ترین کتاب ﴿جو پیدائش کائنات کے وقت لوح محفوظ میں رقم کر دی گئی تھی اور جو رہتی انسانیت تک کے لئے ہدایت کا سامان ہے، اور جس کے بعد مزید کسی کتاب کی گنجائش تک موجود نہیں﴾ میں ایک حکم نافذ کرتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قانون انسانی قدرت سے باہر ہے لہذا نئے قانون کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ اول ایسا قانون ہی کیوں نافذ کیا گیا جو انسانی استطاعت سے باہر تھا؟ اور اگر ایسا کرنا ہی پڑا تو اس کی تعبیر ایسے الفاظ میں کیوں کی گئی جس میں انسانی نفسیات بالکل واضح طور پر جھلک رہی ہے اور الوہی صفات سے گریز پایا جا رہا ہے؟؟

خلاصہ کلام

نتیجہ ان آیات کے مطالعے سے یہ نکلتا ہے کہ قرآن کوئی الہامی کتاب نہیں ہے، بلکہ کسی انسان ہی کا کلام ہے، جس کی بشریت آیت نمبر 66 میں واضح طور پر جھلک رہی ہے۔ کیونکہ اگر یہ کلام الٰہی ہوتا تو اللہ تو عالم الغیب ہے وہ کبھی بھی یہ نہ کہتا کہ اسے اب اس بات کا علم ہوا ہے کہ حکم اول نا قابل عمل ہے، لہٰذا حکم اول منسوخ کر کے حکم ثانی جاری کیا جاتا ہے۔

مومنین کیلئے دعوت فکر ہے.

وما مسنا من لغوب

بیشتر مذاہب کا اپناہی ایک قصہ ء تخلیق ہے تاہم تخلیق سے پہلے کیا صورتحال تھی یہ بتانے میں انہیں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے.

قوموں کے فرق سے ان تخلیق کے قصوں میں بھی فرق رہا، ہر قوم کا قصہ ء تخلیق اس کے اپنے ماحول کی پیداوار تھا، سب نے خدا کی تصویر کشی اپنے تصور کے حساب سے کی، مثال کے طور پر جن قوموں کا انحصار شکار پر تھا ان کے قصہ ء تخلیق کا شکار سے گہرا تعلق تھا.

یہودیوں نے اپنے زمانے میں رائج قصہ ء تخلیق میں اپنے ذوق کے حساب سے تبدیلیاں کر کے اسے اپنایا، چنانچہ ان کا قصہ ء تخلیق یوں شروع ہوتا ہے کہ خدا موجود تھا اور اس نے کائنات کو سات دنوں میں بنایا، ہر دن کائنات کا ایک حصہ تخلیق کیا، یہودیوں کے بعد جب عیسائیوں کی باری آئی تو انہوں نے یہودیوں کے اس قصہ ء تخلیق کو ایک مسلم حقیقت کے طور پر اپنایا، اسلام نے بھی عیسائیوں کی طرح یہودیوں کے اسی افسانوی قصے پر انحصار کیا کہ خدا نے یہ کائنات چھ دنوں میں بنائی.

ان توحیدی مذاہب میں کائنات کو چھ یا سات دنوں میں تخلیق کرنے کا یہ افسانوی قصہ صدیوں تک ایک مسلم حقیقت رہا، مگر جب علوم اور دریافتوں نے ترقی کی اور علم زمین اور کائنات کی عمر دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ان مذاہب کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں جو یہ سمجھتے تھے کہ تخلیق کا عمل عین اسی طرح ہوا تھا جیسا کہ ان کے مذہبی افسانوں میں درج ہے، یوں ان توحیدی مذاہب کے مولوی دفاعی پوزیشن پر آگئے اور مقدس کلام کی وہ تاویلیں نکالنی شروع کر دیں جو اس سے پہلے ان کے کسی وڈیرے نے نہ تو کبھی کی تھی اور نا ہی کبھی خواب میں ہی سوچا تھا، یوں اچانک دنوں کو زمانوں میں بدل دیا گیا اور کہا گیا کہ خدا کا مقصد زمینی دن نہیں تھا بلکہ یہ "کوئی اور" ہی دن ہے! اب خدا کا دن ہمارے دنوں کا ایک ہزار یا پچاس ہزار گنا طویل ہوگیا، اگر ہم اسلام کی بات کریں اور حدیث سے رجوع کریں تو یہ ثابت کرنا چنداں مشکل نہیں کہ یہ دن وہی عام دن ہیں جو ہمارے جانے پہچانے ہیں نا کہ ہزاروں سالوں پر مشتمل دن جیسا کہ زغلول وہارونی ٹولہ لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا پھرتا ہے.. الواحدی کی اسباب النزول میں سورہ ق کی آیت 38 کے اسباب نزول میں یوں درج ہے:

769– أخبرنا أحمد بن محمد التميمي قال: أخبرنا عبد الله بن محمد بن جعفر الحافظ قال: أخبرنا إبراهيم بن محمد بن الحسن قال: أخبرنا هناد بن السري قال: حدثنا أبو بكر بن عياش عن أبي سعد البقال، عن عكرمة عن ابن عباس: أن اليهود أتت النبي –صلى الله عليه وسلم– فسألت عن خلق السماوات والأرض فقال: "خلق الله الأرض يوم الأحد والاثنين، وخلق الجبال يوم الثلاثاء [وما فيهن

من المنافع]، وخلق یوم الأربعاء[الشجر والماء]، وخلق یوم الخمیس[السماء]، وخلق یوم الجمعة النجوم والشمس والقمر”. قالت الیهود: ثم ماذا یا محمد؟ قال: ”ثم استوی علی العرش”. قالوا: قد أصبت لو تممت ثم استراح. فغضب رسول الله –صلی الله علیه وسلم– غضبا شدیدا. فنزلت: (ولقد خلقنا السماوات والأرض وما بینهما فی ستة أیام وما مسنا من لغوب فاصبر علی ما یقولون)

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور زمین وآسمانوں کی تخلیق کے بارے پوچھا تو فرمایا کہ: اللہ نے زمین اتوار و پیر کے دن بنائی، اور پہاڑ منگل کے دن بنائے اور بدھ کے دن درخت اور پانی بنایا اور جمعرات کے دن آسمان بنایا اور جمعہ کے دن ستارے سورج اور چاند بنایا، تو یہودیوں نے کہا: پھر کیا اے محمد؟ فرمایا: پھر وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا، یہودیوں نے کہا: درست کہا اور اگر آپ پورا کریں تو پھر آرام فرمایا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غصہ آگیا تو آیت نازل ہوئی کہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو مخلوقات ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنادیا اور ہمکو ذرا بھی تھکن نہیں ہوئی۔۔ سورہ ق آیت 38.

یہاں اظہر من الشمس ہے کہ دنوں سے مراد وہی عام دن ہیں جو ہم جانتے ہیں، خدا نے بھی اس واقعے پر جو آیت نازل کی اس میں اس نے اپنے پیغمبر کی بات کی تائید ہی کی اور ایسی کوئی تصحیح نہیں فرمائی کہ جناب آپ نے جو دن بتائے ہیں وہ آپ کے عام دن نہیں ہیں بلکہ ہزاروں سالوں پر مشتمل ہیں وغیرہ، چنانچہ یہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خدا قادر مطلق نہیں ہے بلکہ ایک مادی چیز ہے.. کیوں؟

کیونکہ اگر یہ وہ خدا ہوتا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کن کہتا ہے اور سب کچھ ہو جاتا ہے تو اسے زمین وآسمان کو بنانے میں چھ دن جتنا طویل وقت لگانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، یوں منطقی طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ خدا ایک عاجز خدا ہے جسے ایک معمولی سی تخلیق کے لیے اتنا وقت لگانا پڑا، اس طرح وہ اپنی قدرت کھو دیتا ہے، اگر وہ کوئی آدمی ہوتا تو بات سمجھ میں آنے والی تھی مگر خدا اتنا وقت لگائے یہ یقیناً ناممکن ہے..؟؟

اس کے علاوہ وہ آیات جو یہ کہتی ہیں کہ خدا نے زمین وآسمان چھ دن میں بنائے یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ خدا ایک مادی چیز ہے اور "دن" کے زمان کا پابند ہے... دن کی تعریف کیا ہے؟ دن ایک زمانی مدت ہے جو ہر سیارے پر مختلف ہوتی ہے، زمین پر اس کا دورانیہ 24 گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ایک دن اور ایک رات شامل ہوتی ہے جو زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کی وجہ سے متواتر رہتے ہیں، مختصراً یہ کہ ایک دن کسی ستارے کے تابع کسی سیارے کی اپنے محور کے گرد گردش کے ایک چکر پر مشتمل ہوتا ہے، اگر ہم اس اصول کو خدا پر لاگو کر دیں تو کیا ہوگا؟ خدا اپنی ہی بنائی ہوئی ایک مصیبت میں پھنس جائے گا کیونکہ یہ کیسے

ہو سکتا ہے کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے خدا کسی وقت کا پابند ہو؟ یعنی کائنات کو تخلیق کرتے وقت وہ کس حرکت کا پابند تھا؟ کیا اس کائنات کے اس سورج کا جسے ہم روز دیکھتے ہیں؟ مگر قرآن کے مطابق زمین آسمانوں سے پہلے بنائی گئی تھی اور جب آسمان بشمول ان کے ستاروں کے موجود ہی نہیں تھے تو وہ کس دن کی پابندی کر رہا تھا؟ زمین کی تخلیق کے وقت وہ کس حرکت کا پابند تھا؟.. عجیب بات یہ ہے کہ زمین کو بنانے میں اسے چار دن لگے جبکہ سورج چاند اور کھربوں کھربوں ستاروں اور سیاروں کو بنانے میں اسے محض دو دن لگے..؟! تخلیق کی اس نامعقول ترتیب اور مدت سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ خدا کا کسی سیارے کی حرکت کا پابند ہونا کس قدر معقول ہے؟ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ جناب زمین وآسماں وں کو تخلیق کرنے سے پہلے بھی "کچھ "موجود تھا تب بھی سوال برقرار رہتا ہے؟ خدا کا کسی وقت کا پابند ہونے کا مطلب ہے کہ وہ ایک مادی چیز ہے اور مکان میں جگہ گھیرتا ہے، یہ وہ خدا نہیں ہے جس کے جیسا اور کوئی نہیں.. کیا خدا کا اپنی مخلوقات کی حرکت کا پابند ہونا معقولیت کے دائرے میں آتا ہے؟ اور کیا واقعی اس خدا جیسی کوئی چیز نہیں ہے جبکہ وہ میری طرح کچھ بنانے کے لیے دنوں کا پابند ہے؟؟

مصیبت یہ ہے کہ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ ہم کس مصیبت میں ہیں!؟

انصاف کا فسانہ

جب ابتدائی انسان نے کچھ شعور پکڑا تو اپنے تجربے سے اسے یہ معلوم ہوا کہ طاقتور ہی ہمیشہ زیادہ تر چیزوں پر قابض ہو جاتا ہے اور اس طرح کمزوروں پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے، اسی صورتحال کا سامنا جاگیر داروں اور تاجروں کی صورت میں بھی رہا جنہوں نے اقلیت ہونے کے باوجود صرف طاقت کے بل بر اقلیت پر مظالم ڈھائے اور ان کا استحصال کیا، اس صورتحال کے حتمی نتیجے کے طور پر انسان نے "انصاف "کا مفہوم ایجاد کیا جو ہر انسانی معاشرے کے تمام افراد میں مساوات کا مظہر تھا، مگر یہ خوبصورت نظریاتی مفہوم نظریاتی ہی رہا اور حقیقی دنیا میں اس کا اطلاق انتہائی مشکل ثابت ہوا، مگر انسان پھر بھی اس کا مشتاق رہا، یہی وجہ ہے کہ جب انسان نے آسمانی خداؤں کا نظام ایجاد کیا تو کچھ خداؤں کو انصاف کی صفت بھی مرحمت فرمادی تا کہ وہ اسے طبعی آفتوں، برے انسانوں کے شر اور برائی کے خدا سے نجات دلا سکے، پھر اس نے افسانے گھڑے جن میں اچھائی کا خدا برائی کے خدا سے لڑ کر مظلوم انسانوں کی نصرت کرتا اور انہیں بچاتا ہے، مگر انصاف کا مفہوم پھر بھی افسانوں اور قصے کہانیوں تک ہی سمٹا رہا اور انسانی معاشروں میں اس کا اطلاق نہ ہو سکا۔

پھر اتفاق سے وہ مشہورِ زمانہ تینوں توحیدی مذاہب کہیں سے نمودار ہوئے اور دعوی کیا کہ خدا ہی انصاف ہے اور اس کے انصاف جیسا کوئی انصاف نہیں ہے، مگر ان مذاہب نے جب یہ فرمایا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت میں بنایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے تب وہ اپنی بات میں ہی تضاد کا شکار ہوگئے، کیونکہ اگر انسان خدا کی صورت میں ہی بنایا گیا ہے جو عین انصاف ہے اور اس کی روح خدا کی روح کا ہی حصہ ہے تو پھر دنیا میں ظلم اور برائی کے انبار کہاں سے لگ گئے؟ کئی فلسفیوں نے اس تضاد کو حل کرنے کی بھرپور کوششیں کی مگر ناکام رہے، چنانچہ صورتحال سے تنگ آکر بیل Bayle نے کہا کہ:

1- یا تو خدا دنیا سے ظلم اور برائی کا خاتمہ چاہتا ہے مگر کر نہیں سکتا

2- یا پھر وہ ایسا کر سکتا ہے مگر کرنا نہیں چاہتا

3- یا وہ نا چاہتا ہے اور نا ہی کر سکتا ہے

4- یا تو چاہتا ہے اور قادر ہے

اگر پہلے مفروضے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو خدا کمزور ثابت ہوگا اور خدا ہونے کے لائق نہیں رہے گا، اگر دوسرے مفروضے کو درست تسلیم کیا جائے تو خدا حاسد قرار پائے گا جو انسان کی زندگی پر حسد کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پر اپنے ظلم جاری وساری رکھے اور اسے سکھ کا سانس نہ لینے دے، اگر تیسرے مفروضے کو تسلیم کر لیا جائے تو خدا کمزور ہوگا اور خدا ہونے کے قابل نہیں رہے گا، اور اگر آخری یعنی چوتھا مفروضہ درست ہے یا درست تسلیم کر لیا جائے یعنی خدا دنیا سے ظلم وبرائی کا خاتمہ کر سکتا ہے اور ختم کرنا بھی چاہتا ہے تو پھر دنیا میں ظلم وبرائی کی موجودگی ناممکن ہے.. مگر چونکہ دنیا میں ظلم وبرائی موجود ہے چنانچہ یہ امر یقینی ہے کہ یہ ظلم خدا کی روح سے ہی آرہا ہے جو اس نے انسان میں پھونکی جس وہ ظالم بن گیا، سوزن نیمن (Susan Neiman) اپنی کتاب ایول ان ماڈرن تھاوٹ (Evil in Modern Thought) میں رقمطراز ہیں کہ: "شاید کائنات کی خوبصورتی اور اس کے قوانین کا نظم وضبط خالق کی حکمت کے گواہ ہوں، مگر مخلوق جو خالق کی صورت میں بنائی گئی اس حکمت کی عکاسی نہیں کرتی، چنانچہ اگر ہم نسلِ انسانی کی تاریخ اور اس کے مظالم پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خالق کی حکمت اور خوبصورتی کی صفات ایسی صفات ہیں جن کا دفاع نہیں کیا جا سکتا".

اس ضمن میں اگر اسلامی خدا کی بات کی جائے تو وہ کہتا ہے:

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ (سورہ الذاریات آیت 56)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

یعنی انسان کو تخلیق کرنے کی پہلی اور آخری وجہ محض اس کی عبادت ہے اور جو اس کی عبادت نہیں کرے گا وہ گویا اپنے وجود کی وجہ سے انحراف کا مرتکب ہو گا اور خدا اسے سخت ترین سزا دے گا، اگر خدا انصاف پسند ہو تا تو انسان کو اپنی عبادت کے لیے پہلے سے ہی پروگرام شدہ بناتا اگر اسے تخلیق کرنے کا مقصد محض اپنی عبادت ہی کروانا تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس قرآن میں ایسی بہت ساری آیات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگ جنہیں خدا نے تخلیق کیا ہے اس کی عبادت نہیں کرتے:

1-اَفَمَن کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّن رَّبِّہٖ وَیَت لُو ہُ شَاہِدٌ مِّن ہُ وَمِن قَب لِہٖ کِتٰبُ مُو سٰی اِمَامًا وَّرَح مَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ
یُؤ مِنُو نَ بِہٖ ؕ وَمَن یَّک فُر بِہٖ مِنَ ال اَح زَابِ فَالنَّارُ مَو عِدُہٗ ۚ فَلَاتَکُ فِی مِر یَۃٍ مِّن ہُ ☆ اِنَّہُ ال حَقُّ
مِن رَّبِّکَ وَلٰکِنَّ اَک ثَرَ النَّاسِ لَایُؤ مِنُو نَ (سورہ ہود آیت 17)

بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن رکھتے ہوں اور انکے ساتھ ایک آسمانی گواہ بھی اسکی جانب سے ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ہو جو پیشوا اور رحمت ہے تو کیا وہ قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے؟ یہی لوگ تو اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اور فرقوں میں سے اس سے منکر ہو تو اس کا ٹھکانہ آگ ہے تو تم اس قرآن سے شک میں نہ ہونا۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

2-وَاتَّبَع تُ مِلَّۃَ اٰبَآءِی اِب رٰہِی مَ وَاِس حٰقَ وَیَع قُو بَ ؕ مَاکَانَ لَنَا اَن نُّش رِکَ بِاللّٰہِ مِن
شَی ءٍ ؕ ذٰلِکَ مِن فَض لِ اللّٰہِ عَلَی نَاوَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَک ثَرَ النَّاسِ لَایَش کُرُو نَ (سورہ یوسف آیت 38)

اور میں اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے مذہب پر چلتا ہوں۔ ہمیں شایاں نہیں ہے کہ کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک بنائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور لوگوں پر بھی۔ لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

3-وَمَا اَک ثَرُ النَّاسِ وَلَو حَرَص تَ بِمُؤ مِنِی نَ (سورہ یوسف آیت 103)

اور بہت سے آدمی گو تم کتنی ہی خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

4-الٓمّٓرٰ ۟ تِل کَ اٰیٰتُ ال کِتٰبِ ؕ وَالَّذِی اُن زِلَ اِلَی کَ مِن رَّبِّکَ ال حَقُّ وَلٰکِنَّ اَک ثَرَ النَّاسِ لَا
یُؤ مِنُو نَ (سورہ الرعد آیت 1)

آلمرا۔ اے نبی یہ کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں۔ اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

5-وَلَقَدۡ صَرَّفۡنٰہُ بَیۡنَہُمۡ لِیَذَّکَّرُوۡا ۫ۖ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوۡرًا (سورہ الفرقان آیت 50)

6-وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَہُمۡ اَکۡثَرُ الۡاَوَّلِیۡنَ (سورہ الصافات آیت 71)

اور ان سے پیشتر بہت سے پہلے لوگ بھی گمراہ ہوگئے تھے۔

7-اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (سورہ غافر آیت 59)

قیامت تو آنے والی ہے اسکے آنے میں کچھ شک نہیں۔ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔

مزید یہ کہ خدا نے لوگوں کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جہنم کو ان سے اور جنوں سے بھی بھر دے گا:

1-قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡہَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنۡکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (سورہ الاعراف آیت 18)

اللہ نے فرمایا نکل جا یہاں سے پاجی۔ مردود جو لوگ ان میں سے تیری پیروی کریں گے میں ان کو اور تجھ کو جہنم میں ڈال کر تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

2-وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلَا یَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِیۡنَ ﴿118﴾ۙ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَلِذٰلِکَ خَلَقَہُمۡ ؕ وَتَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿119﴾ (سورہ ہود)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا اور وہ برابر اختلاف کرتے رہیں گے۔۔ مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم فرمائے اور اسی لئے اس نے انکو پیدا کیا ہے اور تمہارے پروردگار کا قول پورا ہو گیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

3-وَلَوۡ شِئۡنَا لَاٰتَیۡنَا کُلَّ نَفۡسٍ ہُدٰىہَا وَلٰکِنۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ مِنِّیۡ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ (سورہ السجدہ آیت 13)

اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔ لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پاچکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

4-لَام۟لَ- ٘ ٗ نَّ جَہَنَّمَ مِن۟ک وَمِمَّن۟تَبِعَکَ مِن۟ہُم۟اَج۟مَعِی۟نَ (سورہ ص آیت 85)
کہ میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

یہاں خدا کہتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی ملت پر پیدا کرتا مگر اس نے انہیں مختلف پیدا کیا تاکہ "میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا" کا جواز پیدا کیا جاسکے.. معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ "وہ برابر اختلاف کرتے رہیں" جیسا کہ سورہ ہود کی آیات 118 اور 119 میں کہا گیا ہے چنانچہ وجہ تخلیق یہی ہے حالانکہ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ اس نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے بنایا ہے اور اب کہتا کہ انہیں اس لیے بنایا ہے تاکہ وہ آپس میں اختلاف کر سکیں، چاہے ہم وجہ تخلیق کے اس تضاد سے صرف نظر کر بھی لیں، کیا انصاف پسند خدا کو یہ زیب دیتا ہے جو سارے انسانوں کو ایک امت وملت پر پیدا کر کے ان کے درمیان اختلاف کے امکانات ختم کر سکتا تھا، انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور کئی مذاہب پر محض اس لیے پیدا کرے تاکہ انہیں جہنم میں بھرنے کا اپنا کیا ہوا وعدہ وفا کر سکے؟ اور اگر خدا انصاف پسند ہوتا تو کیا وہ اپنی نافرمانی کرنے والے ابلیس کو قیامت تک اپنے بندوں کو بہکانے کے لیے کھلا چھوڑ دیتا؟ کیا یہ انصاف ہے کہ جنہیں محض اپنی عبادت کے لیے بنایا انہیں بہکانے کے لیے ابلیس کو زندہ چھوڑ دیا جائے؟ اور کیا یہ انصاف ہے کہ لوگوں کو محض ایک ہی وجہ یعنی اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا جائے اور عبادت نہ کرنے پر انہیں بھون ڈالا جائے؟ ان لوگوں کا کیا جن سے اگر پوچھا جاتا تو وہ پیدا ہونا ہی پسند نہ کرتے؟ خدا انہیں پیدا کرنے سے پہلے انہیں یہ اختیار دے سکتا تھا کیونکہ اس نے آدم کی پیٹھ سے اس کی ساری اولاد کو نکال کر ان سے قسم لی اور پھر انہیں آدم کی پیٹھ میں واپس کر دیا.

اور کیا یہ انصاف ہے کہ خدا لوگوں کو بہکائے اور جب وہ بہک جائیں انہیں سزا دے جیسا کہ سورہ انعام کی آیت 125 میں کہا کہ:

فَمَن۟یُّرِدِاللّٰہُ اَن۟یَّہ۟دِیَہٗ یَش۟رَح۟صَد۟رَہٗ لِل۟اِس۟لَامِ۟ وَمَن۟یُّرِد۟اَن۟یُّضِلَّہٗ یَج۟عَل۟صَد۟رَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ۟کَذٰلِکَ یَج۟عَلُ اللّٰہُ الرِّج۟سَ عَلَی الَّذِی۟نَ لَا یُؤ۟مِنُو۟نَ
تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اس طرح اللہ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ خدا مجرموں کی طرح مکر بھی کرتا ہے (وَاللّٰہُ خَی۟رُال۟مٰکِرِی۟نَ –اللہ سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے– سورہ انفال آیت 30) بلکہ اس کا مکر مجرموں کے مکر سے کہیں بڑھ کر ہے، وہ اپنی آیات پر یقین نہ کرنے والوں کو گھیر کر

غلطیاں کرواتا ہے پھر انہیں ان غلطیوں کی سزا دیتا ہے (وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ— اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا انکو ہم بتدریج اس طرح پکڑیں گے کہ انکو معلوم ہی نہیں ہوگا۔ سورہ الاعراف آیت 182). استدراج یعنی Baiting کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے اور اسے ہر انسانی معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کو ایسے جرائم کرنے کی شہہ دیتا ہے جو کہ اگر کوئی اسے شہہ نہ دلاتا تو وہ کبھی نہ کرتا، کیا انسانی قوانین خدا کے قوانین سے زیادہ باانصاف ہیں؟

اور کیا انصاف پسند خدا کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کی سزا بے گناہوں کو دے؟ لیکن قوم لوط، عاد اور ثمود بلکہ کئی دیگر قوموں کے ساتھ اس نے یہی کیا جب پورے کے پورے گاؤں اور شہر بمع مکینوں کے محض اس لیے نیست و نابود کردیے کیونکہ ان میں سے کسی اقلیت نے فحش کام کیے تھے یا صالح کی اونٹنی کے پیر کاٹ دیے تھے؟ ان معاشروں میں بچوں کا کیا قصور تھا؟ کیا انہوں نے یہ منکر کیا تھا یا اونٹنی کے پیر کاٹنے میں مدد دی تھی؟ اور چاہے انہوں نے حصہ لیا بھی ہو کیا دنیا کے تمام قوانین یہ نہیں کہتے کہ بالغ ہونے تک بچے اپنے قول و فعل کے ذمہ دار نہیں ہیں؟

اب ہم جانتے ہیں کہ طبعی آفتیں جیسے زلزلے طوفان وغیرہ خدا کے انتقام کا ذریعہ نہیں ہوسکتے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کیوں اور کیسے ہوتے ہیں، یہ ایسے صحرائی یا پہاڑی علاقوں میں بھی آسکتے ہیں جہاں ایسا کوئی بھی نہیں رہتا جنہیں خدا سزا دینا چاہتا ہو!! کیا اس سے خدا کی ایمان داری اور انصاف مشکوک نہیں ہوجاتا جو کہتا ہے کہ اس نے ان طبعی آفتوں کے ذریعے شہروں کے شہر تباہ کردیے؟ نومبر 1755 میں سپین کے شہر برسیلونا میں آنے والے زلزلے کے بعد یہ نقطہ یورپی فلسفیوں کے ہاں بھی زیرِ بحث رہا، زلزلے کے بعد ایک سونامی آیا اور ہزاروں انسان، جانور، گھر سب تباہ و برباد ہوگئے، اس وقت عیسائی پادریوں کا فرمان تھا کہ زلزلہ خدا کی طرف سے اس شہر کے مکینوں پر عذاب تھا کیونکہ انہوں نے تفتیشی عدالتیں قائم کرکے عیسائیت کی ساکھ کو نقصان پہنچایا، مگر وہ یہ بتانے سے قاصر رہے کہ زلزلے کی وجہ سے کئی گرجے تو تباہ ہوگئے مگر شہر میں قائم ایک فاشی کا اڈہ کیونکر محفوظ رہا؟!.

جرمن فلاسفر لیبنز Gottfried Leibniz نے شر کو تین قسموں میں تقسیم کیا جن میں ایک طبعی شر Natural evil ہے جو ان تکالیف پر مشتمل ہے جو انسانوں کو اپنی زندگی میں درپیش ہوتے ہیں، دوسری قسم اخلاقی شر Moral evil ہے جو ان جرائم پر مشتمل ہے جو انسان سے سرزرد ہوتے ہیں جن کی سزا طبعی شر ہوتا ہے، اور تیسری قسم غیبی یا مابعد الطبیعاتی شر Metaphysical evil ہے جو کہ مادہ کی فرسودگی ہے اور مادے کی اسی فرسودگی کی وجہ سے زلزلے اور دیگر طبعی آفتیں آتی ہیں چنانچہ ان کی وجہ سے خدا کو الزام نہیں دینا چاہیے، اگر اس بیان کو تسلیم کرلیا جائے کہ اخلاقی شر وہ جرائم ہیں جن کا ہم

ارتکاب کرتے ہیں تو کیا یہ انصاف ہے کہ خدا ان جرائم کی پاداش میں انسان کو دنیا میں طبعی آفتوں کی صورت میں سزا دے پھر آخرت میں انہی جرائم کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم برد کر دے اور جب بھی ان کی چمڑی جل کر خاکستر ہو جائے اسے نئی چمڑی سے بدل دے؟

اصولی طور پر سزا جرم کی مناسبت سے دی جانی چاہیے یا جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ Punishment must befit the crime اگر کوئی شخص 65 سال جیتا ہے جس میں کہ پندرہ سال بچپنے کی عمر ہے جس میں وہ مکلف نہیں ہے تو کیا پچاس سال خدا کی نافرمانی کرنے پر ہمیشہ ہمیشہ کی سزا انصاف کے عین مطابق ہے؟ کیا یہ سزا جرم سے راست متناسب ہے؟ پچاس سال کی نافرمانی پر خدا اسے پچاس سال کی سزا کیوں نہیں دیتا؟

بعض جرائم جن کی سزا انسان کو ازل تک ملتی رہے گی متعین ہی نہیں ہیں مثلاً قرآن میں ملتا ہے کہ:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ
یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِکَ لَھُمْ
خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (سورہ المائدہ آیت 33)

جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ بری طرح قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے غائب کر دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں انکی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار ہے۔

یہاں جرم کا کوئی تعین نہیں ہے، انسان اللہ سے کیسے لڑ سکتا ہے؟ اور یہ فساد کون سا ہے؟ چاہے فقہاء فساد کی نوعیت کا تعین بھی کر لیں تب بھی سزا جرم کی نوعیت کے حساب سے متعین نہیں ہے، بعض کو بری طرح قتل کیا جاسکتا ہے، یا سولی پر چڑھایا جاسکتا ہے یا ہاتھ پاؤں کاٹے جاسکتے ہیں یا ملک بدر بھی کیے جاسکتے ہیں، اب ملک بدر ہونے والے کو قتل کیے جانے والے یا ہاتھ پاؤں کاٹے جانے والے سے کم سزا ملی اگرچہ جرم ایک ہی ہے یعنی خدا سے لڑائی یا زمین پر فساد.. اسی پر بس نہیں.. یہ سب تو محض دنیا میں ہے آخرت میں مزید ایک بہت بڑا بھاری عذاب ان کا منتظر ہے.. کیا ایک ہی جرم پر دو دفعہ سزا دینا انصاف کے عین مطابق ہے؟

سزا کے حوالے سے اگر احادیث سے رجوع کیا جائے تو وہ کچھ ملتا ہے کہ جسے پڑھ کر سر کے بال بھری جوانی میں ہی سفید ہو جائیں:

عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ سے گذرے (جہاں قبریں تھیں) تو (دو قبر والوں کے بارے میں) فرمایا (اِنَّھُمَا لَیُعَذَّبَانِ ومایُعَذَّبَانِ مِن کَبِیرٍ اَمَّا اَحَدُھُمَا فَکَانَ یَسعَی بِالنَّمِیمَۃِ وَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَکَانَ لَایَستَتِرُ من بَولِہِ) (اِن دونوں کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں ہو رہا تو اِن میں ایک تو چغلی کیا کرتا تھا اور دوسرا خود کو اپنے پیشاب (کی چھینٹوں) سے بچایا نہیں کرتا تھا)

(صحیح البُخاری / حدیث ۱۲۹۵ / کتاب الجنائز / باب ۸۰، صحیح مسلم / حدیث ۲۹۲ / کتاب الطہارہ / باب ۳۴

کیا خود کو پیشاب کی چھینٹوں سے نہ بچانے جیسے معمولی جرم کے لیے۔اگر یہ واقعی جرم ہے۔قبر میں ہمیشہ کے لیے ایسی دردناک سزا دینا کہ اگلے کی چیخیں تک قبر سے باہر آ رہی ہوں، انصاف ہے؟ کیا ایسی احادیث سے خدا کے انصاف پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے جس نے فضول قسم کی باتوں کے لیے دردناک ترین سزائیں متعین کر رکھی ہیں؟

اور اگر احادیث میں بچوں کے انجام کے بارے دیکھا جائے تو تعجب خیز مواد ملتا ہے مثلاً: حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عقبہ ابن معیط کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا تو (اس نے) کہا کہ (میرے بچوں کو کون پالے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آگ"۔(ابو داؤد)، سیوطی کی الحاوی للفتاوی میں ہے کہ: رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزِ قیامت بغیر سر کے بچوں کو لایا جائے گا تو اللہ تعالی کہیں گے: تم کون ہو، تو وہ کہیں گے: ہم مظلوم ہیں، اللہ تعالی کہیں گے: تم پر کس نے ظلم کیا ہے، وہ کہیں گے: ہمارے آباء مردوں سے ہمبستر ہوتے تھے اور ان میں اپنی منی خارج کرتے تھے، اللہ تعالی کہیں گے: انہیں آگ میں لے جاؤ اور ان کے ماتھے پر لکھ دو اللہ کی رحمت سے مایوس.

جو خدا کسی بچے کو محض اس لیے جہنم برد کر دیتا ہو کہ اس کے باپ نے بدر میں نبی سے جنگ کی تھی، اور جو خدا بچوں کے سر کاٹ کر انہیں اپنی رحمت سے مایوس کر کے محض اس لیے جہنم رسید کر دیتا ہو کیونکہ ان کے آباء نے مردوں سے لواطت کی اور اپنی منی ان میں خارج کی، ایسا خدا انصاف کے مفہوم کے عین مطابق منصف کہلائے گا؟

اس میں شک نہیں کہ اسلامی خدا جسے ایک مرد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس کے دو ہاتھ پیر ہیں اور جو اپنے عرش پر بھی بیٹھتا ہے جسے آٹھ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہے کا انصاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اور اگر کوئی مسلمان یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کا خدا عادل و منصف ہے تو پھر یہ یقیناً ایک ایسا خدائی انصاف ہو گا جسے ہم نہیں جانتے.

انہی وجوہات کی بناء پر بعض فلسفیوں نے جیسے ہیگل نے خدا کی موت کا اعلان کر دیا جبکہ کچھ دوسروں فلسفیوں نے جیسے روسو نے کہا کہ خدا رحیم ہے مگر ہمیں اس کی اور اس کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے، فریڈریک اینگلز نے کہا کہ: "نسلِ انسانی تب تک آزاد نہیں ہو سکتی جب تک وہ خدا کو دیے ہوئے اپنے اختیارات واپس نہیں لے لیتی" چنانچہ خدائی انصاف ہمیشہ افسانہ ہی رہے گا کیونکہ خدا انسان ہے اور انسان اب تک اپنی زندگی میں انصاف قائم نہیں کر سکا ہے.

معجزہ اور قرآن

اسلامی تاریخ ہمیشہ ان تمام تصورات کو جو پہلے سے متعین کردہ فریم سے نکلنے کی کوشش کرتے تھے ضائع کرتی رہی جس کی وجہ سے بہت سارے مُتون کا انجام نامعلوم رہا جبکہ ان کے مصنفین کا انجام قتل، قید اور ملک بدری کے مابین جھولتا رہا، تاہم تمام وجوہات مذہبی نہیں تھیں جس قدر کہ سیاسی تھیں جو مذہب کی آڑ لیے ہوئے تھیں کیونکہ جیسا کہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اسلام میں تلوار ہمیشہ مذہب کی بنیاد پر نہیں اُٹھائی گئی.

اگر مسلمان متکلمین اور فلسفیوں کو پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے زیرِ بحث موضوعات بہت جرات مندانہ تھے، انہوں نے ایسے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر آج کے دور میں بات کرنا غالب کے بقول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، دیگر موضوعات کی طرح قرآن کا معجزہ بھی ایک ایسا شجرِ ممنوعہ تھا جسے یہ مسلمان مفکرین زیرِ بحث لائے، اگرچہ اسلامی تاریخ اسے زندقہ قرار دیتی ہے مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ لوگ ان الزامات سے بہت دور اور مبرا تھے کیونکہ وہ اس قدر گہرے موضوعات پر بحث کرتے تھے جو فقہائے دین کے احاطہ فہم سے باہر تھے یہی وجہ ہے کہ ان فقہاء نے اسے اسلامی مملکت کی آئیڈیالوجی کی خدمت کے لیے استعمال کیا.

(1) ابن الراوندی قرآن پر کہتے ہیں: "اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ فصاحت میں عرب کا کوئی قبیلہ دیگر قبائل سے بڑھ کر ہو، اور اس قبیلے کا کوئی ایک گروہ باقی قبیلے سے زیادہ فصاحت رکھتا ہو، اور اس گروہ میں کوئی ایک شخص باقیوں سے زیادہ فصیح ہو... اب فرض کریں کہ اس کی فصاحت کی شہرت سارے عرب میں پھیل گئی تو عجم پر اس کا کیا حکم ہے جو زبان نہیں جانتے اور ان پر اس کی کیا حجت ہے؟!" اسی سیاق میں ابن الراوندی آگے لکھتے ہیں: "تمہارا دعوی ہے کہ معجزہ قائم اور موجود ہے جو کہ قرآن ہے، اور کہتے ہو کہ "جسے انکار ہو وہ اس کے جیسا لا کر دکھائے" تو اگر تم برتر کلام چاہتے ہو تو ہم بلغاء، فصحاء اور شعراء کے کلام سے اس کے جیسا ہزار لا سکتے ہیں جس کے الفاظ اس سے زیادہ رواں، معانی میں بے تحاشا مختصر، ادائیگی اور عبارت میں بلیغ اور تناسق میں باکمال ہو گا، تو اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہم تم سے وہی مطالبہ کرتے ہیں جو تم ہم سے کرتے ہو" ابن الراوندی کی

بات سے پتہ چلتاہے کہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہر متن اور مصنف کا اپنا ایک اسلوبی پہلو ہوتا ہے جو اسے باقی لکھاریوں اور تخلیق کاروں سے ممتاز کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر یا مصنف کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے جس کی نقل کرنا تقریباً نا ممکن ہوتا ہے، یوں یہ چیلنج دے کر وہ بتارہے ہیں کہ یہی حجت حریف پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی انسان کسی دوسرے کے جیسی کوئی چیز نہیں لا سکتا(2) کیونکہ تخلیق کی مثال جیسا کہ جابری کہتے ہیں ڈرائینگ، مجسمہ سازی، فلسفہ اور فکر کی طرح ہے جس کی نقل نہیں کی جاسکتی کیونکہ تعریف میں نقل "تخلیق" نہیں ہے(3).

ابو بکر الرازی کا خیال ہے کہ اگر کسی کتاب میں کوئی معجزہ ہے تو اسے دینی کتابوں میں نہیں بلکہ علمی کتابوں میں ہونا چاہیے، اس ضمن میں وہ کہتے ہیں: "واللہ اگر کسی کتاب کا حجت ہونا واجب ہوتا تو وہ انجنیئرنگ اور ریاضی کی کتابیں ہوتیں جن سے افلاک اور سیاروں کی حرکت کا علم حاصل ہوتا ہے، اور منطق اور طب کی کتابیں جن میں بدن کی منفعت کے علوم ہیں یہ کتابیں ایسی کتابوں سے زیادہ حجت کی حقدار ہیں جن سے نا تو کوئی نفع ہوتا ہے نا نقصان اور نا ہی کوئی مستور (پوشیدہ) ظاہر ہوتا ہے (یعنی قرآن)" وہ مزید لکھتے ہیں: "ہم اس سے بہتر شعر، بلیغ خطبے اور خوبصورت رسائل لا سکتے ہیں جو اس سے زیادہ فصیح اور باکمال ہوں گے، قرآن میں ایسا کوئی فضل نہیں ہے، یہ محض کلام کے باب میں ہے".

قرآنی معجزے کا تعلق دو معاملات سے رہا، ایک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ان پڑھ ہونا اور دوسرا اسے تقدس کی چادر میں لپیٹ کر ایک اعلی فنی قیمت دینے کی کوشش کرنا تاہم امیت کا مسئلہ زیادہ اہم رہا کیونکہ اسے متن کی قدر یا ویلیو بڑھانے کے لیے "استعمال" کیا گیا تاکہ اسے انسانی تصنیف نہ کہا جائے تاہم اس زمانے میں امیت کا مطلب ان پڑھ ہونا نہیں تھا اور نا ہی ان پڑھ ہونا کوئی معجزے کی علامت ہے، بلکہ اس کے برعکس پڑھنا لکھنا بلیغ کلام کہنے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے کیونکہ بلیغ باتیں پڑھنے لکھنے سے مشروط نہیں ہیں، عرب کے شعراء اور خطیب بغیر کسی سابقہ تیاری کے شعر کہتے اور خطبے پڑھتے تھے(13) یوں ایک زبانی ثقافت میں جہاں پڑھنے لکھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی استثناء حاصل نہیں ہے، تو پھر امیت سے معجزے کا قیاس کیسے کیا جائے؟

حوالہ جات:

1- تاریخ الالحاد فی الاسلام، عبد الرحمن بدوی، سینا للنشر، دوسرا ایڈیشن 1993.

2- تاریخ الالحاد فی الاسلام، صفحہ 253.

3- مدخل الی القرآن الکریم، پہلا اڈیشن 2006صفحہ 83.

4- مدخل الی القرآن الکریم، صفحہ 83.

الکلام الفرقان فی خزعبلات الدکتور جواد خان

لگتاہے اس پانچویں فیل سے بڑے بڑے مومنین کو خطرہ لاحق ہو گیاہے، یہی وجہ ہے کہ میری ہر تحریر پر کوئی نہ کوئی مومن لمبا چوڑارد لکھ مارتاہے، شروع میں ردبڑے سادہ اور روایتی تھے، لیکن میرے سمجھانے پر کچھ فرق پڑاہے، خصوصاًمیرے عزیز دوست ڈاکٹر جواد خان صاحب کو اب ”ردود“لکھنے کا سلیقہ آگیاہے اور اب وہ صرف قرآن سے ہی نہیں بلکہ سابقہ مقدس کتابوں کی بھی خوب ورق گردانی کرکے دلائل پیش کرتے ہیں، پہلے کی طرح میری ” قرآن اور اسرائیلیات “ پر بھی دوعدد ردود منظرِ عام پر آئے، پہلارد اگرچہ اچھا قرار دیا جاسکتاہے مگر روایات سے ہٹ کر اس میں کوئی نیاپن نہیں تھا اس لیے میں نے بھی اسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھا، تاہم ڈاکٹر جواد خان صاحب کارد اتنا کمال کا تھا کہ میں اسے نظر انداز نہ کرسکا، مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انہوں نے ”رد“ کا حق ادا کردیا، مگر افسوس کہ انہوں نے میری جس تحریر کارد لکھا اس کے اصل مقصد کو سمجھا ہی نہیں اور بات کسی اور نہج پر لے گئے، اگر وہ مضمون کے ”مضمون“ پر رہتے ہوئے بات کرتے اور اصل مدعے کو رد کرتے تو شاید میری بھی کچھ اصلاح ہو جاتی.

بہر حال جو بھی ہے، میرے عزیز جراح کو یقین تھا کہ میں ان کے ”رد“ کا ”رد“ ضرور لکھوں گا کیونکہ اپنی تحریر میں وہ جابجا مجھ سے ٹیڑھے میڑھے سوالات کرکے مجھے ”رد“ لکھنے پر اکسا رہے تھے، اور مجھے یقین ہے کہ عوام کو بھی اس رد کے رد کا بڑی بے

صبری سے انتظار ہوگا، اور اتنی عوام کو مایوس کرنا میں گناہِ کبیرہ سمجھتا ہوں

تو چلیے دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی زنبیل میں کیا کیا معجزات ہیں..

پہلا سوال یا اعتراض وہ یوں اٹھاتے ہیں:

”مکّی صاحب نے اپنے مضمون کی ابتدا قرآنی آیات سے کی. طرفہ تماشہ یہ کہ انکے مضمون میں قرآن کی آیات جو کہ کفّار کے اظہار لاتعلقی کے طور پر پیش کی جارہی تھیں، موصوف نے انھیں کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کا الزام بنادیا. سورہ الانعام کی آیات ۲۵ یا سورہ الانفال کی آیت ۳۱ میں الزام یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم کوئی الہامی کتاب نہیں ہے اور یہودیوں کی کتاب

کاچربہ ہے (نعوذ وباللہ) بلکہ کفّار مکّہ کا یہ اظہار لا تعلق تھا کہ جس میں وہ کہتے تھے کہ یہ تم کیا گئے گزرے زمانوں کی باتیں کرتے ہو اور کیا پرانی داستانیں سناتے رہتے ہو"

کیا مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں کفار نے یہ الزام نہیں لگایا کہ قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اس طرح کا کلام وہ خود بھی کہہ دیں؟ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے تو کیا اس سے یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ یہ کہانیاں انہوں نے پہلے بھی سن رکھی تھیں اور جب قرآن نے آکر وہی کہانیاں دوبارہ دہرا دیں تو انہیں اس میں کوئی نیا پن نظر نہیں آیا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کہا کہ یہ "اساطیر الاولین" پر مشتمل ہے جنہیں وہ خوب جانتے ہیں، یہ بات میرے فاضل دوست بھی مان رہے ہیں اور میرا مقصد بھی اسی بات کی طرف توجہ دلانا تھا.

"پتہ نہیں فاضل مضمون نگار کے یہاں درستگی اور اور خطا کا کیا مفہوم ہے مگر یہ بات سب کو معلوم ہے کہ موجودہ الہامی کتب تحریف شدہ ہیں اور ان کتابوں میں تحریف ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ عیسائی علما بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے. بائبل شاید دنیا کی واحد کتاب ہے جس پر اتنی بار نظر ثانی ہو چکی ہے کہ جس کی نظیر کسی بھی الہامی کتاب کے لئے نہیں ملتی. یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ حضرت مّکی جیسے فاضل شخص کی علم سے باہر ہو سکتی ہے"

میں نے اس پورے مضمون میں کہاں کہا ہے کہ موجودہ الہامی کتابیں تحریف شدہ نہیں ہیں؟ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے؟

پھر میرے فاضل دوست تفسیر ابن کثیر سے اسرائیلیات کے حوالے سے کچھ اقتباس کر کے فرماتے ہیں:

"یہاں تفسیر ابن کثیر کے اقتباسات پیش کرنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ اسرائیلیات کا دین اسلام میں کہاں تک دخل ہے اور اسکے نقل کرنے میں کن اصولوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے"

یہ میرے دوست کی تسلی کے لیے کافی ہو گا میرے لیے نہیں، کیونکہ اسرائیلیات کا دخل اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ میرے فاضل دوست سمجھتے ہیں، میرے مضمون میں جن اسرائیلیات کا تذکرہ کیا گیا تھا میرے فاضل دوست نے ان میں سے ایک کا بھی تسلی بخش جواب دینا ضروری نہیں سمجھا، مثلاً میں نے کہا تھا کہ حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ شاہ سرجون الاکادی کا ہے، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ سورہ مائدہ کی آیت 45 میں وارد قانون در حقیقت حمورابی کے قوانین سے آیا ہے، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کا قانون جاہلیت میں بھی موجود تھا، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ حج جاہلیت کی ایک رسم تھی اور ایسے کئی دیگر

الزامات لگائے تھے جن پر سارے مضمون کا دارومدار تھا مگر میرے فاضل دوست کا یا تو تجاہل عارفانہ کمال کا ہے یا پھر وہ رد کرنے سے قاصر تھے.

اس سے آگے وہ فرماتے ہیں:

"مصدر اور خدائی پیغام ایک ہی ہے لہٰذا واقعات کا ایک جیسا ہونا زیادہ اچھنبے کی بات ہے بجائے واقعات کے ایک جیسا ہونے کے"

نہیں جناب ان دونوں سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ واقعات کے مقامات اور کردار کہیں اور ثابت ہو رہے ہوں..

ڈاکٹر صاحب خاتم الانبیاء پر جہالت کا الزام لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے"

یہ دنیا کا سب سے بڑا مذاق ہے، ایک طرف جس نبی کی شان میں دن رات قصیدے گائے جاتے ہیں اسی نبی کو ان پڑھ جاہل قرار دے کر اسے معجزے کا نام دے دیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت میں انہیں جاہل کہنے والے خود سب سے بڑے جاہل ہیں (تعمیم ہے تخصیص نہیں)، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے لمبی چوڑی تجارت سنبھال رکھی ہو اور اسے پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو؟ اور کیا "اُمی" کا مطلب ان پڑھ ہے؟ کیا نبوت کا دارومدار وحی پر ہے یا پڑھنے لکھنے پر؟ جائیے اور ان کے ان پڑھ ہونے کے قوی ترین ثبوت جو آپ کو مل سکیں ڈھونڈ کر لائیے، پھر اس کے بعد میں آپ کو ثابت کردوں گا کہ وہ ان پڑھ جاہل نہیں تھے پھر بیٹھ کر فیصلہ کریں گے کہ گستاخِ رسول کون ہے اور اس کے معیارات کیا ہیں..!؟

اس کے بعد میرے فاضل دوست کچھ بائبلی خرافات نقل کرکے فرماتے ہیں:

"اگر قرآن کریم کسی بھی کتاب کی نقل ہے تو یہ خرافات قرآن کریم میں کیوں نقل نہیں ہوئیں؟ کیوں یہ کتابیں خدا کا ایک اعلیٰ وارفع اور منطقی تصور پیش کرنے میں قرآن کریم کے برعکس ناکام ہیں؟"

میں نے کب کہا کہ میں ان کتابوں پر یقین رکھتا ہوں؟ اور کیا کسی کتاب میں خرافات کا نہ ہونا اسے مقدس بنا دیتا ہے؟ عجیب منطق ہے..!! اور کیا آپ کے خیال میں قرآن میں خرافات نہیں ہیں؟ اگر آپ کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو ایک نمونہ پیش کرنا چاہوں گا:

وَّاَنَّا لَمَس◌ْنَا السَّمَآءَ فَوَجَد◌ْنٰهَا مُلِئَت◌ْ حَرَسًا شَدِی◌ْدًا وَّشُهُبًا ۙ﴿۸﴾ وَّاَنَّا كُنَّا نَق◌ْعُدُ مِن◌ْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّم◌ْعِ ؕ فَمَن◌ْ يَّس◌ْتَمِعِ ال◌ْاٰنَ يَجِد◌ْ لَه' شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴿۹﴾ سورہ جن، آیت 8 اور 9

اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسکو مضبوط چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا۔- اور یہ کہ پہلے ہم وہاں بہت سے مقامات پر فرشتوں کی باتیں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ اب کوئی سننا چاہے تو اپنے لئے انگارہ تیار پاتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّن◌ْيَا بِزِی◌ْنَةِ◌ ال◌ْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾ وَحِف◌ْظًا مِّن◌ْ كُلِّ شَي◌ْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُو◌ْنَ اِلَى ال◌ْمَلَاِ ال◌ْاَع◌ْلٰى وَيُق◌ْذَفُو◌ْنَ مِن◌ْ كُلِّ جَانِبٍ ☆ۖ ﴿۸﴾ دُحُو◌ْرًا وَّلَهُم◌ْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾ اِلَّا مَن◌ْ خَطِفَ ال◌ْخَط◌ْفَةَ فَاَت◌ْبَعَه' شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

بیشک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے سجایا۔ اور ہر شیطان سرکش سے اسکی حفاظت کی۔ کہ اوپر کی مجلس کی طرف کان نہ لگا سکیں اور ہر طرف سے ان پر انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ یعنی وہاں سے نکال دینے کو اور انکے لئے ہمیشہ کا عذاب ہے۔ ہاں جو کوئی فرشتوں کی کسی بات کو چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے تو جلتا ہوا انگارہ اسکے پیچھے لگ جاتا ہے۔

وَلَقَد◌ْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّن◌ْيَا بِمَصَابِی◌ْحَ وَجَعَل◌ْنٰهَا رُجُو◌ْمًا لِّلشَّيٰطِی◌ْنِ وَاَع◌ْتَد◌ْنَا لَهُم◌ْ عَذَابَ السَّعِی◌ْرِ ﴿۵﴾

اور ہم نے قریب کے آسمان کو تاروں کے چراغوں سے زینت دی اور انکو شیطانوں کے مارنے کا آلہ بنایا اور ان کے لئے دہکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

چلیے کسی فلکیات دان کے پاس چلتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ ہمارا قرآن کہتا ہے کہ ستارے اور شہابیے محض شیطانوں کو مار بھگانے کے آلوں کے سوا کچھ نہیں ہیں پھر دیکھتے ہیں کہ ہمیں کتنے جوتے پڑتے ہیں..!؟ (ہم سے مراد میں بھی جوتے کھانے والوں میں شامل ہوں)

رہی بات کہ "کیوں یہ کتابیں خدا کا ایک اعلیٰ وارفع اور منطقی تصور پیش کرنے میں قرآن کریم کے برعکس ناکام ہیں" تو قرآن کون سا کامیاب رہا؟ ایک پتھر کے گرد چکر لگانے اور اسے چومنے چاٹنے میں اور کرشن بھگوان اور گائے ماتا کے آگے سرنگوں ہونے میں کیا فرق ہے؟ اور کیا اس صورت میں گائے ان پتھروں سے زیادہ فائدہ مند نہیں؟

پھر میرے فاضل دوست نے بائبل سے بقول ان کے کچھ "فحش" اقتباسات پیش کر کے فرمایا:

"کیا فاضل مضمون نگار کو انبیا علیہم صلواۃ السلام سے منسوب گھناؤنی، بیہودہ اور انتہائی فحش داستانیں، (معاذ اللہ) قرآن مجید میں نظر آتی ہیں"

کیا آپ واقعی ایسا سمجھتے ہیں؟ یا آپ کی آنکھوں پر تقدس کی پٹی اس قدر کس کے بندھی ہے کہ آپ کو کچھ نظر نہیں آتا؟ آپ کی اجازت سے ایک اور نمونہ پیشِ خدمت ہے:

وَجَآءَاہ◌ لُ ال◌ مِدِی◌ نَۃِیَس◌ تَب◌ شِرُو◌ نَ ﴿٦٧﴾ قَالَ اِنَّ ہٰٓؤُلَآءِ ضَی◌ فِی◌ فَلَاتَف◌ ضَحُو◌ نِ ﴿٦٨﴾ وَ اتَّقُوااللّٰہَ وَلَاتُخ◌ زُو◌ نِ ﴿٦٩﴾ قَالُو◌ اَوَلَم◌ نَن◌ ہَکَ عَنِ ال◌ عٰلَمِی◌ نَ ﴿٧٠﴾ قَالَ ہٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِی◌ اِن◌ کُن◌ تُم◌ فٰعِلِی◌ نَ ﴿٧١﴾

اور آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے [٥٦] لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھ کو رسوا مت کرو [٥٧] اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ [٥٨] بولے کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا جہان کی حمایت سے [٥٩] بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے [٦٠] (سورہ الحجر)

یہ کیسے نبی ہیں جو لونڈوں کو بچانے کے لیے اپنی بیٹیاں اجتماعی آبروریزی کے لیے مسٹنڈوں کو پیش کر رہے ہیں؟ کیا یہ بے ہودہ اور انتہائی فحش داستان نہیں؟ مجھے پتہ ہے کہ آپ سورہ حجر کی آیت نمبر 71 کی کیا تاویل پیش کریں گے، میں چاہتا ہوں کہ آپ وہ تاویل پیش کریں کیونکہ لغوی، منطقی، اور سیاقی لحاظ سے اس احمقانہ تاویل کی دھجیاں بکھیرنے میں تبھی مزہ آئے گا.. اور ہاں یہ کہانی سابقہ مقدس کتابوں کے عین مطابق ہے.

میرے دوست مزید فرماتے ہیں:

"ان الزامات کوڈاکٹر ذاکر نائیک نے نہایت خوبصورت اور محکم دلائل کے ساتھ رد کیا ہے. ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر آپ قرآن اور بائبل کا جائزہ لیں تو کی مقامات پر ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے. لیکن اگر آپ انکا گہرائی سے تجزیہ کریں تو ان میں خفیف سا فرق نظر آئے گا. اس فرق کو اگر آپ سائنسی معلومات کی روشنی میں دیکھیں تو یہ ۲ باتیں ثابت ہو جائیں گی. ایک قرآن کریم نے قصّوں کو نقل نہیں کیا ہے اور دوسری سائنسی معلومات کی روشنی میں قرآن کریم کی حقانیت بھی کھل کر ثابت ہو جاتی ہے"

ڈاکٹر ذاکر نائک کی میں عزت کرتا ہوں، لیکن جہاں بات قرآن سے سائنس کشید نے کی آتی ہے تو ان میں اور ہارون یحیی جیسے جعلساز میں کوئی فرق نہیں رہتا، ایسے لوگ ہمہ وقت ہر جدید سائنسی دریافتوں کو کیچ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، اور پھر اپنا سارازور قرآن میں ایسی کسی آیت کی تلاش میں لگا دیتے ہیں تا کہ یہ ثابت کر سکیں کہ قرآن میں یہ جدید ترین علمی دریافت اگر ازل سے نہیں تو کم سے کم چودہ سو سال پہلے سے ضرور موجود تھی!! میرے خیال سے ماہرینِ علومِ ارض (Geology) حضرت موسی علیہ السلام کے سمندر کو اپنے عصا سے چیر دینے کے عمل کو سائنسی طور پر بیان کر کے انتہائی راحت محسوس کریں گے، نا ہی طبیعات دانوں اور کیمیاء دانوں کو سائنسی طور پر یہ سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ اچانک "بردوسلام" کیسے ہو گئی، نا ہی فلکیات دانوں کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی پش و پیش ہو گا کہ شہابیے اور دمدار ستارے دراصل شیطانوں کو مار بھگانے کے لیے کام آتے ہیں تا کہ وہ فرشتوں اور خدا کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکیں..!؟

ہر جدید سائنسی دریافت منظر عام پر آنے کے بعد ہی قرآن سے کیوں بر آمد ہوتی ہے؟ اسے دن رات طوطے کی طرح رٹنے والے ایسی سائنسی دریافتیں کیوں نہیں کر سکے؟ کیا سائنسدان قرآن کو پڑھ کر یہ سائنسی دریافتیں کرتے ہیں؟ نہیں جناب وہ تو قرآن کو مانتے ہی نہیں، تو پھر وہ ایسے کارنامے کیسے انجام دے لیتے ہیں؟ کیونکہ وہ اپنی عقل کا استعمال کرتے ہیں جو اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے پاس نہیں ہے، جب انسان نے ترقی کی منزلیں اپنی عقل کے استعمال سے ہی طے کرنی ہیں تو مقدس کتابوں میں سائنس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہندو بھی اپنی مقدس کتابوں سے سائنس بر آمد کر لیتے ہیں تو کیا آپ مان لیں گے کہ یہ خدا کی اتاری ہوئی کتابیں ہیں؟ یہودی اور عیسائی بھی اپنی اپنی مقدس کتابوں سے سائنس بر آمد کرتے ہیں تو پھر آپ انہیں کیوں نہیں مانتے؟

ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں:

"بائبل (پیدائش ۱:۳-۵) کہتی ہے کہ خدا نے دن اور رات کی تخلیق پہلے دن کی. دوسری طرف بائبل کے ہی مطابق (پیدائش-۱:۱۴-۱۹) ستارے چوتھے دن تخلیق کے گئے. جو کہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے. اگر ستارے نہیں ہوں تو دن اور رات کا ہونا ممکن نہیں. دن اور رات کا ہونا سورج کے بغیر ممکن نہیں. قران کریم اس کے بر عکس اس طرح کا کوئی بیان دیتا نظر نہیں آتا. اگر فاضل مضمون نگار کو اس طرح کے کسی بیان کا علم ہوتا تو مجھے قوی یقین تھا کہ وہ ایک لمحہ ضایع نہیں کرتے اپنا فیصلہ سنانے میں. سوال پھر وہیں آجاتا ہے کہ اگر قران کریم کسی کتاب کی نقل ہے تو یہ مضحکہ خیزیاں قران میں کیوں نہیں؟"

بھئی دوسرے کی آنکھ میں تنکا بھی ہو تو نظر آجایا کرتا ہے، اور اپنی آنکھ میں شہتیر بھی ہو تو نظر نہیں آتا، چلیے میں آپ کو ایسی ہی ایک مضحکہ خیزی قرآن سے نکال کر دیتا ہوں:

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٩﴾ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴿١١﴾ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿١٢﴾

کہو کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور بتوں کو اس کا مد مقابل بناتے ہو۔ وہی تو تمام جہانوں کا مالک ہے۔ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا سب چار دن میں۔ اور تمام طلبگاروں کے لئے یکساں۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر اس نے دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اسکے کام کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں یعنی ستاروں سے سجایا اور شیطانوں سے محفوظ رکھا۔ یہ اسی زبردست باخبر کے مقرر کئے ہوئے اندازے ہیں۔

یہاں پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمین دو دن میں بنائی گئی، پھر پہاڑ اور سامان معیشت چار دن میں بنائے گئے، (یعنی وہ دو دن جو زمین کو بنانے میں صرف ہوئے ان میں حیرت انگیز طور پر پہاڑ شامل نہیں تھے!!)، پھر سات آسمان دو دن میں بنائے، یعنی زمین، پہاڑ اور سامانِ معیشت چھ دن میں بنائے گئے جبکہ سات آسمان دو دن میں بنائے گئے، کیا یہ معقول بات ہے کہ زمین جیسا ادنی سا سیارہ جس کی اس کائنات کی وسعت کے سامنے کوئی وقعت نہیں کو بنانے میں چھ دن صرف ہوئے جبکہ سات آسمان بشمول اپنی

وسعتوں اور کہکشاؤں کے صرف دو دن میں بنا لیے گئے!؟ اور اگر زمین اور تمام طلبگاروں (مخلوقات) کے لیے سامانِ معیشت آسمانوں سے پہلے بنائے گئے تو بغیر سورج کے وہ کیسے زندہ تھے!؟ چلیے اسی تناظر میں ایک اور تضاد دیکھتے ہیں:

ءَانْ تُم اَشَدُّ خَل قًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰہَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَم کَہَا فَسَوّٰىہَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغ طَشَ لَی لَہَا وَ اَخ رَجَ ضُحٰہَا ﴿۲۹﴾ وَال اَر ضَ بَع دَ ذٰلِکَ دَحٰىہَا ﴿۳۰﴾ اَخ رَجَ مِن ہَا مَآءَہَا وَ مَر عٰہَا ﴿۳۱﴾ وَال جِبَالَ اَر سٰہَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّکُم وَ لِاَن عَامِکُم ﴿۳۳﴾

بھلا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا؟ اللہ نے اسکو بنایا۔ اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کر دیا۔ اور اسی نے رات تاریک بنائی اور دن کو دھوپ نکالی۔ اور اسکے بعد زمین کو پھیلا دیا۔ اسی نے زمین میں سے اسکا پانی نکالا اور چارہ اگایا۔ اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدے کے لئے کیا۔

اب یہاں آسمان زمین سے پہلے بنایا گیا!! مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کھلے تضاد ان شاء اللہ میرے جراح کے ایمان کو قطعی متزلزل نہیں کر سکتے کیونکہ وہ الحمدللہ وراثتی مسلمان ہیں، اور عقل استعمال کرنے سے خدا نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔

"چاند اور سورج دونوں روشنی دیتے ہیں" کے عنوان کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"بائبل کے مطابق (پیدائش–۱۶:۱)" خدا نے دو روشنیاں تخلیق کیں۔ بڑی روشنی دن میں اجالا کرتی ہے اور چھوٹی روشنی رات میں" جبکہ سائنسی طور پر یہ بات صاف ہے کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں لہٰذا اسکی روشنی کے بارے میں تخلیق کا لفظ استعمال کرنا غلط ہے۔ کیا فاضل مضمون نگار جانتے ہیں کہ قران کریم چاند اور سورج کی روشنیوں کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ قرآن کریم سورہ نوح میں کہتا ہے کہ:

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۱۶:۷۱)

اور چاند کو ان میں (زمین) کا نور بنایا ہے اور سورج کو چراغ ٹھیرایا ہے۔

کیا عربی میں مہارت رکھنے والے مّکی صاحب بتانا پسند کریں گے کے قرآن کریم میں سورج اور چاند کی روشنیوں کے حوالے سے الگ الگ الفاظ کیوں استعمال ھوئے؟ چاند کے لئے قران کریم میں قمر کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسکی روشنی کے لئے "منیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ عکسی روشنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا فاضل مضمون نگار بتانا پسند کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کو چودہ سو سال پہلے یہ حقیقت کس نے بتائی تھی کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہے؟ پھر وہی سوال کہ اگر قرآن کریم نقل ہے تو یہ کیسی نقل ہے کہ جو سائنسی غلطیوں کو نقل نہیں کرتی؟"

یہاں جراح صاحب نہ صرف مجھے چونا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اپنی ہی باتوں میں تضاد کا شکار ہیں، آیت کے ترجمہ میں وہ کہتے ہیں کہ چاند زمین کا نور ہے تو دوسری طرف کہتے ہیں کہ "اسکی روشنی کے لئے "منیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے"، کوئی مجھے بتائے گا کہ مذکورہ آیت میں لفظ "منیر" کہاں ہے؟

اور چونا مجھے یوں لگا رہے ہیں کہ ترجمہ میں قوسین میں لفظ "زمین" فٹ کر رہے ہیں جو کہ سیاق وسباق کے لحاظ سے بالکل غلط ہے،

یہ تو وہی بات ہوگئی کہ "فویل للمصلین" کہ نمازیوں کی خیر نہیں ، اس آیت کا مفہوم پچھلی آیت کے بغیر ناقص ہے، دیکھیے:

اَلَم ◌ تَرَو ◌ اکَی ◌ فَ خَلَقَ اللّٰہُ سَب ◌ عَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿ۙ۱۵﴾ وَّجَعَلَ ال ◌ قَمَرَ فِی ◌ ہِنَّ نُو ◌ رًا وَّجَعَلَ الشَّم ◌ سَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾
(سورہ نوح)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے سات آسمان کیسے اوپر تلے بنائے ہیں۔—اور چاند کو ان میں روشن بنایا ہے اور سورج کو چراغ بنا دیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ جو اوپر تلے سات آسمان بنائے گئے ہیں چاند کو "ان میں" (فِی ◌ ہِنَّ) روشن بنایا ہے اور سورج کو چراغ، یعنی یہاں جو چاند اور سورج ہیں وہ ان ساتوں آسمانوں کے درمیان کہیں پر واقع ہیں اور انہیں روشن اور منور کر رہے ہیں!! یہ ہمارے جانے پہچانے چاند اور سورج نہیں ہیں، سو یہ قرآنی تضادات میں سے ایک اور تضاد ہے، روشنیوں کے حوالے سے الگ الگ الفاظ کے استعمال کو تو رہنے ہی دیجیے.

ڈاکٹر صاحب "آدم پہلے انسان تھے جو ۵۸۰۰ سال پہلے دنیا میں تھے" کے عنوان کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"جبکہ علوم آثار قدیمہ اور ارضیات کے مطابق ۱۰ ہزار سال یا اس سے بھی پہلے تک انسان کی اس زمین پر موجودگی کے شواہد موجود ہیں. بائبل کے اس بیان کے برعکس قرآن کریم میں اس طرح کا کوئی بیان نہیں جس میں انبیاء کے درمیان زمانوں کا

درست وقت بتایا گیا ہو. کیا فاضل مضمون نگار یہ بتانا پسند کریں گے کہ کیا چیز تھی جسے قرآن کریم کو اس بظاہر دلچسپ تاریخ کو نقل کرنے سے روکا؟"

بڑا ہی سادہ ساجواب ہے، یقیناً بائبل کی کاربن کاپی بنانا مقصود نہیں تھا... ہے نا..! اور کیا پتہ اس وقت یہ باتیں بائبل میں ہوں ہی نا، بعد میں ڈالی گئی ہوں!

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور قابلِ غور اعتراض کہ:

"تلمودی اور مدراشی اسرائیلیات کے ذیلی عنوان میں حضرت مکّی نے سورہ نمل کی آیت ۱۸ کے حوالے سے ابن کثیر سے متعلق آدھی بات نقل کی ہے حالانکہ اگر پوری تحریر کا حوالہ دیتے تو بات صاف ہو جاتی کہ ابن کثیر نے کیا بات اور کیوں کی. آگے چل کے ابن کثیر اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"نوف بکالی کہتے ہیں یہ بھیڑیے کے برابر تھی. ممکن ہے کہ اصل لفظ ذباب ہو یعنی مکھی کے برابر اور کاتب کی غلطی سے وہ ذیاب لکھ دیا گیا ہو یعنی بھیڑیا""

پہلی بات تو یہ ہے کہ کتابت کی یہ غلطیاں کہاں کہاں واقع ہوئی ہیں؟ کوئی اس کی ضمانت دے سکتا ہے؟ اس طرح جملہ تفاسیر واحادیث اپنے آپ ہی مشکوک ہو جاتی ہیں کہ ان میں کتابت کی غلطیوں کی کوئی ضمانت نہیں، دوسری بات یہ کہ جہاں ڈاکٹر صاحب کا منقولہ بیان موجود ہے وہیں پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

ومن قال من المفسرین: إن ھذاالوادي کان بأرض الشام أو بغیرہ، وإن ھذہ النملۃ کانت ذات جناحین کالذباب، أو غیر ذلک من الأقاویل، فلا حاصل لھا.

"مفسرین میں سے کچھ نے کہا: کہ یہ وادی شام کی زمین یا کہیں اور تھی، اور یہ کہ اس چیونٹی کے مکھیوں کی طرح پر تھے، اور اس طرح کی دیگر باتیں، تو یہ باتیں غلط (لا حاصل) ہیں.

یعنی ابن کثیر خود ہی دیگر مفسرین کی اس تفسیر کو کہ یہ چیونٹی مکھی کے برابر تھی مسترد کر رہے ہیں اور بھیڑیے والی بات پر قائم ہیں، اس طرح میں نے درست ترین تفسیر پیش کی جسے میرے فاضل دوست ناقص بیان نقل کر کے قاری کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، ثبوت کے طور پر تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر دیکھیے.

ڈاکٹر صاحب اسی طرح کا ایک اور الزام بھی لگاتے ہیں کہ:

"پھر آگے چل کر صحیح مسلم کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے گول مول بات کی ہے کاش جناب کّی اس حدیث کا حوالہ بھی دے دیتے تو کتنا اچھا ہوتا؟"

شاید میرے فاضل دوست کو حدیث کے آخر میں بارہ(12) کا عدد نظر نہیں آیا جو حوالے کے لیے تھا، خیر جب آپ جانتے ہی ہیں کہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے تو پھر اعتراض کس بات کا؟ اس طرح تو حدیث اور قوی ہو رہی ہے اور میری بات کو مزید اثبات مل رہا ہے.

حضرت نوح کی عمر کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب گویا ہیں کہ:

"میرا سوال جناب کّی سے سائنس کے ادنیٰ طالبعلم کی حثیت سے یہ ہے کہ عقل ۹۵۰ سال زندہ رہنے کو کیوں تسلیم نہیں کرتی؟ کیا انکے پاس کچھ ایسے سائنسی حقائق ہیں جن کی مدد سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ ۹۵۰ سالہ زندگی ناممکنات میں سے ہے"

یہی سوال میرا ان سے ہے کہ کیا آپ ایسے سائنسی دلائل پیش کر سکتے ہیں کہ کسی انسان کا 950 سال زندہ رہنا ممکن ہے؟ جہاں تک عقل کے تسلیم کرنے کی بات ہے تو آپ قرآن میں آئی کس کس چیز کو عقلیا سکتے ہیں؟

اب ڈاکٹر صاحب کے سب سے بڑے ایمان افروز جھوٹ کی طرف آتے ہیں جسے وہ "فرعون اور اسکے لشکر کی غرقابی" کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں اور جسے وہ بقول ان کے "رعمسیس دوئم (Merneptah) کی لاش کی دریافت اور اسکی موت کے سلسلے میں ہوئی جدید طبّی تحقیقات" قرار دیتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رمسیس دوم کی ممی ہی دراصل موسیٰ (علیہ السلام) کا فرعون ہے اور یہ کہ رمسیس دوم کی لاش فرانس لے جائی گئی جہاں ڈاکٹر موریس بوکلے نے جو مسلمان ہو گئے تھے لاش پر تحقیق کر کے یہ ثابت کیا کہ "اسکی موت کھوپڑی اور گردن کی ہڈیاں ٹوٹنے سے ہوئی ہے. لاش پر نمک کی تہہ اس بات کا ثبوت تھی کہ اسکی موت ڈوبنے اور پانی کے انتہائی شدید دباؤ کا نتیجہ تھی" جس سے علمی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نہ صرف رمسیس دوم ہی فرعون ہے بلکہ سورہ یونس کی آیت نمبر 92 کی حقانیت بھی ثابت ہو جاتی ہے چنانچہ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن بالیقین اللہ تعالیٰ کی ہی اتاری ہوئی کتاب ہے.

جس کسی نے بھی یہ "ایمان افروز" قصہ گھڑا اسے دادنہ دینا زیادتی ہوگی کہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایمان اندھا ہوتا ہے، اور جب انسان کی بنیاد ہی خرافات کے یقین پر کھڑی ہو تو ایسے لوگوں کو کسی بھی طرح الزام نہیں دیا جا سکتا کہ جب ان کا خدا ہی عقل سے فارغ ہو تو اس کے "عباد" پر کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنی عقل استعمال نہ کریں..!!

کیا قرآن کی حقانیت کے ثبوت کے لیے فرعون کی لاش کا دریافت ہونا لازمی تھا؟ اگر لاش دریافت نہ ہوتی تو کیا قرآن پر شبہات کے سائے منڈلاتے رہتے؟ اور اگر اب یہ ثابت ہو جائے کہ رمسیس دوم موسی (علیہ السلام) کا فرعون نہیں ہے تو کیا آپ قرآن کو مسترد کر دیں گے؟

میرے جراح کا دعوی ہے کہ وہ سائنس کے طالب علم ہیں مگر اس جھوٹ کو داغتے اور لوگوں میں جہالت تقسیم کرتے وقت انہوں نے اس بات کی تصدیق کرنے کی ذرا بھی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ ایمان ہی کافی ہے بھلے وہ جھوٹ پر کھڑا ہو..

چلیے اس ایمان افروز جھوٹ کا بھی پردہ فاش کیے دیتے ہیں:

لندن سے شائع ہونے والے سعودی عرب کے مشہور اخبار الشرق الاوسط کی 5 فروری 2005 کی خبر کے مطابق مصر کے وفاقی وزیر برائے آثارِ قدیمہ ڈاکٹر زاہی حواس نے کہا ہے کہ:

"واضاف انه بحسب دراسة القرآن الكريم يتبين ان فرعون الخروج هو «رمسيس الثاني»، بالرغم من النتيجة التي توصل اليها الفرنسيون، عندما قاموا بفحص المومياء في الثمانينيات، والتي اشارت الى انه ليس فرعون الخروج، لعدم وجود آثار للغرق في مومياءه."

"انہوں نے مزید کہا کہ اگرچہ قرآنِ کریم کے مطابق فرعون «رمسیس دوم» ہے تاہم اسی کی دہائی میں فرانسیسیوں کی جانب سے ممی کی جانچ سے یہ پتہ چلا کہ وہ فرعون نہیں ہے کیونکہ اس کی ممی میں ڈوبنے کے کوئی آثار نہیں پائے گئے تھے"

یہی خبر عربیک نیوز آرکائیو میں دیکھیے

ڈاکٹر زاہی حواس علوم آثارِ قدیمہ کے مایہ ناز عالم ہیں، مصریات کے حوالے سے کوئی بھی دستاویزی فلم ان کی موجودگی کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہے، نیشنل جیوگرافک پر انہیں اکثر دیکھا جا سکتا ہے، اور میرے خیال سے وہ ڈاکٹر موریس بوکلے جیسے جعلساز سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں، یہ جعلساز کتنا بڑا مسلمان تھا، کتنے حج کیے، کتنے عمرے کیے، کتنی نمازیں پڑھیں یہ ایک الگ موضوع ہے جسے یہاں زیرِ بحث لانا بے محل ہے، تاہم ڈاکٹر زاہی حواس کے الفاظ قابل غور ہیں کہ قرآن کے مطابق فرعون

رمسیس دوم ہی بنتا ہے لیکن در حقیقت وہ فرعون ہے ہی نہیں، اب یہاں مومنین کی قرآن کی حقانیت کے بارے میں کیا رائے ہو گی؟

عقیدے پر پڑنے والی اس ضربِ کاری کے لیے معافی چاہتا ہوں مگر سچ سچ ہوتا ہے اور سر چڑھ کر بولتا ہے.

مجھے احساس ہے کہ یہ تحریر انتہائی قابلِ اعتراض ہے، مقصد کسی کے جذبات یا عقیدے کا مذاق اڑانا نہیں تھا، اگر کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو میں دلی طور پر ان سے معذرت چاہتا ہوں، میرا مقصد محض میرے محترم دوست ڈاکٹر جواد خان کی "بحث برائے بحث" کے لیے شروع کی گئی تحریر کا جواب دینا تھا جس میں انہوں نے بجائے سابقہ تحریر کے "مضمون" کا رد کرنے کے بے وجہ اور بے دلیل الزامات لگائے اور میری تحریر کے مقصد کو نہیں سمجھا، مزید یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ اگر کیڑے ہی نکالنے ہوں تو انسان خدا میں بھی کیڑے نکال سکتا ہے، میری ڈاکٹر صاحب سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے، وہ میرے لیے اب بھی محترم ہیں، مجھے یقین ہے وہ دل پر نہیں لیں گے.

وماعلینا الا البلاغ

نوٹ: میں نے اس تحریر میں موجود کسی بھی قرآنی آیت کا خود سے ترجمہ نہیں کیا ہے، سارا ترجمہ یہاں سے لیا گیا ہے.

قرآن اور اسرائیلیات

یہودیات سے قرآن کا اقتباس نئی - پرانی بحث ہے جو انیسویں صدی سے آج تک زیرِ بحث قضیہ ہے (1) در حقیقت یہ "شک" اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود قرآن پرانا ہے جس کی تصدیق وہ خود کرتا نظر آتا ہے:

(حتّٰی إذا جاؤوک یجادلونک یقول الذین کفروا إن ھذا إلا أساطیر الأوّلین) (سورہ الانعام، آیت 25)
(یہاں تک کہ جب تمہارے پاس تم سے بحث کرنے کو آتے ہیں تو جو کافر ہیں کہتے ہیں یہ قرآن اور کچھ بھی نہیں صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں)

(وإذا تتلی علیھم آیاتنا قالوا قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھذا إن ھذا إلا أساطیر الأوّلین) (سورہ الانفال، آیت 31)
(اور جب انکو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ تو کہتے ہیں یہ کلام ہم نے سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کا کلام ہم بھی کہدیں اور یہ ہے ہی کیا صرف اگلے لوگوں کی حکایتیں ہیں)

وغیرہ کہ آیات بہت ہیں، ان مجادلین یعنی بحث کرنے والوں کی "اساطیر الاولین" سے مراد شاید "پچھلے لوگوں کی خرافات" یا پھر پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، ایسی کہانیاں جو ان کے لیے نئی نہیں ہیں، وہ ایسی کہانیاں پہلے بھی سنتے رہے ہیں اور اس حوالے سے قرآن ان کے لیے کوئی نیا نہیں ہے یا کوئی نئی "چیز" نہیں لایا ہے.

کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں سابقہ مقدس کتابوں کی باتوں کا وارد ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ مصدر اور خدائی پیغام ایک ہی ہے، چونکہ قرآن، تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے چنانچہ اس میں انہی قصوں کا بیان ہونا حتی کہ بعض قصوں کی تصحیح کرنا سمجھ میں آتا ہے، اب جو بات قرآن سے موافق ہو وہ حق اور جو موافق نہ ہو وہ تبدیل شدہ، تاہم یہ بظاہر منطقی سی بات درست معلوم نہیں ہوتی.

تواراتی اسرائیلیات

قرآن نے بہت سارے توراتی قصے نقل کیے جیسے زمین وآسمان کی چھ دنوں میں تخلیق، تخلیقِ آدم (علیہ السلام)، اور کچھ قوانین وغیرہ، تاہم یہ قصے تورات نے آس پاس کی تہذیبوں سے چوری کیے تھے، سہیل قاشا کہتے ہیں: (کئی محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کے اسفار میں جو قصے کہانیاں اور قوانین وارد ہوئے ہیں در حقیقت ان کا اصل سومری، بابلی اور آشوری تحریروں سے ہے، یہودیوں نے ان میں سے جو انہیں اچھا لگا اسے اپنے ہاں نقل کر لیا اور جو انہیں اچھا نہ لگا اسے حذف کر دیا)(2) چونکہ تورات کی تدوین پانچویں اور آٹھویں صدی قبل از عیسوی میں ہوئی چنانچہ اس میں آشوری کہانیوں کا ہونا تعجب کی بات نہیں جیسے کہ نبی موسی (علیہ السلام) کا قصہ جسے اس کی ماں نے پانی میں بہا دیا اور وہ پانی میں بہتا ہوا ایسے لوگوں کے ہاتھ لگا جنہوں نے اسے پالا اور پھر وہ لیڈر بنا، تاہم یہ کہانی دراصل شاہ سرجون الاکادی کی ہے جس نے 2279 اور 2334 قبل از عیسوی حکومت کی.
اسی طرح تورات میں بابلی قوانین بھی ملتے ہیں جیسے حمورابی کے قوانین جو 1750 قبل از عیسوی میں لکھے گئے تھے اور جو آج پیرس کے لوور میوزیم میں موجود ہیں، مثال کے طور پر کوڈ 196 میں درج ہے: (اگر کوئی سید اشراف کے کسی بیٹے کی آنکھ پھوڑ دے تو انہیں چاہیے کہ وہ بھی اس کی آنکھ پھوڑ دیں) اسی طرح کوڈ 200 میں درج ہے: (اگر کوئی سید اپنے طبقے کے کسی سید کا دانت توڑ دے تو انہیں چاہیے کہ وہ بھی اس کا دانت توڑ دیں)(3) یہی بات سفر تثنیت 19 اور 20 میں ملتی ہے: (نفس کے بدلے نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت)، اور یہی بات قرآن میں بھی منتقل ہوئی:

(وکتبنا علیھم فیھا أنّ النفس بالنفس والعین بالعین والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسنّ بالسنّ)(سورہ مائدہ، آیت 45)
(اور ہم نے ان لوگوں کے لئے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت)

اسی آیت میں قرآن آگے چل کر کہتا ہے:

(ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئک ھم الظالمون)
(اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں)

اب کیا یہ احکام اللہ کے اتارے ہوئے ہیں یا حمورابی کے لکھے ہوئے ہیں؟ شاید قرآن کے مصنف کو یقین تھا کہ یہ قوانین اللہ کے اتارے ہوئے ہیں اسی لیے اس نے انہیں قرآن میں جوں کا توں نقل کیا لیکن اسے نہیں پتہ تھا کہ تورات نے دراصل یہ قوانین بابلی تہذیب سے چرائے تھے اور یہ کہ آگے چل کر حمورابی کے آثار کی دریافت ساری کہانی واضح کر دے گی.
اسی طرح کوئی حیرت نہیں ہوتی جب حضرت موسی (علیہ السلام) کے وجود اور ان کے کرشموں پر ایک بھی آرکیالوجیکل (Archaeology) ثبوت نہیں ملتا، مصر کے کسی بھی مؤرخ نے فرعون اور اس کی فوج کے ڈوبنے کے اس اندوہناک واقعے کا تذکرہ نہیں کیا، اگرچہ کچھ لاہوتی یہ بہانہ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مصر کے مؤرخین کے قومی شعور نے انہیں یہ واقعہ درج کرنے سے روکے رکھا، لیکن معترضین کہتے ہیں کہ چلو آپ کی یہ بات بجا لیکن آس پاس کی تہذیبوں کے مؤرخین کا کیا؟ انہوں نے یہ واقعہ درج کیوں نہیں کیا؟ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس واقعے کے بارے میں نہ سنا ہو؟ حتی کہ ہیروڈوٹس Herodotus جنہیں مصر کی تاریخ پر عبور تھا، اور انہوں نے مصر کے بہت سارے واقعات نقل بھی کیے، اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا (4) مزید برآں جدید آرکیالوجی کو اس توراتی-انجیلی-قرآنی قصے کا ایک بھی ثبوت نہ مل سکا (5)، اسی طرح فرعون کا بنی اسرائیل کو غلام بنانے کا تعلق افسانوی خیال سے تو ہو سکتا ہے تاریخی حقائق سے نہیں، کیونکہ مصر میں غلامی نہیں تھی (6)، ایسے ہی تورات کے مصنفین نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا قصہ گھڑ کر اپنے حسب ونسب کو برتر و اعلی ثابت کرنے کے لیے خیالی گھوڑے خوب دوڑائے اور ان کے لیے جن وانس کی فوجیں بنا ڈالیں حالانکہ آس پاس کی تہذیبوں کے مؤرخین کے ہاں اس شخصیت کا ایک بھی یتیم تذکرہ موجود نہیں ہے جو کہ حیرت انگیز بات ہے.
زیادہ امکانات یہی ہیں کہ یہودیوں نے ان شخصیات کو بابلی تہذیب سے چرا کر قومی ہیرو بنانے کی کوشش کی، خاص طور سے موسی (علیہ السلام) جنہوں نے "یہوہ" کی مدد سے مصری مملکت کو چیلنج کیا اور بنی اسرائیل کو مقدس زمین کی طرف نکال لینے

میں کامیاب ہوگئے، حالانکہ کنعان کی زمین مصری سلطنت کے زیرِ سایہ ہی تھی یعنی صرف اتنا کافی نہیں کہ موسی (علیہ السلام) نے فرعون کو شکست دی جو احمقوں کی طرح ان کے پیچھے اپنی فوج کے ساتھ ہو لیا بلکہ فرعون کی موت کے بعد یہودیوں نے فلسطین میں کنعان کی زمینوں پر قبضہ بھی کر لیا جو فرعونوں کے زیرِ تسلط تھی، اور اپنے آپ کو خدا کی چنیدہ قوم قرار دیا جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

(یا بني إسرائیل أذكروا نعمتي التي أنعمت علیكم وأنّي فضّلتكم على العالمین) (سورہ بقرہ، آیت 122)
(اے بنی اسرائیل میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور یہ کہ میں نے تم کو اہل عالم پر فضیلت بخشی)

یعنی خدا ایک قوم کو دوسری قوم پر فضیلت دیتا ہے حالانکہ وہ ان سب کا خالق ہے، مگر کیوں؟ تو یہ اس کی حکمت ہے، یہ اور اس طرح کی کئی دیگر مثالیں ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں جیسے زمین و آسمان کی چھ دنوں میں تخلیق جس پر معروف الرصافی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: (حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی چھ دنوں میں تخلیق تورات کی خرافات میں سے ہے، اب چونکہ تورات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاں خدا کی کتابوں میں سے ایک مقدس کتاب ہے چنانچہ انہوں نے اسے لے کر قرآن میں اس کا تذکرہ کر دیا) (7).

تلمودی اور مدراشی اسرائیلیات

قرآن نے افسانوں اور خرافات سے بھرے عہد نامہ قدیم وجدید کی ہی تصدیق نہیں کی، بلکہ تلمود اور مدراش کی بھی تصدیق کی جو خرافات کی سب سے بڑی فیکٹریاں ہیں، لفظ تلمود "لمد" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں علم حاصل کرنا، جاننا، پڑھنا، یا عربی میں، تعلم، عرف، درس، چنانچہ تلمود کے معنی پڑھنے کے ہیں جو کہ عربی کے لفظ "تلمیذ" (طالب علم یا سٹوڈنٹ) کے قریب ہے، تلمود مشنات اور جمارا پر مشتمل ہے، مشنات کے بارے میں یہودیوں کا دعوی ہے کہ یہ حضرت موسی (علیہ السلام) کی زبانی منقول شریعت ہے جو چھ حصوں یا مباحثوں پر مشتمل ہے، لفظ مشنات یا مشناہ "شنہ" سے مشتق ہے جس کا عربی میں مطلب "ثنّی" "یعنی راجع اور اعادہ بنتا ہے جس سے قرآن میں مذکور لفظ "المثانی" یاد آتا ہے، جو اگر تلمود میں چھ ہیں تو قرآن میں سات ہیں (آتیناک سبعاً من المثانی)، رہا جمارا تو وہ مشنات پر بحث پر مشتمل ہے، تلمود دو طرح کے ہیں، ایک بابلی اور ایک ارشمیلی (8) تلمود کی تدوین کی تکمیل چھٹی صدی عیسوی میں ہوئی (9) رہا مدراش تو اس کی حیثیت اسلام کی کتب تفاسیر کی سی ہے، یعنی اسے یہودی "مولویوں" نے تورات کی وضاحت اور تاویل کے لیے لکھا، لفظ "مدراش" کا مطلب بھی پڑھنا، تلاش اور تاویل ہے جس کی اصل "درش" ہے اور یہ عربی لفظ "درس" سے قریب ہے، مدراش کی تحریریں دوسری اور تیسری صدی عیسوی تک

پھیلی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے بعض تحریروں کی درست ترین تاریخ کا تعین کیا جاسکتا ہے جو اسلام سے پہلے یا بعد میں لکھی گئیں تھیں، قرآن میں انبیاء کے بیشتر قصے تلمود اور مدراش سے لیے گئے ہیں ماسوائے عاد اور ثمود (علیہما السلام) کے قصے کیونکہ یہ خالصتاً عربی قصے ہیں جو یہودیوں کے ہاں مذکور نہیں.

اعتراضاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں جن قصوں کا تذکرہ ہوا ہے وہ درست ہیں اور اس سے پہلے والی کتابوں میں ان قصوں کا تذکرہ ان کی نفی نہیں کرتا کیونکہ یہ راز نہیں ہیں، یہاں میں ایک مثال دینا چاہوں گا، چلیے تفسیر الزمخشری کھولتے ہیں اور مثال کے طور پر سورہ النمل کی آیت نمبر 18 پر ان کی تفسیر دیکھتے ہیں جس میں نبی سلیمان (علیہ السلام) چیونٹیوں کی وادی سے گزرتے ہیں، آیت کہتی ہے:

(حتّى إذا أتوا على وادي النمل قالت نملة يا أيّها النمل ادخلوا مساكنكم لا يحطمنّكم سليمان وجنوده وهم لا يشعرون) (سورہ النمل، آیت 18)

(یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اسکے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انکو خبر بھی نہ ہو)

زمخشری اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(قيل كانت تمشي [أي النملة] وهي عرجاء تتكاوس، فنادت: يا أيّها النمل، الآية، فسمع سليمان كلامها من ثلاثة أميال. وقيل كان اسمها طاخية) (10)

(کہا جاتا ہے کہ وہ [یعنی چیونٹی] لنگڑا کر چلتی تھی، تو اس نے آواز لگائی: اے چیونٹیوں، آیت، سلیمان نے اس کی بات تین میل کی دوری سے سن لی، اور کہا جاتا ہے کہ اس کا نام طاخیہ تھا)

اور اب تفسیر ابنِ کثیر کھولتے ہیں اور اسی آیت کی تفسیر اس میں دیکھتے ہیں:

(عن قتادة، عن الحسن، أنّ اسم هذه النملة حرس، وأنّها من قبيلة يقال لهم بنو الشيصان، وأنّها كانت عرجاء، وكانت بقدر الذئب) (11)

(قتادہ نے حسن سے روایت کیا، کہ اس چیونٹی کا نام حرس تھا اور اس کا تعلق بنو الشیصان نامی قبیلے سے تھا، اور یہ کہ وہ لنگڑی تھی اور بھیڑیے کے برابر تھی)

ایک ہی آیت پر دونوں تفسیروں کا تضاد تو واضح ہے ہی، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ چیونٹی کا نہ صرف نام ہے بلکہ قبیلہ بھی ہے اور وہ بھیڑیے کے برابر ہے، اوپر سے وہ بولتی بھی ہے اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) اس کی فصیح وبلیغ زبان دانی سن کر مسکراتے بھی ہیں، اب فرض کرتے ہیں کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی ہیں، ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارے اس زمانے میں کسی شخص نے نبوت کا دعوی کرتے ہوئے کہا کہ وہ تورات، انجیل اور قرآن کی تصدیق کرتا ہے اور اپنی چکنی چپڑی باتیں کرتے ہوئے ہمیں ایک آیت سناتے ہوئے کہتا ہے کہ:

(واذ قالت طاخیہ لقومہا من بنی شیصان یاایہا النمل ادخلوا... تا آخر)

(اور جب طاخیہ نے بنی شیصان میں سے اپنی قوم سے کہا کہ اے چیونٹیوں داخل...)

کیا ہم اسے جھٹلاتے ہوئے یہ نہیں کہیں گے کہ یہ انسانوں کی لکھی کہانیاں ہیں جو غلطیاں کرتے ہیں؟ کیا ہم اسے وہ مصدر نہیں دکھائیں گے جہاں سے یہ کلام نقل کیا گیا تا کہ اس پر واضح کر سکیں کہ یہ وحی نہیں ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے نقل کردہ کلام ہے؟

یہی کچھ ہمیں قرآنی قصوں میں ملتا ہے جو تلمود اور مدراش سے منقول ہیں جنہیں لکھنے والوں نے اپنے خیالی گھوڑے خوب دوڑائے اور عجیب وغریب افسانے گھڑے جن میں یقیناً بھیڑیے کے برابر وہ بولنی والی چیونٹی بھی شامل ہے، یہاں زمخشری اور ابنِ کثیر پر کوئی الزام نہیں کہ افسانہ ہی افسانے کو گھڑتا ہے، اور قرآن خود اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس نے سابقہ کتابوں سے اقتباس کیا ہے:

(وإنّہ لتنزیل ربّ العالمین، نزل بہ الروح الأمین، علی قلبک لتکون من المنذرین، بلسان عربیّ مبین، وإنّہ لفي زبر الأوّلین) (سورہ الشعراء آیت 192،196)

(اور یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانتدار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ یعنی اسنے تمہارے دل پر اسکا القا کیا ہے تا کہ لوگوں کو خبردار کرتے رہو۔ اور القا بھی فصیح وبلیغ عربی زبان میں کیا ہے۔ اور اسکی خبر پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔)

چنانچہ قرآن سابقہ کتابوں میں موجود قصوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہے، اس سلیس ترجمے کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ زیادہ تر مقامات پر ترجمہ کمال کا ہے، عربی زبان کی بلاغت کو لاہوتیات میں بڑی خوبی سے استعمال کیا گیا ہے، وہ جانتے تھے کہ

قرآن سابقہ لوگوں کی کتابوں سے منقول ہے ماسوائے بعض آیات کے جیسا کہ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ آسمان سے ایک فرشتہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اترا اور ان سے کہا: آپ کو دونوروں کی خبر دینے آیا ہوں جو آپ کو ملے ہیں اور جو اس سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے، کتاب کا فاتحہ اور سورہ بقرہ کا آخر (12) اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کا سارا کلام اس سے پہلے کسی نہ کسی نبی کو مل چکا ہے ماسوائے سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخری آیتوں کے جیسا کہ ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) جو حدیث کے راوی ہیں بیان کرتے ہیں.

عربی اسرائیلیات

قرآن نے کچھ موجود قوانین کو جاری رکھا جیسے چور کا ہاتھ کاٹنا، المنمق میں آیا ہے کہ جاہلیت میں قریش چور کا ہاتھ کاٹتے تھے (13) اس طرح حج کی رسم جو کہ دراصل جاہلیت کے زمانے کی ہی ایک پرانی رسم ہے جس میں حاجی کثیر رقم ادا کر کے پتھر کے چکر لگاتا ہے، پتھر کو چومتا ہے، اور پتھر کو پتھر سے مار کر خدا سے اپنے سارے گناہ بخشوا کر واپس آجاتا ہے، اب اس مذہبی سیاحت سے کسے فائدہ پہنچتا ہے؟

اسرائیلیات اور سائنس

حدیث، تفسیر اور سیرت کی اسرائیلیات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں (14) کہ یہ ایسے افسانے اور خرافات ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی، مگر یہ کتابیں قرآن کی اسرائیلیات کو نظر انداز کر دیتی ہیں، کیا عقل تسلیم کرتی ہے کہ نوح (علیہ السلام) 950 سال زندہ رہے؟ یا وہ ہدہد جو سلیمان (علیہ السلام) اور بلقیس کے درمیان وزیرِ خارجہ کا کام سرانجام دے رہا تھا معقول بات ہے؟ یا یونس (علیہ السلام) کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنا معقولیات میں سے ہے؟ یا اہلِ کہف جو سو سال تک مردہ پڑے رہے پھر زندہ ہوگئے عین عقل ہے؟ یہ اور ایسی تمام خرافات ایمانیات کے زمرے میں تو آسکتی ہیں مگر عقلیات میں ہرگز نہیں، ہر شخص جس چیز پر چاہے یقین رکھنے اور ایمان لانے میں آزاد ہے مگر وہ خرافات کو عقل کے مطابق یا عقل کو خرافات کے مطابق کرنے میں آزاد نہیں ہے، جیسا کہ قرآن سے سائنس نکالنے والے جعلی سائنسدان جو عربی زبان اور اس کے معنوں کا گلا گھونٹ کر قرآن سے سائنس برآمد کر لیتے ہیں، مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ آیت (والشمس تجری لمستقرلہا) میں سائنس ہے مگر وہ بھول جاتے ہیں (یا انہیں معلوم ہی نہیں) کہ اصل تلمود میں ہے (15) تو کیا تلمود میں بھی سائنس ہے؟

اسی طرح یہ جعلی سائنسدان آسمان سے لوہا اتارنے والی آیت "وانزلنا الحدید" (اور ہم نے لوہا اتارا) کو سائنس قرار دیتے ہیں تو کیا قرآن کا یہ کہنا کہ "وانزلنا من الانعام ثمانیہ ازواج" (اور ہم نے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے اتارے) کا مطلب ہے کہ گائے بھینسیں بھی آسمان سے اتاری گئیں تھیں؟ جبکہ علمی طور پر لوہا آسمان سے نہیں اترا وہ بھی اس صورت میں کہ اگر ہم مان لیں کہ زمین کی تخلیق کی بات کرتے ہوئے لفظ "نزول" یا "سماء" کا استعمال درست ہے!؟

غور کریں کہ کس طرح خرافات کو علمی ثبوتوں میں بدل دیا جاتا ہے اور ان کی ترویج کے لیے پورے پورے ادارے کروڑوں کے بجٹ کے ساتھ کھڑے کر دیے جاتے ہیں تا کہ لوگوں میں جہالت تقسیم کی جاسکے جبکہ قوموں کو ایسی خرافات کی بجائے حقیقی علمی تحقیقی اداروں کی اشد ضرورت ہے تا کہ وہ ترقی کی سیڑھی پر اپنا پہلا قدم رکھ سکیں، ایسے لوگوں کی ایک طرف شہرت اور پیسے کی ہوس اور دوسری طرف طبعیات اور مابعد الطبیعات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش سمجھ میں آتی ہے... جہاں علم اپنا لوہا منوا چکا ہو وہاں ایمان کی تقویت کے لیے مقدس متون میں علمی دلائل کی تلاش از حد ضروری ہو جاتی ہے چاہے اس کے لیے جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے.

حوالہ جات:

1- المصادر الاصلیہ للقرآن The Original Sources of the Qur'an

2- اثر الکتابات البابلیہ فی المدونات التوراتیہ – سہیل قاشا، بیسان للنشر والتوزیع والاعلام، بیروت 1998، صفحہ 8

3- اثر الکتابات البابلیہ فی المدونات التوراتیہ – سہیل قاشا، بیسان للنشر والتوزیع والاعلام، بیروت 1998، صفحہ 28

4- التوراہ کتاب مقدس ام جمع من الاساطیر، لیوٹا کسل، ترجمہ حسان میخائیل اسحاق، صفحہ 176، اصل کتاب فرانسیسی میں ہے:
La Bible Amusante, éd Librairie pour tous, 1897

5- کشف الکتاب المقدس، صفحہ 84، اصل کتاب فرانسیسی میں ہے: Israel Finkelstein et Neil Asher Silberman, La Bible dévoilée

6- قدماء المصریین اول الموحدین، ندیم السیار، 1995، صفحہ 42

7- الشخصیہ المحمدیہ او حل اللغز المقدس، معروف الرصافی، دار الجمل، جرمنی، 2002، صفحہ 654

8- التلمود کتاب الیہود المقدس، تاریخہ وتعالیمہ ومقتطفات من نصوصہ، دار قتیبہ، دمشق، 2006

9-التلمود کتاب الیہود المقدس، تاریخہ وتعالیمہ ومقتطفات من نصوصہ، دار قتیبہ، دمشق،2006صفحہ 27
10-الزمخشری،الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، تحقیق عادل احمد عبدالموجود وعلی محمد معوض، مکتبہ العبیکان، الریاض، 1988، جلد4، صفحہ 440
11- تفسیر القرآن العظیم،ابن کثیر، تحقیق نخبہ من الاساتذہ،موٴسسہ قرطبہ للطبع والنشر والتوزیع، مصر،2000، جلد10، صفحہ 397
12-الحمیدی،الجمع بین الصحیحین، تحقیق علی حسین البواب، دار ابن حزم، لبنان،2002، جلد2، صفحہ 97
13-کتاب المنمق، البغدادی، تحقیق خورشید احمد فاروق، دائرہ المعارف،1964، صفحہ 194
14-مثلاً دیکھیے:الاسرائیلیات فی التفسیر والحدیث، محمد حسین الذھبی، مکتبہ وہبہ،1990-اور دیکھیے:الاسرائیلیات واثرھا فی کتب التفسیر، رمزی نعناعہ، دار القلم ودار الضیاء1970 ودیگر...
15-التلمود البابلی،سنہدرین، صفحہ 91

فلسفہ

ما بعد الطبیعات میں ابدیت کا مفہوم

عام طور پر مابعد الطبیعات یعنی میٹا فزکس کو فلسفہ ”ماورائے مادیت“ سمجھا جاتا ہے، یہ ان چیزوں پر بحث کرتی ہے جو فطرت کے قوانین کے تابع نہیں، یا جو ”چیزیں“ مادیت سے ماوراء ہیں، جو بھی ہو.. آخر میں اس کا سرا ”علم الٰہیات“ سے جا ملتا ہے، مختلف زمانوں میں مختلف فلاسفہ نے مابعد الطبیعات کو مختلف نام دیے، جدید افلاطونیت اسے ”علمِ وحدت“ کہتی ہے، ڈیکارٹ کے ہاں یہ ”لامادیت کا علم“ ہے جبکہ ہیگل کے ہاں یہ ”تصورِ محض“ یا ”خالص روحانی سچائی“ ہے، اور یقیناً مختلف مکاتبِ فکر کے حساب سے اسے اور بھی کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

طبیعات اور مابعد الطبیعات میں کیا فرق ہے؟

طبیعات کی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے بیان کیا جائے اور اس کی پیشگی پیش گوئی کی جائے، آئن سٹائن کہتے ہیں: "کائنات میں سب سے ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ یہ قابلِ فہم ہے". یہ بات علمِ الہیات کے مفہوم سے ٹکراتی نظر آتی ہے جو ایسے معاملات میں مصروفِ کار نظر آتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں یعنی جس کا تعلق غیبیات سے ہے!!

کیا مابعد الطبیعاتی فکر کی موجودگی کا سبب کائنات کی مکمل تفہیم میں ناکامی ہے؟

ابتدائے تاریخ سے انسان کی کوشش رہی ہے کہ وہ دنیا اور زندگی کی سمجھ حاصل کرلے، سائنس اس ضمن میں سب سے بہترین حل ثابت ہوئی، جہاں تک بات اساطیر اور غیبیات کی ہے تو یہ توجیہ محض کند ذہنوں کو ہی پسند آتی ہے۔

آج مابعد الطبیعات محض "بلند اصولوں کی تلاش" تک محدود ہوگئی ہے جن کا وجود محض تخیلی صورت میں صرف ذہن میں ہوتا ہے ناکہ کوئی مادی وجود جسے طبیعات وحساب کتاب کی زد میں لایا جاسکے، آج کل طبیعات دانوں کا نقطہ نظر سائنس میں سمتوں کا تعین کرتا ہے، لہذا سائنسی حلقوں میں عام تصور یہ ہے کہ: میٹافزکس دنیا کو دیکھنے کی ایک سطحی اور محدود سوچ ہے!!

درحقیقت مابعد الطبیعات یعنی میٹافزکس کو ابدیت پر پورا یقین ہے، اس بحث نے مابعد الطبیعات دانوں کو بھی ایک لمبی چوڑی بھول بھلیا میں پھنسایا ہوا ہے.. مثال کے طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موت کے کنارے پر کھڑے کسی مریض پر گزرنے والا محدود وقت ابدی کیسے ہو سکتا ہے؟

فلسفہ مابعد الطبیعات کے ابدی مفہوم کو سمجھانے کے لیے مختلف قصے بیان کرتا ہے، ایسا ہی ایک مناسب سا قصہ یہاں درج کیا جا رہا ہے جو علامتی طور پر مابعد الطبیعات کے ابدی مفہوم کو بیان کرتا ہے:

****

ابدی زندگی۔

آپریشن کے بعد فاطمہ کی حالت مزید ابتر ہوگئی، ڈاکٹر نے بتایا کہ صورتِ حال نازک ہے، بیماری پھیپڑوں تک پہنچ گئی ہے اور اسے نہیں لگتا کہ وہ چھ ماہ سے زیادہ جی پائے گی۔

یہ خبر سن کر اس کے پیروں تلے سے گویا زمین ہی نکل گئی، اور وہ چلائی: صرف چھ ماہ؟

ہم سے جو ہو سکتا تھا ہم کر چکے، اب معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے وضاحت کی۔

مگر مجھے زندگی سے پیار ہے... میں جینا چاہتی ہوں.. بلکہ صدیاں جینا چاہتی ہوں.. ابھی میری عمر ہی کیا ہے...

ایک حل ہے۔ڈاکٹر نے اعلان کیا۔

یہ سن کر فاطمہ امید افزا نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگی، لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کی خاموشی لمبی ہو گئی ہے تو اس نے سوال کیا:

کیا حل ہے؟

حل یہ ہے کہ تم کسی شاعر سے شادی کر لو؟!

شاعر؟!شاعر سے شادی کر کے میری بیماری کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟ کیا شاعر کے پاس کوئی ایسا علاج ہے جو میڈیکل سائنس کے پاس نہیں؟!

اچھا سوال ہے... میں وضاحت کرتا ہوں..

یہ کہہ کر ڈاکٹر کی خاموشی ایک بار پھر طویل ہو گئی۔

میں سن رہی ہوں.. بتایئے؟ فاطمہ نے گویا ڈاکٹر کو جھنجھوڑا..

بات یہ ہے.. (ڈاکٹر نے تمہید باندھی)... کہ شاعر مغرور مخلوق ہوتے ہیں.. متقلب المزاج اور کثیر الفرمائش ہوتے ہیں.. انہیں یہ وہم ہوتا ہے کہ وہ کسی الگ نوع کے انسان ہیں، وہ خود کو برتر سمجھتے ہیں اور باقیوں کو کمتر.. وہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ ہیں مگر در حقیقت وہ الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہیں.. شاعر چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں ان کی متقلب المزاجی سے خود کو ہم آہنگ کریں، تمہیں دن رات اپنے شوہر کی اتنی شاعری سننی پڑے گی کہ بالآخر تم تنگ آجاؤ گی.. اور خبردار جو تم نے اس کی شاعری پر ذرا بھی تنقید کی یا اسے ناپسند کیا.. قیامت کے دن بھی جب خدا اس سے نیکیوں اور گناہوں کا پوچھے گا تو وہ کہے گا کہ اس کے کھاتے میں صرف نیکیاں ہی نیکیاں ہیں کیونکہ وہ ایک بڑا شاعر ہے.. اس کا واحد گناہ صرف تم سے شادی کرنا ہے اور یہ

گناہ تو مردوں کو ویسے ہی معاف ہے کیونکہ خدا نے آدم کو بھی حواء کے بہکاوے میں آنے کے باوجود معاف کر دیا تھا.. اسے توقع ہوگی کہ قیامت کے دن خدا اس سے کہے گا کہ چونکہ تم ایک بڑے شاعر ہو لہذا تمہاری جگہ یہاں ہے جہاں میں بیٹھتا ہوں.. آؤ اور میری جگہ پر جلوہ افروز ہو جاؤ.. یہ بھی خیال رہے کہ جب وہ کوئی غزل یا نظم لکھ رہا ہو تو چائے کافی کو دیر نہیں ہونی چاہیے.. یا چائے میں چینی اس کی پسند کے مطابق نہ ہو.. ورنہ وہ تم پر اپنی غزل کی خرابی کا الزام ڈال دے گا، اگر اس کی کسی غزل پر تنقید ہوئی تو تم پر الزام ہو گا کہ اس کے ناقدین کی طرح تم میں بھی رتی بھر ادبی ذوق نہیں ہے، اور اگر اس کی غزل کی پذیرائی ہوئی تو تمہیں پھول ملیں گے.. مگر خیال رہے.. اس کے بیڈ کے سرہانے رکھنے کے لیے۔

مگر مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس سب کا میری بیماری کے ٹھیک ہونے سے کیا تعلق ہے؟ میں زندہ کیسے رہوں گی؟ فاطمہ نے استفسار کیا۔

یہ بڑا اہم سوال ہے.. شاعر جیسا کہ میں نے بیان کیا تمہاری زندگی جہنم بنا دے گا۔

مگر چھ ماہ بعد میری ممکنہ موت کا کیا؟

یہ تو گویا خلاصہ ء کلام ہے.. تمہاری بیماری ٹھیک نہیں ہوگی.. تم چھ ماہ بعد مر جاؤ گی.. مگر کسی شاعر کے ساتھ گزرے چھ ماہ تمہیں صدیوں پر محیط محسوس ہوں گے.. شاید ان چھ ماہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی تم موت کی تمنا کرنے لگو!!

روشن خیالی

روشن خیالی کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے ایک مثال کا جائزہ لے لیجئے، روشن خیالی کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ایک ہندو اگر اپنے ضمیر کی عدالت میں ذات پات کی تقسیم کو درست نہ سمجھے اور چھوت چھات کا قائل نہ ہو، اس کی نظر میں تمام انسان برابر ہوں۔ حالانکہ یہ شخص ہندو دھرم کی مبادیات کا انکاری ہے، لیکن پوجا پاٹ سرانجام دیتا ہے، بتوں کے آگے سر جھکاتا ہے، تو ایک دوسرے کٹڑ ہندو کی نظر میں اس کے تمام افعال قابل تحسین ہیں، لیکن ذات پات کی تقسیم سے انکار اس کے نزدیک دھرم کا اپمان کرنا ہے، اس کٹر ہندو کی نظر میں ایسا ہندو، ہندو دھرم کا مخلص پیروکار نہیں ہو سکتا اور اس کے نزدیک ایسا کرنا ہندو دھرم سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔

ایک مسلمان کی نظر میں اس ہندو کے بقیہ تمام مذہبی افعال تو قابل تحسین نہیں، لیکن ذات پات کی تقسیم سے انکار اس کی نظر میں ایک قابل تحسین فعل ٹھہرے گا، وہ اس کے اس فعل کو سراہے گا، اور اس پر کاربند رہنے پر اس کی حوصلہ افزائی بھی

کرے گا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ذات پات کی تقسیم ہندو مت میں ہندو اعتقادات کا حصہ ہے، ہندو مت کے مبادیات دین میں شامل ہے، اس لئے دیگر راسخ العقیدہ ہندووں کی نظر میں یہ ہندو کبھی مستحسن نظر سے نہیں دیکھا جائے گا، اور اس کے برعکس چونکہ ذات پات کی تقسیم سے انکار مسلمان کے کسی اعتقاد کے خلاف نہیں بلکہ اس کے اعتقاد کے عین مطابق ہے، اس لئے ایک ہندو کی روشن خیالی سے اسے کوئی مسئلہ نہیں۔

اس تحریر میں اسی بات کا جائزہ لینے کو شش کی گئی ہے کہ انسانی اعتقادات زیادہ اہم ہیں یا انسان دوست نظریات (خواہ ان کا تعلق کسی مذہبی اخلاقیات سے ہو یا نہ ہو) زیادہ اہم ہیں؟ انسان اعتقادات کیلئے ہے یا اعتقادات انسان کیلئے ہیں؟ اہمیت انسان کی زیادہ ہے یا اس کے اعتقاد کی؟ کیوں ایک راسخ العقیدہ انسان ہر حال میں اپنے اعتقادات کو ہی اہمیت دیتا ہے، اس کی سوچ کیوں صرف اپنے اعتقادات کے تقدس کے گرد ہی گھومتی ہے اور وہ اپنے اعتقاد کے خلاف کسی بہتر سوچ کے بارے میں سوچنے پر آمادہ ہونے کیلئے بھی تیار نہیں؟

روشن خیالی در حقیقت عقیدہ کی قید سے آزاد ہو کر اپنے عقیدے میں بیان کی گئی اخلاقیات سے بہتر اخلاقی قدر سے واقف ہو کر اسے تسلیم کرنے اور اپنانے کا نام ہے۔ یہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کا نام ہے۔ یہ ایثار کا نام ہے، قربانی کا نام ہے، یہ کمتر سے بہتر کی طرف سفر کا نام ہے، یہ تقلید کی زنجیر توڑنے کا نام ہے، یہ روایت پرستی سے آزادی کا نام ہے، ایک قدم اور بڑھاتے ہوئے کہنے دیجئے کہ یہ گمراہی سے ہدایت پا جانے کا نام ہے۔ ایک روشن خیال انسان کے نزدیک عقیدے سے زیادہ انسانیت کی اہمیت ہوتی ہے، وہ اخلاقی قدریں اپنانے کیلئے مذہبی حدود و قیود کا مقید نہیں ہوتا، اسے اچھی اخلاقیات جو انسان دوستی پر مبنی ہوں خواہ مذہب سے حاصل ہوں یا مذہب کے باہر سے، انہیں اپنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ روشن خیال معاشرے کے ہر طبقہ اور مکتب فکر کا فرد ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ اس کی مخالفت عموما مذہبی عناصر کی جانب سے کی جاتی ہے اس لئے روشن خیال لوگوں کو غلط فہمی کی بنیاد پر عام طور پر مذہب دشمن تصور کیا جاتا ہے۔

ایسے روشن خیال ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں، ایسے افراد اپنے ہم مذہب لوگوں کے برعکس دیگر مذاہب کے متبعین کی نظروں میں عموماً ہیروز کا درجہ رکھتے ہیں، ہندو مت میں ستّی کے خلاف تحریک چلانے والا، اور ستّی پر قانونی پابندی عائد کرانے والا بھی ایک ہندو ہی تھا، عیسائیت میں پاپائیت کے علم بغاوت بلند کرنے والا، خالق و مخلوق کے درمیان پادری کی دلّالی کے خلاف آواز بلند کرنے والا بھی ایک عیسائی ہی تھا۔ کون صاحب عقل سلیم مسلمان ہو گا جو راجہ رام موہن رائے جس نے ستی کی رسم ختم کرائی، اور مارٹن لوتھر، جس نے پاپائیت کے چنگل سے عیسائیوں کو نجات دلائی، کی خدمات کو نہ سراہے گا؟ انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز کے سامنے اپنے اعتقادات کو قربان کیا، ایک بہتر اخلاقی قدر کو ترجیح دی، راجہ رام موہن رائے ایشور کو مانتا تھا، مارٹن لوتھر خدائے ازلی پر کامل ایمان رکھتا تھا، لیکن ان دونوں کو اس بات کا یقین کامل تھا کہ اگر کوئی ایشور ہے، اگر کوئی خدا ہے

تو وہ اس قدر ظالم اور سنگ دل نہیں ہو سکتا کہ اس قدر سنگدلانہ احکامات منوانے سے اسے مسرت وراحت حاصل ہوتی ہو۔ ایسے روشن خیال افراد، مذہب اسلام کو بھی میسّر آجائیں تو ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی مسلمان کا ضمیر رجم کی سزا سے مطمئن نہ ہو، اس کی اخلاقیات پتھر مار مار کر کسی کی جان لینے کو گوارا نہ کرتی ہو، وہ جہاد کی سیاسی تشریح سے متفق نہ ہو، وہ مرتد کی سزا قتل کو انسان کی بنیادی آزادی کے خلاف سمجھتا ہو تو اس میں کیا برائی ہو سکتی ہے؟ اس سے معاشرے میں کون سی برائی یا فساد پھیلنے کا خدشہ ہے؟ زانی پر رجم کی مخصوص سزا نافذ کرنا زیادہ اہم ہے یا زنا کے اسباب کا سدِّباب کرنا زیادہ ضروری ہے؟ کیا سروں پر حکومت قائم کرنا دلوں پر حکومت کرنے سے کسی طرح بہتر ہو سکتا ہے؟ کیا ستّی کی رسم ختم ہونے سے ہندو معاشرے میں فساد برپا ہوا یا انسانیت کو سکھ کا سانس نصیب ہوا، کیا پاپائیت کا اقتدار ختم ہونے سے معاشرے کی بنیادیں ہل گئیں یا معاشرہ مزید مستحکم ہوا؟

ایسا کیوں ہے کہ روشن خیالی کی روایت شکن سوچ، سوچنے والا مسلمان آج کے اس دور میں ہندووں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ہاں تو ہیرو بن جائے گا، لیکن مسلمان ایسے روشن خیال مسلمان کی جان کے درپے ہو جائیں گے؟ روشن خیالی نے دنیا میں بہتری کو ہی ترویج دی ہے، کیا مسلمان دنیا کے کسی ایک روشن خیال معاشرے کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ روشن خیالی ان کے اپنے معاشرے کیلئے وبال جان بن گئی ہو؟ اور وہ روشن خیالی کو اپنے معاشرے کیلئے تباہ کن تصور کرتے ہوئے روشن خیالی سے نجات کے متمنی ہوں۔

مذہبی اعتقادات اور احکامات سے بغاوت سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں ہے، مثلاً ہندو دھرم میں گوشت خور یا شاکاہاری ہونا مذہبی اعتقاد اور حکم سے بغاوت ہے، لیکن ایسی بغاوت کو ہندو دھرم میں گوارا کر لیا جاتا ہے، اسی طرح شراب نوشی اسلام کے اعتقاد اور حکم سے بغاوت ہے، لیکن شراب نوشی کسی مسلمان کے اسلام پر اس قدر اثر انداز نہیں ہوتی کہ اسے اسلام سے خارج قرار دے دیا جائے، بالفاظ دیگر ایک شراب نوش کو بھی اسلام میں گوارا کر لیا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس، کوئی ایسا نظریہ یا سوچ اختیار کرنے سے جس سے انسانیت کا بھلا ہو غور و فکر کرنے کے بجائے مذہبی ملّائیت فوراً متحرک ہو جاتی ہے اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتی ہے۔ اس تحریک کا بنیادی محرّک سوائے منفی سوچ کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر انسانیت کی فلاح ہی مذاہب کا بنیادی مطمع نظر ہے تو ہر ایسی روایت شکن سوچ کی جس سے انسانیت کی فلاح ممکن ہو مخالفت غیر معقول ہے، روشن خیال طبقہ، ایسی باغیانہ اور روایت شکن سوچ کو جسے وہ انسانیت کیلئے مفید تصور کرتا ہے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے اور مذہبی طبقہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ مذہب کے ذمہ داروں کو اپنی اس روش پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ عقل مند انسانوں نے انسانیت کیلئے مفید سوچ کو فوراً قبول کیا اور کی ترویج کیلئے کوششیں سرانجام دیں، اور مذہبی ملّائیت پہلے پہل تو اس کے خلاف کمربستہ ہوتی ہے، پھر انسانی معاشرے میں اس سوچ کے اثر و نفوذ کے بڑھ جانے کے بعد

نا صرف اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے، بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ یہ سوچ تو اس کے مذہب کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے۔

خدا وجود اور عدم

جب مؤمنین (تمام مذاہب کے) ملحدین کے دلائل کا جواب نہیں دے پاتے تو ان کی آخری پناہ گاہ بگ بینگ نظریہ ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نظریہ خدا کو ثابت کرتا ہے کیونکہ نظریہ کہتا ہے کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی، یہاں مؤمنین اس نظریے میں اپنے خدا کو (بغیر اس سے پوچھے) گھسیٹ لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بگ بینگ خدا نے شروع کیا، دوسرے لفظوں میں خدا نے کائنات کو عدم سے تخلیق کیا، مؤمن بڑے سادہ لوگ ہوتے ہیں، جس الحاد سے وہ بھاگ رہے ہوتے ہیں انجانے میں پھر اسی میں گھر جاتے ہیں، بقول شاعر:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

یہ بھی یاد رہے کہ دنیا کے کسی بھی مذہب میں نا تو کوئی بگ بینگ ہے اور نا ہی وجود اور عدم کی کوئی ڈیفی نیشن، حتی کہ کائنات کا بھی کسی مذہب میں کوئی ذکر نہیں ملتا، مذاہب میں صرف انہی چیزوں کا ذکر ہوتا ہے جو ننگی آنکھ سے کسی کو بھی نظر آسکتی ہیں، جیسے زمین، چاند، سورج، ستارے اور آسمان، تمام تر مذاہب میں خدا انہی چیزوں کو تخلیق کرتا نظر آتا ہے، مذاہب کے خدا نے کبھی کائنات تخلیق نہیں کی، نا ہی اس کا ذکر کیا، کیونکہ جب کچھ فراڈیے خدا کے نام پر یہ فرسودہ مذاہب تخلیق کر رہے تھے تب کائنات کا کوئی تصور نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے خدا بھی کائنات تخلیق کرتے نظر نہیں آتے، مؤمنین کے ایسے استدلال دراصل جدیدیت کی دین ہیں، اب تو ہر سائنسی دریافت میں خدا کو گھسیڑنا ایک فیشن بن گیا ہے جو کہ مؤمن کی ذاتی توجیہ ہوتی ہے اس کے مذہب کی نہیں، ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ باتیں صراحت سے مذہب بیان کرے مگر ہوتا اس کا الٹ ہے، جب تک سائنس نے کائنات، کہکشاؤں اور بگ بینگ کا تصور نہیں دیا تھا خدا بھی ان کا خالق نہیں تھا، لیکن جیسے ہی سائنس نے یہ سب دریافت کیا اچانک خدا بھی ان ساری چیزوں کا خالق بن گیا، خدا کو مؤمنین کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اسے ایسی چیزوں کی تخلیق کا موقع دیا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی ہوں گی۔

خیر آئیے دیکھتے ہیں کہ مؤمنین الحاد کے چنگل سے بھاگ کر پھر الحاد کے دام میں کیسے پھنس جاتے ہیں۔

ہمارے پاس صرف دو حالتیں ہیں، "وجود" اور "عدم"، یہ دونوں حالتین کبھی نہیں ملتیں، "عدم" سے کبھی "وجود" نہیں آسکتا، اور "وجود" سے کبھی "عدم" نہیں بر آمد ہو سکتا، تاہم ان دونوں حالتوں کی ایک مشترکہ خصوصیت ہے، اور وہ ہے "لامتناہیت"، اگر "عدم" ہو گا تو وہ یقیناً "لامتناہی" ہو گا، اور اگر "وجود" ہو گا تو وہ بھی یقیناً "لامتناہی" ہو گا، یہاں "لا متناہی" سے مراد منظر کا تمام تر ابعاد میں غیاب یا حضور ہے، یعنی اگر "وجود" ہو گا تو وہ ہر چیز پر محیط ہو گا، اور اگر "عدم" ہو گا تو وہ بھی محیط ہو گا، اب چونکہ ہم، جانور، کہکشائیں اور خود خدا "موجود" ہیں لہذا (ماضی میں کسی وقت) "عدم" کا ہونا محال ہے کیونکہ "عدم" نا تو کچھ پیدا کر سکتا ہے اور نا ہی کسی چیز کے وجود کی اجازت دیتا ہے، یوں ہم "عدم" کو بڑے آرام سے ایک طرف کر سکتے ہیں کیونکہ اس سے کچھ پیدا ہونا محال ہے۔

اب خدا کی جو بھی شکل ہے (جیسے چاہیں خدا کا تصور کر لیں) عدم میں وجود نہیں رکھ سکتا کیونکہ خدا "شے" ہے "لا شے" نہیں کیونکہ اگر ہم خدا کو "لا شے" مان لیں تو پھر تو جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ وجود ہی نہیں رکھتا جو مؤمنین کے عقائد کے بر خلاف ہے، اب چونکہ "عدم" اپنے اندر کسی چیز کی موجودگی کی اجازت نہیں دیتا چنانچہ یہ لازم ٹھہرا کہ خدا عدم کی متضاد دوسری جگہ یعنی "وجود" میں موجود ہو، کیونکہ خدا "شے" ہے "لا شے" نہیں، اب چونکہ "وجود" کی لازمی صفت "لامتناہیت" ہے لہذا وجود ہر چیز اور تمام تر ابعاد پر اس طرح محیط ہو گا کہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہو گی جس کا وہ احاطہ نہ کرے، اس طرح یہ بات تو یقینی ہو جاتی ہے کہ ہم اور خدا ایک ہی جگہ میں رہتے ہیں یعنی "وجود" کے اندر کیونکہ وجود "لا متناہی" ہوتا ہے۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماضی میں کبھی "مطلق عدم" کی کوئی حالت نہیں رہی کیونکہ ہم اور خدا دونوں وجود رکھتے ہیں اور چونکہ عدم اپنے اندر کسی چیز کے وجود کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ وہ موجود ہی نہیں ہوتا، لہذا ہم اور خدا دونوں عالمِ وجود میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں، اگر کوئی کہے کہ کیا وجود "عدم" پیدا کر سکتا ہے یا "عدم" میں تبدیل ہو سکتا ہے تو جواب ہے نہیں کیونکہ "وجود موجود" ہے، اور اگر ایسا ہوا تو ہمارے ساتھ ساتھ خدا بھی مارا جائے گا کیونکہ وہ بھی ہماری طرح اسی وجود کا حصہ ہے اور "شے" ہے "لا شے" نہیں، اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اور خدا دونوں اس "وجود" میں نقطہء "نا آغاز" سے نقطہء "لاانتہا" تک موجود ہیں۔

اب چونکہ ہم اور خدا اس لامتناہی وجود میں بطور "شے" ہونے کی حیثیت سے موجود ہیں جس کا نا تو کوئی آغاز ہے اور نا ہی کوئی انتہا ہے چنانچہ اس وجود میں ہمارا ساتھی ہونے کے ناطے ہم خدا کی عمر کے بارے میں غور کر سکتے ہیں، کیا خدا کی عمر بیس ارب

سال ہے یعنی بگ بینگ سے سات ارب سال بڑا؟ اس "نا آغاز" کی شکل کیا ہوگی جس میں خدا پیدا ہوا ہو گا؟ اور چونکہ صدیوں سے خدا کا کوئی معجزہ نہیں دیکھا گیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے مرے ہوئے زمانے گزر گئے ہوں؟

بگ بینگ عدم میں نہیں ہو سکتا کیونکہ عدم ماضی میں کبھی وجود ہی نہیں رکھتا تھا کیونکہ نہ صرف ہم موجود ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ عدم سے کچھ پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ "لا شے" ہے۔

اگر "وجود" اور "عدم" کی صرف دو حالتیں ہوتی ہیں اور اگر خدا نے بگ بینگ کو عدم سے تخلیق کیا ہے تو اس لمحے یہ "خدا" کہاں تھا؟ کیا وہ عدم میں تھا؟ یقیناً ایک "شے" ہونے کے ناطے خدا کا عدم میں ہونا محال ہے، پھر یقیناً وہ "وجود" میں "موجود" تھا یعنی "وجود" خدا سے پہلے "موجود" تھا، یوں خدا کا "شے" ہونا یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔

اگر قدیم فلسفے کی طرف رجوع کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بیشتر فلاسفہ کے نزدیک دنیا قدیم ہے، مسلمان فلاسفہ کے فلسفے کا بھی یہی نچوڑ ہے، یہ الگ بات کہ مذہبی تعصب کے سبب وہ بات کو گھماتے رہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ فلاسفہ بڑے دور اندیش تھے، آج جدید علوم کی ترقی کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے اس نتیجے میں صرف معمولی سا فرق پڑا ہے، دراصل دنیا قدیم نہیں بلکہ وجود قدیم ہے، وجود اور عدم دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں، آگ اور پانی کی طرح یہ کبھی نہیں مل سکتے، اگر عدم اصل ہو گا تو پھر حقیقت یہ ہو گی کہ کچھ بھی نہیں ہو گا، مگر چونکہ ہم موجود ہیں لہذا یہ ثابت کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہیں کہ دراصل وجود ہی اصل ہے، وجود ہی ہر چیز پر محیط ہے، بگ بینگ بھی اسی میں وقوع پذیر ہوا.. خدا بھی اسی وجود کا حصہ ہے، سبھی اس "وجود" میں ہیں، اس "وجود" سے کوئی نہیں بچ سکتا، خدا بھی نہیں، ہم سب اس کے "قیدی" ہیں، اس "وجود" کے باہر "کچھ نہیں" ہے۔

عقل مندوں کو سلام!

دینِ فطرت زیرِ نشتر

قرآن کہتا ہے: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ـ سورہ روم آیت 30۔

ترجمہ: تو تم ایک طرف کے ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ (اور) خدا کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو

پیدا کیا ہے (اختیار کئے رہو) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اس آیت کو دلیل بناتے ہوئے علمائے اسلام یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے یعنی اگر کرہ ارض پر ہر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اسلام کا انتخاب کرے گا یا کم از کم توحید کا انتخاب تو کرے گا ہی، اسی معنی میں ایک حدیثِ نبوی میں آیا ہے کہ: ہر انسان فطرت پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں، یہ اور اسی طرح کے دیگر مُتون سے یہ علماء یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تمام تر انبیاء کا مذہب اسلام ہے اگرچہ ان کے حکام اور شرائع میں حالات اور ثقافت کے لحاظ سے فرق ہے، جس کا مطلب ہے کہ ان مذاہب میں ایک قدرِ مشترک "ذات" ہے جسے دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور جو دوسری چیزوں میں بھی ہے جیسے درخت، پتھر، اور بذاتِ خود انسان.. تمام پتھر اپنی ذات میں پتھر ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کا حجم یا رنگ کیا ہے جسے فلسفہ کی زبان میں عرض کہا جاتا ہے، یہ فارمولا درختوں، انسانوں، جانوروں اور دیگر انواع پر بھی لاگو کیا جاسکتا ہے کہ ان کے تمام تر افراد میں ایک قدر مشترک ہے جو ان کا جوہر ہے، ہر چیز کے جوہر کی دو بنیادی خاصیتیں ہوتی ہیں: دوام اور قائم بالذات ہونا، یہ دونوں خاصیتیں عرض کے بر خلاف ہیں جیسے سفیدی جس کا اپنے آپ میں کوئی مستقل وجود نہیں ہے (یعنی قائم بالذات نہیں ہے) بلکہ یہ دوسرے پر معروض ہوتی ہے، اسی طرح اسے دوام بھی حاصل نہیں بلکہ یہ حالات اور مختلف عوامل کے سبب تبدیل ہوتی ہے، تو اگر فرض کر لیا جائے کہ مذہب کا کوئی ایک جوہر ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جوہر آخر ہے کیا؟ مذاہب میں آخر وہ کون سی قدرِ مشترک ہے جس میں یہ دو خاصیتیں پائی جاتی ہیں یعنی دوام اور قائم بالذات ہونا؟ اور دینِ فطرت سے کیا مراد ہے؟
اس ضمن میں تین امکانات بیان کیے جاسکتے ہیں:

1- شاید مذاہب کے جوہر سے مراد "ذات" ہو، یعنی تمام مذاہب کی قدر مشترک ایک ذات ہو جیسا کہ پتھر، درخت اور انسان کے حوالے سے اوپر ذکر کیا جاچکا ہے، یہ ذات ہی وہ توحیدی فطرت ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں آیا ہے، تاہم یہ معنی لینے میں کئی مسائل ہیں جیسے:

1.1- آیت کہتی ہے کہ "خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا" جبکہ حدیثِ نبوی کہتی ہے کہ تبدیلی ممکن ہے اور والدین اور معاشرہ اسلام اور توحید کی فطرت کو شرک و کفر اور دیگر مذاہب میں بدل سکتے ہیں۔

1.2- فطری چیزوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانی تاریخ کے بیشتر انسانوں میں موجود ہو اور استثناء بہت ہی نادر اور قلیل ہو، جبکہ اس مسئلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ بالکل بر عکس ہے، تمام تر تاریخی تحقیقات اور خود قرآن کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر انسانی اقوام نہ صرف پہلے دینِ شرک پر تھے بلکہ اب بھی ہیں اور یہ کہ شرک کو توحید پر سبقت حاصل رہی ہے۔

1.3- ہر چیز کی ایک ثابت ذات ہونا دراصل ارسطو کا قول ہے جسے بعد کے فلاسفہ نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے خاص کر ہیوم اور وجودی اور ظاہری فلسفہ کی طرف سے کیونکہ چیزوں کی ذات ثابت نہیں کی جا سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل ہر چیز میں صرف صفات کا ہی ادراک کر سکتی ہے، انسان اپنی آزادی کے سبب بے ماہیت وجود ہے اور اپنی ماہیت خود بناتا ہے لہذا ایک جنس کے تمام افراد کے درمیان کوئی مشترک ذات نہیں ہے جسے فطرت کہا جائے چنانچہ دینِ فطرت نامی بھی کوئی شئے نہیں ہے۔

1.4- تینوں توحیدی مذاہب کا توحید کی کسی ایک شکل پر اتفاق نہیں ہے، یہودیت میں بنی اسرائیل کا خدا قومی خدا ہے، میسحیت میں تثلیث ہے، اسلام کا خدا بشری صفات کا حامل ہے، شیعوں کے ہاں اللہ کی ذاتی صفات کچھ اور، اور سنیوں کے ہاں کچھ اور ہیں، اب ان سارے توحیدی مذاہب کے مختلف و متعدد مقولات کے درمیان "دینِ فطرت" کہاں ہے؟

2- شاید جوہر سے مراد "ہدف" ہو، تمام مذاہب کا ہدف مشترک ہے، اور وہ ہے دنیا و آخرت میں سعادت، خوشی و کامرانی کا حصول، یہاں بھی حقیقتِ حال سے متعلق بہت سارے سوالات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، عام مشاہدہ ہے کہ بیشتر مؤمنین مذہب کی سخت پابندی کے باوجود دنیا میں خوشی و کامرانی حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں جبکہ ایسے لوگ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو مذہب پر عمل نہیں کرتے یا مذہب کو سرے سے مانتے ہی نہیں اس کے باوجود وہ خوش و کامران ہوتے ہیں خاص کر ترقی یافتہ ممالک میں، اگر یہ بھی کہا جائے کہ مقصد خوشی و کامرانی کا حصول آخرت میں حاصل کرنا ہے دنیا میں نہیں تو جہاں یہ دعوی معاملے کو مجہول کی کھونٹی پر ٹانگنے کے مترادف ہے وہیں ہر مذہب اس آخرتی مقصد کے حصول کا دعوی کر سکتا ہے اور اسلام کو ان میں کوئی انفرادیت حاصل نہیں ہے۔

3- ہو سکتا ہے مقصد "کام" میں مضمر ہو، یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب یا مذاہب کا مشترکہ کام انسان کو اس دنیاوی زندگی میں طمانیت بخشتا ہے، یا الوہی قوانین کے ذریعے معاشرے کے معاملات کو منظم کرنا ہے وغیرہ.. لیکن استقراء کے ذریعے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذاہب کا یہ کام تین قسموں یا انواع پر مشتمل ہے: نفسیاتی، معاشرتی، اور روحانی...

نفسیاتی پہلو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، مذہب مؤمن کو ایک نفسیاتی راحت عطا کرتا ہے اور اس میں بہتر مستقبل کی امید جگاتا ہے چاہے وہ موت کے بعد ہی کیوں نہ ہو، تاہم یہ کام صرف توحیدی مذاہب پر ہی منحصر نہیں ہے، شرک میں بھی یہ خاصیت بدرجہ اتم موجود ہے، رہا معاشرتی پہلو تو جدیدیت نے یہ کام بھی مذہب سے چھین لیا ہے اور عملاً ثابت کیا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے سول قوانین خدائی شریعت سے زیادہ بہتر اور منصفانہ ہیں مزید بر آں شہریت لوگوں کو بلا تفریق ایک معاشرے میں ضم کرنے کے لیے زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے جہاں مذہب کی بنیاد پر ان کے درمیان تفریق بھی نہیں کرنی پڑتی، رہی بات روحانیت کی تو یہ خوبی بھی کوئی اسلام کی یا توحیدی مذاہب کی جاگیر نہیں، چلتی مثال بدھ مت اور انسانیت کے جدید مفہوم کی ہے جس نے یہ کام توحیدی مذاہب سے کہیں بہتر سرانجام دیا ہے۔

آزادی فکر اور انسانی حقوق

انسانی حقوق کے کام کا مقصد بہت سادہ ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں ہر شخص عزت اور وقار کی زندگی گزارے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مقصد کیسے حاصل ہو؟

آرام دہ محفوظ زندگی بسر کرنے والوں کے لیے جو چیز بامعنی ہو سکتی ہے، ممکن ہے کہ معاشرے کے پسماندہ لوگوں کیلیے اس کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔ اس مسئلے کا احساس اپنے کام کے دوران مجھے ہر روز ہوتا ہے۔ دو الفاظ مجھے اس مسئلہ کے حل میں بہت مدد دیتے ہیں۔ پہلا لفظ "احترام" یعنی ہر ایک کے نقطہ نظر کو سننا اور سمجھنا، اور دوسرا لفظ ہے "ذمہ داری"۔ اپنے حقوق کا حصول اور ان کے ساتھ ذمہ دارانہ طور پر زندگی بسر کرنا تاکہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔

(میری رابنسن، انسانی حقوق کے لیے اقوام متحدہ کی سابقہ ہائی کمشنر)

کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے حقوق کیا ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ ڈیڑھ سو سے زائد حکومتوں نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ ہر ایک کو زندہ رہنے کا حق ہے، کہ لوگوں کو ایک اصولی مقدمہ کے بغیر بند نہیں کیا جا سکتا، کہ آپ کوئی بھی مذہب اپنانے کیلیے آزاد ہیں اور بہت کچھ؟ ۱۹۴۸ میں دنیا بھر کی حکومتیں جنیوا میں اکٹھی ہوئیں اور انسانی حقوق کے عالمی منشور پر متفق ہوئیں۔ انسانی حقوق کے عالمی منشور کی ۳۰ دفعات زندگی کے معنی اور اس کی اقدار بیان کرتی ہیں۔ یہ صرف جنگ زدہ علاقوں یا دور افتادہ جابرانہ آمریت کے شکار لوگوں کیلیے نہیں ہیں۔ یہ ہمارے بارے میں ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔

سوال اٹھتا ہے کہ انسانی حقوق کو نافذ کیسے کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ انسانی حقوق کے لی، صنفی، لسانی یا مذہبی امتیاز کے بغیر حاصل ہونا چاہیئے- یہاں ہم مکمل منشور پر گفتگو کے بجائے اس کی تین دفعات پر بات کریں گے- جو مندرجہ ذیل ہیں:

ا- ہم سب آزاد اور برابر ہیں-

۲-سوچنے کی آزادی-

۳-اظہار رائے کی آزادی-

"سب انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور سب کے حقوق ایک جیسے ہیں- ہر شخص سوچنے کی قوت اور ضمیر رکھتا ہے- اس لیے اسے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کا رویہ رکھنا چاہیئے-"

زمانہ قدیم سے لوگ باگ اور کئی جگہ گروہ یہی سمجھتے رہے ہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عقلمند، سمجھدار، تہذیب یافتہ، خوش شکل اور خوش مزاج وغیرہ ہیں- یہ ایک غیر منطقی اور مبنی بر تعصب سوچ ہے- کوئی کسی سے بہتر نہیں- فطرت کے اصول کے مطابق تمام انسان برابر ہیں- ہم سب برابر ہیں- ہم ایک دوسرے سے، ایک معاشرہ یا ایک تہذیب دوسرے سے منفرد اور مختلف ہو سکتی ہے، بلکہ ہر موجود میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہے- انسان اپنی زندگی کے ہر دور میں انسان رہا ہے- تمام انسانیت ایک خاندان ہے- ان میں برتری و کمتری کی تعلیم خود غرضی کا پیش خیمہ ہے- فطرت ساری انسانیت کو ایک گردانتی ہے- معاشرہ میں ہر ایک، دوسرے سے برابری کی نسبت رکھتا ہے- ایسا نہیں ہوتا کہ ایک فرد یا گروہ تو منتخب و محبوب ہو، اور باقی سب کمتر و ملعون- تاریخ کا تنقیدی جائزہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو انسان سے نفرت کرنے کا سبق سکھانے کے نت نئے بہانے دراصل بیمار ذہنوں کی پیداوار ہیں-

"تمام انسانیت ایک خاندان ہے، جس میں نہ تفریق ہے نہ امتیاز- اس میں تفریق و امتیاز پیدا کرنے والے انسان دوست نہیں کہلائے جاسکتے-"

(جون ایلیا)

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جب دنیا میں اتنا فساد، انارکی، جنگ وغیرہ جاری ہیں تو ایسے میں اس بات کو کیسے منوایا جاسکتا ہے؟ ہمیں کسی سے کچھ منوانے سے غرض نہیں ہے اور نہ ہی ہونی چاہیئے- ہم لوگوں کو ایک دوسرے، اور ایک دوسرے کے حقوق کا احترام صرف تعلیم اور باخبر کرکے ہی سکھا سکتے ہیں- ہر انسان کی نشوونما میں ثقافتی اقدار (جس کا تعلق تہذیب و تمدن، اخلاق

وکردار، رسم ورواج، علوم وفنون وغیرہ سے ہے) اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر ہم اپنے حقوق اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو انسان سمجھنے لگ جائیں، اور یہ جان لیں کہ وہ بھی اتنے ہی حقوق رکھتا ہے جتنے کہ ہم، تب ہم نہایت سکون سے امن سے نہ صرف اکھٹے رہ سکتے ہیں۔ بلکہ ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، لسانی وغیرہ جیسے تعصب سے بھی جان چھڑا کر ایک پر امن فضا قائم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا سمجھنے میں غلطی کر دیں یا ناکام ہو جائیں یا دوسروں کو وہ حقوق دینے کو تیار نہ ہوں جو خود اپنے لیے چاہتے ہیں، تب ہم اپنے معاشرہ کی بنیاد کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اور انسانیت کی قبر کھود رہے ہیں اور معاشرہ کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ کیونکہ خود کو سب سے بہتر سمجھ کر (انفرادی واجتماعی طور پر) ہم انسانی عالمگیر اقدار میں کہ جس کی بنیاد اخلاقی اقدار پر رکھی گئی ہیں، ہم تمام انسانیت کی نفی کر رہے ہیں۔ جب تک ہم سب کو برابر اور آزاد نہ سمجھیں گے، ہم مل جل کر انسانی ناطے کے طور پر پرسکون اور خوشگوار زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ لہذا اپنے معاشرہ کو پر امن گھوارا بنانے کیلیے ہر ایک انسان کے حقوق و فرائض کی پاسداری لازمی ہے۔

۲۔سوچنے کی آزادی:

"ہر ایک کو حق ہے کہ وہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے عقیدہ اختیار کرے۔ اگر چاہے تو اپنی رائے یا عقیدہ تبدیل کر لے، اپنے احساسات کے مطابق عبادت کرے، اس کی تبلیغ کرے اور جس طرح جانے اپنے مذہبی تہوار منائے اور ان کو منظم کرے۔"

"ان سب لوگوں کے بارے میں سوچیں جنہوں نے اتنے سارے نئے خیالات دیے، چاہے وہ دنیا کی تخلیق کے بارے میں تھے یا مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں، یا ایک ملک کو چلانے کے بہترین طریقے کے بارے میں۔ کون صحیح ہے؟ ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی صحیح یا غلط جواب نہیں ہے۔ تو پھر کیا لوگوں کو ان کے عقیدے کی بنیاد پر سزائیں دینا غلط نہیں ہے؟ کسی کو اپنے مذہب کی پیروی سے روکنا غلط نہیں ہے؟ لوگوں کو اپنی سوچ کی وجہ سے اذیت اٹھانا پڑی ہے، یہ کب ختم ہو گا؟"

معروف انتھروپالوجسٹ یوسف شاہین لکھتے ہیں:

"۱۳اپریل ۱۹۳۹ء کو ضلع حیدر آباد کے ایک چھوٹے سے شہر نصرپور میں میرا جنم ہوا۔ اس وقت دنیا میں فیصلے مسلط کرنے کا رواج عام تھا بلکہ یہ عمل ہمارے کلچر کا حصہ بن چکا تھا۔ میرے دادا نے میرے کان میں اذاں دے کر مجھے مسلمان قرار دے دیا۔ حالانکہ اصولی طور پر مجھے یہ حق ملنا چاہیئے تھا کہ میں بالغ ہونے کے بعد چھان بین کر کے اپنی سمجھ اور مرضی سے کوئی ایسا مذہب قبول کرتا جسے میں خود صحیح سمجھتا۔ چاہے وہ مذہب اسلام ہی کیوں نہ ہوتا۔ میرے دادا نے اپنے مذہب کو جس طرح مجھ

پر مسلط کیا وہ طریقہ انتہائی قابل اعتراض، غیر جمہوری اور آمرانہ تھا-افسوس یہ ہے کہ آج ساری دنیا میں تمام لوگ اس آمرانہ اور غیر جمہوری پالیسی کا شکار ہیں-عیسائی کے گھر پیدا ہونے والا عیسائی بنادیا جاتا ہے-ہندو کے گھر پیدا ہونے والا ہندو کر دیا جاتا ہے-یہی حالت یہودیت، بدھمت اور دوسرے مذاہب کی ہے-حد تو یہ ہے کہ کوئی بھی شخص مسلط کردہ مذہب کو چھوڑ نہیں سکتا-تقریبا" تمام مذاہب نے اس کی سزا موت رکھی ہے-چونکہ مذہب میں ہر بات "حرف آخر" ہوتی ہے، اس لیے مذہب پر تنقید بھی نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس میں آسانی کے ساتھ اصلاحات کی بات کرسکتے ہیں-مذہب چھوڑنے یا بدلنے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے جھوٹے مذاہب ختم نہیں ہوسکتے-گزشتہ پانچ ہزار سال سے صرف "فاتحین" کو یہ حق حاصل رہا ہے کہ وہ جب چاہیں اور جس کا چاہیں مذہب بدلوادیں-ہم خود اس مسئلے پر کوئی جمہوری انداز اپنانے کو تیار نہیں اور نہ ہی جمہوریت کو "سقراط" کے دور سے آگے لے جانا چاہتے ہیں-

۳۹۹ قبل مسیح میں سقراط کو زہر دے کر مارا گیا-اس پر الزام تھا کہ وہ نوجوانوں کے ذہن خراب کررہا تھا-سقراط نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک چلائی-وہ خاموش طبیعت، صوفی منش انسان صرف عام اجتماعات یا محفلوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا-اس نے یونانی مذہب کو مسترد نہیں کیا جو آج دیومالائی قصہ بن چکا ہے-سقراط یونانی خداؤں کی نہ صرف عبادت کرتا تھا بلکہ ان کے آگے قربانیاں بھی دیتا تھا-جو اس وقت مذہب کا اہم فریضہ تھا-وہ غالبا" یونانی مذہب میں اصلاحات لانے کی تبلیغ کرتا تھا-اتنی معمولی سی بات پر اسے موت کی سزا دی گئی-اس وقت یونان میں جمہوریت نافذ تھی-وہ جمہوریت کس معیار کی تھی، اس کا آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے-بہر حال، لوگوں کو اگر یہ جمہوری حق دیا جائے کہ وہ اپنا مذہب رضامندی سے تبدیل کرسکیں، تو دنیا کی صورتحال کافی مختلف ہوسکتی ہے-کم از کم جھوٹے مذاہب سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے-جب بات جھوٹے اور سچے مذاہب کی کی جائے تو یہ معاملہ حل طلب ہوجاتا ہے کہ کون سے مذاہب سچے اور جھوٹے ہیں-سب لوگ اپنے مذہب کو صحیح اور سچا قرار دیتے ہیں-بہر حال، یہ بات بڑی پیچیدہ اور الجھن پیدا کرنے والی ہے-اس نقطے پر صرف ایک ناقابل تردید بات ملتی ہے کہ اس وقت جتنے بھی مذاہب موجود ہیں وہ سب کے سب نوع انسانی پر "فاتحین" نے زبردستی تلوار کے زور پر مسلط کیے-ہمارے آباؤاجداد نے رضامندی سے فاتحین کے مذاہب قبول نہیں کیے-اس لیے جو فیصلے جبر سے کرائے گئے، وہ سب کے سب کالعدم ہوجاتے ہیں-دنیا کا کوئی قانون زبردستی جبر سے کرائے گئے فیصلوں کو نہیں مانتا-یہ فاتحین کا نہیں عوام کا دور ہے-یہ علم سائنس تحقیق اور مہارت کا دور ہے-ہمیں نئے سرے سے تمام معاملات کی چھان بین کرنی چاہیئے-"

انسان لاکھوں برس سے اس کرہ ارض پر آباد چلا آرہا ہے- مدنی یا معاشرتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد انسان کی ضروریات اور ان کے حصول کے تجسس نے اسے کرہ ارض کے مختلف اسرار و رموز کو جاننے پر آمادہ کیا- اور اس طرح زمین پر پائی جانے والی اشیاء ان کی افادیت و اہمیت اسے زمین کے کونے کونے پر لے گئی- آبادی کے اضافے نے انسانوں کو کوئی گروہوں کی شکل دے دی اور تلاش معاش نے انہیں زمین کے مختلف خطوں میں پھیلا دیا- ہر قوم نے اپنے زیر قبضہ خطہ زمین پر اقتدار قائم کرکے وہاں کی ریاست و حکومت کے مسائل کو بہتر سے بہترین کی طرف لے کر جانے کی کوشش کی، اس انسانی ضروریات و خواہشات نے تہذیبوں کے درمیان آپس میں تعاون و اتحاد، تجارت، سفارت وغیرہ کو فروغ دیا- وہیں لڑائی جھگڑے و جنگیں بھی ہوئیں- ہر خطے کی تہذیب نے اپنے سماجی شعور کے حساب سے علم و تمدن میں ترقی کی- اور تجارت و سیاحت کی ترقی سے تہذیبی و ثقافتی رشتے بھی استوار ہوئے- اور تہذیبوں میں خیالات و تصورات و نظریات کی بھی ترسیل ہوئی- یہاں ہم دیکھتے ہیں کے ہر نظریہ، فلسفہ، ادب و فن کی طرح ایک مخصوص تہذیبی روح کا مظہر ہوتا ہے- اس کی زندگی ایک تہذیب و تمدن سے وابستہ ہوتی ہے جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں- اس بات سے کسی کو مفر نہیں کے ہر تہذیب تاریخ میں ایک جدا اور منفرد مقام رکھتی ہے- اس دور کا فلسفہ اپنے زمان و مکان کا پابند، اور سماجی شعور کا آئینہ ہوتا ہے- وہ ایک مخصوص دور کے نابغہ کی مساعی ذہن اور جمالی وجدان کا مرہون منت ہے اور اسے اسی سماجی شعور کے سیاق و سباق میں رکھ کر سمجھا جاسکتا ہے- کسی بھی مخصوص عقیدہ یا نظریہ کا مطالعہ دراصل کسی آفاقی اور الوہی تفکر کا مطالعہ نہیں بلکہ اس سماجی و ثقافتی اکائیوں کا مطالعہ قرار پاتا ہے کہ جس سماجی شعور سے وہ پھوٹتے ہیں- کسی بھی نظریہ عقیدہ فلسفہ کو اس کے ثقافتی و تہذیبی سماجی سیاق سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کیجیے تو ہم اس میں وہ قوت محرکہ نہیں پائیں گے جو اس نظریہ یا عقیدہ وغیرہ کی روح سمجھی جاتی ہیں۔

ہم کسی بھی مفکر کی فکر کو اس کے عہد کی میکانی زندگی سے جدا کرکے دیکھیں تو اس کے مسائل سمجھنے میں دشواری ہوگی- لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ انسان ایک جگہ محدود یا جم کر نہیں رہتا- اس کا سابقہ دوسرے انسانوں سے بھی رہتا ہے- یہ متحرک وجود رکھتا ہے- اسی طرح ایک تہذیب دوسری تہذیب سے مکمل طور پر علیحدہ ہوکر پروان نہیں چڑھتی- جیساکہ ہم نے اوپر بھی اشارہ کیا، امتداد زمانہ سے خیالات پھیلتے، قبول ہوتے اور بدلتے جاتے ہیں- اور اسی طرح مختلف تہذیبی اکائیاں اپنے منفرد فلسفے رکھنے کے باوجود دوسروں کے افکار سے استفادہ کرتی ہیں تو اس میں توارد اور سرقہ دونوں کا ہی عمل کام کرتا ہے- اور مختلف فلسفوں میں مشابہت نظر آتی ہے- بعض جگہ مسائل مشترک ہو جاتے ہیں- بعض اوقات ان کے حل میں مناسبت اور مشابہت نظر آتی ہے- اس طرح عقائد نظریات و تصورات کو دیکھیں تو وہ انسانوں کا ثقافتی ورثہ اور افراد کی کاوش ذہنی کا ثمر قرار پاتا ہے- اس ضمن میں پیپرس کے کتبات (مردوں کی کتاب:The book of dead) سے اقتباس اور حکایتوں و قوانین

واخلاقی اقداروں کا بائبل کے لکھنے والوں نے سرقہ کیا- قدیم مصری عقائد خاص کر گلگامش کی روایتوں سے زرتشتر امت کا متاثر ہونا اور دونوں سے اسلامی عقائد کا بنانا وغیرہ وغیرہ-

لہذا، سب کو سوچنا چاہئیے، بلکہ اس بات پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہئیے کہ کسی عقیدے پر قائم رہ کر یا کسی مذہبی فرقہ سے جڑ کر کیا کھویا کیا پایا- اور اس پر یعنی اپنے عقیدے پر رہ کر ہم اس کے مطلق درست اور راست پر ہونے کا دعوی صرف اس بنا پر کرتے ہیں کہ ایسا کوئی مذہبی کتاب کہتی ہے یا ایسا کوئی خدا اپنی کتاب میں اپنے پیغمبر سے کہتا ہے- یہی خیال ہر عقیدے سے تعلق رکھنے والے کا ہے چاہے وہ مجوسی ہو ہندو ہو یہودی ہو یا مسلمان ہو- سب کے پاس اپنے عقیدے کے درست ہونے کیلیے وہی دلیل وہی استدلال ہیں جو کہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے کے پاس ہوتے ہیں- لیکن ایسا کرنا کہ سب کو اپنے مذہب کے علاوہ قابل گردن زنی گردانا، مخالف سوچ رکھنے والوں کو قابل نفرت جاننا، اور اس بنا پر ان سے تضحیک آمیز سلوک رکھنا، انہیں اچھوت یا کمتر خیال کرنا قطعی طور پر غیر دانشمندی ہے- کوئی ایک گروہ یا مذہب دانشوری کی معراج نہیں ہے، نہ ہی اس کی مقتدرہ ہستی عقل کل تھی جبکہ ہونا تو یہ چاہئیے کہ اس مقتدرہ ہستیوں کے کردار و تعلیمات کو عہد حاضر کی سائنسی سوچ اور نئے اخلاقیات کی روشنی میں پرکھا جائے- اور دیکھ سکیں اور جان سکیں کہ جن مقتدرہ ہستیوں کی تعلیمات و تصورات سے ہم سند ڈھونڈلاتے ہیں خود ان کا علم کیا اور کتنا تھا- بہر حال، ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کے کسی عقیدے پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کی نفی کرنے کیلیے ہر حد سے گزر جائیں صرف اس لیے کہ ہمارے نزدیک ہمارا عقیدہ درست ہے- کون سا عقیدہ صحیح ہے یا کون سا غلط، اس رمز میں جائے بغیر ہمیں سب کو وہی عزت احترام دینا ہو گا جو ہم اپنے لیے چاہتے ہیں- ہم جب تک ہم اپنے عقیدے کو درست مان کر، اور مذہبی بنیاد پر خود کو اس عقیدے یا مذہب سے باہر انسانوں کے مقابلے میں برتر اور فائق سمجھتے رہیں گے- اور تہذیبی نرگسیت کا شکار ہو کر اپنے مذہب کی بڑائی اور اس کی سربلندی کیلیے جدوجہد کرتے رہیں گے، تب تک ہم معاشرہ کو پرامن اور سب عقیدوں سے تعلق رکھنے والوں کیلیے رہنے لائق نہیں بنا سکتے- ادعائیت کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے عقیدہ سے تعلق رکھنے والوں کیلیے جھوٹی بڑائی اور تعریف کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور یہی جذبہ دوسرے عقائد سے تعلق رکھنے والوں کے خلاف نفرت اور عناد پیدا کرتا ہے- ایسے لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ اپنے مذہب کے لوگ جو کچھ بھی کریں یا کہیں وہ ٹھیک ہے اور دوسرے مذہب کے لوگ جو کچھ کریں وہ غلط ہے-

جارحانہ عقائد پرستی استحصال کی ایک منظم ترین شکل کی صورت اختیار کر لیتی ہے- اور اپنے گروہی / مذہبی / فرقہ وارانہ مفاد کی خاطر دوسرے مذہبی گروہ / فرقوں کے جائز مفاد کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ اسے پورے طور سے قربان کر دیا جاتا ہے- جب تک تنگ نظر جارحانہ پرستی کو ترک نہ کیا جائے گا اس وقت تک ہم اپنے معاشرے میں کوئی پائدار اور اچھا سماجی نظام

اور پائدار اور ابدی امن قائم نہیں ہو سکتا- عقائد میں ادعائیت اور پھر اس جارحانہ رویہ انسانیت کیلیے کافی سے نقصان دہ ہے کسی بھی معاشرے میں ہر طرح خیالات، نظریات و تصورات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں- اس میں کئی مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوسکتے ہیں- لادین اور روشن خیال بھی ہوسکتے ہیں- ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے تمام گروہ ایک دوسرے کی مذہبی نظر سے بالاتر ہو کر دیکھیں اور ایک دوسرے کے خیالات وعقائد کا احترام کریں اور باہمی اختلافات کی کسی بھی صورت کو پرامن طریقے سے دور کرنے کی کوشش کریں- ہر مذہبی گروہ میں اپنی بڑائی یا برتری کا جذبہ پایا جاتا ہے- وہ اپنے آپ کو دوسروں سے ہر لحاظ سے برتر و فائق سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے اس سوچ کے ساتھ مخالف نقطہ نظر رکھنے والے گروہوں سے دشمنی، تعصب اور منافرت کا جذبہ ہی پیدا ہو سکتا ہے- کہ جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ہولناک دنگے فساد، لڑائی جھگڑے، خون ریز خانہ جنگی ہونے کے امکان ہر وقت تازہ رہتے ہیں- ان باتوں سے نہ تو کسی معاشرہ میں امن قائم رہ سکتا ہے نہ ہی کسی کا جان و مال محفوظ رہ سکتا ہے نہ ہی اس معاشرہ میں انسانیت کا معیار ترقی کر سکتا ہے- سب کی بھلائی اور ترقی تب ہی ہو سکتی ہے کہ جب سب مذہبی گروہ ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کریں اور سب کو اس کا عقیدہ رکھنے، اس پر پابند رہنے کی مکمل آزادی ہو- اور ان معاملات میں ان میں تعاون کا جذبہ پایا جاتا ہو ایک سماج میں مختلف گروہ اور جماعتیں موجود ہو سکتی ہیں- ان کے اختلافات معاشی، مذہبی اور رہن سہن وغیرہ کے ہو سکتے ہیں- ان کی سوچ کی مختلف راہیں ہو سکتی ہیں اور اکثر اسی سبب سے سماج کے مختلف گروہ مختلف مقاصد رکھتے ہیں اور ان کے نفوذ کے خواہاں رہتے ہیں- لیکن اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہ ایک کثیر الجہتی معاشرہ میں سب کی ضروریات و مفادات کیلیے کثیر الجماعتی مقاصد سامنے رکھ کر نظام اور طریقے رواج دیے جائیں- اس ضمن میں دیکھا جائے تو اکثر جگہ یہی بات مشترک نظر آتی ہے کہ معاشرے کی نمائندہ یا ذی اثر جماعت اپنے نظریات کو نافذ کرنا چاہتی ہے- سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ روایات کے تحفظ کی خواہش- سماج کی بقا میں تو روایت کی اہمیت سے کسے انکار ہو گا- لیکن کون سی روایات محفوظ رہیں اور کون سی متروک ہو جائیں، اس کا طے کرنا ایک اعلی مطمح نظر بن جاتا ہے لیکن سماجی قرار کی بات ہو یا سماجی تغیر کی، بہر حال ان سب چیزوں کو سماجی حقائق سے وابستہ کر کے دیکھنا چاہئیے- اور ایک کثیر الثقافتی معاشرہ میں سب ثقافتوں و مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو مد نظر رکھ کر ہی اس کے قوانین و اقدار کا تعین کرنا ازحد ضروری ہے- معاشرہ کے اکثریتی گروہ کو معاشرہ کا محافظ ہونا چاہئیے- یہ گروہ معاشرہ یا سماج کی امنگوں، عزائم، حوصلوں اور امیدوں کا امین ہے اور ان سے معاشرہ کے تمام گروہوں کو واقف کرانا ان لوگوں کے فرائض میں سے ہے- اگر معاشرہ کا یہ طبقہ ان باتوں پر عمل نہیں کرتا تو وہ سماج کا دشمن قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اخلاقی، معاشی اور تاریخی اعتبار سے اس قسم کا جواز دینا ممکن نہیں کہ یہ امتیازات حق ہیں کہ عقائد و خیالات کی بنا پر امتیازات کو جائز قرار دیا- رسل نے جتلایا کہ اس قسم کی باتیں جھوٹ اور کذب کی تعلیم کی دنیا ہے- کیا یہ جھوٹ نہیں کہ انسانی تعصبات کے نتیجہ میں

پیدا ہونے والے اختلافات اور معاشرتی بے انصافیوں کو حکم خداوندی کہہ کر جائز قرار دیا جائے؟ اور سماجی اختلافات و امتیازات کے باوجود یہ باور کرایا جائے کہ ہمارا معاشرہ سارے ممکنہ عالموں میں بہترین عالم اور معاشرہ ہے؟ اگر ایک معاشرہ کی غالب مذہبی جماعت اس بات کی تبلیغ کرتی ہے تو وہ جھوٹی ہے۔ اور اگر "سب کو اپنی سوچ کی آزادی" دینے کے حق کے حقائق کو جائز نہ سمجھ کر ان کی تبلیغ کریں اور درپردہ اپنی بات کی اہمیت منوانا چاہیں، تو بزدل ہیں۔

۳۔اظہار رائے کی آزادی۔

"ہر شخص کو کسی دوسرے کی مداخلت کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق سوچنے اور اس کے اظہار کی آزادی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی ذریعہ ابلاغ سے، کسی بھی ملک میں ایسا کرنا چاہے۔"

"ارے آپ یہ نہیں کر سکتے۔" "اوہ! آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔" "آپ سے کسی نے یہ کتنی بار کہا ہے؟ اگر آپ کا جواب" کبھی نہیں" ہے تو آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں۔ صدیوں سے لوگوں کو اپنی سوچ کے اظہار سے روکا گیا ہے۔ آرٹسٹ اور لکھنے والے خاص طور پر اس مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں۔ شاید آپ یہ سوچیں کہ کسی اور کا کام تباہ کر دینا ہر صورت میں غلط ہے، مگر دوبارہ سوچیے۔ ان لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو انٹرنیٹ پر عریاں اور نسل پرست مواد بھیجتے ہیں؟ انہیں اس کی اجازت ہونی چاہیئے یا نہیں؟ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنی سوچ کے اظہار کا حق ہے مگر یہ بات اتنی آسان بھی نہیں ہے!" اس ضمن میں مشہور فرانسیسی مفکر والٹیر (Voltaire) نے کہا تھا:

"I disagree entirely with what you say, but I shall defend to the death you'r right to say it!"

(ترجمہ: آپ جو کہہ رہے ہیں میں اس سے قطعی متفق نہیں لیکن آپ کے کہنے کے حق کیلیے میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں)

والٹیر کے ان الفاظ سے بہتر جمہوریت اور آزادی کی کوئی تعریف نہیں ہو سکتی. ایک صاحب سڑک پر چلے جا رہے تھے اور اپنی چھڑی کو چاروں طرف زور زور سے گھما رہے تھے. یہ گھومتی ہوئی چھڑی ایک دوسرے صاحب کے چہرے کے قریب سے گزر گئی تو انہوں نے پہلے صاحب کو روکا اور پوچھا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ جواب ملا کہ میں اپنی آزادی کا مظاہرہ کر رہا ہوں. دوسرے صاحب نے کہا: "لیکن یاد رہے کہ آپ کی آزادی وہاں ختم ہوتی ہے جہاں میری ناک شروع ہوتی ہے." سارتخ نے حریت اور آزادی اظہار رائے کو انسان کی کہنہ قرار دیا۔ آرویل کہتے ہیں کہ دو اور دو، چار کہنے کی آزادی ہی اصل آزادی

ہے-جولوگ آزادی اظہار رائے پر قدغن لگاتے ہیں وہ دراصل خوفزدہ لوگ ہیں جو اسے سہار نہیں سکتے اور خود فریبی کا شکار رہتے ہیں- آزادی اظہار رائے کا حق ہر انسان کا بنیادی حق ہے-اسے کوئی اس سے چھین نہیں سکتا-نہ جانے کب انسان کے اس حق کو تسلیم کیا جائے گا اور اسے رائے کے اظہار کا حق دیا جائے گا کہ اس کی رائے اس کے اختلاف پر اسے جبر و تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اسے اس بات پر قابل گردن زنی نہ گردانا جائے گا-اس پر زمین تنگ نہ کی جائی گی-یہ غلط ہی نہیں انسانیت کا استحصال بھی ہے-ہر ایک کو سوچنے اور بولنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔

بولنے سے مجھے کیوں روکتے ہو؟

بولنے دو، کہ میرا بولنا دراصل گواہی ہے-

میرے ہونے کی-

تم نہیں بولنے دوگے تو میں سناٹے کی-

بولی ہی میں بول اٹھوں گا-

میں تو بولوں گا-

نہ بولوں گا تو مر جاؤں گا-

بولنا ہی تو شرف ہے میرا-

کبھی اس نکتے پہ بھی غور کیا ہے تم نے-

کہ فرشتے بھی نہیں بولتے-

میں بولتا ہوں-

حق سے گفتار کی نعمت صرف انسان کو ملی-

صرف وہ بولتا ہے-

صرف میں بولتا ہوں-

بولنے مجھ کو نہ دوگے تو مرے جسم کا-

ایک ایک مسام بول اٹھے گا-

کہ جب بولنا منصب ہی فقط میرا ہے-

میں نہ بولوں گا تو کوئی بھی نہیں بولے گا-

آخر ش اس شعر کے ساتھ اجازت دیجیے:-

"لکھتے رہے جنوں کی حکایت خونچکاں-
ہر چند کہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے-"

حق موجود یا حق غیر موجود

حق غیر موجود مابعد الطبعیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو ہمیں ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے. اور ابدی اور لافانی مسائل کی حقیقت سے روشناس کراتی ہے. مابعد الطبعیات،حیات و کائنات اور خدا کے تصور کو زیر بحث لاتی ہے. اس میں مادی اور غیر مادی مسائل شامل ہیں،جس کی حقیقت کی تلاش میں فلسفی سرگرداں رہتاہے. اور غور و فکر کرکے مختلف سوالات کرتا ہے. مثلاً کیا کوئی ایسی لافانی طاقت ہے جو حیات و کائنات کے نظام کو کنٹرول کیے ہوئے ہے؟ اس عالم کا نقطہ آغاز کیاہے؟ اور ابتدائی سرچشمہ کیاہے؟ وغیرہ وغیرہ

ہم یہاں اسلامی نقطۂ نظر سے اس عالم کے نقطہ آغاز کی بابت مابعد الطبعیات پر بات کریں گے اور دیکھیں گے اللہ اور اس کے رسول کا اس کائنات کی تخلیق کے متعلق دعوی کیاہے؟. اور اس دعوے کی حیثیت کیاہے. اہل مذاہب کا خدا کا تصور یا تو جابر سردارِ قبیلہ کے تصور کے مترادف ہے،جس کے احکامات کو بے چوں چراں مان لیاجائے یا پھر ایک ایسے سادہ باپ کی مانند ہے جو اپنی اولاد کے معاملات میں دلچسپی تو لیتاہے لیکن زیادہ روک ٹوک کا قائل نہیں. یہودیت،عیسائیت،اور اسلام میں خدا اور بندے کا تعلق انہی تصورات کے گرد گھومتاہے. جس میں خدا کہیں انتہائی مہربان اور شفیق نظر آتاہے تو کہیں اچانک اس کے تیور بدل جاتے ہیں اور وہ ذرا ذرا سی بات پر بے انتہا خفا نظر آتاہے. جب خدا اور کائنات کے تعلق کا ذکر آتاہے اور ایسی کائنات کے جس میں یہ دنیا اور اس میں بسنے والے بھی شمار ہوتے ہیں تو پھر روحانی مقنن اور آسمانی باپ کی جگہ ایک عظیم صناع لے لیتاہے. قرآن کی سورہ اعراف کی آیت نمبر54اور سورہ فصلتی آیت نمبر 9 تا 12 میں بتایا گیاہے کہ خدا نے کس طرح چھ یا آٹھ دنوں میں صنعت گری کرتے ہوئے اس عالم کو خلق کیا. اگر خدا کو فطرت و موجوداتِ عالم کی صورت گری کیلئے بطور ایک فنکار،صناع یا مصور تسلیم کرلیاجائے تو اس سے انسانی مقام و مرتبہ مجروح ہوتاہے. لہذا اس قسم کے خدا کے تصور سے انکار ناگریز ہوجاتاہے. ظاہر ہے جب ایک صانع مصنوعات کو بناتاہے، مثلاً ایک معمار مکان بناتاہے یا جولاہا کپڑے بناتاہے،تب ظاہر ہے کمہار بغیر مٹی کے اور نجار بغیر لکڑی کے کیا اپنی صنعتی قوت کا اظہار کرسکتاہے؟ پھر اس عظیم صناع نے اس عالم کی صنعت گری کس چیز سے کی؟اس تناظر میں یہ بات لازم ہو جاتی ہے کہ عدم میں خدا کی طرح مادہ بھی خود بخود موجود تھا. اور اس مادے سے خدا نے اس عالمِ رنگ و بو کی صنعت گری کی. لیکن یہاں بھی مذہب یہ کہتاہے کہ اس عالم کے

خلق ہونے سے پہلے عدم تھا، اور خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا جو ہمیشہ سے ہے اب ایک نیا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ جب عدم تھا یعنی جب کچھ نہ تھا، تب اس "کچھ نہ تھا" میں خدا کہاں سے آیا؟ پھر اس عدم میں خدا کے ساتھ ساتھ وہ کائناتی مادہ بھی موجود تھا جس سے خدا نے اس عالم کو خلق کیا. اب یا تو صرف عدم تھا جس میں واقعتاً اور حقیقتاً کچھ نہیں تھا، یا پھر اس عدم میں خدا اور مادہ دونوں موجود تھے اور عدم نہ تھا. یہاں قرآن کی ایک آیت اس بات پر استدلال کرتی ہے کہ عدم یعنی جب کچھ نہ تھا تب بھی خدا نہ صرف موجود تھا بلکہ کائناتی مادہ بھی اس عدم میں موجود تھا، جس سے خدا نے اس عالم کو خلق کیا.

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿سورۃ النحل ۴۰﴾

ترجمہ: ہم جس کام کے کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہم اسے کہہ دیں کہ ہو جا پھر ہو جاتا ہے

گویا ایک عظیم صناع "اس" یعنی لحہ موجود میں موجود مادہ سے کہہ رہا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے. یعنی جب کون و مکان نہ تھا، نہ زمین تھی نہ کائنات تھی، نہ یہ عالم تھا، جب کچھ نہ تھا صرف عدم تھا اور اس عدم میں بھی خدا موجود تھا، اب توحید کا تقاضہ تو یہ ہے کے صرف خدا کا وجود ہونا چاہئے تھا، لیکن عدم سے پرے. مگر خدا عدم میں ہی تھا، اور تب ہی خدا کسی "اس" سے کہتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے. یہ آیت استدلال کرتی ہے کہ عدم میں خدا بھی تھا اور کوئی "اس" بھی تھا. ظاہر ہے یہ "اس" کائناتی مادہ ہی تھا. جس سے خدا نے اس عالمِ رنگ و بو کو خلق کیا. گویا خدا واحد نہیں تھا بلکہ مادہ اس کا شریک تھا. جس کی مدد سے اس نے صنعت گری کی. یعنی مادہ کے بغیر اس کائنات کی صنعت گری ممکن ہی نہ تھی، اور مادہ اور خدا دونوں ہی عدم میں موجود تھے. اب کچھ متکلم الہیاتی مدرسے کہتے ہیں کہ مادہ "روحانی" تھا. اور اس روحانی مادے سے خدا نے اس کائنات کو خلق کیا. لیکن یہ استدلال اپنی ماہیت میں غیر منطقی ہے. روحانی مادے سے وجودی مادہ خلق کرنے کا کہنا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ میں نے ذہن میں کسی چیز کا تصور کیا اور لحہ موجود میں حقیقتاً آن موجود ہوئی. لہٰذا اولین مادے کو روحانی متصور کرنا لغو خیال ہے. کائنات کی تخلیق کے متعلق قرآن کی سورہ اعراف میں کون و مکان کو زمان کی قید میں تخلیق کرنے کی بات کی جا رہی ہے، اور یہ بات ایسے ہی ہے جیسے ٹیلی وژن کا موجد کہہ رہا ہو کے میں ٹیلی وژن کی ایجاد کے وقت ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا. زمان کی قید میں رہتے ہوئے مکان کو خلق کرنے کا دعوی ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس دعوی میں کتنی لغویت ہے. جب زمان تھا ہی نہیں تب یہ خالق زماں کی حدود و قیود میں کیسے آ گیا؟ کیا جب خالق اس کائنات کو خلق کر رہا تھا اس وقت وہ کسی ایسے کرہ پر موجود تھا جس میں دن اور رات کا آنا جانا لگا ہوا تھا؟ گویا اس عالم کے خلق کرنے والے نے اس عالم کو کسی کرے پر موجود رہ کر خلق کیا. اور وہ جس کرے پر موجود تھا، وہ کرہ کسی سورج کے قریب موجود کوئی سیارہ تھا! جس پر سورج کے گرد گردشوں کی وجہ سے دن اور رات کا آنا جانا لگا تھا. جو چیز خلق کی جا رہی ہو اس کی پہلے سے موجودگی چہ معنی دارد؟ یہ

تصور ہی لایعنی اور فضول ہے۔ اگر ہم نے کوئی ناول لکھنا ہو تو ہم پہلے سے اس کے کردار اور مرکزی خیال وغیرہ کے متعلق خامہ فرسائی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم سے کوئی پوچھے کے ناول میں کیا ہو گا؟ تب ہم اس ناول کے تصور پر قیاس آرائی کریں گے، اس کے پلاٹ پر بات کریں گے، لیکن ایسا قطعی نہیں ہے کہ ہم مستقبل قریب میں لکھے جانے والے ناول کو پہلے سے ہی کسی کو پڑھنے کیلئے دے دیں۔ اور کہیں کہ جناب یہ لکھنا ہے مستقبل قریب میں! کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو ایجاد کسی موجد نے مستقبل میں ایجاد کرنی ہو لیکن وہ اس کے ایجاد کرنے سے پہلے ہی اسے استعمال کر رہا ہو؟ اب ظاہر ہے جب نہ زمان تھا نہ مکان تھا، تب انہی کی موجودگی میں ان کو خلق کرنے کی بات کی جا رہی ہے، جو کے صاف ظاہر ہے لایعنی ہے اور یہ دعوی بے بنیاد ٹھہرتا ہے۔ یہ دعوی اس اعتبار سے بھی لغو ہے کے دن اور رات کا آنا جانا صرف ان سیاروں میں پایا جاتا ہے جو اس عالم میں موجود کسی بھی نظام شمسی کا حصہ ہوں۔ ظاہر ہے جب کوئی نظام شمسی ہی نہ تھا پھر دن اور رات کے سانچے میں کس کو تخلیق کیا جا رہا تھا۔ ایسا دعوی ایک انسان کر سکتا ہے کوئی قادر مطلق خدا نہیں، جس نے واقعتاً اور حقیقتاً اس عالم کو تخلیق کیا ہو۔

ہونا تو یہ چاہئے کے ہم اس مقام پر رک جائیں کہ جہاں خدا خدا نہیں رہتا۔ لیکن پھر بھی اتمامِ حجت کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں خدا انسان اور وجود کے متعلق قرآن پاک میں کیا ارشاد فرماتے ہیں، اور اپنے وجود سے متعلق کیا استدلال کرتے ہیں۔ وہ آیت اللّٰہُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ ہے۔ خدا خود اپنی ہی تخلیق کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا نور ہے، تو وہ نور جو کچھ بھی ہو (یہاں کچھ بھی سے مراد اہل اسلام کی وہ تاویلات ہیں جو وہ نور سے متعلق کرتے ہیں) لیکن بہر حال اپنا وجود رکھتا ہے۔ اور جو کچھ بھی عالم مظاہر میں موجود ہے اسے جانا جا سکتا ہے، دریافت کیا جا سکتا ہے، اور وہ موجود تجربات و مشاہدات کی زد میں آ سکتا ہے۔ اور اس خدائی نور کا تجربات و مشاہدات کی زد میں آنے کا سیدھا سا مطلب یہی ہے کہ وہ خود اپنی ہی تخلیق کا مظہر ہے اور ہر قانونِ قدرت، عالمِ مظاہر کی طرح اسے بھی گرفت میں لایا جا سکتا ہے، پرکھا جا سکتا ہے۔ یہاں گرفت میں لانے اور پرکھنے کا مطلب یہی ہے کہ جیسے انسان اس عالم مظاہر کو تسخیر کرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا جب خود اپنی ہی تخلیق کا مظہر ہے پھر وہ خدا نہیں رہتا بلکہ خدا کے مرتبے سے معزول ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خالق اور مخلوق بہر حال باہم متضاد ہیں۔ کیا کوئی خالق خود اپنی ہی مخلوق ہو سکتا ہے؟ مخلوق ابتدا رکھتی ہے جبکہ خدا کوئی ابتدا نہیں رکھتا۔ مخلوق کو زوال ہے لیکن خدا کی صفت تو یہ کہتی ہے کہ اسے کوئی زوال نہیں۔ کیا واجب الوجود بیک وقت خالق اور مخلوق ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، قطعی نہیں۔ یہ انتہائی نامعقول بات ہے۔ خدا کا نور ہونا اسے اس عالمِ مادی کا محتاج کر دیتا ہے۔ یا تو وہ خالق ہے یا پھر مخلوق ہے۔ دونوں کا امتزاج سخت مہمل اور لغو بات ہے۔ ایک سخت لایعنی بات ہے۔ کوئی خدا خود اپنی ہی تخلیق کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ بہت جلد الٰہیاتی ماہرین کو اس اجمال کی لن ترانیوں کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ "خدا وجود سے بھی برتر و ماوراء ہے"۔

اس نقطے پر بات کرنے سے پہلے ہم کچھ باتیں کریں گے. ہمارے تصورات اور خیالات ان کے الفاظ و تصورات کے معنی و مفہوم کے بارے میں ربط و تعلق کس طرح دیکھا جائے؟ اور کون سے تصورات کو قبول کیا جائے، یا پھر کس طرح ان کا جائزہ لے کر نتائج نکالے جائیں اور آخر کار ان کے قبول یا عدم قبول کا جواز پیش کیا جائے. یہ فلسفیانہ عمل ہے جو مختلف مراحل سے گزرتا ہے. اولاً تو معنی اور تصورات کی تحلیل کا مرحلہ ہے پھر منطقی روابط و تحلیل کا مرحلہ ہے پھر تصورات کی قدر اور اہمیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور آخر میں ان تصورات کو قبول کرنے یا رد کرنے کے بارے میں جواز فراہم کیا جاتا ہے. اس تمام تر تحلیل کا مطلب یہ ہے کہ صداقت کی جھلک حاصل ہو جو تعصبات، گنجلک خیالات و الفاظ کے گورکھ دھندوں سے پاک ہو.

مذاہب میں موجود بعض عقائد واضح نہیں ہیں اور نہ ہی جن کی کوئی منطقی وضاحت کی جاسکتی ہے، مذاہب کے وہ تمام مسائل جن کی ہزار ہا عجب عجب تاویلات، ایک دوسرے سے یکسر مختلف پیش کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں، فلسفہ میں اس صورتحال کو جنم دینے والے مسائل کو مبہم اور غیر واضح کہا جاتا ہے. اور ان کی نتائجیت پر پہنچنے وقت تحلیل و ترتیب کے دوران ان کے گنجلک پن کو صاف اور واضح کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ تو سرے سے کوئی مسائل ہی نہیں جس پر جھگڑا کیا جارہا ہے. ایسے میں یہ عقائد غیر اہم اور بے قدر و قیمت قرار دیئے جاتے ہیں. اگر نتائجیت کا طریق کار کا ان عقائد پر متوافق اطلاق کیا جائے تو جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے روایتی مابعد الطبیعاتی دینیات کا تقریباً ہر قضیہ یا تو بے معنی ہے یا گورکھ دھندہ ہے. جہاں ایک لفظ کی دوسرے سے تعریف کی جاتی ہے اور ان کی تعریف دوسرے الفاظ سے، لیکن اس کے باوجود ہم اس کے حقیقی معنی و مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے. ایسے قضایا قطعاً لغو خیال کئے جاتے ہیں۔

غرضیکہ اس قسم کا سارا کوڑا کرکٹ راہ سے ہٹا دیا جائے اور اس طرح جو باقی بچے ان کے بارے میں سائنسی مشاہداتی طریقہ کار سے تحقیق و تفتیش کی جائے. مابعد الطبیعاتی دینیات چاند کی چمک سے زیادہ نہیں جو اچھی لگے لیکن بے مصرف ہو. ہم اس گورکھ دھندے کو کس طرح اپنی فکر سے دور کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کے معنی کے اطلاق سے، جس کی صورت یہ ہوگی، اگر ہم سے سوال کیا جائے کہ کسی چیز کے سخت ہونے سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب ہوگا کہ اس تصور کے عواقب اور نتائج. اگر یہ کہا جائے کہ فلاں چیز سخت ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس پر رگڑ کا نشان ڈالنا ممکن نہیں. غرض تصورات کے معنی ان کے متوقع کارآوری اور نتائج میں ہے، اور ان عواقب کو ہم عملی طور پر جانتے ہیں. جب تک کہ ایک تصور کو قبول کر کے تجربے میں نہ لایا جائے اس کے معنی و مفہوم کا ذکر کرنا عبث ہے. یعنی کسی تصور کا معنی اس کا عملی نتیجہ ہے، اور عام زندگی میں اس کے عملی اثرات ہیں. جبکہ مابعد الطبیعاتی دینیات میں یہ خاصیت مفقود ہے. ظاہر ہے جب ہم تصور کر کے یہ دعوی کرتے ہیں کہ گنجے فرشتے موجود ہیں، تب ہمیں اس تصور کی وضاحت بھی کرنی ہوگی اور اس کے وجود کے حق میں دلائل بھی دینے ہونگے. ایسے دلائل کہ جن سے گنجے فرشتوں کا نہ صرف وجود ثابت ہو جائے، بلکہ ان دلائل پر چل کر ہم انہیں

دریافت بھی کر لیں، لیکن اگر کوئی ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے تب اس دعوے کی حیثیت بغیر ثبوت و شواہد کے کوئی معنی اور حقیقت نہیں رکھتی. حقیقت بھی یہی ہے کے انسان اپنے ذہن میں کسی بھی قسم کی تصوراتی دنیا آباد کر لے، لیکن یہ تصوراتی دنیا اس وقت تک ذہنی مخلوق ہے جب تک کہ اس کا حقیقی وجود وہ ثابت کر کے نہیں دکھاتا .اور ایسا عملاً ہو نہیں سکتا، اس تناظر میں خدا کے مابعد الطبعیاتی دینیاتی تصور کو ہم عقل کے پاس لئے چلتے ہیں جو اس پر کوئی بھی حکم لگانے کی سب سے زیادہ مجاز ہے. اور اس مسئلے میں سب سے زیادہ استحقاق بھی اسی کا ہے کہ وہ اس مسئلے پر بر بنائے علم کوئی بھی حکم لگائے. یہاں آ کر سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ الہیات بذات خود کیا ہے؟ اور الہیاتی ماہرین کس طرح خدا کی تعریف کرتے ہیں؟ Theology سے مراد وہ علم یا علوم ہیں جو خدا کے بارے میں بحث کرتے ہیں یعنی الہیات۔ کسی بھی واجب الوجود کے دعوے دار کو اس معیار پر پرکھا جاتا ہے جو پیمانے اور کسوٹی الہیات نے طے کر رکھے ہیں. ہر مذہب کی الہیات کا ایک پیمانہ ہے جو ان کی الہامی کتب میں بیان کیا گیا ہے. اور انہی الہامی پیمانوں سے واجب الوجود پر بحث کی جاتی ہے. اور اس طرح ہر مذہب اپنے اپنے الہیاتی پیمانوں سے اپنے خدا کو سچا خدا ثابت کرتا ہے. لیکن مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بین المذاہب خدا کی ذات پر گفتگو کی جاتی ہے. اور بالآخر تمام مذاہب کی گفتگو اس نتیجے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کہ خدا ایک ہے. جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا. حالانکہ ہم دیکھ آئے ہیں کہ خدا کے ساتھ ساتھ عدم میں مادہ بھی موجود تھا جس سے اس عظیم صناع نے صنعت گری کی، لیکن مذاہبِ عالم الہیات میں خدا کی ذات پر گفتگو کرتے وقت الہیاتی کسوٹی کے علاوہ ہر اس الہامی نگارشات کو قطعی فراموش کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں جو کے بذات خود ایک غیر منطقی سی بات ہے۔

اسلام میں الہیات کا پیمانہ سورہ اخلاص ہے. جس سے خدا کی صفات و کمالات اور اس کے وجود کو ثابت کرتے وقت، اس کے وجود پر استدلال کرتی ہوئی دیگر قرآنی آیات کو الہیاتی مدرسے فراموش کر دیتے ہیں. ظاہر ہے یہ الہیاتی ماہرین کی منافقت کے سوا کچھ نہیں. اب اس سے آگے بڑھتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ الہیات میں خدا کیا ہے؟ لاطینی میں خدا کو Ens Causa Sui کہا گیا ہے. اور اس کے معنی عام طور پر یہ لیے جاتے ہیں کہ یہ "ایک ایسی ہستی ہے جو وہ ہونا چاہتی ہے، جو وہ ہے" خدا کی یہ تعریف کم و بیش تمام مذہبی فرقے اور بیشتر فلسفیانہ و الہیاتی مدرسے قبول کرتے ہیں. خدا کا یہ تصور نیم فلسفیانہ اور الہیاتی تصور ہے. اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا کسی ایسی ہستی کا وجود ہو سکتا ہے جو اجتماع ضدین ہو، جس میں حال اور مستقبل کی کامل عینیت کا تقاضا شامل ہو. یہ کہنا کہ ایک ہستی وہی ہے جو وہ ہونا چاہتی ہے، ایک بدیہی طور پر غیر معقول اور منطقی طور پر لغو تصور ہے. اس تصور کو انسانی سیاق میں رکھ کر دیکھیں تو اس کی تصویب واضح ہو جائے گی. ہم وہ ہونا چاہتے ہیں جو ہم نہیں ہیں. اگر کو اعلیٰ ڈگری نہیں ہے تو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر معاشرے میں ہماری کوئی توقیر نہیں تو اس کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور اگر ہماری کوشش بار آور ثابت ہوتی ہے تو ہم وہاں کہہ سکتے ہیں کہ ہم وہی ہیں جو ہم ہونا چاہتے تھے. لیکن یہ کہنا قطعی بے

معنی ہو گا کہ ہم وہی ہیں جو ہم ہونا چاہتے ہیں۔ اسی طرح یہ بات مہمل ہو گی اگر میں بادشاہ ہوں تو چاہوں گا کہ بادشاہ بنوں، اس بات کا تو امکان ہے کہ اگر میں بادشاہ ہوں تو بادشاہ رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ لایعنی بات ہے کہ میں بادشاہ ہوتے ہوئے بادشاہ ہونا چاہوں۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ: "میں ایک چھُپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوق کو اِس لئے پیدا کیا تا کہ یہ میری پہچان کرے"۔

یعنی خدا اپنی پہچان کرانا چاہتا تھا جو پہلے نہیں تھی۔ اور صرف انسان کے وجود سے ہی ممکن تھی۔ یہاں خدا اپنی پہچان کے سلسلے میں انسان کے وجود کا محتاج محض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ چار و ناچار اس نے اس عالم کو اور انسان کو خلق کیا تا کہ پہچانا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی پہچان ممکن نہ تھی۔ گویا خدا کی ہستی وہ ہونا چاہ رہی ہے جو وہ اس سے پہلے نہ تھی۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کے خدا کی ہستی جو بھی ہے لیکن اس ہستی کی اس کے علاوہ کوئی غرض و غائیت نہیں کہ اپنی مرضیات کی اطاعت و بندگی اپنی مخلوق سے کرائے۔ اور وہ انسان سے اس بات کی طالب ہے کہ وہ اس کی ہدایتوں کی پیروی کرے اور اسی کی اطاعت کرے اور اس کی راہنمائی میں چلے، اور اسی کو واحد نصب العین مانتے ہوئے اس کا یقین رکھے، اس کے علاوہ اس کی کوئی غرض و غائیت نہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں خدا کی ہستی کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اپنے قوانین پر عمل درآمد کرانا چاہتا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ وہ بے نیاز ہے۔ اگر وہ واقعتاً بے نیاز ہے تب مذہب کے کھڑاک کے ذریعے گناہ و ثواب، جنت و دوزخ جیسے خوف، لالچ اور ترغیب کی ضرورت اسے انسانوں کا نیاز مند بنا دیتی ہے۔ یعنی خدا کی ہستی کے ہونے کا مقصد صرف خود کو منوانا ہے، کسی قادر مطلق خدا سے اس قسم کی خواہش کا اظہار ہونا اس کے قادر مطلق ہونے پر کئی سوالیہ نشان کھڑے کر دیتا ہے۔ جیسا قرآن میں مذکور ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿سورۃ الذاریات:۵۶﴾

میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں

اور انسان کے وجود کا مقصد ایک ایسے موجود کی جی حضوری قرار پاتا ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ تمام الہیاتی مدرسے اور تمام مکاتب فلسفہ اس بات پر متفق ہیں کہ خدا کی ہستی وجود سے بھی برتر و ماورا ہے۔ اس نقطے پر ہم ایک الہیاتی ماہر کی رائے سے استفادہ کرتے ہوئے گفتگو کو منطقی انجام تک پہنچائیں گے۔ حضرت جون ایلیا فرماتے ہیں کہ:

"جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ تب ہم اسے ایک ماہیت قرار دیتے ہیں۔ ہم گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر موجود شے ہے اور ہر شے موجود ہے۔ شیئیات اور وجود ہم معنی ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا شے ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ نہیں تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خدا لا شے ہے۔ لا شے کے دو

مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک لاموجود اور ایک یہ کہ وہ موجود جو شے نہ ہو، کچھ اور کیا؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب مابعد الطبعی فکر کے تمام نمائندوں کو دینا ہے۔"

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کے خدا وجود سے بھی ماوراہے. اب ہم دیکھتے ہیں کے واجب الوجود کو موجود کہا جائے تو اس کے وجود کی تعریف کرنا خدا کے دعوے داروں کیلیے ناممکن ہو جاتا ہے. چنانچہ اس سے گھبرا کرانہوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ واجب الوجود ایسا موجود ہے جو وجود سے بھی ماوراہے. یہ بذات خود ایک بدیہی طور پر غلط تصور ہے. جس کا جواب مابعد الطبعیاتی دینیات کے پاس نہیں. اور مابعد الطبعیاتی دینیات کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک تصوراتی دنیا، جس کا گھر ذہن ہے. اور اگر ذہن میں پائے جانے والی مخلوقات حقیقی وجود رکھتی ہیں تب مابعد الطبعیاتی دینیات کے نمائندوں اور اہل مذاہب کو اس بات کا بھی اقرار کرنا ہو گا کہ ہر دین کا ہر ایک کردار حقیقتاً اور واقعتاً وجود رکھتا ہے. بلکہ پھر ہمیں یہ بھی ماننا ہو گا کہ سپر مین، آئرن مین، بیٹ مین، ٹارزن، ڈریکولا جیسے تمام فکشن کریکٹر بھیحقیقتاً وجود رکھتے ہیں.

فری تھنکنگ

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ فری تھنکنگ کیا ہے؟ اس ضمن میں اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنے سے قبل کچھ باتیں کرنا چاہوں گا گر قبول افتد زہے عزو شرف۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا عقائد و معجزات کو راہنما بنا کر حقیقت و صداقت کے راستے طے کئے جاسکتے ہیں؟ اس پر آپ کیا سوچتے ہیں اس کا فیصلہ تو آپ کے اظہار سے ہی ممکن ہو سکے گا، لیکن میرا جواب اس سلسلے میں بڑا واضح ہے کہ: "نہیں!"

اس کائنات میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں سربستہ راز پنہاں و مضمر ہیں، انسان کی علمی سطح میں جوں جوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ دنیا اور کائنات کے خفیہ گوشوں سے پردہ اٹھاتا جا رہا ہے، ہماری اس دنیا اور کائنات میں کیا کیا پوشیدہ ہے اس کا علم دھیرے دھیرے ہوتا جا رہا ہے اور آگے بھی ہوتا رہے گا، مسلسل آگاہی کا، تحقیق و جستجو کا اور علمی پیش رفت کا یہ سلسلہ رہتی دنیا تک جاری و ساری رہے گا، علم و آگہی، سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی میں سائنسدان و محقق حضرات کا سب سے بڑا ہاتھ ہے جو حقیقت و صداقت تک انسان کی راہنمائی کرتے جا رہے ہیں اور یہ بات اظہر من الشمس کی طرح واضح ہے کہ حقیقت و صداقت کے راستے معجزات و عقائد کی راہنمائی میں طے نہیں ہوتے۔

علم و آگہی کی اس ترقی نے جہاں انسان کی مادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے، وہیں اس نے انفرادی اور اجتماعی شعور کی ترقی میں نہایت گرانقدر کارنامہ سرانجام دیا ہے، واقعہ تو یہی ہے کہ جیسے جیسے تہذیب و تمدن کی ترقی ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے انسان کا

انفرادی واجتماعی شعور بھی ترقی کے مدارج طے کرتا چلا جاتا ہے، کسی بھی تہذیب کی نمایاں خصوصیت یہی ہونا چاہئیے کہ وہ متحرک ہو، جامد اور بے حرکت نہ ہو، وہ تہذیبیں مردہ یازائدالمعیاد (Out Dated) خیال کی جاتی ہیں جو جامد ہوں، جو بھی تہذیب حرکت پذیر نہ ہو، مردہ ہو جاتی ہے، ظاہر ہے ایک تہذیب اسی وقت حرکت پذیر ہوگی جب اس میں ترقی کا عمل جاری و ساری ہو، تہذیب افکار و نظریات سے تشکیل پاتی ہے، جبکہ تمدن انہی افکار و نظریات کے عملی اظہار کا نام ہے، اصطلاحی اعتبار سے تمدن کا مطلب ہے کہ زندگی کی ضروریات ولوازمات پورا کرنے کیلئے انسان جو کچھ بناتا ہے، ایجاد کرتا ہے، تیار کرتا ہے، وہ سب تمدن کے تحت آتے ہیں اور تمدن کے مظاہر ہیں، معمولی سی معمولی چیزوں مثلاً سوئی، صابن وغیرہ سے لے کر جہاز تک، صنعت وزراعت، سماجی ادارے وغیرہ سب تمدن میں شامل ہیں اور انہی سب چیزوں سے تمدن تشکیل پاتا ہے۔

تصور کریں کہ کسی تہذیب میں نئے نظریات وافکار کا فقدان ہو جائے، جس معاشرے میں کسی ایک مخصوص نظریے کو شعار بنا لیا جائے، وہ تہذیب تمدنی لحاظ سے ترقی کر سکے گی؟ جس معاشرے میں نت نئے نظریات ناپید ہو جائیں اور وہاں کے لوگ کسی ایک ہی نظریے یا عقیدے کے قائل ہو جائیں، ان میں استنادیت اور ادعائیت اپنی جڑیں پھیلا لیتی ہے، اور بالآخر اس معاشرے کو تمدنی لحاظ سے کمزور کرنا شروع کر دیتی ہے، اذہان کو بانجھ کر دیتی ہے جس میں نئی فکر و نظریات آنا بند ہو جاتے ہیں اور تہذیب آہستہ آہستہ جمود کی بانہوں میں دم توڑ دیتی ہے۔

یہاں ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئیے کہ ہر معاشرے اور ہر فرد کا ایک نظریہ ہوتا ہے جس پر وہ عمل پیرا ہوتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی سعی کرتے ہیں لیکن اس نظریے میں رہ کر اس پر سختی سے جم جانا اور اس معاملے میں غیر لچکدار رویہ اپنا لینا، اذعانیت اور ادعائیت کو فروغ دیتا ہے، معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مل کر رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے، معاشرے کیلئے انگریزی لفظ سوسائٹی (Society) استعمال کیا جاتا ہے جو لاطینی لفظ سوسئیس (Socius) سے نکلا ہے جس کا مطلب کمپینئین (Companion) یعنی ساتھی ہے، اسی طرح معاشرے کا مطلب ساتھیوں کی ایسی جماعت ہے جو مل جل کر رہتی ہو اور اس کے سامنے چند مشترکہ مقاصد ہوں۔۔ مشہور مفکر لنٹن (Linton) کہتا ہے کہ:

"افراد کا ایسا گروہ جو طویل عرصہ سے ایک جگہ مقیم ہو اور اشتراکِ عمل کی بدولت وہ اتنا منظم ہو جائے کے لوگ اس گروہ کو وحدت کا درجہ دے دیں تو وہ گروہ معاشرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

ظاہر ہے ایک اکیلا فرد معاشرے کی تشکیل نہیں کر سکتا نہ ہی افراد کا کوئی گروہ معاشرہ کہلاتا ہے، معاشرے کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ ایک سے زیادہ افراد ہوں اور ایک طویل عرصے تک اکھٹے رہے ہوں اور ان میں باہمی اتحاد، یگانگت اور باہمی

ربط جیسی صفات موجود ہوں، معاشرے کے ارتقا اور بقا کیلیے ضروری ہے کہ معاشرے کے افراد کے سامنے کچھ مقاصد ہوں، ان کے رسم ورواج میں یکسانیت ہو اور وہ یہ رسم ورواج مل جل کر سرانجام دیتے ہوں، ایک معاشرے کے افراد میں ذہنی ہم آہنگی کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے، دراصل یہی وہ شے ہے جس پر معاشرے کی مضبوط عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے، لیکن معاشرے میں مختلف عقائد اور خیالات کے فرد بھی ہوسکتے ہیں، معاشرہ ایک فطری ادارہ ہے، اور اس کے بغیر فرد کی صحیح نشو نما ممکن نہیں، اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر انسان کسی نہ کسی معاشرے سے تعلق رکھتا ہے، بقول ارسطو اگر کوئی انسان معاشرے کے بغیر رہ سکتا ہے تو وہ یا تو حیوان ہے یا دیوتا۔

کوئی بھی معاشرہ ساکن و جامد نہیں ہوتا، انسانی سوچ اور نقطہ نظر بدلنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بھی تغیر پذیری کا عمل جاری رہتا ہے، موجودہ معاشرے کی شکل وصورت قدیم معاشرے سے قطعی مختلف ہے، معاشرے کی بات اختصار کے ساتھ اس ضمن میں کی گئی کہ اس پس منظر میں انسان کی ذہنی تربیت کے عمل کو جان سکیں، انسان معاشرتی رسم ورواج کو معاشرے سے ہی بتدریج سیکھتا ہے، خاندان کی ابتدائی پرورش کے بعد بچہ اسکول اور مذہبی تعلیم کیلیے مذہبی اداروں کا رخ کرتا ہے تو یہ ادارے فرد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تربیت کرتے ہیں، اس ضمن میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری تہذیب کی اس جہت میں استنادیت کی کار فرمائی نظر آتی ہے، مذہبی کتب کا سمجھنا ہو یا دنیاوی علوم کا یا پھر کوئی علمی و عملی مسئلہ ہو، یا کوئی اخلاقی یا سیاسی سوال ہو، ہم حکم اور سند ڈھونڈتے ہیں اور اس کے حاصل ہونے پر مزید بحث اور گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جستہ جستہ واقعات کی حد تک یا کبھی کبھار ہم کسی ماہر کی بات یا صاحب علم کا مشورہ یا کسی مقتدر ہستی کا کہا سن لیں اور مان لیں، بلکہ استنادیت سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ علم کا ذریعہ اور اس میں تیقن مقتدر ہستی کا مرہون منت ہے، ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ضروری نہیں کہ یہ مقتدر ہستی ایک فرد واحد ہو، بعض جگہ علما کا ایک گروہ ہو سکتا ہے، کسی پروہتوں، ملاؤں، پنڈتوں، ربیوں، پادریوں، بشپ وغیرہ کی انجمن ہو سکتی ہے، غالب سیاسی جماعت یا اس کے نمائندہ دانشور ہو سکتے ہیں جیسا کہ مسولینی کی فسطائیت، نازی سوشلزم، لینن کی کی اشتراکی ریاست میں ہوا، ان سب صورتوں میں مستند ہے میرا فرمایا ہوا کا اصول کام کرتا ہے جو اذعانیت اور ادعائیت کو فروغ دینے کا باعث ہے، ہمیں اس قسم کی غیر دانشمندانہ صورتحال سے بچنا چاہئے کیونکہ انسان تقلید سے نہیں سیکھتا جس میں انفرادی غور و فکر کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔

ہمارے ذہن میں پیش نظر ہر آن نظریہ امکان رہنا چاہئے کیونکہ کوئی بھی نظریہ حرف آخر نہیں ہوتا، نہ ہی اسے مقدس گاۓ سمجھا جانا چاہیے، انسان اور کائنات سے متعلق ہر شے نظریہ امکان کی زد میں ہے، کوئی بھی نظریہ حتمی نہیں، کچھ بھی قطعی اور حرف آخر نہیں، تلاش مسلسل میں رہنا چاہئے، کسی نظریے پر یقین رکھنے سے بہتر ہے کہ "تجربہ" پر یقین رکھا جائے کیونکہ جو

چیز یقینی ہے وہ تجربہ ہے، حقائق جن کے بارے میں فلاسفہ بحث کرسکتے ہیں وہ ہیں اور وہی ہونے چاہئیں جن کی تعریف ان حدود میں ہو جو تجربے سے حاصل کی گئی ہوں نہ صرف یہ بلکہ وہ اضافات جو ایک تجربہ سے دوسرے تجربہ کو متعلق کرتے ہیں وہ بھی تجربی حقائق ہیں، اس تجربی دنیا کے مختلف عناصر کے پس پردہ کوئی ان دیکھی حقیقت نہیں، کوئی مطلق نہیں، علم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم دو تجربی حقائق کے مابین تعلق کو پڑھ لیں، لیکن سارا علم ایک تجربی استمرار ہے، ایک تجربے سے ہم دوسرے پر جاتے ہیں، ایک لمحاتی تجربہ ہمیں دوسرے سے ہمکنار کراتا ہے، ہم تجربہ کے مختلف عناصر کی ہر لمحہ ترتیب کرتے ہیں اور ان کے ثمرات وصول کرتے ہیں۔

عناصر کی ترتیبِ نو ہمارے اغراض و مقاصد کی روشنی میں ہوتی ہے، کیونکہ بہر حال ذہن کا علیحدہ سے اپنا وجود نہیں اور علم ایک مجموعہ تصورات نہیں جو کہیں باہر سے تھوپ دیا گیا ہو، ذہن ایک فعال عملیہ ہے جو عضویہ سے جدا نہیں اور یہ عضو انسان ہے، ذہن ایک عمل ہے جو اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب کہ عضویہ انسان اپنے اردگرد موجود اشیا کو اپنے تصرف میں لاتا ہے، یا ماحول کی تشکیل نو کرتا ہے یا کسی اور تعمیری مصروفیت میں منہمک ہوتا ہے۔

ہمارا تفکر حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اسے سمجھتا ہے اور کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے کیونکہ تفکر ایک عضویاتی وظیفہ ہے اور اس کا مقصد عضویہ اور ماحول میں مطابقت حاصل کرنا ہے یا اس میں اصطلاحات کرنا ہے، اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر نظریات جو اپنے وقت کے حساب سے انتہائی مناسب تھے، اس کے باوجود استنادیت میں گم ہو جاتے ہیں اور حقیقت معروضیت کے ایک نہایت محدود تصور کے سبب فرد کی زندگی سے رنگینی اور آزادی سلب کرلیتی ہے، لیکن انسانی فکر کی تاریخ متنوع تعلیمات از مذاہب، مارکسزم، کیپیٹلزم، آئیڈلزم وغیرہ پر ہی آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ذہنِ انسانی روز ایک نئی فکر دیتا ہے اور سوچ کے نئے سوتے ہر عہد میں اپنی بہار دکھلاتے رہتے ہیں، ہمیں انہی نظریات سے باہر آکر ایک وسیع تر سیاق میں سوچنے کی عادت ڈالنی چاہئے، کسی بھی نظریے میں رہنا دراصل ایک قسم کی ذہنی بندش اور مصنوعی حدبندی ہے جس سے انسانی فکر کا وقار مجروح ہوتا ہے، ہمیں اس طرزِ فکر پر سوچنا، سمجھنا اور غور و فکر کرنا چاہئے جس میں حریت اور داخلیت کی بھی تسکین ہو اور مصنوعی حدبندیوں اور ذہنی بندشوں کو توڑ کر انسان اپنی ذات کا صحیح تحقق کرسکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ: "فکری غلامی سے جسمانی غلامی بہتر ہے۔"

فکری غلامی سے مراد کسی بھی نظریے پر مستقل قیام کرنا ہے، جبکہ کسی بھی سوچنے والے مفکر کیلئے کسی بھی مخصوص نظریے پر قیام کرنا فکر کو جمود کے حوالے کردینے کے مترادف ہے، ایک متشکک ذہن کسی بھی ضابطے اور قاعدے کو تسلیم نہیں کرتا

(یہاں ضابطوں اور قاعدوں سے مراد اخلاقی اقدار اور قانون ہر گز نہیں)اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فکر مجموعی طور پر ترقی پسند ہوتی ہے، کسی مخصوص جگہ پر ہو تو دائروں میں گھومتی رہ جاتی ہے، ایسے کتنے لوگ ہیں جو سمندروں کی طرح بولتے ہیں لیکن ان کی سوچ گندے جوہڑ کی مانند ہے، کسی مخصوص نظریے پر قیام کرنا ایسا ہی ہے جیسے مثال کے طور پر ایک گڑھے میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے اور باہر آنے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا جس سے اس میں تعفن، بدبو اور غلاظت پیدا ہو جاتی ہے، یہی حال ان انسانوں کا ہے جن کا قیام کسی مخصوص نظریے پر ہے، ایسے لوگ اپنی مخصوص نظریاتی سوچ کی بنا پر جس زاویے سے دنیا کے بارے میں سوچتے ہیں، اس میں انہوں نے دنیا کو دو دھڑوں میں تقسیم کر رکھا ہوتا ہے، مثلاً ایک مسلمان کو دنیا میں صرف مسلم اور غیر مسلم نظر آتے ہیں، مارکسسٹ حضرات کو دنیا میں صرف دو دھڑوں کا یقین کامل ہوتا ہے جن میں سے ایک مارکسی بقایا سرمایہ دار، ایسا سوچنا اور کہنا صرف راسخ العقیدگی کی وجہ سے ممکن ہے جن پر ان حضرات کا کسی مخصوص نظریے پر قیام ہے، اسی فکری قیام کی وجہ سے ان کی محدود سوچیں انہیں وہی کچھ دکھاتی ہیں جو ان کی مخصوص نظریاتی سوچ انہیں دکھانا چاہتی ہے۔

فکر آزاد ہو تو نت نئے نقطے ڈھونڈ لاتی ہے، انسان کی سوچ ہمیشہ آگے کی جانب بڑھتی ہے، کیونکہ انسان اپنے گردو پیش سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا اثر قبول کرتا ہے، فکری قیام ذہنی ارتقا کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور انسان کی سوچ کو دائروں میں گھمانا شروع کر دیتا ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ جتنے بھی نظریات وعقائد موجود ہیں ان کو پرکھ کر، ان کی ترتیب و تحلیل کر کے ہی فکری ارتقا کی راہ پر گامزن رہا جا سکتا ہے، یہی ارتیابیت ہے۔۔۔ کیونکہ کوئی بھی نظریہ یا عقیدہ حرف آخر نہیں، لہذا اس میں ہمیشہ گنجائش موجود رہتی ہے کہ اس سے بہتر کو سامنے لایا جائے، ہر نظریے کو تشکیک کی زد میں لایا جا سکتا ہے، ایک متشکک ذہن کسی ایک جگہ قیام نہیں کر سکتا اور ہمیشہ ان زاویوں پر سوچتا ہے، معاشرے میں رائج نظریات یا کتابی نظریات کے ان گوشوں کو کھنگالنے کی سعی میں جتا رہتا ہے جس پر ان نظریات کے اندر رہ کر سوچنے والوں کی رسائی نہیں ہونے پاتی اور ان نظریات کے ان تاریک گوشوں کو سامنے لے کر آتا ہے جس کا ذکر بھول کر بھی نظریات میں رہنے والے کرنا پسند نہیں کرتے، صحافت میں ایک طریقہ کار یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی شے کا جائزہ باہر رہ کر لیا جائے تو وہ شے زیادہ بہتر انداز میں کھل کر یوں سامنے آئے گی گویا وہ اس کا شاہد ہو، اس میں بتایا جاتا ہے کے کیسے تہذیب کے باہر آکر تہذیب کو دیکھا جائے، اور یوں اسے جانا جائے کہ ایک ایک گوشہ کھل کر نگاہوں کے سامنے آجائے، چنانچہ سکھایا جاتا ہے کہ کسی بھی شے کے ہر پہلو سے مکمل آگاہی کیلیے اس سے باہر آکر اسے دیکھا جائے، یعنی اگر آپ خود کسی کھیل میں مگن ہوں تو آپ پر ایک نفسیاتی دباؤ سا ہوتا ہے، جبکہ کھیل کا مشاہدہ کرنے والوں کا ذہن اس کیفیت سے آزاد ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ اپنے آزاد ذہن سے کھیل کو کھیلنے والوں سے زیادہ بہتر انداز میں سمجھ رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اکثر رائے زنی بھی کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر آراء بالکل درست نکلتی ہیں (اس تجربے سے سب ہی حضرات بارہا گزرے ہوں گے)۔

اس طرح فلسفہ کا مطالعہ انسان کو تمام تریقینیات سے محروم کر دیتا ہے، چنانچہ اس کے ساتھ ہی اذعانیت اور ادعائیت دم توڑ دیتی ہے، لہذا فکر کی بلند پروازی کو جاری رہنا چاہئیے، محض سوچنے کیلیے نہیں بلکہ کسی نتیجے تک پہنچنے کیلیے، کسی مخصوص نظریے میں قید رہ کر سوچنا یا کسی مخصوص فکری سانچے کو معیار بنالینا فکر کے ساتھ ظلم ہے، یہ ایک تمثیلی جملہ ہے کہ فکری غلامی سے جسمانی غلامی بہتر ہے، یعنی اپنی فکر گروی رکھنے سے بہتر میں یہ پسند کروں گا کہ مجھے جسمانی طور سے غلام بنالیا جائے، فکری آزادی ہو گی تو ہی جسمانی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کیلیے جدوجہد کر پاؤں گا، اس کی تحلیل کا جائزہ ان مفکروں کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ہر دور میں آزادی کیلیے تحاریک چلائیں اور اکثر کامیاب بھی رہے، اگر فرانس کے مفکر فکری طور پر آزاد نہ ہوتے تب انقلابِ فرانس ہر گز نہ آتا، اگر کے برصغیر میں فکری غلامی پائی جاتی تب ہندوستان دولخت ہر گز نہ ہوتا، یہاں میں ان فکری تحاریک چلانے والوں کو "فری تھنکر" نہیں گردان رہا، اس کے برعکس اشارہ اس بات کی جانب ہے کہ اگر ان مفکروں کی سوچ پر غالب قوت کا فکری غلبہ ہوتا، تب یہ مفکر جسمانی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی تحاریک چلانے کے قابل نہ ہوتے۔

ہمیں جاننا چاہیے کہ انسان اس وقت تک انسان ہے جب تک کے وہ "شے" نہیں بن جاتا، یا اگر دوسرے اسے شے بنا دینا چاہتے ہیں اور وہ اس عمل سے مزاحمت کرے اور خود کو شے میں تحویل کر دیئے جانے کو قبول نہ کرے، اس ضمن میں ہمیں ان فرانسیسی حریت پسندوں کو یاد رکھنا چاہئیے جنہوں نے نازی
بربریت کا مقابلہ کیا، جنہوں نے لاکھ اذیتوں کے باوجود اپنے رفقا کے نام افشا کرنے سے ہمیشہ انکار کیا، دراصل بربریت اور اذیت ناک موت سے مقابلہ کرنا ہی آزادی ہے، یہاں یقینی موت کے منہ میں اپنی سی کہنا اور کرنا انسانی فکری آزادی کا اثبات کرنا ہے۔

جنگ میں نازی پروپیگنڈہ اور گستاپو ہتھکنڈوں کا مقصد عام فرانسیسیوں کو زندگی کی انتہائی تاریکیوں میں دفن کرنا تھا، لیکن ان سے مزاحمت، ان سے انکار اور ان اذیتوں کا سہار جانا ہی نعرہ حریت بن گیا، اعلان آزادی کی صورت اختیار کر گیا۔

چاہے دکھ، تکلیفوں کے تجربوں کے باعث انسان کا جسم اس کا ساتھ چھوڑ چکا ہو، لیکن اس کے ہوش و حواس سلامت ہوں اور اس میں ظالم اور موذی کو "نا" کہنے کی بھی صلاحیت اور جرآت ہو، تو وہ انسان ہے، فکری طور پر آزاد بھی ہے اور بااختیار بھی، لہذ کبھی ایسا وقت آن پڑا کہ کسی بھی جانب سے کسی بھی قسم کی جنگی جارحیت کا سامنا کرنا پڑے، تب ذہن کو غلامی میں دینے سے بہتر جسم کو غلامی میں دے دیا جائے، ذہن آزاد ہو اور اس پہ غالب قوت کا فکری غلبہ نہ ہو تو اس میں راحت ہے اور عین ممکن ہے کے جلد جسمانی غلامی سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیا جائے گا، کیونکہ فکر بہر حال آزاد ہے۔

ہر لحظہ ہر آن نظریہ امکان کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کیونکہ بہر حال یہ امکانات کا عالم ہے، تاریخ پر نگاہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جسے انتہائی حد تک ناممکنات میں تصور کیا جاتا تھا، اگلے کچھ وقتوں میں وہی عین ممکنات میں شامل ہو گیا، پھر کچھ وقت کا سفر آگے کو ہوا تو وہی چیز معمول کی باتوں میں شامل ہو گئی۔ کچھ اور وقت گزرنے کے بعد اس شے سے بھی بہتر کئی چیزیں سامنے آجاتی ہیں، اس ضمن میں کسی بھی ایجاد کو دیکھ لیں، جیسے ہوائی جہاز کی ایجاد ناممکنات میں سے تھی، خود رائٹ برادران کے ابا حضور جو کہ پادری بھی تھے، اس کی شدید مخالفت کر رہے ہوتے تھے اور اپنے وعظ میں اس کی شدید مذمت کرتے اور ٹھٹھے اڑاتے، ایسی ایجاد کا تصور بھی اس وقت کے انسانوں کیلیے ایک اچنبھے کی اور انتہائی ناممکن بات تھی لیکن رائٹ برادران نے اسے ایجاد کر ڈالا، پھر یہ ایجاد عام ہوئی، اور اب طیارے کا سفر معمول کی بات ہے، اور طیاروں کی ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ رائٹ برادران کا جہاز ان کے آگے ہیچ ہے، لیکن بہر حال وہ طیاروں کا جدِ امجد تھا۔

معاشرے پر نگاہ دوڑائیں، ایسے لوگ دکھائی دیں گے جو در حقیقت "طوطے" ہیں، جو رٹی ہوئی باتیں دہراتے ہیں، ایسے ہی یہ لوگ بھی وہ باتیں کرتے ہیں جو انہیں دوسرے بتاتے ہیں، یعنی سنی سنائی پر زندہ ہیں، اسی پر یقین رکھتے ہیں حرف آخر جان کر، جو انہیں کسی سے معلوم ہو جائے، جو کہیں سے سن لیں پڑھ لیں، اپنی طرف سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے اسے مزید جاننے اور پرکھنے کی، تحقیق نہیں کرتے، ان کا اپنا مشاہدہ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتا، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے سامنے کی بات کا اقرار نہیں کرتے گویا اسے بھول جاتے ہیں، اور اس بارے میں وہ بات کرتے ہیں جو دوسرے ان سے کہہ دیتے ہیں، دراصل ایسے لوگ اپنی سہل پسند طبیعت کی وجہ سے عقل کا استعمال نہیں کرتے اور استنادیت پسند ہو جاتے ہیں، کسی بھی قوم کے زوال کا اہم ترین سبب ایک یہ بھی ہے کہ اس قوم کے افراد تحقیق کرنے اور جستجو رکھنے کے بجائے تقلید کا رویہ اپنا لیتے ہیں، اور یوں ان کی فکر جمود کا شکار ہو کر بانجھ ہو جاتی ہے، پھر یہ اپنے نظریاتی دائروں میں گھومتے رہ جاتے ہیں، اور جو ہم خیال نہ ہو انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کی وجہ سے مخالفین کو بڑی سہولت رہتی ہے، افواہیں پھیلانے میں، پروپیگنڈہ کرنے میں اور وہ ان کو جب چاہیں اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں، وہ ان کا رخ کسی بھی جانب موڑ سکتے ہیں جو کہ ایک خطرناک بات ہے اور لمحہ فکریہ ہے۔

اس کی مثال یوں بھی لیجیے کہ کیسے سیاسی ومذہبی لیڈر اس قسم کے لوگوں کو استعمال کرتے ہیں، وہ انہیں کسی شے یا مسئلے پر کہہ دیں کہ یہ صحیح تو وہ کہتے ہیں ہاں صحیح ہے، وہ اس کو غلط کہیں تو یہ کہیں گے ہاں غلط ہے، یعنی ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی، یاد رکھیں! اگر آپ کی اپنی کوئی مضبوط اور سوچی سمجھی رائے نہیں تو آپ کبھی بھی سیدھی راہ نہیں پا سکتے اور استنادیت میں گم ہو کر اذعانیت اور ادعائیت کا شکار ہو جائیں گے۔

انسان کو اپنے مشاہدے، تجربے سے کام لینا چاہئیے اور اس کے مطابق بات کرنی چاہئیے، ہر شے پر بعد از تشکیک اپنی سی تحقیق کرنی چاہئیے، سنی سنائی پر یقین کرنا گمراہی ہے و جہالت ہے، اگر کوئی آپ سے سنجیدگی سے کوئی "مسلمہ مانی جانے والی" آئیڈیالوجی بیان کرتا ہے، تو اسے من و عن مان لینے کے بجائے اپنی سی کوشش اسے جاننے کی کیجیے، جستجو رکھئیے، تحقیق کیجیے۔ اسے مزید جاننے کی کوشش کیجیے، اگر وہ نظریہ درست نکلے تو ہی اسے مانئے ورنہ اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کریں، کہ اپنی تحقیق میں کیا پایا اور اگر آپ کی تحقیق صحیح غلط کا فیصلہ نہ کر سکے تو مزید کوشش کیجیے اور کرتے رہئیے۔

یاد رکھیں "ایک شرارے سے شعلہ لپکتا ہے اور ایک شعلہ سے ایک بڑا الاؤ روشن ہوتا ہے۔"

کسی بھی فلسفی، منطقی، مصلح کی بات کو بلاچوں چرا مان کر اسے اپنا عقیدہ بنالینے کے بجائے تشکیک کیجیے اور عقل کے گھوڑے دورائیے، غور و فکر کی عادت کو شعار بنالیں، اگر محقق، سائنسدان اور فلسفی حضرات وغیرہ استنادیت اور اذعانیت و ادعائیت کو اپنا شعار بنالیتے، تب کیا یہ دنیا اس مقام تک پہنچ پاتی جہاں آج کھڑی ہے؟ یقیناً نہیں! اگر معاشرے و سماج میں رائج مفروضات و تصورات و نظریات سے یہ لوگ نہ نکلتے تب ہم آج بھی پتھروں کے دور میں کھڑے ہوتے، ذرا سوچیے۔۔ تہذیب کے، نظریات کے، عقائد کے دائروں اور مصنوعی حدبندیوں سے انہیں باہر آکر دیکھیں اور جانئے کہ صحیح کیا ہے غلط کیا، استنادیت سے چھٹکارا پائیے، ادعائیت کو خیرآباد کہیئے، فکر کے چراغ روشن کیجیے، اپنی فکر کی راہ کا تعین خود اپنے تجربہ و تحقیق کی روشنی میں کیجیے، اس دنیا نے فکری طور پر ابھی بہت آگے جانا ہے، کسی مخصوص جگہ قیام نہیں کرنا جو کہ تہذیب و تمدن کی موت کے مترادف ہے۔

دہریت اور سماجی سوالے

پچھلے چند دنوں سے کچھ عجیب سی پوسٹس پڑھنے کو مل رہی ہیں، جن کے پیچھے تجسس کی بجائے تضحیک کا مادہ کارفرما ہے۔ لیکن اہل ایمان کے علاوہ کچھ اپنے دوست بھی اس مسئلے پر کسی حد تک کنفیوژن کا شکار ہیں۔ چند اہم سوال جو اٹھائے گئے ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

1- دہریئے خدا یا مذہب سے انکار کرتے ہیں لہذا کیا وہ محرمات مثلاً ماں، بہن یا بیٹی سے مباشرت کرتے ہیں؟۔

2- کیا دہریئے اپنی بہنوں، بیٹیوں کو شادی سے پہلے جنسی تعلقات رکھنے کی اجازت دیتے ہیں؟۔

3-کیا دہریئے اپنی بیوی کو دوسرے کے ساتھ بانٹنا پسند کریں گے، کیا بیوی کو دوسرے مردوں کے ساتھ تعلق رکھنے کی اجازت دیں گے؟۔

4-دہریئے شادی کیسے کرتے ہیں؟۔

5-دہریئے مرنے کے بعد کونسی رسومات ادا کرتے ہیں؟۔

6-کیا دہریئے اپنے ماں باپ کا ادب کرتے ہیں؟۔

ان سوالوں کا جواب کھوجنے کیلیئے اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ دہریت مذہب نہیں ہے، یہ ایک ضابطہ حیات ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اور نا ہی یہ کسی قسم کا کوئی نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس کا کسی بھی نوعیت کا کوئی معاشی پروگرام نہیں ہے، اور نا ہی یہ معاشی تفاوت اور دیگر معاشرتی مسائل کے حل کی راہیں سجھاتا ہے۔ دہریئے سرمایہ داری کے حمایتی بھی ہوسکتے ہیں اور اشتراکی نظام کے بھی۔ دہریئے عام انسانوں کی طرح معاشرے کی ایسے ہی رکن ہوتے ہیں جیسا کہ مذہب کے ماننے والے۔ یہ بھی معاشرتی تقاضوں کو اسی طرح نبھاتے ہیں جن پر اس معاشرے میں رہنے والے دیگر افراد عمل پیرا ہوتا ہیں۔ دہریئے صرف خدا یا کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود کا انکار کرنے کے علاوہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جس کا تقاضا ان سے معاشرہ کرتا ہے۔ (میں خود کئی ایک نزدیکی لوگوں کی نماز جنازہ میں گیا ہوں، جس سے مقصد ان کی مغفرت کی دعا کرنا ہرگز مقصود نہ تھی، بلکہ یہ اس چیز کا اظہار تھا کہ میں مرنے والے کے بچھڑ جانے کو محسوس کرتا تھا اور اسی کا اظہار کرنے اور جانے والے کو عزت دینے کیلیئے مسجد تک جا پہنچا، البتہ میں دل ہی دل میں کچھ بڑبرانے کی بجائے پیٹ پر ہاتھ باندھے، سر جھکائے خاموشی سے کھڑا رہتا رہا ہوں۔) البتہ دہریئے کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی چیز کو قبول یا رد کرنے کیلیئے عقلی دلیل اور استدلال کا سہارا لیں نہ کہ صدیوں پرانی کتابوں سے اخلاقی اور معاشرتی رویے کشید کریں۔

بس پر چڑھتے ہوئے کون سی دعا پڑھنی ہے، کون سا پاؤں پہلے پائیدان کے اوپر رکھنا ہے، اترتے وقت کون سی دعا پڑھنی ہے، گھر کے اندر اور باہر جانے کی دعائیں کون سی ہیں، جنسی عمل سے پہلے، بعد اور دوران کون سی آیت یا دُعا پڑھنی ہے، لیٹرین میں جانے کی دُعا اور نکلنے کی دعا کیا ہے، پیشاب کرتے ہوئے عضو تناسل کو کس ہاتھ سے تھامنا چاہیئے، پاخانے کے بعد کون سے ہاتھ سے کتنی دیر تک صفائی کرنی ہے؟ دہریئے اس قسم کی خرافات کو رد کرتے ہیں۔ وہ حیات بعد الموت کے قائل نہیں ہیں، ان

کے نزدیک اس زندگی کے بعد انسان بھی دیگر حشرات الارض کی طرح ختم ہو جاتا ہے، لہذا فرد کی دنیاوی خوشی ہی سب سے زیادہ اہم ہے، بشرطیکہ وہ خوشی کسی دوسرے کے دکھوں کی بنیاد بنا کر حاصل نہ کی جائے۔

چونکہ دہریئے بھی اہل ایمان کی طرح ہی معاشرے کے رکن ہوتے ہیں، لہذا ان کی سوچیں اور رویے بھی اسی ثقافت اور معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا وہ حصہ ہوتے ہیں۔ پاکستان کے اندر اور مغربی ممالک کے اندر موجود ناستکوں کے رویے اپنے اپنے معاشرتی اور ثقافتی اظہار کے مطابق ہوں گے، جو اکثر حالات میں ایک دوسرے سے متصادم بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مغربی ممالک کے ناستکوں اور خدا کے وجود کو ماننے والوں کے ثقافتی رویوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ان کا شادی سے پہلے جنسی تعلقات پر ایک جیسا ردِ عمل ہی ہوتا ہے، کیونکہ ان معاشروں میں جنس کو اتنا گھٹیا مقام نہیں دیا جاتا، جبکہ ہمارے ہاں جنس کو گالی اور تشدد کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں یہ تصور تک سرے سے ناپید ہے۔

پاکستانی اہل ایمان کے ماں، بہن یا بیٹی سے مباشرت کے سوال کا اصل مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ ملحدین کو بالواسطہ طور پر گالی دی جائے۔ اس قسم کی خرافات کو مغربی معاشرے کے لوگ سوائے ہنسنے کے کوئی اور جواب نہیں دیتے۔ کیونکہ تمام دیگر جاندار چیزوں کی طرح انسان کی بھی دو ہی بنیادی ضروریات ہیں اور وہ خوراک اور جنس ہیں۔ خوراک سے کسی بھی ذی روح کی انفرادی بقا کا سوال جڑا ہوا ہے۔ انسان کو اگر دیگر حشرات الارض کی طرح ایک خاص مدت تک خوراک نہ ملے تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے، جبکہ جنس سے اس ذی روح کی نسل کی بقا کا تسلسل وابستہ ہے۔ اگر جنس کا وجود ختم کر دیا جائے تو 80-90 سال تک اس کرہ ارض پر شاید ایک بھی انسان باقی نہ رہے۔

میں بچپن میں ایک کھیت میں کھڑا تھا، ایک راہگیر کو بڑے ادب سے ماموں کہہ کر مدد مانگی، اس نے پاس آ کر بڑے پیار سے سمجھایا: بیٹا، میں تمہاری مدد تو کر دیتا ہوں لیکن آئندہ کسی کو ماموں نہیں کہنا بلکہ چچا کہنا، کیونکہ ماموں ایک گالی ہوتی ہے مجھے اس وقت اس بات کی سمجھ نہیں آئی لیکن اب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں سیکس کے ساتھ گناہ کا تصور وابستہ ہو، جس معاشرے میں ماموں یا سالا کے الفاظ ایک گالی کی حثیت رکھتے ہوں، جہاں جنس جو ایک انتہائی فطری جذبہ ہے اور جس سے نسل انسانی کی تخلیق اور تسلسل وابستہ ہے، جنس کو گالی سمجھنے کی سوچیں اور رویے ایک ایسے معاشرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انتہائی بیمار اور گل سڑ چکا ہے۔

میں یہاں پر اپنا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سنانا چاہوں گا۔ ستر کی دہائی میں اوسلو میں ایک چائنیز کیفے ٹیریا پاک ٹی ہاوس کی شکل اختیار کر گیا تھا، دوست لوگ وہاں اتوار کے روز اکٹھے ہو کر بحث و مباحثہ کرتے، گپ بازی، میل ملاپ کی ایک بہت ہی مقبول

جگہ تھی۔ اتفاق سے ایک دن اپنے ایک دیسی اور مقامی میں جھگڑا ہو گیا، جو گالیوں تک جا پہنچا، مقامی نارویجن کی گالیاں بہت ہی "معصوم" قسم کی تھیں، جبکہ اپنے دیسی نے پنجابی گالیوں کا نارویجن ترجمہ شروع کر دیا، لیکن جب اس نے پہلی گالی کچھ یوں دی: "میں تیری ماں کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"، تو چند لمحوں کیلئے اس نارویجن کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا، لیکن پھر اس نے جواب دیا: "میری ماں کا کسی کے ساتھ مباشرت اس کا ذاتی مسئلہ ہے، اگر وہ تمہارے ساتھ یہ کچھ کرنا چاہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں"۔ یہ لمحہ بہت ہی عجیب تھا اور اس پاکستانی کی حالت دیکھنے کی لائق تھی جس کا اتنا بڑا حملہ اس بری طرح پسپا کر دیا گیا تھا۔

چونکہ الحاد کوئی نظریہ نہیں ہے اور اس کے کوئی باقاعدہ اصول وضع نہیں کیے گئے لہذا ہر ملحد اپنے افعال یا سوچوں کا خود ذمہ دار ہے۔ میری سوچیں صرف میری ہیں جو میری زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہیں، میں کسی دوسرے ملحد کی نمائندگی نہیں کرتا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ مغربی ملک میں گزرا ہے، لہذا میری یا پاکستان اور دیگر ممالک میں موجود ملحدین کی سوچوں میں فرق ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میری سوچیں، میرا ثقافتی اظہار پاکستان میں موجود کسی ناستک سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ میرے ہر لفظ یا کسی بھی حصے سے دوسروں کا متفق ہونا قطعی ضروری نہیں ہے، میری سوچوں سے کسی کا اختلاف اس کے مجھ سے کم یا زیادہ ناستک ہونے کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے گرد و نواح اور زندگی کے تجربات کے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے۔

جو ناستک پاکستان میں رہتے ہیں، وہ یقیناً اسی ملک کی ثقافت اور رسوم کی پابندی کرتے ہیں، البتہ جن دہریوں کو نزدیکی رشتہ داروں سے شادی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا پتہ ہوتا ہے، ماں بہن سے مباشرت تو درکنار وہ حتی الوسع اپنے کزنوں کے ساتھ شادی سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ اتنے نزدیکی رشتوں کے ساتھ مباشرت کی کہانیاں البتہ مذہب میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ آدم اور حوا بھی اصل میں باپ بیٹی کے درمیان ازدواجی تعلقات کی ہی کہانی ہے، حوا کے بیٹے بیٹیوں کا ایک دوسرے سے شادی کرنا، حضرت لوط کی بیٹیوں کا اپنے باپ کو شراب سے مدہوش کر کے اس سے مباشرت کرنا، حضرت ابراہیم کا اپنی سوتیلی بہن سارہ سے شادی کرنا اور اس سے حضرت اسحاق کا پیدا ہونا، اپنی نوکرانی ہاجرہ سے مجامعت کے نتیجے میں حضرت اسماعیل جیسے "ناجائز" بچے کا پیدا ہونا اسی مذہبی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مومنین جب ناستکوں پر ماں، بہن، بیٹی سے مجامعت کا الزام لگاتے ہیں تو یوں گمان گزرتا ہے کہ انہیں ماں بہن سے مباشرت کرنے سے صرف مذہب نے روکا ہوا ہے ورنہ وہ اپنی یہ حسرت ضرور پوری کرتے۔

ناستکوں سے متعلق سوالوں کا جواب دینے کیلئے میں اپنے حوالے سے بات کروں گا۔ میں ایک پاکستانی، پنجابی، دیہاتی، سنی مسلم گھرانے میں پیدا ہوا۔ یورپ میں مقیم ہوں۔ میں نے یورپ میں شادی نہیں کی اور اس کی وجہ مذہبی تفاوت نہیں تھی کہ میں مسلمان ہوتے ایک یورپی عیسائی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف ثقافتی فرق تھا۔ میں پاکستان میں پلا بڑھا اور

اپنے آپ کو اس قابل نہیں پایا کہ میں یورپ کی ایک لڑکی کے ساتھ ثقافتی فرق کی وجہ سے چل پاتا۔ ہاں مجھے پاکستان میں پلی بڑھی عیسائی، ہندو، سکھ یا کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والی ایسی لڑکی ملتی جو مجھ سے شادی کرنا چاہتی تو مجھے اس سے شادی منظور تھی۔ لیکن پاکستان جیسے معاشرے میں یہ ممکن نہیں تھا، کوئی بھی غیر مسلم مذہبی فرق کی وجہ سے اپنی بیٹی سے میری شادی کرنے کیلئے کبھی تیار نہ ہوتا۔ مجھے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ چونکہ کوئی بھی پاکستانی مسلمان والدین بغیر نکاح کے اپنی بیٹی میرے حوالے کرنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ لہذا میں نے باقاعدہ نکاح کیا، لیکن اگر مجھے بغیر نکاح کے لڑکی ملتی تو مجھے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرے نزدیک نکاح یا عدالتی کاروائی ایک معاشرتی تکلف سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اگر دو بالغ انسان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے اکٹھا رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کا پورا حق ہے۔ مجھے اگر یورپ میں میرے ثقافتی پس منظر سے تعلق رکھنے والی ایسی لڑکی ملتی جو مذہب سے میری طرح دور ہوتی تو مجھے اس کے ساتھ دفتر جا کر اپنے آپ کو میاں بیوی کی طرح رجسٹر کروانے یا بغیر شادی کیے اکٹھے رہنے میں کوئی برائی نظر نہ آتی۔ میں اگر کسی لڑکی کو پسند کرتا ہوں اور اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں تو اس خواہش یا جذبے کی تصدیق کیلئے مجھے کسی عجیب و غریب حلیے والے مرد یا کسی سرکاری محکمے کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔

پاکستان یا دیگر ممالک میں موجود ناستک اپنے اردگرد کے معاشرے کے غلام ہیں، وہ اگر چاہیں بھی تو اپنی سوچوں پر اس طرح عمل نہیں کرسکتے جنہیں وہ صحیح سمجھتے ہیں، وہ کسی دوسری خاتون کے ساتھ بغیر شادی کیے نہیں رہ سکتے، وہ اپنی بہنوں بیٹیوں کے شادی کے بغیر جنسی تعلقات رکھنے کے معاشرتی نتائج کا سامنا نہیں کرپائیں گے، لیکن مغربی ممالک میں اب پاکستانی نژاد اہل ایمان لڑکیاں بھی شادی سے پہلے جنسی تعلقات میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتیں۔ عرب سنی خواتین مسیار اور شیعہ خواتین متعہ کا سہارا لے رہی ہیں۔ ترکی میں میرا ایک دوست جو ناستک نہیں ہے وہ کئی ماہ ایک ترک خاتون کے ساتھ رہ کر اب شادی کے بندھن میں بندھا ہے۔ وہ یہ کچھ پاکستان میں نہ کرپاتا۔

کیا کوئی ملحد اپنی بیوی کو دوسرے کے ساتھ بانٹنا چاہے گا، اس کا تعلق بھی ہر فرد کی ذاتی سوچ کے ساتھ ہے۔ گروپ سیکس نام کی چیز مغربی ملکوں میں موجود ہے، کچھ عرصہ پہلے ایک مقامی اخبار میں پڑھا تھا کہ کچھ مقامی لوگ ایک ہوٹل میں کمرہ بک کرلیتے ہیں، اور "فراغت" کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں، میں چونکہ پاکستان میں ایک گاؤں میں ہی پلا بڑھا لہذا پاکستان کی شہری زندگی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن سنا ہے کہ اسلام آباد وغیرہ جیسے شہروں میں کچھ لوگ بیویوں کو کچھ لمحوں کیلئے تبدیل کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے۔ ویسے میں اپنے اختیار کردہ ملک میں ذاتی طور پر ایک غیر پاکستانی دوست فیملی کو جانتا ہوں جو اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے، حالانکہ وہ ناستک بھی نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک تحفہ ہے اور اس سے

جس قدر خوشی کشید کی جاسکتی ہے، ضرور کرنی چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کچھ عرصہ اکٹھا رہنے کے بعد محبت کی چنگاری مدھم ہونے لگتی ہے، اور انہیں اپنے ساتھی کے علاوہ دیگر افراد میں بھی کشش محسوس ہوتی ہے، لہٰذا ہر چند مہینوں اور سالوں بعد نیا جیون ساتھی ڈھونڈنے کی بجائے یہ بہتر طریقہ ہے کیونکہ اس سے ان کی معاشی زندگی اور بچے کسی قسم کے مسائل کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ اکٹھے رہ کر اگر زندگی کا مزہ لے سکتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔

وہ جہاں کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی

لیکن اکثریت اس سے مختلف خیال رکھتی ہے، ان کے نزدیک جب ایک دوسرے کے ساتھ مزید رہنے کو جی نہ چاہے تو علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ بہت زیادہ خواتین دوست ایسی بھی ہیں، جنہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی کیونکہ وہ اپنی آزادی نہیں کھونا چاہتیں۔ ان میں زیادہ تر کے بچے بھی نہیں ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اس دنیا میں کافی انسان موجود ہیں، ان کے بچے نہ پیدا کرنے سے نسل انسانی کی بقا کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

جنسی رویوں یا سوچوں کا بنیادی تعلق ثقافت اور رسوم و رواج سے ہے لیکن مومنین کے نزدیک وہ اخلاقیات کا مسئلہ ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم مغالطہ جس کا مومنین شکار ہیں وہ یہ ہے کہ اخلاقیات مذہب کی پیداوار ہے۔ لیکن میں ناستک ہوتے ہوئے جھوٹ اس لیے نہیں بولتا کہ مجھے کسی آسمانی باپ کی سزا کا خوف ہے، میں اس لیے سچ بولتا ہوں کہ جو میری بات سن رہا ہے وہ مجھے اس قابل سمجھتا ہے کہ میری بات سنے، میں اس عزت افزائی کے بدلے اسے جھوٹ بول کر گمراہ نہیں کرنا چاہتا، اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے جھوٹ بول کر گمراہ کرے، میں اس لیے کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ کوئی مجھے دھوکا دے۔ میں کسی کو بھی اس لیے قتل نہیں کرنا چاہتا کہ میرے نزدیک ایک انسان کی سب سے قیمتی متاع اس کی زندگی ہے، اور اسے اگر فطرت سے یہ تحفہ ملا ہے تو مجھے اس سے چھیننے کا بالکل اسی طرح حق نہیں ہے جیسے میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے میری سب سے قیمتی متاع جو میری زندگی ہے، مجھ سے چھینے۔

کیا میں اپنے ماں باپ کا ادب کرتا ہوں۔ ادب کیا چیز ہے، میں اسے تین حصوں میں تقسیم کروں گا۔ کیا میں اپنے ماں باپ سے عزت و احترام سے بات کرتا ہوں۔ کیا میں ان کی ہر بات مانتا ہوں۔ کیا میں بڑھاپے میں ان کا سہارا بنوں گا؟۔

ایک ناستک ہونے کے ناطے میں کسی بھی آسمانی ہدایت کے بغیر ہر کسی کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک معاشرے آداب کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں اس لیے بھی دوسروں کو احترام دیتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے بھی احترام دیا جائے، جبکہ میرے والدین تو میرے جنم داتا ہیں۔

کیا میں اپنے والدین کی ہر بات مانتا ہوں، اس کا جواب نفی میں ہے۔ میرے والدین پچھلی صدی کے لوگ ہیں، ان کی سوچیں اور خیالات اپنے وقتوں کے مطابق شاید صحیح ہوں لیکن اب پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے، ان کے اکثر مشورے میرے کام کے نہیں ہیں۔ میرے والد میری شادی اپنے بڑے بھائی کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے، میں نے انکار کر دیا، پٹائی بھی ہوئی لیکن میں ڈٹا رہا، مجھے آج بھی اپنے اس فیصلے پر ندامت نہیں ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو بھی یہی درس دیا ہے کہ میری بات یا مشورے کو اس بنا پر ہر گز نہ ماننا کہ میں تمہارا باپ ہوں اور میرے ہر الٹے سیدھے فیصلے کو مان لینے سے میری عزت افزائی ہو گی۔ اگر تمہیں میری صلاح یا مشورہ صحیح نہ لگے تو بنا لحاظ کیے انکار کر دینا۔ اور مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب میرے بچے اکثر اوقات مجھے غلط ثابت کر کے میرا منہ بند کر دیتے ہیں، ان لمحوں میں مجھے لگتا ہے کہ میں نے ان کی پرورش کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

کیا میں اپنے والدین کے بڑھاپے کا سہارا بنوں گا؟۔ انسانی بچہ پیدا ہوتے وقت جس قدر بے آسرا ہوتا ہے شاید کسی دوسری ذی روح کے بچے کو ایسی بے بسی کا سامنا نہ ہو۔ میں پیدائش کے وقت سب انسانی بچوں کی طرح گوشت کے ایک لوتھڑے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ میری ہر قدم پر حفاظت کی گئی، آج اگر میں ہوں تو اپنے والدین کی وجہ سے ہوں، میرے والدین وہ لوگ ہیں جنہوں نے میری زندگی کا میرا پہلا قدم اٹھانے میں میری مدد کی، اب وہ اپنی زندگی کے آخری قدم اٹھا رہے ہیں۔ ان کے آخری قدم اٹھانے کے وقتوں میں اگر میں ان کا ساتھ نہ دوں تو لعنت ہے مجھ جیسے احسان فراموش پر۔ میں یہاں پر والدین کی محبت کا ذکر نہیں کر رہا، اگر میں والدین کا ایسے کٹھن وقتوں میں سہارا نہ بن پایا تو شاید زندگی بھر آئینے میں اپنا منہ دیکھنے کی ہمت نہ کر پاؤں۔ لیکن میں یورپ میں رہتا ہوں، میں نے زندگی بھر ریاست کو ٹیکس ادا کیا ہے، ریاست میرے بڑھاپے اور علاج معالجے کی ذمہ دار ہے، چونکہ یہاں پر اولڈ ز ہوم بہت ہی معیاری ہیں، لہذا میں ذاتی طور پر اپنے بڑھاپے کے وقتوں میں اپنے بچوں پر بوجھ بننے کی بجائے اولڈز ہوم میں جانا پسند کروں گا۔

یہی حال مرنے کے بعد کی رسومات کا ہے، اگر میں پاکستان میں ہوتا تو مرنے کے بعد میں کوئی الٹی سیدھی وصیت کر کے اپنے لواحقین کی زندگی میں کانٹے بونا پسند نہ کرنا چاہتا، وہ اپنے حالات کی مناسبت سے اگر مجھے دفن کرتے، جنازہ و فاتحہ خوانی

کرواتے، مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، میرے مرنے کی وجہ سے میرے لواحقین کی زندگیاں متاثر نہیں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے اسی معاشرے کا حصہ بن کر زندہ رہنا ہے۔

لیکن میں یورپ میں مقیم ہوں، میرے بچے میری لاش کے مالک ہوں گے، انہیں جو بھی مناسب لگے گا وہ کریں گے۔ مجھے دفن کر دیں، جلادیں، سمندر میں پھینک دیں، کسی لیبارٹری کے حوالے کر دیں، یہ ان کا مسئلہ ہے، مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ویسے بھی مرنے کے بعد میرے لیے میرا جسم بے کار ہو جائے گا، میرا جسم مجھے کسی بھی حالت میں دوبارہ زندہ نہیں کر پائے گا، میں گرچہ اس وقت موجود نہیں ہوں گا، لیکن مجھے ان کے کیے گئے کسی بھی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

تصویرِ خدا

نیلا آسمان کس قدر شاندار اور خوبصورت لگتا ہے، نظر کی ایک حد سے دوسری حد تک پھیلا ہوا بے عیب، نیلگوں۔۔ ایسا لگتا ہے کہ اتنی خوبصورت اور بے عیب چیز دوسری کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایک سوال ہے جو شاید آپ نے بھی کبھی سوچا ہو، یہ آسمان نیلا کیوں دکھتا ہے؟ کسی کے لیے تو جواب ہو گا خدا نے اسے نیلا بنایا ہے، کوئی جو سائنس سے تھوڑی بہت جانکاری رکھتا ہو گا کہے گا فضاء میں معلق پانی کے بخارات نیلے رنگ کا آسمان ہیں۔

کیا یہی حقیقت ہے؟ کیا یہی پانی کے بخارات نیلے رنگ کا آسمان ہیں؟ بالکل کہہ سکتے ہیں، مگر یہ ہمیں نیلے رنگ کے کیوں دکھتے ہیں؟ یہ بھی ایک سوال ہے، کیا یہ ہماری آنکھوں کا کمال ہے کہ روشنی ان سے گزر کر ہماری آنکھوں کے ریٹینا پر گر رہی ہے۔ مگر پھر بھی یہ نیلا ہے کیا؟ میں آپ سے کہوں گا نیلا کچھ نہیں ہے، نیلا رنگ صرف اور صرف آپ کے دماغ میں ہے۔ آپ کہیں گے: کیا بات کرتے ہو۔

مگر یہی حقیقت ہے، روشنی آپ کی آنکھوں میں آتی ہے اور آنکھیں آپ کے دماغ کو معلومات دیتی ہیں اور اس معلومات کا مطلب دماغ کے لیے نیلا رنگ ہے۔ مطلب درحقیقت نیلے رنگ کے آسمان کو سمجھنے کے لیے دماغ نے ایک نظام بنایا ہوا ہے، جب آنکھوں پر روشنی پڑی تو اس روشنی کے مطابق دماغ کو معلومات دی اور اس سے دماغ

نے ایک تصوراتی تصویر بنائی جو حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔اسی طرح ہی تمام ہی احساسات ہمارے حواسِ خمسہ کے ذریعے دماغ کو باہری حقیقت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

اوپر کی گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں،جو سونگھتے ہیں وہ ہمارے دماغ کے اندر چل رہا ہوتا ہے اور ہمارے حواس کے ذریعے سے دماغ میں آنے والی تمام معلومات سے ایک عکس بنتا ہے جو صرف دماغ کے اندر ہوتا ہے، تمام چیزیں جو ہمارے اردگرد وجود رکھتی ہیں ان کا وجود ایک حقیقت ہے جس کو ہمارا دماغ سمجھتا ہے اور اس کی اپنے انداز میں ایک تصویر بنالیتا ہے اس طرح سے ہمارا دماغ ہمارے اردگرد کے ماحول کی حقیقت سے رابطے میں رہتا ہے۔

دوسری طرف دماغ میں چلنے والی ہر چیز،ہر سوچ،صرف حواسِ خمسہ پر ہی انحصار نہیں رکھتی،دماغ کی ایک اپنی دنیا ہے،اس دنیا میں سوچ کی بے شمار تصویریں ہیں،یہ تصویریں حقیقت پر مبنی بھی ہوتی ہیں اور تخیل پر بھی، تخیلات اور حقیقت مل کر دماغ کی سمجھ بوجھ میں کردار ادا کرتے ہیں۔

اب میں دو چیزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں،ہم میں سے ہر ایک نے زندگی میں کبھی نہ کبھی گھوڑا ضرور دیکھا ہو گا،اب اگر میں آپ سے پوچھوں تو آپ با آسانی مجھے بتادیں گے کہ گھوڑا ایک جانور ہے اس کی شکل ایسی ہوتی ہے،اس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔مگر اگر میں آپ سے پوچھوں کہ پری کیا چیز ہے؟تو ہر کسی کا جواب مختلف ہو گا،کوئی کہے گا اس کے دو پر ہوتے ہیں کوئی کہے گا چار پر ہوتے ہیں،کوئی کہے گا اس کے بال اتنے لمبے ہوتے ہیں کوئی کہے گا اس کی پوشاک ایسی ہوتی ہے،کوئی کہے گا ویسی۔اصل میں گھوڑے اور پری کی مثال دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ گھوڑا ایک حقیقت ہے اور پری دماغ کی ایک تصوراتی تصویر،اگر آپ کسی سے گھوڑے کے بارے میں پوچھیں گے تو ہر کوئی گھوڑے کی تقریباً ایک جیسی خصوصیات ہی بتائے گا،مگر پری یا پھر جل پری،جن بھوت،بلائیں اور ہر قسم کے خیالی اور تصوراتی کرداروں کی ہیئت اور اشکال میں آپ کو ایک ایسا

تضاد ملے گا کہ اگر آپ صرف ان کی خصوصیات کسی کو بتانے لگیں اور کہیں کہ بوجھو میں کس چیز کے بارے میں بتارہاہوں تو کوئی کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچ پائے گا۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ تخیلاتی چیزیں جو صرف دماغ میں ہوتی ہیں ان میں بے شمار تضاد ہو گا کیونکہ ان کا تعلق خالصتاً دماغ کی دنیا سے ہے جبکہ حقیقی وجود رکھنے والی چیزوں کے بارے میں تضاد نہیں ہو گا کیوں کہ ان کا تخیل یا تصویر دماغ نے حواسِ خمسہ کے ذریعے لے کر اپنے اند محفوظ کی ہوئی ہوتی ہے، اسی باعث ان تصورات میں تضاد نہیں ہوتا، مگر جو تصوراتی چیز صرف اور صرف دماغ کی پیداوار ہے اس کے بیان میں تضاد ضرور ہو گا، مطلب پری اور جل پری کی ہی بات لے لیں، پری کا تصور پہلے آیا ہو گا کہ جل پری کا؟ شاید پری کا، یعنی ایک خوبصورت عورت جس کے پر ہوتے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے، پھر کسی دن کسی نے سوچا کہ اگر خوبصورت پری ہوا میں پروں کے ذریعے اڑ سکتی ہے تو پانی میں تیرنے کے لیے اس کو مچھلی جیسی ایک دم کی ضرورت ہو گی، تو لیں جی جل پری بن گئی۔ کوئی کہے گا کہ جل پریاں انسانوں کی دوست ہیں تو دوسرا کہے گا نہیں وہ تو آدم خور ہوتی ہیں۔ یعنی تصوراتی کرداروں کے بارے میں تصورات میں تضاد انتہائی زیادہ ہو گا، ہاں گھوڑے کے قد یا جسامت میں فرق ہو سکتا ہے مگر کوئی بھی یہ نہیں مانے گا کہ گھوڑا اڑ سکتا ہے، مگر جل پری کے بارے میں یہ بات کوئی آسانی سے مان لے گا۔

دنیا میں ایسی بھی چیزیں ہیں جو دماغ کے تصور کی پیداوار ہیں مگر انسانی صنعت کے باعث حقیقت کا روپ دھار گئیں، ان چیزوں کی ہیئت اور بناوٹ کے بارے میں بھی کوئی خاص تضادات نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو تھوڑا بہت حواسِ خمسہ کے استعمال کے بعد دور ہو جاتے ہیں، مگر وہ چیزیں جو خالصتاً تصور میں رہتی ہیں ان کے بارے میں تضادات کو دور کرنا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ دماغ ان کی حقیقت کو کبھی بھی دریافت نہیں کر سکتا، اس لیے ان تصورات میں اضافہ یا بڑھوتری صرف تصوراتی بنیادوں پر ہو کر ان معاملات کو مزید پیچیدہ کر دیتی ہے۔

آپ کو دنیا میں جل پریوں کے مصوروں کے بنائے ہوئے فن پارے تو مل جائیں گے مگر دنیا میں کوئی حقیقی جل پری کبھی بھی نہیں ملے گی، ان کے حسن کے قصے بھی کتابوں میں مل جائیں گے، ان کا ذکر شاعری میں، دیومالائی قصوں میں بھی مل جائے گا مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مصور تصویر بناتا ہے، جل پری اس کے دماغ میں ایک تصور ہے اس کو کینوس پر اتار دیتا ہے، ہر مصور کی جل پری مختلف ہوگی، کسی کے بال سرخ ہوں گے تو کسی کے سبز، کسی کی دم شارک سے ملتی ہوگی تو کسی کی ڈالفن سے، کسی کی کھال پر ہیرے جڑے ہوں گے تو کسی جلد مچھلی جیسی۔ اور کسی مصور کی جل پری مچھلی کی دم کی جگہ آکٹوپس کی ٹانگیں رکھتی ہوگی۔

اس سے آگے بات آجاتی ہے انسانی ارتقاء کے دوران ہمیں 40000 سال پرانی غاروں میں انسانوں کی بنائی ہوئی تصویریں ملتی ہیں۔ اس وقت انسان اس قابل تھا کہ اپنے ذہن میں پائی جانے والی باتوں کو تصویروں کی زبان میں بیان کرسکے، مگر اس وقت کی تصاویر زیادہ تر شکار کی داستانیں بیان کر رہی ہوتیں تھیں۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب جب وقت گزرتا گیا تو نسبتاً جدید زمانے یعنی 10000 سے 20000 سال کے عرصے میں انسان تصورات کو بھی تصویروں میں ڈھالنے لگا، اسی دوران کہیں خدا کا تصور بھی پروان چڑھ چکا تھا، اور اب انسان نے دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیں اور تصاویر بنانی شروع کردیں۔ یعنی تصور خدا جو انسان کے ذہن میں تھا، اس کا مختلف اشکال میں دنیا میں تصویری حقیقت میں ڈھالنا شروع کردیا۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ایک جل پری کی طرح خدا بھی کئی قسم کے ہیں، سورج بھی خدا ہے، بعل جو کہ ایک بچھڑا ہے وہ بھی خدا ہے، مگر مچھ اور کچھوے بھی خدا ہیں، یعنی تصورِ خدا میں ایک جل پری کے تصوراتی کردار سے کہیں زیادہ تضادات ہیں، کہیں خدا بادلوں میں گرجتا اور باز کی شکل لیتا ہے تو کہیں وہ ناموجود ہے، کہیں وہ پانیوں کا خدا ہے تو کہیں آسمان کا، اسی طرح اس کے بے شمار اوتار ہر قسم کے متضاد خداؤں کو دنیا میں متعارف کرتے رہتے ہیں، کہیں زیوس، را، سیتھ، بعل، اوڈن، یہواہ اور اللہ۔

خداؤں کی دو اشکال ہیں، یا تو وہ بالکل انسان کے دماغ میں رہتے ہیں، مسیحت کا خدا کہتا ہے وہ دل میں رہتا ہے، اسلام کا خدا بھی کھلے دل سے اس کو قبول کرنے کی بات کرتا ہے، دوسرے خدا جو انسانی دل و دماغ (حقیقت میں تو

خدا صرف دماغ ہی میں ہوتا ہے) سے نکل کر کینوس اور تراشی ہوئی صورتیں بن جاتے ہیں۔یعنی خدا کی حقیقت صرف تصور یا پھر تصویر کے اظہار ہی میں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا صرف ایک تصور ہے۔جو بھی چیز وجود رکھتی ہے اس کے بارے میں تضادات نہیں ہوتے، مگر خدا تضادات سے بھرا پڑا ہے، ایک ہی مذھب کے ماننے والوں کے بھی اپنے خدا کی ہیئت کے بارے میں بے شمار تضادات ہوتے ہیں۔مختلف مذاہب کے تصورِ خدا تو بالکل ایک دوسرے سے مکمل متضاد ہیں۔

اگر خدا کی کوئی حقیقت ہوتی تو چین میں رہنے والے جین مت کے ماننے والے، عرب کے مسلمان، افریقہ کے مگرمچھ کے پجاری اور حقیقی امریکی باشندوں کے خداؤں میں کوئی تو یکسانیت ہوتی۔گھوڑے تو ان سب ملکوں کے لوگوں کے ایک جیسے ہوتے ہیں، پانی کیا چیز ہے اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں، زبان میں پانی کے نام پر اختلاف ضرور ہوسکتا ہے مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ کیا چیز پانی ہے اور اس کو پیا جاتا ہے، پانی زمین پر ہر جگہ جہاں انسان رہتا ہے مل جاتا ہے، تو پھر خدا جو ہر جگہ موجود ہے اس کے بارے میں اتنے اختلاف کیوں ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ جل پری کی طرح خدا بھی ایک دماغی تصویر ہی ہے جسے انسان کینوس، کتب اور عبادت گاہوں میں اتار رہا ہے؟

سیکولرزم

الحاد اور ضابطہ حیات

الحاد—پھر اس کے بعد کیا؟

یہ سوال عموماً سامنے آتا ہے، لیکن کبھی آپ نے غور کیا کہ یہ سوال کبھی ایسے شخص کی جانب سے سامنے نہیں آتا جو الحاد کے مراحل طے کر چکا ہوتا ہے، بلکہ یہ سوال عموما ان لوگوں کی طرف سے سامنے آتا ہے جو یا تو حالت ایمان میں ہوتے ہیں یا ایمان اور الحاد کی دہلیز پر حالت تذبذب میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

ملحد، الحاد کا مرحلہ بہت غور و فکر کے بعد طے کرتا ہے، اس لئے الحاد کے بعد اسے اپنے ذاتی نظریات کے حوالے سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی، ہمارے معاشرے کے تناظر میں اسے صرف یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اب اسے اس کے نظریات کے ساتھ اس کا خاندان، عزیز و اقارب اور معاشرہ قبول نہیں کرے گا، اور اس کی جان کے درپے ہو جائے گا، اس لئے اسے صرف یہ مشکل درپیش آتی ہے کہ اپنے نظریات کو کس طرح دوسروں سے چھپا کر رکھے۔ وہ اپنے نظریہ کی سچائی کے بارے میں بہت واضح اور بااعتماد ہوتا ہے۔ جن معاشروں میں آزادیٔ اظہار رائے کا احترام کیا جاتا ہے ملحد کو اپنے الحاد کی وجہ سے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ واضح رہے کہ الحاد بذات خود کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے، بلکہ دلیل کو عقل کے معیار پر قبول کرنے کا نام ہے، اس لئے جو بھی قوانینِ حیات عقل اور شعور کی رہنمائی میں مرتب کئے جائیں گے، ایک ملحد کیلئے قابل قبول ہوں گے۔

جو لوگ "ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر" کی کیفیت میں ہوتے ہیں ان کے ذہن میں ممکنہ طور پر یہ مغالطہ جاں گزین ہوتا ہو گا کہ اخلاقیات کا منبع مذہب ہے اور مذہب سے باہر کی دنیا کا اخلاقیات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سوچ بہت حیران کن ہے، یہ صرف دنیا کے موجودہ حالات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ ایسے افراد کو اندازہ ہی نہیں آج کی دنیا فلسفہ اخلاقیات کی ترقی کے کس مقام پر کھڑی ہے کہ جہاں صدیوں سے رائج مذہبی اخلاقیات بھی معذرت خواہانہ کیفیت میں منہ چھپاتی نظر آتی ہے، یا بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتی نظر آتی ہے کہ یہ جدید اخلاقیات دراصل مذہبی اخلاقیات سے ہی کشید کردہ ہے، حالانکہ مذہبی اخلاقیات اور جدید اخلاقیات میں تضاد اظہر من الشمس ہے۔ ان لوگوں کو کبھی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں اخلاقیات کی تاریخ ہی اٹھا کر دیکھ لیتے۔ میں یہاں الحاد کے وقت اپنی کیفیت کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ میں جب ایمان و الحاد کی دہلیز پار کر کے الحاد کی روشن دنیا میں داخل ہوا تو یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آپ نے کسی مشکل ترین معمّے (Puzzle) کی اہم ترین گتھی سلجھالی ہو اور اس کے بعد کی تمام تر گتھیاں خود بخود سلجھتی چلی جائیں اور سوالوں کی کڑی خود بخود

اپنے منطقی جوابات کی کڑی سے جاکر جڑتی چلی جائے۔ایک مذہبی ہمیشہ اپنے مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلاء رہتاہے لیکن ایک ملحد اپنی سوچ اور فیصلے کی سچائی کے بارے میں شواہد کی بنیاد پُر اعتماد ہوتا ہے،اور فکری ونظریاتی طور پر ایک مذہبی کی نسبت بہت اطمینان اور پر سکون زندگی گذار رہا ہوتا ہے۔

اگر الحاد کے سامنے یہ سوال کھڑا ہوتا کہ الحاد پھر اس کے بعد کیا؟ تو اس سوال کا سب سے زیادہ سامنا مغربی ممالک میں ملحد ہونے والے افراد کو کرنا پڑتا،اور وہاں یہ سوال ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ بن کر ابھرتا۔یہ سوال ہمارے معاشرے کے کم علم،باہر کی دنیا سے ناواقف انسان کے محدود ذہن کی پیداوار ہے۔

کیا آپ نے کبھی مغربی ممالک میں جہاں ہر طرح کے موضوعات پر کھل کر بحث ومباحثہ ہوتا ہے کبھی اس موضوع پر بحث کے بارے میں سنا ہے؟وجہ اس کی بالکل واضح ہے کہ وہاں ایک عرصے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے اخلاقیات مذہب سے نہیں بلکہ اجتماعی انسانی عقل وشعور سے کشید کی جارہی ہے۔مغرب میں انفرادی زندگی میں تو مذہب کارفرما ہو سکتا ہے اور وہ بھی آزادیٔ اظہار رائے کے سنہری اصول کی دین ہے،لیکن اجتماعی زندگی کے قوانین مرتب کرتے ہوئے مذہب کے بجائے اجتماعی انسانی عقل وشعور سے استفادہ کیا جاتا ہے،جنہیں سیکولر قوانین کہا جاتا ہے۔دوسرا اہم ترین ادارہ جمہوریت ہے، جو معلوم تاریخ میں اب تک کا سب سے بہترین طرز حکومت ہے۔سیکولرازم اور جمہوریت دونوں کسی مذہبی صحیفے نے متعارف نہیں کرائے،بلکہ انسان نے اپنی اجتماعی عقل وشعور کی بدولت دریافت کئے،جن کی برکات سے مذہبی اور لامذہبی دونوں بھرپور استفادہ کررہے ہیں،اور ابھی تک کوئی اور نظام ان کو چیلنج نہیں کرسکا ہے۔

انفرادی زندگی کے حوالے سے انسان نے صدیوں کے مشاہدے اور تجربے کی بدولت اجتماعی انسانی عقل وشعور کی روشنی میں بلاامتیاز دنیا بھر کے انسانوں کیلئے بنیادی حقوق متعین کرلئے ہیں،جنہیں مسلمان ممالک سمیت تمام اقوام نے منظور کیا،یہ بنیادی انسانی حقوق اقوام متحدہ کے شائع کردہ "انسانی حقوق کا عالمی منشور" میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں،جو کل 30 دفعات پر مشتمل ہے۔یہ مختصر سا کتابچہ دور جدید کا عظیم "معاہدۂ عمرانی" ہے،اس منشور پر اتفاق رائے دنیا بھر کے تمام مذہبی ولامذہبی انسانوں کے حقوق کے تعین اور تحفظ (بشرطیکہ ان کی اپنی حکومتیں اس پر عمل درآمد کرائیں) کا ضامن ہے۔اس منشور کی موجودگی انسانیت کو کسی بھی مذہبی صحیفے سے بے نیاز کردینے کیلئے کافی ہے۔جو ممالک اس منشور پر عمل پیرا ہیں ان ممالک کے شہریوں کی زندگی کا معیار ان ممالک سے بہت بہتر ہے جو آج کے اس جدید دور میں بھی اخلاقی قوانین کیلئے آسمانی صحیفوں سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم الحادی زندگی کی توضیح کے اعتبار سے بہت آسان دور میں جی رہے ہیں جہاں ہمیں الحاد کے بعد اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی خلاء نظر نہیں آتا،ہمارے پاس انفرادی واجتماعی زندگی کے حوالے سے بہترین عملی مثالیں موجود

ہیں۔ ہمیں سیاسی اسلام کی طرح تصوراتی دنیا کے جھوٹے خواب دکھانے کی ضرورت نہیں کہ پہلے اقتدار ہمارے حوالے کر دو، پھر ہم آپ کو یہ دنیا جنت بنا کر دکھائیں گے۔ ہم برملا کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے احکامات سے رہنمائی حاصل کرنے والے معاشروں کی نسبت، وہ معاشرے جو زندگی کے رہنما اصول عقل و شعور کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں، بہت مثالی معاشرے ہیں، اور خدا پرست ان معاشروں کی طرف ہجرت کیلئے ہر قیمت ادا کرنے کیلئے تیار ہیں۔

جب ہم مذاہب پر عمل پیرا لوگوں کی خرابیاں بیان کرتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ پیروکاروں کی خرابیوں کو مذہب کی خرابی قرار نہیں دیا جا سکتا، گویا یہ بالفاظ دیگر مذہبی تعلیمات کی ناکامی کا اعتراف ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت میں انتہائی سخت سزاؤں کی وعید کے باوجود لوگ مذہبی قوانین و ہدایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ مذہب معاشرے میں موجود خرابیوں کو زمینی حقائق کے بجائے بے جا خوف پیدا کر کے کنٹرول کرنا چاہتا ہے، خوف ایک وقتی سد باب تو ہو سکتا ہے، مستقل علاج نہیں۔ جبکہ انسانی عقل و شعور زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر معاشرتی سائنس سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کیا اسلام قبول کرنے کے بعد زندگی کے مسائل ختم ہو جاتے ہیں؟ یا انسان مسائل کے ایک بھنور میں پھنس جاتا ہے؟ کبھی مسلمانوں نے بھی اس پہلو پر غور کرنے کی کوشش کی کہ اسلام ـــ پھر اس کے بعد کیا؟؟؟

ایک مسلمان ہونے والا فرد کون سا فرقہ اختیار کرے؟

کس فرقے کو کافر کہے گا تو اس کا اپنا اسلام معتبر مانا جائے گا؟

عورت پردہ کرے یا نا کرے، اگر پردہ کرے تو عین اسلام نقاب ہے یا حجاب؟

صیام اور عیدین کیلئے کس کی رؤیتِ ہلال کو معتبر سمجھے اور کسے غیر معتبر؟

تین طلاقیں تین معتبر ہوں گی یا ایک؟

حضرت محمد کو بشر مانے یا نور؟

نماز رفع یدین کے ساتھ ادا کرے یا بغیر رفع یدین؟

متعہ کو حلال جانے یا حرام؟

قرآن کے کس ترجمے کو درست مانے اور کسے غلط؟

تراویح بیس پڑھنی ہیں یا آٹھ، یا سرے سے پڑھنی ہی نہیں ہیں؟

غرض ایک لمبی چوڑی فہرست ہے۔

علیاء اور ملالہ

علیاء المہدی نے سویڈن میں مصری سفارتخانے کے سامنے عریاں ہو کر صدر مرسی کے شرعی دستور کے خلاف احتجاج کیا، وہ پہلے بھی عریاں ہو کر مصر کے سماجی ڈھانچے کو چیلنج کر چکی تھی، اس کے بعد تو گویا عرب میڈیا میں اس کے خلاف پوری ایک مہم شروع ہو گئی اور سیاسی اسلام کی طاقتوں کے ساتھ جنگ میں جسم کی زبان استعمال کرنے پر اس کا مذاق بنایا گیا.

سیاسی اسلام کے گروہوں نے اس کے عریاں ہونے کو صدر مرسی کے دستور کے حق میں استعمال کیا اور لوگوں کو اکسایا کہ وہ دستور کے حق میں ووٹ دیں، تاہم عرب دنیا کے مثقفین کی تنقید کم الزام تراشیاں سمجھ سے بالا تر ہیں، اگر یہ حضرات آزادی کے دعوے دار ہیں تو اس نے جو کچھ کیا وہ عین آزادی ہے کہ آزادی کی کوئی حدود نہیں ماسوائے اس کے کہ اس آزادی سے دوسروں کی آزادی متاثر نہ ہو، اور عریاں ہو کر اس نے کسی کی آزادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، اگر کسی کو اسے عریاں دیکھ کر تکلیف ہوئی ہے تو وہ اس کی تصاویر نہ دیکھنے میں آزاد ہے بالکل کہ جس طرح وہ اپنا جسم دکھانے میں آزاد ہے، وہ ایک آزاد عورت ہے اور اپنے جسم کی خود مالک ہے، اس کا جسم نا تو اس کے والد کی ملکیت ہے، نہ معاشرے کی، نہ اس کے دوست کریم کی، اور نا ہی وڈی وڈی داڑھیوں والے ملاؤوں کی اور نا ہی مذاق اڑانے والے مثقفین کی.

اب اگر اعتراض اس بات پر ہے کہ اس کے عریاں ہونے سے لوگوں نے دستور کے حق میں ووٹ دیا اور ریفرنڈم کے نتائج بدل گئے تو اس پر میں یہی کہوں گا کہ ایسے لوگ بھاڑ میں جائیں جو اپنے دستور کا فیصلہ ایک عورت کا جسم دیکھ کر بدل لیتے ہیں، ان لوگوں کو اگر اپنی قومی مصلحت عورت کی شرمگاہ میں نظر آتی ہے تو وہی تنہا اس کی قیمت بھی ادا کریں گے.

رہی بات اس کی ملالہ یوسف زئی سے موازنہ کرنے کی تو ہر ایک کا انکار کرنے کا اپنا انداز، طریقہ اور ثقافتی پس منظر ہے، دونوں نے ہی معاشرے کی تھوپی ہوئی چیزوں کو مسترد کیا اور دونوں نے ہی اس کا اظہار اپنے اپنے طریقے سے کیا اور جو انہیں لگا کہ یہ مؤثر ہے، علیاء ملالہ کی طرح یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں سکول ضرور جاؤں گی یا قتل کی دھمکیوں کے باوجود میں اپنی تعلیم مکمل کروں گی کیونکہ کسی نے اسے پڑھنے سے نہیں روکا مگر چونکہ اس کے معاشرے میں جنسی ایذاء رسانی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے جس سے نا تو باحجاب اور نا ہی بے حجاب عورتیں بچی ہوئی ہیں اور جہاں مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے بھرپور طور پر استعمال کیا جاتا ہے لہذا اس نے اس پر احتجاج اسی پس منظر میں عریاں ہو کر کیا.

ملالہ کا مسئلہ تعلیم تھا جس پر اس نے اسی مناسبت سے احتجاج کیا اور بھرپور جواب دیا، در حقیقت دونوں بچیوں نے اپنے مقام، معاشرے اور مسئلے کے حساب سے اپنے اپنے طریقے سے مناسب احتجاج کیا چنانچہ مسئلے اور حالات کے فرق کی وجہ سے ان دونوں کا آپس میں موازنہ کوئی معنی نہیں رکھتا.

میرے حساب سے دونوں ہی بہادر اور قابلِ احترام ہیں، تاہم علیاء المہدی کا احتجاج اس امت کے جاہلوں اور پڑھے لکھوں دونوں کے لیے بالکل نیا تھا.

سیکولرزم کیوں؟

تمام مغربی ممالک سیکولر ہیں اور مذہب کو حکومت سے الگ رکھتے ہیں، یہی حال ہندوستان، چین، جاپان، روس، اسکینڈے نیویا کے ممالک، کوریا، اور سارا لاطینی امریکہ جبکہ کچھ افریقی ممالک بھی شامل ہیں، چنانچہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے ممالک غلط ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے.. کون زیادہ دولت مند اور ترقی یافتہ ہے، سیکولر ممالک یا غیر سیکولر ممالک؟ جواب ہے سیکولر ممالک.

کون دوسرے پر انحصار کرتا ہے؟ کیا سیکولر ممالک غیر سیکولر ممالک پر انحصار کرتے ہیں یا برعکس؟

جواب ہے: غیر سیکولر ممالک ہی سیکولر ممالک پر انحصار کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر سیکولر ممالک نہ ہوتے تو غیر سیکولر ممالک بھوک اور بیماریوں سے برباد ہو جاتے.

آخری سوال: کیا جزوی سیکولرزم مسلمان ممالک کی روز مرہ زندگی کا حصہ ہے یا نہیں؟

جواب ہے: ہاں، وہ بھی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں جس میں تعلیم، قوانین، آئین، پارلیمنٹ، جمہوریت، اقتصاد میں سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ.. بلکہ اسلامی بینک سرمایہ دارانہ بینکوں سے معاملات کیے بغیر چل ہی نہیں سکتے.

کیا زندگی کے ہر شعبے میں سیکولرزم کی دراندازی سے اس کی کامیابی کے بارے میں سوال نہیں اٹھتا؟

معاملے کا تعلق ہماری مذہبی سمجھ یا کفر سے اس قدر نہیں ہے جتنا کہ زمینی حقائق سے ہے، سیکولرزم کے عالمگیری مفاہیم جیسے جمہوریت، آئینی مساوات، اور انسانی حقوق ایک ایسی حقیقت بن چکے ہیں کہ کسی معاشرے یا ملک کے پاس کوئی آپشن باقی نہیں رہا، سارے اسلامی ممالک سیکولرزم کی لالچ میں آکر شکست تسلیم کر چکے ہیں، در حقیقت سیکولر دنیا میں کوئی آپشن ہی نہیں ہے،

یاتومان جائیں یاڈائینا سار کی طرح ناپید ہو جائیں، اگرڑ دکھانے سے کوئی فائدہ نہیں.. خیر منطقی سوال کی طرف واپس آتے ہیں:
سیکولرزم کیسے کامیاب ہو گیا جبکہ اس سے پہلے کلیسا کے تسلط کی عمر کوئی ہزار سال رہی ہے؟ مغرب میں عقلیت پسندی کو مذہبی غیبیت پر فتح کیسے حاصل ہو گئی؟ میرا خیال ہے کہ جواب آسان ہے، پورے ہزار سال میں مسیحی مذہبی فکر زندگی کو ترقی دینے میں ناکام رہی، چنانچہ مغربی انسان نے حل تلاش کرنا شروع کیا، اور اسے یہ حل عقل میں ملا، تعجب کی بات یہ ہے کہ مغربی انسان کو یہ عقل مسلمان مفکر ابن رشد کی کتابوں میں ملی جس کی دعوتِ عقل سے کلیسا نے خوب جنگ کرنے کی کوشش کی اور باوجود اس کی کتابیں جلانے کے ناکام رہا!! افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس مسلمان مفکر کی مسلمانوں کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے، کیا آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے ابن رشد کے ساتھ کیا کیا؟ 580 ہجری میں فقہاء ابن رشد کی تعلیمات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس پر زندقہ کا الزام لگایا، اس پر مقدمات چلائے گئے اور ملک بدر کر کے اس کی ساری کتابیں جلا دی گئیں...

انسانی تاریخ کے اس فیصلہ کن لمحے سے، یعنی پندرہویں صدی عیسوی سے مغرب سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور کوئی اس کا پیچھا نہیں کر پا رہا، سیکولر سوچ نے ہی انسان کو کائنات کا محور بنایا اور اپنی ذات کے اثبات کے لیے دنیاوی ابدیت حاصل کرنے کی سعی راہ پر گامزن کیا، اور یہ سب مغرب کی سنجیدہ مادی کوششوں سے ہی ممکن ہو سکا ہے، انہوں نے غربت سے جنگ کی اور انسانیت کو بھوک اور بیماری سے نجات دلائی، ٹیکنالوجی میں تو ایجادات کا ایک ڈھیر ہی لگا دیا جیسے ٹی وی، فون، ریڈیو، جہاز، طرح طرح کی جان بچانے والی ادویات اور ویکسینیں جن سے کروڑوں بچوں کو وبائی بیماریوں سے بچانا ممکن ہوا جیسے پولیو، چیچک، خسرہ وغیرہ.. یہاں انسولین کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ جب مسلمانوں نے ڈینمارک کی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا مگر انسولین کا بائیکاٹ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "ضرورت ناجائز کو جائز بنا دیتی ہے" اس طرح مسلمانوں نے ذاتی مفاد کی خاطر دین کے لیے جان دینے سے انکار کر دیا۔

انہی وجوہات کی بناء پر سیکولرزم سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا چاہے جزوی شکل میں جیسا کہ مسلم ممالک میں ہوتا ہے یا کلی طور پر جیسا کہ مغرب اور دیگر کئی ممالک میں ہوتا ہے چاہے اس سے ہمیں انسانی فطرت کی مخالف سول آزادی جیسی برائی ہی کیوں نہ ملے، سیکولرزم اب لازمی شر بن چکا ہے، میں نام لیے بغیر ایک مثال دوں گا، امید ہے سب سمجھ جائیں گے: مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی کسی فحش چینل کو استعمال کرتے ہوئے کسی نئے اسلامی چینل میں سرمایہ کاری نہ کرے!؟ سیکولرزم اور مذہبی شناخت کے بیچ جھولتی اس طرح کی ذہنیت کی وجہ سے بہت سارے لوگ خوار ہوئے اور ہو رہے ہیں، اس طرح کا دہرا پن اور منافقت صراحتاً سیکولر ممالک میں نظر نہیں آتا جہاں دین کی سیاست سے علیحدگی قطعی واضح ہے، چنانچہ ہمیں وہاں یہ سب ملتا ہے:

ٹیکنالوجی کی ترقی

طبی ترقی

فکری ترقی

علمی ترقی

فنون کی ترقی

اقتصادی ترقی

تعلیمی ترقی

انسانی حقوق کی دستیابی

یہ سب صرف سیکولر ممالک میں ہوتا ہے، بلکہ نوبل انعام حاصل کرنے والوں کا زیادہ تر تعلق سیکولر ممالک سے ہی ہوتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ سیکولرزم کو مسترد کرنے کے باوجود اکثر مذہب پرستوں پر جب کوئی بڑی بیماری نازل ہوتی ہے تو یہ علاج کرانے کے لیے سیکولر ممالک کی طرف ہی بھاگتے ہیں..!؟ اپنے بچوں کو اعلی تعلیم دلانی ہو تو بھی یہ سیکولر ممالک کا ہی انتخاب کرتے ہیں!

کوئی مانے نہ مانے، سیکولروں کے بغیر اہلِ زمین بھوک، بیماری اور غربت سے ہلاک ہو جاتے، ایک اہم بات جو صرف خردمندوں کے لیے عرض ہے کہ سیکولرزم مذاہب کی مخالفت نہیں کرتا، بلکہ یہ واحد فکر ہے جو اپنے مخالفین کو مذہبی آزادی دیتی ہے، مغرب میں مساجد کی تعداد اور مسلم ممالک میں گرجوں کی تعداد کا آپس میں موازنہ کرکے یہ حقیقت ثابت کی جاسکتی ہے، تلاش معاش میں سیکولر ممالک جانے والے خواہش مندوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے جو غیر سیکولر ممالک میں جانا چاہتے ہیں، ان حقائق کے پیش نظر سیکولرزم سے جنگ کرنا عبث اور فضول ہے اور اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا، سیکولرزم کی مخالفت کرنے والوں کو ایماندارانہ مشورہ ہے اور میرے خیال سے یہ ایمان داری کا تقاضہ بھی ہے کہ وہ جزوی سیکولرزم سے بھی خود کو آزاد کرلیں اور کسی صحراء میں جاکر سیکولرزم سے دور زندگی گزاریں اور یہ یقین رکھیں کہ فناء ان کا مقدر ہوگا.

اور اگر نہیں تو میرا چیلنج ہے کہ وہ اس جزوی سیکولرزم سے ہی دستبردار ہوکر دکھادیں!؟ لہذا بہتر یہی ہے کہ اسے پوری طرح سے قبول کرلیں، اور ویسے بھی دو کشتیوں کا سوار کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، جبکہ تنزیلِ حکیم میں ہے: (مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّن

قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ –اللہ نے کسی آدمی کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے) اور سیکولرزم کے مخالف یہ ناممکن حاصل کرنا چاہتے ہیں.

کیا تم سیکولر ہو؟

قبلہ و کعبہ مولانا صاحب

جنابِ واعظ

عرض ہے کہ یہ دنیا سیکولر ہے

اور آپ اس دنیا کا ایک حصہ ہیں

کاغذ کے وہ نوٹ جو آپ اپنے کھانے پینے اور روزمرہ کی ضروریات کے لیے ادا کرتے ہیں سیکولرازم کی دریافت ہیں

آپ یقیناً ان کاغذ کے نوٹوں کی شکل اچھی طرح جانتے ہیں

اور بینکوں کی عمارتیں بھی آپ نے دیکھی ہوں گی

بینکوں کی بینکاری کا نظام، کرنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ وغیرہ سب سیکولرازم کی دریافتیں ہیں

اس نے اپنے نظام کو مذہب سے الگ کر دیا

یہ عالمی اقتصادی نظام کا حصہ ہے

اور آپ میرے اے عزیز دوست ان بینکوں سے معاملات کرتے ہیں

آپ چاہیں یا نہ چاہیں

کیونکہ آپ کمزور ہیں

حکومت کو اس سودی نظام کا ذمہ دار مت ٹھہرائیں

کیونکہ حکومت نے یہ عالمی سیکولر نظام لاگو نہیں کیا

بلکہ آپ خود اس حکومت کی کمزوری اور پسماندگی کی ایک وجہ ہیں

میرے عزیز آپ زبردستی کے سیکولر ہیں چاہے آپ کو اچھا لگے یا برا مگر پھر بھی آپ سیکولر ہیں

کیونکہ یہ ساری دنیا سیکولر ہے اور آپ کمزور ہیں

کیا آپ نے تجارت شروع کر دی ہے اور مال جرمنی سے منگوا رہے ہیں؟

جی ہاں جرمنی ایک ایسا ملک ہے جو ایجاد کرتا اور مصنوعات تیار کرتا ہے، اور جی ہاں آپ درست کہتے ہیں جرمن سیکولر ہیں چنانچہ ان پر لعنت ہے!!

آپ کو آپ کا مال دینے سے پہلے عالمی ادارے آپ کو مجبور کرتے ہیں کہ آپ بینکوں سے معاملات کریں اور یقیناً آپ اس مال پر انشورنس ادا کرنے کے پابند ہیں...

ہائے انشورنس...

یہ سیکولر ازم کی ایک اور مصیبت ہے..

آپ کو بینک کو فائدے دینے ہوں گے تاکہ آپ کا مال آپ تک بخیر وعافیت پہنچ سکے

اور آپ کی رقم بخیر وعافیت ان کمپنیوں تک

چنانچہ آپ سیکولر مولوی ہیں

آپ ہی نے اسلام کے مفہوم کے بارے میں وہ مشہور بات کی ہے نا

کہ اسلام ہر زمان و مکان کے لیے کار آمد ہے

آپ گاڑی چلاتے ہیں

اس گاڑی کو چلانے کے لیے ایک نظام وضع کیا گیا ہے

چلیے قرآن سے ٹریفک کے قوانین نکال کر دیجیے؟

یا پھر آپ کلام کو بغیر سمجھ کے طوطے کی طرح دہراتے ہیں؟

مجھے یقین ہے کہ آپ یہ کہنے کی حماقت نہیں کریں گے کہ ٹریفک کے قوانین جنہیں سیکولر ملکوں نے وضع کیا اور جو ان کے سیکولر نظام کا ایک حصہ ہے قرآن میں موجود ہے...

یا اس مسئلے کے لیے آپ ائمہ اسلام کے فتاوی سے رجوع کریں گے جو اب سے ہزار سال پہلے کہیں کسی خیمے میں رہا کرتے تھے اور اونٹ، گھوڑوں اور گدھوں پر سفر کیا کرتے تھے...!؟

یہ نظام جو آپ کی گاڑی کو دوسری بہت ساری گاڑیوں کے ساتھ منظم کرتا ہے سیکولر حسب نسب رکھتا ہے کیونکہ یہ آپ کی دریافت نہیں ہے

یہ نظام آپ کو جرمانے ادا کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے

اب آپ چاہیں یا نہ چاہیں آپ کو یہ جرمانے ادا کرنے ہوں گے بالکل جس طرح کسی سیکولر ملک کا کوئی شہری یہ جرمانے ادا کرتا ہے

کیونکہ آپ ایک ""کنزیومر"" ہیں اور اس سیکولر دنیا کو تقویت بخشنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں

آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ کا ملک عالمی نظام یا عالمی اقتصادی نظام کے قوانین وضع نہیں کرتا

کیونکہ یہ طاقتور ملک نہیں ہے

اگر آپ دنیا پر اپنا""غیر سیکولر"""نظام لاگو کرنا چاہتے ہیں

تو میں آپ کو ایک اہم کام کرنے کی صلاح دوں گا

اور وہ ہے سوچنا

سوچنے سے مت ڈریں

کیونکہ اگر آپ نے اپنی کھوپڑی کے خول کے اندر موجود غدود کو استعمال کر لیا تو اللہ آپ کو کوئی سزا نہیں دے گا

اور سوچنے سے آپ زندیق بھی نہیں ہو جائیں گے

کیونکہ اکیلے ایمان ہی کافی نہیں ہے

کیا آپ نے غزوہ خندق کے بارے میں سنا ہے؟

کیا آپ نے نوٹ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب کو اہمیت دی

اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ خندق بھی کھودا گیا

کیونکہ ایمان اور عقیدہ کافی نہیں ہوتا

اور صرف عمل ہی عبادت نہیں

اگر اس دنیا میں آپ کا وجود محض عبادت کے لیے ہے

تو میری آپ کو یہ تجویز ہے کہ تمام ایجادات سے دستبردار ہو جائیں

کیونکہ یہ ساری ایجادات کسی نہ کسی سیکولر ملک سے آئی ہیں

اور صحراء میں خیمہ نصب کر لیں اور اپنی باقی ماندہ زندگی وہیں گزاریں

یہ آپ ہی کہتے ہیں نا کہ آپ کا وجود محض اللہ کی عبادت کے لیے ہے!!

چنانچہ صحراء کی زندگی آپ پر زبردستی لاگو کردہ عالمی سیکولر نظام سے آپ کو دور لے جائے گی

کیونکہ شہر میں کوکا کولا پینے کے لیے بھی آپ کو کیمیاء پر ابنِ تیمیہ کے فتوے کی ضرورت پڑے گی

جو آپ کو نہیں ملے گا

کیونکہ کوکا کولا کا موجد سیکولر کیمیاء دان تھا

اس کوک کو خرید کر آپ بیرونی سیکولر اقتصاد کو تقویت پہنچاتے ہیں

اور اپنے بچے کے لیے پلے سٹیشن خرید کر آپ دیگر سیکولر اقتصادیات کو تقویت بخش رہے ہوتے ہیں

کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر روپے کے مقابل سونا ہوتا ہے؟

آپ کے تمام پیسوں کے مقابل سونا ہے جو سوئٹزرلینڈ کے سیکولر بینکوں میں محفوظ ہے

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی سب سے مہنگی پراڈکٹ اسلحہ ہے؟

اس سیکولر کائنات سے نکلنے کے لیے شاید آپ کے پاس صرف جہاد کا راستہ ہی بچا ہو

یقیناً آپ کو رقم کی ضرورت پڑے گی اور آپ کو سودی بینکوں سے معاملات کرنے پڑیں گے

تب کہیں جا کر آپ سیکولر ملکوں کا بنایا ہوا اسلحہ خرید پائیں گے

اپنے جہاد میں بھی آپ ""کنزیومر"" ہیں اور سیکولرازم کی اقتصادیات کو قوت بخشتے ہیں

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی دوسری سب سے مہنگی پراڈکٹ دواء ہے؟

آپ کے جہاد میں کئی لوگ زخمی ہوں گے

اور کئی قتل ہوں گے

یہاں آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مسلمان تھے یا نہیں

کیونکہ آپ کا مقصد انتہائی پاک صاف ہے

مگر وہ سیکولر ملکوں کی اقتصادیات کو قوت بخشتا ہے

اسلحے کے لیے پیسہ چاہیے اور دواء کے لیے بھی پیسہ چاہیے

اور یہ سارے پیسے ان سیکولر ملکوں کو جائیں گے

جو آپ کے پیسے سے مزید طاقتور ہوں گے

جس سے وہ مزید تحقیق کریں گے

اور مزید نئی نئی ایجادات سامنے لائیں گے

میں اپنے آپ کو بے قصور قرار نہیں دے رہا

میں بھی نہ چاہتے ہوئے اس بیرونی سیکولرازم کو طاقت بخش رہا ہوں

تو اب آپ کی رائے میں اس طرح کی صورتحال کا کیا حل ہے؟

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے اکابرین اور ان کے اقوال کو فی الحال رہنے دیں

آپ انسان ہیں جسے اللہ نے ""بہترین صورت ""میں بنایا ہے

اپنی عقل اور دل سے سوچیے

کیا اللہ نے اس کائنات میں ہر چیز کے لیے ""سبب ""نہیں بنایا ہے؟

آپ آسمان سے ایسے نہیں ٹپکے تھے

بلکہ ایک مرد و عورت کی شادی ہوئی تھی

پھر وہ ہمبستر ہوئے

اور آپ نطفے سے علقہ ہوئے... حتیٰ کہ

آپ بہترین صورت میں بر آمد ہوئے

یہ سارے اسباب تھے تاکہ آپ اس دنیا میں آئیں

تو پھر آپ کو عالمی قوتوں کے اسباب نظر کیوں نہیں آتے؟

آپ یہ اسباب اپنا کر ان سے استفادہ حاصل کیوں نہیں کرتے؟

اپنے دین میں، دنیا میں اور ارد گرد میں

لیکن افسوس

اس کے بجائے آپ نے اپنی اور اپنے چیلوں کی عقل پر تالے لگا دیے ہیں

آپ سیکھنا نہیں چاہتے

بلکہ طوطے کی طرح صدیوں پر انا رٹا دہرانا چاہتے ہیں

اور دہرائے چلے جارہے ہیں

یہ جانے بغیر کہ آپ ""کنزیومر"" بن گئے ہیں

اور روزانہ اپنے پیسوں سے اپنی ضروریات خرید کر

بیرونی سیکولرازم کو طاقتور بنارہے ہیں

پھر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ: کیا تم سیکولر ہو؟

اسلام اور غیر مسلموں کے حقوق

مسلمان آج ساری دنیا میں یہ شور مچائے پھرتے ہیں کہ اسلام جیسا بہترین دین کوئی نہیں اور اس نے غیر مسلموں کو بھی بہترین حقوق اور مقام و مرتبہ سے نوازا ہے یا اسی طرح یہ شور مچانا کہ اسلام رواداری و برداشت کا دین ہے جو کافروں سے بھی حسن سلوک کا حکم دیتا ہے جبکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات غیر مسلم کافروں کے ساتھ بغض و نفرت، حقارت اور کمتر امتیازی سلوک سے بھری پڑی ہیں۔ جو اسلام کو قبول نہ کرے اسے قدم قدم پر ذلیل و رسوا کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ ان ساری نفرت انگیز حقیقی تعلیمات پر آج مسلمان علماء و داعی پردہ ڈالے رکھتے ہیں اور دوسروں کے سامنے خود پر ظاہری و جھوٹے اخلاق و کردار کا غلاف چڑھا لیتے ہیں۔ اس ظاہری لبادے کا مقصد بھی سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جو اسلام کی اصلی تعلیمات سے واقف نہیں وہ اس ظاہری اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام کے جال میں پھنس جائے۔

چنانچہ اس سلسلے میں اسلام کی دوسروں سے نفرت و بغض سے بھری تعلیمات کو سامنے لایا جانا ضروری ہیں کیونکہ غیر تو غیر، ان تعلیمات سے آج خود مسلمان تک واقف نہیں ورنہ یہ اس قدر کراہت انگیز ہیں کہ آج کسی انصاف پسند مسلمان کو بھی اسلام کا یہ چہرہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

کفار جانوروں سے بھی بدتر

قرآن میں اسلام کو نہ ماننے والے کافروں کا مقام و مرتبہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

"یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔" (الاعراف:179)

مشہور مفسر و امام ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: "اور جس نے کفر کیا وہ جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔"

(تفسیر ابن کثیر مترجم، جلد2 صفحہ 438، مکتبہ اسلامیہ لاہور)

اسی طرح ایک اور آیت میں کہا گیا: "کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے، ہر گز نہیں یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی گم کردہ راہ ہیں۔" (الفرقان:44)

گویا اسلام کی دعوت کے نہ ماننے والوں کو سب سے پہلے جس اعزاز سے نوازا گیا ہے وہ یہ کہ ان کی انسانیت کا ہی انکار کر دیا گیا اور انہیں جانوروں جیسا بلکہ ان سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ چند مخصوص جانوروں سے بُرا قرار دیا گیا ہو بلکہ انہیں تمام مخلوقات و جانداروں سے بدتر قرار دیا۔

چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا: "اور اللہ کے ہاں سب جانداروں میں سے بدتر وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے۔" (الانفال:55)

کافر نجس و ناپاک ہیں

قرآن میں غیر مسلم مشرکین کے بارے ارشاد ہوا:

"اے ایمان والو! بے شک مشرک بالکل ہی نجس (ناپاک) ہیں۔" (التوبہ:28)

قرآن کی اس نفرت انگیز تعلیم کو دیکھئے کہ اپنے تصور توحید کے نہ ماننے والوں کو نجس و ناپاک قرار دیا۔ زیادہ تر مسلم علماء کا تو ماننا یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے باطن سے گندے و نجس ہیں لیکن ان کا جسم ناپاک نہیں۔ مگر بعض ایسے علماء جو قرآن کے ظاہری الفاظ کو ہی اپنی دلیل مانتے ہیں ان کے نزدیک تو کافروں کے جسم بھی ناپاک ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان کسی کافر سے ہاتھ ملالے تو اپنے ہاتھ دھوئے۔ چنانچہ مفسر ابن کثیر نے لکھا:

"یہ آیت مشرکوں کی نجاست پر بھی دلیل ہے۔۔۔باقی رہی یہ بات کہ مشرکوں کا بدن اور ذات بھی نجس ہے کہ نہیں، پس جمہور کا تو قول ہے کہ نجس نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا ذبیحہ حلال کیا ہے۔ بعض ظاہریہ (علماء) کہتے ہیں کہ مشرکوں کے بدن بھی ناپاک ہیں۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو ان سے مصافحہ کرے وہ ہاتھ دھوڈالے۔"

(تفسیر ابن کثیر مترجم، ج2ص550-549، مکتبہ اسلامیہ لاہور)

کافروں پر اللہ کی لعنت ہے

قرآن کے خدا نے کافروں کو ایک اور اعزاز سے نوازتے ہوئے کہا:

"پس کافروں پر اللہ کی لعنت" (البقرۃ:89)

صرف اللہ ہی کی لعنت نہیں اور صرف زندہ کافروں پر ہی نہیں بلکہ دنیا سے گزر جانے والے کافروں تک کے بارے میں فرمایا:

"جو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ایسوں پر خدا کی اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت۔" (البقرۃ:161)

ایسی تعلیمات کو ماننے والے اور اپنا ایمان قرار دینے والے مسلمان دوسروں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ غیر مسلم کفار ان سے بغض رکھتے ہیں۔ ہرگز نہیں یہ تو مسلمانوں کے دل ہیں جو ان نفرت انگیز تعلیمات کے زیر اثر جانتے نہ جانتے ہر غیر مسلم کافر کے خلاف بغض و حقارت سے بھرے ہوئے ہیں۔

کافروں سے لڑو حتیٰ کہ ذلیل ہو کر جزیہ دیں

قرآن نے اسلام کے قبول نہ کرنے والوں کے خلاف اشتعال اور نفرت دلاتے ہوئے کہا:

"ان لوگوں سے لڑو، جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شے کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔" (التوبہ:29)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی شرح میں لکھا: "پس (اللہ) فرماتا ہے کہ جب تک وہ ذلت و خواری کے ساتھ اپنے

ہاتھوں جزیہ نہ دیں انہیں نہ چھوڑو۔"

(تفسیر ابن کثیر مترجم، ج2ص550، مکتبہ اسلامیہ لاہور)

یہ ہیں وہ تعلیمات جن پر ایمان لانے اور عامل ہونے کی وجہ سے اسلام دوسرے مذاہب کے ماننے والوں یا دیگر غیر مسلموں کے لئے مسلسل خطرہ ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب تک کافر ایمان نہیں لے آتے اور اسلام کے ہی نافذ کردہ حلال و حرام کو مان نہیں لیتے تب تک مسلمان ان سے لڑتے رہیں حتیٰ کہ مسلمان ان غیر مسلموں کو اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر جزیہ دیں۔ لہٰذا مسلمان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو لڑنے مرنے کی دھمکیاں لگا کر نہ صرف جزیہ کے نام پر بھتہ وصول کرتے بلکہ انہیں ذلیل ہونے کے لقب دیتے۔

چنانچہ مشہور جنگجو صحابی خالد بن ولید نے اہل فارس کے نام خط لکھا، جس میں موجود تھا کہ:

"ہم تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں، اگر تم انکار کرو تو تم اپنے ہاتھوں جزیہ ادا کرو اس حال میں کہ تم ذلیل ہو کیونکہ میرے ساتھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں قتال کو ایسے پسند کرتے ہیں جیسے فارسی شراب پسند کرتے ہیں۔"

(حاکم: 3/299، طبرانی کبیر: 4/105، مسند علی بن الجعد: حدیث 2304، مجمع الزوائد: 5/310، امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔)

قرآن نے غیر مسلموں کو ذلیل سمجھ کر جزیہ لینے کی بات کی لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ساتھ میں یہ بھی لازم کیا کہ اگر ان کو ذلیل سمجھنے والے مسلمانوں میں سے کوئی ان کے پاس سفر کرتے ہوئے گزرے تو یہ اس کی تین دن تک مہمان نوازی بھی کریں گے۔

چنانچہ ابو الحویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ایلہ" سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں پر ہر سال تین سو دینار کی ادائیگی لازم قرار دی تھی اور یہ لازم قرار دیا تھا کہ جو مسلمان ان کے پاس سے گزرے وہ اس کی تین دن تک مہمان نوازی کریں گے اور وہ کسی مسلمان کو دھوکہ نہیں دیں گے۔"

)مسند امام شافعی، جزء چہارم، کتاب الاسر والفداء، باب ضرب الجزیۃ، حدیث 1771، مصنف عبد الرزاق: حدیث 10092، السنن الکبریٰ للبیہقی: 19/9(

مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ عمر نے اس پر مزید یہ بھی اضافہ کر دیا کہ اگر مسلمان ان کے پاس سے گزریں تو یہ کافر تین دن تک ان کی نہ صرف مہمان نوازی کریں گے بلکہ ان کی دیگر ضروریات زندگی بھی مہیا کرنے کے پابند ہوں گے۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سونے (میں ادائیگی کرنے) والوں پر چار دینار اور چاندی (میں ادائیگی کرنے) والوں پر چالیس درہم جزیہ مقرر فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ (گزرنے والے) مسلمانوں کی ضروریات زندگی اور تین دن کی مہمان نوازی"

)مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب الجزیۃ، حدیث 4041، مئوطا امام مالک: 1/279، حدیث 623(

یہ زبردستی کی مہمان نوازیاں اور غیر مسلموں کے ساتھ ذلت بھرا سلوک یہیں ختم نہیں ہو گا بلکہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم زبردستی کی ان خواہ مخواہ کی مہمان نوازیوں سے انکار کریں تو وہ زور زبردستی کے ساتھ مہمان نوازی کا اپنا یہ "اسلامی حق" وصول کریں۔

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم کسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ ہماری مہمان نوازی کرتے ہیں نہ ہمارا وہ حق ادا کرتے ہیں جو ان پر عائد ہوتا ہے اور ہم بھی ان سے اپنا حق (زبردستی) حاصل نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر وہ انکار کریں اور تمھیں زبردستی لینا پڑے تو (زبردستی کر کے) لو۔"

)مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب الجزیۃ، حدیث 4040، سنن ترمذی: حدیث 1589(

غیر مسلموں پر جنگی یلغار

اسلام چونکہ مسلمانوں کے نزدیک ایک مکمل نظام حیات ہے، اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ صحیح اسلامی حکومت اپنے ارد گرد پائے جانے والے دیگر غیر اسلامی قبائل و ریاستوں کے لئے کیسے نادر و نایاب حقوق و فرائض

کا عملی نظام رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک اسلامی حکومت جو سب سے پہلا حق رکھتی ہے، وہ یہ کہ جن قبائل اور ریاستوں کا اسلام لانا ثابت نہ ہو، ان پر چڑھ دوڑے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ "آپ جب بھی کسی قوم پر چڑھائی کرتے تو اس پر اس وقت تک حملہ نہ کرتے جب تک صبح نہ ہو جاتی اور آپ انتظار فرماتے، اگر اذان سُن لیتے تو حملے کا ارادہ ترک کر دیتے اور اگر اذان نہ سنتے تو ان پر غارت گری کرتے۔"

(صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب مایحقن بالاذان من الدماء، حدیث 610)

امام بخاری نے اس حدیث پر کیا خوب عنوان باندھا ہے: "اذان کی آواز سُن کر خونریزی سے رُک جانا"

اس نبوی نمونے سے سیکھنے والی جو بات ہے وہ یہ کہ ضروری نہیں کہ اہل اسلام کسی غیر مسلم قبیلے یا ریاست کے بارے میں حملہ کرنے سے پہلے ضرور جانتے ہی ہوں کیونکہ جس کے بارے میں جانتے ہوں اس کا اذان سے اسلام پرکھنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اذان کا انتظار اس لئے کیا جاتا کہ جن پر حملہ کیا جارہا ہے ان کی ایمانی و اسلامی حالت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اگر اذان کی آواز آجائے تو گویا سامنے والے لوگ مسلمان ہیں، ان پر چڑھائی کا ارادہ ترک کر دیا جائے اور اگر اسلام کی دولت سے مالامال نہیں تو ان کو دنیاوی مال و دولت اور جان کے تحفظ کا بھی کوئی حق نہیں، لہٰذا ان پر چڑھائی کر دی جائے۔ اس لئے اکثر ملتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں نے اپنے دشمنوں کی بے خبری و غفلت میں ان کی بستیوں پر حملہ کیا، نوجوانوں کو قتل کیا اور ان کے بے قصور عورتوں اور بچوں کو قیدی و غلام بنالیا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعہ میں بیان ہوا ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنو مصطلق پر حملہ کیا تو وہ بالکل بے خبر تھے اور ان کے جانوروں کو تالاب پر پانی پلایا جارہا تھا، چنانچہ آپ نے ان کے لڑنے والوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچون کو قیدی بنالیا۔ انہی قیدیوں میں جویریہ (بنت حارث) بھی تھیں۔"

(صحیح بخاری، کتاب العتق، باب من ملک من العرب۔۔۔۔۔، حدیث:2541)

مشرکین سے میل ملاپ کی ممانعت

اس احتیاط اور تدبر کے باوجود یہ خطرہ باقی رہ جاتا ہے کہ کہیں کوئی مسلمان ایسے اندھا دھند اسلامی حملوں میں "جانوروں سے بدتر" کافروں کے ساتھ مارانہ جائے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ نبوی حکم دیا گیا کہ

"مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار نہ کرو، ان کے ساتھ میل جول نہ رکھو۔ جو شخص ان کے ساتھ رہائش اختیار کرے اور ان کے ساتھ میل جول رکھے، وہ بھی انہی کی مانند ہو گا۔"

(سنن ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین، حدیث بعد1530)

اہل اسلام کو کافروں اور مشرکین کے ساتھ میل جول اور رہائش سے اس قدر نفرت اور کراہت دلائی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان باوجود ان اسلامی احکامات کے ان کے درمیان رہیں تو پھر اسلامی حملوں میں ایسے مسلمانوں کے مارے جانے کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خثعم قبیلے کی طرف ایک جنگی مہم روانہ کی، کچھ لوگوں نے سجدے کے ذریعے بچنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے انہیں تیزی سے قتل کر دیا۔ اس بات کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نصف دیت ادا کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا: "میں ہر ایسے مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔"

(سنن ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین، حدیث1530)

اس روایت میں انتہائی غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اسلام کے نبوی مجاہدین نے ان لوگوں کو بھی کاٹ پھینکا جو سجدے میں گرے ہوئے تھے یعنی ان کا مسلمان ہونا یا نہ ہونا تو ایک طرف لیکن یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ لڑ نہیں رہے تھے بلکہ خود کو سجدے میں سرنڈر کر چکے تھے۔ مگر ایمانی تلواروں کے ساتھ ان نہتے لوگوں کا خون پانی کی طرح بہا دیا گیا۔

آج اسلامی جہادی تنظیمیں اور جماعتیں ان اسلامی احکامات کے مطابق غیر مسلموں پر حملے کرتی ہیں تو ان کو اکثر اپنے ماڈریٹ اور اسلام سے نابلد مسلمانوں کی جانب سے یہ سننے کو ملتا ہے کہ ان جہادی حملوں میں تو مسلمان بھی مارے جاتے ہیں تو عرض ہے کہ یہ اسلامی جہادی تنظیمیں اپنے ان اسلامی احکامات کو آپ سے بڑھ کر جانتی ہیں

اور اس حقیقی اسلام کی پیروکار ہیں جو کفار کو تو پہلے ہی انسان نہیں سمجھتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کافروں کے ہاں رہنے والے مسلمانوں تک کے بارے میں یہی حقوق اور مقام بیان کرتا ہے۔

مسلمان کو غیر مسلم کے قتل کے بدلے جان کا تحفظ

ایک اسلامی ریاست میں ایک غیر مسلم کافر کو یہ حق اور مقام بھی حاصل ہو گا کہ اگر کوئی مسلمان اس کو قتل کر دے تو اسلامی ریاست جو اپنے ہاں قتل کے بدلے قتل پر یقین رکھتی ہے، مگر اس کافر کے بدلے میں اس قاتل مسلمان کو ہرگز موت کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو وصیت کر رکھی تھی جو انہوں نے لکھ رکھی تھی۔اس میں یہ حکم بھی موجود تھا کہ "کسی مومن کو کسی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

(سنن ابو داؤد، کتاب الدیات، باب ایقاد المسلم من الکافر، حدیث 4530)

لہٰذا کوئی بھی غیر مسلم یہ بات بھول جائے کہ ایک اسلامی ریاست میں اس کی جان تک کے بارے میں برابری کی سطح پر کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔اسی طرح ایک مسلمان کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی غیر مسلم کافر اس کے ہاتھ سے مر مرا جائے تو وہ کم از کم اپنی جان کو بالکل محفوظ و مامون سمجھے۔

غیر مسلموں کو کمتر و حقیر کام ہی سونپے جائیں

ایک بہترین اسلامی ریاست میں ایک غیر مسلم کافر کو یہ حق اور مقام و مرتبہ بھی حاصل ہو گا کہ اسے کوئی عزت و اکرام والے کام کا اہل نہ سمجھا جائے۔موجودہ دور کے عرف عام میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی غیر مسلم کافر کو اسلامی ریاست میں "وائٹ کالر جاب" کی اجازت نہیں دی جاسکتی بلکہ اس کا مقام و مرتبہ یہی ہے کہ اسے ذلت و پستی والے کام ہی سونپے جائیں۔

چنانچہ ابو موسیٰ رضي اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عمر رضي اللہ عنہ سے کہا کہ میرے پاس ایک نصرانی کاتب ہے، وہ کہنے لگے:

"تجھے کیا ہوا، اللہ تجھے تباہ کرے، کیا تو نے اللہ کا فرمان نہیں سنا: {اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ

یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی ایک کے ساتھ دوستی کرے گا وہ بلاشبہ انہیں میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالی ہر گز راہِ راست نہیں دکھاتا} المائدۃ(51)۔تو نے ملت حنیفی پر چلنے والے کو حاصل کیوں نہ کیا(یعنی مسلمان کاتب کیوں نہ رکھا)؟"

ابو موسی رضي اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں میں نے کہا:اے امیر المومنین!مجھے تو اس کی کتابت چاہیے اور اس کے لیے اس کا دین ہے، عمر رضي اللہ عنہ فرمانے لگے:

"جب اللہ تعالی نے ان کی توہین کی اور انہیں ذلیل کیا ہے تو مَیں ان کی عزت و احترام نہیں کرونگا، اور جب اللہ تعالی نے انہیں دور کیا ہے تو مَیں انہیں قریب نہیں کروں گا۔"

(مجموع الفتاویٰ:326/25،السنن الکبریٰ للبیہقی:204/9، أحکام أھل الذمۃ لابن القیم:454/1، إرواء الغلیل:256/8، محدث و امام ابن تیمیہ نے اس روایت کو صحیح اور محدث علامہ البانی نے "اسنادہ حسن" قرار دیا ہے۔)

غیر مسلموں کو تحقیر و تضحیک کا نشانہ بنایا جائے

ایک صالح اسلامی معاشرے کا خاصہ یہ ہو گا کہ غیر مسلم کافروں کو سلام میں بالکل پہل نہ کی جائے اور اپنے ارد گرد رہنے والے کافروں کی تحقیر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے حتیٰ کہ اگر راستے میں کوئی غیر مسلم کافر گزرتا نظر آئے تو اسے ذلیل کرنے کے لئے اس کا راستہ تنگ کر دیا جائے۔یہ ہیں اسلام کی وہ اخلاقی اقدار، جن پر مسلمان جتنا فخر کریں کم ہے کیونکہ یہ اس نبی آخر الزماں کی تعلیمات ہیں کہ جن کا لقب ہی "رحمت اللعالمین" ہے۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل نہ کرو اور جب ان میں سے کوئی راستے میں مل جائے تو اُسے تنگ راستے کی طرف مجبور کر دو۔"

(صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النھی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام و کیف یرد علیھم، حدیث 5546)

مشہور محدث اور امام ترمذی اسی حدیث کو اپنی کتاب میں لانے کے بعد لکھتے ہیں:"بعض اہل علم کہتے ہیں:یہ اس

لیے ناپسند ہے کہ پہلے سلام کرنے سے ان کی تعظیم ہو گی جب کہ مسلمانوں کو ان کی تذلیل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح راستے میں آمنا سامنا ہو جانے پر ان کے لیے راستہ نہ چھوڑے کیوں کہ اس میں بھی ان کی تعظیم ہے۔"

(سنن ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی التسلیم علی اہل الکتاب، تحت حدیث 1602)

ذرا اس اعلیٰ اخلاقی تعلیم کو عملی طور پر صرف سوچ کر دیکھئے کہ آتے جاتے گزرتے ہوئے دوسروں کو ذلیل کرنے کے لئے ان کا راستہ تنگ کر دیا جائے۔ کیا تعصب اور حقارت آمیز رویے کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی مثال ہو گی جو اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ غیر مسلموں کی تذلیل و تحقیر وہ بنیادی سبق ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں کو دیتا ہے اور یہی وہ برتاؤ اور تربیت ہے جس پر مسلمان سلف علماء کاربند رہے۔ مگر آج ان اصل تعلیمات کو چھپا کر ظاہر یہ کیا جاتا ہے جیسا کہ اسلام انتہائی برداشت و رواداری کا دین ہے۔

غیر مسلموں کے بارے دیگر تحقیر آمیز احکامات

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دوسروں کے ساتھ جو سلوک اور برتاؤ سکھا رکھا ہے وہ اخلاقی پست روی اور ذلت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ غیر انسانی بھی ہے۔ اگر ابھی بھی یقین نہ آئے تو مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ عمر بن خطاب کی اہل شام پر عائد کردہ وہ شرائط پڑھیے جن کی بنا پر وہاں کے لوگوں نے ان سے امان حاصل کی تھی۔

چنانچہ عبدالرحمٰن بن غنم اشعری کہتے ہیں: "میں نے اپنے ہاتھ سے عہد نامہ لکھ کر حضرت عمر کو دیا تھا کہ اہل شام کے فلاں فلاں شہری لوگوں کی طرف سے یہ معاہدہ ہے امیر المومنین حضرت عمر فاروق کے ساتھ کہ جب آپ نے ہم پر لشکر کشی کی تو ہم نے آپ سے اپنی جان مال اور اہل و عیال کے لئے امن طلب کی ہم ان شرطوں پر وہ امن حاصل کرتے ہیں:

(اس عہد نامہ کی انتہائی قابل توجہ شرائط درج ذیل ہیں کہ جن سے ایک صحیح اسلامی خلافت و ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے مقام و مرتبہ پر خوب روشنی پڑتی ہے)

★ہم اپنے شہروں اور اس کے اطراف میں کوئی نیا کلیسا یا خانقاہ نہیں بنائیں گے۔

★ہم اپنے خستہ حال پرانے یا معدوم ہو جانے والے کلیساؤں کی تعمیر نو یا مرمت نہیں کریں گے۔

★ہم مسلمان مسافروں کو دن یا رات کسی بھی وقت اپنے کنیساؤں میں قیام سے منع نہیں کریں گے، اور تین دن تک مسلمان مسافروں کی مہمان نوازی کریں گے۔

★ہم اپنے کلیساؤں اور گھروں میں کسی جاسوس کو پناہ نہیں دیں گے۔

★ہم مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش یا دھوکہ نہیں کریں گے۔

★ہم اپنے کلیساؤں میں بجنے والے ناقوس کی آواز نہایت پست رکھیں گے۔

★اپنے کلیساؤں پر نمایاں مقام پر صلیب نصب نہیں کریں گے۔

★جب مسلمان ہمارے کلیساؤں میں موجود ہوں تو اپنی عبادات کی ادائیگی کے وقت اپنی آوازیں پست رکھیں گے۔

★مسلمانوں کے راستوں میں صلیب اور اپنی مقدس کتاب لے کر نہیں جائیں گے، نا کسی مذہبی اجتماع کا انعقاد یا عید کریں گے۔

★اپنے جنازوں کو خاموشی سے گذاریں گے اور (اپنی مذہبی رسم کے مطابق) ساتھ مشعلیں لے کر نہیں چلیں گے۔

★مسلمانوں کے سامنے خنزیر لے کر جائیں گے نہ شراب بیچیں گے۔

★مسلمانوں کو عیسائیت کی تبلیغ نہیں کریں گے، نا کسی شرک کا ارتکاب کریں گے۔

★کسی غلام کو خریدنے کیلئے مسلمانوں کے مقابلے بولی نہیں لگائیں گے۔

★اپنے رشتے داروں میں کسی کو اسلام قبول کرنے سے نہیں روکیں گے۔

★کسی بھی حال میں زیب وزینت اختیار نہیں کریں گے۔

★مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی مشابہت اختیار نہیں کریں گے، نا مسلمانوں کی طرح ٹوپی پہنیں گے، نا

عمامہ باندھیں گے،ناجوتا پہنیں گے،نابال بنائیں گے،ناسواری اختیار کریں گے۔

★نامسلمانوں کی زبان بولیں گے،ناان جیسے نام رکھیں گے۔

★اپنی پیشانی کے بال منڈوائیں گے،اور مانگ نہیں نکالیں گے۔

★کمرپر زنّار(پٹکا)باندھیں گے،اپنی انگوٹھیوں پر عرب عبارت کندہ نہیں کرائیں گے۔

★سواری کیلئے زین(کاٹھی)استعمال نہیں کریں گے،ناکوئی اسلحہ رکھیں گے ناتلوار لٹکائیں گے۔

★مسلمانوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں ان کی عزت افزائی کریں گے،انہیں راستے کی نشاندہی کریں گے،کسی محفل میں مسلمان بیٹھنا چاہیں تو ہم کھڑے ہو جائیں گے۔

★ہم مسلمانوں کے گھروں میں نہیں جھانکیں گے۔

طاپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم نہیں دیں گے۔

★کوئی عیسائی،مسلمان کے ساتھ تجارت نہیں کرے گا،سوائے اس کے کہ اس تجارت کا مکمل اختیار مسلمان کے پاس ہو۔

★ہم ہر مسلمان مسافر کی تین دن تک مہمان نوازی کریں گے اور اس کے قیام وطعام کا بندوبست کریں گے۔

یہ تمام شرطیں ہمیں قبول و منظور ہیں اور ہمارے سب ہم مذہب لوگوں کو بھی انہی شرائط پر امان ملی ہے۔اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی ہم خلاف ورزی کریں تو ہم سے آپ کا ذمہ الگ ہو جائے گا اور جو کچھ آپ اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے کرتے ہیں ان تمام مستحق ہم بھی ہو جائیں گے۔

جب یہ عہد نامہ حضرت فاروق اعظم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے اس میں مزید اضافہ کرایا کہ"کوئی عیسائی مسلمانوں کے بنائے گئے غلام نہیں خریدے گا اور اگر کسی عیسائی نے کسی مسلمان کو مارا تو وہ اس معاہدے میں دی گئی امان کا حق دار نہیں ہو گا"۔

(أحكام أهل الذمة لابن قيم:1149/3، تفسیر ابن کثیر: تحت سورۃ توبہ آیت 29،إرشاد الفقیہ لابن کثیر: 340/2،المحلی لابن حزم:346/7،الاحکام الصغریٰ لعبد الحق الاشبیلی:600)

امام ابن کثیر نے ان شرائط کے بارے میں لکھ رکھا ہے کہ "اسے اسحاق بن راہویہ، قاضی ابو محمد بن زبر، بیہقی اور کئی ایک ائمہ نے روایت کیا ہے اور اس کے طرق جید ہیں۔۔۔۔۔ آئمہ اسلام نے ان شروط پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔اُن خلفاءراشدین اور ائمہ مھدیین نے اس پر عمل کیا ہے، جنہوں نے حق کے ساتھ فیصلہ کیا اور اسی کے ساتھ وہ عدل کیا کرتے تھے۔"(إرشاد الفقيه:2/340)

صرف یہی نہیں بعد والے خلفاء نے بھی غیر مذاہب کے ساتھ اس غیر انسانی وتحقیر آمیز سلوک میں کمی نہ آنے دی بلکہ اضافہ ہی کیا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے امام اور مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز قاضی ابویوسف نے اپنی مشہور کتاب الخراج میں غیر مسلم ذمیوں کے لئے ایسے بہت سے احکامات نقل کئے ہیں۔ یہاں صرف نمونے کے طور پر ان کی کتاب سے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا ایک خط نقل کیا جارہا ہے جو انہوں نے اپنے ایک گورنر کو بطور تنبیہ لکھا تھا جس نے شاید غیر مسلموں کی تحقیر و تذلیل پر مبنی احکامات پر عملدرامد چھوڑ دیا تھا۔ یاد رہے کہ عمر بن عبد العزیز مسلمانوں کے ہاں پانچویں خلیفہ راشد مانے جاتے ہیں۔

عمر بن عبد العزیز نے اپنے ایک عامل کو یہ لکھا کہ:

"امابعد، جو صلیبیں اعلانیہ نصب ہیں انکو توڑ دیا جائے۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کو اجازت نہیں کہ وہ سواری کے لیے زین کا استعمال کر سکیں بلکہ انہیں سامان ڈھونے والی کاٹھی رکھ کر ہی سواری کرنا ہوگی اور انکی خواتین بھی زین پر بیٹھ کر سواری نہیں کر سکتیں بلکہ انہیں بھی سامان ڈھونے والی کاٹھی ہی استعمال کرنی ہے۔ اس کا باقاعدہ فرمان جاری کرو اور عوام کو اس کی نافرمانی نہ کرنے دو اور فرمان جاری کرو کہ کوئی عیسائی قبا نہیں پہن سکتا اور نہ ہی نفیس کپڑا پہن سکتا ہے اور نہ ہی عمامہ پہن سکتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہاری عملداری میں بہت سے عیسائی عمامہ پہننے کی رسم میں دوبارہ مبتلا ہو گئے ہیں اور وہ کمر کے گرد پیٹی (زنار) بھی نہیں باندھ رہے ہیں اور اپنے آگے کے سر کو گنجا بھی نہیں کر رہے ہیں۔ اگر تمہاری موجودگی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو اسکی وجہ تمہاری کمزوری ہے، تمہاری نااہلی ہے اور تمہارا خوشامدیں سننا ہے، اور یہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ کیسے اپنے پرانے رسوم کو جاری

کریں۔ تم کس قسم کے انسان ہو؟ ان تمام چیزوں کا خیال رکھو جن کی میں نے ممانعت کی ہے اور ان لوگوں کو ایسا کرنے سے بالکل روک دو۔ والسلام"

(کتاب الخراج لأبي يوسف، صفحہ 145، المکتبۃ الأزھریۃ للتراث)

ان تمام شرائط و احکامات پر دوبارہ ایک نظر ڈالئے جو مسلم خلفائے راشدین کی جناب سے دیئے گئے اور پھر انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے کہ یہ کیسا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کے دلوں میں دوسروں کے لئے ایسی نفرت اور حقارت پیدا کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے ایسا رویہ و سلوک رکھیں جو جانوروں سے بھی مستحسن نہ سمجھا جائے۔ یہ کیسی بیمار ذہنیت ہے جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی ذلت و رسوائی میں اپنی عزت اور توقیر سمجھتی ہے۔ افسوس کہ آج مسلمان خود اسلام کی ان نفرت انگیز اور تحقیر آمیز تعلیمات سے واقف نہیں اور ضرورت اسی امر کی ہے کہ ان حقیقی اسلامی تعلیمات کو سب کے سامنے لایا جائے تاکہ ان وجوہات کو تلاش کیا جا سکے جو مسلمانوں کے اندر دوسروں کے ساتھ باہمی انسانی اقدار کو اپنانے میں رکاوٹ ہیں۔ حقائق کو چھپا کر ہم کبھی بھی صحیح معنوں میں بہتری کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔

سائنس

نسلِ انسانی اور تہذیب کا آغاز

عالمی ادارہ آثار قدیمہ کی کھنڈرات کی کھدائی کے دوران جو باقیات حاصل ہوئیں ان کی بنا پر کی گئی تحقیق کے مطابق، انسانی نسل کا تعلق انسانیت سے قبل کی نسل سے جا ملتا ہے، جسے "ہو مینڈ" یعنی اعلیٰ حیوانوں میں سے انسان نما کا کوئی وجود سمجھا جاتا ہے، جو 40 لاکھ سال پہلے مشرقی افریقہ میں پایا جاتا تھا۔ ہو مینڈ اور بن مانس نما دوسرے حیوانوں میں ایک اہم فرق یہ تھا کہ ہو مینڈ اپنے دونوں پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور اس کے دونوں بازو اور ہاتھ دیگر کاموں کے لئے آزاد رہتے تھے۔ انسان وہ جانور بن گیا جو ہاتھ میں پکڑے ہوئے آلات کو استعمال کرنے کی سکت رکھتا تھا۔ جدید انسان "ہوموسیپئنز" وہ جانور ہے جس کی بڑی

کھوپڑی ہومونائیڈک نسل سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ وہ ایک لاکھ سال پہلے افریقہ میں پایا جاتا تھا۔ آخری برف کا عہد، جو 75 ہزار سال قبل شروع ہوا تھا، شروع میں اس کی آبادی گرم موسم کے علاقوں تک محدود تھی۔ بعض گروہ سرد علاقوں، شمال میں یورپ کی طرف، پھر جنوبی ایشیاء کے راستے آسٹریلیا تک جا پہنچے۔ دور دراز کے علاقوں میں پہنچنے والوں میں بیشتر لوگ امریکی انڈینز کے آباؤاجداد تھے، جنہوں نے الاسکا اور سوبیا کے درمیان زمینی پل کا سفر طے کیا اندازے کے مطابق یہ واقعہ 2500 قبل مسیح کا ہے، لیکن زیادہ امکان 10000 ہزار سال قبل مسیح کا ہے (اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ انسانی ترقی کی رفتار چالیس ہزار سال پہلے تیز ہونے لگی) آرٹ کے اولین نمونوں کا تعلق اسی عہد سے ہے جب آج کے جدید انسان نے آبنائے بیہرنگ عبور کی اور مغربی نصف کرے میں پہنچا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی ستر ہزار سال پہلے سائبیریا کو الاسکا سے ملانے والا برفانی پل بنا جواب سے کوئی دس ہزار سال پہلے تک موجود تھا۔ سماجی اور جنیاتی مواد سے پتہ چلتا ہے انسان پہلے پہل مغربی نصف کرے میں اسی راستے سے پہنچا تھا۔

برف کا آخری دور 12000 سال قبل مسیح سے 10000 ہزار سال قبل مسیح کا ہے، ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً 40 لاکھ نفوس پر مشتمل تھی (اس تعداد میں کافی تضاد کا امکان ہے کیونکہ اس وقت ذرائع ابلاغ، مواصلات اور سماجی روابط بہت قلیل تھے اور انسانوں کا آپسی رابطہ آسان نہ تھا) اور (6) براعظموں پر مشتمل تھی۔

سب سے پرانے انسانی معاشروں میں لوگ خاندانوں کی صورت میں تقسیم تھے۔ شکار کرتے، مچھلیاں پکڑتے اور دوسرے طریقوں سے خوراک اکٹھی کرتے تھے۔ جانوروں کی کھال اور ان کے بالوں سے اپنے لباس تیار کرتے، پتھروں کو تراش کر نوکیلے اور کارآمد آلات بناتے۔ پتھر کے زمانے کے آخری دنوں میں ایک انقلاب رونما ہوا، جو برف کے زمانے کے جانے کی وجہ سے ہوا اس انقلابی زمانے میں کاشتکاری کا ہنر متعارف ہوا، سوت کاتنے اور بننے کا عمل شروع ہوا، مٹی کے برتن، تیر کمان بنانے اور جانوروں سے کام لینے کا سلسلہ شروع ہوا، کاشتکاری کے فن میں مزید بہتری آنے کی وجہ سے خوراک کی پیداوار اور فراہمی میں اضافہ ہوا، اور فارغ وقت دوسرے فنون کو جاننے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ چھ ہزار سال پہلے پتھر کے آلات کی جگہ تانبے کے آلات نے لے لی۔ تانبے اور ٹین کو ملا کر کا لتی بنائی گئی جو زیادہ لچک دار

دھات ہوتی ہے۔لوہے کو پگھلانے کا ہنر تین ہزار سال قبل مسیح سے پہلے شروع ہوا۔اب خوراک چونکہ زمین سے پیدا ہو رہی تھی اس لئے لوگوں نے مل جل کر رہنا شروع کر دیا جس سے آبادی گھنی ہوتی گئی۔

تاریخ دانوں میں یہ موضوع زیر بحث ہے کہ زمین پر زراعت کسی ایک جگہ شروع ہوئی یا بہت سے مقامات پر ہوئی۔آثار قدیمہ کے ماہرین نے شام کے شمال میں ابوموریہ کے مقام پر یہ دریافت کیا کہ تقریباً نو ہزار پانچ سو سال پہلے یہاں اچانک ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔زمین کی گہرائی میں کھودتے ہوئے انہوں نے یہ دیکھا کہ مٹی کا رنگ بادامی سے کالا ہو گیا تھا جس میں کسی پودے کے ٹکڑے شامل تھے۔جس سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ اس سے پہلے کی بستی پر کاشتکاری کرنے والا گاؤں تعمیر ہوا تھا۔اس سے یہ بھی شواہد ملتے ہیں کہ وہاں کے باشندے جو سرد موسم کے پھر سے شروع ہونے کے بعد یہاں آئے تھے،انہیں اچانک مختلف نوعیت کے مقامی پودوں کا علم ہو گیا تھا جو کہ مشرق وسطیٰ میں پھیل گئے تھے۔بعض لوگوں کا یہ قیاس ہے کہ زراعت کے بارے میں جو علم لوگوں میں تیزی سے پھیلا اس کا سبب "مواصلات کا انقلاب" تھا جو تجارت کی وجہ سے شروع ہوا۔جنوبی ترکی میں قیت الحیوق کے مقام پر کھدائی کے دوران میں یہ انکشاف ہوا کہ یہاں ایک بستی تھی،جس کی آبادی پانچ سے دس ہزار نفوس کے درمیان تھی،یہ جگہ تجارت کا مرکز تھی۔یہ آبادی جہاں سانڈوں کی عبادت ہوتی تھی،نو ہزار سال قبل دنیا کا پہلا شہر رہا ہو گا۔مغربی مؤرخوں کے مطابق مصر اور میسوپوٹامیہ تہذیب کے اولین گہوارے تھے۔تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ ایک زیادہ نفیس قسم کا معاشرہ ہندوستان میں ابتدائی عہد میں موجود رہا ہو۔ریگ وید میں بہت سے اشعار "سرما" کا حوالہ دیتے ہیں جب سورج نصف النہار پر تھا اور سورج کے برج حمل میں داخل ہونے کی ابتداء تھی۔یہ حالات سات ہزار سال قبل مسیح کے فلکیات سے ملتے جلتے ہیں۔ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی کھدائی سے فنی طور پر ایک زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کے باقیات ملتے ہیں،جو تین ہزار سال قبل مسیح میں پائی جاتی تھی۔اس کے شہر باضابطہ گلیوں سے منسلک تھے،جن میں پانی کی فراہمی،نکاسی آب اور غسل خانوں کا انتظام موجود تھا۔اس کے باشندے گندم اور جو کھاتے تھے اور کپاس سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ان کی تحریر جسے اب تک پڑھا نہیں جاسکا،غالباً دراوڑی زبان سے نکلی تھی۔اس عہد کی مہریں یہ ثابت کرتی ہیں کہ شروع میں "شو" کی پوجا ہوتی تھی۔آریاؤں سے پہلے کا ہندوستانی معاشرہ اپنے مولد سے پھیلنا شروع ہوا۔یہ سندھ اور سرسوتی کی وادیوں تک پھیل گیا اور دریائے گنگا کے قریب کے علاقے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ 1800 سے 2000 قبل مسیح کے دوران جب سرسوتی دریا خشک ہو گیا تو یہ تہذیب بھی ناپید ہو گئی۔

انسانی ارتقاء کی مختصر تاریخ

ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کرہ ارض پر زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی؟ زمانہ قبل از تاریخ میں ہمارے آباءواجداد کون تھے؟ وہ کون سے ارضیاتی تغیرات تھے جن کی وجہ سے کرہ ارض پر پائے جانے والے سب سے پیچیدہ حیوان "انسان" کا ارتقاء

شروع ہوا؟ یہ سوالات صدیوں سے انسانی ذہن میں آتے رہے ہیں مگر ان کے جوابات کسی کے پاس نہ تھے یہاں تک کے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والی فوسلز کی دریافتوں نے سائنس دانوں کے لئے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ حقائق و شواہد کی روشنی میں انسانی ارتقاء کو بیان کر سکیں کہ انسان اپنی موجودہ حالت میں کس طرح آیا اور انسان کو اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگا، سائنسی حقائق و شواہد کی روشنی میں زمین پر زندگی کی ابتداء 220ملین سال قبل یوکریاٹیک نامی خلیے سے ہوئی، 65 ملین سال قبل پہلا ممالیہ جاندار ارتقاء پذیر ہوا، 13 ملین سال قبل سنزویک دور میں پیروپلا پتھیکس ارتقاپذیر ہوا، 7 ملین سال قبل بون اور چمپنزی کا کامن جدِ امجد ساحلونتھروپوس ارتقاء پذیر ہوا جس کے بارے میں کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ہی چمپنزی اور انسان کا کامن جدِ امجد رہا ہو گا۔

لگ بھگ 40 ملین سال قبل افریقہ میں موسمی تبدیلیاں آنے لگیں، یہ آتش فشاؤں کے پھٹنے اور تیز سیلابی بارشوں کا زمانہ تھا، اس وقت کے ہمارے آباءواجداد درختوں پر ویسی ہی زندگی گزارتے تھے جیسے چمپنزی اور بون گزارتے ہیں، کچھ عرصہ بعد موسمی تغیرات کے باعث خشک سالی بڑھنے لگی اور برساتی جنگلات گھٹنے لگے جس کے باعث ہمارے آباءواجداد کے لئے زندگی مشکل ہونے لگی اور وہ درختوں پر رہن سہن چھوڑ کر زمین پر آنے لگے جس سے ان میں دو ٹانگوں پر چلنے کی ابتدا ہوئی، بیشتر سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چار ٹانگوں کی بجائے دو ٹانگوں پر چلنے والا پہلا جاندار اوسترالوپتھیکس تھا، جیسے جیسے افریقہ کا ماحول اور موسم ہمارے آباءواجداد کی بقائے حیات کے لئے مشکل ہوتا گیا وہ ایک نئے جاندار میں ارتقاء پذیر ہوتے گئے جسے ہومو حبلس کہا جاتا ہے، اوسٹرلوپیتھیکس کو ہوموحبلس تک پہنچنے میں 1.1 ملین سال کا عرصہ لگا، یہ نوع سائز میں بڑا دماغ رکھتی تھی اور ذہانت میں اوسترالوپتھکس سے زیادہ تھی، یہ پتھر کے بنیادی اوزار بنالیا کرتے تھے اس کے 7 لاکھ سال بعد ہوموحبلس ارتقا کے ذریعے ہومو ایریکٹس میں تبدیل ہو گیا جو کہ مزید بڑا دماغ رکھتے تھے اور زیادہ ذہانت کے حامل تھے انہوں نے آگ کا استعمال شروع کیا اور خوراک کی تلاش میں افریقہ سے باہر بھی نقل مکانی کی اور مشرقِ وسطی اور ایشیا تک پھیل گئے، اسی دوران ایک دوسری نوع ہوموہیڈلبر جنسس نے افریقہ سے یورپ کی طرف نقل مکانی کی اور یورپ میں وہ نینڈرتھل میں ارتقاپذیر ہو گئے، ہم ہوموسپین ان دونوں جانداروں ہوموایریکٹس اور نینڈرتھل میں کس سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں؟ اس کا جواب ہم ذیل میں جدید ارتقائی سائنس کی روشنی میں جاننے کی کوشش کریں گے، ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی تعریف کیسے کی جائے گی، انسان اور اس کے آباءواجداد میں وہ کون سا فرق ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ ہمارا نزدیکی جدِ امجد کون تھا، ہوموایریکٹس یا نینڈرتھل؟ اور ہمیں کون سی چیز ان سے ممتاز کرتی ہے۔

انسانی دماغ انسان کا سب سے پیچیدہ عضو ہے جس کی وجہ سے ہمارے پاس ذہانت، سوچنے سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت ہے، ہم بہترین طریقے سے دو ٹانگوں پر حرکت کر سکتے ہیں اس کے علاوہ ہمارا بہتر سماجی رویہ ہمیں باقی ہومینڈ جانداروں سے ممتاز کرتا ہے اور انہی خصوصیات کی وجہ سے کرہ ارض پر ہماری حکمرانی ہے۔

انسان، چمپنزی اور ہوموایریکٹس کے جسمانی خدوخال کے تجزیے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کے وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کے ارتقاء پذیر ہونے سے انسان اور دیگر ہومینڈ جانداروں کے درمیان اتنا واضح فرق آیا، ہوموایریکٹس کے فوسلز سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ ان میں بھی کچھ ایسی ہی خصوصیات تھیں جیسی آج کے انسان میں موجود ہیں۔

فوسل ریکارڈ سے پتہ لگتا ہے کے ہوموایریکٹس کے دماغ کا سائز وقت کے ساتھ ساتھ بڑا ہوتا جارہا تھا، اپنے باقی آباء واجداد کے مقابلے میں ہوموایریکٹس کے دماغ کا سائز ساڑھے آٹھ سو سے گیارہ سو کیوبک سینٹی میٹر کے لگ بھگ تھا جبکہ ایک چمپنزی کے دماغ کا سائز تین سو سے ساڑھے چار سو کیوبک سینٹی میٹر کے درمیان ہوتا ہے اور موجودہ انسان کے دماغ کا سائز چودہ سو کیوبک سینٹی میٹر ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ نشو نما پا رہا تھا اور ہوموایریکٹس چمپنزی کے مقابلے میں ذہین تھا، بائی پیڈیلزم (دو ٹانگوں پر چلنے کی صلاحیت) ایک اور اہم خاصیت ہے جس نے ہوموایریکٹس کی بقاء میں نہایت اہم کردار ادا کیا، فوسل ریکارڈ سے پتہ لگتا ہے کہ ہوموایریکٹس کا پیلوس (پیرو) کافی حد تک انسان سے مشابہ تھا جس کی وجہ سے ان کے لئے دو ٹانگوں پر چلنا اپنے آباء واجداد کے مقابلے میں قدرے آسان تھا، جسمانی مشابہت کے علاوہ ہوموایریکٹس اور انسان کے عمومی رویے میں بھی کافی مماثلت پائی جاتی ہے، انسانوں کی طرح ہوموایریکٹس میں بھی اوزار بنانے کا رواج پایا جاتا تھا، ہوموایریکٹس سخت پھل اور گوشت کاٹنے کے لئے پتھر کے اوزاروں کا استعمال اپنے اجداد کی نسبت بخوبی جانتا تھا، اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کے ہوموایریکٹس سوشل ہوتا جا رہا تھا اور اس میں خاندانی نظام پروان چڑھ رہا تھا، سائنسدانوں کو ایک ہوموایریکٹس فوسل ملی جس کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور وہ دانتوں سے محروم ہونے کے باوجود بھی کافی طویل عرصہ زندہ رہا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضعیف ہوموایریکٹس کی نہ صرف کوئی دیکھ بھال کر رہا تھا بلکہ اس کو کھانا بھی چبا کر دے رہا تھا یہی وہ سماجی رویہ ہے جو آگے چل کر انسان میں منتقل ہوا۔

چمپنزی میں بھی کچھ حد تک سماجی رویہ پایا جاتا ہے، وہ بھی گروہ بنا کر رہتے ہیں مگر وہ انسان یا ہوموایریکٹس کی طرح اپنے گروہ سے اس طرح سے قریب نہیں ہوتے جس طرح سے انسان یا ہومورکٹس تھے، ایک اور صلاحیت جس نے ہوموایریکٹس کی بقاء میں معاونت کی وہ اس کی آگ جلانا سیکھنے کی قابلیت تھی، جب ہوموایریکٹس گوشت خور جانوروں کے درمیان رہتا تھا تو وہ آگ جلا کر اپنے آپ کو جانوروں کا شکار بننے سے بچاتا تھا۔

مندرجہ بالا خصوصیات سے پتہ چلتا ہے کے ہم ہوموایریکٹس سے قریب تھے مگر میں یہ کہوں گی کہ ہمارا ایک مشترکہ جدِامجد ضرور تھا مگر ہوموایریکٹس ہمارا براہ راست جدِامجد نہیں تھا کیونکہ ہوموایریکٹس کا دماغ ہمارے جیسا ضرور تھا مگر ہم سے سائز میں کافی کم تھا، ہوموایریکٹس کے چہرے کے خدوخال ہم سے ملتے جلتے تھے مگر مکمل ہماری طرح نہیں تھے، تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہوموایریکٹس ہمارا براہِ راست جدِامجد نہیں تھا تو پھر ہمارا براہِ راست جدِامجد کون تھا؟

چار ملین سال قبل افریقن سوانا میں چار انسان نُما جاندار رہتے تھے، جیسے جیسے موسم گرم ہوتا گیا خشکی بھی بڑھتی گئی، نتیجتاً ابتدائی انسان جیسے جانداروں کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بقاء کے لئے افریقہ سے نقل مکانی کر جائیں، تو اس وقت ہوموایریکٹس افریقہ سے نقل مکانی کر گیا اور مشرقِ وسطی اور ایشیا سے ہوتا ہوا انڈونیشیا تک پھل گیا، اسی زمانے میں ایک اور انسان جیسا جاندار افریقہ سے نکل کر یورپ جا کر آباد ہو گیا اور وہاں جا کر وہ مستقبل میں نینڈرتھل میں ارتقاء پذیر ہو گیا، جسمانی خدوخال اور عمومی رویے کے اعتبار سے نینڈرتھل اور انسان میں ہوموایریکٹس کی نسبت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ انسان، نینڈرتھل اور چمپینزی کا آپسی تعلق سمجھنے کے لئے سائنس دان ان کی کھوپڑیوں کا موازنہ کرتے ہیں، چمپینزی کا دماغی خول چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی جسمانی ساخت درختوں پر چڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں اور نینڈرتھل میں واضح فرق موجود ہے البتہ چمپینزی، نینڈرتھل اور انسان چونکہ ایک مشترکہ جدِامجد سے وجود میں آئے ہیں تو اس وجہ سے ان کی کھوپڑیوں میں کچھ حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، نینڈرتھل کا پیلوس کپ کی شکل کا ہوتا تھا جو اس کی ریڑھ کی ہڈی اور اوپری باڈی کو سپورٹ کرتا تھا، پیلوس کی شکل سے ہمیں پتہ چلتا ہے کے نینڈرتھل بالکل انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر چل سکتا تھا، نینڈرتھل صرف جسمانی خدوخال کے لحاظ سے ہی انسان جیسا نہ تھا بلکہ اس کا رویہ بھی کافی حد تک انسانی تھا، یہی وہ پہلا جاندار تھا جس نے کپڑوں کا استعمال شروع کیا، انسانوں کی طرح یورپ کے سرد موسم اور برفانی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے نینڈرتھل کو اپنی بقاء کے لئے کپڑوں کے استعمال کی ضرورت پڑی، نینڈرتھل ماہر شکاری تھا اور اس نے شکار کے لئے اوزاروں اور ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا، ان کے ہتھیار اور اوزاروں کی ٹیکنالوجی ہوموایریکٹس کے مقابلے میں کافی جدت کی حامل تھی، نینڈرتھل کے اوزاروں میں لکڑی کے بنے ہوئے نیزے شامل تھے جن کی مدد سے وہ اپنے سے طاقتور جانوروں کا شکار کر لیا کرتے تھے، اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی دماغی صلاحیتیں انسان سے قریب تھیں اور وہ بھی کچھ حد تک ضرورت کے مطابق ایجاد کر لیا کرتے تھے۔

حال ہی میں سائنس دانوں نے ایک نینڈرتھل کا مکمل ڈھانچہ دریافت کیا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کے نینڈرتھل میں بھی اپنے مردے کو ٹھکانے لگانے کا رواج شروع ہو چکا تھا، نینڈرتھل کی قبر سے کچھ اوزار بھی ملے ہیں جو مرنے والے کے ساتھ ہی رکھ

دیے جاتے تھے، نینڈر تھل کے ڈی این اے پر ہونے والی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ نینڈر تھل میں فوکس پی ٹو نامی جین پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان بولنے اور زبان وکلام کے قابل ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے ہے کہ نینڈر تھل بھی نہ صرف بول سکتا تھا بلکہ ایک دوسرے کی بات چیت سمجھ بھی سکتا تھا مگر ہماری طرح موثر طریقے سے نہیں کیونکہ نینڈر تھل کے گلے کے ڈھانچے نے اس کی بات چیت کو محدود کردیا ہوگا، سائنس دانوں نے وہ خول بھی دریافت کرلئے ہیں جس میں نینڈر تھل رنگ اور پگمنٹ رکھتا تھا، نینڈر تھل بھی اپنی غاروں کو پینٹنگ سے آراستہ کرتے تھے۔

اب تک کی ہونے والی سائنسی تحقیق اور حقائق وشواہد کی روشنی میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آج سے دوملین سال قبل افریقہ میں چار انسان نُما جاندار رہتے تھے، ہومو ایریکٹس نے نقل مکانی کی اور ایشیا چلا گیا، ہوموہائڈل برجنسس کا ایک گروہ افریقہ سے یورپ منتقل ہو گیا جو بعد میں ارتقاء کے ذریعے نینڈر تھل بن گیا، اور جو گروہ افریقہ میں رہا وہ آنے والے وقتوں میں ارتقاء کے ذریعے موجودہ انسان بن گیا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نینڈر تھل اور انسان دونوں ایک ہی مشترکہ جدِامجد ہوموہائڈل برجنسس سے ارتقاء کے ذریعے وجود میں آئے ہیں۔

بشکریہ مریم خان

عدم سے تخلیق - بغیر خدا کے

بیشتر کے نزدیک یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی شئے لاشئے سے نہیں آسکتی، تاہم زیادہ تر طبیعات دان اس سے اتفاق نہیں کرتے، اس دعوے کے خلاف وہ بسا اوقات "کوانٹم ویکیوم فلکچویشن" یا "ورچوئل پارٹیکلز" کا حوالہ دیتے ہیں، یہ پارٹیکل اور ضد پارٹیکل کے جوڑے ہیں جو ازحد مختصر وقت کے لیے ہائزنبرگ کے اصولِ غیر یقینی کے تعلق سے خالی خلاء میں وجود میں آتے ہیں (اقتباس 1 اور 2)، یہ قابلِ قیاس اثرات چھوڑتے ہیں جیسے لیمب شفٹ اور کیزیمر اثر (اقتباس 3 اور 4)، یہ پارٹیکل بے قاعدہ نہیں ہیں بلکہ اس قدر عمومی ہیں کہ کچھ طبیعات دان یہ استدلال پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ اگر ہم خالی خلاء کو لاشئے سمجھیں تو کوئی بھی چیز لاشئے نہیں ہوسکتی کیونکہ خلاء کبھی بھی خالی نہیں ہوتا، یہ ہمیشہ ورچوئل پارٹیکلوں سے بھرا رہتا ہے (اقتباس 5)، مختصراً، اگر ہم زیادہ تر لوگوں کی اس سوچ کا اتباع کریں کہ خالی خلاء لاشئے ہے تو ہمارے پاس کم سے کم ایک ایسی قوی مثال موجود ہے جس میں کوئی شئے لاشئے سے برآمد ہوسکتی ہے.

کیا کائنات لاشئے سے وجود میں آسکتی ہے؟

ورچوئل پارٹیکل مختصر زندگی جینے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ کائنات میں بڑھتی توانائی کی نمائندگی کرتے ہیں، ہائیزن برگ کے اصولِ غیر یقینی میں مختصر زندگی کے حامل ان ورچوئل پارٹیکلوں کے لیے گنجائش موجود ہے، مگر طویل زندگی کے حامل پارٹیکلوں کا ظہور جیسا کہ ہماری کائنات میں ہے حرحرکیات کے پہلے قانون کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے، چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر کوانٹم ویکیوم فلکچویشن کا ہماری کائنات کے ماخذ سے کوئی تعلق نہیں بنتا، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبیعات دان کم سے کم بھی ٹرائن (1973) تک پہنچ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کائنات ایک بہت بڑی کوانٹم ویکیوم فلکچویشن ہو (اقتباس 6). اسے ممکن بنانے والی کائنات کی بنیادی خاصیت یہ ہے کہ اس کی مجموعی توانائی صفر ہو، یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کائنات کی مجموعی توانائی صفر ہو؟، جواب یہ ہے کہ تجاذبی توانائی منفی ہوتی ہے، جب اسے کائنات میں مادے کی مثبت توانائی کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے تو دونوں کمیتیں ایک دوسرے کو منسوخ کر دیتی ہیں (اقتباس 7 اور 8)، نا ہی ہائیزن برگ کا اصولِ غیر یقینی اور نا ہی حرحرکیات کا پہلا قانون مجموعی صفر توانائی کے حامل کوانٹم ویکیوم فلکچویشن کے طولِ وقت کے جاری رہنے پر کوئی حد لگاتے نظر نہیں آتے، چنانچہ ہماری کائنات کی قدامت اس امکان کو رد نہیں کرتی کہ اس کی اصل کوانٹم ویکیوم فلکچویشن ہے (اقتباس 9)، تجویز یہ نہیں ہے کہ ساری کائنات ایک ہی جھٹکے میں برآمد ہوگئی، بلکہ یہ ہے کہ کوانٹم ویکیوم فلکچویشن نے زمان و مکان کے مقامی پھلاؤ کے لیے بیج کا کام سرانجام دیا جس کے ذیلی اثر کے طور پر مادہ خودکار طور پر وجود میں آگیا (اقتباس 10 اور 11).

اس طرح کی تجاویز میں کوانٹم ویکیوم فلکچویشن خالی زمان و مکان میں ہوتی ہے، دیگر تجاویز میں، خاص طور سے جو ایلکس ویلنکائن کی پیش کردہ ہے اس میں پہلے سے موجود زمان و مکان کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے اور ویکیوم فلکچویشن کی بجائے صرف کوانٹم ٹنلنگ پر انحصار کیا گیا ہے (اقتباس 12).

کیا طبیعات دانوں کی "لاشئے" واقعی لاشئے ہے؟

اب وقت ہے اوپر کی ساری باتوں پر اعتراضات اٹھانے کا، اعتراض یہ ہے کہ جب طبیعات دان "لاشئے" کی بات کرتے ہیں تو کیا وہ واقعی ایک ایسی حالت کی بات کر رہے ہوتے ہیں جس میں لفظی مفہوم میں کوئی بھی چیز موجود نہیں ہوتی؟ بات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لیے میں کسی بھی چیز کی عدم موجودگی کو "لاشیئیت" قرار دے دیتا ہوں، چنانچہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ طبیعات دانوں کی "لاشئے" درحقیقت "لاشیئیت" نہیں ہے، پہلی نظر میں اقتباس 5 اس طرف اشارہ بھی کرتا نظر آتا ہے، تاہم میرے خیال سے یہ غلط فہمی یا Misreading ہے.. موریس صرف اتنا کہنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خلاء کبھی بھی مکمل طور پر خالی نہیں ہوتا، مگر ہم یہاں کسی تاویلی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے، کیونکہ یہ سچ ہے کہ ٹرائن-ٹائپ ماڈلوں میں کائنات پیدا کرنے والی کوانٹم ویکیوم فلکچویشن پہلے سے موجود زمان و مکان میں ہو رہی ہوتی ہے.

اب کوئی اس چیلنج کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے؟ میرے خیال سے یہاں دو باتیں بہت اہم ہیں:

(1) پہلی بات تو یہ ہے کہ لا شئے سے کوئی شئے آسکتی ہے اس بات پر لوگ اس لیے یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتے کیونکہ وہ اپنی روز مرہ زندگی میں اپنے ارد گرد چیزوں کو خالی خلاء میں سے ظہور پذیر ہوتا نہیں دیکھتے، وہ خالی خلاء کو لا شیئیت قرار دیتے یا سمجھتے ہیں تاہم جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ علمی طور پر پارٹیکل ایسا کرتے ہیں اور کائناتیں خالی خلاء سے ظہور پذیر ہو سکتی ہیں تب زیادہ تر لوگوں کی مابعد الطبیعاتی فکر کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے چنانچہ (اسے بچانے کے لیے) وہ یہ اعتراض اٹھا دیتے ہیں کہ خالی زمان ومکان کس چیز سے آیا؟.

(2) دوم یہ کہ چاہے ہم زمان ومکان کو بھی کسی "شئے" کے طور پر شمار کر لیں تب بھی اس سے ویلنکائن-ٹائپ کی تجاویز پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اس نقطہ پر آکر (جب بھاگنے کا اور کوئی راستہ نہیں ملتا) یہ اعتراض اٹھا دیا جاتا ہے کہ ویلنکائن کی تجویز کو کوانٹم میکانکس درکار ہے اور یہ کہ کوانٹم میکانکس کے قوانین کوئی "شئے" ہیں..!؟ دو وجوہات کی بنا پر یہ ایک عجیب وغریب اعتراض ہے: (1) معلوم ہوتا ہے کہ معترض طبعی قوانین کو مجسم کرنے کے درپے ہے جو کہ کوئی شئے نہیں ہیں بلکہ چیزیں کیسے کام کرتی ہیں ان کی تفصیل ہے، یہ واضح نہیں ہے کہ کوئی اس حقیقت کو کہ کائناتیں کوانٹم میکانکس کے بیان کردہ انداز میں وقتاً فوقتاً وجود میں آسکتی ہیں، کوئی چیز کیسے قرار دے سکتا ہے؟. (2) اگر کوئی حقائق کو "چیزیں" یا "شئے" قرار دے دے تو "لا شیئیت" منطقی طور پر نا ممکن ہے، اگر کچھ بھی وجود نہیں رکھتا تو پھر یہ حقیقت ہوگی کے کچھ بھی وجود نہیں رکھے گا، یعنی کم سے کم ایک چیز (یہ حقیقت کہ کوئی چیز وجود نہیں رکھتی) تو بالآخر وجود رکھتی ہے، جو کہ نتیجے کے طور پر اصل مفروضے سے متصادم ہوگی، نتیجتاً اگر کوئی حقائق کو شئے کے طور پر شمار کرتا ہے تو کچھ حقائق لازماً حاصل ہوتے ہیں، لیکن، اگر کم سے کم ایک حقیقت بھی حاصل ہوتی ہے تو پھر وہ یہ حقیقت کیوں نہیں ہو سکتی کہ کوانٹم میکانکس لاگو ہو سکتی ہے؟

آخری بات

یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے اور نا ہی یہ دعوی ہے کہ تمام تر کونیات اور فلسفے کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے، صرف یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مقبول علمی اور تکنیکی فہم میں "الحادی کائنات" کا عدم سے ظہور پذیر ہونا عین ممکن ہے، چاہے زیادہ تر مومنین کو یہ حقیقت ناگوار گزرے مگر سچ یہی ہے کہ جدید طبیعات نے اس پر فیصلہ کن انداز میں مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

****

معاون اقتباسات:

اقتباس 1– پال ڈیویئس:

روز مرہ کی دنیا میں، توانائی ہمیشہ ناقابلِ تغیر اور مستحکم ہے، توانائی کے تحفظ کا قانون کلاسیکی طبیعات کی اساس ہے، مگر کوانٹم کی چھوٹی دنیا میں توانائی لامکانی طور پر خود کار اور ناقابلِ پیشگوئی انداز میں ظاہر اور غائب ہو سکتی ہے.(پال ڈیویئس 162:1983)

اقتباس 2– رچرڈ موریس:

اصولِ غیر یقینی بتاتا ہے کہ پارٹیکل مختصر وقت کے لیے وجود میں آسکتے ہیں چاہے جب انہیں بنانے کے لیے کافی توانائی بھی دستیاب نہ ہو، درحقیقت یہ توانائی کے عدم تیقن سے پیدا ہوتے ہیں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے لیے درکار توانائی مختصر عرصے کے لیے "ادھار" لیتے ہیں اور پھر، مختصر وقت کے بعد، اپنا "قرض" اتار کر دوبارہ غائب ہو جاتے ہیں، چونکہ یہ پارٹیکل مستقل وجود نہیں رکھتے چنانچہ انہیں ورچوئل پارٹیکل کہا جاتا ہے.(موریس 24:1990)

اقتباس 3– پال ڈیویئس:

اگرچہ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے، مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ ورچوئل پارٹیکل "حقیقتاً" خالی خلاء میں موجود ہیں کیونکہ وہ اپنی سرگرمیوں کے قابلِ دریافت نشان چھوڑ جاتے ہیں، مثال کے طور پر ورچوئل فوٹونوں کا ایک اثر ایٹموں کی توانائی کی سطحوں میں ہلکا سا تغیر پیدا کرنا ہے، مزید بر آں یہ الیکٹرانوں کی مقناطیسی گشتاور میں برابر ہلکی تبدیلی کرتے ہیں، یہ دقیق مگر اہم تغیرات سپیکٹروسکوپک تکنیکوں سے حد درجہ درستگی کے ساتھ ناپے جاچکے ہیں.(ڈیویئس 32:1994)

اقتباس 4– جان بیرو اور جوزیف سلک:

توقع تھی کہ ورچوئل پارٹیکل کے جوڑوں کا ایٹموں کی توانائی کی سطحوں پر قابلِ پیائش اثر ہوگا، متوقعہ اثر ایک اربویں حصے میں محض دقیق سی تبدیلی ہے مگر تجربہ کاروں نے اس کی تصدیق کردی ہے، 1953ء میں ولیم لیمب نے ہائیڈروجن کے ایٹم کی اس برانگیختہ حالت کو ناپا تھا، اب اسے لیمب شفٹ کہا جاتا ہے، ایٹموں پر ویکیوم کے اثرات کا متوقعہ فرقِ توانائی اتنا کم ہے کہ اسے صرف خردموج فریکوینسیوں میں بطور تغیر کے دریافت کیا جاسکتا ہے، خردموجوں کی یہ درست پیائش اتنی عظیم تھی کہ لیمب یہ تغیر پانچ اہم اعداد میں ناپنے میں کامیاب رہا، اس کے اس کام کے لیے بعد میں اسے نوبل انعام سے نوازا گیا، اب کوئی شک باقی نہیں رہا کہ ورچوئل پارٹیکل موجود ہیں.(بیرو اور سلک 1993:65-66)

اقتباس 5– رچرڈ موریس:

جدید طبیعات میں کوئی چیز "لاشئے" نہیں ہوتی چاہے بے عیب ویکیوم ہی کیوں نہ ہو، ورچوئل پارٹیکل کے جوڑے ہمیشہ بنتے اور تباہ ہوتے رہتے ہیں، ان پارٹیکلوں کا وجود ریاضیاتی تخیل نہیں ہے، اگرچہ ان کا براہ راست مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا مگر جو اثر وہ

چھوڑتے ہیں وہ واقعی حقیقت ہے، ان کے وجود کا مفروضہ ان پیشگوئیوں کی طرف دلالت کرتا ہے جن کی تصدیق اعلی درجے کے درست تجربات سے ہو چکی ہے.(موریس 25:1990)

اقتباس 6- ہائینز پیگلز:

جیسے ہی ہمارا دماغ مادے کی ناپائیداری اور ویکیوم کے نئے خیال کو قبول کرتا ہے، ہم اس سب سے بڑی چیز کے ماخذ کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جسے ہم جانتے ہیں- کائنات، ہو سکتا ہے کہ کائنات بذاتِ خود لاشئے سے وجود میں آئی ہو- ایک عظیم ویکیوم فلکچویشن جسے آج ہم بگ بینگ کے نام سے جانتے ہیں، نمایاں طور پر جدید طبعیات کے قوانین اس امکان کی اجازت دیتے ہیں. (پیگلز 247:1982)

اقتباس 7- سٹیفن ہاکنگ:

ہماری قابلِ مشاہدہ کائنات کے خطوں میں کوئی دس ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین ملین (1 کے بعد 85 صفریں) پارٹیکل موجود ہیں، یہ سب کہاں سے آئے؟ جواب یہ ہے کہ کوانٹم نظریے میں پارٹیکل توانائی کے ذریعے پارٹیکل / ضد پارٹیکل کے جوڑوں کی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں، مگر اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ توانائی کہاں سے آئی؟ جواب یہ ہے کہ کائنات کی مجموعی توانائی بالکل صفر ہے. کائنات کا مادہ مثبت توانائی سے بنا ہے، تاہم یہ سارا مادہ اپنے آپ پر تجاذبی کشش لگاتا ہے، ایک دوسرے کے قریب مادے کے دو ٹکڑوں میں ایک دوسرے سے دور ایسے ہی مادے کے دو ٹکڑوں کے مقابلے میں کم توانائی ہوتی ہے، کیونکہ آپ کو انہیں الگ کرنے کے لیے اس تجاذبی قوت کے خلاف جو انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہی ہے توانائی صرف کرنی پڑے گی، اس طرح سے تجاذبی میدان منفی توانائی رکھتا ہے، کائنات کی صورت میں جو کہ مکان میں تقریباً ہموار ہے، یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ یہ منفی تجاذبی توانائی مادے کی نمائندہ مثبت توانائی کی مکمل طور پر نفی کر دیتی ہے، چنانچہ کائنات کی مجموعی توانائی صفر ہے.(ہاکنگ 129:1988)

اقتباس 8- پال ڈیویئس:

ابھی تک ایک حیرت انگیز امکان موجود ہے، جو کہ صفر توانائی کی حالت سے مادے کی تخلیق ہے، یہ امکان اس لیے پیدا ہوتا ہے کیونکہ توانائی دونوں طرح سے مثبت اور منفی ہو سکتی ہے. حرکت کی توانائی یا کمیت کی توانائی ہمیشہ مثبت ہوتی ہے، مگر کشش کی توانائی، جیسے کہ مخصوص قسم کے تجاذبی یا برقی مقناطیسی میدان کی توانائی منفی ہوتی ہے، ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں مثبت توانائی جو کہ مادے کے نئے بنائے گئے پارٹیکلوں کی کمیت بناتی ہے، وہ برقناطیسیت کی تجاذبی منفی توانائی کے بالکل برابر ہو، مثال کے طور پر ایک ایٹمی نیوکلیئس کے قرب میں برقی میدان حد درجہ شدید ہوتا ہے، اگر 200 پروٹانوں پر مشتمل نیوکلیئس بنایا جائے (ممکن مگر مشکل) تو نظام الیکٹران- پازیٹران کے جوڑوں کی خودکار پیدا کاری کے خلاف غیر مستحکم ہو جائے گا وہ بھی

مکمل طور پر کسی درآمدہ توانائی کے بغیر،اس کی وجہ یہ ہے کہ منفی برقی توانائی اپنی کمیتوں کی توانائی کے عین برابر ہو سکتی ہے.

تجاذبی حالت میں صورتِ حال ابھی تک مزید انفرادیت کی حامل ہے، تجاذبی میدان کے لیے یہ صرف ایک مکانی-خمیدگی ہے، مکانی-خمیدگی میں مقید یا مقفل توانائی کو مادے یا ضد مادے کے پارٹیکلوں میں بدلا جا سکتا ہے، ایسا مثال کے طور پر بلیک ہول کے قریب ہوتا ہے، اور غالباً بگ بینگ میں پارٹیکلوں کا ایک اہم مصدر تھا، یوں مادہ فطری طور پر خالی مکان سے پیدا ہوتا ہے، یہاں ایک سوال اٹھتا ہے، کیا وہ قدیم دھماکہ توانائی کا حامل تھا یا پوری کائنات مادے کی تمام توانائی سمیت بشمول تجاذبی کشش کی منفی توانائی کے صفر-توانائی کی حالت میں ہے؟

مسئلے کو سادہ حساب کتاب سے حل کیا جا سکتا ہے، فلکیات دان کہکشاؤں کی کمیتوں کی پیائش کر سکتے ہیں، ان کی اوسط مفارقت اور پس روی کی رفتار، ان اعداد کو ایک مساوات میں ڈال کر ایک مقدار حاصل ہوتی ہے جسے کچھ طبعیات دان کائنات کی مجموعی توانائی کے طور پر تعریف کرتے ہیں، قابلِ مشاہدہ درستگی میں جواب صفر آتا ہے، یہ حیرت انگیز نتیجہ ایک طویل عرصہ تک کائنات دانوں کے لیے معمہ بنا رہا، کچھ نے تجویز کیا کہ کوئی گہرا کائناتی اصول عمل پذیر ہے جس کے لیے کائنات کی مجموعی توانائی بالکل صفر ہونا ضروری ہے، اگر معاملات ایسے ہی ہیں تو کائنات کم مدافعت کا راستہ اپناتے ہوئے مادے یا توانائی کی کسی طرح کی ضرورت کے بغیر وجود میں آسکتی ہے.(پال ڈیویئس 1983:31-32)

اقتباس 9- ایڈورڈ ٹرائین:

طبیعات کے قوانین ویکیوم فلکچویشن کے پیمانہ پر کوئی حد نہیں لگاتے، تاہم دورانیے پر یقیناً حد لگائی جا سکتی ہے $\Delta E \Delta t \sim h$، مگر اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ ہماری کائنات صفر توانائی رکھتی ہے، جو کہ واقعتاً قرینِ قیاس ہے.(ٹرائین 1973:397)

اقتباس 10- وکٹر سٹینجر:

عمومی اضافیت میں، زمان و مکان مادے اور شعاع ریزی سے خالی ہو سکتے ہیں مگر پھر بھی اس میں توانائی ہو سکتی ہے جو اس کی خمیدگی یا انحناء میں ذخیرہ ہو گی، بے علت، اتفاقی یا رینڈم کوانٹم فلکچویشن ایک ہموار، خالی، بے خواص زمان و مکان مثبت یا منفی خمیدگی کے حامل مقامی خطے وجود میں لا سکتا ہے، اسے "زمانی مکانی جھاگ" کہا جاتا ہے جبکہ خطوں کو "باطل ویکیوم کے بلبلے" کہا جاتا ہے، جہاں کہیں بھی خمیدگی مثبت ہو گی باطل ویکیوم کا بلبلہ-آئن سٹائن کی مساوات کے عین مطابق-پھولنا شروع ہو جائے گا، 10^-42 سیکنڈ میں بلبلہ ایک پروٹون کے حجم کے برابر ہو جائے گا اور اس کے اندر کی توانائی کائنات کے تمام مادے کو بنانے کے لیے کافی ہو گی.

بلبلوں کا آغاز بغیر مادے، شعاع ریزی، یا خطوطِ قوت کے میدان اور زیادہ سے زیادہ ناکارگی کے ہو گا، ان میں توانائی ان کی خمیدگی میں ہو گی، اس طرح یہ ایک "باطل ویکیوم" ہو گا، جیسے ہی یہ پھیلیں گے، ان کے اندر کی توانائی صعودی طور پر بڑھنا

شروع ہو جائے گی، اس سے قانون بقائے توانائی کی خلاف ورزی نہیں ہوتی کیونکہ باطل ویکیوم منفی دباؤ رکھتا ہے (میرا یقین کریں، یہ سب اس مساوات کی پیروی میں ہو رہا ہے جو آئن سٹائن نے 1916ء میں لکھی تھی) چنانچہ پھیلتے بلبلے اپنے آپ پر کام کریں گے۔

جیسے ہی بلبلہ کائنات پھیلتی ہے، ایک طرح کی رگڑ وقوع پذیر ہوتی ہے جس سے توانائی پارٹیکلوں میں بدل جاتی ہے، پھر درجہ حرارت کم ہوتا ہے اور ایک بے ساختہ تشاکل توڑنے کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے جیسے مقناطیس میں جسے درجہ کوری Curie point کے نیچے تک ٹھنڈا کر دیا گیا ہو، اور پارٹیکلوں اور قوتوں کا بنیادی اتفاقی ڈھانچہ نمودار ہوتا ہے، پھلاؤ رک جاتا ہے اور ہم مزید شناسا بگ بینگ کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

نمودار ہونے والی قوتیں اور پارٹیکل زیادہ یا کم اتفاقی (رینڈم) ہوتے ہیں، اور صرف تشاکل کے اصولوں کے زیرِ انتظام ہوتے ہیں (جیسے توانائی یا مومینٹم کے تحفظ کے اصول) جو کہ کسی ڈیزائن کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ قطعی طور پر ڈیزائن کی غیر موجودگی کا نتیجہ ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ پارٹیکل اور طبیعات کی قوتیں کاربن پر مبنی زندگی کی پیداکاری کے لیے "ہموار" کی گئی ہیں جسے "انسانی اتفاقات" میں اس حقیقت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ زمان ومکان کی جھاگ لامتناہی ابھرتی کائناتیں رکھتی ہے جو کہ ہر ایک، ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہوا صرف یہ ہے کہ ہم ان میں سے ایک ایسی کائنات میں موجود ہیں جہاں قوتوں اور پارٹیکلوں نے اپنے آپ کو کاربن اور دیگر ایٹموں سمیت اس ضروری پیچیدگی کی تولید کے قابل بنالیا جو زندہ اور سوچنے کی صلاحیت رکھنے والے جانداروں کی نشو نما کے لیے ضروری ہے۔ (سٹینجر 1996)

اقتباس 11– ولیم کاؤ فمین:

کائنات میں سارا مادہ اور شعاع ریزی پہلی بار کہاں سے آئی؟ طبیعات دانوں کی حالیہ دلچسپ نظریاتی تحقیق جیسے ہارورڈ کے سٹیون وائن برگ اور ماسکو کے یاہی زیلڈووچ تجویز کرتی ہے کہ کائنات ایک پرفیکٹ ویکیوم کے طور پر شروع ہوئی اور یہ کہ مادی دنیا کے تمام پارٹیکل خلاء کے پھیلاؤ سے بنے...

بگ بینگ کے فوراً بعد کی کائنات پر غور کریں، خلاء دھماکے دار قوت سے شدت سے پھیل رہی ہے، ابھی تک جیسا کہ ہم نے دیکھا، تمام خلاء ورچوئل اور اینٹی ورچوئل پارٹیکلوں سے ابل رہی ہے، عام طور پر پارٹیکل اور اینٹی پارٹیکل کو وقت کے وقفے میں ایک ساتھ پیچھے جانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا... اتنا مختصر وقفہ کہ قانون بقائے مادہ کی اصولِ غیر یقینی سے تشفی ہو جاتی ہے، بگ بینگ کے دوران خلاء اس طرح تیزی سے پھیل رہا تھا کہ پارٹیکل تیزی سے اپنے متعلقہ اینٹی پارٹیکل سے دور کھینچے جا رہے تھے، اس طرح وہ دوبارہ یکجائی کے موقع سے محروم ہو گئے، یہ ورچوئل پارٹیکل حقیقی دنیا کے حقیقی پارٹیکل بن گئے، تاہم اس

مادہ سازی کے لیے توانائی کہاں سے آئی؟

یاد کریں کہ بگ بینگ بلیک ہول کے مرکز کی طرح تھا، چونکہ تجاذبی توانائی کی وسیع فراہمی اس کائناتی اکائی کے شدید تجاذب سے مشروط تھی، اس مصدر نے اتنی کافی توانائی فراہم کی کہ کائنات کو مکمل طور پر ان تمام قابلِ فہم پارٹیکلوں اور اینٹی پارٹیکلوں سے بھر دیا، چنانچہ پلانک وقت کے فوراً بعد، کائنات میں پارٹیکلوں اور اینٹی پارٹیکلوں کا سیلاب آگیا تھا جو خلاء کے شدید پھیلاؤ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے. کاؤفمین (1985:529-532)

اقتباس12– مارٹن بوجوالڈ:

ویلنکن کی سرنگ حالت کوانٹم میکانکس کے ایک اور اثر پر انحصار کرتی ہے، ایک بار پھر ویو فنکشن کی خصوصیات کا نتیجہ، ویو فنکشن بسا اوقات اپنی دموں کے ساتھ رکاوٹوں کو چھید سکتا ہے، حتی کہ اگر وہ مطابق کلاسیکی پارٹیکل سے کہیں بلند ہوں...

ویلنکن نے 1983 میں تجویز کیا کہ ہو سکتا ہے کائنات بذاتِ خود ایسے ہی کسی سرنگ عمل کاری سے ظہور پذیر ہوئی ہو، ہماری کائنات ایک راہنما ویو فنکشن کی دم ہو سکتی ہے جو کہ بگ بینگ اور اس کی اکائی کی رکاوٹوں کو چھید گئی ہو، مگر کائنات کی سرنگ اور اتنی مقدار میں ویو فنکشن کہاں سے آیا، سرنگ عمل کاری سے پہلے ہماری کائنات کی سرنگ کہاں سے آئی، ویلنکن کا واضح جواب ہے، پہلی بار لا شئے سے...

کوئی لا شئے سے سرنگ کاری کو مادی فہم میں لفظی معنوں میں لے سکتا ہے، اس سے قطع نظر ویلنکن کا مفروضہ کائنات کے ویو فنکشن کے اعتبار سے معقول ہے، اور یقینی اولین قدروں اور معدوم حُجم سمیت سرنگ حالت کا عطا کردہ ہے. (بوجوالڈ 2010: 222)

کائنات کی توانائی

اگر یورینئم کے ایک نیو کلیئس میں مقید توانائی کو دیکھا جائے یا کروڑوں سالوں سے سورج سے ابلتی توانائی پر نظر ڈالی جائے یا اس حقیقت کو مدِ نظر رکھا جائے کہ ہماری قابلِ مشاہدہ کائنات میں کوئی 10^80 پارٹیکل موجود ہیں تو ایسا لگتا ہے گویا کائنات کی مجموعی توانائی ناقابلِ بیان حد تک زیادہ ہوگی، مگر در حقیقت ایسا نہیں ہے، یہ صفر ہے.

روشنی، مادہ اور ضد مادہ وہ چیزیں ہیں جنہیں طبیعات دان "مثبت توانائی" کہتے ہیں اور یقیناً یہ کافی مقدار میں موجود ہیں تاہم بہت سے طبیعات دانوں کا خیال ہے کہ اسی تناسب میں "منفی توانائی" بھی موجود ہے جو کہ اس تجاذبی کشش میں پنہاں ہے جو کہ تمام مثبت توانائی کے پارٹیکلوں کے درمیان پائی جاتی ہے، یوں مثبت اور منفی متوازن ہو جاتے ہیں چنانچہ کائنات میں سرے سے کوئی توانائی دراصل ہے ہی نہیں.

سٹیفن ہاکنگ اپنی دستاویزی فلم "ہرچیز کا نظریہ" میں مثبت اور منفی توانائی کے تصور کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں: "ایک دوسرے کے قریب مادے کے دو ٹکڑوں میں ایک دوسرے سے دور ایسے ہی مادے کے دو ٹکڑوں کے مقابلے میں کم توانائی ہوتی ہے، کیونکہ آپ کو انہیں الگ کرنے کے لیے اس تجاذبی قوت کے خلاف جو انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہی ہے توانائی صرف کرنی پڑے گی، اس طرح سے تجاذبی میدان منفی توانائی رکھتا ہے، کائنات کی صورت میں جو کہ مکان میں تقریباً ہموار ہے، یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ یہ منفی تجاذبی توانائی مادے کی نمائندہ مثبت توانائی کی مکمل طور پر نفی کر دیتی ہے، چنانچہ کائنات کی مجموعی توانائی صفر ہے"۔

یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے کے طبیعات دان الیکسی فلیپینکو (Alexei Filippenko) اور ولیم کالج کے طبیعات دان جے پاساچوف (Jay Pasachoff) اپنے مشترکہ مقالے "کائنات لا شئے سے" میں تجاذب کی منفی توانائی کو یوں بیان کرتے ہیں: "اگر ہم کوئی بال گرائیں (جو کہ ساکن ہونے کی وجہ سے صفر توانائی کی حالت پر ہے) تو گرتے وقت یہ حرکت کی توانائی حاصل کرلے گی (حرکی توانائی–kinetic energy) مگر جیسے جیسے یہ زمین کے مرکز کے قریب ہوتی جائے گی یہ حصول مکمل طور پر (زمین کی) بڑی منفی تجاذبی توانائی سے متوازن ہو جائے گا اور اس طرح دونوں توانائیوں کا مجموع صفر رہے گا"۔
دوسرے لفظوں میں بال کی مثبت تونائی بڑھی، مگر عین اسی وقت منفی توانائی بھی زمین کے تجاذبی میدان میں شامل ہوگئی، وہ بال جو خلاء میں سکون کی حالت میں صفر توانائی پر تھی وہ بعد میں خلاء میں گرتی صفر توانائی کی حامل بال میں بدل گئی۔

کائنات کو مجموعی طور پر اس بال سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، بگ بینگ سے پہلے کائناتی بال حالتِ سکون میں تھی اور اب بگ بینگ کے بعد یہ گر رہی ہے، روشنی اور مادہ وجود میں آیا اور حرکت بھی کر رہا ہے مگر منفی توانائی کی وجہ سے جو پارٹیکلوں کے ذریعے تجاذبی میدان میں بنی، کائنات کی مجموعی توانائی صفر رہ جاتی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کار یہ (کائناتی) بال گرنا ہی کیوں شروع ہوئی... مساوی مثبت اور منفی حصوں سمیت کوئی چیز لا شئے سے کیسے آسکتی ہے؟

طبیعات دان کہتے ہیں کہ مساوی کمیتوں پر مشتمل یہ مثبت اور منفی توانائی اتفاقی (randomly) طور پر فلکچویٹ (fluctuated) کرتی ہوئی وجود میں آگئی، فلیپینکو اور پاساچوف کہتے ہیں کہ: "کوانٹم نظریہ خاص طور سے ہائیزن برگ کا اصولِ غیر یقینی طبعی وضاحت فراہم کرتا ہے کہ توانائی کس طرح لا شئے سے وجود میں آسکتی ہے، تمام کائنات کے پارٹیکل اور اینٹی پارٹیکل بے ساختہ حالت میں اور تیزی سے قانون بقائے توانائی کو توڑے بغیر ایک دوسرے کو باطل کر دیتے ہیں، ورچوئل

پارٹیکلوں کی اس بے ساختہ پیدائش اور موت کو "قدری تموج" یا "کوانٹم فلکچویشن" کہا جاتا ہے، لیبارٹری میں کئے گئے تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ در حقیقت کوانٹم فلکچویشن ہر جگہ اور ہر وقت ہوتی رہتی ہے".

کائنات دانوں نے "پھلاؤ" (inflation) کا ایک نظریہ وضع کیا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ کس طرح خلاء کے کسی ازحد دقیق حصے میں ورچوئل پارٹیکل کے جوڑے پھول کر ایک ایسی ضخیم کائنات بناتے ہیں جیسی کہ آج ہم دیکھتے ہیں، ایلن گتھ (Alan Guth) جو انفلیشن کاسمالوجی کے مرکزی دماغ ہیں کائنات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں: "انتہائی مفت لنچ – the ultimate free lunch".

ایک لیکچر میں کونیات دان سین کیرول (Sean Carroll) نے کائنات کے لیے توانائی کی ضرورت کو یوں بیان کیا کہ: "آپ کسی قسم کی توانائی کے بغیر ایک مضبوط اور خود پر منحصر کائنات بنا سکتے ہیں".

ارتقاء کے مخالفین کی علمی مصداقیت – ہارون یحیی بطور نمونہ

یہ کوئی نئی خبر نہیں ہے کہ جن تخلیقیوں کی ویب سائٹس سے انٹیلی جینٹ ڈیزائن اور نظریہ تخلیق کے حامی عام مسکین تخلیقیے اپنے موقف کی تائید کے لیے اقتباسات کاپی کر کر کے پیش کرتے ہیں جھوٹی ہوتی ہیں، یہ ویب سائٹس ارتقاء کے خلاف انشائی تقریری مضامین لکھ کر ان میں نامور علماء کے اقتباسات اس طرح سے موڑ توڑ کر پیش کرتی ہیں گویا یہ ان کے اعترافات ہوں تاکہ نظریہ ارتقاء کو غلط ثابت کیا جا سکے.. بعض اوقات ان ویب سائٹس کی جعل سازی اس قدر بھونڈی ہوتی ہے کہ بھانڈا پھوٹنے کے باوجود بھی یہ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش تک نہیں کرتے جو ہٹ دھرمی کی انتہاء ہے.. اس کی ایک بڑی مثال عدنان اوکطار کی ویب سائٹ ہے..

تاہم کروڑوں کا سوال یہ ہے کہ عدنان اوکطار المعروف ہارون یحیی اور اس جیسے دیگر مذہب پرست تخلیقیوں کی علمی حیثیت اور مصداقیت کیا ہے؟

ذرا سی گوگلنگ کرنے پر پتہ چلا کہ صاحب در حقیقت جامعہ میمار سنان سے فنون لطیفہ میں فارغ التحصیل ہیں.. اب بھلا حیاتیات اور ارتقاء کا فنونِ لطیفہ سے کیا تعلق؟ ہو سکتا ہے تخلیقیوں کی نظر میں ہو کہ یہ چاہیں تو مٹی کو بھی سونا ثابت کر سکتے ہیں.. 😀
بہر حال مزید تلاش کرنے پر پتہ چلا کہ صاحب 1986 میں 10 ماہ تک پاگل خانے میں رہ چکے ہیں..!! 1991 میں انہیں کوکین رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور طبی جانچ سے ان کے خون میں نشے کی کثیر مقدار پائی گئی، 1999 میں انہیں کئی سکینڈلوں کے تحت گرفتار کیا گیا جن میں دھمکیاں، جرائم پیشہ تنظیم کا قیام اور ترکی کی ماڈل ابرو سمسک Ebru Simsek کو ہراساں کرنا شامل ہے کیونکہ اس نے عدنان اوکطار کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے سے انکار کر دیا تھا، ترکی کی عدالتوں میں یہ کیس دو

سال تک چلتے رہے جس کے دوران زیادہ تر مدعیان نے دھمکیاں ملنے پر اپنے کیس واپس لے لیے اور یوں تخلیقیوں اور اسلام کے یہ ہیرو جیل سے آزاد ہوئے جبکہ اس کی تنظیم کے دیگر دو ساتھوں کو ایک ایک سال قید کی سزا سنائی گئی.. 2008 میں ترکی کے daily Cumhuriyet اخبار نے بتایا کہ عدنان اوکطار نے اپنی تنظیم کی خواتین ارکان کو امیر گھروں کے نوجوان سائنسدانوں کو جنس کی لالچ دے کر کچھ خصوصی محفلوں میں شرکت کرنے پر اکسایا، اخبار کے مطابق ایک خاتون کو زبردستی سولہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے پر مجبور کیا گیا، ان جنسی تعلقات کی فلمیں بنا کر عدنان اوکطار کے حوالے کی گئیں جنہیں تنظیم چھوڑنے کے خواہش مندوں کو دھمکانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، جرم ثابت ہونے پر عدالت نے اسی سال عدنان اوکطار اور اس کے دیگر 17 ساتھیوں کو تین سال قید کی سزا سنائی، عدنان اوکطار کی ذاتی سیکریٹری سے جب ان سب حرکتوں کے پیچھے کار فرما فلسفے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: "جنسي تعلقات قائم کرنا". (حوالہ 1-2)

اسلامی تخلیقیوں کا یہ فرشتہ صفت اور پاکباز نجات دہندہ اپنی کتاب "اطلسِ تخلیق" (Atlas of Creation) کو اپنی زندگی کی بہترین کتاب قرار دیتا ہے، اس کتاب میں اس نے بزعم خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ متحجرات یعنی فوسلز نظریہ تخلیق کی تائید کرتے ہیں کیونکہ یہ ان جاندار انواع سے بالکل مماثل ہیں جو اب زندہ ہیں، صاحب نے یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر

سکولوں، تحقیقی اداروں اور یورپی وامریکی جامعات کو مفت میں "زبردستی" ارسال کی اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کرایا، 2007 میں یہ کتاب فرانس میں اس بڑے پیمانے پر پھیلائی گئی کہ فرانسیسی وزارتِ تعلیم کو ایک بیان جاری کرنا پڑا جس میں کہا گیا کہ ہماری تعلیم ارتقاء پر مبنی ہے اور اس کتاب کی ہمارے ہاں کوئی جگہ نہیں.

یونیورسٹی آف مِنی سوٹا موریس میں حیاتیات کے پروفیسر مائرز اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں:

"The general pattern of the book is repetitious and predictable: the book shows a picture of a fossil and a photo of a living animal, and declares that they haven't changed a bit, therefore evolution is false. Over and over. It gets old fast, and it's usually wrong (they have changed!) and the photography, while lovely, is entirely stolen"

"کتاب کا عمومی انداز حسبِ توقع اور تکراری ہے: کتاب ایک متحجرہ اور ایک زندہ جانور کی تصویر دکھا کر یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ یہ ذرا بھی تبدیل نہیں ہوا چنانچہ ارتقاء غلط ہے، اس بات کو اتنا دہرایا جاتا ہے کہ بوریت ہونے لگتی ہے، جو کہ عموماً غلط ہے (وہ تبدیل ہوئے ہیں!) جبکہ وہ خوبصورت تصاویر مکمل طور پر چوری شدہ ہیں."

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کتاب میں جتنی بھی تصویریں ہیں ساری کی ساری انٹرنیٹ سے اٹھائی گئی ہیں خاص طور سے گراہم اون کی ویب سائٹ پر خصوصی شبِ خون مارا گیا ہے.. 😀

آکسفرڈ یونیورسٹی میں ارتقائی حیات اور ایتھالوجی کے پروفیسر رچرڈ ڈاکنز نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں جانداروں کی غلط زمرہ بندی کی گئی ہے اور مصنف کو سمندری سانپ اور برقی بام مچھلی میں فرق تک کا نہیں پتہ.. 😀

پروفیسر ہومر جیکبسن ایک 84 سالہ امریکی کیمیاء دان اور محقق ہیں جو بروکلین کالج نیویارک میں کیمیاء کے پروفیسر رہے ہیں اور اب بیس سال سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں، 2007 میں پروفیسر جیکبسن نے امریکن سائنٹسٹ میگزین کے چیف ایڈیٹر کو ایک خط لکھا اور 52 سال پہلے شائع ہونے والے اپنے ایک تحقیقی مقالے کے کچھ حصے واپس لینے کا مطالبہ کیا.. مگر کیوں؟

ہوا یہ کہ 1955 میں پروفیسر جیکبسن نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا: Information, Reproduction and the Origin of Life اس مقالے میں انہوں نے اربوں سال پہلے زمین پر امائنو ایسڈ کی خودکار افزائش پر بحث کی، امائنو ایسڈ پروٹینز کی بنیاد ہوتے ہیں اور اس طرح یہ زندگی کی بھی بنیاد ہیں، پروفیسر جیکبسن کا یہ مقالہ سٹینلی ملر کے مشہور تجربے جو 1953 میں کیا گیا تھا کے دو سال بعد شائع ہوا جس میں ملر بجلی کو پانی اور غیر نامیاتی مواد میں کیمیائی تعامل کے لیے توانائی کے طور

پر استعمال کرتے ہوئے نہ صرف امائنوایسڈ بلکہ دیگر نامیاتی اجسام بھی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا، پروفیسر جیکبسن سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ملر کے تجربے میں توانائی کے مصدر کو نظر انداز کر دیا اور کہا کہ ابتدائی زمین کے سمندروں میں امائنوایسڈ کی خودکار تشکیل ناممکن ہے.. اس وقت کسی نے بھی اس مقالے پر توجہ نہیں دی بلکہ خود پروفیسر جیکبسن بھی اسے بھول گئے تھے مگر ایک اتفاق نے انہیں اس کی یاد دلا دی جب انہوں نے اپنا نام گوگل میں ڈال کر سرچ کیا اور 52 سال بعد انہیں اپنی غلطی پر پچھتانا پڑا..

گوگل کے پہلے دس نتائج میں ذیل کے روابط شامل تھے:

http://www.darwinismrefuted.com

http://www.evolution-facts.org

یہ ویب سائٹس تخلیقیوں کی ہیں جو نظریہ ارتقاء کو غلط قرار دیتی ہیں، DarwinismRefuted.com نامی ویب سائٹ نے جو عدنان اوکطار کی ملکیت ہے پروفیسر جیکبسن کے اُس مقالے کا ایک اقتباس نظریہ ارتقاء کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان کے اعتراف کے طور پر پیش کیا کہ زندگی کے لیے درکار اجزاء خودکار طور پر پیدا نہیں ہو سکتے:

“Directions for the reproduction of plans, for energy and the extraction of parts from the current environment, for the growth sequence, and for the effector mechanism translating instructions into growth-all had to be simultaneously present at that moment [when life began]. This combination of events has seemed an incredibly unlikely happenstance”

اپنے کام کو ارتقاء کے خلاف استعمال ہوتے ہوئے دیکھ کر انہیں شدید صدمہ پہنچا مگر یہ تو صرف آغاز تھا، جب انہوں نے اپنے اصل مقالے سے رجوع کیا تو انہیں پتہ چلا کہ ہارون یحیی کے صفحہ پر ان کی بات کا جو اقتباس درج ہے اسے موڑ توڑ کر پیش کیا گیا ہے، جب انہوں نے علم کے نام پر یہ جعلسازی دیکھی تو اپنے مقالے کا وہ حصہ واپس لینے کا فیصلہ کیا اور سائنٹفک امریکن کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر اعتراف کیا کہ انہوں نے جو لکھا تھا وہ غلط تھا چنانچہ 1955 میں لکھے گئے ان کے مقالے کے وہ غلط حصے منسوخ کر دیے جائیں، علمی حلقوں نے پروفیسر جیکبسن کے اس اقدام کی تعریف کی.. آخر حقیقی عالم اور جعلی عالم میں کوئی تو فرق ہے..!؟

پروفیسر جیکبسن کے مقالے کے اقتباسات اب بھی ہارون یحیی کی ان دونوں ویب سائٹس پر ذیل کے صفحات پر موجود ہیں:

http://www.darwinismrefuted.com/20questions01.html

http://www.harunyahya.com/de/kollaps02.php

اور چونکہ اردو کی سب سے بڑی علمی جعلسازی پر مبنی ویب سائٹ قرآنک سائنس کا ارتقاء کے خلاف لکھا گیا یہ مضمون – جیسا کہ مضمون کے آخر میں حوالہ دیا گیا ہے – ہارون یحیی کی ویب سائٹ سے استفادہ کرکے لکھا گیا ہے لہذا یہ جعلسازی یہاں بھی موجود ہے بلکہ مضحکہ خیز حد تک جاتے ہوئے نہ صرف پروفیسر جیکبسن کو کیمیاء (chemistry) کی بجائے خرد حیاتیات (Microbiology) کا ماہر قرار دیا گیا ہے اور ان کے بیان کی گردن مزید مروڑتے ہوئے اس میں خدائی مداخلت بھی داخل کردی ہے بلکہ انتہائی بھونڈے طریقے سے پروفیسر جیکبسن کے بیان کو نوبل انعام یافتہ علماء جیمس واٹسن اور فرانسس کریک کی ڈی این اے کی ساخت کی دریافت کے پس منظر سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے:

"خرد حیاتیات (Microbiology) کے امریکی ماہر جیکب سن اس کیفیت پر کچھ یوں تبصرہ کرتے ہیں: "نسل خیزی، دستیاب ماحول سے توانائی اور (درکار) اجزاء کا حصول، سلسلوں کی افزائش، اور احکامات کو افزائش میں بدلنے والے اثر پذیر نظام کے لئے ساری اور مکمل ہدایات کو اُس وقت (جب زندگی کی ابتداء ہوئی) ایک ساتھ موجود ہونا چاہئے تھا۔ ان واقعات کا بیک وقت وقوع پذیر ہونا اس قدر ناممکن ہے کہ ہماری سمجھ سے ماوراء ہے، اور اکثر کسی خدائی مداخلت کا مرہونِ منت ہی سمجھا جاسکتا ہے"۔ مذکورہ بالا عبارت، ڈی این اے کی ساخت دریافت ہونے کے صرف دو سال بعد تحریر کی گئی تھی"

یہ تھی عدنان اوکطار المعروف ہارون یحیی کی علمی اور اخلاقی حیثیت جس سے ارتقاء کے خلاف لکھے گئے اس کے اور اس جیسے دیگر تخلیقیوں کے انشائی مضامین اور کتابوں کی تحقیقی اور علمی مصداقیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے.

تنقیدو تاریخ

غلامی – ایک پیدائشی جرم

غلاموں کی تاریک کوٹھڑیوں میں جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کا مالک خدا نہیں ہوتا تھا؟ ان غلام بچوں کی پیدائش پر ان کے غلام ماں باپ کو خوشی ہوتی تھی؟ میں اس بات کا ادراک نہیں کرسکتا، باپ غلام، ماں غلام، بہن بھائی غلام، جانے کب مالک کا دل

آئے تو ان میں سے کسی کو کسی نئے مالک کے ہاتھ بیچ دے اور اس غلام خاندان کا شیرازہ بکھر جائے، کب کسی مندر کی قربان گاہ پر وہ بچہ قربان کر دیا جائے یا مالک کی قبر میں زندہ دفن کر دیا جائے، کوئی کام کرتے ہوئے مر جائے، کوئی بیماری سے مر جائے، عمر سے پہلے لڑکیوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہو جائے، لڑکوں کو نامرد بنا دیا جائے، ایک غلام یا لونڈی کے ساتھ کیا کیا ہوتا تھا یہ سوچ کر ہی میری روح کانپ جاتی ہے۔

جب ماؤں سے ان کے لختِ جگر چھینے جاتے ہوں گے، جب مالک کو آنکھ دکھانے پر کوئی نوجوان غلام جان سے جاتا ہو گا، جب شوہر کے سامنے اس کی بیوی اور باپ کے سامنے اس کی بیٹی بے آبرو ہوتی ہو گی، اس بے بسی کے عالم کا تصور بھی ناممکن ہے۔ بوڑھے ماں باپ کا بوجھ دنیا نہیں اٹھاتی، عمر رسیدہ غلاموں کے ساتھ کیا ہوتا ہو گا؟

غلاموں کو دی جانے والی سزائیں حضرت مسیح کی سولی سے سنگین تر، غلاموں پر ٹوٹنے والی آفتیں فرعون اور مصر پر ٹوٹنے والی دس آفتوں سے کہیں گراں، حضرت امام حسین پر ٹوٹنے والے مظالم ان کی زندگی کا روزمرہ معمول، فاقہ کشی، کال اور بُھک مری روز کا کاروبار، غلاموں پر ہونے والے مظالم بیان کرنے کے لئے نا تو میرے پاس الفاظ ہیں اور نا ہی مثال۔

غلامی کے معاملے میں مذہب ہمیشہ سے خاموش تماشائی بنا رہا، خدا نے عاد و ثمود کو تو ان کے گناہوں کے باعث نیست و نابود کیا، کاش ایسی کوئی سنگین سزا غلامی کے لئے بھی کسی شہر پر نازل کر دیتا، شریعتِ موسوی سے لے کر شریعت محمدی تک غلامی کو ترک کرنے کے بارے میں کوئی حکم صادر نہیں کیا گیا، غلاموں کے بارے میں مذہبی کتب کے اوراق سفید ہیں، دنیا کے وہ مذاہب جو ہماری نظر میں بت پرستانہ اور گناہ پر مبنی ہیں اور وہ مذاہب جو الہامی ہیں غلامی کے معاملے میں ایک جیسی چپ سادھے بیٹھے رہے، غلامی پر بات کرنے سے آنکھ چراتے رہے، عصر حاضر میں معاش اور توانائی کا دارومدار تیل کمپنیوں پر ہے، حکومتیں اور مذاہب ان کے سامنے سر تسلیم خم ہیں اسی طرح ماضی کی دنیا اور اس کا معاشی دارومدار غلامی اور اس سے حاصل ہونے والے دولت و توانائی پر تھا۔ اس لئے کوئی مذہب اس کے خلاف نہیں بولا۔

غلامی کی لعنت کے خلاف اگر آواز اٹھانے کا سعادت حاصل بھی ہوئی تو ایک کافر، مرتد، لادین ابراہام لنکن کے حصے میں۔ غلامی کے خلاف امریکا میں پرزور تحریک ابراہام لنکن نے چلائی، انہوں نے غلامی کو امریکا سے جڑ سے اکھاڑ پھینکا، اور حقیقتاً ان کو ہی غلامی کے خلاف کھڑے ہونے والے "شہید اعظم" کا درجہ نصیب ہوا، ایک ایسا درجہ جو کہ اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء اور پیغمبروں کو بھی حاصل نہ ہو سکا، اس لحاظ سے دکھی انسانیت پر ابراہام لنکن کا احسان عظیم ترین ہے، کیونکہ پیغمبروں اور نبیوں نے کسی حد تک غلاموں سے متعلق قوانین اور ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک تو بیان کیا مگر کبھی بھی غلامی کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش نہ کی۔ کئی مذاہب کے پیروکار بڑے فخر سے اپنے مذہب میں غلاموں سے رحم سے پیش آنے کے حکم کا ذکر کرتے ہیں، غلاموں کو دیئے جانے والے حقوق کا راگ الاپتے ہیں، مگر یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ غلام سے لاکھ نرمی برتیں اس کو

لاکھ حقوق دیں جب تک آزادی کا حق نہ دیا تب تک اس کی ذات پر کوئی احسان نہیں کیا، کیونکہ آپ ایک انسان کو سب کچھ بھی دے دیں اور خود اپنی ذات کے مالکانہ حقوق نہ دیں تو سب خاک ہے۔ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے باقی تمام ہی حقوق کی بات آزادی حاصل کرنے کے بعد آتی ہے، جس کو آپ بیچ یا خرید سکتے ہیں وہ انسان نہیں بلکہ ایک ملکیت ہوتا ہے، اور کسی بھی خریدی ہوئی شے کا کوئی حق نہیں ہوتا اس کی ایک قیمت ہوتی ہے، چیز اچھی حالت میں ہو تو اچھی قیمت بری میں تو کم قیمت، اور جو جتنی قیمت ادا کرتا ہے اس سے اتنا ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔

جیسے آج مشینوں کے کوئی حقوق نہیں ہیں اسی طرح غلاموں کے کوئی حقوق نہیں تھے، مشینوں کو تیل دیا جاتا ہے، آرام دیا جاتا ہے کہ کل صبح صحیح طرح سے کام کر سکیں، اگر خراب ہو جائیں تو کاٹھ کباڑ میں بیچ دیا جاتا ہے، لوہے کی بھٹی میں پگھلا دیا جاتا ہے، اور کوئی ان کے نیست ہونے پر آنسو نہیں بہاتا۔ غلاموں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا تھا، مگر ان میں مشینوں جتنی برداشت نہیں تھی، روتے بھی تھے، خدا سے التجائیں دعائیں بھی مانگتے تھے، مگر خدا بھی انہیں کوئی مشین ہی سمجھتا تھا؟ خدا نے گناہ سے رہائی اور نجات کی تو بہت باتیں کیں مگر غلامی سے نجات کی کوئی خاص بات نہیں کی، غلاموں کو پیدا کرنے والے خدا نے غلامی کی مد میں ہر گناہ پر چپ سادھے رکھی۔ شائد غلامی کسی پیدائشی جرم کی سزا تھی، جو موت تک پیچھا نہیں چھوڑتی تھی، شائد جہنم کے بدلے وہ مظلوم انسان دنیا میں آ گئے تھے۔

غلام کی کوئی مرضی نہیں،

نام، عزت، ملکیت، گھر، مذہب، لباس نہیں،

پہچان، محبت، ایمان، امید نہیں،

وطن اور سوچ نہیں، نہ اس کا حسن اپنا نہ وجود اپنا،

نہ ہنسی اپنی نہ خوشی اپنی،

بے بس دعائیں اور بے کس التجائیں،

اور کوئی ہے تو بس اِک گونگا، بہرا خدا جو ان کی ہر ایک التجاء سے بے فکر غلاموں کے نیک آقاؤں پر اپنی برکات کے آسمانی چھپر پھاڑ تا رہا تا کہ روتے دھوتے غلاموں پر قہر فراوانی سے نازل ہوتا رہے۔

"غزوۂ پشاور اسکول" اور بنیاد پرست

میرے کسی "خیر خواہ" نے مجھے اس بلاگ کا لنک اس امید پر فراہم کیا کہ دہشت گردی سے متعلق میرا مؤقف سراسر اسلام، جہاد، مولویوں اور دینی مدارس سے تعصب پر مبنی ہے اور اس بلاگ کی شکل میں شائد مجھے "آئینہ" نظر آ جائے اور میں اپنے مؤقف پر نادم اور شرمندہ ہو کر اس سے رجوع کر لوں، اور اسلام کو امن و شانتی کا علمبردار، جہاد کو اللہ کی زمین سے فساد کے

خاتمے کاذریعہ،مولویوں کوامن کاسفیراوردینی مدارس کوجہالت کے منبع کے بجائے امن،شانتی،محبت،رواداری،برداشت اور سلوک کے کارخانے سمجھنے لگ جاؤں۔بلاگ لکھنے والے صاحب جن کانام تومجھے معلوم نہیں،انہوں نے اپنے لئے اپنا قلمی نام "بنیادپرست" چناہے۔اردوبلاگنگ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس نام سے یقیناًمانوس ہوں گے۔لیکن مجھے ان کابلاگ پڑھنے کی سعادت پہلی بار نصیب ہوئی۔

موصوف ظالم بلاگر کومیں نے ابتدائی کلمات میں "معذرت خواہ مسلمان"اس لئے قرار دیاہے کہ انہوں اپنے اس خاص الخاص بلاگ کے ذریعے "غزوۂ پشاور اسکول" کے کرتادھرتا سرفروش مجاہدین کی عظیم جہادی معرکہ پرپانی پھیرنے کی کوشش سر انجام دی ہے،وہ مقدس جہاد کہ جب فریضہ جہاد کی اولین آیت (۳۹:۲۲) نازل ہوئی تواس ایک آیت نے مکّی دور کی ان بیسیوں آیات کوبیک جنبش قلم منسوخ کردیاتھاجن میں کسی قدررواداری اوربرداشت کاسبق موجودتھا۔انہی منسوخ شدہ آیات کوآج انہی کی طرح کے معذرت خواہ مسلمان اسلام کوامن وشانتی،رواداری اوربرداشت کادین ثابت کرنے کیلئے بڑھ چڑھ کرپیش کرتے ہیں۔

میں شائد الفاظ کے سحر میں مسحور ہوکر،عبارت کی سلاست وبلاغت میں مبہوت ہوکر،بڑے مدلّل ومفصّل طرزاستدلال سے متاثر ہوکر اس عظیم بلاگر کے پیش کردہ دلائل سے قائل ہوجاتا۔لیکن شامتِ اعمال میں مذکورہ بلاگ پڑھنے سے قبل ہی مجاہدین اسلام کی ترجمان ویب سائٹ "منتدیات باب الاسلام" پرموجود ایک طویل انٹرویو پڑھ چکاتھاجس میں ایک عظیم جہادی لیڈر دولت اسلامیہ کے انصار عالم دین شیخ ابومقاتل المہاجر اپنے "اعترافیہ بیان" میں ناصرف "غزوۂ پشاور اسکول" کی تمام تر ذمہ داری قبول کرتے ہیں بلکہ اپنے اس انٹرویومیں جابجاقرآنی آیات،احادیث نبویہ اوربہت سے علماء کرام کی جہادی تصنیفات کے مکمل حوالہ جات کے ذریعے "غزوۂ پشاور اسکول" کوعین معرکۂ کفرواسلام اورمعرکۂ حق وباطل قراردیتے ہیں۔"منتدیات باب الاسلام" نامی ویب سائٹ پاکستان کے مرتد حکام،مرتدفوج اوریہودوہنود کی ریشہ دوانیوں کے سبب بلاک ہے،اپنے ممدوح بلاگر سے گذارش ہے کہ وہ براہ کرم اس مکمل انٹرویوکوملاحظہ کرنے کیلئے اس ویب سائٹ کوکسی پراکسی کے ذریعے بالکل اسی طرح کھول کرضرورملاحظہ فرمالیں جس طرح وہ کسی پراکسی کے ذریعے یوٹیوب سے استفادے کیلئے کسی پراکسی کے ذریعے یوٹیوب کھولتے ہوں گے،بعدازاں پراکسی سے ممنوعہ سائٹ کھل جانے کاتمام ترثواب مجاہدینِ ملّت اوریاجان مقبول اورانصار عباسی صاحبان کوہدیہ کرنانابھولئے گا۔شائدیہ انٹرویوپڑھنے کے بعد آپ کواپنے اس سوال کاجواب مل جائے کہ:"سانحہ پشاورپرکون ہے جسے افسوس نہیں ہواہوگا ؟ آپ توسانحہ پشاورپرغم نہ کرنے والوں کوڈھونڈرہے تھے یہاں توقہرخداکاسانحہ پشاورپرباقاعدہ بغلیں بجانے والے تک موجودہیں۔

بقیہ قارئین اس انٹرویو کو ملاحظہ کرنے کیلئے اس انٹرویو کی پی ڈی ایف فائل اس لنک سے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ کمزور دل قارئین جو دھواں دھار دلائل کی مار سہنے کے قابل نہ ہوں اور کاہل طبع قارئین کیلئے جو اس طویل ترین انٹرویو کو مکمل پڑھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے ان کی سہولت کیلئے میں اس انٹرویو کے چیدہ چیدہ اقتباسات یہاں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

☆– امارت اسلامیہ افغانستان اور القاعدۃ برصغیر دونوں سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے پروپیگنڈہ کی شدت کو دیکھتے ہوئے جلد بازی میں تحریک طالبان پاکستان کا موقف جانے بغیر صرف دشمن کے دجالی میڈیا کی خبروں کو سنتے ہی اپنے امیج بہتر بنانے اور رائے عامہ میں مقبولیت پانے کی خاطر مذمتی بیان جاری کیا۔ حالانکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں حکم دیا ہے :

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو تم اس کی تحقیق کرو" (الحجرات :6)

☆– اسلام میں کافروں و مرتدین کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا سات سے زائد حالتوں میں جائز ہیں، آپ ان کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بلاد حرمین کے مجاہد عالم دین شیخ ابو یوسف العییری رحمہ اللہ کی کتاب "حقیقۃ الحرب الصلیبیۃ الجدیدۃ (نئ صلیبی جنگ کی حقیقت)" میں تفصیل کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔

☆– اس کے علاوہ اگر دشمن تک پہنچنا ممکن ہو اور دشمن نے عام شہریوں یا مسلمانوں کو آبادی والے علاقوں میں ڈھال بنا رکھا ہو تو ایسی حالت میں اگر مجاہدین کے پاس مسلمانوں کو شہید کیے بغیر دشمن تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو ایسی صورت میں اسلام ان مسلمانوں کو شہید کر کے دشمن کو مردار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں اور فقہ و جہاد کی کتابوں میں اس کے احکام بیان کرنے والے ابواب "التترس والاغارۃ" کے نام سے موجود ہیں۔ پشاور آرمی سکول و کالج جیسی کارروائیوں کی شرعی حیثیت بھی انہی ابواب میں تفصیل کے ساتھ فقہائے امت بیان کر چکے ہیں اور اس پر موجودہ دور کے جید علمائے جہاد نے مفصل کتابیں لکھ کر دشمن کو ہلاک کرنے والی اس طرح کی "التترس" والی کارروائیوں کو اور کفار و مرتدین کی آبادیوں پر عام تباہی پھیلانے والی جنگ مسلط کرنے کو جائز قرار دیا ہے کہ جن میں بیگناہ بھی جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ اس پر سب سے تفصیلی کتاب جہادی عالم دین فضیلۃ الشیخ ابو عمر محمد بن ابراہیم النفیعی حفظہ اللہ نے لکھی ہے، جس کا نام ہے : "الکتاب القیم شبھات و ردود داخي المتراجع احذر ماذا خلفك! التترس والاختلاط مع الكفار"۔ اس کے علاوہ دولت خلافت اسلامیہ کے عالم دین شیخ ابو بکر الاثری حفظہ اللہ نے "مسائل في التترس والاغارۃ" کے نام سے لکھی ہے۔ القاعدۃ کے مجاہد عالم دین شیخ ابو یحیی اللیبی رحمہ اللہ نے بھی "التترس في الجهاد المعاصر" کے نام سے عمدہ کتاب لکھی ہے۔ القاعدۃ کے افغانستان ہی میں موجود ایک مجاہد عالم دین شیخ عبدالمجید عبدالماجد نے "احکام الغارات الفدائیۃ والتترس" لکھی ہے۔ بلاد حرمین کے مجاہد اسیر عالم دین شیخ فارس آل شویل الزهرانی فک اللہ اسرہ نے "نصوص الفقهاء حول أحكام الغارة والتترس" نامی کتاب لکھی ہے۔

☆- پس پشاور آرمی سکول جیسی کارروائیاں کرنااور دشمن کے بالغ بچوں کو مارنا یا مسلمانوں کے ساتھ موجود کافروں کو یا شیعہ ومرتدین کی آبادی والے علاقے کو کار بم دھماکوں اور شہیدی حملوں سے نشانہ بنانا شرعی لحاظ سے مکمل طور پر درست ہے اور اس پر کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہیں۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہے تو وہ جا کر ان کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے اشکالات واعتراضات کا ازالہ کر سکتا ہے۔ (یہ آخری جملہ شائد خاص الخاص عالمِ اسلام کے مایہ ناز بلا گر شیخ بنیاد پرست کیلئے ہی خصوصًا کہا گیا ہے)

☆- اب وہ معصوم چھوٹے بچے جو اس کارروائی میں جاں بحق ہوئے ہیں، وہ مرتد فوجیوں اور طلباء کے نجی سیکورٹی گارڈز کی طرف سے حملہ آور مجاہدین کی طرف چلائی جانے والی گولیوں کا نشانہ بنے یا پھر حملے کے بعد فوجیوں نے خود ہی چھوٹے بچوں کی کلاسوں میں داخل ہو کر ان بچوں کو قتل کیا تا کہ وہ مجاہدین کو اسی طرح بدنام کر سکے، جس طرح وہ پبلک مقامات اور بازاروں میں بم دھماکے کر کے بدنام کرتے ہیں۔

☆- میڈیا اور مرتدین کے ایجنٹوں نے حملے میں مجاہدین کے ہاتھوں مارے جانے والے اٹھارہ اور پچیس سال کے لڑکوں کو بچے قرار دے کر پروپیگنڈہ کیا حالانکہ اسلام میں جس بچے کی داڑھی یا مونچھ کے بال اگنا شروع ہو جائے یا بلوغت کے (زیر ناف) بال جسم میں اگنا شروع ہو جائے تو وہ بالغ لڑکا کہلاتا ہے اور رسول اللہ نے بنو قریظہ کے ان تمام بچوں کو قتل کیا تھا جن کے زیر ناف بال آچکے تھے کیونکہ وہ بالغ ہو گئے تھے۔

☆- دوسری بات صلیبی امریکہ اور مرتد ناپاک آرمی کی حمایت کرنے والے لیڈروں ور ہنماؤں کی تنظیموں کو نشانہ بنانا درست ہونے کے دلائل قرآن وسنت میں بے تحاشا ہیں۔ یہاں صرف چند ایک کی طرف اشارہ کرتا ہوں: "رسول اللہ سے کیا گیا معاہدہ بنی بکر بن وائل یا قریش کے سرداروں نے توڑا لیکن آپ قریش کے جنگجوؤں سے لڑتے تھے۔ بنو قریظہ کے بڑوں اور اہل رائے لوگوں نے معاہدہ توڑا تو آپ نے صرف ان کے خلاف قتال نہیں کیا بلکہ پورے بنو قریظہ کے مردوں، بوڑھوں، مزدوروں اور زیر ناف اگنے والے بالوں کے حامل لڑکوں پر مشتمل 700 جانوں کو قتل کیا اور باقیوں کو قیدی بنالیا۔ حالانکہ ان سب نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ ان کا تعلق ایسی قوم وبرادری سے تھا جس کے بڑوں نے رسول کے خلاف عہد شکنی کی تھی۔

☆- اب پاکستان میں نظام خلافت قائم نہیں ہوا اور نہ ہی یہاں سے شرک وکفر کے نظام کی حکمرانی ختم اور اقوام متحدہ وامریکی صلیبیوں کے مفادات کے رکھوالی مرتد فورسز کا صفایا ہوا ہے تو پھر کس طرح یہاں جہاد کو ادھورا چھوڑ کر کشمیر یا کہیں اور جایا جاسکتا ہے۔

میرے ممدوح بلاگر اس قدر خوش فہم ہیں کہ بیان سے باہر ہے، مثلاً ان کی یہی خوش فہمی ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں:

"یہ سوال اٹھانے والے شاید یہ نہیں جانتے کہ پہلے دن سے جب سے یہ مسائل پیش آئے علماء کی جانب سے حکومت کی غلط

پالیسیوں پر مثبت تنقید کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں بڑا واضح موقف اختیار کیا گیا کہ پاکستان میں مسلح جدوجہد ناجائز ہے، قرآن وحدیث میں اس کی اجازت نہیں ہے"۔

میرے ممدوح بنیاد پرست سے زیادہ بڑے بنیاد پرست شیخ ابو مقاتل المہاجر ایک سوال کے جواب میں ان کی یہ ساری خوش فہمی ہی دور کر دیتے ہیں، سوال اور اس کا جواب ملاحظہ کیجئے:

انس: کیا مرتدین کے خلاف جہاد کو مؤخر نہیں کیا جا سکتا؟ پاکستانی آئین میں اسلامی شقیں بھی موجود ہیں تو ظاہری طور پر یہی تاثر ہے کہ پاکستانی آئین اسلامی ہے۔ بس صرف معاملہ ان اسلامی آئین کو نافذ العمل بنانے کا ہے۔ حکمران مکمل طور پر اسلام کے منکر نہیں ہیں اور وہ اسلام کا نام بھی لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے خلاف جہاد چھوڑ کر امریکہ و اسرائیل اور بھارت کے خلاف جہاد کیا جائے جب یہ کفری طاقتیں تباہ ہو جائے گی تو پاکستان سمیت تمام عالم اسلام آزاد ہو جائے گا اور پھر ان حکمرانوں کے لیے بھی امریکی غلامی سے نکلنے کے بعد اسلام کے تمام احکام پر عمل کرنا آسان ہو گا؟

شیخ ابو مقاتل: پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستانی آئین اسلامی نہیں ہے اور آئین میں جو اسلامی شقیں ہیں، وہ سب سیکولر شقوں کے ماتحت ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔ پاکستانی آئین میں موجود کفر کو تفصیل کے ساتھ جاننے کے لیے شیخ ایمن الظواہری حفظہ اللہ کی کتاب "الصبح والقندیل (سپیدہ سحر اور ٹمٹماتا ہوا چراغ)" کا مطالعہ کریں، جس میں انہوں نے اس پورے پاکستانی آئین کا پوسٹ مارٹم کیا ہے اور اس کے کفر کو نمایاں کیا ہے۔ یاد رکھیں! اسلام کے چند احکامات کو لینے سے کوئی آئین اسلامی نہیں ہو جاتا ہے بلکہ اسلامی آئین وہ ہوتا ہے جو مکمل طور پر سو فیصد اسلام کی تعلیمات سے ٹکراتا نہ ہو اور نہ ہی اس کی مخالفت کرتا ہو۔ اسی طرح آئین میں بالادستی صرف اللہ کے کلمہ (اسلام) کی ہو اور جتنے بھی شقیں مرتب کی جائیں، وہ سب کی سب اسلام کے ماتحت ہوں اور اسلام کا حکم ان پر لاگو ہو۔ یہ نہیں کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو ان سے مستثنیٰ قرار دے کر انہیں آئین میں شامل کیا جائے، جیسا کہ پاکستانی آئین میں ہے۔ رہا حکمرانوں کا ظاہری طور پر مسلمان ہونے کا معاملہ تو اس بارے میں عرض ہے کہ اسلام میں منافقت اور دوغلے پن کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح آدھا اسلام لینے اور کفر کے چند احکام کو لینے والے کو بھی مسلمان نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ دین اسلام کی پیروی کرنے والا کہلائے گا۔ اس لیے جو کوئی بھی اسلام سے خارج کر دینے والے نواقض اسلام میں سے کسی بھی عمل کا ارتکاب کرے گا تو پھر اس کا اسلام اسی طرح ٹوٹ جائے گا جس طرح کسی کا وضو گیس یا پیشاب سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح تمام علمائے امت کا متفقہ طور پر اس بات پر اجماع ہے کہ "اگر کوئی بھی حکومت صرف ایک قانون بھی غیر اسلامی بنائے تو وہ پوری حکومت غیر اسلامی ہو جاتی ہے اور اس کے خلاف قتال اس وقت تک کرتے رہنا واجب ہے جب تک کہ وہ اس سے رجوع نہیں کر لیتی۔" اس طرح پاکستانی حکومت

ایک مرتد حکومت ہے اور اس حکومت کو اسلامی حکومت بنانے اور جمہوری نظام کو ڈھا کر خلافت کا نظام لانے تک اس کے خلاف جہاد کرنا تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔

ایک مقام پر ہمارے ممدوح عظیم بلاگر صاحب لکھتے ہیں:

"اس بات کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسائل جن کا اس وقت ہم سب لوگ شکار ہیں ان کی مدت زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سال ہے اور مدارس اس خطے میں سوڈیڑھ سو سالوں سے موجود ہیں۔ اگر یہ مدارس کی پیداوار ہوتے تو پہلے بھی یہ مسائل پیش آتے۔ لیکن آج سے بیس سال پہلے تک ایسی کوئی بات اس خطے میں نہیں دیکھی گئی"۔

جس بات کو موصوف نے دلیل کہہ کر بیان کیا ہے وہ دراصل دلیل نہیں بلکہ سراسر ایک دعویٰ ہے، کیونکہ دلیل میں ثبوت موجود ہوتا ہے اور اگر دلیل ثبوت سے خالی ہو تو وہ بھی محض دعویٰ ہی کہلائے گی۔ یہ کہنا کہ جن مسائل کا ہم سب لوگ شکار ہیں ان کی مدت زیادہ سے زیادہ "پندرہ بیس سال" ہے، اب اس دعوے کو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ موصوف دینی مدارس سے دہشت گردی کا داغ دھونے کیلئے حد سے زیادہ اپنی لاعلمی کا ثبوت دے رہے ہیں، پاکستان میں دینی مدارس کے ذریعہ دہشت گردی کا آغاز دسمبر ۱۹۷۹ء کو افغانستان کی جنگ کے کچھ عرصہ بعد ہی شروع ہو گیا تھا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں بتدریج اضافہ ہوا ہے، دینی مدارس سے طلباء کی کھیپ افغان جنگ میں شرکت کیلئے جانا شروع ہوئی، اور پاکستان میں جہادی تنظیمیں پھوٹنا شروع ہوئیں، افغان سرحد سے منسلک پاکستانی علاقوں میں ٹریننگ کیمپس بنائے گئے، بعد ازاں انہی جہادی تنظیموں سے پاکستان کی شدت پسند فرقہ پرست تنظیموں نے بھی جہادی (دہشت گردی) کی تربیت حاصل کی اور پاکستان کو فرقہ واریت کی ایسی جنگ میں جھونک دیا کہ اس فرقہ پرستی کی لعنت سے جان چھڑانا اب ناممکن نظر آتا ہے۔

موصوف بلاگر پاکستان بھر میں علماء کرام کے ذریعہ پھیلی ہوئی فرقہ واریت، مذہبی منافرت اور انتشار، کو دیکھنے کے باوجود اس پر پردہ ڈالنے کیلئے یا پھر اس سے صرف نظر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نا حکومتی لیول پر پالیسی بناتے وقت ان (علماء) کو کوئی ویلیو دی جاتی ہے اور نا میڈیا عام حالات میں ان کی کسی اچھی رائے، تجویز، بات کو شائع کرنا گوارا کرتا ہے۔ ہر دفعہ ایسے مسائل پر مشورے کے لیے آل پارٹیز کانفرنس بلائی جاتی ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پورے ملک سے علماء کو بھی جمع کیا گیا ہو اور ان سے ان کی رائے لی گئی ہو کہ آپ کے خیال میں اس کا حل کیا ہے؟"

اس بارے میں میرا تو سیدھا جواب یہی کہ جس عطار کے سبب بیمار ہوا جائے اسی کے لونڈے سے دوا نہیں لی جاتی، ملک کے حالات کی خرابی میں انہی علماء کا بہت بڑا عمل دخل ہے، جنہوں نے اپنے بچوں تو اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرون ملک روانہ کیا اور قوم کے

بچوں کو ۷۲ حوروں کے لالچ میں جہاد کے نام پر دہشت گردی کی تربیت کیلئے افغانستان روانہ کیا۔ بعد ازاں قوم کے انہی بچوں کو اپنے ملک میں بھی شریعت کے نفاذ کا شوق چرایا اور اس کیلئے مسلّحہ جدّوجہد کا آغاز بھی کر دیا۔ صوفی محمد اور ملّا فضل اللہ المعروف ملّا ریڈیو کا تعلق براہ راست دینی مدارس سے ہی ہے۔ جن علماء کی اس قدر ناقدری کی شکائت کی جارہی ہے کہ حکومتی سطح پر پالیسی بناتے ہوئے ان کو کوئی ویلیو نہیں دی جاتی، انہی علماء کی حکومتی ایوانوں میں اس قدر دہشت ہے کہ آج تک مدارس کو ریگولرائز نہیں کیا جاسکا۔ کسی حکومتی ادارے میں اتنا دم نہیں ہے کہ مدارس کو اپنے ذرائع آمدن اور خرچ کے آڈٹ کا پابند کیا جاسکے، آئین میں شامل کسی مذہبی شق کو چھیڑا نہیں جاسکتا، پاکستان کا آئین ایک اسلامی آئین ہے، جس میں کوئی قانون خلاف شریعت نافذ نہیں کیا جاسکتا، اسلامی نظریاتی کونسل موجود ہے، جس کی زیادہ تر دلچسپی کا محور نکاح اور پردۂ نسواں کے مسائل ہی ہوتے ہیں، آج تک ملک میں دہشت گردی اور فرقہ واریت کے خاتمے کے حوالے سے اس کونسل نے کوئی ایک تجویز تک پیش نہیں کی ہے۔ آئین پاکستان کی روشنی میں قائم وفاقی شرعی عدالت جیسا حکومتی ادارہ موجود ہے، پھر بھی شکایت کہ علماء کی ناقدری کی جاتی ہے۔

مزید آگے فرماتے ہیں:

"ایک اور اہم بات جب ہم اتحاد اور قومی یکجہتی کی بات کرتے ہیں تو اس میں ہمیں ملک کا جو سب بڑا طبقہ ہے دیندار طبقہ، اس کے جذبات اور احساسات کا بھی خیال رکھنا چاہیے"۔

معلوم نہیں موصوف کون سے پاکستان میں رہتے ہیں، اگر دیندار طبقہ پاکستان کا سب سے بڑا طبقہ ہے تو پھر تو موصوف کے اعتقادات کے مطابق پاکستان کو تو امن کا گہوارا ہونا چاہئے تھا، یہاں دین دار طبقے کی اکثریت کی وجہ سے دودھ اور شہد کی نہریں بہنی چاہئیں تھیں، اگر دیندار اکثریت والے ملک کا یہ حال ہوتا ہے تو مقامی اور عالمی سطح پر کون ہے جو ایسی دینداری اختیار کرنا پسند کرے گا؟ اسی دیندار طبقے کی اکثریت کی بدولت پھر تو پاکستان کی تمام اسمبلیوں میں انہی دینداروں کے نمائندے ہونے چاہئے تھے، اور پھر وہ خود ہی اپنے جذبات اور احساسات کا بخوبی خیال بھی رکھ لیتے، دیندار طبقے کو نظر انداز کئے جانے کی شکایت کس بات کی؟، ذرا عقل و شعور اور غور اور فکر سے کام لے کر معلوم کرنے کی جستجو کیجئے کہ پاکستان کی اکثریت مذہب پسند ہونے کے باوجود بدحالی اور بدامنی کا شکار کیوں ہے؟ اگر سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے معلوم کر لیجئے گا۔

معروف اسکالر جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں پاکستان میں جاری دہشت گردی کے تانے بانے دینی مدارس سے جوڑے تو موصوف بلاگران کا ذکر کچھ اس طرح شروع کرتے ہیں:

"ملائیشیا میں مقیم ایک صاحب ہیں جو کہ ایک مذہبی سکالر و تجزیہ نگار کے طور پر مشہور ہیں"

جناب بنیاد پرست صاحب! جاوید احمد غامدی صاحب ملائشیا میں مقیم ہر گز نہیں ہیں، مقیم اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی علاقے میں اپنی مرضی و ارادے سے رہتا ہو، جاوید احمد غامدی صاحب ملائشیا میں مقیم ہر گز نہیں ہیں، بلکہ آپ کو یوں کہنا چاہیئے تھا ایک صاحب جو دہشت گردوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر آج کل ملائشیا میں پناہ گزین ہیں یا یوں کہتے کہ جان کے خطرے کی بدولت ملائشیا بھاگے ہوئے ہیں، یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اظہارِ رائے کے جرم کی بدولت ملائشیا میں خود ساختہ جلاوطنی گذار رہے ہیں، یا پھر یوں کہ ملائشیا ہجرت کر گئے ہیں، لیکن انہیں ملائشیا میں مقیم کہنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہے، مجھے امید ہے کہ آپ کو یہ ضرور معلوم ہو گا کہ جاوید احمد غامدی صاحب کے ملائشیا ہجرت کر جانے کی کیا وجوہات تھیں۔ (نوٹ: مذہب کے معاملے میں میرا غامدی صاحب سے بھی اسی قدر اختلاف ہے جس قدر بنیاد پرست صاحب سے ہو سکتا ہے، لیکن میری ہمدردی غامدی صاحب کے ساتھ صرف آزادیٔ اظہار رائے کی وجہ سے ہے)

ایک اور دلیل جو بنیاد پرست صاحب نے دینی مدارس سے دہشت گردی کا داغ مٹانے کیلئے پیش کی وہ یہ ہے کہ:

"دوسری بات اگر کفر و شرک کو تلوار سے خاتمہ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو ان مدارس والوں کی تبلیغی جماعتیں دنیا بھر میں کونسی تلوار لیے پھر رہی ہیں"۔

یہ عبارت پڑھ کر تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ موصوف انتہائی معصوم ہیں، بنیاد پرست صاحب! پہلی بات تو یہ کہ دنیا بھر میں بغیر تلوار کے تبلیغ ان کی مجبوری ہے کہ تلوار لے کر تبلیغ کرنے کیلئے کوئی انہیں ویزہ ہی نہیں دے گا، اس لئے اگر ان کے بس میں ہو تا تو یہ دنیا بھر میں تلوار لے کر ہی تبلیغ کیلئے نکلتے، لیکن میری نظر میں تبلیغی جماعت کی حیثیت پاکستان اور دنیا بھر میں دہشت گردی کے مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ یا ریکروٹمنٹ ایجنسی کی ہے۔ ان کا کام صرف بندوں کو گھر گھار کر بنیاد پرستی کے بنیادی مشن پر لگانا ہوتا ہے، بعد میں ان کے دینی رجحان اور جنون کی وجہ سے دہشت گرد تنظیمیں ان کا با آسانی شکار کر لیتی ہیں۔ نیز یہ "تبلیغِ اسلام" کیا بلا ہے؟ اگر ہجرتِ مدینہ کے بعد باقاعدہ دربارِ رسالت سے ایک بھی تبلیغی وفد غیر مسلموں کو اسلام کی تبلیغ کیلئے روانہ کیا گیا ہو تو مجھے اس کی تفصیل سے ضرور آگاہ کیجئے گا، میرے علم میں اضافہ ہو جائے گا، اور میں آپ کا بے حد احسان مند۔

اپنی اس تحریر میں، میں نے صرف بنیاد پرست صاحب کے بلاگ کے پوسٹ مارٹم پر اکتفاء کیا ہے، "دینی مدارس کا دہشت گردی سے کیا تعلق" کے عنوان سے میں باقاعدہ ایک الگ تحریر لکھوں گا، جو مجھ پر ادھار ہے، ایک دینی مدرسے کے فاضل سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ دینی مدارس اور دہشت گردی (جسے جہاد کا نام دے دیا جاتا ہے) کا باہم کیا تعلق ہے، اور اس تحریر میں انہی کتابوں کا حوالہ درج ہو گا جن کا لنک بنیاد پرست صاحب نے اپنے اسی بلاگ میں فراہم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "دینی مدارس میں کیا پڑھایا جاتا ہے، وہ ان کتابوں کو دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے"۔

دہریت اور خدا، پھر کیا؟

ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ صرف خدا کی نفی کافی نہیں، کیونکہ اگر تم نے مجھے اس کا کوئی متبادل نہیں دیا تو میں کسی نہ کسی شکل میں اسے دوبارہ تخلیق کرلوں گا کیونکہ مجھے اس کے وجود کی عادت ہوگئی ہے... چنانچہ بعد از خدا کے مرحلے پر کچھ غور و خوض ضروری ہوگیا ہے، میں اپنا نقطہ نظر تین نکات میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

1- فلسفیانہ طور پر۔

خدا کی نفی انسانیت کے لیے بہت معنی رکھتی ہے، کیونکہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے تمام تر کارنامے چاہے وہ اخلاقی ہوں یا علمی بشمول جرائم اور جنگیں ہمارے اپنے ہاتھ کی کارستانیاں ہیں اور اس میں کسی کی مداخلت یا مشیت نہیں تھی، اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ اپنے اور معاشرے کے تئیں انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، نا ہی کوئی ذریت ہے اور نا ہی کوئی شریعت اور نا ہی کوئی دوسری ایسی کوئی چیز ہے جس کے کاندھوں پر اسباب کی ساری ذمہ داری ڈال کر خود کو بری الذمہ کیا جاسکے اور اپنے کردہ گناہ اس کے سر منڈھ دیے جائیں۔۔ ذرا تصور کیجیے کہ مذاہب کی بجائے اگر صنعتی انقلاب دس ہزار سال پہلے آجاتا تو اب ہم کہاں ہوتے؟ مگر افسوس انسانیت نے وہ قیمتی سال حقیقت کی تلاش کی بجائے خدا نامی اس وہم کی تلاش میں ضائع کردیے کیونکہ انسان فطرت کی قوتوں سے خائف تھا، موقع پرستوں نے اس ڈر کا فائدہ اٹھایا اور انسان پر نام نہاد وصیتیں اور شریعتیں تھوپ دیں اور ہر مخالف آواز کو کچل کر انسان کو غلام بنایا اور انسانیت کا چہرہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا، چنانچہ تمام تر معاشرتی اور ثقافتی موروثات پر نظرِ ثانی ہمارا فرضِ منصبی ہے تاکہ ہم ان موروثات کو جدید انسانی معیارات کے مطابق ڈھال کر انہیں اکیسویں صدی سے ہم آہنگ کر سکیں۔

2- عملی طور پر۔

نیند میں غرقاب خدا اور اس کے حواریوں نے زمین پر زندگی کو درپیش خطرات کے حوالے سے کوئی حقیقی حل پیش نہیں کیے جیسے جراثیم کا ارتقاء جس کی وجہ سے بیشتر پر اب دوائیں بے اثر ہوچکی ہیں اور گلوبل وارمنگ وغیرہ.. اور چونکہ زمین پر صرف ہم ہی ایک عاقل جاندار ہیں چنانچہ ساری ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر آپڑتی ہے، ہمیں ان معاملات کو لے کر زیادہ ذمہ دار اور سنجیدہ ہونا ہوگا خاص کر جن مسائل کا تعلق زمین پر حیات کے بقاء سے ہے، ہمیں مظاہر اور چیزوں کے کام کے میکنزم کو سمجھ کر خود ہی حل نکالنے ہوں گے لیکن ان میں بھوت اور خرافات ٹھونسے بغیر تاکہ ہم درست راہ سے بھٹک نہ جائیں، تاریخ روز ثابت

کرتی ہے کہ جب انسان نے توہمات اور خرافات کو ترک کر کے صحیح معنوں میں سنجیدہ ہو کر حقیقت کی تلاش شروع کی تو وہ اسے علم میں ملی کہنوت میں نہیں، بادلوں کی سیر کے قابل ہم ایسے ہی نہیں ہوئے، صرف علم ہی ہمارے لیے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔

3- وجودی طور پر۔

یہ حقیقت چاہے کسی کو کتنی ہی کڑوی کیوں نہ لگے مگر یہ سچ ہے کہ انسان ایک ادنی اصل سے آیا ہے، اس سے ہمیں واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کے درمیان تفریق کرنے والی کوئی شئے نہیں ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت یا برتری حاصل نہیں نا تقوے سے نا کسی اور چیز سے، سب برابر ہیں، نا ہی کوئی چنندہ قوم ہے اور نا ہی کوئی بہترین امت، بہتری کا انحصار اس بات پر ہے کہ کوئی قوم تہذیبِ انسانی کو کتنا کچھ دے سکتی ہے، ہم انسان زمین پر زندگی کے سلسلے کی صرف ایک کڑی ہیں، لہذا ہمیں اپنے غرور کو ایک طرف رکھنا ہو گا اور یہ خام خیالی ترک کرنی ہو گی کہ ہم مرکزِ کائنات ہیں، اگر ہم اپنی بقاء کے لیے سنجیدہ کوششیں کرنے میں ناکام رہے تو اسی طرح ناپید ہو جائیں گے جس طرح ہمارے اجداد ڈائینا سار اور دیگر کروڑوں انواع ناپید ہو گئے تھے، کچھ اگر بچے گا تو صرف ہماری ہڈیوں کے ڈھانچے... اور یقین مانیے کسی مؤمن اور کافر کے ڈھانچے میں کوئی فرق نہیں۔

زندگی ایک بہترین موقع ہے جو شاید اس سیارے پر پھر کبھی نہ دہرائی جائے لہذا اسے توہمات کے پیچھے بھاگ کر ضائع نہ کیجیے، ہمیں خود کو زندگی کے قابل بنانا ہو گا اس پر بوجھ نہیں، ہمیں عورت، ترقی اور جدیدیت کے خوف سے باہر آنا ہو گا اور توہم پرستی سے خود کو آزاد کرنا ہو گا خاص کر مقدس وہم، اور یہ سب عبادتوں سے نہیں بلکہ علم، تحقیق اور سنجیدہ کوششوں سے ہی ممکن ہو گا۔

الوہی مداخلت

خدا ایک ذہنی مفروضہ ہے یا پھر یوں سمجھ لیں کہ جہاں انسان کی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے وہاں وہ کسی ایسی طاقت کا تصور کر لیتا ہے جو سب کام انجام دیتی ہے، انسان کا محدود شعور اسے تمام طاقتوں کا منبع و سرچشمہ قرار دے کر ہتھیار ڈال دیتا ہے، یعنی جہاں وہ کسی بات یا کام کی کوئی عقلی توجیہ یا منطق نہیں سمجھ سکتا وہاں وہ کسی خدا پہ اس کی ذمہ داری ڈال کر بری الذمہ ہو جاتا ہے اور مطمئن ہو رہتا ہے۔

یوں بھی ہے کہ حکومت کا انتظام سنبھالنے کیلئے خدا کا تصور پیش کیا گیا، عوام کو عبادات میں الجھائے رکھنے اور روحانی طور پر غلام بنائے رکھنے کیلئے خدا اور مذہب کی ایجاد ضروری تھی، جو قوم طاقت پکڑتی اور دنیا فتح کرنے نکلتی وہ اپنا خدا بھی وہاں پہنچا دیتی اور مفتوح علاقوں کے لوگوں کے خدا اور مذہب کو منسوخ کر کے اپنا خدا اور مذہب مفتوح قوموں پر لاد دیتے، پھر ان پر کوئی غالب آتا تو مغلوب کے خدا کے تصور اور مذہب کو یکسر حرفِ غلط قرار دے کر اپنے خدا اور مذہب کو مسلط کر دیتا، یعنی اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بات اظہر من الشمس کی طرح واضح نظر آتی ہے کہ ہر مذہب اور "ہر" خدا اپنے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے زورِ بازو پر پھیلا اور جہاں جہاں وہ مغلوب ہوئے ان کا خدا بھی مغلوب ہوا اور اس کی جگہ فاتحین کے خدا نے لے لی، لیکن کہیں ایسا نہ ہوا کہ قوموں کے خداؤں اور مذہب نے ان کو اقتدار میں مدد دی یا ان کی کسی معاملے میں حمایت کی یا ان کا کسی بھی سطح پر ساتھ دیا یا مادی ترقی میں ہی مدد کی، الٹا ہر دور کا ہر مذہب ہر مسلک کا خدا اپنے ماننے والوں کا ہر ہر معاملے میں محتاج رہا، یوں کے بقول شخصے:

چاہے تو کام میں لے، چاہے نکما کر دے
میں تیرا ہوں، تیری مرضی مجھے جیسا کر دے!

جہاں کہیں بھی کسی حکومت یا کسی قوم پر زوال آیا تو اس کا سبب اس کی کمزوری اور عاقبت نااندیشی تھی، کوئی حقیقی خدا انسانوں کی آپس کی اس باہمی کشمکش میں کہیں نظر نہیں آتا، سب کے نظریے مفروضات پر قائم ہیں، انسانوں کی آپس کی ریشہ دوانیوں میں خدا اور اس کا تصور اور اس کی تعلیمات کی حیثیت بس اتنی ہے کہ کیسے حکومت کرنی ہے، اور عوام کو کیسے مطمئن رکھنا ہے اور کیسے ان کو اپنی مرضی پہ چلا کے اپنی مرضی کے نتائج و فوائد حاصل کرنے ہیں، خدا کی ذات کی مداخلت کہیں کسی تہذیب کے معاملات میں ڈھونڈے نہیں ملتی، کسی فوق البشر طاقت کی انسانوں کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کی شہادت نہیں ملتی، لہٰذا کسی شے کو یا موجوداتِ عالم کو کسی تصور سے وابستہ کر کے اسے اسی کی کارستانی قرار دینا ایک بے کار اور لغو خیال ہے۔

کائنات میں کسی الوہی مداخلت کا تصور ناقص ہے، کیونکہ کائنات کا نہ کوئی اندرون ہے نہ بیرون، جو کچھ ہے مظہر ہے، موجودات ہیں، جتنے بھی خدا کے موجود ہونے کے نظریات ہیں وہ سب ضعیف الاعتقاد لوگوں کے مفروضات ہیں جن کی عقل نے غور و فکر کرنے کے بجائے اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے کی بجائے ایک مفروضہ گھڑ کر ان سب چیزوں کو اس سے نتھی کر کے تصوراتی و مفروضاتی خداؤں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

انسانوں کی آپس کی ریشہ دوانیوں میں خدا کا تصور اور اس کی تعلیمات کی غرض وغایت بنی نوع انسان کو روحانی وسیاسی غلام بنانا ہے، یہ مفادات کی جنگ تھی جسے اذعانیت اور ادعائیت نے مزید فروغ دیا، اور اب یہ ایسا جوہڑ بن چکا ہے جس میں ڈاگما کے شکار ضعیف الاعتقادی کے مزے لوٹتے ہیں، یہ تصور حرص وہوس پر مبنی تھا، کبھی داسی، کبھی نن، کبھی مالِ غنیمت میں حاصل ہونے والی لونڈی کی صورت میں، اس تصور نے ہزارہا سال شبِ خون مارا ہے تہذیب وتمدن کے نادر ونایاب اثاثوں پر۔

انسانوں کو روحانی وسیاسی طور پر غلام بنائے رکھنے کیلیے خدا اور مذہب کو فروغ دیا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ مفاد پرستوں نے کیسے کیسے متنوع خدا اور مذاہب متعارف کرائے، کتنے اپنے ماننے والوں کے بل پر پھلے اور کتنوں نے راج کیا، اور اس راج کا مزا لوٹنے کے بعد ذلتیں بھی اٹھائیں، اور جو خدا کبھی عظیم گردانا جاتا رہا وہی خدا اپنے ماننے والوں کی شکست کے بعد ذلیل ترین گنا گیا، اگر سب کا خدائے واحد اصل اور سچا ہوتا تو جو قومیں اپنے اپنے مذاہب پر پورے طریقے سے عمل پیرا تھیں اور اپنے خدا کی جی حضوری میں وقت گزارتی تھیں، کم از کم ان کا خدا تو ان کو اس دنیا میں ذلیل وخوار نہ کرتا، لیکن چونکہ ایسی مثال نہیں ملتی لہذا یہ انسان کے اپنے قائم کردہ نظریات ہیں، اور انسان اور قوموں کے عروج وزوال کا تعلق بھی انہی کے عمل سے مشروط ہے، ان کا عروج وزوال کسی خدا کی مداخلت کا مرہونِ منت نہیں۔

جتنا وقت اپنے ہی تصور کی جی حضوری اور اس کی عبادات اور مذہبی رسومات میں انسانوں نے ضائع کیا ہے، اتنا ہی وقت کسی تعمیری کام یا کسی اچھے عقلی نظریات پر لگایا جاتا تو یقیناً حالات قطعی مختلف ہوتے، کم از کم یہ جو دنیا ہم آج دیکھ رہے ہیں، یہ عہد گزشتہ کئی صدی قبل آ چکا ہوتا، کسی خدا کے علتِ کاملہ ہونے کا جھگڑا، اس کی موجودگی کو ثابت کرنے یا نہ کرنے کا سلسلہ تو بعد کا ہے، سب سے پہلے ہمیں ان خطوط پر بات کرنی چاہیئے جن پر چل کر کسی خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔

سارے مذاہب اور اکثر مصلح خدا کی بات کرتے ہیں، انسانی زندگی کا مقصد اس کی عبادت واطاعت چاہتے ہیں، اور انسانی زندگی کو کسی خدا کی چاہت بتاتے ہیں، لیکن تاریخ کے عمیق ترین مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ایک واقعہ نہیں جس میں کسی فوق البشر ہستی کی مداخلت کا ہاتھ نظر آتا ہو، کسی بھی شخص کی ترقی، کسی بھی قوم یا معاشرے کی ترقی میں ان کی اپنی محنت اور عمل کا ہاتھ ہے جس کو ان میں سے اکثر حضرات اپنی کم علمی کے سبب کسی مافوق الفطرت ہستی سے منتھی کرتے رہے اور لایعنی عبادات میں اس ہستی کو پوجتے رہے جس کو وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جانتے تھے۔

کسی ایک مذہب میں دعوؤں کے علاوہ اپنی بات کے حق میں کہنے کیلیے ایک بھی ثبوت نہیں، عیسائی سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت آگے کر دے گا، کسی ہندو سے پوچھیں تو وہ اپنی کتابیں آگے کر دے گا، کسی مسلمان سے پوچھیں تو وہ اپنی

کتاب بطور ثبوت پیش کر دے گا، سب کی ایک ہی بات کہ ہماری کتاب خدا نے ہدایت کیلیے بھیجی، لیکن خود اس بات کا ثبوت ندارد، سب کی اپنی اپنی تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے اپنے خدا کو دعووں کے ذریعے ثابت کرتے ہیں، گویا یہاں بھی کوئی خدائی مداخلت نہیں صرف انسان خود ہے، جو خدا کو منوا رہا ہے۔

بہر حال یہاں کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ جس پر چل کر خدا کو مانا جائے اور منوایا جائے، صرف ایمان بالغیب ہے جو کسی خدا کو مان سکتا ہے اور منوا سکتا ہے، صرف چند وہم ہیں خوف کی صورت جو خدا پر ایمان رکھا جاتا ہے، لیکن حقیقت و صداقت کے راستے معجزات و عقائد کی راہنمائی میں طے نہیں کیے جا سکتے، اور نا ہی کبھی ایسا ممکن ہوا ہے، سچائی کو کسی خدا سے منسوب کرنے کی ضرورت اضافی نوعیت کی ہے، خدا پر یقین رکھنا ایسا ہی ہو گا جیسے بچے زمانہ طفلی میں سپر مین، سپائیڈر مین وغیرہ کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں۔

محسن انسانیت

پچھلے دو سو سالوں میں دنیا نے اتنے حیران کن انداز میں ترقی کی ہے کہ یقین نہیں ہوتا. سیاسی نظریات کی پیچیدگی، فن و ادب کی ترقی، سائنسی ایجادات، تجارت اور سفارتی تعلقات وغیرہ نے تمام انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور عالمی حالات میں آئے دن اتنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں کے پوری دنیا کو "قوموں کا خاندان" تصور کیا جاتا ہے.

Wendell Willkie کی "واحد دنیا" "One World" کا خواب آج حقیقت کا روپ دھارتا جا رہا ہے. جدید ترین ذرائع مواصلات وجود میں آ گئے ہیں. فاصلے یوں سمٹ گئے ہیں کہ کوئی قطب جنوبی سے پکارے تو قطب شمالی تک سنا جائے. زمین کے کسی کونے میں پیش آنے والا واقعہ لمحوں میں ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے. انسان نے اپنی عظمت کے نشان چاند کی تسخیر کے بعد سیاروں پر بھی چھوڑنے شروع کر دیے ہیں اور ان تمام چیزوں کے اثرات بہر حال پوری انسانیت پر مرتب ہو رہے ہیں.

سماجی شعور اور معاشرتی و اخلاقی قدریں تیزی سے تبدیل ہوتی جا رہی ہیں. لیکن ان بدلتی ہوئی قدروں میں کچھ گروہ آج بھی صدیوں پہلے کے سماجی شعور اور قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں. انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے لیکن مذہبی پنڈتوں کیلیے آج بھی رویت ہلال کا جھگڑا سب سے اہم ہے. آج بھی راسخ العقیدہ لوگوں کی اجارہ داری ہے معاشرہ و سماج پر. اکثر معاشرے مذہبی جنونیوں اور رجعت پسندوں کا گڑھ ہیں، جن کے پاس وحدت انسانیت کو تقسیم در تقسیم کرنے کا ایک نایاب فارمولا ہے. یہ رجعت پسند معاشرے کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے تشدد، جنونیت اور توہم پرستی کی آبیاری کر رہے ہیں.

امن و سلامتی کے عقائد کے نام پر انسانیت کا استحصال کرنے میں جتے ہوئے ہیں. امن اور محبت کے نام پر، انسانیت کے نام پر نفرتوں کی فصلیں بوئے جارہے ہیں، کاٹے جارہے ہیں. رجعت پسندوں کا، مذہبی جنونیوں کا ہر طبقہ انسانیت کا نعرہ آفرین بلند کر کے اٹھتا ہے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف صف آراء ہو جاتا ہے. اور رجعت پسندی کے دوسرے مکتبوں کو دبانے کیلیے ہر ممکن طریقہ کار اپناتا ہے. کمیونل ازم، سیکٹیرین ازم کے تناظر میں یہ رجعت پسند معاشرہ کو انسانیت کے نعرہائے تحسین تلے کھوکھلا کرنے میں جتے ہوئے ہیں. یہ جدید دنیا کے پس منظر نامے میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کے بجائے اس کی مخالفت کرنے میں جتے ہوئے ہیں. یہ لوگ ماضی سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں اور اسی ماضی میں جی رہے ہیں. ان کی نرگسیت نے انہیں جبر و تشدد اور تنگ نظری سے اپنا دفاع کرنے والا بنا دیا ہے. یہ وہ لوگ ہیں جن کو اب تک یہ پڑی ہے کے کون گستاخ رسول ہے کون توہین رسالت کا مرتکب ہے. کون کافر ہے کون مشرک ہے. یہ دائروں میں گھوم رہے ہیں اور دائرے سے باہر نکلنا بھی گوارا نہیں. دائرے سے نکلیں تو معلوم ہو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے. یہ لوگ ماضی کے مزاروں میں زندہ ہیں.

شاید علامہ اقبال نے انہی لوگوں کیلیے کہا تھا:

"اے صور اسرافیل بپا شور حشر کر
صدیوں سے ہم آغوش جمود فنا ہیں ہم"

مزید کچھ کہنے سے پہلے قارئین سے چند سوالات پوچھنا چاہوں گا. کیا آپ کے نزدیک ایک ایسا دین امن و سلامتی کا علمبردار ہو سکتا ہے جس کے سینکڑوں فرقے ہوں، اور ہر فرقہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار ہو، اور اپنے علاوہ دوسرے کو کافر، زندیق، قابل گردن زنی ٹھہرا رہا ہو؟ کیا آپ کسی ایسے مذہب کو امن و سلامتی کی ضمانت سمجھتے ہیں جس میں فرقہ واریت اتنی مضبوط ہو چکی ہو کہ جس کے خاتمے کا سوچنا بھی عبث ہے، اور جن میں سے ہر ایک اپنے مخالف ہر فرقے کے خلاف ہر ممکن ہتھکنڈہ اور انسانیت سوز طریقہ کار اپناتا ہو، محض اسے نیچا دکھانے اور باطل ثابت کرنے کیلیے؟

کیا فرقہ واریت میں لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر فرقہ وارانہ نفرت، بغض، عناد، اور فساد وغیرہ پھیلانے سے کسی معاشرے میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے؟

معروف مورخ ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب میں کہتے ہیں:

"فرقہ واریت چاہے کمیونل ازم کی شکل میں ہو یا سیکٹیرین ازم کے روپ میں، یہ معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے. فرقہ وارانہ جذبات ایک دوسرے کی مخالفت میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کے دوسرے سے نفرت، تعصب اور دشمنی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں. اور فرد ایک انسان کے بجائے، انہیں شیطان کی شکل میں نظر آتا ہے کہ جسے مٹانا، ختم کرنا، کمزور کرنا یا دبانا ان کے عقیدہ کا ایک حصہ بن جاتا ہے. جب نفرت کے جذبات عدم رواداری، قوت برداشت، رحمدلی اور دلسوزی کے جذبات کو ختم کر دیتے ہیں اور معاشرہ بربریت اور وحشت کا شکار ہو جاتا ہے. ایک ایسے معاشرے میں ادب، آرٹ، موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ اپنی لطافت

کھو دیتے ہیں. نفرت کے ماحول میں کمزور فرقوں اور مذہبی اقلیتوں کے تعلیم یافتہ اور ماہرین علوم ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ اور زیادہ پسماندہ ہو جاتا ہے. فسادات کی وجہ سے معاشرہ پر نفسیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ مالی نقصانات بھی مرتب ہوتے ہیں. نفسیاتی طور پر جب افراد قتل و غارت گری کرتے ہیں تو ان کا انسانیت سے ایمان اٹھ جاتا ہے اور دنیا کے بارے میں ان میں منفی خیالات ابھرتے ہیں کہ جن میں مایوسی ناامیدی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے. جو افراد اور خاندان فسادات سے متاثر ہوتے ہیں ان کی دنیا اجڑ جاتی ہے. قتل ہونے والوں کا کوئی نعم البدل نہیں."

اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑایئے، غور و فکر کیجیے، دیکھئیے کس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں. وہ کیا کر رہے ہیں، کیوں کر رہے ہیں، کس لیے کر رہے ہیں، کیا انسانیت صرف اس فرقے تک محدود ہے جس سے چند انسانوں کا تعلق ہے؟ کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ انسانیت صرف ایک فرقے تک محدود ہے اور باقی فرقے جائیں بھاڑ میں، اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے تو ہیں ہی جہنمی. دیکھیے ایک انسان دوست کیا کہہ رہے ہیں:

"انسانیت ایک خاندان ہے، نہ اس میں کوئی امتیاز ہے نہ تفریق. جو تفریق پیدا کرتے ہیں وہ اس مقدس خاندان میں شامل نہیں." (جون ایلیا)

کیا کوئی انسانیت میں تفریق و امتیاز کرنے والوں کو انسان دوست کہہ سکتا ہے؟ اور ان تفریق پیدا کرنے والوں کا جس دین سے تعلق ہے، اس دین کو امن و سلامتی کا دین کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس دین کے دینے والے کو محسن انسانیت کہا جا سکتا ہے؟ کیا آپ ایسے شخص کو محسن انسانیت کہہ سکنے کی اخلاقی جرآت رکھتے ہیں جس کی شریعت کے نام پر آئے روز نت نئے فتنے اٹھتے ہوں؟ جس شریعت کو لاگو کرنے کیلیے ہر دور میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا ہو، جس شریعت کے نام پر خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی ہو، اور اب بھی یہ سلسلہ متواتر جاری ہے. کیا آپ اب بھی اس شریعت کے دینے والے کو محسن انسانیت اور رحمت العالمین کہیں گے؟ بہت بہتر. گویا آپ انسانیت پر عقیدے کو فوقیت دے رہے ہیں.

بہت چند باتیں سوالوں کی مد میں اور ہیں. گر قبول افتد زہے عز و شرف. کیا آپ کسی ایسے شخص کو انسان دوست مان سکتے ہیں جو آپ کے گھر میں بغیر اجازت گھس آئے. اور آپ کے سامنے مطالبات رکھے کہ یا تو میری ہر بات بلا چوں چرا مان لو، یا پھر مجھے ہر ماہ کچھ نہ کچھ غنڈہ ٹیکس دو، یا پھر میری جارحیت کا سامنا کرنے کیلیے تیار ہو جاؤ؟ کیا آپ کسی ایسے شخص کو اخلاقی طور پر انتہائی بلند کردار کا مالک خیال کر سکتے ہیں جس نے مال غنیمت میں آنے والی عورتوں سے زنا کیا ہو، ان کے خاندان کو جنگ میں مار کر اسی رات ان سے ہم بستری کی ہو، جس نے یہودیوں کے کے قبائل کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہو، جس نے اپنی ہجو کہنے والوں کو چن چن کر قتل کرایا ہو، کیا آپ ایسی ہستی کو اخلاقی طور پر بلند کردار کا حامل سمجھیں گے اور اس کی عزت و تکریم کرنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑیں گے. اور اس متنازعہ ہستی کو محسن انسانیت، رحمت العالمین جیسے القاب سے بھی نوازیں گے؟ کیا آپ اس ہستی کو محسن انسانیت کہیں گے جس کے نام پر تاریخ میں سب سے زیادہ قتال کیے گئے ہوں اور اب بھی کیے جاتے ہیں. جو اجتماع ضدین ہو، جس کے نام پر انسانیت نواز افعال بھی ہیں تو انسانیت سوز افعال بھی. کیا آپ بھی ایسی متنازعہ ہستی کو محسن انسانیت اور رحمت العالمین کہیں گے؟ اس کے برعکس تاریخ میں کئی ایسی ہستیاں پائی جاتی ہیں جن کی تعلیمات اور جن کا اخلاق اس ہستی سے نہ صرف بہت اعلی تھے. بلکہ ان کی ہستی اس قدر متنازعہ بھی نہیں تھی. مانی، مہاویر اور گوتم کی تعلیمات میں انسان تو کجا کسی جانور کو بھی تکلیف پہنچانے کی ممانعت تھی. اور اسی ایک وجہ سے مانی کی مانویت زیادہ نہ پھیل سکی. کیونکہ اسے ایسے اصحاب میسر نہ تھے جو بات بے بات تلوار نکال لیتے. چونکہ اس کا مذہب عدم تشدد کا قائل تھا، اور کلی طور پر انسانیت پر مبنی تھا. اس لحاظ سے اس کے اصحاب بھی انسان تھے، خونخوار نہ تھے.

مانی کا کہنا تھا کہ ظلمت سے کنارہ کشی اختیار کی جائے. اس نے ہر تکلیف پہنچانے والے کاموں سے منع کیا. لیکن مانی کے اصحاب انسان دوست تھے، انسان دشمن نہ تھے. جو اپنا مذہب دوسروں پر مسلط کرنے کیلیے شرائط رکھتے، یا پھر جنگ و جدل کرتے. چنانچہ اس انسان دوست مصلح کو اس وقت کی مملکت فارس کے شہنشاہ بہرام اول نے زندہ گرفتار کر کے اس کی زندہ کھال کھنچوالی. اس طرح یہ مسیحا اور پیغمبری کا دعوے دار اذیت ناک موت سے دوچار ہو کر فوراً ہلاک ہو گیا. اس کی کھال میں بھس بھر کر شہر "ابدی شاپور" کے صدر دروازے پر لٹکا دی گئی.

لیکن مانی کے مقابلے میں گوتم کی تعلیمات کو برصغیر کے عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا. اس کی تعلیمات پھیلنے کا سب سے بڑا سبب اس کا سادہ ہونا تھا. اس لیے عوام اس کی جانب کھینچے چلے آئے. اس لیے کھینچے چلے آئے کیوں کہ وہ موجودہ مذاہب سے بیزار تھے. جن کے ٹھیکیداروں کی اجارہ داری دین و دنیا کے ہر معاملے میں قائم تھی. چنانچہ گوتم کی سادہ تعلیمات اور انسانی برابری کے اصول کو سب کے دل نے لبھایا اور لوگ جوق در جوق اس کے ہم خیال ہوتے گئے.

پھر گوتم کی تعلیمات کو اشوک نے اپنایا اور دنیا کا سب سے پہلا مذہبی رواداری قائم کرنے والا مطلق العنان شہنشاہ بنا. اسی وجہ سے اشوک کو اشوک اعظم کہا جاتا ہے. گوتم کی سادہ اور انسان دوست تعلیمات نے اشوک کی کایا پلٹ دی، جس نے کالنگا کی جنگ کے بعد جنگ و جدل سے منہ پھیر لیا اور انسانی مساوات پر مبنی ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس کی نظیر اس سے قبل تاریخ میں ڈھونڈے نہیں ملتی. وہ بھی اس وقت جب فتوحات کا دور تھا. اور تلوار کے زور پر اپنا خدا اپنا مذہب دنیا پر مسلط کیا جاتا تھا. لیکن اشوک نے اس روایت کے برعکس بدھ کی تعلیمات کا پرچار ان اصولوں پر کرایا جو اسلامی صوفیاؤں کے پیش رو ہیں. بدھ بھکشوؤں نے اپنے اخلاق اور پیار سے گوتم کی تعلیمات کو برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچایا. کیا انسانیت کے حقیقی معنوں میں علمبردار گوتم اور اشوک کو محسن انسانیت کہنا ناجائز اور "حرام" ہے؟

اس وقت عرب کی حالت زار کیا تھی جب گوتم انسانیت کی تعلیم عام کر رہا تھا؟ گوتم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں کیا فرق ہے؟ جن وقتوں میں بدو خانہ کعبہ کا برہنہ طواف کیا کرتے تھے، بتوں کو پوجتے تھے، رفع حاجت کے بعد خود کو نجاست سے پاک بھی نہ کرتے تھے. جب ان بدوؤں کو یہ تک نہ پتہ تھا کہ انسانیت کا احترام کیسے، کیونکر اور کس لیے کیا جائے ان وقتوں میں برصغیر میں، اس خطے اور اس دھرتی کے مہان سپوت مہاتما بدھ نے ذات پات اور انسانی تقسیم کا آریائی مذہبی فارمولا مکمل طور پر رد کر کے یہ اعلان کیا کہ سب انسان برابر ہیں، کوئی پنچ ناپاک اور کسی دوسرے انسان سے کمتر نہیں، انسان کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ صرف اس کے اعمال سے کیا جا سکتا ہے.

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا سے نبوت کا پروانہ لے کر نکلے اور انسانوں کو "روحانی و سیاسی غلام" بنانے میں جت گئے. مہاتما نے نروان حاصل کیا اور "مذہبی اداروں" اور "خداؤں کے تصور" کو یکسر رد کر کے اعلان کیا کہ خدا کی عبادت کیلیے جو وقت درکار ہوتا ہے وہ انسانیت کی خدمت کیلیے وقف کیا جائے. ہند دھرتی کے اس عظیم سپوت نے کسی بھی مصلح کے برعکس بنی نوع انسان کو روحانی غلام بنانے کے بجائے روحانی آزادی بخشی. راجہ سدھارتھ کے بیٹے، سلطنت کے ولی عہد گوتم نے جنگیں نہیں لڑیں، لوٹ مار نہیں کی، مال غنیمت اکھٹا نہیں کیا. نہ ہی جنگی قیدیوں میں سے خوبصورت خواتین کو اپنے لیے پسند کر کے الگ رکھنے کو کہا، بدھ نے کسی کی آبروریزی نہیں کی، بدھ نے لونڈیاں رکھ کر ناجائز اولاد پیدا نہیں کی. گوتم نے کسی رسول کی طرح مذہب کی آڑ میں اپنی نفسانی خواہشات پوری نہیں کی بلکہ اس کی شدید مذمت کی. گوتم نے اپنی تعلیمات کا خراج نہیں مانگا انسانیت سے، اس کے برعکس اس نے سلطنت ٹھکرا دی. دھرتی کے اس مہان پرش نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گیارہ سو سال قبل بنی نوع انسان کو انسانیت کا درس بغیر کسی لالچ کے دیا. محسن انسانیت اور رحمت العالمین جیسے القاب بھی گوتم جیسے اخلاقی مفکرین کو ہی زیب دیتے ہیں.

جب بدؤوں کیلیے ہر شے خدا تھی. فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے. اجنہ کو الوہیت کا درجہ دیتے تھے. بتوں کو مظہر خدا مان کر ان کی پرستش کرتے تھے. سینکڑوں بتوں کی پوجا ہوتی تھی. بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑے جاتے. ان پر انسانوں کی قربانیاں ہوتی تھیں. بتوں کے نام کے تیروں سے قرعہ اندازی ہوتی تھی. ہر نچلا طبقہ اپنے سے بلند طبقے کا غلام تھا. بلکہ اس سے بھی کچھ پست تھا. جب ان کی اخلاقی حالت انتہائی شرمناک تھی، ایک ایک عورت کئی کئی شوہر کر سکتی تھی. جب بدو ماں بہن کو ایک سمجھتے تھے. بدمستی میں ہر گناہ ثواب بن جاتا تھا. محرمات تک سے بھی تمتع کار ثواب بن جاتا تھا. عصمت کی کوئی قیمت نہ تھی. بڑے بڑے امراء کی عورتیں جامہ عصمت اتار پھینکتی تھیں. بعض طبقے لڑکیاں قتل کر ڈالتے تھے. ان کی تعلیم نے شرافت انسانی کو بالکل مسخ کر دیا تھا. مذہبی تعلیمات بداخلاقیوں سے محفوظ نہ تھیں بلکہ اخلاقی پستی ان کا معلم تھی. کعبہ کے متولی حجاج کو ستاتے، طرح طرح کے مظالم کرتے، کعبہ کا چڑھاوا کھا جاتے، ایک دوسرے کی ہجو گوئی میں مصروف رہتے. معمولی زیور کی طمع میں چھوٹے بچوں کو قتل کر ڈالتے. لالچ ان کی فطرت میں شامل تھی. ان کی ذلت کی وجہ سے ان کی کوئی سیاسی اہمیت نہ تھی.

جب عرب گھور اندھیروں میں غرق تھا. تب دنیا کے دیگر خطوں کی تہذیبوں کے افق پر کئی نام ستاروں کی طرح چمک رہے تھے. اس وقت برصغیر میں چانا میں کئی اخلاقی مفکرین آئے. جنھوں نے اس وقت انسانیت کا درس اپنی عوام کو دیا اور "روحانی غلامی" سے نجات کی تحاریک چلائیں، جب بدو جہالت در جہالت کے مزے لوٹ رہے تھے. انہی روشن ستاروں میں سے ایک برہاس پتی تھے. جن کا کہنا تھا کہ:

"سورگ ہے نہ انتم نجات، روح ہے نہ کوئی ابدی دنیا، رسومات نہ ذات پات، خاک میں خاک ہو کر یہ جسم دوبارہ کیسے جنم لے سکتا ہے؟ وہ بھوت ہی ہو گا. موت ترکے میں کچھ نہیں چھوڑتی سوائے مہنگی رسم ورواج کے جو پروہت کا وسیلہ حیات ہیں."
(۸۰۰ قبل از مسیح)

انہی تابندہ ستاروں میں سے ایک مہاویر تھا. جس نے انسان کو انسان ہونے کا احساس دلایا. جس نے مذہب اور خداؤں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تحریک چلائی. اس کا کہنا تھا:

"صرف کائنات ابدی ہے، ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی، باقی کچھ نہیں. انقلابات، لامتناہی تغیرات، جبلی قوتوں کے باعث وقوع پذیر ہوتے ہیں. ان کے ظہور میں الوہی مداخلت کا کوئی حصہ نہیں." (۵۵۰ قبل از مسیح)

انہی وقتوں میں جب عرب جہالتوں کا گڑھ تھا، چائنا میں تاؤاور کنفیوشیس اخلاقیات اور رکھ رکھاؤ کا درس دے رہے تھے. انسانوں سے محبت سے پیش آنے، امن وچین سے زندگی بسر کرنے اور آپس میں بھائی چارہ قائم کرنے کا درس دے رہے تھے. کنفیوشیس کی تعلیمات کا اثر چائنا کی ثقافت اور تہذیب میں آج تک نمایاں ہے. اس کی تعلیم کا مرکزی اصول یہ تھا کہ ہر بات اور ہر کام میں میانہ روی کا سنہرا راستہ اختیار کرنا چاہیئے. اور دوسروں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا چاہیے. اور اجنبیوں سے نرم برتاؤاور بہترین سلوک روا رکھنا چاہیے. انہی روشن ستاروں میں سے ایک چارواکاس تھا. جو عقلیت پرستی کی داغ بیل ڈالنے میں پیش پیش تھے. جو انسان کو انسانیت کی راہ پر گامزن کرنے کی قابل صد تحسین جدوجہد میں سرگرداں تھے. دیکھیے کیا فرماتے ہیں:

"روح ایک سراب ہے، واہمہ ہے، ایک وسوسہ ہے. آتما کا تصور ہی محض ایک دھوکہ ہے. تاریخ کے مشاہدے سے ہمیں خداؤں، دیوتاؤں یا مافوق الفطرت قوتوں کی کوئی وضاحت نہیں ملتی. یہ سارا مظہر عین فطری ہے. اصل حقیقت تو مادہ ہے. جسم پٹھوں کا مجموعہ ہے اور دماغ سوچ کا مادہ ہے. کس نے جسم سے روح کو جدا ہوتے دیکھا ہے؟ ابدیت کی کوئی حقیقت نہیں. تناسخ یا آواگون transmigration of soul ممکن نہیں. مذہب ایک لغزش ہے، ایک بیماری ہے، ایک فریب ہے. خدا کا کوئی وجود نہیں. دنیا کو سمجھنے کیلیے اس مفروضے کو بنیاد بنانا کہ خدا موجود ہے، یہ سب بیکار باتیں ہیں. انسان کو مذہب کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کا عادی ہو چکا ہے. اس کے بغیر اسے تشنگی اور بیکاری کا احساس ہونے لگتا ہے. حالانکہ یہ تشنگی علم سے دور کی جاسکتی ہے. اخلاقیات فطری عمل ہیں. یہ محض وضع داری کیلیے ایک سماجی ضرورت ہے. اس کا الہامی احکامات سے کوئی سروکار نہیں. سورج دیانت دار، بددیانت، اچھوں اور بروں، عام انسانوں اور صوفیوں پر یکساں چمکتا ہے. جذبات اور جبلت کو دبانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں. زندگی کا اصل مقصد بھرپور زندگی گزارنا ہے اور واحد دانشمندی "خوشی" ہے.

اس کا حقیقت کا ادراک چارواکاس کو ہزاروں سال قبل ہو گیا تھا کہ مذہب ایک لغزش ہے، ایک بیماری ہے، سراب ہے. آج ہم شدت سے اس چیز کو محسوس کر رہے ہیں کہ مذہب کے نام پر انسانیت کا کہاں کہاں اور کیسے استحصال کیا جاتا ہے. گو کہ اس میں اچھائیاں بھی ہیں. لیکن اس کا تاریک پہلو اتنی وسعت کا حامل ہے کہ اس نے اس کے اچھے پہلوؤں کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا ہے.

یہ صرف چند مثالیں ہیں ان مفکروں کی، جن کے نظریات اور عمل نے انسانیت سکھائی. اس کے برعکس محسن انسانیت نے کیا کیا؟ ان کی تعلیمات تضادات کا مجموعہ ہے جس میں سے ہر کوئی اپنے مطلب کی چیز نکال لیتا ہے. جن کو اپنانے کے بعد انسان حق

اور باطل کی نہ ختم ہونے والی جنگ کا حصہ بن جاتا ہے اور باطل کو مٹانے کیلیے ہر ممکن طریقہ کار کو بروئے عمل لاتا ہے. کیونکہ اسی میں جنت پوشیدہ ہے.

ایک اخن آتون تھے. جس نے فرعونِ وقت ہوتے ہوئے بھی شہنشائیت ٹھکرا دی. جس نے فتوحات کے دور میں فوج کشی سے توبہ کی. اور فتوحات کے عمل کو ہی ناجائز ٹھہرا دیا. اور کہا کہ یہ ایک انسانیت سوز عمل ہے. اس نے اپنی وسیع تر سلطنت میں پھیلی ہوئی، اور مختلف مہمات میں مصروف فوج کو واپس بلا لیا اور اپنا فوجی ادارہ یہ کہہ کر توڑ دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں. فوج کی جارحیت کبھی انسان دوست نہیں ہو سکتی. اس کے برعکس محسن انسانیت نے تھوڑے عرصے میں بے تحاشہ جنگیں کی، اور جہاد فرض کر کے کہا کے اس میں اللہ کی رضا پوشیدہ ہے. اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے. جس کا جسم کبھی نہیں سڑتا. بلکہ اس سے خوشبو آتی ہے. اللہ شہید کو جنت میں عام جنتیوں سے زیادہ نوازیں گے. اس کے درجات زیادہ بلند ہونگے. اضافی حوریں عطا کی جائیں گی. وغیرہ وغیرہ. حکیم الامت فرماتے ہیں:

"میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر"

یہ کیسی انسانیت ہے جس میں کفار کے خلاف مسلسل حالت جنگ میں رہنے کا کہا جا رہا ہے؟ یہ کون سا حق ہے جو غیر مسلمانوں کو روئے ارض سے مٹا دینے کے بعد ہی ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا دوسرے مذہب کے لوگ اور غیر مذہبی لوگ انسان نہیں. کیا باطل اس عالم کا حصہ نہیں، عالم سے باہر ہے؟ پھر رحمت العالمین اور محسن انسانیت کہنا چہ معنی دارد؟ یہ محسن انسانیت تھے، جو اپنے ایک مخالف کو عرب میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے. جنہوں نے ہجو گوئی کرنے والوں کو نہ چھوڑا. آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو محسن انسانیت تھے. ہجو گوئی کرنے والے شعرا کو اپنے اخلاق سے رام کر سکتے تھے، لیکن نہیں کیا. اس کے برعکس انہیں چن چن کر قتل کرایا. آنخضرت تو رحمت العالمین تھے، مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ مدینے میں رہ لیتے.
آنخضرت تو بہترین مدبر تھے، مدینہ کے یہودیوں کی "سازشوں" اگر کے وہ کر رہے تھے، کا توڑ با آسانی کر لیتے اور انہیں اپنے بہترین اخلاق سے قائل کر کے صراط مستقیم پر لے آتے. لیکن نہیں، کیونکہ شاید مدینہ کے یہودی اس عالم کے نہیں تھے. اس لیے رحمت العالمین نے انہیں نہیں بخشا. ان پر جنگ مسلط کی پروپیگنڈہ کر کے ان کا قتل عام کرایا. یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ مسلمان جو اس وقت عرب کی ابھرتی ہوئی طاقت تھی ان کی دھاک اچھی طرح وہاں کے لوگوں پر بیٹھ جاتی. چنانچہ ایسے ہر مواقع پر رحمت العالمین کی رحمت نے قطعی جوش نہ مارا. بلکہ رب العالمین بھی فرمان جاری کرتے رہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی

تمہارے دوست نہیں ہو سکتے، یوں رحمت العالمین کی رحمتوں کے بادل نہ برسے۔ اور وہ اور ان کی ابھرتی ہوئی سپاہ قتال کرتی رہی، مال غنیمت اکھٹا کرتی رہی، عورتوں کو بھنبھوڑتی رہی۔

فتوحات کے دور میں، جب جنگ و جدل پر فخر کیا جاتا تھا۔ اور اپنے مذہب اور اپنے خدا کو دوسری تہذیبوں پر مسلط کرنے کا رواج ہر خطے ہر تہذیب میں رائج تھا۔ اس وقت بھی ایسے مفکرین آتے رہے جنہوں نے اہل مذاہب کے اس فعل پر لعن طعن کی، اور فتوحات کے اڈے قائم کرنے والوں کے انسانیت سوز جرائم کے آگے انسانیت نواز نظریات کا پرچار کیا۔ ان مفکرین نے اپنی تعلیمات سے بنی نوع انسان کو محبت کا سبق اور اخلاق کا درس پڑھایا۔ جس وقت عربوں کی اخلاقی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی، اس وقت چائنا میں laoste نے انسانیت کا درس دیا۔ لیکن ان اخلاقی مفکرین نے انسان کو بغیر کسی حرص و طمع کے انسانیت کا درس دیا۔ اپنی تعلیمات کو پھیلانے کیلیے کسی جہاد کا سہارا نہیں لیا۔ اس کے بر عکس ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو جہاں سچائی ملے گی وہ وہاں کھینچے چلے آئیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ لوگ ان مفکرین کی سادہ تعلیمات اور انسان دوست نظریات کی طرف کھنچتے چلے آئے۔

ان اخلاقی مفکرین میں سے کسی ایک نے بھی اپنی "خدمات" کے عوض زن پرستی نہیں کی، ان میں سے کسی ایک مصلح نے قتل و غارت گری کا بازار گرم نہیں کیا۔ بلکہ اس کی شدید مذمت کی اور اس سے باز رہنے کو کہا۔ کسی ایک نے اپنے نظریات کا خراج خون اور عورت کی صورت میں نہیں مانگا۔ ان لوگوں نے اپنی بات نہ ماننے والوں کو جہنمی، بندر، سور نہیں کہا۔ ایسے اوچھے ہتھکنڈے نہیں اپنائے، لوگوں کو کسی قسم کا "معجزہ" دکھلا کر اپنا گرویدہ نہیں بنایا۔

انسانیت کا سبق پڑھانے والے اخلاقی مفکرین کے قریبی اصحاب کو کیسا ہونا چاہیئے؟ ظاہر ہے انسان دوست ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ انسانیت کے عظیم مفکروں کے دست راست تھے۔ اس کے بر عکس ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ کے اصحاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے تین روز قبل آپ کے گھر میں اکھٹے ہوئے تو آپ نے یہ خواہش فرمائی کے کاغذ اور قلم لایا جائے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی تحریر لکھ دیں کہ لوگ ہمیشہ کیلیے گمراہی سے بچ جائیں لیکن بعض احباب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کا احترام نہیں کیا اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہذیان گوئی کی تہمت لگائی (نعوذ باللہ)۔ چنانچہ رسول اللہ برہم ہوئے اور ان تمام اصحاب کو اپنے گھر سے نکال دیا۔

اس کے بر عکس گوتم کی موت کے وقت اس کے احباب اور شاگرد اس کے پاس آئے اور اس نے اپنے خاص شاگرد آنند کو وقت رخصت بلا کر کہا:

"اے بھکشو! اب مجھے فنا ہونا ہے، شوق و ذوق سے من کی سچائی کی جستجو جاری رکھنا چاہئیے. یاد رکھ! سچائی کو من کے علاوہ کسی اور ذات کے حوالے سے جاننے کی ضرورت نہیں."

اپنی بات مکمل کر کے گوتم سکون سے فنا کی گود میں اتر گیا. ایسے وقت میں گوتم کے کسی مصاحب نے اس پر "ہذیان گوئی" کی تہمت نہیں باندھی. بلکہ سلیقے اور محبت سے اس کی بات سنی. حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محسن انسانیت تھے، لیکن محسن انسانیت سے انسانیت والا سلوک خود ان کے اصحاب نے نہیں کیا. بدھ انسانیت کا علمبر دار تھا. اس کے اصحاب نے اس کی تعلیمات کا بھرم رکھا اور آخری وقت میں بھی گوتم کی تعظیم کی. یاد رہے دونوں انسانیت کے علمبر داروں میں تقریباً "گیارہ سو سالوں" کا فرق تھا. حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر ان کے اصحاب اقتدار کیلیے لڑتے رہے. لیکن گوتم کی وفات پر اس قسم کا کوئی ہنگامہ نہ مچا.

رحمت العالمین کے کریڈٹ پر چند کارناموں کے علاوہ ایسا کوئی کارنامہ نہیں جس بنا پر انہیں رحمت العالمین اور محسن انسانیت کہا جائے. محسن انسانیت جنہیں رحمت العالمین بنا کر بھیجا گیا. کیا انہوں نے عرب سے غلامی کے بدترین رواج کا خاتمہ کر دیا؟ ہر گز نہیں. بلکہ خود رسول اللہ نے غلام اور کنیزیں رکھیں. اور ان کنیزوں سے بغیر نکاح کے صحبت اختیار کی. کیونکہ لونڈی اور کنیز ان پر اللہ میاں نے "حلال" فرمادی تھی. بلکہ یہی نہیں، یہاں تک فرمایا گیا کہ کوئی بھی اپنی مرضی سے رسول اللہ کو عورت دان کر سکتا ہے.

غلامی ایک بدترین لعنت ہے. انسانیت کی تذلیل ہے. لیکن افسوس رسول اللہ نے غلامی کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس سے استفادہ بھی کیا. حالانکہ ان کو تمام عالموں کیلیے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا. لیکن شاید غلام نامی مخلوق اس عالم کی نہیں یا پھر انسان ہی نہیں. ورنہ محسن انسانیت سے ایسی چوک کب ہو سکتی تھی بھلا. ان کی دنیا میں تشریف آوری کا مقصد ہی بنی نوع انسان کی بھلائی تھا. اس کے برعکس ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کی بدترین رسم، روایت، رواج، ریت، بدعت جو مرضی کہہ لیں، ختم کرنے کی سعادت کافروں کے حصے میں آئی جو نہ تو رحمت العالمین بنا کر بھیجے گئے نہ ہی جن کا کام بنی نوع انسان کو سیدھی راہ پر لانا تھا.

یہ کافر ابراہم لنکن، ولیم فورس وغیرہ تھے. ابراہم لنکن نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے ۱۸۶۳ میں حبشیوں کی آزادی کا اعلان کیا. اس نے اس ضمن میں تحاریک چلائیں اور سر توڑ کوششیں کیں. اس کے نزدیک غلامی انسانیت سوز اور غیر فطری ہے. انسانوں کو غلام بنا کر ان کا استحصال کرنے کے خلاف سب سے موثر آواز برطانیہ کے امیر ولیم فورس نے اٹھارویں صدی میں اٹھائی. ولیم نے ۱۷۸۷ میں پارلیمنٹ میں پہلی بار غلاموں کی تجارت کے خلاف بل پیش کیا. لیکن شنوائی نہ ہوئی. لیکن اس نے ہمت نہ ہاری. وہ ہر سال اسمبلی میں بل پیش کرتا رہا. یہاں تک کے بیس برس بعد ۲۵ مارچ ۱۸۰۷ میں جیت گیا. یوں ۲۵ مارچ ۱۸۰۷ کو برطانیہ

میں غلاموں کی تجارت پر پابندی لگ گئی. ہر سال برطانوی عوام ۲۵ مارچ کو غلامی کی بدترین اور قبیح رسم ختم کرنے کی یاد میں ولیم ویلبر فورس کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جس نے انسانوں کو انسان ہونے کا فخر واپس کر دیا.

اس احسن کام کو محسن انسانیت بھی کر سکتے تھے؟ جو بنی نوع انسان کیلیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے. غلامی کے بدترین اور انسانیت سوز عمل کو تاریخ میں تقریباً ہر مصلح ہر بادشاہ نے جاری رکھا. افسوس تو یہ ہے کہ محسن انسانیت نے بھی اس عمل کی مذمت نہیں کی بلکہ اس کو جاری رکھا. پتہ نہیں کیوں اللہ نے ہر اچھے کام کافروں کے نصیب میں لکھ دیئے ہیں. ہمارے پیارے رسول اللہ کو اللہ تعالی نے دو جہانوں کی بادشاہت عطا کی لیکن اس نیک کام کو سرانجام دینے کیلیے اخلاقی جرآت عطا نہیں کی کہ وہ ابراہم یا ولیم کی طرح غلامی کی لعنت کو اپنی تہذیب سے اکھاڑ پھینکتے. کیا محسن انسانیت انسانوں کو انسان ہونے کا فخر واپس نہیں کر سکتے تھے؟ اگر رسول اللہ واقعی رحمت العالمین تھے تو غلامی کو ختم کر سکتے تھے. اگر سماجی و معاشی مجبوریاں ان کے راستے میں حائل تھیں تب ان میں اور عام انسان میں کیا فرق رہ گیا؟

تاریخی مادیت ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارا وجود، یعنی سماجی وجود ہمارے شعور کو محدود کرتا ہے. لہذا اس تناظر میں یہ سوال اپنی اہمیت کھو دیتا ہے کہ رسول اللہ نے چودہ سو سال پہلے غلامی ختم نہ کی. کیونکہ پھر وہ دیگر انسانوں جیسا سماجی شعور و آگہی رکھنے والے تھے. اگرچہ محسن انسانیت نے بہت سی باتوں پر شرائط رکھیں کہ غلام آزاد کرو تو ثواب ملے گا، ان سے اچھا سلوک کرو. یعنی اس دور میں بھی ان کو غلام آزاد کرا دینے کی فکر تھی. جبکہ اس طرح کی کئی مثالیں اس سے قبل کی تاریخ میں مل جاتی ہیں، لہذا سماجی شعور اتنا تھا کہ غلامی کی لعنت سے چھٹکارے کیلیے کچھ عملی اقدام کیے جاتے. جبکہ ہونا تو یہ چاہئیے تھا کہ رسول اللہ کا شعور اس وقت کے سماجی شعور کے حساب سے نہ ہوتا. کیونکہ بالآخر دو جہانوں کا علم ان کو دیا گیا تھا. اور ان کے پاس قرآن جیسی حکمت بھری کتاب بھی تھی. جس میں ہر طرح کا علم ہے.

عرب چودہ سو سال پہلے تجارت کرتے تھے کیونکہ انہیں اور کچھ نہ آتا تھا، اور اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قبائلی معاشرہ ہی تھا. ہر قبیلے کے اپنے قوانین تھے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے قوانین لاگو کر کے اس کو قبائلی نظام سے نکال کر ایک ریاست اور بادشاہت کی طرف ہی لیکر گئے تھے. حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو سال پہلے ٹرین تو نہیں بنا سکتے تھے نہ ہی پولیو ویکسین ایجاد کر سکتے تھے، مگر انہوں نے وہ سب کیا جس کی ان کو عرب قبائلی نظام اجازت دیتا تھا. جیسے شراب کو تیرہ سال بعد سختی سے اس وقت منع کیا جب ان کے پاس مکمل طاقت آ گئی تھی. غلامی ختم کرنا ان کے بس میں نہیں تھا اس لیے نہیں کر سکے. کیونکہ رحمت العالمین کا سماجی شعور اس وقت کے حساب سے ہی تھا.

کوئی صاحب غلامی کو جتنا مرضی خوش کن بنا کر پیش کر دیں، کتنی ہی تاویلیں گھڑلیں، کتنی ہی احادیث لے آئیں کے غلاموں کو آزاد کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ان سے اچھا سلوک کرو وغیرہ وغیرہ لیکن اس سب سے بہر حال حقیقت پر فرق نہیں پڑنے والا. غلامی بہر حال غلامی ہے. جو کسی بھی حال میں یا رنگ میں ہو بہر حال انسانیت سوز ہے. جتنا مرضی کہہ لیں کے فلاں غلام فلاں عہدے پر پہنچا. ڈھمکاں غلام نے اتنی ترقی کی. مگر کیا وہ آزاد ہو گیا؟ وہ بہر حال غلام ہی رہا. اور غلام جتنی مرضی ترقی کر لے، اسے بہر حال غلام ہی پکارا جائے گا. اس لفظ کو عزت و تکریم کے مابعد الطبعی افق پر پہنچا دیں، لیکن اس لفظ سے جڑی حقیقت اسے بے توقیر ہی رکھے گی. اس کا استہزا اڑ تا رہے گا. مذاق بنتا رہے گا. غلام اور غلامی کو کوئی مہذب معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا. جتنی مرضی اس پر حسن وو قار کی لیپا پوتی کر لی جائے، حقیقت وہی، نتیجہ وہی رہنا ہے: "ڈھاک کے تین پات".

اخلاقیات کا تعلق سماجی شعور سے ہوتا ہے. اخلاق افراد کے مابین باہمی تعامل کا نام ہے. میکس شیلر کا کہنا ہے کہ اقدار مثالی معروض ہیں جو ایک عالم اقدار سے تعلق رکھتی ہیں اور ہم تک ایک منفرد حساس قدر میں پہنچتی ہیں. یہ حساس قدر عام نفسیاتی اور تاثراتی تجربات سے مختلف ہے. یہ موضوعی کیفیت نہیں بلکہ خارجی معروضی حقیقت کی جانب ایک منفرد عمل ہے. بہر حال اخلاقی قدروں کی فلسفیانہ بحث سے قطع نظر ہمیں اس سے سروکار کرنی چاہیے جو اخلاقی قدروں اور سماجی شعور کا تعلق جوڑتی ہیں. جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یورپ و امریکہ میں اخلاقیات نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہاں anti-bullying قوانین بنائے جا رہے ہیں. جس کی رو سے اگر آپ کسی نظر کا چشمہ لگانے والے کو چشماٹو کہہ دیں یا پھر اس کی تضحیک کیلیے کوئی اور غیر مناسب یا اخلاق سوز پھبتی کسیں، تب ان اخلاقی قوانین کے تحت آپ پر فرد جرم بھی عائد کی جا سکتی ہے. جرمانہ بھی ہو سکتا ہے. جبکہ محسن انسانیت اور رب العالمین کا اخلاقی شعور اس وقت کے سماجی شعور کے حساب سے ہی تھا. رسول اللہ کو بات بے بات لعنت ملامت کرنے کا ازحد شوق تھا. وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو صرف اس بات پر جھنجھلا کر لعنت ملامت کرتے تھے. کیونکہ وہ ان کی بات نہیں مانتے تھے. اور رحمت العالمین کو زچ کرنے کیلیے خوب عقل کے گھوڑے دوڑاتے تھے. اور جو رسول اللہ کی بلا چوں چرا مان لیتے، ان پر بالکل لعنت نہ فرماتے. بلکہ کہتے کہ میں راضی تے رب راضی.

رب العالمین نے اپنے کلام میں جا بجا خود اپنی ہی مخلوق انسان کو بندر، سور، ملعون اور نجانے کیا کیا گالیوں کو سنوں سے نوازا. اگر محسن انسانیت اور رب العالمین عہد حاضر میں یورپ و امریکہ کے شہری ہوتے تو وہاں کے مروجہ اخلاقی قوانین کے تحت اس قسم کے غیر مہذبانہ رویوں پر فورا دھر لیے جاتے. اور قانون تو پھر قانون ہوتا ہے. قید بھی ہو سکتی ہے اور جرمانہ بھی. استغفر اللہ. لیکن اللہ تعالی کیونکہ رب العالمین ہیں اور انسان سے ستر ماؤں جتنی محبت بھی کرتے ہیں چنانچہ اگر کچھ گالیاں قرآن میں ارشاد کر ہی دی ہیں تو ہمیں اس پر بالکل خفا نہیں ہونا چاہیے. قادر مطلق ہے. اور "جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے". اور

رحمت العالمین بھی چونکہ محسن انسانیت ہیں، اور انسانیت کو "انسانیت" کے مقام پر فائز کرنے آئے تھے. لہذا اگر کوئی انسان خود ہی انسانیت کی صف میں آنے کو تیار نہ ہو، تب اس قسم کے نہ ماننے والوں پر رسول اللہ کا جھنجھلا کر لعنت ملامت کرنا عین جائز حق ٹھہرتا ہے. سور، بندر وغیرہ کہنا اس صورت میں قطعی جائز تھا. اور اس پر کسی کو چنداں برا نہیں منانا چاہیے. بلکہ خندہ پیشانی سے ان ملامتوں، گالیوں، کوسنوں کو قبول کرنا چاہیے. اور اس طرح کی باتیں کرنا بھی ہمیں زیب نہیں دیتا. لہذا آگے بڑھتے ہیں. اور دیکھتے ہیں کہ اخلاقی معیار کس قسم کا ہونا چاہیئے.

کچھ عرصہ قبل میرے ایک جاننے والے نے بتایا کہ اس کے خاندان کے ایک بزرگ جن کی عمر کوئی پچپن ساٹھ سال ہو گی. جو بلا کے متقی، پرہیزی، نمازی، ولی، صوفی، حاجی، باریش بارعب وغیرہ وغیرہ ہیں. ان کے ساتھ یکایک نظر کا ایک حادثہ پیش آ گیا. انہیں خود سے عمر میں کئی گنا چھوٹی بچی پسند آگئی. اور وہ اس چھوٹی عمر کی نابالغ بچی سے شادی کے شدید خواہشمند ہو گئے. جس کی عمر گڑیوں سے کھیلنے، سہیلیوں سے اٹھکیلیاں کرنے، ہم جولیوں سے لڑنے جھگڑنے اور پڑھنے لکھنے کی تھی. لیکن ان بزرگ نے ہر شرم کو بالائے طاق رکھ کر اس معصوم بچی سے شادی کرکے ہی دم لیا. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بزرگوار کی یہ حرکت قابل ستائش اور صد آفرین ہے، ایک انقلابی قدم ہے معاشرے کو بدلنے کا، جہالت مٹانے کا؟ آپ کے خیال میں ان بزرگوار کو بہترین اخلاق کا مالک گردانا جا سکتا ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ عمل اخلاقی، معاشرتی اور سماجی جرم نہیں؟ کیا آپ ان بزرگ کہ اس عمل پر ان کو داد سے نوازیں گے جنہوں نے پیرانہ سالی کی عمر میں ایک دس سال کی نابالغ بچی سے محض اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کیلیے بیاہ رچایا؟ کیا آپ ایسے شخص کو قابل تعظیم گردانیں گے اور اس کے اس عمل کو جائز قرار دیں گے؟ اگر آپ کا جواب ہاں ہے تب یقین کریں یا نہ کریں لیکن آپ نے اخلاقیات کی قبر کو ایک عظیم لات شریف رسید کردی ہے. اگر آپ "واقعتاً اور حقیقتاً" اس عمل کو احسن سمجھتے ہوئے اس کی تائید کیلیے تاویلات ڈھونڈ لانے میں پیش پیش ہیں، تب آپ معاشرے اور سماج میں ہونے والے کسی بھی اخلاقی جرم کی مذمت شریف کرنے کے قطعی مجاز نہیں ہیں. لیکن خدانخواستہ اگر ایسی ہی صورتحال آپ کی اپنی عزیز خواتین میں سے کسی کے ساتھ درپیش ہو؟ تب؟ اب بھی اگر آپ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنی عقیدت پر قائم ہیں، تب آپ منافقت کر رہے ہیں. ایک بدترین منافقت. جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ میں اتنی اخلاقی جرآت نہیں کے غلط کو غلط کہہ سکیں.

خیر، اگر محسن انسانیت ہی کہنا ہے تو اس انسان کو کہیے جو واقعتاً اور حقیقتاً اس گرانمایاں لفظ کا صحیح معنوں میں حق دار ہو. ڈاکٹر یونس جیسے لوگوں کو کہیے. جس نے گرامین بینک جیسے بینک کی بنیاد رکھی. جو بینک سے زیادہ ایک سماجی ادارہ ہے. جس سے دنیا کے پندرہ کروڑ لوگ فائدہ اٹھا چکے ہیں. اس بینک نے بنگلہ دیش کے لاکھوں مزدوروں کو خیرات، زکوۃ، صدقات، بھیک لینے

والوں کے بجائے معاشرے کا کارآمد اور فعال رکن بنادیا. گرامین بینک کی تقلید میں اب دنیا بھر میں بینک بتائے جارہے ہیں.
محسن انسانیت ہی کہنا ہے تو عبدالستار ایدھی، مدر ٹریسا، فلورینس نائٹ اینگل جیسے عظیم انسانوں کو کہیے. ٹھہریئے! اگر ان عظیم انسانوں کو بھی محسن انسانیت کہنا گوارا نہیں تب کلکتے کی ایک مشہور مغنیہ گوہر جان کو ہی اس منصب پر فائز کردیجیے. جس کے اخلاق کے آگے محسن انسانیت کا اخلاق ہیچ ہے. جس نے اپنی گزر بسر کرنے اور معاشرے میں اعلی مقام حاصل کرنے کیلیے کسی مالدار شخص سے شادی نہیں کی. جس پر اکبر الہ آبادی نے فرمایا:

"خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا"

گوہر جان نے اپنے فن کی کمائی کھائی اور غریبوں، فقراءومساکین پر بے دریغ لٹائی. اور بدلے میں ان کی وفاداریاں نہ مانگیں. نہ ہی اپنی بات ماننے اور تعظیم کرنے کو کہا. گوہر جان آرمینیا میں پیدا ہوئی. وہ ہندوستان کب اور کن حالات میں آئی یہ تو معلوم نہیں. البتہ اس کا بچپن ہندوستان میں گزرا. وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ خوبصورت آواز کی مالک تھی. اور بہترین رقاصہ بھی تھی. اردو، ہندی، فارسی، عربی، بنگالی، انگریزی، سنسکرت زبانوں کی ماہر تھی. اس کی مقبولیت مشرق و مغرب میں یکساں تھی. برٹش گورنمنٹ نے اسے کئی اعزازات سے نوازا. جب شہنشاہ جارج پنجم نے دہلی میں اپنا دربار منعقد کیا، گوہر جان کی خدمات کے اعتراف میں اسے سونے اور چاندی کے تمغوں سے نوازا. گوہر جان نعت پڑھتی یا بھجن گاتی تو مجلس میں شریک ہر ذی نفس کو گویا سانپ سونگھ جاتا. لوگوں پر ایک وجد ساطاری ہوجاتا اور حاضرین محفل جھومنے لگتے. چاہے وہ ہندو ہوں یا سکھ ہوں، مسلمان ہوں یا عیسائی ہوں یا یہودی. گوہر جان بلاشبہ ایک بڑی فنکارہ تھی. جس کا جادو مغرب و مشرق میں یکساں چلتا تھا. وہ لاکھوں نگاہوں کا مرکز اور لاکھوں دلوں پر راج کرتی تھی. اس نے فلاح عامہ کے بے تحاشہ کام کیے. کئی یتیم خانے، اناج گھر وغیرہ اس کے عطیات سے چلتے تھے. وہ بلا کی غریب نواز تھی. اس نے اپنی موت سے کچھ روز قبل اپنا تمام اثاثہ، جو اس وقت بھی کروڑوں میں تھا شہر کے غریبوں میں تقسیم کردیا. بلاشبہ اسے بھی ان ہستیوں میں گنا جاسکتا ہے جو حقیقی معنوں میں محسن انسانیت کہلائے جانے کی حقدار ہیں. گوہر نے کبھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائی چہ جائیکہ جنگ جیسی واہیات شے کسی پر مسلط کرکے اس کے ناک میں دم کرتی.

اگر گوہر جان پر بھی آمادہ نہیں بل گیٹس کو کیوں نہیں کہتے؟ میری نظر میں بل گیٹس اس وقت دنیا کا سب سے بڑا انسان ہے. جس نے ۲۰۰۸ میں اعلان کیا کہ وہ مائیکروسافٹ کو چھوڑدے گا اور اپنی باقی ماندہ زندگی بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہوئے گزارے گا. چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، اس کے شب وروز فلاح عامہ کے کاموں میں گزرتے ہیں. اس کا زیادہ وقت "بل اینڈ

میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن" کا ہے. بل گیٹس اپنی نوعیت کا واحد شخص ہے جس نے پوری تاریخ میں عام انسانوں کی خدمت کیلیے اس دنیا کی سب سے بڑی کمپنی چھوڑ دی. گویا انسانیت کی خدمت کرنے کیلیے بادشاہت چھوڑ دی. اس کا کہنا ہے کہ اس کی دولت اس دنیا کے ضرورتمندوں کیلیے ہے اور وہ اپنے بچوں کو ورثے میں صرف ایک ایک ملین ڈالر دے گا. بل گیٹس متعدد بار دنیا کی امیر ترین اشخاص کی فہرست میں سرفہرست رہا ہے. لیکن "بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن" کی بدولت وہ رہتی دنیا تک دنیا کا سب سے بڑا انسان رہے گا.

کیا آپ بل گیٹس جیسے عظیم ترین انسان کو محسن انسانیت، رحمت العالمین کہنے کی اخلاقی جرآت بھی نہیں کر سکتے؟ کیوں کہ اس سے عقیدے اور تقدس پر ضرب پڑتی ہے. کیونکہ عقیدہ تو کہتا ہے کہ رحمت العالمین صرف رسول اللہ ہیں. اور محسن انسانیت بھی صرف انہیں کہا سنا جائے، بیشک انہوں نے انسانیت کیلیے کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دیا تو کیا ہوا. ایک بل گیٹس پہ کیا موقوف، ایسے عظیم ترین انسان دوستوں کی طویل فہرست ہے. جن کی انسانیت کیلیے کی گئیں خدمات کسی بھی پیغمبر / مصلح کو شرما دینے کیلیے کافی ہیں. انہی میں سے ایک وارن بفٹ ہیں جنہوں نے اپنی دولت کا ۸۷ فیصد حصہ بل گیٹس کی فلاح و بہبود کی فاؤنڈیشن کو عطا کر دیا. ان کا کہنا ہے کہ:

"میں نے بل گیٹس کی فاؤنڈیشن کو اس لیے منتخب کیا کہ یہ امریکہ کا واحد ادارہ ہے جو اپنے فنڈز کا ۷۰ فیصد حصہ امریکہ سے باہر دوسرے ممالک میں خرچ کرتا ہے. اور یہ امیر ترین شخص آج بھی سادہ ترین زندگی گزارتا ہے."

اگر آپ ان کافروں پر بھی مطمئن نہیں، تب اور بہت سے کافر ہیں. انگوار کیمپارڈ ہے. جو اپنی نوعیت کا واحد شخص ہے جسے اسراف پسند نہیں. حد درجے سادہ زندگی بسر کرتا ہے. ایک روپیہ فالتو نہیں خرچتا، بلا کا کنجوس ہے. لیکن بات جب فلاح عامہ کے کاموں کی ہو تب وہ لاکھوں کروڑوں ڈالر بلا دریغ خرچ کر ڈالے گا. ایک طرف وہ اپنے کسی ورکر کو کاغذ تک ضائع کرنے پر سرزنش کرتا ہے تو دوسری طرف اربوں کھربوں ڈالر خیرات کر دے گا لیکن اس کی تشہیر نہیں ہونے دے گا. اکانومسٹ میگزین کے مطابق انگوار کیمپارڈ، بل گیٹس سے بھی زیادہ رقم فلاح عامہ میں خرچ کرتا ہے. اس نے INGKA Foundation کے نام سے ایک فلاحی ادارہ بنا رکھا ہے اور اس ادارے کے ذریعے اب تک تقریباً پچاس بلین ڈالر کی چیرٹی کر چکا ہے.

محسن انسانیت ہی اگر کہنا ہے تو ان لوگوں کو کہیئے جنہوں نے اصل معنوں میں انسانیت کی خدمت کی اور انسانیت کیلیے سوچا. یہ لفظ ان عظیم لوگوں پر ہی جچتا ہے، جو اصل معنوں میں اس کے حقدار ہیں. "گول" اور "فوڈ بینک" جیسی تنظیمیں بنانے والوں کو

کہئیے. نیلسن منڈیلا، میلکم ایکس کو کہئیے. کارل مارکس کو کہیے جو انسان کے غم میں رویا، جسے مزدوروں کا غم کھا گیا. جس نے انسانی مساوات کیلیے بلند ترین آواز اٹھائی. جس نے انسان کی وحدت کا خواب دیکھا.

یہ پیغمبران جو تاریخ میں نظر آتے ہیں، جو انسان اور انسانیت کے سب سے بڑھ کر وارث اور ٹھیکیدار نظر آتے ہیں. انہوں نے کیا کیا ہے؟ کون سا ایسا کارنامہ کیا ہے جو انسانیت کے مفاد میں ہو؟ کیا انہوں نے انسانیت کو بانٹنے اور نفرتیں پیدا کرنے کیلیے مذہب ایجاد نہیں کیا؟ جو رہتی دنیا تک، انسان کو انسان سے لڑاتا رہے گا. نفرتیں بانٹتا رہے گا. ان میں تفریق پیدا کرتا رہے گا. تقسیم کرتا رہے گا. یہ اور ان کے پیروکار دراصل انسانیت سے خارج ہیں کیونکہ انہوں نے ایسا لازوال فارمولا مذہب کی صورت میں انسان کو تھما دیا ہے، جو انسانوں میں تفریق اور امتیاز پیدا کرتا رہے گا. فسادات پیدا کرتا رہے گا. جبر ان انہی تفریق اور امتیاز کرنے والوں کے متعلق کہہ گئے ہیں کہ یہ درحقیقت مردہ ہیں لیکن ان کو اب تک لحد میں نہیں اتارا گیا.

انسانی تقسیم کا فارمولا بنانے والوں کو محسن انسانیت، رحمت العالمین جیسے القاب سے نوازنا، کل انسانیت کے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہے. وہ جو باغی ہیں، جو آزادی کی علمبردار روحیں اور محبت کے پیغمبر ہیں، تمام اشیا کی آفاقیت، اتحاد اور شخصی آزادی پر یقین رکھتے ہیں. یہ وہی تو ہیں جنہوں نے انسانیت کے مفاد میں کام کیے. اور ہر چیز پر انسانیت کو مقدم سمجھتے ہیں. بس انسان کو ہی ہر چیز پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے. چاہے وہ عقیدہ ہو یا کوئی نظریہ، کسی کو انسان پر فوقیت حاصل نہیں. عقائد انسانیت کی تقسیم کا باعث ہیں. مذہب اور مذہبیت، انسانیت کے استحصال پر کھڑے ہیں. منشور انسانیت کسی ایسے نظریے، قاعدے، اصول، عقیدے کو نہیں مانتا جو انسان دشمنی کو فروغ دے. اس منافقت سے بھی باز آئیں جو کسی نام نہاد انسانیت کے علمبردار کو محسن انسانیت کہنے پر مجبور کرتی ہے.

محسن انسانیت ہی کہنا ہے تو ان سائنسدان حضرات کو کہیے جنہوں نے انسانیت کو بہم آسانی پہنچانے کیلیے اتنا کچھ ایجاد کیا. جنہوں نے زندگی کو سہل ترین بنا دیا، پر آسائش بنا دیا. ان لوگوں کو کہیے جن کی بدولت میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کی، اور کئی بیماریوں کا علاج دریافت کیا اور کئی کا علاج ڈھونڈا جا رہا ہے. جنہوں نے ہر قسم کی ویکسینیشن ایجاد کی، جنہوں نے انتہائی خطرناک بیماریوں کا علاج ڈھونڈا. ورنہ محسن انسانیت تو یہ کہہ کر فارغ ہو گئے تھے کے اونٹ کا پیشاب پیجیے پڑیئے گر بیمار!

ان ایجادات کرنے والے موجد حضرات کو محسن انسانیت کہیے جن کی ایجادیں، آپ ہر وقت ہر جگہ استعمال کرتے ہیں. ان محقق حضرات کو کہیے جن کی دریافت کے بدولت انسان کا علم یہاں تک پہنچا کہ جن کے بغیر عام زندگی تک میں گزارا نہیں. لیکن

ان سب چیزوں سے استفادہ کرنے کے بعد بھی انہیں کافر، ملعون، زندیق، جہنمی اور "جاہل" گردانا جاتا ہے. اور انہیں محسن انسانیت کہا جاتا ہے جنہوں نے انسانیت کیلیے کچھ نہ کیا.

لگتا ہے اللہ میاں نے ہر اچھا کام ان لوگوں کے نصیب میں لکھ دیا ہے. جو اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے، جو کافر، بندر، سور، بدترین جانور، ملعون وغیرہ ہیں. لیکن محسن انسانیت کو ان اچھے کاموں کی بالکل توفیق نہ دی اور انہیں بغیر کسی اچھے کام کے سب سے افضل سب سے محبوب قرار دے کر رحمت العالمین کے درجے پر فائز کر دیا. صرف ایک ایسا کام جو محسن انسانیت کے کریڈٹ پر ہو جس سے تمام انسانیت نے فیض اٹھایا ہو یا اٹھا رہی ہو؟ اس کے برعکس ان کی ہر سنت پر بیک وقت ہزاروں فرقے لڑ رہے ہیں. قرآن کی ایک آیت کے ترجمے سے لیکر تفسیر تک پر، بیک وقت سینکڑوں فرقوں کے کروڑوں لوگ لڑ رہے ہیں، جھگڑ رہے ہیں، کشتوں کے پشتے لگا رہے ہیں. اب بھی انہیں محسن انسانیت، رحمت العالمین کہہ کر پکارا جائے؟

"شرم تم کو مگر نہیں آتی"

شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار

حمزہ کاشغری، ایک سعودی شاعر اور صحافی جو سعودی عرب کے اخبار "البلاد" میں کالم لکھا کرتا تھا، 1989ء میں پیدا ہوا۔ 2011ء سے حمزہ کاشغری اپنی جمہوریت پسند سرگرمیوں کی بدولت سعودی خفیہ ایجنسی (مباحث) کی نظروں میں کھٹک رہا تھا، پھر معروف سوشل نیٹ ورک ٹیوٹر پر پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنے تین توہین آمیز ٹویٹس شائع کرنے کی وجہ سے متنازعہ شخصیت بن کر ابھرا۔ انتہاءپسند ملاؤں کے دباؤ کے باعث سعودی فرماں رواشاہ عبداللہ نے حمزہ کاشغری کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے، کیونکہ ان تین ٹویٹس کی بدولت حمزہ کاشغری "توہین رسالت" کا ارتکاب کر کے سعودی حکمرانوں اور مسلمانوں کی قوت برداشت کی حد کو پار کر چکا تھا۔
4 فروری 2012ء کو میلادالنبی کے موقع پر حمزہ کاشغری نے اپنی اور پیغمبر اسلام کے مابین ہونے والی تصوراتی ملاقات کے بارے میں اپنے اُن مشہور و معروف ٹویٹس میں لکھا تھا کہ:
1- فی یوم مولدک سأقول: نی احببت الثائر فیک، لطالما کان ملھمالی، و انی لم احب ھالات القداسۃ، لن اصلی علیک۔
(ترجمہ) تمہاری سالگرہ کے موقع پر میں یہ کہوں گا کہ: تمہارے اندر پائے جانے والا باغی مجھے پسند ہے، جب تک کہ تم میرے لئے متاثر کن شخصیت رہے، لیکن میں نے تمہارے گرد تقدیس کے ہالوں کو کبھی پسند نہیں کیا۔ میں ہر گز تم پر درود نہیں پڑھوں گا۔

2- في يوم مولدک أجدک في وجهي أينما اتجهت سأقول أنني أحببت أشياءً فيک، وكرهت أشياءً ...... ولم أفهم الكثير من الأشياء الأخرىٰ۔

(ترجمہ) تمہاری سالگرہ کے موقع پر میں جہاں بھی دیکھتا ہوں تمہیں ہی پاتا ہوں، مجھے تمہاری بعض باتیں پسند ہیں، اور کچھ باتیں ناپسند، اور بہت ساری دوسری باتیں سمجھ سے بالاتر ہیں۔

3- في يوم مولدک لن أنحني لک، لن أقبّل يديک، سأصافحک مصافحة الندّ للندّ، وابتسم لک كما تبتسم لي، وأتحدّث معک كصديق فحسب .... ليس أكثر۔

(ترجمہ) تمہاری سالگرہ کے موقع پر، میں تمہارے لئے ہرگز نہیں جھکوں گا، نہ تمہارے ہاتھ چوموں گا، میں تم سے ایسے ہی ہاتھ ملاؤں گا جیسے کوئی حریف اپنے حریف سے ہاتھ ملاتا ہے، اور میں بھی تمہارے لئے ایسے ہی مسکراؤں گا جیسے تم میرے لئے مسکراؤگے، (زیادہ سے زیادہ) میں تم سے اپنے کسی ساتھی کی طرح پیش آؤں گا، بس۔۔۔اس سے زیادہ نہیں۔

اسلام اور جدیدیت کا خوف

گذشتہ 1400 سالوں میں اسلام کو بہت سے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، جیسے پیغمبر اسلام کے انتقال کے فوراًبعد خلافت کا مسئلہ، ارتداد کی تحریک، نت نئے مدّعیان نبوت کا سامنا، تسنن و تشیّع کا اختلاف، خلافت کا ملوکیت میں تبدّل، فکر اعتزال، فلسفۂ یونان کا عربی میں ترجمہ کے باعث فکری بحران، تاتاری یلغار، صلیبی جنگیں، عرب و عجم کے اقتدار کی چپقلش، وغیرہ۔ مسلمانوں نے کہیں عسکری قوت کی بدولت، کہیں انتظامی جوڑتوڑ کے ذریعے، کہیں مصلحت و حکمت کے ذریعے اور کہیں دھونس اور دھاندلی کے ذریعے جیسے تیسے ان مشکل حالات کو بالآخر اپنے حق میں موڑ ہی لیا۔

جب مسلمانوں کو جزیرہ نما عرب سے باہر کی ثقافتوں کے ساتھ میل جول کا موقع میسر آیا، تو ایسے نئے نئے مسائل نے جنم لینا شروع کیا، جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی رہنمائی میسر نہیں تھی۔ یہ انتہائی پریشان کن صورت حال تھی اس صورت حال میں علماء اسلام نے بدلتی ہوئی صورت حال کے تقاضوں کے مطابق اسلام میں ایک نئ اصطلاح متعارف کرائی جسے "فقہ" کے نام سے جانا جاتا ہے، کیونکہ اس سے قبل اسلامی تعلیمات میں فقہ نامی کسی اصطلاح کا وجود نہیں تھا، لیکن اس زمانے کے فقہاء، علماء، اور محدثین نے اسلام کو جمود کا شکار ہونے سے بچانے کیلئے اسلامی تعلیمات کی تشریحات کا رخ موڑتے ہوئے "کتاب و سنت" کے علاوہ "قیاس" اور "اجماع" کی نئ اصطلاحات کو متعارف کروایا اور اسلامی تعلیمات کو بانجھ ہونے سے بچانے کیلئے "کتاب و سنت" کے علاوہ "قیاس" اور "اجماع" کو اسلامی قانون سازی کے بنیادی مصادر میں شامل کر اسلام میں ایک نئ روح پھونک دی گئی۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبر اسلام کا مشہور قول ہے کہ "ترکت فیکم ماان تمسکتم بہ لن تضلوا ابعدي کتاب اللہ وسنتي " یعنی "میں تم میں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت چھوڑے جارہا ہوں، جب تک ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے "پیغمبر اسلام کے اس قول کی روشنی میں بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ اسلام میں قانون سازی کیلئے قرآن و سنت کے علاوہ کسی اور مصدر کا اضافہ کیا جاسکے۔ لیکن اس زمانے کے علماء نے اس بات کا بخوبی ادراک کرلیا کہ قیاس اور اجماع کو شریعت کے مصادر میں جگہ دیئے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہے اور اس رکاوٹ کو ختم کرنے کی خاطر قول رسول پر اضافہ بھی کرنا پڑجائے (یابالفاظ دیگر معروف تشریح کو تبدیل بھی کرناپڑجائے) تو اسے گوارا کئے بغیر کوئی اور راستہ نہیں۔

اس زمانے کے علماء کرام نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اسلام کو درپیش ایک بہت اہم چیلنج سے بخوبی نپٹتے ہوئے دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ اس موقع پر ایسا بھی نہیں ہوا کہ فقہاء نے اصول شریعت میں قیاس اور اجماع کے اضافے کی ضرورت سمجھی اور بغیر کسی مزاحمت کے یہ اضافہ کردیا گیا، بلکہ قیاس اور اجماع کو اصول شریعت میں اضافہ کرنے کے خلاف بھی آواز تو اٹھی، لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے کے مترادف کوئی اور چارہ بھی نہ تھا، اس لئے ان "بدعتی علماء" کے خلاف آواز زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوسکی اور ان بدعتی علماء کے فیصلے کو قبول عام کا درجہ حاصل ہوگیا، اور مخالفانہ آواز دم توڑ گئی۔

تمام مشکل مراحل سے بخوبی گذرنے والے اسلام کو آج جدیدیت کا چیلنج درپیش ہے، اور یہ چیلنج سابقہ تمام چیلنجز سے مشکل ترین چیلنج ثابت ہوا ہے، یہ چیلنج اس لئے مشکل نہیں ہے کہ یہ واقعتاً ایک مشکل چیلنج ہے بلکہ یہ چیلنج اس لئے مشکل ترین ثابت ہورہا ہے کہ آج اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کیلئے اہل علماء دستیاب نہیں ہیں، علماء اسلام کی اکثریت جمود پسند ہے اور جمود کو توڑے بغیر جدیدیت کے چیلنج کا سامنا ممکن نہیں۔ آج عالم اسلام جدیدیت کے خوف میں مبتلا ہے اور جدیدیت، اسلام کیلئے ایک ڈراونے خواب کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔

مسلمان انتہائی فخر کے ساتھ دنیا کو بتاتے ہیں کہ جدید سائنس کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے یہ بنیاد سائنس کو مسلمانوں نے فراہم کی، اور مغرب نے تمام تر سائنسی علوم مسلمانوں سے ہی حاصل کئے، مغرب کی تمام تر سائنسی ترقی کی ابتداء مسلمانوں سے ہی ماخوذ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ آپ کی ہی میراث ہے، اس عمارت کی بنیادیں آپ کی ہی فراہم کردہ ہیں، آپ نے ہی ان علوم کو بنیادی معیارات عطا کئے تھے، تو آج مسلمان اپنی اسی میراث کو اپنانے میں دنیا بھر سے پیچھے کیوں ہیں؟ جس عمارت کو بنیادیں آپ نے فراہم کیں اگر وہ عمارت آج ایک پرشکوہ نمونے میں ڈھل چکی ہے تو آپ کو اس عمارت سے کفرو بدعت کی بدبو کیوں آنے لگی؟ اگر گذشتہ کل اہل مغرب آپ سے سائنسی علوم مستعار لے رہے تھے تو یہ گذرا ہوا ماضی آپ کیلئے اس حد تک قابل فخر ہے کہ اسے بیان کئے بغیر آپ کی عظمت رفتہ کی داستان مکمل نہیں ہوتی، اور آج اگر آپ کو وہی علوم اہل مغرب سے حاصل کرناپڑرہے ہیں تو آپ شرمندگی، ہچکچاہٹ، جھجک، احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور آپ کی جھوٹی خود

ساختہ عزت نفس مجروح ہونے لگتی ہے۔ آج اہل مغرب سے اپنی گم گشتہ میراث کو دوبارہ حاصل کرتے ہوئے آپ کو اپنا ایمان خطرے میں محسوس ہوتا ہے۔

یہ بڑی دلچسپ صورت حال ہے کہ ایک طرف عالم اسلام کے ممتاز علماء کرام قرآن سے سائنس کو ثابت کرنے پر لگے ہوئے ہیں اور دوسری جانب کچھ ایسے علماء کرام بھی ہیں جو قرآن سے ہی سائنس کو غلط ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اور یہ صورت حال اس مغالطے کی وجہ سے ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے درست اور غلط ہونے کیلئے قرآن کو معیار بنالیا ہے، حالانکہ سائنس کو درست ثابت کرنے کیلئے یا غلط ثابت کرنے کیلئے مسلمانوں کو سائنسی علوم میں مہارت اختیار کرنا ہوگی، اگر آج مسلمانوں کو چارلس ڈارون، آئن اسٹائن، اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات سے اتفاق نہیں ہے اور انہیں غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اپنی صفوں میں انہی کے پائے کے سائنسدان پیدا کرنا ہوں گے نا کہ شیخ عبد اللہ بن باز، شیخ طنطاوی، ذاکر نائک، ہارون یحیٰی۔

دنیا میں جو مذاہب تبدیلی کے چیلنج کا سامنانہ کر پائے وہ اپنی افادیت یا اپنا وجود کھو بیٹھے، ماضی میں یہی صورت حال عیسائیت کو بھی درپیش ہوئی، اور عیسائیت کو پاپائیت کے شکنجے سے نجات نصیب ہوئی، اگر آج عالم اسلام کو مطلوبہ صلاحیت کے افراد میسر آ جائیں، تو جدیدیت کے گرداب سے نکلنا کچھ خاص مشکل نہیں، بلکہ امت مسلمہ کو تعلیم اور ترقی کی نئی راہیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اور عالم اسلام، اقوام عالم کے درمیان اپنا مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔

اللہ کا دشمن کون ہے؟

میں اس شخص کا دشمن کیسے ہو سکتا ہوں جس سے میں کبھی ملا ہی نہیں اور جو مجھے جانتا بھی نہیں؟

مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کا قتل ایک جرم ہے الا یہ کہ وہ اللہ کا دشمن ہو۔۔

تو پھر اللہ کا دشمن کون ہے؟

کیا آپ کے کچھ ایسے دشمن ہیں جنہیں آپ قتل کرنا چاہتے ہیں؟ اللہ کا شکر ہے کہ میرے کوئی دشمن نہیں ہیں! یہ درست کہ آفس میں مجھے شپنگ مینجر سے نفرت ہے جو ہر پر فارما میں کیڑے نکال کر میرا کام بڑھا دیتا ہے، محلے کی مسجد کے مولوی سے بھی مجھے نفرت ہے جو دن رات لاؤڈ سپیکر پر گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے آقائے مُردار پر درود و سلام بھیجتا ہے اور سارے محلے کا سکون برباد کرتا ہے۔۔ اور چڑیا گھر سے بھاگے ہوئے اس بھنگی سے بھی مجھے نفرت ہے جو آج کل کیپٹل ٹاک میں نظر آتا ہے۔۔ طارق جمیل سے بھی مجھے نفرت ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اب اسے پاگل خانے بھیج ہی دیا جانا چاہیے۔۔ تاہم ان میں سے کسی کے لیے

میں موت کا متمنی ہر گز نہیں ہوں اور نا ہی انہیں قتل کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں کیونکہ آخر کار میں ایک انسان ہوں اور میرے کچھ اصول اور اخلاقیات ہیں جن کا میں خود کو پابند سمجھتا ہوں۔

سیرتِ نبوی میں قتل اور اجتماعی نسل کشی کے کئی واقعات ہیں، بنی قریظہ کے یہود یا خیبر اس کی مثال ہیں، بنو قریظہ کے قتلِ عام کے بارے میں خون سے لتھڑی مُعطر سیرتِ مصطفی ہمیں بتاتی ہے کہ جب وہ شکست تسلیم کرتے ہوئے اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے تو صلعم نے انہیں بنی النجار کے ایک گھر میں قید کر دیا اور ایک ایک کو باہر نکال کر ذبح کرتا گیا اور خندق میں پھینکتا گیا جبکہ باقی قیدیوں کو پتہ ہی نہ تھا کہ ان کے ساتھ باہر کیا ہو رہا ہے حالانکہ شکست کے معاہدے کے مطابق صلعم کو ان کے مال کے بدلے ان کی جان بخشنی تھی مگر صلعم نے اپنی سرشت کے مطابق غداری کی، اس دوران کٹتی انسانی گردنوں اور بہتے خون کے ان ہولناک مناظر نے انصار کے دل دہلا دیے، یہ وہ لوگ تھے جو صلعم کے مدینہ آنے سے پہلے ان کے پڑوسی تھے اور ان سے ان کے اچھے برادرانہ تعلقات تھے لہذا انہوں نے صلعم کو یہ قتلِ عام روکنے کے لیے کہا مگر صلعم اپنی مکارانہ فطرت سے مجبور تھا، اس نے کسی کی نہ سنی اور یہ بہیمانہ قتلِ عام جاری رکھا جہاں خونین سیرت کے مطابق چھ سو سے سات سو انسانوں کی گردنیں اتاری گئیں پھر صلعم نے ان کے مال و دولت اور عورتوں پر قبضہ کر لیا، سب سے بڑا انعام حیی ابن اخطب کی بیٹی صفیہ تھی جس سے صلعم نے بغیر عدت کے اس کے باپ اور شوہر کو قتل کرنے کے بعد فوری طور پر شادی رچالی۔۔(تفسیر الطبری میں دیکھیے سورۃ الاحزاب کی آیت 26 کی تفسیر، صفحہ 421)

اس قصے کو جسٹی فائی کرنے کے لیے مسلمانوں کے ایک ہزار ایک بہانوں سے مجھے حیرت نہیں ہو گی۔۔ خاص طور سے جبکہ وہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن تھے لہذا ان کے ساتھ جو کچھ ہوا بالکل ٹھیک تھا کہ یہ اُس جلاد اللہ کی حکمت ہے جس نے احمقوں کی طرح آسمان کو بغیر ستونوں کے اٹھا رکھا ہے۔

پھر اللہ کا دشمن آخر ہے کون؟

اللہ کے دشمن کی تعریف وضع کرنا خاصہ مشکل کام ہے، کیا یہ وہ ہندو ہے جو بتوں کی پوجا کرتا ہے یا بدھ مت؟ یا یہ وہ عیسائی ہے جو صلیب کی پوجا کرتا ہے؟ کیا یہ وہ رافضی ہے جو رسول کے پالتو پیارے صحابہ کو گالیاں دیتا ہے؟ یا خشک دماغ وہابی یا قادیانی، یا بہائی، یا صوفی، یا اسماعیلی، یا سیکولر، یا کمیونسٹ یا پھر وہ جو مسلمانوں سے کسی بات پر اختلاف کرے؟

ابھی تک اللہ کے دشمن کی کوئی تعریف نہیں مل سکی؟

چاروں آسمانی کتابیں، قرآن، تورات، انجیل اور اور نبیوں کے نبی سید قطب کی کتاب فی ظلال القرآن یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ اللہ کے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے جبکہ ان میں سے ہر کوئی دوسرے کو اللہ کا دشمن سمجھتا ہے، شیعہ اور سنی ایک دوسرے کو اللہ کا دشمن سمجھتے ہیں بلکہ قصہ تخلیق کے آغاز سے ہی اللہ کا ایک دشمن موجود تھا۔۔ ذرا بوجھیے تو وہ کون ہے؟۔۔۔۔۔ جی ہاں یہ ابلیس ہے۔۔

حضرتِ مسیح اپنے ماننے والوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت کریں مگر یہی بات وہ خود پر لاگو نہیں کرتے اور اپنے دشمن شیطان سے محبت نہیں کرتے بلکہ اسے صلیب کا دشمن قرار دیتے ہیں، میں نے کبھی ایسا شخص نہیں دیکھا جو اپنے آلہ قتل سے اس قدر محبت کرتا ہو جتنا کہ یہ شخص کرتا ہے، یعنی اگر اسے پھانسی دے کر مارا جاتا تو کیا وہ رسیوں سے محبت کرتا؟!

قرآن اور سیرت میں اللہ کے بہت سارے دشمنوں کا ذکر ہے، موسی کا فرعون اللہ کا دشمن تھا، ابولہب اللہ کا دشمن تھا، ابو جہل، مسیلمہ، نمرود، عامر بن طفیل، لوط کی بیوی، مایکل جیکسن، برکت حسین اوباما اور ہر وہ شخص جو گناہ کرتا ہے اللہ کا دشمن ہے۔۔

اللہ کے دشمن کی گالی صحابہ میں خاصی پاپولر و مقبول تھی، جب اللہ کی بے نیام تلوار خالد بن الولید نے بنی تمیم کے سردار مالک بن نویرہ کا قتل کیا جو مرتد نہیں ہوا تھا اور اسلام کو اپنے تمام تر ارکان سمیت قبول کر لیا تھا مگر اس نے اپنے اوپر قریش کے تسلط کو مسترد کر دیا تھا، تو ہمارے اس جلیل القدر صحابی نے اسے صرف قتل کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کی بیوی لیلی بنت المنہال التمیمیہ سے فوری طور پر شادی بھی رچالی جو اپنی خوبصورت ٹانگوں کی وجہ سے بہت مشہور تھی اور اسلامی عدت کی شرط کو دیوار پر دے مارا، اس طرح اس نے اپنے رسول کی سلفیانہ اتباع کی جس نے صفیہ بنت اخطب سے شادی کرتے وقت عدت کی شرط کو خود ہی پامال کر دیا تھا، عباس محمود العقاد اپنی کتاب "عبقریۃ خالد" میں اس عورت کا الیہ لکھتے ہیں:

(کان ثدییہا ینضحان بلبن الرضاع من اولاد لہا من مالک)

"مالک سے اس کی اولاد کے لیے اس کے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے"

خالد جنگی مجرموں کے لیے ایک بہترین نمونہ تھا حتی کہ عمر نے اس سے کہا تھا کہ:

(یا عدو اللہ قتلت امرءاً مسلماً ثم نزوت علی امراتہ، واللہ لارجمنک بالاحجار)

"اے اللہ کے دشمن ایک مسلمان شخص کو مار کر اس کی بیوی پر سوار ہو گئے، اللہ کی قسم میں تمہیں پتھروں سے سنگسار کروں گا"

ایک اور قصے میں حضرت ابو ہریرہ نے جب بحرین کے بیت المال کی کرپشن سے دس ہزار درہم بنائے تو حضرت عمر نے اسے "اللہ اور اس کی کتاب کا دشمن" قرار دیتے ہوئے اس کی کتوں کی طرح اتنی پٹائی کی کہ وہ لہولوہان ہو گیا۔

اسلامی ملوکیت کے دور میں بھی اللہ کے دشمن کے الزام کی اصطلاح کا استعمال جاری رہا، جب عباسی بنو امیہ کی تخلیق کردہ احادیث کی چھانٹی کر رہے تھے اور انہیں ایسی احادیث سے بھر رہے تھے جو ان کے اقتدار کو جواز دیتیں، ہمیں ہارون الرشید احادیث کے ایک مصنف سے اختلاف کرتے ہوئے ملتا ہے، اور اس سے پہلے کہ وہ اس کا سر کاٹے وہ بے چارہ اسے یاد دلاتا ہے کہ وہ احادیثِ نبویہ کی جعلسازی میں مہارت رکھتا تھا تو ہارون الرشید جو ایک سال جنگیں لڑتا تھا اور ایک سال حج کرتا تھا اور فارغ وقت میں لوگوں کو قتل کرتا تھا نے اسے "اللہ کے دشمن" کی گالی دیتے ہوئے مطلع فرمایا کہ جناب ہمارے پاس ابی اسحاق الفزاری اور عبد اللہ بن المبارک جیسے آپ سے اچھے احادیث گھڑنے والے جعلساز موجود ہیں۔ (حوالہ)
آج جمہوری اسلامی پاکستان اللہ کے دشمنوں سے بھرا پڑا ہے جنہیں اسلام پسند اللہ کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے روزانہ بموں سے اڑاتے ہیں، جمہوری اسلامی پاکستان کے سارے لیڈر اللہ کے دشمن ہیں، نواز شریف اللہ کا دشمن ہے، اس کا بھائی شہباز شریف بھی اللہ کا دشمن ہے، جنرل کیانی بھی اللہ کا دشمن ہے، حسنی مبارک بھی اللہ کا دشمن ہے، قذافی بھی اللہ کا دشمن تھا، خادم الحرمین الشریفین بھی اللہ کا دشمن ہے، پوپ بھی اللہ کا دشمن ہے، موم بھی اللہ کی دشمن ہے، سلمان رشدی بھی اللہ کا دشمن ہے بلکہ انسان تو انسان اب تو چیزیں بھی اللہ کی دشمن ہونے لگیں ہیں۔۔ ٹی وی بھی اللہ کا دشمن ہے اور اب تو موبائل فون بھی اللہ کی دشمنی سے نہ بچ سکا۔

اگر آپ صلعم کے دشمن ہیں تو آپ خود کار طور پر اللہ کے بھی دشمن ہیں، اور اگر آپ صلعم کے کسی قلیل القدر صحابی کے دشمن ہیں تو آپ اللہ کے بھی دشمن ہیں، اور اگر آپ کسی تابعی کے تابع کے تابع کے تابع کے کسی قول سے متفق نہیں ہیں تب بھی آپ اللہ کے دشمن ہیں، اور اگر آپ ثابت شدہ یا متفق علیہا عباسی یا اموی دور کے رسول اللہ سے احادیث گھڑنے والے کسی زندیق سے متفق نہیں ہیں تو بھی آپ اللہ کے دشمن ہیں، اگر آپ لبرل ہیں، یا سیکولر ہیں یا ملحد ہیں اور بھلے ہی آپ کا ان سے دور تک کا کوئی واسطہ نہ ہو تب بھی آپ اللہ کے دشمن ہوں گے۔

آپ شاید یہ تصور نہ کر سکتے ہوں کہ کوئی بازاروں میں جا کر بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو محض اس لیے قتل کرے گا کیونکہ اس کے خیال میں وہ اللہ کے دشمن ہیں۔۔ مگر جہاں اللہ کے دشمنوں کو قتل کرنے کے خدائی احکامات ہوں اور ان احکامات کو ماننے والے بے وقوف بھی ہوں تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔۔ معاملہ بس ایک نظر، پھر ایک مسکراہٹ اور پھر لبیک اور پھر۔۔۔۔ دھڑام۔۔۔۔ اور پھر بہتر حوروں کے ساتھ گروپ سیکس جس کا مقابلہ جینا جیمسن کی فلمیں بھی نہیں کر سکتیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انسانیت کے خلاف ان بہیمانہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے لوگوں میں ضمیر کی ذرا سی بھی خلش نہیں ہوتی کیونکہ بے قصوروں کے قتل کے اللہ کے احکامات اسلام کے ماننے والوں کے ہاں اس قدر عام اور بدیہی ہیں کہ انہیں یہ ایک عام بات لگتی ہے، اور کیسے نہ ہو کہ انبیاء کے باپ ابراہیم کو اللہ نے سات سال کے بچے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تو اس نے بلا چوں وچرا اس پر لبیک کہہ دیا کہ اللہ کا حکم بجالانا ہے چاہے وہ کتنا ہی انسانیت سوز اور گھٹیا ہو۔

اکثر مسلمان نازی ہولوکوسٹ کی محض اس لیے تایید کرتے ہیں کیونکہ یہودیوں نے مستقبل میں فلسطین پر قبضہ کرنا تھا!؟ اسی طرح اکثر مسلمان مغرب سے نفرت کی وجہ سے القاعدہ سے ہمدردی رکھتے ہیں بلکہ ہر اس نظریہ سے جو ان کے نظریات سے مختلف ہے، مسلمانوں کے دماغوں میں یہ فکر قومی عسکری آمریتیں گزشتہ سو سال سے ٹھونستی چلی آرہی ہیں۔

مسلمانوں کے دعوے کے مطابق ریت سے برآمد ہونے والے ان کے اس خدا کے حکم کے بغیر کوئی ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، اس قدر بے پناہ طاقت کے باوجود وہ اپنے دشمنوں کو مارنے کے لیے انسانوں کو مامور کرتا ہے حالانکہ وہ یہ گھٹیا کام خود بھی کر سکتا ہے۔۔ ریت کا خدا یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ یہ طریقہ کارگر نہیں ہے، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو لوگوں کو شروع سے ہی صحیح مذہب میں پیدا کرتا تاکہ وہ میرے دشمن نہ بنیں، تب مجھے دوسروں کو انہیں قتل کرنے کا حکم صادر نہ کرنا پڑتا، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں جان بوجھ کر غلط مذہب میں پیدا کیا کیونکہ وہ شروع سے ہی انہیں قتل کرنے کی نیت کیے بیٹھا تھا۔

اللہ ہمیں اور آپ کو اپنی دشمنی سے بچائے۔۔۔

آمین۔

اسلام اور آزادی

مسلمانوں کا دعوی ہے کہ آزادی اور ڈیموکریسی چونکہ مغرب سے درآمد کی گئی ہے اس لیے یہ ہمارے معاشروں کے لیے مناسب نہیں ہے کیونکہ ایک مسلمان کے لیے آزادی اس کی مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے جو ان آزادیوں سے زیادہ بہتر اور افضل ہے جو مغرب اپنے شہریوں کو دیتا ہے۔۔ تو کیا یہ بات درست ہے؟

جب ہم مذہبی اداروں اور اسلامی جماعتوں کی ترکیب پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ چاہے یہ ووٹنگ کا نظام ہی کیوں نہ استعمال کریں ان کا ڈھانچہ مخروطی ہی رہتا ہے جس میں طاقتِ اقتدار صرف چند محدود شخصیات کے گرد ہی گھومتی ہے جنہیں

علماء، مرشدین اور آیات اللہ کہا جاتا ہے، اگر یہ ادارے اسی طبقے کے گرد گھومتے ہیں تو ایسے میں یہ لوگ ڈیموکریسی کی کیا سمجھ رکھتے ہیں؟

مسلمانوں کی تمام تر ادبیات میں انسانی آزادی کی حقیقت کو بگاڑنے کے لیے جھوٹ، دھوکہ بازی اور الفاظ کے ہیر پھیر سے کام لیا گیا ہے، اسلام آن لائن اور اس جیسی دیگر ویب سائٹس کا ایک چکر لگا کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اس تحریر کے عنوان میں لفظ اسلام کو ہٹا کر اس کی جگہ فاشٹ ازم لکھ دیا جاتا تو معنی میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔

اسلام آزادی کا مصدر کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کی خون آلود میلی شریعت میں آج بھی رق اور غلامی کے گندے قوانین موجود ہیں؟ یہ اسلام انسانوں کو آزادی کیسے دے سکتا ہے جو مرد اور عورت اور مالک اور غلام کے حقوق میں تفریق کرتا ہے؟ اسلام سے آزادی کیسے پھوٹ سکتی ہے جبکہ وہ ایک ہی وطن کے شہریوں کے حقوق اور واجبات میں محض اس لیے تفریق کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے مذہب اور عقیدے میں مسلمانوں سے مختلف ہیں؟۔۔۔ بھکاری نے کیا بھیک دینی ہے!؟

جرمن مستشرق فریز روزینتھل (Franz Rosenthal) اپنی کتاب مسلم تصورِ آزادی (The Muslim Concept of Freedom Prior to the Nineteenth Century) میں کہتے ہیں کہ:

"اسلام میں آزادی کا مطلب فرد کو قانون اور خدائی نظام کے حوالے کرنا ہے"

وہ مزید کہتے ہیں کہ اسلام اور عیسائیت میں آزادی کے حوالے سے ایک قدرِ مشترک ہے، دونوں ہی غیر شرعی وہمی آزادی کی تلاش کے خلاف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی لغت میں لفظ آزادی کا وجود ہی نہیں ہے، کیونکہ آزادی یعنی "حریۃ" لفظ "حر" کا اشتقاق ہے جو "عبد" یعنی غلام کا الٹ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہو، آزادی کا آج کا مفہوم پہلی بار عربوں کے ہاں ابن حیان، فارابی اور رازی کی تحریروں میں ملتا ہے جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھا، تاہم یہ بھی خالی خولی باتوں سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا اور اس کا عملی اطلاق کبھی دیکھنے میں نہیں آیا جیسا کہ بعد میں یورپ میں دیکھنے میں آیا۔

آزادی کا جو گیت آج کے مسلمان گاتے پھرتے ہیں اس کے مطابق انسانی آزادی قطعی مسترد ہے کیونکہ یہ مغرب سے آئی ہے، اس کا اکلوتا اور حقیقی متبادل صرف اللہ کی عبودیت (غلامی) میں مضمر ہے۔۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس اصول کو اپنا کر ہم آزاد انسانی معاشرے تشکیل دے سکتے ہیں؟

قطعاً نہیں۔۔ وہ ان الفاظوں سے لوگوں کے ذہنوں سے کھیل رہے ہیں، ان کا سارا مطلب یہ ہے کہ "اصل آزادی" یہ ہے کہ آپ آسمان کے قوانین کے تابع ہو جائیں جسے وہ "شریعت" کہتے ہیں۔۔ اب کس نے کہا ہے کہ یہ قوانین آسمانی ہیں؟ یقیناً وہ خود۔۔ اسلام کے مولوی، مطوع، شیخ، امام، آیات اللہ اور کاہن۔۔ اب آپ پر یہ قوانین لاگو کون کرے گا؟ یہ بھی وہ خود کریں گے جنہوں نے ان قوانین کو گھڑا ہے۔۔ اب اگر آپ نے ان کے ان گھڑے ہوئے قوانین کو توڑا تو آپ کو سزا کون دے گا؟ سزا بھی یہی لوگ دیں گے کیونکہ ساری طاقت اور حکمرانی انہی کے پاس ہوگی، صرف انہیں ہی یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ سیاستدانوں کو ڈکٹیٹ کریں کہ کون سے قوانین بنائے جاسکتے ہیں اور کون سے نہیں۔۔ اچھی گیم ہے۔۔ ہے نا!؟ اپنی سادگی کے ساتھ جسے صرف بے وقوف ہی نگل سکتے ہیں مسلم رائے عامہ بالکل یہی راگ الاپتی رہتی ہے۔

یہ نا تو آزادی ہے اور نا ہی ڈیموکریسی۔۔ آزادی تب ہوتی ہے جب اقتدار عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے نا کہ مولویوں اور آیات اللہ کے۔۔ اسلام کا جدید طرزِ حکومت اریسٹوکریسی سے ملتا جلتا ہے جو اب ناپید ہو چکی ہے اور جس میں اقتدار مذہبی ملاؤں اور ان کے نمائندہ سیاستدانوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، یورپ کی اشرافیہ کا یہ دعوی تھا کہ وہ آسمانی تعلیمات کے مطابق حکومت کرتے ہیں اور غلاموں۔۔ مطلب عوام پر "خدائی قانون" لاگو کرتے ہیں۔۔ اگر آپ الفاظ بدل لیں۔۔ مقدس کتاب کی جگہ اسلامی شریعت رکھ دیں تو آپ ہر بار اسی جھوٹ، اسی فریب اور اسی نتیجے تک پہنچیں گے۔۔
یہ ایک فول پروف پلان ہے جو اقتدار پر قبضے اور عوام کو "مذہبی اریسٹوکریسی" کے ذریعے رام کرنے کے سے شروع ہوتا ہے اور لاہوتی نظامِ حکومت پر ختم ہوتا ہے جس کے بعد امارت یا خلافت کھڑی کی جائے گی اور ہم ساتویں صدی عیسوی کے کنیزوں اور باندیوں کے دلدادہ خلیفہ کے زیر نگیں ہو جائیں گے جو ہمارے بچوں کو جنگوں اور غزوات کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دے گا۔

اسلام کے شیخ اور آیات اللہ ڈیموکریسی پر براہ راست حملہ نہیں کرتے، بلکہ وہ تین مراحل پر مشتمل ایک ننگی گیم کھیلتے ہیں:

1- یہ دعوی کرنا کہ انسان کو اس کی پوری آزادی نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس پر شہوت مسلط ہے لہٰذا اسے کچھ "شرعی" ضابطوں کا پابند ہونا چاہیے۔

2- ایسی مثالیں تلاش کرنا جو مغربی آزادی کے منفی پہلو اجاگر کرتی ہوں جیسے: "سویڈن کی ایک عورت نے اپنے کتے سے شادی کرلی۔۔ کیا یہی مغرب کی نام نہاد آزادی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔۔ بے وقوف ایسی کہانیوں کے جال میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں جن کی خیر سے ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔

3- پھر آپ کی عقل کی وکالت کرتے ہوئے آپ کو اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ آزادی لا محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ انسان کی ذاتی سلوکیات، آزادی اور اختیارات پر کچھ پابندیاں لاگو ہونی چاہئیں مگر کس معیار کے مطابق؟ یقیناً ان کے اپنے معیارات کے مطابق 😊

اسلام میں آزادی یا اسلام میں جمہوریت کے حوالے سے کوئی بھی کالم پڑھ لیں، آپ کو اس میں یہی مذکورہ تین لالی پاپ پوشیدہ نظر آئیں گے۔

یہاں پر اسلام مسلمانوں کی انتہاپسندی اور نسل پرستی کے پوشیدہ جذبے پر چوٹ لگا کر ایک حساس کھیل کھیل رہا ہے۔۔ مسلمان عورت کے حوالے سے انتہائی انتہاپسند ہواقع ہوئے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ وہ کسی بھی طرح مرد کے برابر ہو جائے یا اسے آزادی مل جائے۔۔ اسلامی دنیا کے اندر اس کی مثالیں بکھری پڑی ہیں۔۔ شام، عراق اور کردستان میں آبروریزی کی بلند شرح، مصر میں خواتین کے ساتھ اجتماعی جنسی ہراسمنٹ، سعودی عرب میں عورت کو ملازمتیں نہ کرنے دینا اور گاڑی نہ چلانے دینا، غیرت کے نام پر اسے برقعہ نامی سیاہ تمبو میں لپیٹ کر اس کی آزادی سلب کرنا وغیرہ۔۔

مسلمان دوسرے مذاہب کے خلاف بھی انتہاپسند واقع ہوئے ہیں جو ان کی نظر میں "تحریف شدہ مذاہب" ہیں لہذا ان کا آسمانی قانون بھی "جعلی" ہے اور سلفی، وہابی ورژن کی طرح "خالص" نہیں ہے، لہذا ایک آزاد انسانی جمہوری معاشرے کے تحت ان کفار سے مساوات کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مسلمان فکری طور پر مختلف طبقوں کے بھی خلاف ہیں، وہ ملحدین کے خلاف ہیں، سیکولروں کے خلاف ہیں، لبرلوں کے خلاف ہیں حتی کہ مذہبی طور پر معتدل لوگوں کے بھی خلاف ہے لہذا انہیں ان کے برابر مساوی حقوق اور آزادیاں کیسے دے دی جائیں؟

ذرا سوچیے کہ ایک اسلامی جمہوری نظام کے اندر کیا کیا نہیں ہوگا؟ تصور کرنا بھی محال ہے۔۔ دیکھیے جمہوری اسلامی ایران میں روز کیا ہوتا ہے۔۔ ہم جنس پرستوں کو پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے، سیکس کرنے پر مردوزن کی گردنیں اتار دی جاتی ہیں، شراب پینے والوں کو کوڑے مارے جاتے ہیں اور عورتوں کو لباس کی وجہ سے مارا پیٹا جاتا ہے۔۔ یہی وہ اسلامی ڈیموکریسی ہے جو آپ کے انتظار میں ہے، یہی "حقیقی اسلامی آزادی" ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کو ڈرا ڈرا کر نفسیاتی بنا دیا ہے، جب مولوی کسی مسلمان سے کہتا ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی آزادی کے نام پر کسی اور کے ساتھ سوئے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ لواطت سرِ عام سڑکوں پر ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی سکول سے حاملہ ہو کر آئے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ آزادی کے نام پر تمہاری بیٹی کسی یہودی یا عیسائی سے شادی کر لے؟ کیا تمہیں مغرب کی یہ آزادی چاہیے؟ یہ سب سن کر مسلمان چیختے ہوئے مولوی کے قدموں میں گر جاتا ہے اور کہتا ہے: "نہیں۔۔ مجھے مذہبی حکمرانی چاہیے۔۔ تم مجھ پر حکومت کرو پلیز۔۔ اقتدار اللہ کے لیے ہے عوام کے لیے نہیں"۔

اسلام ساری دنیا کے خلاف ہے

دنیا میں مذہبی فسادات کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، تاہم یہ بات آسانی سے نوٹ کی جا سکتی ہے کہ اسلام ان میں سے تقریباً ہر ایک میں فریق ہوتا ہے، مسلمان ہندوؤں کے خلاف ہیں، عیسائیت کے خلاف ہیں، وہ یہودیت اور بدھ مت کے بھی خلاف ہیں۔۔ الغرض کہ گنتے چلے جایئے اسلام کو کسی کا بھی وجود منظور نہیں، جہاں بھی اسلام اور کوئی دوسرا مذہبی گروہ ہوتا ہے وہاں مذہبی فسادات لازماً ہوتے ہیں، اس اسلام کی آخر پرابلم کیا ہے؟ اور یہ ہمیشہ ہر فساد میں فریق کیوں ہوتا ہے؟

ہمیں دوسرے مذاہب کے آپس میں کوئی خاص جھگڑے نظر نہیں آتے مثال کے طور پر بدھ مت اور عیسائیت کے درمیان، یا یہودیت اور بدھ مت کے درمیان یا ہندو مت اور عیسائیت کے درمیان وغیرہ۔۔ یقیناً ہلکے پیمانے پر دوسرے مذاہب کے بھی آپسی اختلافات ہوں گے مگر یہ اختلافات ایسے نہیں ہیں جیسا کہ اسلام کے ان سب مذاہب کے ساتھ ہیں اور جو اکثر خونی ہوتے ہیں۔۔ کیا وہ یہ دعوی نہیں کرتے کہ اسلام امن کا مذہب ہے؟ اور کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے ایک ایسا مذہب ہونا چاہیے جو انسانوں کو امن و آشتی کا پیغام دیتا ہو؟ لیکن زمینی حقائق جو ہم دیکھتے ہیں وہ امن کی دعوت کم اور انتقام کی دعوت زیادہ معلوم ہوتے ہیں، مطالبات، کینہ پروریاں، بداندیشیاں، بغض، عداوت، صلیبیوں، ہندوؤں اور مشرق و مغرب کے خلاف جہاد کی دعوت، یہ دوسروں کے خلاف اپنے بغض میں اس قدر متذبذب اور وحشت زدہ ہیں کہ اپنی ہی قوم کے خلاف جہاد کا اعلان کر ڈالتے ہیں۔۔ آخر کیوں؟

یہ نفرت کا فیکٹر ہے جو ساری دنیا کو دشمن کے طور پر پیش کر کے اسلام اپنے ماننے والوں کے دلوں میں پالتا رہتا ہے، یہ پہلو تہی ہو گی اگر ہم کہیں کہ اسلام صرف دوسرے مذاہب کا ہی دشمن ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہر نئی چیز کے خلاف بغض رکھتا ہے، مثلاً اسلام کو سیکولرازم سے نفرت ہے۔۔ اسے کمیونزم، ڈیموکریسی، سرمایہ داری، مغرب، فن، تمام غیر دینی علوم، غیر مسلم ممالک، عورت، جدیدیت حتی کہ اس دنیا میں زندگی سے بھی اسلام کو نفرت ہے۔۔ یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جو اپنے ماننے

والوں کو خود سے بم باندھ کر اڑانے پر قائل کر سکتا ہے؟ مسلمان چلتے پھرتے بم ہیں اور اسلام ایسے دہشت گرد پیدا کرنے والا ناسور۔

اسلامی کینہ پروری اور بغض کے آگے بند باندھنے میں نہ صرف اسلامی دنیا کے غریب ممالک (جیسے پاکستان) بلکہ امیر ممالک (جیسے سعودیہ) بھی ناکام ہیں، یہ ممالک انصاف پر مبنی روشن معاشرے تخلیق کرنے سے قاصر ہیں اور اس کی بجائے زندگی سے مایوس ایسی نوجوان نسلیں پیدا کر رہے ہیں جو بے قصور لوگوں کو اسلام کے نام پر جہنم رسید کرنے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔۔ ان اسلامی معاشروں کو خود سے پوچھنا چاہیے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تاہم شاید انہیں لفظ "کیوں" سے بھی نفرت ہے۔۔

نفرت کے سلفی شیخ حمود بن عقلاء الشعیبی فرماتے ہیں:

"الولاء والبراء قاعدة من قواعد الدين واصل من اصول الايمان والعقيدة فلا يصح ايمان شخص بدونهما، فيجب على المرء المسلم أن يوالي في الله ويحب في الله ويعادي في الله فيوالي أولياء الله ويحبهم ويعادي اعداء الله ويبغضهم ويتبرء منهم"

"ولاء اور براء دین کے قاعدوں میں سے ایک قاعدہ ہے اور ایمان اور عقیدے کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے ان دونوں کے بغیر کسی شخص کا ایمان درست نہیں ہو سکتا، مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے وفاداری کرے اور اللہ کے لیے محبت کرے اور اللہ کے لیے نفرت کرے چنانچہ اولیاء اللہ سے وفاداری اور محبت کا اظہار کرے اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی، بغض اور عداوت کا اظہار کرے"

وہابی شیخ صالح بن فوزان فوزان الفوزان اپنے ایک فتوے میں گویا ہیں:

"فيجب معاداة الكفار وبغضهم وعدم مناصرتهم على المسلمين وقطع المودة لهم، كل هذا يجب على المسلم أن يقاطعهم فيه وأن يبتعد عنهم ولا يحبهم ولا يناصرهم ولا يدافع عنهم ولا يصحح مذهبهم، بل يصرح بكفرهم وينادي بكفرهم وضلالهم ويحذر منهم"

"چنانچہ واجب ہے کہ کفار سے دشمنی اور بغض کیا جائے اور مسلمانوں پر ان کی نصرت اور طرفداری نہ کی جائے، مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان سب میں ان کا بائیکاٹ کرے اور ان سے دور رہے، نہ ان سے محبت کرے، نہ نصرت کرے، نہ ان کا دفاع کرے اور نا ہی ان کا مسلک درست کرنے کی کوشش کرے، بلکہ سرِعام ان کے کفر و ضلالت کا اظہار کرے اور ان سے بچنے کی تلقین کرے"

چنانچہ ثابت ہوا کہ دوسروں سے نفرت اور بغض کرنا ایمان وسنت کے اصولوں میں سے ہے۔۔ اسی نفرت، بغض اور کینہ پروری کے سبب مسلمان جدیدیت کے معانی سمجھنے سے قاصر ہیں، وہ یہ نہیں سمجھ پارہے کہ جدیدیت کا مطلب ایسے مذہبی تصورات سے دستبر داری اور صحراء کے قلب سے بر آمد ہونے والے اس دین کا احتساب نہیں ہے۔۔ جو بھی مذہب ہزاروں سال پرانی تعلیمات کو ایک ناقابلِ تبدیلی اور بند فکر سمجھتا ہو، اس کے ماننے والے ان تعلیمات پر اندھا اعتقاد رکھتے ہوں اور اسے تھوپی ہوئی تلوار اور قانون سمجھتے ہوں، ایسا مذہب ہمیشہ جدیدیت کے ساتھ ایک دائمی جنگ میں ملوث رہے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہ جدیدیت آخر ہے کیا جس سے یہ اس قدر ڈرے ہوئے ہیں؟ یہ اپنے جوہر میں دوسرے کو قبول کرنے سے زیادہ کچھ نہیں ہے، دنیا ہر گان تبدیل ہو رہی ہے، قومیں جدیدیت کے ساتھ خود کو ڈھالتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں، ایسے میں جو قومیں جدیدیت کو مسترد کریں گے وہ پہلے پسماندگی کا شکار ہوں گے اور پھر ڈائناسار کی نسل میں شامل ہو جائیں گی۔۔ اسلام نے خود کو جدیدیت کے راستے میں ایک رکاوٹ بنالیا ہے، ایسے میں کیا لگتا ہے کس کی جیت ہوگی، ترقی اور ایجاد کی یا جمود کی؟ بغض اور کینہ پروری جس کا اسلام شکار ہے اس کی یہی وجہ ہے۔۔۔

یقیناً اسلام ہی وہ واحد مذہب نہیں ہے جو دوسرے مذاہب کے ساتھ مذہبی فسادات میں ملوث ہوتا ہے، لیکن یہ ان سب میں سے سب سے زیادہ ایسے فسادات کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے جس کی وجہ اس کا فاشسٹ سیاسی رجحان اور اقتدار کی کرسیوں تک پہنچنے کی اس کی شدید خواہش ہے، اس کے علاوہ یہ اپنی فطرت میں بنیاد پرستی اور تعصب سے بھرا ہوا ہے۔

چور مچائے شور (حصہ اول)

مسلمان، خواہ ناخواندہ ہوں یا تعلیم یافتہ، اعتدال پسند ہوں یا انتہا پسند، ایک بات پر متفق ہیں، اُس پر یقین رکھتے ہیں اور ہر دم اور ہر سطح پر اُسی کا راگ الاپتے رہتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ وہ ساری دُنیا میں خواہ وہ امریکہ ہو یا یورپ، آسٹریلیا ہو یا فلپائن، بھارت ہو یا چین سنکیانگ (رُوس) چیچنیا یا سربیا، تھائی لینڈ ہو یا نائیجیریا، ہر جگہ مسلمان اقلیتوں پر مظالم ہو رہے ہیں اور خصوصاً اسرائیل اور فلسطین میں تو مُسلمانوں پر قیامت ڈھائی جارہی ہے۔ اُن کے لیے یہ بات ایک آفاقی کُلیے کی حیثیت رکھتی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی اقلیتی گروہ ہیں، وہ وہاں حکومتوں یا اکثریتی آبادی کے مظالم کا شکار ہیں۔

اِس بُہتان تراشی میں اسلامسٹ(Islamist)پروپیگنڈہ مشینری کی مُنہ میں زُبان رکھنے والا دراصل مغربی دانشوروں اور سیاستدانوں کا اپنا ایک گروہ بھی ہے جس کا تعلق بائیں بازو یا آزاد خیال اُس طبقے سے ہے جو شروع سے ہی اُس مغربی معاشرے کو گالیاں دیتا آیا ہے جس نے اُسے اظہارِ رائے کی یہ آزادی دی ہے۔ اِن میں سرِ فہرست کئی مشہور شخصیات ہیں جیسے رپورٹر رابرٹ فِسک، برطانوی سیاستدان جارج گیلووے، امریکی دانشور ایڈورڈ چرچل اور نوم چومسکی، لندن کا سابقہ میئر کین لیونگ اسٹون اور دیگر بہت سے۔ یہ آگ اور پانی کا اتحاد بھی بہت عجیب ہے۔ متذکرہ بالا اور اُن کے قبیل کے دوسرے افراد مُلحد یالا دین ہیں جو اسلامی نظریات اور قوانین کے مُطابق سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور لائق سزا ہیں۔ اگر مُلاؤں کے بس میں ہو تو اسلامی قوانین کے مُطابق اِن افراد کے ساتھ بدترین سلوک ہو جیسا کہ اِن جیسوں کے ساتھ اسلامی مملکتوں ایران، سعودی عرب اور طالبان کے زیرِ اثر افغانستان میں ہوا ہے۔

شاید بائیں بازو کے گروہ کو بالکل بھی یاد نہیں ہے کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ کے ہٹائے جانے کے بعد اُن کے دسیوں ہزار کا مریڈوں کا ایران کے آیت اللہ حکمرانوں نے کیا حشر کیا۔ وہ یہ بھی بھول چُکے ہیں کہ افغانستان میں مُلاؤں نے ڈاکٹر نجیب کی لاش کو کابل کی سڑکوں پر کیسے گھسیٹا تھا۔ کیونکہ وہ مغرب کی آزاد اور محفوظ فضا میں اسلامسٹوں کی دسترس سے دور بیٹھے ہیں۔ وہ وہاں بیٹھ کر نہایت آسانی سے مغرب کو گالیاں دے سکتے اور اسلامسٹوں کی براہِ راست یا گھُما پھرا کر حمایت کر سکتے ہیں۔

فلسطینیوں پر مظالم

مُسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی داستانوں میں سرِ فہرست فلسطین اور کشمیر کی دل خراش اور جذبات انگیز حکایات ہیں۔ لیکن یہ داستانیں اُس وقت تک حقیقی معلوم ہوتی ہیں جب تک آپ اُن کے پسِ منظر کے واقعات کا قریب سے جائزہ نہ لیں۔ حقائق کو کھُلی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد نہ صرف حقیقت کچھ مختلف بلکہ عام طور پہ پیش کردہ صورتحال کے برعکس دکھائی دیتی ہے۔

اسرائیل کی مملکت اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے تحت 1948ء میں وجود میں آئی۔اِسی قرارداد کے تحت ایک فلسطینی ریاست کا وجود بھی عمل میں آنا تھا۔نہ صرف یہ کہ کسی عرب مُلک نے اقوامِ متحدہ کی قرارداد اور اُس کے تحت بننے والی اسرائیلی ریاست کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اسرائیلی ریاست کے اعلان کے اگلے روز ہی پانچ عرب ممالک نے اُس پر تین اطراف سے حملہ بھی کر دیا۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق اقوامِ متحدہ کی بُنیادی قرارداد کو تو تسلیم ہی نہ کریں لیکن یہ چاہیں کہ اسرائیل کے خلاف اقوامِ متحدہ میں نئی سے نئی قرارداد پیش ہوتی رہے اور اُس پہ عمل بھی ہو؟؟

پہ درپہ عرب ممالک نے 1950ء، 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں اسرائیل پر کئی حملے کئے جن کا مقصد اسرائیل کو صفحہء ہستی سے مٹانا تھا۔اُن تمام جنگوں میں جارح عرب ممالک کو تقریباًپورے عالمِ اسلام کی حمایت حاصل رہی ہے۔

امریکہ کی مشرقِ وسطیٰ کے متعلق پالیسی کے نقاد کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اگر آج امریکہ اسرائیل کی حمایت نہ کر رہا ہوتا تو اسرائیل کا وجود کب سے مٹ چُکا ہوتا۔عرب ممالک نے اسرائیل پر تمام حملے کسی فلسطینی ریاست کو آزاد کرانے کے لئے نہیں بلکہ اسرائیل کو مٹانے کے لئے کیے۔کیونکہ ایک فلسطینی ریاست کے حصول کے لئے کسی حملے یا جنگ کی ضرورت ہی نہ تھی۔صرف اقوامِ متحدہ کی اُس قرارداد کو تسلیم کرنا ہی کافی ہوتا جس کا مقصد ایک یہودی اور ایک فلسطینی ریاست کے قیام کو یقینی بنانا تھا۔

اِس دوریاستی فارمولے پہ عمل درآمد کے لیے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنا لازمی ہوتا جو عرب ممالک کو کبھی بھی قابلِ قبول نہ تھا اور نہ ہے۔عرب ممالک فلسطینی ریاست کے قیام میں کوئی دلچسپی رکھتے تو اردن خود فلسطین کے ایک بُہت بڑے حصّے پر قابض نہ ہو جاتا۔مزے کی بات یہ ہے کہ کبھی بھی اسلامی دُنیا نے اردن پر دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ فلسطینی علاقے پر اپنا قبضہ ختم کر دے۔وہ تو اردن خود اُس مقبوضہ علاقے کا بیشتر حصہ اسرائیل کے ساتھ جنگ میں ہار بیٹھا۔

بیشتر فلسطینی جو اپنے لیے ایک آزاد ریاست کے خواہاں ہیں، اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اِس رویے میں تھوڑی سی تبدیلی صرف کُچھ سال پہلے آئی جب 1990ء کے بعد پی ایل او کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اسرائیل کو جڑ سے مٹانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اُس نے اپنے بُنیادی مقصد یعنی اسرائیل کی بربادی سے کنارہ کش ہو کر دوریاستی حل پر بات چیت کا راستہ اختیار کیا۔ لیکن اِس حل کے راستے میں سب سے بڑی مشکل یہ آن پڑی ہے کہ پی ایل او خود فلسطینیوں کی اکثریت کی حمایت سے محروم ہو چُکا ہے۔ اُسے تنہا حماس کے ہاتھوں انتخابات میں شکست ہو چکی ہے۔ حماس کا نصب العین آج بھی اسرائیل کو نیست و نابود کرنا ہے۔ اگر آج دوسری فلسطینی انتہا پسند تنظیمیں جیسے اسلامک جہاد یا AL-Aqsa Martyrs Brigade، حماس کے ساتھ اتحاد کر لیتی ہیں تو پی ایل او کا وجود مکمل طور پر ختم ہو جائیگا۔ اُس صورت میں اسرائیل کو سلامتی کی ضمانت کون دے گا؟؟ اسرائیل فلسطینی علاقے چھوڑ دے اور خود فلسطینی اور دیگر عرب، اسرائیل کے وجود کو ہی تسلیم نہ کریں؟ اسرائیل فلسطین کو ایک مُلک کے طور پہ آزاد کر دے تاکہ وہ خود اسرائیل کے وجود کیلیے خطرہ بن جائے؟ واہ کیا منطق ہے! کیا انصاف ہے جس کی باتیں اسلامسٹ اور لیفٹسٹ کر رہے ہیں۔

پاکستان اور اسرائیل کی تخلیق کا موازنہ

پاکستان 1947ء میں وجود میں آیا کیونکہ ہندوستان کے مُسلمان برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی کے وقت مُسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اُس مطالبے کے دُرست ہونے کی نہ تو کوئی منطقی توجیہہ تھی اور نہ ہی کوئی مجبورئِ حالات۔

ہندوستان ہزاروں سال سے ہندوؤں کی سرزمین تھی۔ مسلمان یہاں پر حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہاں آ کر اُنہوں نے جبر و استبداد کے ذریعے یہاں کی اکثریتی آبادی پر حکمرانی کی۔ برطانیہ کے تسلط سے آزادی کے وقت یہاں کے ہندوؤں کو اِس بات کی اُمید نظر آئی کہ اب ہندوستان کے لوگ ہندوستان پر جمہوری طریقے سے حکومت کریں گے جس میں مُسلمان اور دیگر مذہبی اقلیتوں کا بھی بحثیت ہندوستانی نہ کہ مذہبی بنیاد پر حصہّ ہو گا۔ لیکن مُسلمانوں کو یہ بات منظور نہ تھی کہ ہندو بحثیت افراد اپنی اکثریت کی وجہ سے حکومت میں سب سے

زیادہ حصہ حاصل کر سکیں۔ اُن کے نزدیک یہ حق صرف اُن کا ہی تھا کہ باوجود اقلیت ہونے کے وہ تو دیگر مذاہب کے لوگوں پر حکومت کریں لیکن کوئی اُن پر حکومت نہ کر پائے۔

پاکستان کے بن جانے کے بعد بھارت نے پاکستان کو تسلیم کیا باوجود اِس حقیقت کے کہ پاکستان کا وجود اُس علاقے میں ظہور پذیر ہوا جو گذشتہ ہزاروں سال سے ہندوستان کا حصہ سمجھا جاتا رہا تھا۔ لیکن بھارت نے پاکستان پر حملہ نہیں کیا جیسے کہ عربوں نے اسرائیل کی نومولود ریاست پر ہلہ بول دیا۔ اِس کے برعکس اپنے وجود میں آنے کے کُچھ مہینوں کے اندر پاکستان نے قبائلی لشکر کی آڑ میں کشمیر کی ریاست پر حملہ کر کے جارحیت کا آغاز کیا۔ یہ قبائلی لشکر آج کے طالبان کی ابتدائی شکل تھے اور یہیں سے اِن قبائلی مُجاہدین کو پاکستانی اسٹیبلشمینٹ نے اپنا سٹر ٹیجک ہتھیار سمجھنا شُروع کر دیا تھا۔

پاکستان میں یہ تاثُر عام ہے کہ بھارت پاکستان کو مٹانا چاہتا ہے، جبکہ اب تک لڑے جانے والی تمام پاک بھارت جنگوں میں جارحیت کی ابتداء پاکستان کی طرف سے ہوئی۔ یہ بھی خوب حکمتِ عملی ہے۔

مارو بھی خود اور روؤ بھی خود

پاکستان بنائے جانے کے مقابلے میں اسرائیلی ریاست بنائے جانے کے لیے ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔ موجودہ اسرائیلی سرزمین ہزاروں سال سے یہودیوں اور عیسائیوں کا وطن رہی ہے جِس کو ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے بزورِ شمشیر فتح کر لیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی میں ہولوکاسٹ کے واقعے نے، جس میں تقریباً 90 لاکھ یہودیوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا، اقوامِ عالم کو شدت سے اِس بات کا احساس دلایا کہ یہودیوں کے رہنے کیلیے کوئی اپنا وطن ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہنگامی بُنیاد پر ایک یہودی ریاست کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا گیا جہاں یہودیوں کو جان ومال اور شہری آزادی کا تحفظ حاصل ہو۔ ہندوستان کے مُسلمانوں کی جانوں اور شہری حقوق کو ایک متحدہ ہندوستان میں کوئی ایسا خطرہ لاحق نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے ایک جُداگانہ ریاست کی ضرورت محسوس ہوتی۔ تو بھی مسلمانوں کے نزدیک پاکستان کا بنایا جانا تو حق بجانب تھا، اسرائیل کا نہیں۔ پاکستان کا وجود صرف اِس لیے ہوا کہ یہاں کے مُسلمان ہندوؤں کے ساتھ رہنے پر تیار نہ تھے۔ اسرائیلی ریاست کا وجود اِس

لیے ہوا کہ یہودیوں کے لیے کُرہ ارض پر سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ جہاں جہاں رہتے تھے وہاں کے مقامی حکومتیں اور لوگ اُن سے جیساچاہے سلوک کر رہے تھے۔ یہاں تک بعض اُنہیں جینے کا حق دینے کو بھی تیار نہ تھے۔

اسرائیلی حکومت کے بارے میں بُہت کُچھ کہا اور سُنا گیا لیکن کیا کوئی اسلامی مُلک یا لیفٹسٹ مشرقی تیمور کے بارے میں کچھ بولا؟ اپنے 24 سالہ ناجائز قبضے کے دوران اسلامی ملک انڈونیشیا نے مشرقی تیمور East Timor میں تقریباً دو لاکھ عیسائی آبادی کا قتل عام کیا۔

(source:International Watchdog)

کیا کسی اسلامی ملک یا نمایاں مسلمان شخصیت نے اِس سلسلے میں ایک لفظ مذمت کا بھی کبھی مُنہ سے نکالا؟ باوجود فلسطینیوں اور عربوں کی اسرائیل کے خلاف شدید جارحیت کے، کیا ساٹھ سالہ مشرق وسطیٰ کے تنازعہ میں اتنی جانوں کا زیاں ہوا ہے؟

اقلیتوں کے حقوق۔ اسرائیل بمقابلہ اسلامی ممالک

تمام اسلامی ممالک میں غیر مُسلم اقلیتوں کی تعداد میں مسلسل کمی آرہی ہے لیکن اسرائیل کی حدود میں رہنے والے مُسلمانوں کی آبادی میں اتنی تیزی سے اضافہ ہورہاہے کہ ایک اندازے کے مُطابق آئندہ آنے والی دو دہائیوں میں مسلمان اسرائیل میں اکثریتی مذہبی آبادی بن جائیں گے۔ باوجود اِس کے دُنیا کے مختلف گوشوں سے یہودی افراد مسلسل اسرائیل کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔

2007ء میں غزہ پر حماس کے غلبے کے بعد وہاں کی قدیم مقامی عیسائی آبادی پر حماس کے ارکان نے حملے کر کے اُن کے ذاتی املاک اور عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کیا ہے اور پُر تشدد کاروائیوں میں سینکڑوں افراد کو قتل کیا۔ باوجود حماس کی حکومت کے عیسائی آبادی کو تحفظ دینے کے وعدوں کے، کوئی بلوائی وہاں پر گرفتار نہیں ہوا۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلم آبادی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جارہا ہے؟ اِس کا اندازہ اِن اعداد و شُمار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

–1947ء میں پاکستان کی ہندو آبادی 15٪ سے گھٹ کر 1٪ رہ گئی ہے جو مسلسل ظُلم و ستم کا شکار ہے۔

–1947ء میں بنگلہ دیش کی ہندو آبادی 30٪ سے گھٹ کر 10٪ رہ گئی ہے۔

–عراق میں آج سے دس سال پہلے 800,000 عیسائی آباد تھے اب صرف 150,000 رہ گئے ہیں۔

–پہلی جنگ عظیم کے وقت ترکی میں 20 لاکھ عیسائی آباد تھے جو اب گھٹ کے 1 لاکھ سے بھی کم رہ گئے ہیں۔

–حالیہ 'عرب بہار' (Arab Spring) کے بعد مصر میں عیسائی کوپٹ آبادی (Copts) پر حملے اور اُن کا قتلِ عام ایک معمول بن چُکا ہے۔

ایسی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو اسلامی ممالک میں غیر مُسلموں کی زبوں حالی کو ثابت کرتی ہیں۔

اسرائیلی ریاست کے قیام کے وقت وہاں پہ رہنے والے عربوں کو مساوی حقوق دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ مقامی فلسطینیوں کی خطرناک کاروائیوں کے باعث اسرائیلی حکومت کو یہودی اور عرب شہریوں کیلیے امتیازی قوانین بنانے پڑے۔ غیر معمولی تحفظاتی اقدام کے تحت اپنے شہری حقوق میں تخفیف کے باوجود اسرائیل میں آباد عربوں کو 'آزاد' عرب ممالک کے شہریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ شہری حقوق حاصل ہیں۔ مثال کے طور پہ اُنہیں ووٹ کا حق حاصل ہے۔ اُنہیں مہذب حدود میں رہتے ہوئے اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے پُرامن مظاہرے کرنے کا حق ہے۔ اُنہیں آزادئ صحافت کا اور حکومت پہ تنقید کا حق ہے۔ کیا سعودی عرب، کویت، عمان، قطر، بحرین، یمن، متحدہ عرب امارات، شام، اردن کے شہریوں کو اُن کے اپنے ممالک میں یہ حقوق حاصل ہیں؟ عراق میں شہریوں کو یہ حقوق صرف حال ہی میں حاصل ہوئے ہیں جب 'کافر مُلک' امریکہ نے وہاں حملہ کر کے 'کافرانہ' جمہوریت کو وہاں پر متعارف کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اِن جمہوری حقوق سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسرائیل میں آباد فلسطینی کھلے عام اسرائیلی ریاست کے مٹائے جانے کی بات کرتے ہیں اور اُس کے باوجود آزاد شہری رہتے ہیں جب تک کہ کسی پر تشدد کاروائی یا دہشت گردی میں ملوث نہ پائے جائیں۔

حال ہی میں اسرئیلی پارلیمنٹ (Knesset) کے مسلمان رُکن عظمیٰ بشریٰ نے ایران کے صدر احمدی نژاد کے اِس مطالبے کی پُرزور حمایت کی ہے کہ اسرائیلی ریاست کو مشرقِ وسطیٰ سے اُٹھا کر یورپ مُنتقل کر دیا جائے۔ عظمی بشریٰ اور اسرائیلی پارلیمنٹ کے ایک اور مُسلم رُکن محمد بارک نے شام کی موجودہ حکومت کی حمایت میں کئی جلوس نکالے۔ واضح رہے کہ ایران کے ہمراہ شامی حکومت بھی اسرائیل کے خاتمے پر یقین رکھتی ہے۔ یہاں بشریٰ نے اعلان کیا کہ اگر ساری دُنیا بھی اسرائیل کو تسلیم کر لے تو وہ پھر بھی اُسے تسلیم نہیں کریگا یعنی اُس مُلک کو جس کی پارلیمان کا وہ خود رُکن ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی قومی اسمبلی کا کوئی اقلیتی مذہب سے تعلق رکھنے والا رُکن پاکستان کو مٹانے کی بات کرے تو اُس پر غداری کا مُقدمہ نہ چلایا جائے۔

مُسلمان آج تک اُس افسوسناک واقعے پر آگ بگولا ہیں جس میں ایک مشکوک ذہنی حالت رکھنے والے یہودی فرد نے مسجدِ اقصیٰ کے ایک حصے کو آگ لگا دی تھی۔ لیکن وہ اسلامی ممالک میں پیش آنے والے اُن واقعات کو معمول سے بھی کم سمجھتے ہیں جن میں آئے دن دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ کیا کوئی گن کے بتا سکتا ہے کہ پاکستان میں اب تک کتنے مندر ڈھائے گئے ہیں اور کتنے گرجوں کو آگ لگا دی گئی ہے؟

مسجدِ اقصیٰ کی آتش زنی کے افسوسناک واقعہ کا ذکر کرنے والے اِس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ اسرائیلی ریاست میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ جبکہ بیشتر اسلامی ممالک میں دوسرے مذاہب کی عبادات پر مکمل یا جزوی پابندی ہے۔

سعودی عرب کا شہری صرف ایک مُسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ سعودی عرب میں دوسرے مذاہب کے افراد کا اپنی عبادت گاہیں بنانا تو دُور کی بات ہے، اپنے گھروں تک میں اپنی مذہبی رسُوم کی ادائیگی مُشکل ہے۔ وہ یوں کہ

دسیوں لاکھ غیر مُسلم افراد کو جو سعودی عرب میں بغرض روزگار مُقیم ہیں اپنی مذہبی کتابیں جیسے گیتا یا بائبل یا مذہبی علامتی نشانات جیسے بُت یا صلیب وغیرہ سعودی بادشاہت کے اندر لانے کی اجازت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ دبئی جیسی امارت میں، جو اپنی آزاد شبانہ زندگی میں لاس ویگاس کو مات دیتی ہے، چالیس لاکھ غیر مُسلم غیر مُلکی کارکُنان کے لیے صرف ایک گرجے اور ایک مندر کی اجازت ہے۔ یہ دونوں عمارات اتنی چھوٹی ہیں کہ وہاں مُشکل سے چند سو افراد ہی سما سکتے ہیں اور اپنے روایتی بیرونی ساخت سے عاری صرف عام مکانوں کی طرح ہیں۔

جبکہ ایک اسلامی مُلک میں دوسروں کی مذہبی آزادی سے یہ سب کُچھ ہو سکتا ہے تو کیا ایک یہودی ریاست میں اسلامی رسوم کی ادائیگی پر پابندی نہیں ہو سکتی تھی؟ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اگر ہوتا تو وہاں رہنے والے مُسلمان اب تک اسرائیل چھوڑ دیتے، وہاں رہ کر اپنی آبادی کو مسلسل بڑھا نہ رہے ہوتے۔

(یہ مضمون کچھ برس پیشتر ماہنامہ "نیا زمانہ" لاہور میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ ہم اس مضمون میں پیش کیے گئے نقطہ نظر کی انفرادیت اور بے باکی کی بنا پر اسے اپنے قارین کی توجہ اور دلچسپی کے لیے یہاں شائع کر رہے ہیں۔ مضمون کے مصنف روش عام سے ہٹ کر پاکستان کے چند گنے چنے تجزیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کو روشن خیال اور وسیع النظر کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی جرأت اظہار کی بنا پر پاکستان کے "بدنام" ترین کالم نگاروں میں سے ایک ہیں۔)

چور مچائے شور: کشمیر (حصہ دوم)

مظلوم نما ظالم:

اس مضمون کے پہلے حصے میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اقوام عالم نے مشرق وسطیٰ میں دو ریاستی فارمولے کو وہاں رہنے والے یہودی اور عربوں کے لئے ایک قابل عمل حل قرار دیا تھا۔ عربوں نے اس فارمولے کو رد کیا اور اسرائیل پہ چڑھ دوڑے۔ بجائے پُر امن بقائے باہمی کے عربوں نے اسرائیل کے وجود کو برداشت کرنے سے انکار کر کے مشرق وسطیٰ کے تنازعے کا آغاز کیا اور تنازعے کو بات چیت سے حل کرنے کی

بجائے طاقت کے ذریعے نپٹانے کی ٹھان لی۔ اسرائیلی ریاست کے قیام کے وقت جتنا علاقہ اسرائیل کے پاس تھا اس سے چار گنا زیادہ علاقہ آج اسرائیل کے پاس ہے۔ یہ علاقہ عربوں نے اسرائیل سے جنگوں میں ہارا ہے۔ ہر دفعہ جنگ کا آغاز عربوں نے ہی کیا اور ہر دفعہ شکست کھا کر اسرائیلی ریاست کو مزید توسیع دینے میں مدد کی۔

لطف یہ ہے کہ آج اسرائیل سے مقبوضہ علاقہ کو چھوڑنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مغربی کنارے کی ساری پٹی پر اردن نے پہلے قبضہ کیا۔ بعد ازاں اردن کی اپنے خلاف جارحیت کے نتیجے میں اسرائیل نے یہ سارا علاقہ اردن سے چھینا۔ آج اسرائیل کو توسیع پسند اور غاصب قرار دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کو جنگ کے ذریعے حل کرنے کا فیصلہ کس کا تھا؟ عربوں نے اسرائیل پر ہر حملہ اس سے پیار محبت بڑھانے یا وہاں کے شہریوں میں مٹھائی تقسیم کرنے کے لئے تو کیا نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حملے اسرائیل کو مٹانے کے لئے کئے گئے۔ اس سے اس کی زمین چھیننے کے لئے کئے گئے۔ اس کے شہریوں کو اپنی رعایا بنانے کے لئے کئے گئے۔ اُنہیں پھر دربدر کرنے کے لئے کئے گئے۔ عربوں کو کیا پتہ تھا کہ الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گی۔ کھیل آپ نے خود چنا۔ اگر بساط الٹ گئی تو کیسا شکوہ۔ جو اسرائیل عربوں کے ساتھ کر رہا ہے اُس پہ رونا دھونا کیوں؟ یہی سب کچھ تو آپ اسرائیل کے ساتھ کرنا چاہتے تھے، اور اب بھی یہی کرنا چاہتے ہیں مگر آپ کو اپنے ہی کھیل میں شکست ہو گئی ہے۔ اِسے کہتے ہیں "مظلوم نما ظالم"۔

مسئلہ کشمیر:

غیر تقسیم شدہ ہندوستان میں 1946ء کے انگریزوں کے پیش کردہ کیبنٹ مشن پلان کے تحت کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت بنائے جانے پر دونوں فریقین میں اتفاق ہو چکا تھا۔ کانگریس کی منظوری کے باوجود پنڈت نہرو نے اس پلان کو مسترد کر کے ہندوستان کی تقسیم کا راستہ کھول دیا۔ نہرو نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی سب سے اہم وجہ جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نہرو زرعی اصلاحات کے ذریعے ہندوستان سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ چاہتا تھا۔ لیکن جاگیرداروں پہ مشتمل مسلم لیگ کو یہ بات منظور نہ تھی۔ انہی اختلافات میں ایک یہ اختلاف بھی تھا کہ نہرو کی خواہش تھی کہ Princely States کی عوام اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ آیا اُسے ایک آزاد ریاست

کے طور پہ رہنا ہے یا ہندوستان میں الحاق کرنا ہے۔ جبکہ نو آبادیاتی برطانیہ یہ حق ریاست کے نواب یا راجہ کو دینا چاہتا تھا جس کو مسلم لیگ کی پُر زور تائید حاصل تھی۔ بہر حال انڈیپنڈنس آف انڈیا 1947 کے ایکٹ میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ نوابی ریاست یا رجواڑے کا حکمران ہی آزاد رہنے یا بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک ریاست کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے گا۔ جناح اس طریقۂ کار کے زبردست حامی تھے۔

اسی ایکٹ کے تحت کشمیر کے راجہ نے کشمیر کو ایک آزاد ریاست رکھنے کا فیصلہ کیا (تفصیلات کے لئے شیخ عبد اللہ کی خود نوشت "آتشِ چنار" ملاحظہ کیجئے) اِسی طرح حیدر آباد دکن کی دولت مند ریاست نے بھی آزاد رہنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ابھی پاکستان بنے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ پاکستان کی جانب سے قبائلی لشکر نے کشمیر کی کمزور ریاست پر حملہ کر دیا جسے جہاد کشمیر کا نام دیا گیا۔ جنرل اکبر نے اپنی کتاب "Raiders of Kashmir" میں اس بات کا کُھل کے اعتراف کیا ہے کہ دراصل اُس قبائلی لشکر کو پاک فوج کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی۔ آپ اُنہیں اُس وقت کا طالبان سمجھ سکتے ہیں۔ اُسی وقت سے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور قبائلی مجاہدین کا اتحاد شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

اکثر پاکستانی مفکر اور تاریخ دان امریکہ کو 1979-1988ء کے افغان جہاد کے دوران مجاہدین اور طالبان کا خالق قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کے پروردہ قبائلی مجاہدین کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ اُسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب پاکستان کا وجود عمل میں آیا اور جب کہ اس وقت پاکستان امریکہ کے ساتھ کسی قسم کے بین الاقوامی اتحاد جیسے Seato یا Cento میں شریک تک نہ تھا۔

جب ریاست کشمیر کے حکمران ہری سنگھ نے یہ دیکھا کہ اُس کی کمزور ریاست ایک بڑے ملک کی Proxy فوج سے مقابلے کی سکت نہیں رکھتی تو اُس نے بھارت سے مدد طلب کر لی۔ بھارت نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا اور نہرو نے بھارتی فوج کی مدد کو کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے ساتھ مشروط کیا۔ ناچار ہری سنگھ کو بھارت کی یہ شرط ماننی پڑی۔ یوں انڈیپنڈنس آف انڈیا 1947 کے ایکٹ کی رو سے بھارت کو ریاست کشمیر کو اپنے ملک میں

شامل کرنے کا قانونی حق مل گیا۔ بھارتی فوج نے قبائلی لشکر کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا لیکن اقوام متحدہ کی جانب سے جاری کردہ سیز فائر کے تحت اُسے رک جانا پڑا اور کشمیری ریاست کے ایک بڑے حصے کو وہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہی حصہ اب پاکستان میں "آزاد کشمیر" کہلاتا ہے جبکہ بھارت میں اسے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے اپنے کئی بیانات میں پاکستانی قبائلی لشکر کشی کو پاکستان کی ایک بہت بڑی غلطی قرار دیا ہے۔ اُن کے مطابق طاقت کا یہ کھیل شروع کر کے پاکستان نے از خود بھارت کو کشمیر پہ قبضہ کرنے کا جواز مہیا کیا۔ دراصل پاکستان نے انڈپنڈنس آف انڈیا 1947ء کے ایکٹ کی پاسداری میں بدنیتی سے کام لیا۔ وہ دونوں جہانوں کا مزا لوٹنا چاہتا تھا۔ ایک طرف تو اُس کا خیال تھا کہ حیدر آباد دکن کا حکمران نظام برطانیہ سے اپنے مضبوط تعلقات کی بنا پر اپنی ریاست کو آزاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسی لئے جناح نے برطانیہ کے پیش کردہ اُس تجویز کی حمایت کی جس کے تحت نوابی ریاست کے حکمران کو ہی ریاست کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔ نظام اپنی بے پناہ دولت سے نومولود پاکستان کی کفالت کر رہا تھا۔ اس لئے پاکستان حیدر آباد کو آزاد ریاست کے طور پہ دیکھنا چاہتا تھا۔ دوسری جانب پاکستان کا خیال تھا کہ وہ اپنی پڑوسی ریاست کشمیر پر بزور شمشیر قابض ہو جائے گا۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔

ایک جانب تو پاکستان نے کشمیر پر فوج کشی کر کے خود اُسے بھارت میں شامل ہونے پہ مجبور کیا۔ دوسری جانب بھارت نے طاقت کے ذریعے دکن پر اُسی طرح قبضہ کر لیا جیسے کہ پاکستان نے قلات کی ریاست پر قبضہ کیا۔ اسے کہتے ہیں نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ یہاں کے رہے نہ وہاں کے رہے۔ یہاں پر بھی عربوں کی طرح پاکستان نے ہی جنگ و جدل کے کھیل کی ابتدا کی اور لو اپنے دام میں خود صیاد آ گیا۔

بھارت کی بلیک میلنگ کے تحت کشمیر کے الحاق پر کشمیری عوام میں غم و غصہ پایا گیا۔ اُنہیں اس بات پر غصہ تھا کہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک لوٹ کا مال بن گیا تھا۔ چنانچہ کشمیر میں اپنی ریاست کی آزادی کے لئے

ایک قومیت پرست، جمہوری اور سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا جس میں کشمیری مسلمان اور ہندو شانہ بہ شانہ شریک تھے۔ جبکہ پاکستان نے کشمیر پہ قبضے کے خواب کو کبھی بھی فراموش نہ کیا۔ وہاں پائی جانے والی سیاسی بے چینی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے پاکستان نے ایک بار پھر 1965ء میں کشمیر پہ حملہ کیا۔ اس بار پاکستان نے سوچا کہ کیونکہ لائن آف کنٹرول ایک متنازعہ سرحد ہے اس لئے یہاں حملے کے نتیجہ میں جنگ یہاں تک ہی محدود رہے گی۔ لیکن اس دفعہ بھی اندازے میں غلطی ہوئی اور بھارت نے پاکستان کو فل سکیل جنگ کی صورت میں جواب دیا۔ پاکستان کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔

پاکستان نے کشمیریوں کی قومی جدوجہد (نیشنلسٹ موومنٹ) کو مذہبی جدوجہد میں تبدیل کر کے اُسے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا نقطہ عروج ضیاء الحق کا دورِ آمریت ہے۔ اُس وقت سے لے کر آج تک پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی پروردہ جہادی تنظیمیں مسلسل پاکستانی نوجوانوں کو فوجی تربیت دے کر کشمیر میں دراندازی کے لئے بھیجتی رہی ہیں۔ اس بیرونی مداخلت کی وجہ سے بھارتی حکومت کو کشمیر میں بنیادی شہری حقوق معطل کرنے کا جواز مل گیا جس کی لپیٹ میں کشمیر کے عام شہری بھی آ گئے۔ مجاہدین نے ہندو کشمیریوں کا قتل عام کیا جس کی وجہ سے ہندو آزادئ کشمیر کی تحریک سے علیحدہ ہونے اور اپنی جان بچانے کے لئے ہماچل پردیش، ہریانا، پنجاب اور بھارت کے دیگر علاقوں کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ایک المیہ تھا کہ کشمیر کی آزادی کے نام پر غیر کشمیریوں نے کشمیریوں کا قتل عام کیا۔ کشمیر کے Cause کو بین الاقوامی سطح پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اب تک اس تحریک کو مقامی کشمیریوں کی قومی جدوجہد سمجھا جا رہا تھا لیکن اس مہذب اور جمہوری طریقے سے چلائے جانے والی تحریک کو دہشت گردی میں تبدیل کر دیا گیا۔ دنیا کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ کشمیر میں گڑبڑ مقامی شہری نہیں بلکہ پاکستان سے آئے ہوئے جہادی پھیلا رہے ہیں۔ کشمیری جدوجہد کا حال بھی تحریک آزادی فلسطین جیسا ہوا۔ ایک قومی تحریک کو مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ یوں کشمیریوں کو عالمی ہمدردیوں سے محروم ہونا پڑا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی بات زیادہ تر پاکستان کے فوجی آمروں نے کی ہے جن میں ضیاء الحق سر فہرست ہے۔ دنیا اس بات پہ کتنا ہنستی ہوگی کہ پچاس لاکھ عوام کے حقِ خودارادیت کی بات کرنے والے خود اٹھارہ کروڑ عوام کے حق خودارادیت (Right of Self-detevnination) پامال کر کے اقتدار پہ قابض ہو جاتے ہیں۔ فوجی آمروں نے بار بار عوامی مینڈیٹ کی توہین کرتے ہوئے منتخب حکومتوں کو گرایا۔ اُس وقت خود پاکستانی عوام کا حقِ خودارادیت کہاں گیا تھا؟

اسی طرح بھارت دوسرے ملک سے آئے ہوئے گوریلا لڑاکوں کے خلاف آہنی ہاتھ استعمال نہ کرے تو کیا کرے؟ اکثر اسلامی ملکوں بشمول عراق، یمن، سعودی عرب، شام، ایران وغیرہ میں تو خود اپنے ملک کے باغی شہریوں کا قتل عام کیا گیا ہے۔ کیا پاکستان نے 1971ء میں مشرقی پاکستان میں اپنے ہی شہریوں کا قتل نہیں کیا تھا؟ کیا 1992-3ء میں کراچی میں تخریب کاروں کے خلاف آپریشن میں پاکستانی رینجرز نے ماورائے عدالت قتل نہیں کئے؟ کیا آج بھی بلوچستان میں قوم پرست بلوچوں کا خون نہیں بہایا جا رہا؟ کیا 1985-6ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران ضیاء الحق نے سندھ کی عوام کے خلاف فضائی بمباری نہیں کرائی؟ آج بلوچی اور کل کو کسی اور علاقے کے لوگ پاکستان سے علیحدگی چاہیں تو کیا پاکستان اُنہیں حقِ خودارادیت دے گا؟ اسلامی ملک تو اپنے شہریوں کے خون سے ہولی کھیلیں تو درست لیکن بھارت باہر سے آئے ہوئے دہشت گردوں کے خلاف کاروائی کرے تو غلط ہے؟ جیسے گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے اسی طرح بدقسمتی سے بھارتی فوج کی کاروائی میں بہت سے بے قصور کشمیریوں پر بھی نزلہ گرا۔ لیکن اس میں بھارتی فوج جتنی قصوروار ہے اُس سے زیادہ پاکستانی جہادی تنظیمیں اور اُن کی سرپرست قوتیں ہیں۔ اُن کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے علاقے میں جا کر وہاں کے عوام کی قسمت کا فیصلہ کریں؟ اگر آج کسی اور ملک سے رضاکار بلوچ قوم پرستوں کی مدد کے لئے آجائیں تو کیا پاکستان اُسے برداشت کرے گا؟ کیا پاکستان اُسے پوری قوت سے کچلنے کی کوشش نہ کرے گا؟

یہ المیہ ہے کہ جنہیں اپنے ملکوں میں انسانی اور شہری حقوق کی الف بے کا پتہ نہیں ہے وہی فلسطین اور کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بات کرتے ہیں؟ جبکہ وہاں صورتحال کو بگاڑنے کے ذمہ داری بھی وہ خود ہی ہیں۔ اسے کہتے ہیں "اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔

یورپی نو آبادیاتی نظام کارِدِ عمل:

اسلامی دنیا میں پچھلی صدی کے یورپی نو آبادیاتی راج کے خلاف بہت سی شکایات اور رنجشیں پائی جاتی ہیں۔ وہ اسے اپنے ممالک میں ہونے والے تمام مسائل کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ نومبر 2005ء میں فرانس میں ایک ہفتے تک مسلم تارک الوطن نوجوانوں نے سخت ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی۔ اس ہنگامہ آرائی کا عذر بھی اسی شکایت کو بنایا گیا، کئی نمایاں فرانسیسی نژاد مسلم شخصیات نے فرانسیسی حکومت سے ماضی کے نو آبادیاتی گناہوں کی معافی کا مطالبہ بھی کیا جو اُن کے نزدیک ہنگاموں کو روکنے کے لئے ضروری تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یورپی نو آبادیاتی نظام کی عمر تو بہت مختصر سی ہے۔ یہ تقریباً 1850ء میں شروع ہو کر 1920ء میں زوال پذیر ہو گئی۔ جبکہ ہم اسلامی تاریخ کے اُس طویل دور کو کیوں بھول جاتے ہیں جب ساتویں صدی سے لے کر سترویں صدی تک تقریباً ایک ہزار سال تک مسلم توسیع پسندی اور سامراجیت کا دور دورہ رہا؟ جس کا نقطہ عروج قرونِ وسطیٰ کی سلطنتِ عثمانیہ تھی۔

اس سلطنت کا دور اپنی نو آبادیوں کے لئے کتنا منصفانہ تھا۔ اس کا اندازہ اس چھوٹی سی مثال سے لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ کے مفتوحہ ممالک کی عوام پر یہ فرض تھا کہ وہ اپنی نرینہ اولاد کا پانچواں حصہ (ہر پانچ بچوں میں سے ایک) سلطنت عثمانیہ کو غلام کی حیثیت سے حوالے کریں۔ یورپی نو آبادیاتی نظام تو کئی لحاظ سے اپنی نو آبادیوں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا۔ مثلاً یہ برطانوی راج ہی تھا جس نے ہندوستان میں جمہوریت، آئین، قانون کی بالادستی اور جدید علوم وغیرہ کو متعارف کیا۔ اگر وہ نو آبادیاتی نظام بُرا بھی تھا تو بھی اُس کا شکار صرف مسلمان ہی نہیں رہے بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ مثلاً ہندو، بدھسٹ، سکھ وغیرہ بھی اُس کے زیر اثر رہے ہیں۔ لیکن آج ہندو یا

بدھسٹ تو یورپ میں ہنگامہ آرائی نہیں کر رہے۔ وہ تو وہاں دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث نہیں ہیں۔ اسلامی دنیا ہی برطانیہ یا یورپ کو اپنے ہر مسئلے کا ذمہ دار کیوں ٹھہراتی ہے؟

اس مضمون کے پہلے حصے میں یہ بات تفصیل سے لکھی جا چکی ہے کہ اسلامی دنیا کے اپنے خلاف ہونے والی نا انصافیوں کی کہانیاں نہ صرف مبالغے پر مبنی ہیں بلکہ اکثر تو بالکل بے بنیاد ہیں۔ مسلمان اقلیتیں غیر مسلم ممالک میں نہایت امن و سکون کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اگر کہیں کوئی مسئلہ ہے تو وہ خود اُن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جبکہ اسلامی دنیا میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک ہو رہا ہے جس میں جدید مسلم ممالک جیسے ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل ہیں۔

مسلم دنیا کی بے بنیاد شکایات صرف وہاں تک ہی محدود نہیں جہاں مسلمان اقلیتی مذہبی گروہ کی حیثیت سے رہ رہے ہیں بلکہ وہاں بھی ہیں جہاں وہ اکثریتی آبادی رکھتے ہیں۔ مثلاً افغانستان اور عراق جہاں امریکہ کے زیر قیادت بین الاقوامی اتحادی افواج اُن دہشت گرد قوتوں سے بر سرِ پیکار ہیں جو خود اسلامی ممالک کے لئے بھی انتہائی سنگین خطرہ ہیں۔ ان حملوں کو جواز بنا کر مغربی ممالک کے خلاف نفرت کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تو محض ایک حجتِ ناتمام ہے۔ ورنہ یہ نفرت تو اُس سے کہیں پرانی ہے۔ ماضی قریب میں مسلمانوں نے جس میں القاعدہ اور اُس کا لیڈر اسامہ بن لادن سرِ فہرست تھے، امریکی فوج کی سعودی عرب میں موجودگی کو امریکہ کے خلاف نفرت کا جواز بنایا۔ گویا یہ بھی مغرب کا اسلامی دنیا پر ایک ظلم تھا۔ حالانکہ امریکی فوج سعودی عرب میں خود سعودی عرب کی درخواست پر آئی تھی کیونکہ سعودی عرب کو ایک اور اسلامی ملک عراق سے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یعنی مغرب کا کسی اسلامی ملک کی مدد کے لئے فوج بھیجنا اور اُس خطے کی حفاظت اور استحکام کے نقطہ نظر سے وہاں قیام بھی اُس کا ایک جرم ہے۔ آج جب عراق سے خطرہ ٹلتا نظر آتا ہے تو سعودی عرب کو یمن میں موجود القاعدہ کی عسکری قوت اور ایک دوسرے اسلامی ملک ایران سے خطرہ ہے۔

کیاافغانستان اور عراق پر امریکی اور اُس کے اتحادیوں کی فوجی کاروائی ہی اسلامی دنیامیں مغرب کے خلاف پائے جانے والے غم وغصہ کی وجہ ہے؟کیااسلامسٹوں کی دہشت گرد کاروائیاں انہی کارد عمل ہیں؟مضمون کے اگلے حصے میں ان نقاط کاجائزہ لیاجائے گا۔

(جاری ہے)

تو کعبہ ٹوٹ جاتا ہے

اگر تمہارے روزے برداشتِ نفس و آزمائش سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں تو پھر بجلی نہ ہونے پر شہر الکبیر (رمضان) میں حاصل کردہ ساراصبر اس وقت کہاں جاتاہے جب تم واپڈا کو مغلظات سناتے ہو؟کوئی یہ کیونکر مان لے کہ صبح سے شام تک بھوکے رہ کر تم صابر اور ہر حال میں شاکر ہوچکے ہو؟یہ تو صرف بھوک پر صبر کرنے کا نتیجہ ہے،اس کے علاوہ اگر بات کریں نفسیات کے سراب کی، جس کو اگر میں لفظوں میں صاف صاف لکھتاہوں تو امت کے صبر کاپیمانہ جو گالیوں سے بھرا ہے چھلک جاتاہے۔

دل عضو مرکزیت ہے نہ کہ صرف خون کا فوارہ، دل اعصاب پہ بھاری ہوناجانتاہے،دل احساسات کا مجموعہ ہے،دل کا سکون اگر نمازوں میں،پادریوں،مولویوں کی دعاؤوں اور منتروں میں ہوتاتو تم یہ سب کچھ کرکے روٹی،نوکری،چھوکری،مکان اور بیماریوں کارونانہ روتے،یاتو اس سارے تماشے میں سکون نہیں ہے یا پھر تم منافقت کے پیکر ہو،برادرانہ صلاح ہے کہ زندگی کے سجدے میں گر کے سوچو تو سکون پاؤ گے اور اس پاس کی مخلوق بھی تمہارے تیوروں سے امان میں رہے گی۔

اللہ یا بھگوان نے اگر کعبہ یا مندر میں رہنا ہوتاتو پھر تمہارااور میرادل کیابطور مسکن خوامخواہ ہے؟ذمہ دار اللہ یا بھگوان نہیں ہے،تم اور ہم ہیں،ہم نے دلوں سے نکال کر اسکو بیت اللہ اور مندروں میں دھکیل دیاہے،تم اپنے اعمال دیکھو اور شکوے دیکھو،جب کوئی بھوک سے مر رہاہوتاہے تو اس کی آہ وبکاء سے زیادہ تمہیں مفت خور مولوی کی "حی علی الصلوۃ" اور پنڈت کی "دھنے رام" سنائی دیتی ہے،کیاتمہیں پتاہے کہ جب ایک بھوکا مرتاہے تو ایک کعبہ ٹوٹ جاتاہے؟ایک مندر مسمار ہوجاتاہے

اور ایک گر جاگھر برباد ہو جاتا ہے، دیکھو تم روزانہ کتنے کعبے توڑتے ہو، جب تم ایک بھوکے کے دل کی آواز کو ڈرامہ بازی کہتے ہو تو تم اللہ اور رام جی کو ڈرامے باز کہتے ہو کیا تمھیں تمہارا وجود دینے والا ڈرامے باز ہو سکتا ہے ؟

ڈرامے بازی تو وہ ہے جو کشمیر کی اساس پہ بھارتی اور پاکستانی جرنیل کرتے ہیں، ڈرامے بازی تو پر تھوی اور غوری ہے، ڈرامے بازی تو واہگہ بارڈر پر جئے ہند اور پاکستان زندہ باد کے بلند و بالا نعرے اور جانوروں کی طرح دونوں جانب سے بھاگتے چند فوجی اور مرغوں کی لڑائی کی طرز کے لگنے والے ہو کرے ہیں، ڈرامے بازی تو سربجیت اور ثناء اللہ کا انتقامی قتل ہے، ڈرامے بازی تو "تم ہندو" اور "میں مسلمان" کہنا ہے، ڈرامے بازی تو پاکستان کو گالیاں دے کے نصرت فتح علی خان کو سننا ہے، ڈرامے بازی تو بھارت کو گالیاں دے کے بڑے شوق سے اے آر رحمان کو سننا ہے، ڈرامے باز زمین نہیں ہوا کرتی، ڈرامے باز انسان ہوا کرتے ہیں، ڈرامے باز فنکار ہوتا ہے، اور تم سچے فنکار ہو، سچا فنکار کسمپرسی ہی کا شکار ہوتا ہے اور بھوکا ہی مرتا ہے۔

جہاں خدا رہتا ہے وہاں خوشحالی ہوتی ہے، تم نے اور میں نے خدا کو مسجد، مندر میں بند کر ڈالا ہے دیکھو مسجد میں مولوی رہتا ہے، مندر میں گھنٹی باز پنڈت اور گرجاگھر میں اسقف، سب ہی خوشحال ہیں، خدا کے نام پہ پچھلے کم از کم پچھلے تین ہزار سال سے اس طبقے کو کمائی کی کوئی فکر نہیں، اللہ تو ان کی یونورسل دوائی ہے جس کو انھوں نے گلہ پھاڑ پھاڑ کے تمہارا نشہ بناڈالا ہے۔

خود کو ڈھونڈو وہیں اللہ بھی مل جائے گا، خود کو ٹٹولو تمہارے اندر ایک بہت بڑا انا الحق بیٹھا ہے، خود میں گھومو تمہارے اندر صفا و مروا مروج ہے، خود کو سنو تمہارے اندر گھنٹیاں تو کیا سارا مندر بھجن کرتا ہے، خود میں گرو تمہارے اندر کی مسجد کا صحن ہزاروں مسجودوں کی جگہ رکھتا ہے اور اس وسیع کائنات میں اپنے وجود کا مزہ لو تو آس پاس والے سب انسان نظر آئیں گے کیونکہ خود کو سمجھنا دوسروں کو سمجھنا ہے اور دوسروں کو سمجھنے سے دل نہیں ٹوٹا کرتے اور دل تو کعبہ ہے، تو پھر کعبہ نہیں ٹوٹے گا، اگر ایسا نہیں کروگے تو کعبہ ٹوٹ جاتا ہے۔

میں تو آئینہ ہوں

کتے اور گھر کے مکینوں میں بنیادی فرق تو یہ ہوتا ہے کہ کتا گھر کے باہر کھڑا، بیٹھا ہر آتے جاتے پہ بھونکتا رہتا ہے، اس کا کام ہر نا معلوم شخص پر بھونکنا ہوتا ہے چاہے وہ اس گھر کی چھت مرمت کرنے آیا ہو یعنی گھر کے فائدے کے واسطے، اب مکینوں کا کردار کتے کے کردار سے بلکل مختلف ہوتا ہے، گھر کے مکین دل و جان سے گھر کو صاف رکھتے ہیں، پودوں کو پانی دیتے ہیں الغرض اگر سینکڑوں میل دور جاکر نوکری بھی کرنی پڑ جائے تو اس سے بھی نہیں کتراتے۔

یہ بات سوچنے والی ہے کہ کہیں ہم گھر کے باہر بیٹھنے والے اور ہر اس شخص پر زبان کھولنے والے تو نہیں بن گئے جو اس گھر کی اچھائی چاہتا ہو؟ ہم کھانے پینے اور دوسروں پر تنقید کرنے والی مشین بن چکے ہیں اپنی ذات کو چھوڑ کر ہر اس ذات پر لپکتے ہیں جو ہمیں ناگوار گزرنے والی بات کہہ ڈالتا ہے۔

پچھلی پانچ دہائیوں سے ہماری ذات کو ایک مخصوص پروپگنڈے کے ذریعے امید کے لحاف میں ایسا لپیٹا جاچکا ہے کہ ہم ماسوائے اپنے کسی دوسرے کو خاطر میں ہی نہیں لا پاتے، نماز، روزے، تسبیح، بھارت، اسرائیل، امریکا، کرکٹ، جنت، جہنم اور کئی دوسرے ایسے نفسیاتی بیج ہیں جو ہمارے ذہنوں کو پستی سے بلندی کی طرف کے سفر کو روکنے کے لیے بو دیے گئے ہیں، ایک عام پاکستانی کے ذہن میں اپنے بچوں کو کھانا کھلانے سے زیادہ بھارت سے جنگ کرنے کو جی چاہتا ہو گا یا پھر بچوں کو کپڑے پہنانے سے زیادہ مسجد کے لیے نئی صفوں کی خریداری ذہن میں آتی ہو گی، جنت اور جہنم کے کھیل نے ایسا آدبوچا ہے کہ انسانیت کو چھوڑ کر حیوانیت کے قریب تر ہوتے جارہے ہیں حالانکہ یہ بات قابل فکر ہے کہ جنت یا جہنم میں اگر کوئی جاتا بھی ہو تو اس کا کم از کم انسان ہونا تو لازمی شرط ہے۔

متذکرہ بالا بیج اپنا پھل لے آئے ہیں، آج اگر کوئی بھی تمہیں تمہاری غلطی بتاتا ہے تو تم اس بیچارے کی پچھلی سات نسلوں تک کو گالیوں سے نوازتے ہو، اس کی بات کا جواب تمہارے پاس صرف اس کی ذات پر تنقید ہی ہوتا ہے، تمہارے منہ سے لفظ نہیں آگ نکلتی ہے، جو ایک بات کی دلیل ہے کہ تمہارے اندر کا صبر جنت، جہنم، اسرائیل، امریکا، بھارت، نماز، روزے اور نیکی جیسے بیجوں نے تلف کر ڈالا ہے اور تم کیونکہ ایک بیمار ہو اسی لیے اپنے اندر کی بیماری ختم کرنے والے کی باتوں تک کو بلا جواز بکواس کہہ دیتے ہو، بالکل اس بوڑھے کی طرح جو کہ دمے کا مریض ہے لیکن پھر بھی حقہ پینے کے واسطے ڈاکٹر کے سارے کیے دھرے پہ دو گالیاں جڑ کے مٹی ڈالتا ہے۔

الفاظ کے معنی نہیں بدلا کرتے، ہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ اپنے نفسیاتی اثرات بدل ڈالتے ہیں، اللہ اکبر کا نعرہ تمہارے اندر کی نفسیاتی گندگی سے اٹھنے والی بدبو کا ایسا سپرے بن چکا ہے کہ ہر وہ بات جس کا مناسب جواب تمہارے پاس نہیں ہے، تم اگلے کو یہود و نصاری کہہ کر یہ نعرہ بلند کر ڈالتے ہو، تم اللہ کو بلند نہیں کرتے بلکہ اپنے اندر کے نفسیاتی بھوت کی لٹکی ہوئی گردن کو اونچا کرنے کی بے ہودہ کوشش کرتے ہو، مذہب کو تم نے سچائی سے بچانے والی دوائی بنا کر اپنی ذات پر چھڑک ڈالا ہے، تم ہم ادھ موئے ہو چکے ہیں، جو جوئے شیر ہماری منتظر تھی اس سے دوسرے کب کے لطف اندوز ہو چکے، اب تمہیں، ہمیں خود پسندی کے آسیب سے نکلنا ہے اور نئی جوئے شیر اپنی نسلوں کو لا کر دینی ہے۔

تم تحفظ ختم نبوت کے لیے گلے پھاڑتے ہو لیکن کسی کی سات سال کی بیٹی کی رداتار تار ہونے پہ تمہیں موت پڑ جاتی ہے اور تم اسی طرح خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں پڑھ کے درود کے ورد میں مصروف ہو جاتے ہو، وہ انسان اپنی ماں کی کیسے عزت کر سکتا ہے جو دوسروں کی بیٹی کو کپڑے دھونے، بر تن مانجھنے اور بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھے، یہ ادھ موئی غیرت ابنائے آدم اگر کھوپڑی کو اس کے اصل کام پہ لگا دیں تو یقین جانیں پورا مغرب منہ میں انگلیاں لیے حیرانیت کی حدوں کو چھوئے۔

میں تو آئینہ ہوں، میرا کام تمہیں یہ دکھانا ہے کہ تمہارے ماتھے پر سیاہی لگی ہے، اور دامن پر داغ، اب اس داغ کو دھونا اور سیاہی کو صاف کرنا تمہارا اپنا عمل ہے، لیکن اس سے پہلے کہ تم میری بات کو سمجھو تمہاری خود پسندی تمہیں سیاہی صاف کرنے اور داغ پہ توجہ دینے سے پہلے تمہیں مجھے گالیاں دینے پہ اکساتی ہے جس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ تم اپنی اصلیت دکھا کر ویسے ہی جینا پسند کرتے ہو جیسا کہ آئینہ دیکھنے سے پہلے۔

میں تو آئینہ ہوں، توڑ ڈالو گے تو تمہیں تمہارے اصل روپ کے سینکڑوں حصے نظر آنے لگیں گے، میں تو آئینہ ہوں ٹوٹ کر بھی تمہارے وجود کا عذاب بن جاؤں گا، تمہارے وجود کی خباثت تمہارے علاوہ سینکڑوں کو دکھاڈالوں گا، میں تو آئینہ ہوں میرے کام کو سمجھو نہ کہ توڑنے کی تدبیر۔

میں تو آئینہ ہوں ٹوٹ کے بکھر جاؤں گا

تمہارا چہرہ ہزار آنکھوں کو پھر دکھاؤں گا

نامعقولیت

مسلمانوں کی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جو قرآن و حدیث کو بغیر کسی چوں وچرا کے سند مانتے ہیں، اور دوسری قسم وہ جو احادیث کا مکمل یا جزوی انکار کرتی نظر آتی ہے۔ اس دوسری قسم پہ مشتمل گروہ ان مسلمانوں کا ہے کہ جو قرآن کے واضح معنوں کی (بسا اوقات بالکل الٹ) تاویل کرتے ہیں تا کہ کسی طرح یہ ایک معقول ذہن کے لئے قابلِ قبول بن جائے۔

تقریباً "1200 سال سے بخاری کا ذخیرہء حدیث جمہور مسلم امہ کے لئے قرآن کے بعد مستند ترین درجہ رکھتا چلا آ رہا ہے۔" مسلمان، خصوصاً سنی مسلمان، قرآن کے علاوہ احادیث کو بھی راہنمائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ احادیث محمد کی زندگی کی کہانیاں ہیں جو محققین نے دو سو سے تین سو ہجری کے درمیان جمع کی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور معتبر وہ ہیں جو بخاری اور اس کے شاگرد مسلم نے اکٹھی کیں اور یہ احادیثِ صحیحہ کہلاتی ہیں۔ جس کا مطلب ہے درست، محکم اور مستند۔ ان کے صحیح

کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ ان احادیث نے "علم الحدیث" کی سخت کسوٹی سے گزر کر یہ مقام پایا ہے۔
آج کل مسلمانوں میں انکارِ حدیث کے ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ احادیث کی صحت کا یکلخت انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس انکار میں یہ حضرات اس حد تک گزر جاتے ہیں کہ مسلمانوں کی میجارٹی کے نزدیک انتہائی قابلِ احترام سمجھے جانے والے ان مولفینِ حدیث کو جھوٹا اور "مسلمان کے روپ میں مجوسی" تک کہہ ڈالتے ہیں کہ جنھوں نے سخت جانفشانی سے تدوینِ حدیث کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ان مولفین نے یہ احادیث "ایجاد" نہیں کی تھیں کہ ان کو اس قدر برا بھلا کہا جائے۔ انہوں نے تو ان احادیث کو اکٹھا کر کے ان کی جانچ پرکھ اور تدوین کی اور ان احادیث کی محمد اور اس کے صحابہ تک کے راویان کی فہرست (عنعنہ) مرتب کی۔
ابتدائی مسلم محققین نے حدیث کو صحیح تبھی قرار دیا کہ جب وہ فنِ روایت اور فنِ درایت کے اصولوں پہ پوری اترتی ہو اور اس کے علاوہ وہ قرآن و سنت کے خلاف بھی نہ جاتی ہو۔
آج کے دور میں کوئی بھی فنِ روایت کی بنیاد پہ کسی حدیث کو قبول یا رد کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی روایت کرنے والوں کو مرے ہوئے بھی ہزار سال سے زائد عرصہ بیت گیا اور ہمارے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ہم ان راویان کی جانچ کر سکیں۔ اس وقت ہمارے پاس احادیث کی مصداقیت کا پیمانہ فقط فنِ درایت اور ان کا قرآن کے ساتھ موازنہ ہے۔ مسلم اسکالر آصف افتخار کہتے ہیں کہ: "حدیث کو کسی موضوع کے متعلق اسلامی تعلیم کا مصدقہ مصدر تبھی تسلیم کیا جائے گا کہ جب وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو یا مروجہ انسانی فطری قوانین و عقل کو مطمئن کرتی ہو اور ان کے خلاف نہ جاتی ہو"۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ: "امام ابنِ علی جوزی نے کہا اگر تمھیں کوئی حدیث عقلِ سلیم یا کائناتی حقائق کی نفی کرتی نظر آئے تو اس کو جعلی (من گھڑت) سمجھو، اس کے راویان کی معتبریت پر گفتگو بے معنی ہے۔ ایسی احادیث بھی مشکوک ہیں جو نہایت چھوٹے سے عمل کے بہت ہی بڑے بدلہ کا وعدہ کرتی ہیں یا وہ کہ جو بے سروپا ہیں"۔
اب اگر کچھ احادیث کو عقلِ سلیم (کامن سینس) سے پرکھیں اور ابنِ علی جوزی کی بات کو بھی ذہن میں رکھیں تو ہمیں ایسی بہت ساری احادیث نظر آتی ہیں کہ جو "صحیح" کہلائے جانے کے باوجود بھی اوپر بیان کئے گئے ٹیسٹ پہ پوری نہیں اترتیں، مثال کے طور پر:

صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب

باب: اس کا ثواب جس نے شاخ یا کوئی اور تکلیف دینے والی چیز راستے سے ہٹائی

حدیث نمبر 2472

حدثنا عبد اللہ، أخبرنا مالک، عن سمي، عن أبي صالح، عن أبي هريرة- رضى اللہ عنه- أن رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم قال

"بينما رجل يمشي بطريق، وجد غصن شوك فأخذه، فشكر الله له، فغفر له".

ہم سے عبد اللہ بن یوسف تنیسی نے بیان کیا، کہا ہم کو امام مالک نے خبر دی، انہیں سمی نے، انہیں ابو صالح نے اور ان سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک شخص راستے پر چل رہا تھا کہ اس نے وہاں کانٹے دار ڈالی دیکھی۔ اس نے اسے اٹھالیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ عمل قبول کیا اور اس کی مغفرت کر دی۔

یہاں اجر کی مقدار عمل سے کہیں زیادہ ہے، اور اگر ہم ابنِ علی جوزی کی محکم بات کو مدِ نظر رکھیں تو یہ حدیث جھوٹی نظر آتی ہے۔

یہ مثال بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ محض ایک صحیح حدیث کو غیر صحیح ثابت کر کے (یا مشکوک ٹھہرا کے) ہم نے ان تمام احادیث کے مستند ہونے کو بھی مشکوک ٹھہرا دیا ہے کہ جو "صحیح" کا درجہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا یہاں پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ 90 فیصد مسلمان بخاری اور مسلم کے ذخیرہء حدیث پر ایمان رکھتے ہیں، اور باوجود اس کے کہ یہ احادیث قرآن کے بعد مستند ترین کا درجہ رکھتی ہیں، بہر حال اس قدر قابلِ اعتبار بھی نہیں ہیں۔

آیئے اب ایک اور حدیث لیتے ہیں اور اس کا کامن سینس کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں کہ آیا یہ کامن سینس کے معار پہ پوری اترتی ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے پہلے لگے ہاتھوں کامن سینس کی تعریف بھی بیان کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ: "کامن سینس وہ سینس ہے کہ جو زیادہ کامن نہیں ہے"۔ اور چونکہ مذہبی لوگ جو واقعات کو عقائد کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں ان کے کامن سینس کے میعارات مختلف ہیں۔

مثال کے طور پر، ایک درست عقلِ سلیم کہتی ہے کہ مرد و زن کی ذہنی استعداد ایک سی ہے۔ یقیناً مردوں میں بھی اور خواتین میں بھی کم عقل افراد پائے جاتے ہیں لیکن اس کا تعلق ان کی جنس سے نہیں ہے۔ کسی بھی سنجیدہ سائنسی تحقیق سے کبھی یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ مرد و عورت کے بیچ ذہانت کی مقدار میں کوئی فرق پایا جاتا ہے۔ ہر منطقی شخص یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ عورت اور مرد برابر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سب ہی جانتے ہیں کہ تمام مرد ایک جیسی ذہنی صلاحیتیں نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ آئن سٹائن کی گواہی کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے کہ جتنی نذیر خان کی گواہی کی۔ سائنس، قانون اور عقلِ سلیم سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے حقوق برابر کے ہونا چاہئیں۔

جعلی اور غلط عقائد کی بنیاد پر عقلِ سلیم کو جھٹلا دیا جاتا ہے۔ اسلام میں کامن سینس کی تعریف مختلف ہے۔ حیرت اور قدرے افسوس کی بات ہے کہ کچھ مسلم خواتین بخوشی اپنے حقوق کی سلبی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں اور اس کو آزادی سے تعبیر کرتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حجاب سے ان کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے اور خاوند کے تہ نگین ہو کے اس کی سزا سہہ کر زندگی گزارنا ہی ان کے لئے بہتر ہے۔ ان کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ ذہانت میں مرد سے کمتر ہیں اور یہ بھی کہ ان (عورتوں) کی زیادہ تعداد

جہنم میں جائے گی کیونکہ محمد نے ایسا کہا تھا۔

چنانچہ جب ہم کامن سینس کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد مذہبی افراد کی کامن سینس نہیں، بلکہ وہ کامن سینس ہے کہ جو "اصل" سائنس کے مطابق ہے اور جس کے وضع کرنے والے "اصلی" سائنسدان ہیں۔ یہاں لفظ "اصلی" پہ زور اس لئے ہے کہ تمام مذاہب نے اپنے جعلی فلسفی، جعلی سائنسدان اور اپنی جعلی سائنس بھی وضع کرر کھی ہے۔ مورس بوکائی اور کیتھ مُور جیسے فراڈیوں نے قرآن سے جو سائنس نکال رکھی ہے یہ سائنس نہیں ہے۔ یہ فقط اپنے بینک اکاؤنٹ بھرنے کے لئے گھڑی گئی جہالت کی چُوسنی ہے جو مسلمان بخوشی چُوستے پھر رہے ہیں کہ وہ یہی کچھ سننا چاہتے ہیں جو یہ نوسرباز انہیں سناتے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ درج ذیل حدیث سائنسی اور کامن سینس کے معیار پہ پوری اترتی ہے یا نہیں:

صحیح بخاری، کتاب التوحید والرد علی الجہیمۃ

باب: سورۃ ہود میں اللہ کا فرمان "اور اس کا عرش پانی پر تھا" "اور وہ عرش عظیم کارب ہے"۔

حدیث نمبر 7418

حدثنا عبدان، عن أبي حمزة، عن الأعمش، عن جامع بن شداد، عن صفوان بن محرز، عن عمران بن حصين، قال إني عند النبي صلى الله عليه وسلم إذ جاءه قوم من بني تميم فقال "اقبلوا البشرى يا بني تميم". قالوا بشرتنا فأعطنا. فدخل ناس من أهل اليمن فقال "اقبلوا البشرى يا أهل اليمن إذ لم يقبلها بنو تميم". قالوا قبلنا. جئناك لنتفقه في الدين ولنسألك عن أول هذا الأمر ما كان. قال "كان الله ولم يكن شىء قبله، وكان عرشه على الماء، ثم خلق السموات والأرض، وكتب في الذكر كل شىء". ثم أتاني رجل فقال يا عمران أدرك ناقتك فقد ذهبت فانطلقت أطلبها، فإذا السراب ينقطع دونها، وايم الله لوددت أنها قد ذهبت ولم أقم.

ہم سے عبدان نے بیان کیا ان سے ابوحمزہ نے ہم سے عبداللہ نے بیان کیا، ان سے ابوحمزہ نے، ان سے اعمش نے، ان سے جامع بن شداد نے، ان سے صفوان بن محرز نے اور ان سے عمران بن حصین رضی اللہ عنہمانے بیان کیا کہ۔ ہم آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے ہیں تاکہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور تاکہ آپ سے اس دنیا کی ابتداء کے متعلق پوچھیں کہ کس طرح تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تھا اور کوئی چیز نہیں تھی اور اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمان وزمین پیدا کئے اور لوح محفوظ میں ہر چیز لکھ دی (عمران بیان کرتے ہیں کہ) مجھے ایک شخص نے آکر خبر دی کہ عمران اپنی اونٹنی کی خبر لو وہ بھاگ گئی ہے۔ چنانچہ میں اس کی تلاش میں نکلا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اور اس کے درمیان ریت کا چٹیل میدان حائل ہے اور خدا کی قسم میری تمنا تھی کہ وہ چلی ہی گئی ہوتی اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں سے نہ اٹھا ہوتا۔

یہ کہانی کس طرح عقل کے مطابق ہے؟ اگر کچھ بھی موجود نہ تھا تو اللہ نے اپنا تخت پانی پہ کس طرح رکھا؟ پانی کس چیز پہ قائم تھا؟ زمین و آسمان پانی کے بعد کیونکر بنے، اگر زمین نہ تھی تو پانی کو کس نے تھاما ہوا تھا؟ اور جس چیز نے پانی کو تھاما ہوا تھا کیا اس کو

بھی تھامنے کے لئے آسمان کی ضرورت نہ تھی؟

اس حدیث میں کھلی سائنسی جہالت اور ناقص ترتیب تخلیق ہے۔

کیا زمین نظامِ شمسی کا رکن نہیں؟ نظامِ شمسی کہ جو بجائے خود کائنات میں موجود اربوں کہکشاؤں میں سے ایک درمیانے درجے کی کہکشاں کا ایک معمولی۔۔۔انتہائی معمولی سا حصہ ہے۔ کیا کوئی شخص، بشمول مورس بوکائی کے جس نے اپنا بینک اکاؤنٹ بھرنے کے لئے قرآن میں سے بہت ساری سائنس دریافت کی (لیکن مسلمان ہونے سے اجتناب ہی برتا) ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کا کون سا حصہ سائنسی ہے؟

پس ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اوپر بیان کردہ حدیث چونکہ کامن سینس اور مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے لہٰذا من گھڑت ہے۔ لیکن ٹھہریئے، یہاں ایک دوسرا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو رہا ہے اور وہ یہ کہ حدیث قرآن کے مطابق بھی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"یہاں تک کہ جب وہ سورج ڈوبنے کی جگہ پہنچا اسے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوبتا پایا اور وہاں ایک قوم ملی۔ ہم نے فرمایا اے ذوالقرنین یا تو تُو انہیں عذاب دے یا ان کے ساتھ بھلائی اختیار کرے"

"پھر ایک سامان کے پیچھے چلا، یہاں تک کہ جب سورج نکلنے کی جگہ پہنچا اسے ایسی قوم پر نکلتا پایا جن کے لئے ہم نے سورج سے کوئی آڑ نہیں رکھی" (القرآن 18:86،89،90)

مگر سورج تو "ہر جگہ" نکلتا ہے یا اگر مزید تکنیکی نظر سے دیکھیں تو کہیں سے بھی نہیں نکلتا۔ سورج طلوع ہونے کی جگہ کا مشاہدہ کرنے کے لئے کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ محمد کو واقعتاً زمین کے چپٹا ہونے کا یقین تھا اور یہ کہ سورج زمین کے ایک سرے سے طلوع ہوتا ہے اور دوسرے سرے پہ غروب۔ ایک حدیث سے ہمیں اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

صحیح بخاری، والیوم 4، کتاب 54، نمبر 421

ابو ذر سے روایت ہے:

رسول نے غروبِ آفتاب کے وقت مجھ سے پوچھا، "کیا تم جانتے ہو کہ (غروبِ آفتاب کے وقت) سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس نے کہا "یہ چلتا جاتا ہے حتیٰ کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے، جو کہ اسے مل جاتی ہے (اور ایک وقت آئے گا کہ جب) وہ اجازت طلب کرے گا اور اسے نہ ملے گی بلکہ اسے حکم دیا جائے گا کہ جہاں سے آیا ہے اسی طرف لوٹ جائے، اور پھر یہ مشرق سے نکلے گا۔ یہ اللہ کے اس بیان کی تشریح ہے:

"اور سورج چلتا ہے اپنے ایک ٹھہراؤ کے لئے، یہ حکم ہے زبردست علم والے کا" (القرآن 36:38)۔

یہاں ہمارے پاس ایک حدیث قرآن کے مطابق ہے اور دوسری حدیث اس کی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ یہ حدیث سائنس اور کامن سینس کے تو خلاف ہے لیکن قرآن کے خلاف نہیں۔ اگر ہمارے ذہن میں اب بھی کوئی شبہ ہے کہ محمد کے خیال میں زمین چپٹی نہیں تھی تو درج ذیل آیات سے وہ شبہ رفع ہو جانا چاہئے۔

"کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہ کیا اور پہاڑوں کو میخیں" (القرآن 78:6،7)

بچھونا، یا پھیلانے سے کسی چپٹی چیز ہی کا تصور ہی قائم ہوتا ہے۔ عربی لفظ مھد کا مطلب بستر ہے اور بستر چپٹے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بیضوی نہیں ہوتے۔ اور اس کے علاوہ پہاڑوں کا کردار بھی میخوں کی طرح زمین کو ہلنے سے روکنا نہیں ہے۔

کیا یہ احادیث قرآن کے مطابق نہیں ہیں؟ جو صریحاً یہ بیان کر رہی ہیں کہ زمین چپٹی ہے اور سورج ایک کنارے سے طلوع ہو کر دوسرے کنارے پر ایک کیچڑ والے پانی میں غروب ہو جاتا ہے۔ کیا آسمان پہ کوئی تخت بھی موجود ہے کہ سورج جس کے نیچے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا ہے؟ یہ تصور احمقانہ سا لگتا ہے۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین پانیوں پہ تیر رہی ہے۔ پانیوں کے کناروں پہ اونچے پہاڑ ہیں جن کے پار لامتناہی خلا ہے۔ محمد کی کائنات کے بارے میں تصویر کشی اس دورِ جاہلیت میں ضرور عقل کے مطابق ہو گی لیکن آج کے سائنسی دور میں ہر گز نہیں۔

کائنات کا یہ غلط تصور محمد کی اپنی دریافت ہر گز نہ تھا بلکہ یہ اس دور کی روایات کے عین مطابق تھا۔

آیئے ایک اور حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔

صحیح بخاری، کتاب الانبیاء

باب: اللہ تعالیٰ کا سورۃ البقرہ میں یہ فرمانا، اے رسول! وہ وقت یاد کر جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک (قوم کو) جانشین بنانے والا ہوں۔

حدیث نمبر 3333

حدثنا أبو النعمان، حدثنا حماد بن زيد، عن عبيد الله بن أبي بكر بن أنس، عن أنس بن مالك۔ رضى الله عنه۔ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال "إن الله وكل في الرحم ملكا فيقول يارب نطفة، يارب علقة، يارب مضغة، فإذا أراد أن يخلقها قال يارب، أذكر أم يا رب أنثى يارب شقي أم سعيد فما الرزق فما الأجل فيكتب كذلك في بطن أمه"۔

ہم سے ابو النعمان نے بیان کیا، کہا ہم سے حماد بن زید نے بیان کیا، ان سے عبید اللہ بن ابی بکر بن انس نے اور ان سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ماں کے رحم کے لئے ایک فرشتہ مقرر کر دیا ہے وہ فرشتہ عرض کرتا ہے اے رب یہ نطفہ ہے، اے رب یہ مضغہ ہے، اے رب یہ علقہ ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اسے پیدا

کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتہ پوچھتا ہے اے رب، یہ مرد ہے یا عورت۔ اے رب، یہ بند ہے یا نیک، اس کی روزی کیا ہے اور اس کی مدتِ زندگی کتنی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ماں کے پیٹ ہی میں فرشتہ سب کچھ لکھ لیتا ہے۔

یہ حدیث ایک مذاق معلوم ہوتی ہے۔ خالی اس نجھے سے فرشتے کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے کہ جو عورت کے رحم کے سامنے کھڑا مرد عورت کے اختلاط کا منظر دیکھتے ہوئے اللہ سے نطفے کی استدعا کر رہا ہوتا ہے۔ کیا ہم اس حدیث کو بھی جعلی قرار دے کر رد کر دیں؟ یہ واضح طور پر گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کامن سینس کے بھی خلاف ہے۔

مگر یہ ان کے کامن سینس کے خلاف کیوں نہیں گئی کہ جنہوں نے اسکو 1200 سال پہلے روایت کیا۔ ہمارے لئے یہ احمقانہ بات ہے لیکن ان کو یہ احمقانہ کیوں معلوم نہ ہوئی جو بارہ سو سال سے اس کو پڑھے اور مانے چلے آ رہے ہیں۔ چند سو سال پہلے کامن سینس سمجھتی تھی کہ زمین چپٹی ہے۔ تمام فلسفی اور پیغمبر بھی اسی بات پر متفق تھے۔ لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟

کیا ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ جو احادیث ہمارے جدید کامن سینس سے متصادم ہیں وہ جعلی ہیں؟ جبکہ یہی احادیث گزشتہ ادوار کے کامن سینس کے مطابق سچ سمجھی جاتی تھیں۔ ہمارا نقطہ یہ ہے کہ ہم احادیث کو محض اس بنیاد پہ رد نہیں کر سکیں گے کہ یہ ہمارے کامن سینس کے خلاف جاتی ہے۔ مسلمانوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ چونکہ محمد اللہ کا رسول ہے چنانچہ وہ غلط نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ احادیث کو دوبارہ پرکھتے ہیں اور جو ان کو موجودہ سائنس اور کامن سینس سے متصادم نظر آتی ہیں ان کو رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ طریقہ کار انتہائی جانبدارانہ ہے۔ ہم ان ثبوتوں کو کیونکر رد کر سکتے ہیں جن سے محمد کا جھوٹا ہونا ثابت ہو رہا ہو؟ کیا محض اس لئے کہ ہم نے اس کا سچا ہونا فرض کر لیا ہے؟ ایک حقیقی عدالت کو تمام ثبوتوں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ان کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ محمد کے دعوے کی سچائی جاننے کے لئے پہلے ہمیں اس بات کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہم کون سی طرف ہیں؟ آیا ہم جیوری ہیں یا پھر ملزم کے وکیل ہیں۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یقیناً وکالت ہی کا انتخاب کرے گی۔ وہ یہ جاننا ہی نہیں چاہیں گے کہ محمد واقعتاً نبی تھا بھی یا نہیں کیونکہ یہ سوال ان کے ذہن میں اٹھتا ہی نہیں۔ انہوں نے اس کو اللہ کا پیغمبر جو مان لیا ہے۔ وہ اس موضوع کے حوالے سے جانبدار ہیں ان کا مقصد محمد کے بارے میں سچائی جاننا نہیں بلکہ کسی بھی طریقے سے، دھونس دھاندلی سے اسے بے گناہ قرار دلوانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے پڑھے لکھے مسلمان احادیث میں موجود خرافات دیکھتے ہیں تو ان کی مصداقیت کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ چونکہ بیشتر احادیث عجیب و غریب ہیں چنانچہ تمام احادیث کا یک بیک انکار کرنے کا آسان حل ان کو یہی نظر آتا ہے کہ بخاری و مسلم ہی کو بدنام کر دیا جائے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ وہی بخاری و مسلم کہ جو سینکڑوں سالوں سے مسلمانوں کے ہاں مکرم و محترم ہیں۔

یہ سراسر ناانصافی اور جانبدارانہ تعصب ہے۔ بخاری، مسلم اور دیگر محدثین نے احادیث نہیں "گھڑیں"، انہوں نے محض ان کو جمع کیا ہے۔ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے کہ ان اسکالرز اور محقیقن کی محنتِ شاقہ کو بیک بنی و دو گوش جھوٹ کا پلندہ قرار دے دیا جائے محض اس بنیاد پر کہ اس سے محمد کی شان پہ حرف آتا ہے اور محض اس وجہ سے کہ یہ آج ان کی "کامن سینس" میں نہیں سمارہیں۔

کچھ احادیث یقیناً من گھڑت ہیں، لیکن بہت ساری حقیقی ہیں۔ اگر آپ کے پاس موجود کرنسی نوٹوں میں کچھ جعلی نوٹ شامل ہو جائیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمام رقم پھینک دی جائے محض اس وجہ سے کہ اصل و نقل کا امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔ اگر چہ یہ اچھی بات ہے کہ مسلمان محض احادیث ہی پہ بھروسہ نہ کریں کیونکہ یہ محض اسلام کی تاریخ ہے، ان سے البتہ ہم محمد اور اس کی زندگی کے بارے میں ضرور جان سکتے ہیں۔ اگر ہم احادیث اور تاریخ کا سرے سے انکار کر دیں تو محمد نامی شخص کی نبوت کو کیسے ثابت کریں گے؟ اگر سب کی سب (یا بیشتر) من گھڑت ہیں کہ جو کسی شیطانی شخص یا گروہ کی کارستانی ہے تو پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسی شیطانی گروہ نے قرآن بھی نہیں گھڑا ہے اور اسلام سارے کا سارا ہی ایک من گھڑت داستان نہیں ہے؟

حدیث کے بغیر ہم محمد، اس کی زندگی اور اس کی تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے۔ ان کے بغیر مسلمان یہ تک نہیں جان سکتے کہ نماز کس طرح ادا کرنی ہے اور روزہ کیسے رکھنا ہے۔ احادیث پر تو اسلام کی بنیادیں استوار ہیں۔

کامن سینس اور معقولیت کی بنیاد پر احادیث کا انکار کرنے سے ایک دوسرا بڑا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہورہا ہے۔ وہ یہ کہ پھر قرآن کی ایسی اوٹ پٹانگ آیات کا کیا کیا جائے گا؟ کیا ہم قرآن کی ان آیات کا انکار بھی کر پائیں گے کہ یہ بھی احادیث کی طرح غیر منطقی ہیں؟

اور یہ وہ لکیر ہے کہ جس کو مسلمان کبھی عبور نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ یہ کرتے ہیں کہ ان کی باطنی تشریح کر دیتے ہیں۔ ان کی تاویلیں نکالتے ہیں۔ اگر چہ غور کیا جائے تو صرف تاویل اور باطنی تفسیر کی ضرورت ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ آیات مبہم (یعنی نامکمل) ہیں اور ان کے مطالب واضح نہیں ہیں۔

معتزلین کو سب سے پہلے اس چیز کا احساس ہوا۔ تصوف کی بنیاد بھی قرآن کے ساتھ باطنی معنی منسلک کرنے پر ہے، مثلاً یہی وجہ ہے کہ معراج بھی ان کے نزدیک ایک باطنی واقعہ ہے۔

مسلمانوں کے دو طبقے ہیں۔ پہلا وہ ہے جو کہ ہر قسم کے قاعدے قانون، عقل و انصاف سے بالاتر ہو کر محمد کے ہر فعل کو درست جانتے ہیں۔ وہ اپنے پیغمبر کی ایک نو سالہ بچی سے شادی کا انکار نہیں کرتے، نا ہی اس کے مکاری سے اپنے دشمنوں کے قتل کرنے کی یا قبائل کی نسل کشی کی پردہ داری کرتے ہیں۔ اس کے زناء بالجبر، اس کی شہوت پرستی اور دیگر غیر اخلاقی حرکات کا انکار نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک وہ انسانیت کا مکمل نمونہ ہے اور اس کے اعمال پہ انگلی اٹھانے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ سمجھتے

ہیں کہ محمد کے اعمال ہی اخلاقیات مرتب کرتے ہیں نہ کہ اخلاقیات کو محمد کا کردار جانچنے کا پیمانہ بنانا چاہئے۔

دوسرا طبقہ محمد کے بارے مندرجہ بالا شرمناک تاریخی حقائق کا انکار کرتا ہے اور فراہم کردہ ثبوتوں کو یا تو یکسر مسترد کر دیتا ہے یا ایسی تاویلیں پیش کرتا ہے تا کہ موجودہ جدید معاشرے کو وہ قابلِ اعتراض نظر نہ آئیں۔ اور یہ طبقہ اعتدال پسند مسلمان کہلاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، مسلمانوں کا اعتدال پسند گروہ وہ ہے کہ جو محمد کے بارے میں کڑوے سچ کو جھٹلاتا ہے بالکل ریت میں سر دیئے شترمرغ کی مانند۔

پہلے طبقے کی ایمانداری کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ بہت سے بزعم خود اعتدال پسند مسلمان قرآن میں موجود جبر و بہیمیت کو دوسرے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اس وقت کی آیات کو پیش کرتے ہیں کہ جس وقت محمد کمزور تھا اور اس کی تعلیمات میٹھی تھیں جبکہ وہ مدینہ میں بیان کی گئی سخت آیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جب محمد نے اپنے قدم جمانے شروع کر لئے تھے۔

چنانچہ اعتدال پسند کہلانے والا گروہ نامعقولیت کی حد تک ان چیزوں کا انکار کرتا ہے کہ جو آج تک امتِ مسلمہ کے نزدیک بالکل درست تھیں۔ اور ایسا کرنے کے لئے وہ ہر طرح کی جانبداری برتتا ہے، سچ جھوٹ ملا کر کسی نہ کسی طرح اسلام کو مذہبِ حق ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہے خواہ اس کے لئے اس کو ڈیڑھ ہزار سال سے رائج اسلام اور اسلامی قوانین، عبادات و شریعت کی نفی کر کے نئے سرے سے اسلام مرتب ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ خواہ اسے فراڈیوں کی مرتب کردہ جعلی سائنس ہی کا سہارا کیوں نہ لینا پڑے۔

بشکریہ علی سینا

مولوی بمقابلہ سور

دوسروں کی بیویوں پر کون چڑھ دوڑتا ہے، مولوی یا سور؟

ہمارے امام، مولوی، اور ملا سور کے حرام ہونے کی درج ذیل وجوہات بتاتے ہیں:

1. سور دنیا کا غلیظ ترین جانور ہے، گندگی پسند کرتا ہے اور غلاظت اس کی مرغوب غذا ہے حتی کہ اپنا پیشاب اور پاخانہ بھی کھا جاتا ہے.

2. سور ہم جنس پرست جانور ہے، جنسی تسکین کے لیے نر اور مادہ میں تمیز نہیں کرتا.

3. سور نہایت بے غیرت، بے شرم، اور بے حیا جانور ہے. یہ دنیا کا واحد جانور ہے جو دوسرے سوروں کو اپنی بیوی سے ہمبستری

کی دعوت دیتا ہے.

4. سور اس قدر زہریلا جانور ہے کہ اژدہے کے ڈسنے سے بھی نہیں مرتا.

ہم سادہ لوح مسلمان آنکھیں بند کر کے اپنے پیارے مولویوں کی باتوں بلکہ خرافات پر ایمان لے آتے ہیں، ہمیں اپنی یہ روش بدلنا ہو گی، آج کے بعد مولویوں کی کوئی بات بلا تحقیق اور بلا تصدیق ہر گز قبول نہ کریں، اب آپ مولویوں سے چند سوالوں کے جواب دریافت کریں:

آپ نے سوروں پر تحقیق کب اور کہاں کی؟

اس تحقیق میں کتنے سور شامل تھے؟

آپ نے اس تحقیق یعنی سوروں کی عادات اور حرکات کا مشاہدہ کرنے میں کتنے سال لگائے؟

کیا سوروں کی گندی فطرت اور بے حیائی کے مناظر آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے؟

سوروں کا نکاح کون پڑھاتا ہے؟

آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ ہمارے مولویوں نے سوروں پر کبھی کوئی تحقیق نہیں کی، انہوں نے بس سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر سوروں پر الزامات بلکہ فتوے لگا دیئے، یوں مولوی حضرات قرآن کے ایک واضح حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں:

"اور (اے انسان!) تو اس بات کی پیروی نہ کر جس کا تجھے (صحیح) علم نہیں، بیشک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے باز پرس ہو گی." (عرفان القرآن 17:36)

مولوی سور پر الزامات تو لگاتے ہیں مگر انہیں ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ہے، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولوی سور سے جتنی نفرت کرتے ہیں اتنا بغض انہیں شیطان سے بھی نہیں ہے، کوئی سور بھول کر بھی مولوی کے سامنے آ جائے تو اس کا زندہ بچ جانا مشکل ہے، لھذا ہمیں مولویوں کی اندھی تقلید سے بچنا ہو گا، ہمیں وہی بات قبول کرنی

چاہیے حقائق جس کی تصدیق کریں، سوروں کے بارے میں چند حقائق درج ذیل ہیں، یہ سائنسدانوں کی برسوں کی تحقیق کا نتیجہ ہیں، سور نہایت ذہین جانور ہے اور اس کی سیکھنے کی صلاحیت کتے سے بہتر ہوتی ہے۔

سور کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہے۔

سور کی زبان میں ذائقہ کی 15 ہزار کلیاں ہوتی ہیں جبکہ حضرت انسان کی زبان میں صرف 9 ہزار۔

سور کی جلد میں پسینے کے غدود نہیں ہوتے، لھذا وہ پانی یا کیچڑ کے ذریعے گرمیوں میں اپنے جسم کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔

سور گندگی پسند نہیں کرتا مگر ضرورت کی وجہ سے گرمیوں میں بدن پر کیچڑ مل لیتا ہے جو کہ نہ صرف اس کی جلد کو سورج کی تپش سے بچاتی ہے بلکہ اسے مکھیوں اور حشرات سے بھی تحفظ فراہم کرتی ہے۔

سور کا شمار صفائی پسند جانوروں میں ہوتا ہے، یہ اپنے کھانے پینے اور رہائش کی جگہ کے قریب کسی قسم کی گندگی یا غلاظت برداشت نہیں کرتا۔

سور اپنے علاقے میں کسی غیر نر سور کی موجودگی پسند نہیں کرتا، نیز افزائش نسل اور علاقے کی حفاظت کے معاملے میں یہ سخت جنگجو ہے۔

سور کی جسمانی ساخت اور بہت سے اندرونی اعضا کی بناوٹ اور فنکشن انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی انسان کے دل کا والو خراب ہو جائے تو ڈاکٹر اسے سور کے دل کا والو لگا دیتے ہیں۔

سور کے دانت بھی انسانی دانت کی طرح مظبوط ہیں اور وہ اپنی غذا چبا کر کھاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سور کا نظام ہضم انسانوں کے نظام ہضم جیسا ہے، لہذا انسان کی طرح سور بھی صرف چبائی ہوئی غذا ہضم کر سکتا ہے۔

کیٹ اسکین کی دریافت سوروں پر ہونے والی تحقیق کی مرہون منت ہے، اس ٹیکنالوجی کی بدولت ڈاکٹر سرجری کے بغیر ہی انسانوں اور جانوروں کے اندرونی اعضا کا معائنہ کر سکتے ہیں۔

سوروں کے بارے میں مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں مولوی کے بیشتر دعوے غلط ثابت ہو چکے ہیں، مولوی بیچارے کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اژدہاز ہریلا نہیں ہوتا، وہ اپنے شکار کو ڈستا نہیں بلکہ اپنے جسم کے شکنجے میں جکڑ کر مار دیتا اور سالم ہی نگل جاتا ہے۔

مولوی کو کیسے معلوم ہوا کہ ہر سور کی ایک بیوی ہوتی ہے؟ کیا سوروں کا نکاح بھی مولوی پڑھاتے ہیں؟

ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں کہ کوئی سور دوسرے سوروں کو اپنی زوجہ سے ہمبستری کی دعوت دیتا ہے، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ مولوی دوسرے مردوں کی بیویوں پر چڑھ دوڑنے کا کوئی موقع کبھی ضائع نہیں کرتا، حلالہ بھی مولوی کی ایجاد ہے اور یہ اسے حلوے سے بھی زیادہ مرغوب ہے، حلالہ کے پردے میں مولوی دوسروں کی بیویوں سے صحبت یعنی بدکاری کرتا ہے اور ساتھ ہی اس "خدمت" کا بھاری معاوضہ بھی وصول کر لیتا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ سور جنسی تسکین کے لیے نر اور مادہ میں تمیز نہیں کرتے، البتہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض مولوی قرآن پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کو بھی نہیں بخشتے، ان کی جنسی ہوس اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ بچہ اور بچی میں تمیز کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔

میری ایک امریکن دوست نے جس کا تعلق ایک کسان فیملی سے ہے ایک دلچسپ واقعہ سنایا، ایک دن وہ گھر سے باہر نکلی تو اسے کھیتوں میں ایک نر سور کھلا ملا، وہ اسے ہانک کر باڑے میں لے گئی اور اس جگہ بند کر دیا جہاں ایک اور نر سور پہلے سے موجود تھا، تھوڑی دیر بعد اس کا باپ گھر آیا تو اس نے اسے نر سور کے بارے میں بتایا، باپ نے بیٹی کو سرزنش کی کہ دو نر سوروں کو کبھی ایک جگہ بند نہیں کرتے، وہ لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں، دونوں باڑے کی طرف چل دیئے، وہاں جا کر دیکھا تو دونوں سور لڑ بھڑ کر شدید زخمی ہو چکے تھے۔

رج کتھوں لیائیے لبھکے ہلا کو خان دکی ہور

حسن بن صباح 1050ء میں ایران کے شہر طوس (مشہد) میں پیدا ہوا۔ 1071ء میں مصر گیا اور وہاں فاطمی خلیفہ المستنصر نے اسکی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے اپنے خاص داعی کی حیثیت سے ایران میں اسمٰعیلی دعوت پھیلانے کیلئے بھیجا۔ 1090ء میں حسن نے کوہ البرز میں الموت نامی قلعے پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں کئی دوسرے قلعے بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔ حسن نے 1094ء میں مصر کے اسماعیلیوں سے قطع تعلق کرنے کے بعد اپنے آپ کو "شیخ الجبال" نامزد کیا اور قلعہ الموت کے پاس کے علاقے

میں چھوٹی سی ریاست قائم کرلی۔ حسن نے ایک جماعت منظم کی جس کے اراکین فدائی کہلاتے تھے۔ان فدائیوں کی سرفروشی کا یہ عالم تھا کہ حسن کے حکم پر اپنے پیٹ میں چھرا تک گھونپ لیتے یا قلعہ سے کود کر جان دے دیتے۔
حسن بن صباح نے ایک انتہائی خوبصورت باغ لگوایا اور اس میں نہایت خوبصورت لڑکیاں رہتی تھیں۔ حسن کئی بار دو چار فدائیوں کو حشیش پلا کر اس باغ میں پہنچا دیتا، ہوش میں آنے پر فدائی یہ سوچتے کہ وہ حقیقی جنت میں ہیں۔عبدالحلیم شرر کا ناول "فردوس بریں" اسی پس منظر کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ بعد میں لڑکیاں ان کو جام کوثر کے بہانے دوبارہ بھنگ پلا دیتیں اور عالمِ بے ہوشی میں انہیں اس "جنت" سے باہر نکال دیا جاتا۔فدائیوں کا کام حسن کے حکم پر ناپسندیدہ لوگوں کو قتل کرنا تھا۔ حسن نے جب کسی کو قتل کروانا ہوتا تو کسی ایک فدائی کو دوبارہ جنت کی سیر کا وعدہ کرتا۔اور یہ بھی یقین دلاتا کہ بفرضِ محال اگر وہ اِس مہم میں مارا بھی گیا تو بھی آخرت میں اُسے ہمیشہ کیلئے جنّت مل جائے گی۔ فدائین جنّت کی خواہش اور حشیش کے نشے میں جانثاری اور بہادری کے بڑے بڑے کرشمے انجام دیتے تھے۔ حشیش کے استعمال کی وجہ سے فدائیوں کو حشاشین (بھنگ نوش) بھی کہا جاتا ہے۔ فدائین کو شمالی وزیرستان میں زیر تعلیم مدرسوں کے طالبعلموں کی طرح لڑائی کے علاوہ مذہب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ فدائیوں کو مجاہد اور انہیں ان کی دہشت کی کاروائیوں کو جہاد ہونے کا احساس دلایا جاتا تھا۔

حشاشین کا پہلا شکار سلجوقی سلطان ملک شاہ تھا، جسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔ اس کے بعد سلجوقی سلطان الپ ارسلان کا وزیر نظام الملک طوسی فدائین کے خنجر کا شکار بنا۔کچھ عرصہ بعد نظام الملک کے دو بیٹوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ انکے اگلے شکار حمص اور موصل کے دو شہزادے تھے جنہیں نماز پڑھتے ہوئے ہلاک کیا گیا۔ سلجوقی سلطان سنجر شاہ کے وزیر عبدالمظفر علی اور اس کے دادا چکر بیگ کو قتل کیا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سے مقتدر لوگ پُراسرار طریقے سے ہلاک ہوتے رہے۔ان میں خلفاء، سلاطین، اُمراء اور علماء سبھی لوگ شامل تھے۔ مسلمان تو ایک طرف بہت سے عیسائی بھی فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ عیسائیوں میں سب سے اہم نام طرابلس کے حکمران ریمنڈ کا لیا جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز جو صباح کے فدائین کو ہمارے خودکش حملہ آوروں سے ممتاز کرتی ہے، فدائین نے پاکستانی خودکش حملہ آوروں کے برعکس کبھی عام لوگوں کو اپنا شکار نہیں بنایا۔

فدائین کھلے عام دن دہاڑے لوگوں کے سامنے اپنی وارداتیں انجام دیتے تھے۔اُن کا ہتھیار ایک زہر آلود خنجر ہوتا تھا۔ کبھی کبھار فدائین قتل کی بجائے دھمکی آمیز خط کسی کے سرہانے چھوڑ دیتے تھے۔ جس سے اُن کا مقصد بغیر قتل کے بھی حاصل ہو جاتا۔ دہشت انگیزی کی یہ تحریک اتنی منظم تھی کہ قرب وجوار کے تمام بادشاہ فدائین کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے۔ صلاح

الدین ایوبی پر بھی قاتلانہ حملے ہوئے، جن سے وہ ہر بار بچ گیا۔ قتل کی اِن وارداتوں سے بچنے کیلئے صلاح الدین ایوبی نے حسن بن صباح کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

حسن بن صباح نے طویل عمر پائی اور اس کے مرنے کے بعد رکن الدین نے جماعت کی باگ ڈور سنبھالی۔ فدائیوں کا قلعہ "قلعہ الموت" کہلاتا تھا۔ دشوار گزار پہاڑ کے اوپر واقع ہونے اور فدائین کی جاںنثاری کی وجہ سے اس قلعہ کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔

کہاجاتا ہے کہ چنگیز خان کے پوتے منگول بادشاہ منگو خان پر حملہ کرنے کیلئے بھی ایک فدائی روانہ کیا گیا، جو بدقسمتی سے پکڑا گیا۔ منگو خان کو بہت غصہ آیا اور اس نے حسن بن صباح کو سزا دینے کیلئے اپنے چھوٹے بھائی ہلاکو خان کو روانہ کیا۔ ہلاکو خاں نے ہمیشہ سے ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے قلعہ الموت کی اینٹ سے اینٹ بجادی، حسن بن صباح کے جانشین اور آخری شیخ الجبال رکن الدین خور کو گرفتار کرلیا گیا، اور اُسے اس کے تمام بچوں اور ہزاروں فدائیوں سمیت بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا۔ مرد تو مرد ہلاکو خان نے عورتوں کو بھی نہیں بخشا، حسن بن صباح کی جنّت کی حوریں بھی قتل کر دی گئیں۔

آج مذہبی انتہاپسندوں نے حسن بن صباح کی جگہ لے لی ہے۔ طالبان اور خودکش حملہ آور جنّت کے حصول کی خواہش میں فدائین کا روپ دھارے کھڑے ہیں۔ شمالی وزیرستان قلعہ الموت کا منظر پیش کر رہا ہے۔ وہی دہشت، وہی چالیں، وہی حربے۔ آج بھی کم عمر نوجوانوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انہیں کسی لڑکی کے نسوانی اعضا چھونے کا موقع دے کر جنّت کے حسین سپنے دکھائے جاتے ہیں، اور پھر اُسے خودکش حملہ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے، بالکل جیسے حسن اپنے فدائی روانہ کرتا تھا۔ میرے دیس کے خودکش فدائیوں کو کون روکے گا؟، یہ موت کا کاروبار کیسے ختم ہوگا؟۔ حل کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی، آنکھیں کسی مسیحا کو کھوجتے کھوجتے پتھرا گئی ہیں، کچھ سمجھ نہیں آتی، کیا کریں؟، کہاں جائیں؟۔۔۔۔۔۔

اج کتھوں لیایئے لبھ کے ہلاکو خان اک ہور

مجاز مؤمن کی جائے پناہ

اللہ، شیطان اور فرشتوں کی تجسید کے سبب جو مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان سے بچنے کے لیے انہیں مجاز پر محمول کر دیا جاتا ہے لہذا اللہ ایک ابدی اچھائی اور شیطان ایک ابدی برائی بنادی جاتی ہے تاہم یہ عقیدہ خود اپنے ہی بوجھ کے نیچے دب کر ڈھیر ہوجاتا ہے، ظاہر ہے ایک ابدی اچھائی مجازی جلدوں کو بھوننے کی مجازی دھمکی کیوں دے گی اگر ابدی برائی آدم کو مجازی طور پر سجدہ کرنے سے انکار کر دے جس کی وجہ سے اسے اور اس کے چیلوں کو مجازی طور پر جہنم میں جلایا جائے گا؟

جب مؤمن ان مقدس تحریروں کو جن پر وہ اعتقاد رکھتا ہے مضحکہ خیز پاتا ہے تو وہ مجاز میں اپنی جائے پناہ ڈھونڈتا ہے۔۔ چنانچہ قرآن میں عورت کو مارنے کا حکم مجازی ہے، نوح کی کشتی بھی ایک مجازی کشتی ہے بلکہ جب مؤمن کو اللہ اور شیطان کی مستقل موجودگی کی منطقی توجیہ نہیں ملتی جو غصہ کرتے، خوش ہوتے اور دھمکیاں دیتے ہیں تو وہ انہیں بھی مجازی اصطلاحات میں بدل دیتا ہے۔

بلکہ یہ تو کچھ بھی نہیں، مؤمن اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتا ہے، وہ مجازی چیزوں کے لیے نماز پڑھتا اور روزے رکھتا ہے، بلکہ وہ تو یہ تک سمجھتا ہے کہ یہ مجازی چیزیں ایک حقیقی کتاب کے ذریعے اس سے مخاطب ہونا چاہتی ہیں، اور اس حقیقی کتاب کے اندر مجازی احکامات ہیں جن کا کام اس کی زندگی کو ان مجازی احکامات کے ذریعے آسان اور منظم بنانا ہے تاکہ وہ ان پر ایمان اور اطاعت کی انتہاء کو پہنچ جائے اور پھر مرنے کے بعد یہ مجازی ہستی اسے ایک مجازی جنت میں بھیج دے گی یا پھر ایک مجازی جہنم میں اسے مجازی طور پر سزا دی جائے گی، تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس بے چارے مؤمن کو حقیقی بھوک اور پیاس لگتی ہے بلکہ وہ ان لوگوں کو مارنے کے درپے ہوتا ہے جو ان مجازی چیزوں کو نہیں مانتے وہ بھی اس امید پر کہ اس کے صلے میں یہ مجازیات اسے مجازی جنت میں جگہ دلوائیں گی جہاں اسے 72 مجازی حوروں کی صحبت نصیب ہوگی اور وہ شراب و شہد کی مجازی نہروں سے اپنی پیاس بجھا سکے گا، مجاز کی مضحکہ خیز انتہاء میں مؤمن اپنا ملک و گھر چھوڑ کر اللہ کے ایک مجازی گھر کی زیارت کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے، اللہ کے اس مجازی گھر کی حقیقی زیارت میں مؤمن مجازی شیطان کو سات حقیقی پتھر مارتا ہے اور یہ یقین کرلیتا ہے کہ اس نے واقعی ایک حقیقی شیطان کو پتھر مارے ہیں لیکن جب اسے حقیقتِ حال کا سامنا کروایا جاتا ہے تو وہ ایک بار پھر مجاز میں اپنی جائے پناہ ڈھونڈتے ہوئے کہتا ہے کہ شیطان ابدی برائی کی ایک مجازی تعبیر ہے۔

مجاز ان مؤمنین کی ہمیشہ سے پسندیدہ جائے پناہ رہی ہے جو فرسودہ اور سخت قسم کی مقدس تحریروں کی تاویل کرکے ان میں سے زیادہ گہرے اور بلیغ معانی کشید کرنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں اپنی انسانی حس اور اعلی اخلاقیات سے ہم آہنگ کر سکیں، جدت پسند مؤمن کے دماغ میں یہ تصادم کی ایک دردناک اور جراتمندانہ حالت ہے جو شعوری یا لاشعوری طور پر مذہبی خرافات کو مسترد کرتا ہے مگر وہ معاشرتی اور مذہبی دباؤ کا شکار ہوتا ہے، سب سے بڑا دباؤ موت کا خوف یا اس مجازی خدا کی مجازی سزائیں ہیں جن کا ایمان نہ لانے کی صورت میں وہ شکار ہوگا، مجاز مذہبی عقائد کی فرسودگی اور مؤمن کی عقلیت پسندی کے مابین ایک درمیانہ حل ہے۔

کوئی بھی عام یہودی، عیسائی یا مسلمان واقعتاً اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ کہ زمین کی عمر چھ ہزار سال ہے، یا حواء آدم کی پسلی سے برآمد ہوئی، یا نوح نے جاندار انواع کے چھ ارب جوڑے قطبِ شمالی سے افریقہ تک اور ایمازان کے جنگلوں سے لے کر

اسٹر یلیاو قطبِ جنوبی تک جمع کیے اور انہیں ٹائٹینک سے بھی کئی گنابڑی کشتی میں ٹھونس دیا، اور موسی نے واقعتاً بحرِ احمر کو اپنے اُسی ڈنڈے سے چیر ڈالا جو قبل ازیں سانپ بن گیا تھا، یا مسیح واقعی دو ہزار سال پہلے آسمان کی طرف اڑ گیا تھا، یا صلعم نے حقیقتاً ایک پروں والے گدھے پر سوار ہو کر روشنی کی رفتار میں سفر کرتے ہوئے ساتویں آسمان کا سفر کیا۔ سبھی کسی نہ کسی سادہ شکل میں ان قصوں پر یقین تو رکھتے ہیں مگر مضحکہ خیز لگنے والے حصوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کا ایمان منطقی نظر آئے، مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی تحاریر جامد ہوتی ہیں اور اپنا پول خود ہی کھولتی نظر آتی ہیں چاہے کوئی بھی انہیں ہاتھ نہ لگائے، اسی لیے مجاز مذہبی تحاریر میں ہر غیر منطقی اور نامعقول کو منطقیانے اور عقلیانے کا ایک بہترین اوزار ہے۔

البتہ بن لادن ٹائپ کے متعصب یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کے ہاں کائناتی مظاہر کی توجیہ میں عقل اور منطق کا کوئی کردار نہیں ہوتا، لہذا وہ اپنی اپنی مذہبی تحاریر کی تاویل کے لیے مجاز کا استعمال نہیں کرتے اور نا ہی اپنی انسانی حس اور مذہبی تحاریر کی بدصورتی میں کوئی توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح وہ تمام تر انسانی اخلاقیات، اصول اور علوم کا انکار کر دیتے ہیں جو مذہبی تحاریر سے مطابقت نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کے لیے مذہبی تحاریر ہی اخلاق، اقدار اور علوم کا واحد منبع ہیں، بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا بلکہ طبیعاتی قوانین تک کو ان مذہبی تحاریر کے مطابق چلانا چاہیے چاہے وہ کامیاب نہ ہو کیونکہ ان کے خیال میں مسئلہ ہمیشہ انہیں لاگو کرنے کے طریقوں کی خامی میں مضمر ہے نا کہ مذہبی تحریر میں کوئی خرابی ہے۔

بہر حال مؤمن کا اپنی مذہبی تحاریر کے دفاع میں مجاز کا سہارا لینا اور قابلِ تغیر تاویلیں نکالنا وہ آخری تھپڑ ہے جو مؤمن ان مقدس تحاریر پر لعنت بھیجنے سے قبل ان کے منہ پر مارتا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مؤمن کی انسانی حس اور اخلاقیات اعلی مراتب طے کر رہی ہیں، وہ بنیادی طور پر ہمارے زمانے سے مختلف زمانے سے آنے والی تحاریر جو ہماری زبان نہیں بولتیں اور اپنے زمانے کی اخلاقیات کی قیدی ہیں کا انکار کرتا ہے، یہ مذہبی تحاریر کی انتہاء پسندی کا انکار ہے، ابراہیمی مذاہب کے ماننے والوں کا اپنے مذاہب کی ہولناکی کی تاویل کے لیے مجاز کی طرف رجوع کرنا در اصل انسانیت کی طرف رجوع ہے اور اس ہولناکی کا انکار ہے جن سے یہ مقدس کتابیں اٹی پڑی ہیں۔

اسلام کا ناسُور

جرمن اور جاپانیوں کا وہم تھا کہ وہ نا قابلِ شکست ہیں، پوری دنیا جنگ کے نتائج سے آگاہ تھی اور جانتی تھی کہ نازی ہار رہے ہیں، لیکن اسکے باوجود وہ حملوں سے باز نہیں آ رہے تھے۔ مسلمانوں کی طرح انکو بھی وہم تھا کہ وہ نا قابلِ تسخیر ہیں۔ انکو اس احمقانہ خواب سے بیدار کرنے اور اس نہ رکنے والی جنگ کا خاتمہ ضروری تھا۔ چنانچہ ایٹم بم استعمال کیا گیا۔ درست ہے کہ

ہزاروں بے گناہ لوگ مرے لیکن جنگ تو اختتام پذیر ہوئی، لاکھوں لوگوں کی جانیں بچ گئیں اور آج جاپانی خود بھی اس واقعے کو بھیانک خواب سمجھ کر بھول گئے ہیں اور امریکہ سے انکے بہت اچھے مراسم ہیں۔

کچھ لوگ نائن الیون کا موازنہ ہیروشیما اور ناگاساکی سے کرتے ہیں مگر ایسا کرنا غلط ہے۔ ایٹم بم کا استعمال ایک طویل، تکلیف دہ اور لایعنی جنگ کا خاتمہ تھا۔ جبکہ دوسری طرف نائن الیون تو ایک شیطانی جنگ کا آغاز ہے جو مسلمانوں نے ڈیڑھ ہزار سال پرانے بدوُوانہ معاشرے کو دنیا پر مسلط کرنے کے لئے شروع کی ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اچھا ہوا، کم از کم دنیا کی آنکھیں تو کھلیں انکو احساس تو ہوا کہ اسلامی عفریت جاگ رہا ہے اور انکو نگلنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ جاپان پہ اتحادیوں کے فیصلہ کن حملے نے چند ہزار کے عوض لاکھوں جانوں کو تو بچا لیا۔ نائن الیون نے کیا کیا؟ پوری دنیا میں دہشت گردی اور بدامنی کی لہر دوڑادی۔ نائن الیون سے پہلے کے حالات یاد کریں اور آج کے حالات دیکھیں۔ کیا کسی طور نائن الیون کے نتائج کا موازنہ ہیروشیما اور ناگاساکی سے کیا بھی جاسکتا ہے؟ کیا ہماری عقل کی آنکھوں میں اسقدر موتیا اتر آیا ہے؟

بعض مسلمان ان مذہبی دہشت گردوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے بھی نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چند لوگ سارے عالمِ اسلام کی ترجمانی نہیں کرتے۔ لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ ان دہشت گردوں نے کونسا عمل اسلام کے خلاف کیا ہے۔ دہشت گرد مسلمان (باعمل مسلمان) اپنے ہر عمل کو قرآن و سنت سے جسٹیفائی کرتے ہیں۔

بعض افراد کافی حد تک روشن خیال ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مذہبی دہشت گردی غلط ہے اور ہمیں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق جینا چاہئے اور صرف امن و بھائی چارے والی تعلیمات پر عمل کرتے رہنا چاہئے۔ لیکن میرا ان سے سوال ہے کہ اگر آپ اسلام کو بطور مذہب قبول کرتے ہیں تو آپ کس طرح کسی کو اس پہ عمل کرنے سے روک سکتے ہیں یا برا جان سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے آپ برائی نہ کریں، اسلام کی شیطانی تعلیمات کو نہ اپنائیں اور صرف وہ باتیں جو اچھی معلوم ہوں ان پر عمل کریں۔ لیکن پھر بھی درحقیقت آپ انکے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں جو اسلام کی شیطانی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں، جو فساد (جہاد) کے لئے اسلحہ اکھٹا کرتے ہیں، جو امن کے نام پر دنیا میں انارکی پھیلا رہے ہیں۔

آپ بھلے کفار کی گردن اتارنے میدان میں نہ اتریں، لیکن جو لوگ آپکے قرآن کی آیات پڑھ کر ایسا کرتے ہیں کیا آپ انکو برا کہہ سکتے ہیں؟ کس بنیاد پر؟ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، دہشت گردوں کو آپکی مورل سپورٹ حاصل ہے۔ جس کتاب سے آپ نے اپنا طرزِ حیات منتخب کیا ہے وہ بھی تو اسی کتاب پہ عمل کر رہے ہیں آپ کس بنیاد پر انکے عمل کو غلط اور اپنے عمل کو صحیح قرار دے سکتے ہیں؟

اور ویسے بھی اگر عقل کی بنیاد پر آپ قرآن میں سے اچھی اچھی باتیں چن سکتے ہیں اور بری بری باتیں نظر انداز کر سکتے ہیں تو پھر قرآن کی ضرورت ہی کیوں؟ کیا عقل کافی نہیں؟

اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور اسکی پیروی کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ نیم مسلم یا نیم غیر مسلم کوئی چیز نہیں۔ یا آپ مسلمان ہیں یا نہیں ہیں۔ اگر مسلمان ہیں تو قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور اسمیں موجود کسی چیز کو برا نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر آپ کی عقل و شعور ایک چیز کو برا بھی جانتی ہے۔ آپ اس پر عمل بھی نہیں کرتے لیکن ساتھ میں اسکی نفی کرنے کو بھی تیار نہیں تو پھر مجھے افسوس سے آپکو اطلاع دینا پڑے گی کہ آپ منافق ہیں۔ برائی کو برائی جانتے ہوئے بھی پشت پناہی کر کے آپ زیادہ بڑے مجرم بن رہے ہیں۔

عمل نہ کرنے کے باوجود اگر آپ ان شیطانی اعمال کو اپر وو کرتے ہیں تو کس بنیاد پر آپکا یہ خیال ہے کہ آپ اچھے انسان ہیں؟

گفتگو اور دلائل کے مسلمان قائل نہیں۔ انکے نزدیک انکی ذمہ داری "حق اور سچ بات" پہنچا دینا ہے۔ یہی اتمامِ حجت ہے۔ اب فریقِ مخالف کے پاس یہی راستہ ہے کہ یا تو مسلمانوں کے دعووں پر بالغیب ایمان لے آئے اور بغیر بحث و دلائل کے تسلیم کر لے کہ یہ حق کا راستہ ہے یا انکی حکمرانی تسلیم کر کے ہتھیار ڈال دے یا مر جانے کے لئے تیار ہو جائے۔ اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

جو مذہب ہمیں برداشت کرنے کو تیار نہیں، ہم اسکو برداشت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ کیا ہمارا یہ مطالبہ غلط اور برا ہے کہ ہم آپکو یہ کہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو مت سکھاؤ کہ ہم (غیر مسلم) کافر اور دنیا کی بدترین مخلوق ہیں اور ہمیں قتل کر کے وہ ان دیکھے خدا کے حضور بہت بڑے انعام کا حقدار قرار پائے گا؟ کیا ہم اس صورت میں آپکے دوست بن سکتے ہیں کہ جبکہ آپکے نزدیک جنت میں جانے کا تیز ترین اور مستند ترین طریقہ یہ ہے کہ ہمیں قتل کر دو اور ہماری عورتوں کو اغوا کر کے ریپ کر لو؟ بچوں کو غلام بنا لو؟

خدا کی زبردست ہٹ دھرمی

سورہ مائدہ آیت 32 میں ارشاد خداوندی ہے کہ من قتل نفس بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا، ترجمہ: جس انسان نے کسی دوسرے انسان کو قصاص اور فساد کے علاوہ قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔۔۔ اب ذرا سورہ الانفال کی آیت 65 میں خدائی بیان سنئے، یا ایھا النبی حرض المومنین علی القتال، ترجمہ: اے نبی مومنین کو قتال پر ابھاریئے، خدا نے اپنے پیغمبر کو محض دو صورتوں میں ایک انسان کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے لہذا اب ہم تحقیق کریں گے کہ غزوہ بدر، احد، خندق اور خیبر میں مرنے والے کفار ان دو صورتوں میں شامل ہوتے ہیں یا نہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان جنگوں میں مرنے والے لوگ قصاص کے زمرے میں تو بالکل نہیں آتے، کیونکہ قصاص دراصل ایک معروف اسلامی قانون ہے جس کے مطابق قاتل کو قتل کر دیا جاتا ہے باقی بچی دوسری صورت یعنی فساد، اب ہم تحقیق کریں گے کہ ان لوگوں کا فساد کیا تھا جو بدر، احد اور خندق وغیرہ میں مارے گئے، ہم خدا کے کلام قرآن ہی سے پوچھیں گے کہ فساد کی بنیاد کیا ہے چنانچہ سورہ

بقرہ کی ابتدائی آیت 8 میں ارشاد خداوندی ہے کہ، ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وماھم بمومنین، ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے خدا اور اسکے رسول پر مگر وہ ایمان لانے والے نہیں، گویا فساد کی بنیاد خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہ لانا ہے سو اب ہم ایمان کی تعریف بیان کریں گے، ایمان کا بنیادی مادہ امن سے ہے جبکہ اس کے اصطلاحی معنی جو یہاں پر مراد ہیں اعتماد یا یقین کے ہیں چنانچہ جمہور علماء اسلام کے مطابق ایمان کے معنی بن دیکھے خدا پر یقین کرنا جبکہ جدید روشن خیال اہل اسلام علماء کے مطابق بن دیکھے مگر عقل کے مطابق یقین کرنے کے ہیں، ایمان کے جو بھی معانی لئے جائیں بہر حال اس کی تعریف یہاں پر آ کر رک جاتی ہے کہ خدا اور اس کے رسول پر یقین کرنا، اصول معقولات یہ ہے کہ جو شخص بھی خدا کے نبی ہونے کا دعوی کرتا ہے اول تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کا وجود ثابت کرے، اگر بالفرض وہ خدا کا وجود ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر اسے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ واقعی خدا کا نبی ہے، تب کہیں جا کر کسی کو اس بات کا قائل کیا جا سکتا ہے کہ وہ یقین کرلے، مگر اس کے برعکس اسلام اور اس کے لانے والے کی یہ ضد ہے کہ بغیر کسی ٹھوس منطقی ثبوت کے لوگ نہ صرف اس کے خدائے واحد یعنی اللہ کو تسلیم کرلیں بلکہ یہ بھی تسلیم کرلیں کہ وہ اس اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا یعنی اس کا پیغمبر ہے، پیغمبر نے اپنی قوم والوں کو تو ایمان نہ لانے کے عوض فسادی قرار دے کر ابدی نیند سلا دیا تو کیا اس پیغمبر کے اپنے بھی اس کے ایمان کو تسلیم کرتے تھے اس پر ہم ابھی بحث کرلیتے ہیں کیونکہ یہ نقطہ بنیادی ہونے کے علاوہ بہت اہم ہے، دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ ایک انسان کی شخصیت کو اس کے والدین سے بڑھ کوئی نہیں جان سکتا چنانچہ ابھی ہم اسی کسوٹی پر پیغمبر اسلام کو پرکھتے ہیں پیغمبر اپنی ماں کے پیٹ میں ہی تھے کہ ان کے والد عبد اللہ فوت ہو گئے تھے، جبکہ غالباً 6 سال کی عمر میں اس کی والدہ آمنہ فوت ہو گئی تھی، اس کے بعد پیغمبر کی دیکھ بھال اس کی کزن ام ہانی کرنے لگی جبکہ اسی دوران پیغمبر کے دادا عبد المطلب نے بھی حتی الوسع آپ کی پرورش کی جب دادا فوت ہو گئے تو پیغمبر کی مستقل پرورش کا ذمہ آپ کے چچا ابو طالب نے اپنے سر لے لیا، ابو طالب قریش کے معتبرین میں سب سے زیادہ ذہین اور بذلہ سنج تھے ابو طالب نے پیغمبر کو بچپن ہی سے کاروباری سرگرمیوں میں اپنے ساتھ کر لیا تھا، گویا ابو طالب پیغمبر کیلئے ایک باپ کی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ جب پیغمبر نے نبوت کا اعلان کیا تو آپ نے بارہا ابو طالب کو اپنے اس نئے دین کی دعوت دی مگر ابو طالب آخری دم تک پیغمبر کی دعوت کو ٹھکراتے رہے حتی کہ ایک مشہور روایت کے مطابق پیغمبر ابو طالب کو مرتے وقت یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ چچا آج تو میرے کان میں کلمہ پڑھ دے کل قیامت کے دن میں خدا کے سامنے گواہی دوں گا کہ تم نے کلمہ پڑھا تھا، قارئین ابو طالب کا جواب سنئے، نہیں بالکل نہیں، لوگ کیا کہیں گے کہ موت کے ڈر سے بھتیجے کا دین قبول کرلیا (مسلم رقم 24) قارئین پیغمبر کی اس قدر حوصلہ شکنی پر پیغمبر کا خدا ہٹ دھرم بن کر فوراً پینترا بدل لیتا ہے چنانچہ اب وہ اپنے پیغمبر کو تسلی دیتا ہے کہ: انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء، ترجمہ: بے شک تو ہدایت نہیں دے سکتا اسے جس سے تو محبت کرتا ہے بلکہ ہدایت تو خدا دیتا ہے جسے چاہتا ہے، (سورہ قصص

56) قارئین اب آیئے اس اہم نقطہ کی جانب جہاں سے ہم نے آغاز کیا تھا کہ وہ لوگ جو یمان نہیں لاتے وہ فسادی ہیں پس ان کو قتل کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کے عوض تو مومنین کو جنت ملے گی ملاحظہ کیجئے سورہ توبہ، ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ، ترجمہ: بے شک خرید لیا ہے مومنین سے ان کے خدا نے ان کی جان اور مال جنت کے بدلے (سورہ توبہ 111) قارئین آپ نے دیکھ لیا کہ پیغمبر کے باپ یعنی اس کے چچا کے انکار پر پیغمبر کا خدا کتنی ہٹ دھرمی سے اس کے لئے سہولت پیدا کر رہا ہے جبکہ عوام کیلئے کچھ اور ہی ضابطہ ہے، یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم، ترجمہ: اے نبی جہاد کرو کفار اور منافقین کے ساتھ اور ان پر سختی کرو (سورہ توبہ 73) یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیغمبر کے چچا ابو طالب کفار میں سے نہیں تھے؟ کیا پیغمبر نے خود ان پر اتمام حجت نہیں کیا تھا؟ قارئین آپ نے دیکھ لیا کہ پیغمبر اپنے چچا کو اپنے دین میں داخل کرنے کیلئے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر چکے تھے مگر اس سب کے باوجود بھی پیغمبر کے چچا اپنے بھتیجے کے خدا اور اس پر ایمان نہ لا سکے، اب دوسرا سوال یہ ہے کہ پھر پیغمبر نے کیوں اپنے چچا کو زندہ چھوڑ دیا کیوں ان کے خلاف جہاد نہیں کیا کیوں ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی، کہیں ایسا تو نہیں کہ پیغمبر کے خود ساختہ ہٹ دھرم خدا کو شرم آرہی تھی کہ وہ اب اپنے پیغمبر کو اپنے محسن چچا کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم کیسے دے گا گویا پیغمبر کے خدا کا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا قارئین اچنبھے میں پڑنے کی ضرورت نہیں بالکل یہی وجہ تھی کہ ایک باپ نما چچا جس نے کل کلاں مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے اب اس کے خلاف کیسے تلوار اٹھاؤں ہماری الجھن بھی یہی ہے کہ جب پیغمبر اپنے باپ نما چچا کو مسلمان نہ کر سکے تو پھر دیگر عوام کے خلاف تلوار اٹھانے کا کس بنیاد پر جواز نکال رہے ہیں اگر کفار کے خلاف تلوار اٹھانا ضروری ہے تو پھر ابو طالب کیسے بچ نکلا، کیا ان کا شمار کفار میں نہیں تھا اگر ان کا شمار کفار میں نہیں تھا تو پھر اس وقت کے تمام کفار کا شمار بھی کفار میں نہیں کیا جا سکتا، قارئین گھر کی بات تھی نا اس لئے تو خدا نے خود مداخلت کر دی اس کے برعکس عوام کا انکار سامنے آیا تو فوراً خدا اپنی منشاء کو پس پشت ڈال کر اپنے پیغمبر کو حکم دے رہا ہے کہ ان کفار کے خلاف تلوار اٹھاؤ، قارئین یقین کریں ایسا اقرباء پرور اور ہٹ دھرم خدا میں نے تو آج تک کسی مذہب میں بھی نہیں دیکھا۔

مزہب اور فلسفہ میں کیا فرق ہے؟

کیا فلسفے کا مذہب سے کوئی تعلق ہے؟ کیا مذہب فلسفے کی کوئی قسم ہے؟ کیا ہم اسے مذہبی فلسفہ کہہ سکتے ہیں؟ کیونکہ اکثر و بیشتر ہمیں اسلامی فلسفہ، یہودی فلسفہ یا عیسائی فلسفے کی اصطلاحات سننے کو ملتی ہیں؟

کیا فلسفہ اور مذہب میں کوئی مشابہت ہے؟ کیا یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟

مشرقِ بعید کے مذاہب میں جیسے بدھ مت یا تاؤ میں ہمیں مذہب اور فلسفے کا یہ تداخل ملتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مشرقی فلاسفر فلسفے کو عوام الناس تک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ مشرقی فلسفہ بشمول اسلامی فلسفے کے صوفیات اور پُراسراریت میں ڈوب گیا اور یونانی فلسفے سے متاثر ہونے کے باوجود اس جیسا عقلی فلسفہ پیدا نہیں کر سکا۔

یہ درست ہے کہ بعض اوقات ایسا لگتا ہے جیسے مذہب اور فلسفے میں کچھ مکسنگ ہے تاہم تشابہ کے باوجود یہ مکسنگ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

فلسفہ اور مذہب جن مسائل پر بحث کرتے ہیں وہ بادی النظر میں ایک جیسے لگتے ہیں جیسے اچھائی اور برائی کیا ہے؟ اچھی زندگی گزارنے کا کیا مطلب ہے؟ حقیقت کی فطرت کیا ہے؟ ہم یہاں کیوں ہیں؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ایک دوسرے کے ساتھ ہمارا سلوک کیسا ہونا چاہیے؟ اور زندگی میں سب سے اہم چیز کیا ہے؟

چنانچہ یہ واضح ہے کہ دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے یوں فلسفے کو مذہب یا مذہب کو فلسفہ سمجھنے کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، تو کیا اس کا مطلب ہے کہ ہمارا سامنا ایسے دو مختلف الفاظ سے ہے جن کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے؟ نہیں۔۔ یہ درست نہیں ہے، دونوں میں بہت سارے جوہری فرق ہیں بھلے ہی بادی النظر میں ان دونوں کی دلچسپیاں ایک جیسی ہی کیوں نہ لگیں۔۔ مثال کے طور پر مذہب میں مقدس دن ہوتے ہیں جیسے عید، میلاد، محرم، کرسمس وشادی غیرہ، اور مقدس رسومات بھی ہوتی ہیں جیسے نمازیں، حج وغیرہ۔۔ جبکہ فلسفے کے طالب علم کسی قسم کے مراسم کے پابند نہیں مثلاً کالجوں میں افلاطون اور ہیگل کو پڑھنے سے پہلے وہ ہاتھ نہیں دھوتے اس کے برعکس مذہبی تعلیمی اداروں میں طالب علموں کو قرآن پڑھنے سے پہلے وضوء کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ فلسفہ عقل کو ترجیح دیتا ہے اور تنقیدی فکر کو جلا بخشتا ہے اور ان پر زور دیتا ہے جبکہ مذاہب عقلیت پسندی سے صرف بقدرِ ضرورت ہی استفادہ حاصل کرتی ہیں، ان کا زیادہ زور خالص اندھے ایمان اور منطق، عقل اور حجت کی نفی کرنا ہوتا ہے اور یہ اسی پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔

کچھ فلاسفر ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے دعوی کیا ہے کہ انسان محض عقل سے حقیقت دریافت نہیں کر سکتا اور انسانی عقل کی محدودیت بیان کرنے کی کوشش کی مگر اس کا مطلب بہر حال یہ نہیں کہ فلسفہ اور مذہب ایک ہی چیز بن جائیں گے۔۔ کیوں؟۔۔ پڑھنا جاری رکھیں۔

آپ کو ایسا کوئی بھی حقیقی فلاسفر جیسے ہیگل، کانٹ یا رسل یہ کہتے ہوئے نہیں ملے گا کہ اس کا فلسفہ کسی ماڈل کے خدا کی طرف سے وحی کیا گیا ہے، فلاسفر مولویوں کی طرح نہیں ہیں، وہ یہ نہیں کہتے کہ ان کے دعوے کو بغیر بحث کے ایمانی طریقے سے قبول کرنا چاہیے، ایسے دعوے مذہب کی خاصیت ہوتے ہیں جو ہر چیز کو بالآخر خدا پر ایمان یا وحی تک پہنچا دیتا ہے جو کسی آسمانی بھوت کی نازل کردہ ہوتی ہے، چیزوں کو مقدس و غیر مقدس، پاک و ناپاک میں تقسیم کرنا مذاہب کی بنیادی خوبی ہے جو فلسفے میں نہیں، مذہب اپنے ماننے والوں کو تحریروں کا تقدس سکھاتا ہے جنہیں وہ مقدس کتابیں کہتے ہیں جبکہ فلسفہ اپنے طالب علموں کو سقراط یا ابن رشد کی کتابوں کی تقدیس کرنے کا نہیں کہتا اور نا ہی ڈیوڈ ہیوم کی کتابوں کو پڑھنے سے پہلے وضو کرنے کی تلقین کرتا ہے، اس کے علاوہ اکثر مذاہب کا معجزوں پر ایمان ہوتا ہے جو اصولی طور پر کسی بھی طرح کے سائنسی یا طبعی قانون کے خلاف ہوتے ہیں، یہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کا کائنات کے قوانین کے دائرہ کار کے اندر وقوع پذیر ہونا ناممکن ہوتا ہے۔

ہر مذہب میں معجزات بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور بیشتر اوقات اس مذہب پر ایمان کی اساس بھی، یہ تقریباً تمام مذاہب کی ایک بنیادی اور مشترکہ خاصیت ہے جس کا فلسفے میں کوئی وجود نہیں، مثال کے طور پر نیتشے کسی کنواری کے بطن سے پیدا نہیں ہوا، ہیوم نے کبھی پانی کو شراب میں بدلنے کی کوشش نہیں کی، سپینسر نے ڈنڈوں سے سمندر کو چیرنے کی کوشش نہیں کی، سپینوزا نے سلیمان کی طرح کسی چیونٹی سے بات کرنے کی کبھی حماقت نہیں کی اور نا ہی کبھی فرشتوں نے سارتر کا سینہ چیر کر اس کا دل دھویا ہے۔۔ چنانچہ اگر مذہب اور فلسفہ کے کچھ مسائل مشترکہ بھی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ایک جیسے ہیں، اس کے برعکس مشترکہ مسائل کے باوجود دونوں ان مسائل کو الگ الگ طریقے سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

ہمیں فلسفہ اور مذہب میں فرق کو اچھی طرح سمجھنا ہو گا تاکہ مذہب کے شکار نہ ہو جائیں خاص طور سے جب مذہب خود کو اس طرح سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے گویا کہ وہ اس زندگی کا فلسفہ ہو.

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

قدیم عقلی علوم میں انسان کی تعریف حیوان ناطق کے الفاظ کے ساتھ کی جاتی ہے، کیونکہ وصف حیوانیت میں انسان دیگر تمام حیوانات کے ساتھ شریک ہے، مگر جو وصف انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتا ہے وہ نطق ہے۔ نطق عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مفہوم بولنا ہے۔ اور انسان اپنے مافی الضمیر کا اظہار الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر کرتا ہے۔ اسلئے اساس تو مافی الضمیر ہے اور نطق اس مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔

اس تمہید کا مقصد انسانی حیات میں نطق کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے کہ اس کرۂ ارض پر دیگر مخلوقات کے ہجوم میں نوع انسانی کا تعارف ہی اس کا وصفِ نطق ہے۔ گویا ہر انسان اس دنیا میں بولنے اور اظہار رائے کا بنیادی حق لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں بولنے اور اظہار رائے کی اس قدر اہمیت کے باوجود ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے اس پیدائشی حق کے حصول کیلیئے انتہائی تگ ودو اور مشکل ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ استحصالی قوتوں نے آزادیٔ اظہار رائے کو اپنے اقتدار کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے ہمیشہ اس کی بیخ کنی ہے، اور اپنے استحصال کو دوام دینے کیلیئے، انسانی شعور کی ترقی کی راہ میں ہر ممکنہ رکاوٹ کھڑی کر کے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر بنی نوع انسانی کے اجتماعی مفاد کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ کیا۔

آزادیٔ اظہار رائے کے راستے میں آنے والی ان تمام تر پابندیوں اور مشکلات کے باوجود کوئی نہ کوئی جویائے حق گاہے بگاہے علم بغاوت بلند کرتا رہا، اور اپنے سچ کے اظہار کیلیئے ان تمام تر پابندیوں کو چیلنج کرتے ہوئے اپنے اس حق سے دستبردار ہونے سے انکار کرتا رہا۔ آج جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں تاریخ کے سنہرے اوراق پر افلاطون، ابن رشد، گیلیلیو، مارٹن لوتھر، جیسے عظیم درخشاں ستارے تو جھلملاتے نظر آتے ہیں مگر ان استحصالی طاقتوں کا ذکر صرف اسلیئے تاریخ کا حصہ ہے کہ تاریخ کے ان تاریک کرداروں نے ان روشن ستاروں کے چہروں پر چمکنے والی روشنی کو نوچنا چاہا تھا۔ بہر حال آزادی کے متوالوں اور جابروں کے درمیان یہ رسہ کشی ہنوز جاری ہے اور جدید تہذیب کے اس دور میں بھی اس کشمکش کا خاتمہ نہیں ہو سکا، جبر اور پابندی کا نقش کہن اپنی بقاء کیلیئے ابھی تک کوشاں ہے حالانکہ وہ اپنا وجود کا منطقی جواز کھو بیٹھا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اور پروہت ﴿مولوی، پنڈت، پادری، ربی﴾ کا ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا ہے، اور پروہت نے حصولِ حق کے لئے اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کی خاطر شاہ کا ساتھ دیا۔ پروہت نے شاہ کے خلاف عموماً اسی وقت آواز بلند کرنے کی ہمت کی جب خود پروہت کا مفاد خطرہ کے شکار ہوا۔ مذہبی رہنماؤں نے بسا اوقات خود بھی آزادیٔ اظہار رائے کی پابندیوں کا سامنا کیا، اور پابندی لگانے والوں پر شدید نقطہ چینی بھی کی، لیکن حیرت انگیز طور پر جب انہی مذہبی پیشواؤں یا ان کے متبعین کو اقتدار اور غلبہ حاصل ہوا تو انہوں نے بھی آزادیٔ اظہار رائے پر پابندیاں عائد کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کا یہ رویہ انتہائی ناقابل فہم ہے کہ اپنے مفاد و مقصد کیلیئے جب ان کی آزادی پر پابندی لگے تو یہ احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہیں، مگر جب یہ خود اقتدار پاکر اس قسم کی پابندیاں عائد کرتے ہیں تو انہیں اپنی بقاء اسی جبر اور پابندی میں مضمر نظر آتی ہے۔ حالانکہ اگر اظہار رائے کی راہ میں عائد تمام رکاوٹوں کا خاتمہ کر کے اسے آزاد اور حوصلہ افزا

ماحول میں پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جائے تو انسانی شعور کے ارتقاء کی رفتار اپنی قدرتی گنجائش کے مطابق ترقی پذیر ہو سکتی ہے۔

آزادیٔ اظہار رائے کے حوالے سے جب ہم مذہب کا رویّہ دیکھتے ہیں تو انتہائی حیرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ایک طرف تو مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ مذہب خدا کی جانب سے انسانی رہنمائی کا ذریعہ ہے، اور یہ رہنمائی خدا کی وضع کردہ ہے اور دوسری جانب مذہب ہی آزادیٔ اظہار رائے سے سب سے زیادہ خوف زدہ بھی نظر آتا ہے۔ یقیناً یہ خوف کسی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے ورنہ جب ایک مذہبی نظریہ خدا کی جانب سے پیش کردہ ہے تو یقیناً اسے کسی بھی طور پر ردّ کرنا آسان نہیں ہونا چاہئے، اور جب رد کرنا ایک مشکل امر ہو تو اٹھنے والے سوالات پر پریشانی بھی لاحق نہیں ہونی چاہئے اور نہ کوئی خوف لاحق ہونا چاہئے۔ جو نظریہ جس قدر قطعیت کے ساتھ اپنے حق اور سچ ہونے کا دعویٰ کرے گا اسے اسی قدر تنقید کی سخت کسوٹی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ آزمائش کی اس بھٹی میں سے گذرنے سے کندن ہونے کی صلاحیت رکھنے والے نظریہ کو کیوں انکار ہو سکتا ہے؟۔ اس آزمائش سے یقینی طور پر وہی گھبرائے گا جسے اپنے کھوٹے ہونے کا یقین یا شک ہو گا۔ اگر میں کوئی نظریہ پیش کروں اور مجھے اسکی صحت پر کامل یقین ہو تو مجھے تشکیکی سوالات پر کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے پریشانی صرف اسی وقت ہی لاحق ہو سکتی ہے جب مجھے اپنا نظریہ کا وجود خطرے میں نظر آئے اور میں دیانت داری کے تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے حقانیت اور سچائی کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے نظریہ کے بچاؤ کی تگ ودو میں لگ جاؤں، اور ہر وہ سوال جس سے میرے بیان کردہ نظریہ کو خطرہ لاحق ہو دبانے کی کوشش کروں۔ میں تو ایک انسان ہوں جس کے نظریہ میں خطا اور صواب کے امکانات برابر ہیں۔ مگر مذہب کو کیا پریشانی لاحق ہے کہ اسکی پشت پناہی پر تو خود خدا موجود ہے جب انسان کو پیدا کرنے کا دعویٰ کرنے والی ذات انسان کے جذبہ ٔتشکیک کو مطمئن نہیں کر سکتی تو یہ صورت حال خود تخلیق انسان کی دعوے دار ذات کے وجود کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف مذہب یہ وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان اور دنیا کا وجود کس طرح ظہور پذیر ہوا، اور ان کی تخلیق کا مقصد و منشا کیا ہے۔ اور دوسری جانب جب مذہب کی بیان کردہ وضاحتوں کا انسان اپنے علم اور تجربہ کی روشنی میں مطالعہ کرتا ہے اور اس ضمن میں ان وضاحتوں پر جو سوالات اٹھتے ہیں مذہب ان کی حوصلہ شکنی کرتا نظر آتا ہے، اور انسانی جذبہ ٔتشکیک کو مطمئن کرنے میں نہ صرف ناکام رہتا ہے بلکہ اس جذبہ کو سرد کرنے کیلئے نامعقول پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے، جن پابندیوں کو انسانی فطرت ہمیشہ سے رد کرتی نظر آتی ہے۔

انسانی شعور و ادراک آزادئ اظہار رائے کی قدر و قیمت جان چکا ہے، پابندیوں کا دور اب لَد چکا ہے، بجھتے ہوئے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لَو کی مانند اربابِ جبر آخری سانس لے رہیں ہیں۔ اب اس نئی اور بدلتی ہوئی دنیا میں اپنا کوئی مقام اور کردار متعین کرنا ہے تو وقت کے تقاضوں کو سمجھنا ہو گا، اور اقوام عالم میں عزت و سرفرازی کے جینے کی تمنا ہے تو نئے عہد کے پیمانوں کو اپنانا ہو گا۔

اے ملحدو تمھاری خیر نہیں

یہ ای میل ایک حضرت کی طرف سے موصول ہوئی ہے جس میں صاحب نے اپنا نام بتائے بغیر اور کسی بھی طرح کی تمہید کے بغیر لکھا:

قال الملحدون لابی حنیفہ: فی ای سنہ وجد ربک؟ قال: اللہ موجود قبل التاریخ والازمنہ لا اول لوجودہ، قالو: نرید منک اعطاءنا امثلہ من الواقع. قال لہم: ماذا قبل الاربعہ؟ قالوا: ثلاثہ. قال لہم: ماذا قبل الثلاثہ؟ قالوا: اثنان. قال لہم: ماذا قبل الاثنین؟ قالوا: واحد. قال لہم: وما قبل الواحد؟ قالوا: لا شیء قبلہ. قال لہم: اذا کان الواحد الحسابی لا شیء قبلہ فکیف بالواحد الحقیقی وہو اللہ! انہ قدیم لا اول لوجودہ. قالوا: فی ای جہہ یتجہ ربک؟ قال: لو احضرتم مصباحا فی مکان مظلم الی ای جہہ یتجہ النور؟ قالوا: فی کل مکان. قال: اذا کان ہذا النور الصناعی فکیف بنور السماوات والارض. قالوا: عرفنا شیئا عن ذات ربک؟ اہی صلبہ کالحدید او سائلہ کالماء؟ ام غازیہ کالدخان والبخار؟ فقال: ہل جلستم بجوار مریض مشرف علی النزع الاخیر؟ قالوا: جلسنا. قال: ہل کلمکم بعدما اسکتہ الموت؟ قالوا: لا. قال: ہل کان قبل الموت یتکلم ویتحرک؟ قالوا: نعم. قال: ماالذی غیرہ؟ قالوا: خروج روحہ. قال: اخرجت روحہ؟ قالوا: نعم. قال: صفوا لی ہذہ الروح ہل ہی صلبہ کالحدید؟ ام سائلہ کالماء؟ ام غازیہ کالدخان والبخار؟ قالوا: لا نعرف شیئا عنہا. قال: اذا کانت الروح المخلوقہ لا یمکنکم الوصول الی کنہہا فکیف تریدون منی ان اصف لکم الذات العلیہ.

ترجمہ:

دہریوں نے ابی حنیفہ سے کہا کہ تمہارا رب کس سال وجود میں آیا؟ کہا: اللہ تاریخ اور زمانوں سے پہلے سے موجود ہے اس کے وجود کا کوئی اول نہیں ہے، انہوں نے کہا: ہمیں حقیقی واقعاتی مثالیں دیں. ان سے کہا: چار سے پہلے کیا ہے؟ انہوں نے کہا: تین. ان سے کہا: تین سے پہلے کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: دو، کہا: دو سے پہلے کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ایک، کہا: ایک سے پہلے کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: اس سے پہلے کچھ نہیں ہے. کہا: اگر حسابی ایک سے پہلے کچھ نہیں ہے تو حقیقی واحد اللہ سے پہلے کچھ کیسے ہو سکتا ہے! وہ قدیم ہے اس کے وجود کا کوئی اول نہیں ہے. انہوں نے کہا: تمہارا رب کس سمت میں ہے؟ کہا: اگر تم لوگ اندھیری جگہ میں کوئی چراغ لے آؤ تو روشنی کس طرف جائے گی؟ انہوں نے کہا: ہر جگہ: کہا: اگر مصنوعی نور کا یہ عالم ہے

تو آسمانوں اور زمین کے نور کا کیا عالم ہو گا. انہوں نے کہا: اپنے رب کی ذات کے بارے میں ہمیں کچھ بتاؤ؟ کیا وہ لوہے کی طرح سخت ہے یا پانی کی طرح مائع ہے؟ یا بخار اور دھوئیں کی طرح گیسی ہے؟. کہا: کیا کبھی تم لوگ کسی مرتے ہوئے مریض کے پاس بیٹھے ہو؟ انہوں نے کا: ہاں بیٹھے ہیں. کہا: کیا مرنے کے بعد اس نے تم سے بات کی؟ کہا: نہیں. کہا: کیا مرنے سے پہلے بولتا اور حرکت کرتا تھا؟ کہا: ہاں. کہا: اسے کس چیز نے تبدیل کیا؟ کہا: اس کی روح کے نکلنے نے. کہا: کیا اس کی روح نکل گئی؟ کہا: ہاں. کہا: اس روح کی خاصیت کے بارے میں مجھے بتاؤ کیا یہ لوہے کی طرح سخت ہے؟ پانی کی طرح مائع ہے؟ یا دھوئیں اور بخارات کی طرح گیسی ہے؟ کہا: ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے. کہا: اگر تم مخلوق روح کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے تو تم مجھ سے کیسے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ میں تم کو ذات عالیہ بیان کروں.

مؤمنین اپنے آپ کو کیسے بے وقوف بناتے ہیں؟ اپنے آپ سے جھوٹ بول کر عقل و حکمت سے کس طرح دور ہوتے ہیں؟ اگر انسان اپنی عقل استعمال کرے اور تھوڑے سے غور اور ذرا سے شک سے کام لے تو اس کے لیے یہ جاننا قطعی مشکل نہیں ہو گا کہ یہ مناظرہ خالصتاً گھڑا ہوا ہے اور ابی حنیفہ سے بے جا منسوب ہے.. اور پھر اللہ معاف کرے ای میل بھیجنے والا یہ کیوں فرض کر رہا ہے کہ میں ملحد ہوں؟

صحرائی ممالک کی وہ قدیم تحاریر بھی جنہیں بار بار سنا سنا کر لوگوں کے کان پکائے جاتے ہیں کوئی واضح اصل نہیں رکھتیں کیونکہ ان کی دستاویز سازی سالوں اور تاریخوں میں کی ہی نہیں گئی ہے-- حدیث کے راوی یہ نہیں بتاتے کہ صلعم نے کب کوئی حدیث کہی، یعنی نہ سال کا پتہ ہوتا ہے نہ دن کا-- کیونکہ ان احادیث کی اکثریت بعد میں گھڑی گئی ہے جس کی بنیاد صحراء کی زبانی ثقافت پر ہے اس طرح یہ گھڑی ہوئی کہانیاں اسلام پر کافی اثر انداز ہوئیں اور اسے وہ شکل دے دی جس میں یہ آج دوسروں کا خون چوسنے کے درپہ ہے-- آج کے دور میں بھی لوگوں کو ایسے قصے کہانیاں گھڑنے سے کون روکتا ہے؟ آج تو آسانی بھی زیادہ ہے، اِدھر اُدھر سے کچھ سفید اور کچھ سیاہ جھوٹ جمع کیا اور انٹرنیٹ پر ایک نئی اسلامی پھلجڑی چھوڑ دی، مؤمنین اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی نیت اچھی ہوتی ہے، مسلم ممالک کی ہر طرح سے شکست خوردہ اور پسی ہوئی عوام ایسی کہانیوں پر فوراً یقین کر لیتی ہے، کیونکہ وہ بھی یہی کچھ سننا چاہتے ہیں-- آپ جو سننا چاہتے ہوں اس پر فوراً یقین کر لیتے ہیں-- یہ شاید انسانی نفسیات کا ایک پہلو ہے-

اس مناظرے کے متن کی ذرا سی جانچ پڑتال ہی بتاتی ہے کہ کسی قدیم تحریر میں لفظ: "من الواقع" کا استعمال ممکن نہیں کیونکہ اس جملے کا تعلق جدید عربی سے ہے جو بیسویں صدی میں ہی ظاہر ہوا ہے اور قدیم عرب کی زبان اور شاعری میں اس کا کبھی استعمال نہیں کیا گیا.

پھر دہریوں کولاجواب کرنے کے لیے ابو حنیفہ ان سے ہر عدد سے پہلے کا عدد پوچھتے ہوئے ایک سے پہلے تک لے جاتا ہے جس پر وہ کہتے ہیں کہ ایک سے پہلے کچھ نہیں ہے؟؟! اگر یہ ملحدین کم سے کم پرائمری پاس بھی ہوتے تو ابو حنیفہ کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیتے کہ ایک سے پہلے منفی ایک ہے، پھر منفی دو، پھر منفی تین۔۔ اس طرح منفی کروڑ۔۔ ارب۔۔ کھرب۔۔۔ انفینٹی تک۔۔ کون کہتا ہے کہ ایک سے پہلے کچھ نہیں ہے؟

پھر ملحدین رب کی ذات کے بارے میں پوچھتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا وہ لوہے کی طرح سخت، پانی کی طرح مائع یا گیسی ہے؟ اس کا تعلق بھی جدید علوم سے ہے، عرب نے اپنے قدیم علمی تصانیف میں کبھی مادے کی حالتوں کی ان صفتوں میں زمرہ بندی نہیں کی۔۔ لفظ "غازیہ" بھی جدید یورپی زبانوں سے عربی میں مستعمل ہوا۔۔ "النور الصناعی" بھی جدید عربی ہے یہ "القمر الصناعی" یعنی سیٹ لائیٹ کی طرح ہے، ایسے الفاظ نہ تو کبھی ابو حنیفہ نے سنے ہوں گے اور نا ہی کبھی بولے ہوں گے۔

پھر ابو حنیفہ پوچھتے ہیں کہ انسان کو مرنے کے بعد کس چیز نے تبدیل کیا جس پر ملحدین جواب دیتے ہیں کہ روح نے۔۔۔ بریبلک۔۔ یہ کون سے دہریے ہیں جو روح پر یقین رکھتے ہیں؟ ای میل بھیجنے والے کو میرا جواب ہے کہ یہ تحریر کسی ایسے مؤمن نے گھڑی ہے جو اپنے آپ میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ ملحدین کو لاجواب کر دے گا لیکن در حقیقت وہ ملحدین کی حجت کی طاقت اور منطق کی برتری کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہا تھا اور وہ غالباً یہ سب لاعلمی میں ہی کر رہا تھا کیونکہ ملحدین کی اکثریت اپنی زندگی، معاشرتی اور علمی رتبے کی حفاظت کے لیے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے، در حقیقت وہ ایک پسی ہوئی اقلیت ہیں، مگر وہ اپنے فکری مواقف تک ایسے ہی نہیں پہنچ گئے۔۔ ان کے پاس ایسی منطق اور حجت ہوتی ہے جو اس تحریر کے مصنف کے کبھی پلے نہیں پڑے گی جس طرح کی اس نے تحریر لکھی ہے، اور اگر ملحدین کسی آزاد معاشرے میں ہوتے جو فکر کی قدر کرتا ہو تو اس شخص کو زمین پر رگیدتے اور اسے اسلامی ممالک کا مسخرہ بنا دیتے جس طرح کی اس نے بودی منطق پیش کی ہے۔۔ عقل کی توہین ایمانی غیبیات کو ماننے والوں کی عادت بن چکی ہے کیونکہ اسلامی ممالک میں ان کے سامنے کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہے، اور جب تک قانون ان کی رائے کی پشت پناہی اور مخالف رائے کو سختی سے کچلتا رہے گا یہ اسی طرح خرافات میں غرقاں رہیں گے۔۔ ہمیں کیا ہے۔۔ ایسی بودی باتیں لکھتے رہیں اور خود ہی ان پر یقین کرتے اور اپنے آپ کو گمراہ کرتے رہیں تاکہ انہی کے اللہ کا قول ان پر صادق آجائے کہ: وماظلمونا ولکن کانوا انفسہم یظلمون۔

لوگوں کو اپنے عقائد بدلنے پر قائل کرنا بہت مشکل کام ہے، خاص طور سے جب عقیدہ مذہبی یا سیاسی ہو، آپ چاہے کتنا ہی ان کے دعوں کے تضادات ان کے سامنے رکھیں اور عقلی و علمی دلائل دیں غالب امکان یہی ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم رہیں گے۔۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

ہم بچپن سے ہی کچھ مفاہیم کو قبول اور مسترد کرتے ہیں، یہ وہ خیالات ہوتے ہیں جو ہمارے والدین، سکول ٹیچر، مسجد کا شیخ، میڈیا کے ذریعے سیاسی تلقین ہمارے ذہن میں ڈالتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ خیالات کس طرح ہمارے دماغ میں ڈالے گئے؟ یوں ہم انہیں اپنے خیالات سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ لاشعوری طور پر ہماری شخصیت سازی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں پھر ہم یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ہم ان خیالات سے متفق ہیں بھلے ہی شعور ان کی مزاحمت کر رہا ہوں اور ان کے فکری تضاد کو مسترد کر رہا ہو، ہم انہیں شک کا موقع دیے بغیر ان کا دفاع شروع کر دیتے ہیں، بچپن میں کی گئی برین واشنگ پتھر میں لکیر کی طرح ہوتی ہے، اعتقاد چاہے کتنا ہی بودا کیوں نہ ہو اسے اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا.. ایک پرانی فلم میں ہیرو اپنی جوانی میں ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اس کا باپ معاشرتی اور طبقاتی بنیادوں پر اسے اس لڑکی سے شادی نہیں کرنے دیتا جس پر وہ شدید دکھی ہوتا ہے۔۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہیرو اپنی بیٹی کے خلاف وہی کردار ادا کرتا ہے جو کسی دوسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے لڑکے کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے، اور سختی میں اپنے ہی باپ کا رویہ اختیار کرتا ہے جو اس نے ماضی میں اس کے خلاف اختیار کیا ہوتا ہے تاکہ اس عشق کو شادی پر منتج ہونے سے روکا جا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کو معاشرے میں ایسے بڑھے لکھے لوگ کثیر تعداد میں ملیں گے جو خرافات پر یقین رکھتے ہیں جیسے انجینئر، سائنسدان وغیرہ۔۔ گزشتہ رمضان بیماری کے سبب مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا، ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے روزہ ہے؟ نفی میں جواب دینے پر اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے جواب دیا: کھانے سے روزہ رکھنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر طویل دورانیے تک پانی نہ پینا صحت کے لیے مضر ہوتا ہے اور آپ ڈاکٹر حضرات ہی تو لوگوں کو کثرت سے پانی پینے کی نصیحت کرتے ہیں، ہے نا؟ ڈاکٹر صاحب نے ذرا منہ خراب کرتے ہوئے جواب دیا: درست! مگر یہ رمضان ہے اور اس کی اپنی برکت ہے۔۔

میرے ایک دوست نے جو ادبی آثار اور فن پاروں کو جمع کرنے کا دلدادہ ہے اور خاصا تعلیم یافتہ شخص ہے نے مجھ سے ایک بار کہا کہ فلسطینی-اسرائیلی مسئلے کی پیچیدگی کی وجہ یہ ہے کہ آسمانی کتابیں بشمول قرآن کے یہ گواہی دیتی ہیں کہ یہودی عربوں سے پہلے وہاں موجود تھے! ایک تعلیم یافتہ شخص عبرانیوں کی خرافات پر مشتمل زبانی تاریخ پر یقین کیوں رکھتا ہے جسے وہ آج تک کسی بھی آرکیالاجیکل کھدائیوں سے ثابت نہیں کر سکے؟ یہودیوں کو کبھی کوئی ثبوت نہیں ملنے لگا چاہے وہ پورا بیت المقدس کھود ڈالیں۔۔۔ وجہ بڑی سادہ ہے۔۔ میرا دوست کتابی طور پر پڑھا لکھا اور عقلی طور پر جاہل ہے، اسے سکول میں پڑھایا گیا کہ قرآنی قصے تاریخی طور پر درست ہیں جیسا کہ ثابت شدہ علمی تاریخ ہوتی ہے حالانکہ مذہبی کتابوں کے قصوں کو کوئی بھی سائنس قبول نہیں کرتی اور ایسا ایک بھی مؤرخ نہیں ہے جو اپنے آپ کا اور اپنے پیشے کا احترام کرتا ہو ان کو کوئی اہمیت دیتا ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں بچوں کو عقل اور شک سے متضاد تعلیم دیناہی اس مظہر کی ایک اہم وجہ ہے جو ایک دردناک حقیقت ہے۔۔ ہمیں بچوں کو سکھانا چاہیے کہ وہ کسی بھی طرح کے مفاہیم اور نظریات کو مطلق حقیقت کے طور پر نہ لیں اور ان پر شک اور ان کی جانچ پڑتال کرنا سیکھیں۔۔ اگر ہم حکومت اور معاشرے پر چھائے اسلام پسندوں کی طرف سے تھوپا ہوا تعلیمی نصاب نہ بدل سکیں تو یہ تعلیم ہمیں انہیں گھر پر دینی چاہیے۔

اوپر کی باتوں کا منفی پہلو یہ ہے کہ ہمیں پیش کردہ کسی بھی چیز کو قبول یا مسترد کرنے کے لیے ہمارے اندر تنقیدی تشکیکی سوچ کی ہمیشہ کمی ہوتی ہے مگر اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔۔ اسلامی ممالک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہوں نے بڑے ہوکر بچپن میں سکھائی پڑھائی گئی افکار کو مسترد کر دیا۔۔ میرے خیال سے ان معاملات کو پیش کرنے اور ان پر گفتگو کرنے سے بہت سارے لوگوں کو سطحی عقائد کی دیوار گرانے میں مدد ملے گی چاہے وہ بڑے ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں اور چاہے یہ عقائد بچپن سے ہی ان کے دماغوں میں کیوں نہ ٹھونسے جاتے رہے ہوں۔۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

حماقت کا دائرہ کار (حصہ اول)۔

ایک محترم دوست نے جسٹس (ر) مفتی تقی عثمانی صاحب کی تحریر "عقل کا دائرہ کار" بذریعہ ای میل ارسال کی۔ مفتی صاحب پاکستان کی ایک مشہور و معروف شخصیت اور کئی اسلامی کتب کے مصنف ہیں چنانچہ انکی تحریر کو دلجمعی سے پڑھا۔ مطالعے کے دوران کچھ عجیب ہی کیفیت طاری رہی، یقین نہیں آرہا تھا کہ امتِ مسلمہ کی معروف اور کلیدی عہدوں پہ تعینات شخصیات ایسی سطحی اور غیر منطقی اپروچ رکھتی ہیں۔۔۔ خواص کا یہ حال ہے تو عوام بیچاری کیا بیچتی ہو گی ؟

"عقل کے دائرہ کار" کا سرسری احاطہ بھی کم از کم تین قسطوں کا متقاضی ہے۔ پیشِ خدمت ہے پہلی قسط۔

حصہ اول

تمہید میں ہی جسٹس (ر) صاحب ایک بات واضح کر دیتے ہیں کہ بنیاد پرستی کوئی گالی نہیں بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ قانون، معیشت، سیاست اور زندگی کے ہر شعبے کو اسلامائز کر دینا اور اسکو ایک ہزار چار سو سال پرانے اصولوں کے تحت چلانا اور ریاست کے نظام کا دینِ اسلام کے تابع ہونا۔ اکثر روشن خیال قسم کے سکالر یا تو کھل کر یہ بات نہیں کہتے، یا پھر اسلام کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اب یہ ایک الگ گفتگو ہے کہ اسلام نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ اسلئے ہم یہاں صرف مفتی تقی عثمانی صاحب ہی کی بات پہ توجہ مرکوز کئے رکھیں گے۔ انکا یہ

کھل کر ببانگ دِہل کہنا کہ " ریاست، قانون، سیاست، معیشت اور ہر شعبہِ زندگی کو چودہ صدی پرانے اصولوں کے تحت چلانا ہی دراصل اسلامی نظام کا قیام ہے" لائق تحسین ہے کہ کم از کم انہوں نے کوئی لگی لپٹی تو نہیں رکھی۔ وسیع تر مفاد کی خاطر جھوٹ بولنے اور سچائی کو شوگر کوٹ کرنے سے اجتناب کر کے ایک تو انہوں نے ہمیں خواہ مخواہ کی کوفت سے بچایا اور پھر اپنی سیدھی، کھری اور بے لاگ شخصیت کا بھی اظہار کیا۔

طالبان کیا کر رہے تھے؟ وہ یہی تو کر رہے تھے جو جسٹس (ر) تقی عثمانی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔ یعنی اسلام کا نفاذ بعینہ اسی شکل میں جس شکل میں یہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے نافذ ہوا تھا۔ عورت کو مرد کے دستِ نگر کرنا، انسان کے بنیادی حقوق سلب کرنا، عدم برداشت، تشدد اور مذہب کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق ہی وہ ڈیڑھ ہزار سال پرانا اسلامی نظام ہے جسکا عملی مظاہرہ طالبان نے کر کے دکھایا اور جسٹس ریٹائرڈ مفتی تقی عثمانی صاحب جیسے افراد جس نظام کے نفاذ کے لئے جانے یا انجانے میں کوشاں ہیں۔

اسلامائیزیشن کیوں؟ اس عنوان کے تحت وہ اس بات کا جواب دیتے نظر آتے ہیں کہ ہم ملکی قوانین کو چودہ سو بلکہ بعض کیسز میں ہزارہا سال پرانی مذہبی تعلیمات کے سانچے میں کیوں ڈھالنا چاہتے؟ سیکولر یا لادین ریاست کے پاس نظامِ حکومت کا کوئی اصول موجود نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس عقل، مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے جسکی بنیاد پہ ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے دور کی ضروریات، تقاضے اور مصلحتیں کیا ہیں، چنانچہ ہم انکے مطابق اپنے قوانین ڈھال سکتے ہیں اور بدلتے حالات میں ہم اسکے اندر تبدیلی لا سکتے ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں، لیکن کیا عقل آخری معیار ہے؟ اللہ کے عطا کئے گئے دیگر حواس کی طرح عقل بھی آخری معیار نہیں ہے، جسطرح دیگر حواس کی ایک حد ہے کہ جس سے آگے وہ کام نہیں کر پاتے اسی طرح عقل کی بھی حد ہے کہ جس سے آگے اسکا استعمال ناممکن ہو جاتا ہے اور یہی وہ حد ہے جہاں سے ہماری راہنمائی کی خاطر "وحی الٰہی" یعنی علومِ الٰہیہ کا دائرہ کار شروع ہوتا ہے۔

یہاں مفتی تقی عثمانی صاحب ایک بہت ہی بنیادی سوال کا جواب دیئے بغیر ایک غیر ثابت شدہ مفروضے پر اپنے مقدمہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی یہ فرض کرتے ہوئے کہ ایک قادرِ مطلق ہستی (اللہ / گاڈ) موجود ہے جو انسان کو بذریعہ "وحی" ایسے علوم سے آگاہ کرتا ہے جہاں عقلِ انسانی پہنچنے سے قاصر ہے۔ ایک آسمانی ہستی کو علم کا ماخذ و منبع تصور کرنے سے قبل کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا وجود ثابت کیا جائے؟ آپ عوام الناس پر ایک ایسا نظامِ حکومت اور ضابطہءحیات لانا چاہ رہے ہیں کہ جو وحی کے تابع ہے اور جسکا عقلی و منطقی تجزیہ ناممکن ہے لیکن آپ اس وحی کے منبع اور ماخذ کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ کس قادرِ مطلق ہستی کی بات ہو رہی ہے یہاں؟ گاڈ، بھگوان، خدا، اللہ۔۔۔ بیشمار مذاہب اور مکاتبِ فکر بکھرے ہوئے ہیں، کس کے خدا کی بات ہو رہی ہے؟ کونسا مذہب حق ہے اور کونسا باطل؟ ایک مذہب کی تعلیمات آپ پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں تو آپکا یہ فرض بنتا

ہے کہ پہلے اپنے مذہب کی حقانیت اچھی طرح واضح کردیں اور اسکے سورس (منبع) کی ثبوت کے ساتھ وضاحت کریں۔ جب پوری دنیا پر ایک نظامِ حکومت مسلط کرنے کی بات ہو رہی ہے تو خالی کہہ دینا کافی نہیں ہوگا۔

بہر حال چلیں شک کا فائدہ دیتے ہوئے وقتی طور پر یہ تسلیم بھی کر لیتے ہیں کہ اللہ یا گاڈ کا وجود ہے، اس نے انسان بھی بنائے، جنات بھی فرشتے بھی شیطان بھی۔ اب ہم مولانا صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ اس قادرِ مطلق ہستی کی "وحی" کی تصدیق کس طرح ہوگی؟ اگر شیطان کسی فرشتے کے بھیس میں آکر یہ دعویٰ کر دے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور انسانیت کی راہنمائی کے لئے ایک نسخہء ہدایت لے کر آیا ہے یا ڈائریکٹ غیبی آواز کے واسطے سے ہمکلام ہو کر یہ چال چلے تو ہم کس طرح اسکے جال سے نکلیں گے؟ ہمیں اسکے لئے عقل کا سہارا لینا ہوگا یا نہیں؟ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ وحی کا ماخذ رحمانی ہی ہے نا کہ شیطانی۔

چنانچہ انکے یہاں تک کے بیان میں دو بنیادی ایرر ہیں

نمبر ایک: خدا کا ثبوت پیش کئے بغیر اسکی وحی کو علم کامل کا ماخذ قرار دینا۔

نمبر دو: وحیِ رحمان اور وحیِ شیطان میں امتیاز بغیر عقل کے کس طرح ہوگا۔ چونکہ وحی احاطہ ہی ان مسائل کا کرتی ہے کہ جنکا ادراک بقول مفتی صاحب، عقلِ انسانی کے بس سے باہر ہے۔

آگے "عقل دھوکہ دینے والی ہے" کے عنوان کے تحت مولانا صاحب نے فرمایا کہ آجکل عقل پرستی کا بڑا زور ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر چیز کو عقل کے میزان میں رکھ کر اور تول کر اختیار کریں گے لیکن عقل کے پاس کوئی ایسا ضابطہ اور اصول نہیں ہے جو عالمی حقیقت رکھتا ہو اور جسکو ساری دنیا کے انسان تسلیم کر کے اچھائی برائی کا معیار تجویز کر سکیں۔
ایک عالمگیر یا آفاقی (یونیورسل) قائدہ اور اصول ہے جسے سنہری اصول کہا جاتا ہے۔ اگر مولانا صاحب مذہبی تعلیمات کے عین مطابق، عقل کو اکثر معاملات میں ایک طرف رکھ دینے کی عادت کی وجہ سے اس آفاقی اصول سے لاعلم ہیں تو ہمیں کسی دوسرے کی خطا ہرگز نہیں۔ سنہری اصول اچھائی اور برائی ناپنے کا ایک انتہائی مؤثر پیمانہ ہے، جسکے مطابق "کسی دوسرے کے ساتھ وہ سلوک نہ کریں جو آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے ساتھ کیا جائے۔ اور آپ جس طرح کے سلوک کا مستحق خود کو سمجھتے ہیں، دوسروں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک روا رکھیں"۔ اس اصول کو پیمانہ بنایئے اور آپ اچھائی اور برائی میں با آسانی تمیز کر پائیں گے۔

انکا یہ اعتراض کہ "عقل کوئی ایسا عالمگیر اور متفقہ اصول پیش کرنے سے قاصر ہے جس سے اچھائی اور برائی میں تمیز کی جا سکے"، یہاں ختم ہو جاتا ہے اور تکنیکی اعتبار سے انکا پورا مقدمہ ہمارے اوپر پوچھے گئے دو سوالوں اور یہاں عقل کے حق میں دی گئی مسلمہ دلیل پیش کرنے کے ساتھ ہی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ بہر حال آگے دیکھتے ہیں کہ مولانا صاحب مزید کیا ارشاد فرماتے ہیں۔
فرماتے ہیں آپ تاریخ اٹھا کے دیکھتے جایئے اسمیں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس عقل نے انسان کو اتنے دھوکے دیئے ہیں جسکا کوئی شمار اور حد و حساب ممکن نہیں، اسکے لئے میں تاریخ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔
ان بے شمار اور بے حد و حساب مثالوں میں سے چند مثالیں پیش کرنے کا وعدہ کر کے وہ بمشکل ایک ہی مثال پیش کر پائے ہیں۔ یقیناً" مزید بھی ہوں گی اور ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بھی ایسی انفرادی غلطیاں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ عقل کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ وسعت پذیر ہے، یہ گزشتہ غلطیوں سے سبق سیکھتی ہے، اپنے اور دوسروں کے تجربوں سے سبق حاصل کرتی ہے اور بطورِ مجموعی، بہتر سے بہترین کی طرف گامزن رہتی ہے۔ انفرادی عقل اور اجتماعی معاشرے کی عقل میں امتیاز ضروری ہے۔ عقل اور سنہری اصول کی بنیاد پر جو قوانین مرتب کئے جاتے ہیں وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عقل ہوتی ہے اور اسکے پیچھے ہزاروں سال کا تجربہ اور سبق پنہاں ہوتا ہے۔ مذہبی تعلیمات اسکے برعکس جامد ہیں، انسان چونکہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ یہ الہامی تعلیمات ہیں اسلئے انکا بدلنا ناممکن ہے، خواہ وہ تعلیمات سرے سے الہامی ہوں ہی نا بلکہ کسی مالیخولیا کے مریض کی غیر منطقی خرافات ہوں یا پھر نوسرباز بہروپیے کی ذاتی فائدے کے حصول کے لئے گھڑی گئی من چاہی خواہشات جن کو وحی کا نام دے کر عوام کو بیوقوف بنایا جاتا رہا ہو۔

جاری ہے

حماقت کا دائرہ کار (حصہ دوم)۔

گزشتہ سے پیوستہ

جسٹس (ر) مفتی تقی عثمانی صاحب عقل کے دھوکے کی جو واحد مثال تاریخ سے ڈھونڈ کے پیش کرتے ہیں، حد درجہ واہیات ہے ۔ ملاحظہ ہو

بہن سے نکاح خلافِ عقل نہیں: آج سے تقریباً "آٹھ سو سال پہلے عالمِ اسلام میں ایک فرقہ پیدا ہوا جسکو باطنیہ کہتے ہیں اور اسکا مشہور لیڈر عبید اللہ بن حسن قیروانی اپنے پیروکاروں کو زندگی گزارنے کی بابت ہدایات دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ گھر میں ایک بڑی خوبصورت باسلیقہ بہن موجود ہے جو بھائی کے مزاج کو بھی سمجھتی ہے تو یہ کہاں کی عقل ہے کہ بھائی اسکا ہاتھ کسی اجنبی کو پکڑا دے اور خود کے لئے ایسی لڑکی لے آئے جو عین ممکن ہے حسن وجمال اور سلیقہ شعاری و مزاج شناسی میں بہن سے کمتر ہو، چنانچہ بے عقلی سے اجتناب کرتے ہوئے گھر کی دولت گھر ہی میں رکھیں۔ کیا وجہ ہے کہ جب ایک بہن اپنے بھائی کے لئے کھانا پکا کے اسکی بھوک دور کر سکتی ہے، اسکی راحت کے لئے اسکے کپڑے دھو، بستر درست کر سکتی ہے تو اسکی جنسی تسکین کا سامان کیوں نہیں کر سکتی۔ یہ عقل کے خلاف ہے۔

آپ اسکی بات پر جتنی لعنت بھیجیں لیکن میں (مولانا تقی عثمانی) یہ کہتا ہوں کہ خالص عقل جو وحی الٰہی کی راہنمائی سے آزاد ہو، جسکو وحی الٰہی کی روشنی میسر نہ ہو۔ اس عقل کی بنیاد پر آپ اسکے اس استدلال کا جواب دیں، خالص عقل کی بنیاد پر قیامت تک اسکے استدلال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ یعنی مذہب اور وحی الٰہی ہی انسانوں بشمول مولانا صاحب کو روکے ہوئے ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں سے جنسی تعلقات استوار نہ کریں۔ اگر وحی الٰہی نے راہنمائی نہ کی ہوتی تو مولانا صاحب کی عقل اس گھناؤنے فعل میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتی؟ اگر وہ مسلمان نہ ہوتے تو اپنی ہمشیرہ سے عقد میں انکو کوئی عقلی برائی یا معاشرتی عیب نظر نہ آتا؟

کیا مولانا صاحب کی عقل کو یہ دلیل کافی نہیں کہ یہ ایک غیر فطری، گھناؤنا، مکروہ، شرمناک اور نقصان دہ فعل ہے؟ صرف مذاہب ہی نے اس فعلِ مکروہ کی مذمت نہیں کی بلکہ زمانہ قدیم سے ہی یہ برا اور ممنوع قرار چلا آرہا ہے۔ لادین معاشروں میں بھی یہ ممنوع اور اخلاقی جرم کا درجہ رکھتا آیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ایسا ہوا نہیں، فاسد عقل اور کرپٹ ذہنیت کی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ ہر طرح کے مذہبی یا لادین معاشرے میں ایک عیب، برائی اور جرم تصور کیا جاتا رہا ہے اور یہی اُس اجتماعی شعور اور اجتماعی عقل کا مظاہرہ ہے جسکا ذکر اس ناچیز نے اوپر کیا ہے۔

فرماتے ہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات ہے، بڑی گھناؤنی بات ہے تو اسکا جواب موجود ہے کہ یہ بداخلاقی اور گھناؤنا پن سب ماحول کے پیدا کردہ تصورات ہیں۔ آپ ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جہاں اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے اسلئے آپ اسکو معیوب سمجھتے ہیں ورنہ عقلی اعتبار سے کوئی عیب نہیں۔

گھناؤنے، مکروہ اور شرمناک والی دلیل کو مولانا صاحب ماحول میں رائج تصورات کی پیداوار قرار دے کر رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ماحول میں رائج تصورات کہاں سے پیدا ہوتے ہیں؟ مولانا صاحب۔۔۔اپنی تحریر کو پڑھا بھی کرتے ہیں آپ؟ تصور، خیال، ادراک، وہم، گمان یہ سب کہاں سے آتے ہیں؟ صاحب، ان چیزوں کا ماخذ عقل اور سوچ بچار ہی ہے۔

اس فعل کے غیر فطری ہونے سے تو جانور بھی آگاہ ہیں اور حتی الوسع اس سے اجتناب برتتے ہیں۔ بہت سے تو اس سے بچنے کے لئے اپنے طرزِ حیات کو ایک ایسے انداز سے منظم کرتے ہیں کہ جسمیں اس فعل سے ہر ممکن حد تک بچا جا سکے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب کی عقل کو البتہ اسے سمجھنے میں دشواری کا سامنا ہے چنانچہ وحی الٰہی کی راہنمائی نہ ہوتی تو جانے کیا غضب ہو گیا ہوتا۔ جہاں تک تجربے اور سائنس کا تعلق ہے تو یہ بھی عقل، مشاہدے اور معاشرے میں رائج تصورات کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔

مولانا صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بھی ہیومن ارج (فطری خواہش) کا حصہ ہے۔ مولانا صاحب کا یہ دعویٰ کہ اپنی ماں بہن سے شادی کی خواہش انسان کا فطری تقاضا ہے، ہمیں چکرائے دے رہا ہے اور اسکے تصور کرنے کا بھی خالی تصور ہی ہمارے ضمیر کو کانوں پہ گھسیٹے دے رہا ہے چنانچہ ہم تو انکے اس بیہودہ اور شرمناک دعوے کا فیصلہ قارئینِ کرام پہ چھوڑتے ہیں۔ ہمارے لئے تو اس پہ سوچنا بھی اپنے عقل و شعور اور انسانیت کو لہولہان کرنے کے مترادف ہے۔

آگے چل کے ارشاد فرماتے ہیں کہ۔ اگر آپ کہیں کہ اس سے طبی طور پر نقصانات ہوتے ہیں لیکن آپکو معلوم ہے کہ آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آ رہی ہیں کہ استلزاد بالا قارب انسان کی فطری خواہش کا حصہ ہے اور اسکے جو طبی نقصانات بیان کئے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔

قریبی رشتہ داروں میں ازدواجی تعلقات کے شدید اور ثابت شدہ طبی نقصانات ہیں۔ یعنی باپ بیٹی، ماں بیٹے یا بھائی بہن کے درمیان اسطرح کے تعلق کے صورت میں پیدا ہونے والی نسل میں جینیاتی خرابی کے 25 فیصد (4/1) چانسز ہیں اور یہ بھی صرف اس صورت میں کہ ایسا اس بلڈ لائن میں پہلی بار ہو رہا ہو، ورنہ یہ امکانات شارحانہ یعنی ایکسپونینشلی بڑھیں گے۔

فرسٹ کزن کا رشتہ یعنی قریبی رشتہ داری تو مولانا صاحب کی وحی الٰہی بالکل حلال قرار دیتی ہے جبکہ روزمرہ کا تجربہ و مشاہدہ تو اسکے برعکس نتائج دیتا ہے۔ عقل اور تجربہ بتاتا ہے کہ ازدواجی تعلق کے لئے اپنے خون سے جتنا دور جائیں گے اتنا ہی جینیاتی خرابیاں پھیلنے کے امکانات کم ہوں گے اور جتنا خون کے رشتے کے نزدیک ہوں گے اتنا ہی امکانات میں اضافہ ہو گا۔ معلوم نہیں تقی عثمانی صاحب نے کونسی کتب کا مطالعہ کیا ہے یا کس مغربی گروہ سے اکتساب فیض حاصل کیا ہے کہ جسکی مدد سے انکو یہ پتہ چلا کہ اس فعل کے کوئی طبی نقصانات نہیں ہیں اور یہ انسان کی فطری خواہش کا حصہ ہے۔ انکو اپنے اس دعوے کا ٹھوس

ثبوت پیش کرنا چاہئے تھا چنانچہ میری درخواست ہے کہ وہ اپنے اس دعوے کا مستند یعنی ثابت شدہ حوالہ پیش کریں، تب تک کے لئے یہ احقر انکے اس دعوے کو ننگا جھوٹ ہی قرار دے گا۔

مولانا صاحب کے منافقانہ مذہب کی تعلیمات ایک طرف محرم سے جنسی تعلقات کی ممانعت کرتی ہیں جبکہ دوسری طرف انکے نزدیک خود انکے جدِامجد اسکے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور نوعِ انسانی کی ابتداء ہی incest سے ہوئی ہے۔ایک طرف مولانا صاحب کا آسمانی مالک ایک ہی جوڑا پیدا کرکے افزائشِ نسل کے لئے بھائی بہن کی باہم شادیاں کرنے پر مجبور کررہا ہے حالانکہ ایک قادرِ مطلق خدا کو کس چیز نے روک رکھا تھا کہ دو مختلف جوڑے پیدا کر دیتا اور انکو اس فعلِ مکروہ و مضر سے بچالیتا اور ایسی گھناؤنی مثال ہی قائم نہ ہوتی۔۔۔کہیں عبیداللہ بن حسن قیروان نے بھی یہ دلیل خود خدا کے منظور اور نافذ کردہ اس مذموم فعل سے تو نہیں لی تھی؟

جاری ہے

حماقت کا دائرہ کار (حصہ سوم)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام کہتا ہے کہ بیشک تم عقل استعمال کرو لیکن صرف اس حد تک جہاں تک وہ کام دیتی ہے، جس چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے تیسرا ذریعہ علم یعنی وحی عطا کی ہے وہاں عقل کو استعمال کروگے تو یہ عقل غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔جسکے لئے قرآنِ کریم اتارا گیا۔قرآن آپکو بتائے گا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔یہ بتائے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ یہ سب باتیں آپ کو محض عقل کی بنیاد پر معلوم نہیں ہو سکتیں۔

ہم کہتے ہیں کہ عقل، انسانی زندگی کو پیش آنے والے تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔نام نہاد وحی کا سہارا لیکر اور عقل پہ قدغن لگا کر عیار اور ظالم لوگوں نے نوعِ انسانی پر وہ ظلم ڈھائے ہیں کہ جسکی نظیر نہیں ملتی۔کہیں ایک ظالم، زانی اور ڈاکو وحی کی آڑ میں قبیلوں کے قبیلوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے، معصوم بچوں کو غلام بنالینا انکی عورتوں کو خادمائیں اور رکھیلیں بنالیتا ہے تو کہیں اپنے نفس اور خود پرستی کی تسکین کی خاطر خود کو تمام بنی نوعِ انسان میں افضل قرار دے دیتا ہے۔اپنی بہو کو بیوی بنالینے میں اسکو کوئی برائی نظر نہیں آتی اور جن کو اسمیں برائی نظر آتی ہے انکو وحی کا رعب دے کر چپ کرا دیتا ہے۔جی جناب، واقعی ہم عقل کی بنیاد پر اپنے ہی جیسے گوشت پوست سے بنے جیتے جاگتے انسان کو صرف اسکے مختلف خیالات کی وجہ سے قابلِ گردن زنی قرار نہیں دے سکتے، وحی ہی ہے جو ہمیں ایسا کرنے کا حوصلہ دے سکتی ہے۔ عقل کی بنیاد پر ایک ضعیف عمر رسیدہ معزز بڑھیا کی ٹانگیں چیر کر دو ٹکڑے کر دینا واقعی ایک کارِ محال ہے۔۔۔یہ وحی ہی ہے جسکی مدد سے عقل کو دبا کر ایسا

بہیمانہ ظلم کیا جاسکتا ہے۔

جسٹس مفتی تقی عثمانی صاحب، آپ یہاں چوک رہے ہیں۔ سنہری اصول ایک مسلمہ پیمانہ ہے اور معلوم انسانی تاریخ سے چلا آرہا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جسکی مدد سے اچھے اور برے، حق اور ناحق اور خیر و شر کی تمیز کی جاسکتی ہے۔ وحی تو چالباز لوگوں کا ایک حربہ بھی ہوسکتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے مقاصد کا حصول اور عقلمند لوگوں کے منہ بند کرنے کی کوششیں کرتے آئے ہیں۔ وحی کو ہم علم کی قسم مان ہی کیسے سکتے ہیں؟ اسکی تصدیق کا طریقہ کیا ہے؟ کیا کسی کا یہ کہہ دینا کہ "مجھ پہ وحی اترتی ہے چنانچہ میرا اتباع کرو" کافی ہے؟ ہم یہ کیسے جانیں گے اس شخص پر واقعی وحی اترتی ہے اور یہ ذہنی مریض یا فراڈیا نہیں ہے؟ اور وحی بھی شیطانی نہیں بلکہ رحمانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان اس شخص کو خدا یا اسکا فرشتہ ظاہر کرکے اپنے مقصد کے لئے استعمال کررہا ہو۔ وحی کا نام لیکر بھلے وہ شیطانی اعمال کرتا رہے اور ہم یہ کہہ کر مطمئن ہوتے رہیں کہ وحی کا ادراک انسانی بساط سے باہر ہے چنانچہ جو بھی یہ شخص کررہا ہے ٹھیک ہی ہوگا بس ہمیں اسکی سمجھ نہیں ہے۔ واقعی عقل کی حدود ہوتی ہیں پر جاہلیت کی کوئی حد نہیں ہے۔

آگے خنزیر حلال ہونا چاہئے اور ایک واقعہ کے تحت انہوں نے جو کہا ہے وہ اپیل ٹو اتھارٹی نامی منطقی مغالطے ہیں (ویسے تو انکی یہ ساری تحریر ہی ایک عظیم الشان منطقی مغالطہ ہے اور میرا نہیں خیال کہ یہاں تک پہنچ کر قاری کو یہ بات سمجھتے کوئی دشواری پیش آئے)۔ خنزیر کی حرمت کے لئے وہ قرآن کو بطور دلیل پیش کررہے ہیں جبکہ قرآن وحی الٰہی ہے بھی یا نہیں، یہ بات بجائے خود ایک متنازعہ موضوع ہے۔ پھر گانے بجانے کی حرمت کے لئے بھی یہی مغالطہ، کہ محمد کو اللہ کا رسول تسلیم کرلیا بغیر یہ بات ثابت کئے کہ وہ اللہ کا رسول ہے بھی یا نہیں۔ کیا پہلے انکو یہ بات ثابت نہیں کرنا چاہئے کہ محمد واقعی میں اللہ ہی کا رسول ہے؟ پیشتر اس کے کہ وہ چودہ صدی پہلے گزرے ایک عرب، یعنی محمد کے الفاظ کو ایک مستند دلیل کے طور پر استعمال کریں؟ پہلے محمد کی نبوت تو ثابت کرلیں، پھر اسکی بات کو وحی الٰہی کا درجہ بھی دے لیجئے گا۔ جب تک آپ ایسا نہ کرسکیں، تب تک آپکی یہ دلیلیں منطقی مغالطہ کہلائیں گی۔

ختم شدہ

ڈائینو

دیکھئیے اس تصویر کو.. یہ چیز ڈائیناسار کہلاتی ہے.. اس نے کرہ ارض پر 160 ملین سال حکومت کی جبکہ اس کے اجداد کی تاریخ 230 ملین سال پرانی ہے.. مگر حیرت انگیز طور پر اللہ نہ صرف اس کے ذکر سے عاجز نظر آتا ہے بلکہ اس کی طرف ادنی ترا شارہ تک نہیں کرتا اور اسے ایسے نظر انداز کردیتا ہے جیسے یہ بے چارہ کبھی تھا ہی نہیں.

عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم نے اللہ کا قرآن، اس کی انجیلیں اور باقی مقدس بکواس پڑھی تو ہمیں گائے، بھینسیں، پرندے، گدھے، مکڑیاں، چیونٹیاں، ہاتھی ودیگر جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا خوب تذکرہ ملا کیونکہ یہ سارے جانور و کیڑے مکوڑے انبیاء کے ادوار میں موجود تھے.

مگر یہ عجوبہ جانور جس نے زمین پر انسان سے بھی زیادہ حکومت کی چونکہ صلعم کے دور میں نہیں تھا، اور نا ہی اسے اڑنے والے عیسی اور سانپوں کے شوقین موسی نے دیکھا تھا اس لیے اس کا کسی بھی ابراہیمی بوگس کتاب میں کوئی ذکر نہیں ہے جبکہ کتے بلیاں اس اللہ کے نظر میں زیادہ اہمیت کے حامل تھے!! یہ خدائی جھول ایک بار پھر ثابت کرتا ہے کہ مذاہب انسانی تخلیق کے سوا کچھ نہیں ہیں کیونکہ ان کا خدا ہر چیز کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے جیسا کہ وہ جھوٹا دعوی کرتا ہے.

سچائی / حقیقت کیاہے

ہمارے آس پاس بے شمار مذاہب موجود ہیں اور ہر مذہب حقانیت کا دعویدار ہے۔ انسان جس مذہب کے ماننے والوں میں پیدا ہوتا ہے مرتے دم تک اسی مذہب پہ قائم رہتا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے پیدائشی مذہب سے دستبردار ہو کر کوئی اور مذہب اپنا لے۔

ایسے میں ہمارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ ہم جس مذہب پر کاربند ہیں وہی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ ہم نے اپنے پیدائشی مذہب کو کب پرکھا ہے یا اس کا دوسرے مذاہب کے ساتھ تقابلی جائزہ لیا ہے؟

بہت سے لوگ اس وہم میں مبتلا ہوں گے کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہیں اور اس کی حقانیت سے آگاہ ہیں، لیکن یقین کیجئے ایسا نہیں ہے۔ یہ بچپن سے کی گئی برین واشنگ کا اثر ہے کہ ہم رٹی رٹائی باتیں دہرا دیتے ہیں، ان پہ ایک بھی لمحہ کے لئے سوچے بغیر۔

ابھی گزشتہ چند عشروں کے دوران کینیڈا کے ایک شخص (John de Ruiter) نے بنی نوعِ انسان کے نجات دہندہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے پیروکاروں کے نزدیک اس کا درجہ یسوع مسیح سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے دعوے کی جانچ کیسے کی جائے۔ کس بنیاد پہ ہم اس کے دعوے کو جھٹلائیں یا اس کی تصدیق کریں گے۔ کیا اس کا خود کا دعویٰ اور اس کے جانثار پیروکاروں کی تصدیق ہمارے لئے کافی ہونا چاہئے؟ کیا ہمارا حق نہیں ہے کہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سے تصدیق و تسلی کر لیں کہ یہ شخص واقعی ہمارا نجات دہندہ ہے اور کسی آسمانی مقتدر ہستی نے اسے ہمارے لئے بھیجا ہے اور اس کی پیروی میں ہی ہماری بھلائی ہے۔ ہم کیوں اس کے اپنے کہے گئے الفاظ یا اس کے (ممکنہ عقیدت میں اندھے) پیروکاروں کی بات پہ ایمان لے آئیں۔ یا ہم سرے سے اسکی بات سنے بغیر اسکا انکار کر دیں؟ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ واقعی وہ

پیغامبر ہو یا" ریفارمر" ہو اور اللہ نے بنی نوعِ انسان پر رحم کھا کر اسکی صورت میں ایک اور موقع عنایت کیا ہو اور ہم بغیر اسکی بات سنے انکار کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھیں۔

ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اسکے دعوے کو پرکھ لیں اور جانچیں کہ اسمیں کتنی صداقت ہے؟ اور جب ایسا کر چکیں تو بالکل اسی میعار پر کہ جس پر اسکو پرکھا تھا، اپنے موجودہ مذہب کے دعوائے صداقت کو بھی پرکھیں۔

اپنی بیوی اور تین بچوں کی موجودگی میں اس نے اپنی دو خوبصورت پیروکار بہنوں قطرینہ اور بینیتا کے ساتھ جنسی روابط قائم کئے رکھے اور ان لڑکیوں کے والدین یہ جان کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے کہ "حق" نے ان کی بیٹیوں کو ہمبستری کا شرف بخشا ہے۔ اس کی اپنی بیوی کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے اس کے خدائی دعوے کی تردید کی اور علیحدگی اختیار کر لی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے بیشتر پیروکار اپنے مسیح کی اس روش کے بارے میں جانتے ہیں پر تنقیدی انداز میں سوچنا ہی گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ جب ہم کسی کو خدا، پیغمبر، مسیح یا برتر تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اس کے گناہ، کمزوریاں یا غلطیاں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

جون نامی یہ نجات دہندہ کہتا ہے کہ اس میں اس کی خواہش نفسانی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور یہ کہ اس کا تعلق ان لڑکیوں کے ساتھ روحانیت پر مشتمل ہے۔ میرے خیال میں عقیدت کی عینک اتارنے پر یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ اس "نبی الانبیاء" نے کس چیز کو روحانیت کا نام دے رکھا ہے۔

شروع میں تو اس نے اس تعلق کا سرے سے ہی انکار کر دیا لیکن جب معاملہ سامنے آ گیا تو اس نے جو تاویل دی وہ قابلِ داد ہے۔ اس نے کہا کہ پہلے جب میں نے اس تعلق کا انکار کیا تو وہ "شخصی سطح" پر انکار تھا، اور "شخصی سطح" پر میرا اب بھی کوئی افیئر نہیں ہے۔ نہ ہی میں شہوت پرست ہوں۔

اس کے پیروکاروں میں ایک مشہور ماہرِ نفسیات بھی ہے کہ جس کا دعویٰ ہے کہ اس کے تیس سالہ تجربے کی رو سے جان ڈی ریوٹر مکمل طور پر ذہنی صحت مند شخصیت ہے۔ اور مزید کہ:

"John's responses have cleared questions in my mind that lasted decades... Looking back at it, after having read about or been to so many spiritual teachers and teachings through-out the years, and the questions that lingered in my mind still yet unanswered, the fact that John has answered them with such fullness and clarity, fills my Being with so much Gratitude and Love..."

ایسے پڑھے لکھے اور "باشعور" لوگ کیونکر اس طرح کے فراڈیوں کے ہاتھ بے وقوف بن جاتے ہیں؟ شاید اس لئے کہ لوگ راہنمائی اور ہدایت کی تلاش میں ہیں؟

ہم انسان سہل پسند واقع ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہو جو ہماری راہنمائی کرے اور بتائے کہ ہمیں کیا کرنا ہے تاکہ ہمیں خود فیصلے کرنے کی کوفت نہ اٹھانی پڑے۔ ہم "نجات" پانے کے لئے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ ہم جنوں فرشتوں پہ یقین رکھتے ہیں، روحوں کو مانتے ہیں، بھوت پریت، آسیب شیاطین، جادو تعویذ سے ڈرتے ہیں۔ ہم سادھوؤں فقیروں، ملاپنڈت، پیروں پیغمبروں کے پیچھے چلتے ہیں تاکہ ہم سوچنے سمجھنے اور ضمیر کے مطابق زندگی گزارنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جائیں۔

جب ایسے لوگوں کا وجود ہو گا کہ جو پیروکار بننا چاہتے ہیں تو فطری طور پر ایسے لوگ اٹھیں گے جو راہنمائی کا دعویٰ کریں گے۔ جب لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح سوچنا شروع کریں گے تو چرواہے کے بہروپ میں بھیڑیے خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ مذہب ایسے ہی تشکیل پاتے ہیں۔ ایک جعلساز اٹھتا ہے اور گروہ بناتا ہے جو اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتا ہے، جب یہ جعلساز مرتا ہے تو احمقوں کا یہ ٹولہ مذہب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور اس جعلساز کو پیغمبر، سینٹ یا اوتار وغیرہ کے عہدے پہ فائز کر دیا جاتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانثار عقیدت منداس سے پُر اسرار حکایتیں منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے معجزے اور خرق عادات گھڑ لیتے ہیں اور اس کو نبوت کے ساتویں آسمان پر بٹھا لیتے ہیں، حتیٰ کہ خدا تک بنا لیتے ہیں۔

اس کا ایک واضح ثبوت مسلمانوں کی احادیث ہیں۔ بے شمار احادیث میں نبی کریم ﷺ سے معجزات منسوب کیے گئے ہیں حالانکہ خود قرآن جو مسلمانوں کے نزدیک اللہ کی کتاب ہے اور تب سے اب تک محفوظ شکل میں ہے، معجزات کا انکار کرتا ہے۔

وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿سورۃ الاسراء آیت 59﴾

ترجمہ: "اور ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لئے موقوف کر دیں کہ پہلے لوگوں نے اسکی تکذیب کی تھی۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی نبوت صالح کی کھلی نشانی دی تو انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور ہم جو نشانیاں بھیجا کرتے ہیں تو ڈرانے کو۔"

یہ قصے کہانیاں نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں اور یہی ان کے اثبات کی دلیل بن جاتی ہے۔

آج کے دور میں کوئی مسلمان بھی آزادانہ جنسی میل جول کی تائید نہیں کرے گا لیکن یہی مسلمان کچھ صورتوں میں نہ صرف ان کو قبول کرتا ہے بلکہ اس کے لئے ہر ممکن دلائل بھی پیش کرتا ہے۔

جون کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ "سچائی" تک پہنچ گیا ہے اور دوسروں کی بھی راہنمائی کر سکتا ہے۔ کیا ہم جانتے ہیں کہ حقیقت کو کیسے جانا جائے؟ کیا کوئی ایسا مذہب ہے جو ہمیں حقیقت سے روشناس کرا دے؟ اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ "حقیقت" ہے کیا اور اس سے کیا مراد ہے؟

حقیقت تو ایک ہی ہوتی ہے جس میں تغیر نہیں ہوتا، جو بدلتی نہیں اور جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اگر ہمارا یقین خدا پر ہے تو پھر ہمارا اس بات پر بھی یقین ہے کہ خدا حقیقتِ کاملہ ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم حقیقتِ کاملہ کا ادراک کر سکتے ہیں؟ کیا قطرے میں سمندر سمویا جا سکتا ہے؟ کیا ایک محدود، لا محدود کا احاطہ کر سکتا ہے؟

میں اپنی محدودیت کا ادراک رکھتا ہوں، مجھے اپنی کم علمی کا بھی پتہ ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میں نہیں جانتا۔ عین ممکن ہے کہ حقیقت ایک ہو اور لا محدود بھی ہو، لیکن کیا میں اس کا احاطہ کر سکتا ہوں؟ نہیں!

لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں تلاش ہی ترک کر دوں۔ سمجھنے کے عمل میں مجھے سوال بھی اٹھانے پڑیں گے، اور تعصب سے بالاتر ہو کر کھلے ذہن سے تلاش کرنا ہو گا۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی واضح طور پر سمجھ لینا ہو گا کہ حقیقت لا محدود ہے جبکہ میں محدود ہوں، چنانچہ میں کبھی بھی ساری حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ محدود لا محدود کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

اس وسیع النظری تک پہنچنے کے لئے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ شخصی عقائد و نظریات پر اس کے ماحول اور تعلیم کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ ہمارے موجودہ عقائد ہمارے گزشتہ تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر روز ہم نیا کچھ سیکھتے ہیں چنانچہ ہمارے شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے شعور میں اضافے کے ساتھ ہمارے عقائد بھی تبدیل ہوتے ہیں اور عقائد کی یہ تبدیلی بہت آہستگی کے ساتھ لاشعوری طور پر ہوتی ہے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ عقائد میں بھی تبدیلی ہر لحہ واقعہ ہوتی رہتی ہے، مجھے اپنے عقائد سے چمٹے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے بدلنا ہے، تو میں کیوں دوسروں پہ ان کو مسلط کروں۔ میں کیوں ان کی "حقیقت" تک راہنمائی کروں جبکہ حقیقت تک جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے، یہ بغیر راستے کے ہے۔

حقیقتِ کاملہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو "دیکھا" جا سکے۔ کیونکہ یہ کوئی "چیز" نہیں ہے۔

حقیقتِ کاملہ کوئی ایسی شئے نہیں کہ جس کو مکمل طور پر "سمجھا" جا سکے۔ کیونکہ یہ لا محدود ہے۔

حقیقتِ کاملہ منزل نہیں ہے اور کوئی ہماری راہنمائی اس تک نہیں کر سکتا کیونکہ حقیقت کوئی "جگہ" نہیں ہے کہ جہاں تک کا سفر طے کیا جائے۔

ہم تو بس اس کو اپنی محدودیت کی حد تک سمجھنے کی کوشش ہی کر سکتے ہیں اور جتنی کوشش کریں گے اتنا ہی حقیقت کے نزدیک تر ہوتے جائیں گے۔۔۔ لیکن ہم حقیتِ کاملہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

حقیقت آشنائی کا طریقہ سائنسی طریقے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہ تھیوری پیش کرتے ہیں لیکن اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اس کو بھی مسلسل تشکیک و تجربات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ جب وہ تھیوری (اگر) غلط ثابت ہو جاتی ہے تو انہیں اس تھیوری کو رد کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔

گیلیلو نے اس وقت کے عمومی کائناتی نظریئے پہ شک کیا اور مزید تحقیق کی، نتیجے کے طور پر اس نے جانا کہ حقیقت تو موجودہ عقائد سے بالکل مختلف ہے، اگرچہ اس وقت کے بہت سے علماء و فضلاء نے اس سے اختلاف کیا لیکن آج ہم ان علماء کے نام تک نہیں جانتے جبکہ گیلیلو کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ ڈارون ایک دوسری مثال ہے، وہ بھی مذہبی شخص تھا، لیکن اس نے بائبل پہ سوال اٹھائے اور بائبل میں پیش کی گئی "پیدائش" کی تھیوری پہ شک کیا۔ آج اس کی تھیوری سائنس کے درجے پر ہے اور ہر آنے والا دن اس پر اثبات کی مہر لگا رہا ہے۔

جب ہم شک کرتے ہیں، سوال کرتے ہیں ہم نئی چیزیں سیکھتے ہیں۔ اگرچہ ہم حقیقتِ کاملہ کو نہیں پاسکتے (کیونکہ یہ لا محدود ہے اور ہم محدود)، لیکن ہم اس کے نزدیک تر ہو سکتے ہیں۔ حقیقتِ کاملہ کا احاطہ ناممکن ہے، ذہن اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، کتاب بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ کوئی کس طرح کہہ سکتا ہے کہ یہ چند (سو/ہزار) صفحوں کی کتاب حقیقتِ کاملہ کا احاطہ کرتی ہے؟ چاہے وہ قرآن ہی کیوں نہ ہو۔ کیا حقیقت محدود ہے کہ وہ اس کتاب میں سما گئی؟

جب ہم کوئی نئی بات سیکھتے ہیں تو ہم اپنے پرانے نظریات کو رد نہیں کر دیتے، صرف ہمارا ان کو سمجھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک فرد قادرِ مطلق کے تصور کا انکار نہیں کرتا، بالکل گیلیلو کے مانند، اس نے زمین کو رد نہیں کیا بلکہ "لوگوں کے زمین کو سمجھنے کو" رد کیا تھا۔ وہ خدا کا انکار نہیں کر رہا، بلکہ لوگوں کے اس کو سمجھنے کا انکار کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر وہ خدا کا انکار نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے اس کو سمجھنے کا انکار کرتا ہے کہ "ایک ہستی کہیں چھپی بیٹھی ہے اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھ بے تکے اور غیر منطقی پیغام بھیجتی پھر رہی ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ ہماری تخلیق کا مقصد اس کی عبادت (اور پیغمبر کی بلا سوچے سمجھے پیروی) ہے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں ابدی سزا ہماری منتظر ہے۔۔۔"

کیا آپ کو اس میں کسی انسانی چالبازی کی بو نہیں آتی؟ قرآن، بائبل اور دیگر "آسمانی" کتابوں کی ناقابلِ عمل اور عقل سے متصادم تعلیمات، ان مذاہب کے بانیوں کے مشکوک اور قابلِ اعتراض طرزِ زندگی اور پھر ان کے پیروکاروں کی جاہلانہ تاویلیں بالکل اسی طرح جس طرح جان دی ریوٹر کا اپنی خوبصورت پیروکاروں سے جسمانی تعلق کی تاویل۔

جان دی ریوٹر کے ایک پیروکار نے بھی کیا تاویل دی ہے اس کے اس بے شرمی والے فعل کی، ملاحظہ کیجئے:

"دوسرے پیغمبر بھی اپنے پیروکاروں کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرتے تھے۔ عین ممکن ہے کہ جنسی عمل ان لوگوں کے لئے کچھ اور معنیٰ رکھتا ہو جو اس عالم مادی سے ذہنی تعلق توڑ چکے ہوں۔ جب آپ حقیقت کو پا لیتے ہیں تو اس قسم کی خواہشات

آپ پہ غلبہ نہیں پاسکتیں بلکہ یہ محض نپے تلے مادی وظیفے بن جاتے ہیں جن کا شہوت رانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔۔۔ جیسے کھانا یاسونا، جوکہ محض ایک جسمانی فعل اور ضرورت ہے، کہ جس میں کوئی ہوس پنہاں نہیں۔۔۔ آپ جان دی ریوٹر کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس نے کم و بیش وہی کچھ کہاہے جو دیگر انبیاء کہہ گئے ہیں۔۔۔

ہو سکتاہے اس کے ان پیروکاروں کو ایمان کے لئے اپنی ذات سے باہر دوسری ہستی کی ضرورت ہو اور جب تک ان کو اس کی ضرورت ہو وہ ان کو خدا کی طرف سے مہیا کی جارہی ہو تا آنکہ وہ حقیقت کو اپنے اندر تلاش کر لیں"۔

ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح اندھی عقیدت عقل کو برباد کرتی ہے۔ کارل مارکس نے خوب کہا تھا کہ "مذہب قوموں کی افیون ہے" "کس طرح ایک عقیدت مند چیلا اپنے گرو کے گھناونے فعل کو عقلیا رہاہے اور کس طرح اس کو روحانی رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ اس کو یہ نظر نہیں آرہا کہ اس کا گرو اپنی حیوانی خواہشات کو قابو نہیں کر پارہا اور اپنے پیروکاروں کے اعتماد (اور بیوقوفی) کا فائدہ اٹھا رہاہے۔ لیکن اس کا یہ عقیدت مند اس پہ انگلی اٹھانا تو کجا بلکہ اس کے لئے دلیل پیش کر رہاہے (شاید خود کو مطمئن کرنے کے لیے؟)۔۔۔ کیوں؟ کیونکہ وہ اپنی عقل کو ایمان کے ہاتھ گروی رکھ چکا ہے۔

اس کے عقیدت مند دعوے کرتے ہیں کہ ڈی ریوٹر مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے، انہوں نے اس کے چہرے کو تبدیل ہوتے دیکھا ہے، وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مقامات پہ پایا جاتا ہے وہ ان کے خواب میں آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بالکل اسی طرح مسلمان بھی فکری تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ بھی کثیر الازدواجی کی دلیلیں دیتے ہیں۔ وہ بھی کم عمر نابالغ بچیوں کے نکاح کو عین دینِ فطرت گردانتے ہیں کیونکہ یہ ان کے پیغمبر کی سنت ہے۔ دشمن کو رات کے اندھیرے میں گھات لگاکے بغیر کسی پیشگی وارننگ کے قتل کرنا اور ان کے بچوں کو غلام اور بیویوں کو جنسی تسکین کے سامان کے طور پر رکھ لینے اور انکی خرید و فروخت میں ان کو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ صرف عقائد کی بنیاد پر کسی کو حقارت سے دیکھنا ان کے نزدیک عین ایمان بن جاتا ہے۔ جس حقیقت سے وہ خود واقف نہیں ہوتے اس کے لئے جان تک لے لینا (یا دے دینا) ان کے لئے کارِ ثواب بن جاتا ہے۔

کیا ہمیں اپنا تجزیہ نہیں کرنا چاہئے کہ کہیں ہم بھی جان دی ریوٹر کے چیلے کی طرح برین واش کر دیئے گئے ہوں اور صحیح غلط کی تمیز سے عاری ہو گئے ہوں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمیں دوسرے مذاہب کے عقائد تو مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں لیکن خود اپنے عقائد میں کوئی عجیب چیز نظر نہیں آتی۔

جس بھی مذہب کو عقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے وہ کھوٹا نکلتا ہے۔

کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے "حقیقت" پالی ہے یا یہ کہ وہ "حقیقت" تک راہنمائی کر سکتا ہے۔ صرف احمق یا پھر چالباز لوگ ہی ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب حقیقت تک رسائی کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ حقیقت کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں کہ جس تک پہنچا جائے۔

میرا خیال ہے کہ اب انسان کا عقلی ارتقاء اس سطح تک پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنی راہنمائی کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنا بند کر دے کیونکہ جب تک بے وقوف بننے والے موجود رہیں گے بے وقوف بنانے والے آتے رہیں گے۔ جب تک پیروکاری کا جذبہ باقی رہے گا، مکار لوگ ان کو گمراہ کرتے رہیں گے۔

جو عقیدہ بھی پیش کیا جائے اس کو پرکھیں، اس کا عقلی جائزہ لیں۔ مذہب کیوں شک کی حوصلہ شکنی کرتا ہے؟ کیونکہ مذہب گھڑنے والے جانتے ہیں کہ یہی وہ اوزار ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرتا ہے۔ جب آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایمان شک سے بالاتر ہے تو آپ اس پہ شبہ نہیں کرتے۔ جب آپ شبہ نہیں کرتے تو آپ تلاش، تحقیق، جستجو نہیں کرتے اور جب آپ کھوج نہیں لگاتے تو آپ بھٹک جاتے ہیں۔ زندگی کا معنی تلاش کرنا ہے تو ایک مذہب سے دوسرے مذہب اور ایک راہنما سے دوسرے راہنما تک بھٹکنا بے کار ثابت ہو گا۔ اس کے بجائے انسانیت میں تلاش کیجئے، خدمت میں محبت میں۔

مرکزی خیال "کونسے مذہب کا انتخاب کیا جائے"

آزاد انسان

جب انسانوں پر کوئی آفت آتی ہے اور ہزاروں بے قصور لوگ مارے جاتے ہیں، تب مؤمن اس کے لیے کوئی ایسا جواب تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے جو اس کے عقیدے سے مطابقت رکھتا ہو، کبھی کوئی ایسی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے ریت کے خدا کو غصہ آ گیا ہو گا اور کبھی کہتا ہے کہ یہ مصیبت خدا کی طرف سے امتحان تھی.. یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا واقعی ان بے چاروں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ مقدر تھا یا ان کے اپنے فیصلے کا بھی اس نتیجے میں کوئی عمل دخل تھا.

اسلام اور دیگر آسمانی مذاہب ہمیشہ سے اس خالی مخولی دائرے میں گھومتے چلے آئے ہیں، کیا انسان کا اپنا کوئی آزاد ارادہ ہے یا آسمانی ارادہ ہی سب کچھ ہے؟ کیا وہ ہمیں دور سے ریموٹ کنٹرول سے کنٹرول کر رہا ہے یا ہمارے بھی کچھ فیصلے ہیں جن کے ہم ذمہ دار ہیں؟

اسلام کے ٹھیکیدار وڈے وڈے ظلماء.. مطلب.. علماء اس معاملے کو ہمیشہ ایک ہی نقطے پر ختم کرنا چاہتے ہیں کہ خدا صرف اچھائی ہی تخلیق کرتا ہے یہ ہم ہیں جو برائی کی طرف نکل جاتے ہیں، اس نے ہمیں خیر وشر میں فرق کرنے کی تمیز دی ہے مگر افسوس ہم ضد اور لالچ میں آکر برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، یعنی اس نے ہمیں انتخاب کی آزادی دی ہے.

مجھے اس جسٹی فیکیشن سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ میرے خیال میں یہ مذہبی منطق میں ایک بہت بڑی خرابی چھپانے کی کوشش کرتی ہے، اسلام اور دیگر مذاہب کہتے ہیں کہ وہی حق اور درست مذاہب ہیں، اگر آپ ایمان لے آئے تو آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت کے مکیں ہوں گے اور روزانہ عورتوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ گروپ سیکس کے مزے لوٹیں گے اور اگر آپ ایمان نہ لائے تو آپ کا انجام جہنم ہوگا جہاں آپ کے ساتھ کتوں جیسا سلوک ہوگا اور آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جہنم کی آگ میں جلتے بھنتے رہیں گے...... مگر ایک منٹ... یہاں انتخاب کی آزادی کہاں ہے؟ دھمکیوں میں انسان انتخاب میں آزاد کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کو کچھ اسلامی دہشت گرد اغواء کر لیں اور کہیں کہ نعت سناؤ ورنہ ہم تمہیں حسبِ عادت قتل کر دیں گے تو کیا یہاں آپ کی نعت خوانی آپ کے آزاد ارادے پر مشتمل ہے؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جی سوری میں نعت نہیں پیپی بر تھ ڈے ٹو یو سناؤں گا؟

ایک اور مثال.. میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ نے سکول کا ہوم ورک کیا تو میں آپ کو ہزار روپے دوں گا، یہ ایک اچھی بات، آپ کے پاس اختیار ہے کہ آپ سکول کا ہوم ورک مکمل کر کے ہزار روپے حاصل کریں یا اس آفر کو ٹھکرا دیں.. مگر.. اگر میں اس میں اضافہ کرتے ہوئے یہ کہوں کہ اگر آپ نے ہوم ورک نہ کیا تو میں آپ کو گولی مار دوں گا؟ اس صورت میں آپ ہوم ورک کرنے پر مجبور ہیں نا کہ ارادے اور انتخاب میں آزاد.

اس کے باوجود اوپر کے دو سیناریو اب بھی اس خدا کی دھمکیوں سے کہیں زیادہ "رحم دلانہ" ہیں جو آپ کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں بھونے گا اور جب بھی آپ کی جلد جل کر خاکستر ہو جائے گی اسے ایک اور جلد سے بدل دے گا تا کہ آپ کو جلانے کا سلسلہ جاری وساری رکھا جاسکے.. اس میں انسان کو انتخاب کا اختیار کہاں ہے، اگر اس نے یہ خوفناک دھمکی دینی تھی تو ہمیں انتخاب کی آزادی کیوں دی؟

اب ذرا تصور کریں کہ اسلام اور عیسائیت دونوں آپ سے کہتے ہیں کہ وہی دینِ حق ہے اور اگر آپ نہیں مانے تو آپ کو جہنم میں جلایا جائے گا، ایسے میں آپ کس کا انتخاب کریں گے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے کیونکہ جب آپ دونوں مذاہب کا موازنہ کرتے ہیں تو آپ کو ان دونوں میں کافی ہم آہنگی نظر آتی ہے، چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور لباس کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیں،

دونوں ہی چاہتے ہیں کہ آپ خدا کی عبادت کریں، دونوں ہی عورت پر ظلم ڈھاتے ہیں، دونوں ہی انسانی غلامی کو جائز قرار دیتے ہیں، دونوں ہی مخالفین کا قتلِ عام کرنے کے قائل ہیں.. پھر کہتے ہیں کہ آپ کے پاس انتخاب کی آزادی ہے لیکن اگر آپ سے غلطی ہوئی تو جہنم کا ہولناک عذاب آپ کا منتظر ہوگا، چاہے کوئی یہ کہے کہ عیسائیت نے زمانے کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اب اپنی اخلاقیات درست کرلی ہیں.. مگر کسی نے خدا سے نہیں پوچھا کہ وہ ان تبدیلیوں سے خوش بھی ہے یا نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ اب بھی بغیر کسی تبدیلی کے عیسائیت کے اصلی ورژن کو پسند کرتا ہو؟

یہ معاملہ واقعتاً کافی مشکل ہے، دونوں بھوتوں میں سے عبادت کے لیے کس بھوت کا انتخاب کیا جائے.. اسلامی بھوت یا عیسائی بھوت.. اس بات کا یقین کرلیں کہ آپ کو ان دونوں میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے فرق کا پتہ ہو.. ایک نے اپنے اکلوتے بیٹے کو آپ کے لیے مرنے کے لیے بھیج دیا اور دوسرے بھوت نے رسول، آلِ بیت اور ایک پوشیدہ آدمی (مہدی) بھیجا ہے، ایک کہتا ہے کہ جب آپ اپنی بیوی کو ماریں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ اس کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹے جبکہ دوسرا کہتا ہے کہ اپنے غلام کو مارتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ دو دن بعد کام پر واپس آسکے... ہم م م م.... کافی مشکل فیصلہ ہے.. ہے نا؟

ان دونوں خوبصورت آفروں کے درمیان آپ کی زندگی میں مزید سوچنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے؟ کیا آپ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کے انتخاب میں آزاد ہیں؟ اور کیا ان دونوں خرافاتی بھوتوں کی موجودگی میں آپ واقعی آزاد ہیں؟

اگر کوئی خدا ہوتا اور آپ کا امتحان لینا چاہتا، تو پہلے آپ کو انتخاب کی آزادی دیتا اور اپنی موجودگی کے بارے میں آپ کو لاعلم رکھتا تاکہ دیکھ سکے کہ آپ کا انتخاب درست تھا اور خوف پر مبنی نہیں تھا، ڈرائیور سارجنٹ کو دیکھ کر سگنل پر گاڑی روک سکتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں سگنل توڑ بھی سکتا ہے، یہی درست امتحان ہے، اس خدا کو بھی چاہیے کہ وہ رشوت دے کر لوگوں کو اکسانا بند کرے تاکہ اسے یقین ہوسکے کہ انسان اپنے اختیارات بغیر کسی دباؤ کے استعمال کر رہا ہے.

یہ مؤمنین جنہیں خدا جنت میں داخل کرے گا انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ وہ اس کے حق دار ٹھہریں، انہوں نے درست راستے کے انتخاب کے لیے اپنی عقل کا استعمال نہیں کیا بلکہ عذاب کے خوف اور جنت کی لالچ میں مذہبی تعلیمات پر دیوانہ وار عمل کیا.. یہ آزاد سوچ کے مالک انسان نہیں ہیں اور نا ہی معاملات کو اخلاقی طور پر دیکھتے ہیں.

ریت کا خدا اپنے عیسائی اسلامی ورژن میں جو کچھ کر رہا ہے اسے ظلم اور رشوت کہتے ہیں نا کہ انتخاب کی آزادی، جو بھی اس آسمانی بھوت کی موجودگی پر یقین اور اس پر ایمان رکھتا ہے آزاد انسان قطعی نہیں ہے اور نا ہی اس پر اس خاصیت کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ اس کا خدا اس پر یہ قاعدے قانون زبردستی تھوپتا ہے اسے ان میں انتخاب کی آزادی نہیں دیتا.

آزاد انسان کون ہے؟ آزاد انسان مؤمن انسان نہیں ہے جو ہر وقت آسمانی بھوتوں، جلادوں اور ٹارچر سیلوں سے تھر تھر کانپتا رہتا ہے، وہ انسان آزاد نہیں ہے جسے لالچ اور خوف اپنے فیصلے بدلنے پر مجبور کر دیں، آزاد انسان وہ ہے جو خود انتخاب کرتا ہے... جو جانتا ہے کہ بھوت وہم ہیں اور ریت کا خدا محض ایک بچوں کا قصہ.

عقل مندوں کو سلام!

گرگٹیریا

مسلمانوں کے ساتھ طویل ترین تجربات کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ مسلمان جو خود کو جدت واعتدال پسند مسلمان کہلوانا پسند کرتے ہیں دراصل گرگٹ کی کوئی قسم ہیں، آپ جیسے ہی ان کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک گول مول خالی مخولی دائرے میں گھوم رہے ہیں جس میں آپ جس قدر چاہے گھوم لیں آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے.

اگر آپ سلفیت اور وہابیت پر بات کریں تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اگر آپ مسلمان علماء کے ان عجیب وغریب فتاوی پر بات کرنا چاہیں جو وہ وقتاً فوقتاً چھوڑتے رہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ علماء اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اگر آپ شیعہ اسلام پر بات کریں تو کہتے ہیں کہ یہ روافض اور کافر ہیں اور اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اگر آپ تصوف پر بات

کریں تو جواب آتا ہے کہ یہ مشرک ہیں اور اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اگر آپ افغانستان، صومال، سوڈان، سعودیہ یا ایران پر بات کرنا چاہیں تو جواب آتا ہے کہ یہ ممالک اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اگر آپ پاکستان اور عراق میں شیعوں کے قتل پر بات کرنے کی کوشش کریں تو کہا جاتا ہے کہ یہ جہادی اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اگر آپ طالبان اور اس کے جیسے دیگر مسلح اسلامی دہشت گرد گروہوں اور ان کے معصوم لوگوں پر خودکش حملوں کی بات کریں تو جواب پھر یہی آتا ہے کہ ہم سے طالبان کی بات نہ کریں یہ جہادی اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے، اور اگر آپ کہیں کہ جناب ان کی اسوہ حسنہ تو رسول ہیں جس کی سنت پر وہ عمل کرتے ہیں تو بھی یہی جواب آتا ہے کہ خود رسول اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے..(مذاق).

اس کے بعد اگر آپ کوئی حدیث پیش کریں تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور ضعیف احادیث سے استدلال جائز نہیں حالانکہ وہ خود ایسی احادیث سے استدلال پیش کرتے نظر آتے ہیں لیکن جب آپ کی باری آتی ہے تو یہ احادیث ظالمانہ اور جعلی احادیث بن جاتی ہیں جو اسلام کی نمائندگی نہیں کرتیں، اور اگر آپ صحیح حدیث پیش کریں تو کہتے ہیں کہ آپ کو اس حدیث کو کسی دوسری حدیث کے سیاق میں سمجھنا چاہیے اور اسے قرآن اور اس کے ناسخ و منسوخ اور طالع اور مطلوع کے گورکھ دھندے کے ساتھ منسلک کرنا چاہیے، لیکن اگر صحیح حدیث کچھ زیادہ ہی خرافات پر مشتمل ہو تو پینترا بدل کر کہتے ہیں کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے یا ساری احادیث پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا یا پھر یہ اسرائیلیات میں سے ہے، اگر آپ ترمذی سے کوئی حدیث پیش کریں تو کہتے ہیں بخاری سے پیش کرو اور اگر آپ بخاری سے پیش کریں تو کہتے ہیں کہ مسلم کے ہاں اس کا ذکر نہیں حالانکہ ترمذی بھی صحیح حدیث کی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اور ان ساری صحاح کتبِ احادیث پر بارہ سو سال سے اس امت اور اس کے علماء وفقہاء کا اجماع چلا آرہا ہے اور اب بھی تمام فتاوی انہیں کتبِ احادیث پر انحصار کرتے ہیں اور ساری خوفناک شریعت انہی زرد کتابوں سے لی جاتی ہے!

احادیث سے بھاگنے کا راستہ نہ ملے تو کہتے ہیں کہ ہم سے قرآن کو سامنے رکھ کر بات کریں، اگر آپ قرآن کی خرافات سامنے لے آئیں تو کہتے ہیں کہ قرآن کو اپنی مرضی سے سمجھنے کی کوشش نہ کریں پھر جب آپ قدیم مفسرین کی تفاسیر پیش کرتے ہیں جیسے طبری وغیرہ تو کہتے ہیں کہ نہیں جی یہ تفاسیر درست نہیں بلکہ یہ تو کچھ لوگوں کا اجتہاد ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ مفسرین انسان ہیں! اس پر اگر آپ کہیں کہ جناب اگر مفسرین انسان ہیں اور ان کی یہ تفاسیر غلطیوں پر مشتمل ہیں تو انہیں کچرے میں پھینک کر جدید افکار کو کیوں نہیں اپنا لیتے تو کہتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے اور ما فرطنا فی الکتاب من شیء!!!!!!!!!!

اگر آپ کہیں کہ جناب پتھر کو چومنا بھی بت پرستی ہی ہے تو اسے مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اور یہ مقدس پتھر ہے.. بھئی بت پرستوں کے پتھر بھی تو مقدس ہی تھے آخر فرق کیا ہے؟

اگر آپ کہیں کہ قرآن میں کوئی سائنسی اعجاز نہیں تو کہتے ہیں کہ آپ اسلام کو نہیں سمجھتے کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمام جدید دریافتیں قرآن میں پہلے سے ہی موجود ہیں اس پر اگر آپ کہیں تو پھر صدیوں سے اس کتاب کو رٹنے کے باوجود آپ ان سائنسوں کو کیوں دریافت نہ کر سکے تو حد درجہ بودی منطق پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ نے کفار کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے یہ دریافتیں کرنے کے لیے وقف کر دیا ہے!! اگر آپ کہیں کہ قرآن میں بلاغت نہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کو عربی نہیں آتی اس پر اگر آپ کسی عربی دان سے دلیل دیں تو کہتے ہیں یہ مستشرقین سے متاثر ہے!!

یہاں تک پہنچ کر آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ جدت پسند مسلمان گرگٹ کی ہی کوئی نوع ہے!

اگر آپ ان جدت پسند مسلمانوں سے اسلام میں آزادی اور رواداری کے بارے میں پوچھیں تو فوری جواب آئے گا کہ "لا اکراہ فی الدین" اور یہ کہ "لکم دینکم ولی دین" اور چونکہ اسلام کو ہر حال میں پاک صاف کر کے پیش کرنا ہی ان کا نصب العین ہوتا ہے وہ آپ کو یہ نہیں بتاتے کہ یہ آیات تلوار کی آیت جسے "آیۃ السیف" کہا جاتا ہے سے منسوخ ہیں اور پوری سورۃ التوبہ مخالف کو قتل کرنے پر اکساتی ہے اس کے باوجود ان کا اصرار ہوتا ہے کہ اسلام امن، بھائی چارے اور رواداری کا دین ہے!!!!!

پھر اگر آپ ان سے پوچھیں کہ اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیے تو کیا آپ کو یہ قبول ہے؟ کیا آپ کو مسلمان عورت کی کسی غیر مسلم کے ساتھ شادی کو قبول کرتے ہیں؟ کیا آپ معاشرے کے تمام غیر مسلم طبقات کو وہی حقوق دینے پر رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں؟ کیا آپ کو شرم آتی ہے جب خطیبِ مسجد منبر پر بیٹھ کر اور لاؤڈ سپیکر میں گلا پھاڑ کر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو گالیاں دیتا ہے اور انہیں بندر اور خنزیر کی اولاد قرار دیتا ہے؟ اس سب پر آپ کو تیار اور طویل لنگڑی تاویلیں سننے کو ملیں گی جن کے اختتام پر آپ کو یقین ہو چلے گا کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے عقیدے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کیونکہ اس کی نظر میں ہر حال میں اور ہمیشہ بس اسلام ہی حق اور درست ہے باقی ساری دنیا احمق گدھی اور خنزیر کی اولاد ہے.. اور اسلام اور مسلمان دودھ کے دھلے ہوئے ہیں اور ہر وقت امن کی فاختائیں اڑاتے رہتے ہیں..

اگر آپ پوچھیں کہ کیا آپ اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں چاہے مجتہد کا اجتہاد اس نتیجے پر پہنچے کہ نقاب فرض نہیں اور ہم جنس پرستی قومِ لوط کا فعل نہیں تو فوری الزام آئے گا کہ آپ کافر ہیں اور فحاشی چاہتے ہیں...

اگر آپ سوال کریں کہ کیا آپ اپنے مسلمان بھائی اسامہ بن لادن، ایمن الظاہری، ابو مصعب الزرقاوی ودیگر جہادیوں کی متشدد کاروائیوں کی مذمت کرتے ہیں جو انہوں نے جنت میں بہتر حوروں کے حصول کے چکر میں کیے؟ اس پر ان کا فوری جواب یہ آتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا اور یہ حقیقی اسلام نہیں ہے، مگر ان کے جرائم کی مذمت کبھی نہیں کرے گا...

اگر کوئی اسلام پر تنقید کرے تو فی الفور ان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں کہ "آپ کو میرے عقیدے کا احترام کرنا چاہیے" یا "آپ کو اسلام پر بات کرنے کا حق نہیں کیونکہ آپ اسے نہیں جانتے" یا "آپ کو اسلام پر تنقید کا حق نہیں" یا پھر "آپ یہودی یا عیسائی ہیں اور اسلام کو بدنام کرنا چاہتے ہیں" وغیرہ وغیرہ...

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام انسانی فکر کی آخری حد ہے؟ اور کیا اسے تنقید سے استثناء حاصل ہے جبکہ دیگر تمام مذاہب پر ہمیشہ سے تنقید ہوتی آرہی ہے اور اب بھی ہورہی ہے؟

خود قرآن دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو گدھوں سے تشبیہ دینے سے باز نہیں آتا (جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا پھر انہوں نے اسکے حامل ہونے کا حق ادا نہ کیا انکی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں—سورۃ الجمعۃ آیت 5) یعنی عیسائی گدھے کی طرح ہیں جن کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہیں مگر انہیں نہیں پتہ کہ یہ کتابیں ہیں یا..

دہری مشکل یہ ہے کہ اسلام ایک قدیم اور ابتدائی دور کی فکر ہے جو عظیم فلاسفروں کے فکری تصنیف کی سطح کا نہیں ہے مگر مسلمان کی تربیت اسلامی فکر کی عظمت اور قدسیت پر اس قدر شدت سے کی جاتی ہے کہ وہ کسی بامقصد گفتگو کے قابل ہی نہیں رہتا اور قرآن اور اسلام پر تنقید برداشت کرنا تو گویا اس کے لیے تقریباً ناممکن امر ہوتا ہے اور زندگی اور موت کا سوال بن جاتا ہے گویا کہ اسلام تمام تر انسانی فکر کے ماحاصل سے بلند وبرتر ہو..

اسلام بھی انسان کی دیگر ازمنہء قدیم کی فکری دریافتوں کی طرح ایک دریافت ہے اور انسانی میراث سے کسی طور الگ نہیں، اس پر بھی اسی طرح تنقید ہونی چاہیے جس طرح دیگر فکری تصانیف پر کی جاتی ہے... بصورتِ دیگر مسلمانوں کو خود کو انسان کہنا چھوڑ دینا چاہیے.

عقل مندوں کو سلام!

سائنس، مذہب اور مولویات

ہمارے ایک انجنئیر دوست نے اس بلاگ پر کہی گئی باتوں سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی جانچ کے لئے ایک کتاب کا لنک دیا، جسکا مطالعہ بجائے خود ایک دل گردے کا کام ہے، لیکن مناسب نہ تھا کہ اس سے صرفِ نظر کرتے، چنانچہ پڑھا۔

یقین نہیں آتا کہ اس بے دردی سے حقائق کو موڑ توڑ کر بھی پیش کیا جاسکتا ہے، عوام الناس کے لاجک سے نابلد ہونے، کسی عقیدے کی خواہش اور جذبات کا بڑا فائدہ اٹھایا گیا ہے چنانچہ سوچا کہ تھوڑا تھوڑا کرکے اس کتاب میں بیان کئے گئے دعووں کے بارے میں کچھ بیان کرنا چاہئے۔

Appeal to Authority، اس کی ایک شکل یوں ہے کہ ایک شخص کسی ایسے موضوع پر کلام کرتا ہے کہ جس پر اسے سند حاصل نہیں ہوتی۔ یعنی ایک شخص کا غیر متعلقہ موضوع پر کلام کرنا اور نتیجہ نکالنا یا فیصلہ صادر کرنا۔ ایسے فیصلوں یا نتائج کی درستگی مشکوک یا غلط بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر اکثر اوقات یوں ہوتا ہے کہ اس مغالطے کا شکار لوگ اوپر بیان کئے گئے شخص کے نکالے گئے نتائج اور فیصلوں کو درست اور حرفِ آخر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جبکہ در حقیقت ایسا ممکن بھی ہے کہ وہ درست ہو یا کسی حد تک درست ہو، اور ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ سرے سے درست ہی نہ ہو۔
مصنفِ کتاب، میری معلومات کی حد تک اس کتاب میں احاطہ کئے گئے دو میں سے کم از کم ایک موضوع میں کوئی سند نہیں رکھتے، ذکر تو انہوں نے ایک کا بھی نہیں کیا لیکن یہ فرض کرتے ہوئے (جو کہ غلط بھی ہو سکتا ہے)، کہ ایک اسلامی مدرسے میں انہوں نے چھ سال میں نہ صرف علومِ اسلامیہ پہ عبور حاصل کیا بلکہ وہ علمِ ادیان میں غیر متنازعہ سند بھی رکھتے ہیں۔ البتہ سائنس میں انکی حیثیت غیر مسلمہ یعنی غیر مستند ہے۔ چنانچہ ایک غیر مستند عالم کی حیثیت سے یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف سرے سے غلط ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ درست یا کسی حد تک درست ہو۔ ہمارے پاس یہ جانچنے کے لئے ایک اوزار موجود ہے، اور وہ ہے منطق اور تجزیہ۔

آیئے اس اوزار کی مدد سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انکی تصنیف میں کتنا وزن ہے۔

مولاناوحیدالدین صاحب نے اپنی کتاب "مذہب اور سائنس" میں فکری نوعیت کے بعض مسائل سے کلام کیا ہے تا کہ اسلام کے اعتقادی نظام کا دفاع کیا جا سکے۔ دیباچے میں وہ فرماتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات مجرد تعلیمات (سرسری تعلیمات یا خلاصہ) نہیں ہیں بلکہ کائنات کی ابدی صداقتیں ہیں اور ہماری نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان صداقتوں سے ہم آہنگ کریں، نہ تو ہم انکا انکار کر سکتے ہیں نہ غیر جانبدار ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ دوسرا رویہ ہم کو ابدی تباہی سے ہمکنار کرے گا۔ یوں وہ دیباچے ہی میں اپنے قارئین کو ایک منطقی مغالطے میں گھیرنے کی (کافی حد تک کامیاب) کوشش کرتے ہیں کہ جسکا نام ہے "Appeal to the Consequences of a Belief"۔ اس مغالطے کی ایک شکل جو مصنفِ کتاب نے استعمال کی ہے وہ عام فہم الفاظ میں کچھ یوں ہو گی۔ "یہ بات حقیقت ہے، کیونکہ اگر لوگوں نے اس بات کو حقیقت نہ جانا تو اسکے منفی نتائج نکلیں گے"۔

انہی کی اس اپروچ کو اپناتے ہوئے ہم یہ دعویٰ داغتے ہیں کہ ایک نیکی کا اور ایک بدی کا خدا ہے، نیکی کا خدا کمزور ہے جبکہ بدی کا خدا طاقتور کیونکہ اکثر وہی غالب آتا ہے اور یہ ایک ابدی صداقت ہے، دنیا اسی لئے قائم ہے کہ بدی موجود ہے اگر آج بدی ختم ہو جائے تو دنیا کا فنا ہونا اٹل ہے، ہمارے پاس بدی کے خدا کی پرستش اور ہر سال اسے ایک خوبصورت کنواری لڑکی کی بھینٹ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، ہم یا تو اسکے پیروکار ہیں یا پھر اسکے مخالف اور نیکی کے کمزور خدا کے پیروکار۔ بدی کے خدا کی پرستش نہ کی گئی تو اسکے بھیانک نتائج نکلیں گے اور ازلی تباہی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔

آگے چل کے مصنف کہتے ہیں کہ مذہب کی تعلیمات کو قطعی صورت میں جاننے کا ذریعہ وحی ہے، خدا کے پیغمبروں نے ان تعلیمات کو براہِ راست خالقِ کائنات سے لیکر انسانوں تک پہنچایا اور شکوک کے ازالے کے لئے کہا کہ "کیا تم اس خدا پر شک کرتے ہو جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا"۔ یعنی فطرت کو خدا کی دلیل قرار دیا۔
دوسرے لفظوں میں مصنف کہہ رہے ہیں کہ مذہبی تعلیمات کی قطعیت سے جانکاری ممکن نہیں جب تک کہ براہِ راست خالقِ کائنات سے رابطہ نہ ہو۔ جبکہ راہِ راست رابطہ صرف انبیاء ہی کے لئے مختص ہے تو ایک عام انسان کے لئے سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ان بزعمِ خود انبیاء کی "بتائی" ہوئی پر ایمان لے آئے۔ تو بات یہاں پھر ایمان والی ہی آجاتی ہے، کہ قطعی جانکاری ایک عام انسان کے لئے ممکن نہیں، وہ صرف انبیاء ہی کے پاس ہے۔ تم بس ایمان لے آؤ ان کے کہے پر۔

عامیوں کے لئے فطرت ہی خدا کی دلیل ہے، کہ دیکھو پرندہ اڑ رہا ہے، دیکھو سورج نکلتا اور غروب ہوتا ہے، دیکھو زمین کیسے اپنے مدار میں چکر کاٹتی ہے، دیکھا کیسے دن رات ہوتے ہیں، دیکھو کون بارش برساتا ہے، کون ہے "خدا" کے سوا کون یہ کر سکتا ہے۔ بہت عمدہ۔ مزید کچھ کہنے کی احتیاج رہ جاتی ہے اس دلیل پر؟

اب بکر کہتا ہے کہ ایک نیکی کا خدا ہے اور ایک بدی کا۔ نیکی کا خدا اچھی والی بارش برساتا ہے جبکہ بدی والا خدا زلزلے اور طوفانی بارشیں برساتا ہے۔ اچھا خدا کبوتر اور فاختائیں بناتا ہے اور بدی کا خدا گدھ اور سانپ جیسی مخلوقات بناتا ہے۔ دیکھو سامنے کی بات ہے کہ بنگال میں ایک ٹین کی بنی مسجد پر بجلی گری اور کتنے سارے نمازی ماہِ رمضان میں، نماز کے دوران کوئلہ بن گئے، کون ہے سوائے بدی کے خدا کے جو ایسی طاقت کا مظاہرہ کر سکے؟ تو لازم ہے کہ ہم اسی کی اطاعت کریں، کہ بدی کا خدا ہی ہمیں نقصان دے سکتا ہے اور نیکی کے خدا پر زبردست ہے، تو ہم کیوں نہ اسکو راضی کر کے نقصان سے بچ جائیں۔
جی مولانا صاحب، آئیں اور ثابت کریں غلط اس فطری مظہر سے نکالی گئی دلیل کو۔

آگے فرماتے ہیں کہ جدید مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مذہب انسان کا فطری جذبہ ہے، کسی طرح اسکو انسان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ بس اتنا کہہ کر اس سے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش غلو کے ضمن میں آئے گی کیونکہ یہی "جدید" مطالعہ کہ جسکی وہ مثال دے رہے ہیں آگے جاکے کہتا ہے کہ یہ مطالعہ قطعی طور پر خدا کا وجود یا غیر وجود ثابت نہیں کرتا، نہ ہی حیات بعد الممات کا ثبوت دیتا ہے۔ صرف اس بنیاد پر کہ ایک خاص طرز پر سوچنا نسبتاً آسان ہے، اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ آسان طرزِ سوچ درست بھی ہے۔
جیسا کہ کہتے ہیں کہ بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اور انکی فکر بہت فطری ہوتی ہے۔ اب اگر تقریباً ہر بچہ اپنے باپ کو سوپر مین اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک سمجھتا ہے تو یہ اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ ایسا ہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے پتہ چل جاتا ہے کہ اسکا باپ بھی اربوں دیگر افراد کی طرح ایک عام انسان ہے۔

اسی مطالعے کے مطابق یہ دلیل کسی خالق کے انکار کے حامی بھی اسی صداقت سے استعمال کرسکتے ہیں کہ جس طرح کسی خالق کے اقرار کے حامی۔ چنانچہ مصنف نے اپنے ذاتی خیالات و عقائد کے رنگ میں اس مطالعے کے نتائج کو رنگ ڈالا۔ اور اس جانبداری کی بھی وجہ ہے۔ وہ یہ کہ دینی مدرسے کا کورس کرنے کے بعد جب مصنف کے سامنے مذہب کے حوالے سے سوال رکھے جاتے تھے تو وہ ششدر رہ جاتے تھے کہ انکے جواب تو انکو بتائے ہی نہیں گئے، چنانچہ انہوں نے سائنسی جنرلز اور دیگر مشہورِ زمانہ لوگوں کی تصنیفات کے مطالعے کئے اور اسمیں سے اپنے حق میں دلائل تلاش کرنا شروع کئے۔ یعنی کہ ریسرچ کے شروع ہی میں بجائے غیر جانبداری اختیار کرنے کے، انہوں نے دین و مذہب کو حق گردانتے ہوئے اسکے دفاع میں دلائل اکھٹے کرنا شروع کئے جو کہ کسی طور سے درست طریقہ نہیں چنانچہ کچھ اچنبھے کی بات نہیں کہ انکے اخذ کردہ نتائج میں جابجا مختلف مغالطے، اور آدھی سچائیاں، اور دوسروں کی بات کی غلط اور بے موقع تشریحات موجود ہیں۔

یہ تو تھااس کتاب کے دیباچے کا تجزیہ۔نتائج مرتب کرنا ہم قاری پہ چھوڑتے ہیں۔باقی کتاب پہ گفتگو اسی عنوان کے تحت جاری رکھیں گے۔تب تک کے لئے اجازت

سائنس، مذہب اور مولویات (حصہ دوم)۔

گزشتہ سے پیوستہ

مولاناوحیدالدین کی کتاب مذہب اور سائنس کے دیباچے کے تجزیئے پہ ہمارے محترم دوست نے (انکا جواب دینے کی بجائے) کچھ اعتراضات اٹھائے کہ ہم نے محض دیباچے ہی پہ بات کی ہے اور کتاب کے اصل موضوعات کو گول کر گئے۔جبکہ ہمارا مقصد قارئین کو یہ دکھانا تھا کہ جس کتاب کا حوالہ ہمارے محترم دوست نے دیا ہے اسکی بنیاد ہی منطقی مغالطوں اور حقیقت سے چشم پوشی پہ رکھی گئی ہے، چنانچہ ہم اسکے بقیہ مضمون سے کیا توقع رکھیں گے۔انکا گلہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یاد رہے کہ بلاگ کی کم سپیس اور ہماری دیگر مصروفیات کے باعث پوری کی پوری کتاب پہ تبصرہ کرنا ممکن نہیں، چنانچہ ہم انہی نقاط پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے کہ جن کا ذکر ہمارے فاضل دوست نے اپنے اعتراضات میں کیا ہے۔ویسے بھی یہ کتاب اس قابل ہرگز نہیں کہ اس پہ اپنا یا قاری کا وقت برباد کیا جائے۔

اپنی کتاب کے پہلے باب "طرزِ استدال" میں استدلال کے چوتھے طریقے کو انہوں نے مذہب کے اثبات اور دلیل کے لئے استعمال کیا ہے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ طرزِ استدلال کا چوتھا طریقہ کیا ہے اور انکا یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے کہ مذہب کے دعوے بھی اس طرزِ استدلال کے میعار پہ پورے اترتے ہیں۔

طرزِ استدلال کا چوتھا انداز: "مشاہدات و تجربات، خواہ ٹیکنیکل سائنس کی روسے اصل دعویٰ سے براہِ راست مربوط نہ ہوں مگر اسکے حق میں جائز قرینہ پیدا کرتے ہوں، نیز انکی توجیہ کے لئے کوئی بہتر تصور موجود نہ ہو تو ایسے استدلال کو بھی جائز اور صحیح استدلال سمجھا جائے گا۔"

اسی کے ذیل میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ مذہب کے خلاف دورِ جدید کا مقدمہ دو متضاد پہلوؤں کا حامل ہے، ایک طرف کہا جاتا ہے کہ مذہب چونکہ ایسے عقائد کا مجموعہ ہے جسکا مظاہرہ ممکن نہیں، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جدید دریافتوں نے مذہبی عقائد کو باطل ثابت کر دیا ہے۔

چنانچہ مولانا صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اگر مظاہرہ ممکن نہیں تو اسکا رد کس طرح ممکن ہے؟

باشعور اور جدید طبقہ جب کہتا ہے کہ مذہبی عقائد کا مظاہرہ ممکن نہیں ہے تو اس سے مراد مذہب کے ایسے دعوے ہیں کہ جنکا کوئی ثبوت موجود نہیں اور عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً "مذہب کا جنوں، فرشتوں، خدا اور شیطان کے وجود کا دعویٰ۔ چونکہ انکا کوئی ثبوت نہیں ہے سوائے مذہب کے دعوے کے اور انکے اثرات مشاہدے اور تجربے سے جانچے بھی نہیں جاسکتے چنانچہ اہلِ علم و عقل ایسے دعووں کو مسترد کر دیتے ہیں۔

کیونکہ جو دعویٰ بلا ثبوت پیش کیا جائے، وہ بلا ثبوت رد کیا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف جب مذہب سائنس میں انگلی کرنے لگتا ہے اور بتاتا ہے کہ زمین چپٹی یا سپاٹ ہے، سات آسمان تہ درتہ موجود ہیں، پہاڑ زمین پہ میخوں کی مانند ہیں، آسمان پہ نظر آنے والے ستارے دراصل شیطانوں کو مار بھگانے کا آلہ ہیں اور اس طرح کی دوسرے دعوے جو کہ سائنسی حقائق سے متصادم ہوتے ہیں، مذہب پیش کرتا ہے تو پھر انکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غیر سائنسی دعوے باطل ہیں اور انکا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سائنس کے مشاہدات انکو غلط ثابت کرتے ہیں۔

یعنی مذہبی دعووں کا وہ حصہ جو بلا شواہد ہے، وہ بلا شواہد رد کیا جاتا ہے اور جو حصہ براہِ راست مشاہدے اور تجربے سے متصادم ہے، وہ ثبوت کے ساتھ رد کیا جاتا ہے۔ دلیل برائے دلیل کے بجائے اگر مولانا صاحب تھوڑا سا عقلی تجزیہ کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو انکو اس میں کوئی تضاد نظر نہ آتا۔

"کسی مغربی عالم" (جو کہ اتفاق سے ایک امیریکن یونیورسٹی میں "مذہبیات" کے پروفیسر ہیں) کی اس بات ("جو چیز قابلِ دریافت ہے وہ غیر اہم ہے اور جو چیز اہم ہے وہ قابلِ دریافت نہیں") کو اقتباس کرتے ہوئے مولانا صاحب نے قطعاً "غلو سے کام لیا اور اپنے قارئین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اسکے لئے علمی بد دیانتی سے زیادہ نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہوں۔

قصہ یوں ہے کہ ان مذہبی پروفیسر (مغربی عالم) صاحب نے سائنسدانوں کی اس بات کو کہ "قابلِ مشاہدہ کائنات کے ساتھ کائنات کا بہت بڑا حصہ جو قابلِ مشاہدہ نہیں ہے، بہت ہی اہمیت کا حامل ہے" کے اصل معنی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسکو اپنے مفاد کے لئے استعمال کر لیا، بالکل ویسے ہی جیسے ایک دہریہ کہے کہ مسلمان تو خود "لا الہ" کہہ کر اللہ کا انکار کرتے ہیں۔

کائنات بہت وسیع ہے، اسمیں کوئی شبہ نہیں۔ ہم اسکے بارے میں کلی طور پر سب کچھ نہیں جانتے، یہ بھی درست ہے، لیکن اس عدم ثبوت کو بطور ثبوت پیش کرنا اور طرزِ استدلال کا چوتھا انداز کہنا کم از کم علمی و عقلی وطیرہ نہیں ہو سکتا۔

اسکے بعد مولانا صاحب، نظریہ ارتقاء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسکا موازنہ مذہب کے ساتھ کرتے ہوئے شکوہ کرتے ہیں کہ جس طرزِ استدلال سے ارتقاء کو اثبات ملتا ہے، اسی طرزِ استدلال کو مذہب کے ثبوت کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ ساتھ میں مولانا صاحب یہ بھی بار بار واضح کرتے ہیں کہ انکا مقصد ارتقاء کی تصدیق یا تردید نہیں ہے (ہو بھی کیسے، ارتقاء کا تعلق سائنس اور علم سے ہے) بلکہ محض دلیل دینا ہے۔ یعنی دلیل ایسے علم سے پیش کرتے ہیں کہ جن پہ انکو کوئی اتھارٹی (اور سمجھ) نہیں۔

ارتقاء اب محض ایک نظریہ نہیں رہا بلکہ اسکا ثبوت لیبارٹری میں حاصل کیا جا چکا ہے۔ اور جس وقت انہوں نے کتاب لکھی تھی، تب بھی اس وقت تک ملنے والے شواہد ارتقاء سے بہتر کوئی تھیوری پیش نہیں کر رہے تھے چنانچہ انکا مذہب اور ارتقاء کا تقابلی جائزہ تب بھی غلط تھا اور اب تو بالکل ہی بے بنیاد ہو جاتا ہے۔

آگے مولانا صاحب نے فرمایا کہ سائنس میں جتنے بھی تسلیم شدہ نظریات ہیں سب کا یہی حال ہے کہ کبھی خود اصل نظریات مشاہدہ یا تجربہ میں نہیں آئے بلکہ خارجی مشاہدات کے سبب نظریات قائم کر لئے گئے۔

یہاں مولانا صاحب مذہب کو تسلیم شدہ نظریات کے برابر لے آئے۔ بہتر یہی ہو گا کہ میں ایک سادہ ہی مثال سے انکے اس دعوے کی حقیقت قارئین کے سامنے کھول کر بیان کر دوں تا کہ انکا وقت اور بلاگ پہ جگہ نہ ضائع ہو:

کشش ثقل ایک مسلمہ نظریہ ہے۔ باآسانی آزمایا جاسکتا ہے، مولانا صاحب گھر کی چھت سے کودکے اور زمین پہ نہ گر کے بڑے آرام سے ثابت کر سکتے تھے کہ یہ نظریہ باطل ہے۔ جبکہ دوسری طرف مذہب کا نظریہ ہے کہ خدا ہر ایک کو دیکھ رہا ہے۔ اسکو کیسے ثابت یارد کیا جائے، چلیں جس طرح کشش ثقل کو ہم دیکھ نہیں سکتے مگر اسکا اثر محسوس کر سکتے ہیں، اسی طرح اللہ کے دیکھنے کو دیکھنے پہ ہم اصرار نہیں کریں گے صرف اسکے اثرات بیان فرمادیں جو ہر چیز پر یکساں ہوں۔ (اور یہ ایک نہایت سادہ سی مثال ہے، ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ مذہب کا دعویٰ تسلیم شدہ نظریات کی طرح بالواسطہ طور پر بھی نہیں جانچا جاسکتا)۔

مذہب کے اس دعوے کو کہ جسکو ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا، جسکے اثرات ہی کو نہیں جانچا جاسکتا، بقائمی ہوش و حواس ہم کسطرح سائنس کے مسلمہ نظریئے کے مقابل لاسکتے ہیں؟

مولاناوحیدالدین اور برٹرینڈ رسل

آگے میرے فاضل دوست نے خصوصی طور پر مولانا صاحب کی کتاب کے برٹرینڈ رسل سے متعلقہ حصے کی نشاندہی کی۔ اس حصے میں مولانا صاحب نے بتایا کہ کس طرح انہوں نے برٹرینڈ رسل کا مطالعہ کیا اور اسکے نتیجے میں انکا ایمان مزید پختہ ہوا۔

آگے چل کے اس باب میں انہوں نے مغالطوں ہی کے زور پہ اپنا استدلال قائم کیا۔ جگہ کی محدودیت کے باعث میں یہاں محض انکے "کلیدی نقاط" کہ جن پہ انہوں نے اپنی دلیل کی بنیاد رکھی ہے پیش کروں گا اور ساتھ میں اس منطقی مغالطے کا حوالہ دوں گا کہ جسکا شکار انہوں نے اپنے قاری کو بنانے کی کوشش کی ہے۔

صفحہ نمبر 25، "اس مطالعہ کے مطابق رسل کے لئے صرف دو راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ یا تو تشکیک کی پناہ گاہ میں چلا جائے یا پھر مذہب کی صداقت کا اعتراف کرلے"۔

یہ False Dilemma نامی مغالطہ ہے جسمیں دو ہی راستے پیش کرکے ایک کو برا اور دوسرے کو اچھا گنوا کے اپنی پراڈکٹ بیچی جاتی ہے۔

صفحہ نمبر 29 میں آسان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ ارتقاء کا سبب غیر معلوم ہے اور سبب کے نامعلوم ہونے کے باوجود وہ نظریہ یقینی کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اگر ہو سکتا ہے تو پھر مذہب کا استدلال کیوں کمزور؟

یہ You too fallacy کی ایک بہترین مثال ہے۔ کہ اگر ایک فریق غلط کام کرتا ہے تو دوسرے فریق کو بھی غلط کام کی اجازت ہے۔ چلیں اگر ہم ارتقاء کو اسکے یقینی ثبوت حاصل کر لینے تک پینڈنگ رکھ لیتے ہیں تو کیا مولانا صاحب بھی خدا اور مذہب کے یقینی ثبوت حاصل ہو جانے تک مصلے و تسبیح کو ایک طرف رکھ دیں گے ؟

صفحہ نمبر 30، "انسان ہمیشہ سے یہ مانتا رہا ہے کہ درخت اور انسان کو پیدا کرنے والا قادرِ مطلق ہے۔۔۔"

یہ Appeal to Common Practice ہے۔ کیا تمام انسان ہمیشہ ہی سے یہ مانتے رہے ہیں کہ سب کچھ پیدا کرنے والا قادرِ مطلق خدا ہے ؟ جی نہیں۔ چنانچہ پوری نوعِ انسانی کو شامل کرنا غلط ہے۔ ہاں اکثریت کہہ دیتے تو بات سفید جھوٹ دے دائرے سے باہر ہوتی، لیکن پھر بھی منطقی مغالطہ اپنی جگہ ہی رہتا۔

صفحہ نمبر 31، "میں سمجھتا ہوں کہ برٹرینڈ رسل کا مذکورہ بالا بیان ایک ملحد کی زبان سے مذہب کی اصولی صداقت کا اعتراف ہے"

Straw man fallacy اسمیں اپنے حریف یا شکار کا ایک فرضی خاکہ اپنی منشا کے مطابق بنا کے اسکو با آسانی چاروں خانے چت کر دیا جاتا ہے (جو کہ "علمائے حق" کا پسندیدہ مشغلہ ہے)۔۔

اگر مولانا صاحب برٹرینڈ رُسل کی عقلی برتری نہ سمجھ پائے اور اسکی منطق انکے سر پر سے گزر گئی تو یہ بات رُسل کو کم فہم نہیں بلکہ ثابت کرتی بلکہ مولانا صاحب کی کج فہمی پر دلیل ہے۔

فی الحال اسی پہ اکتفا کرتے ہیں، اگرچہ برٹرینڈ رسل والے باب کے مطالعے کے بعد سے دہائی قارئین کو دورِ جدید کے مذہب کا پوسٹ مارٹم یعنی "جائزہ" پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ تو کسی فراغت کے وقت ضرور دیکھیں گے کہ یہاں کون کونسے گل کھلے نظر آتے ہیں۔

سب ملیدا ہے

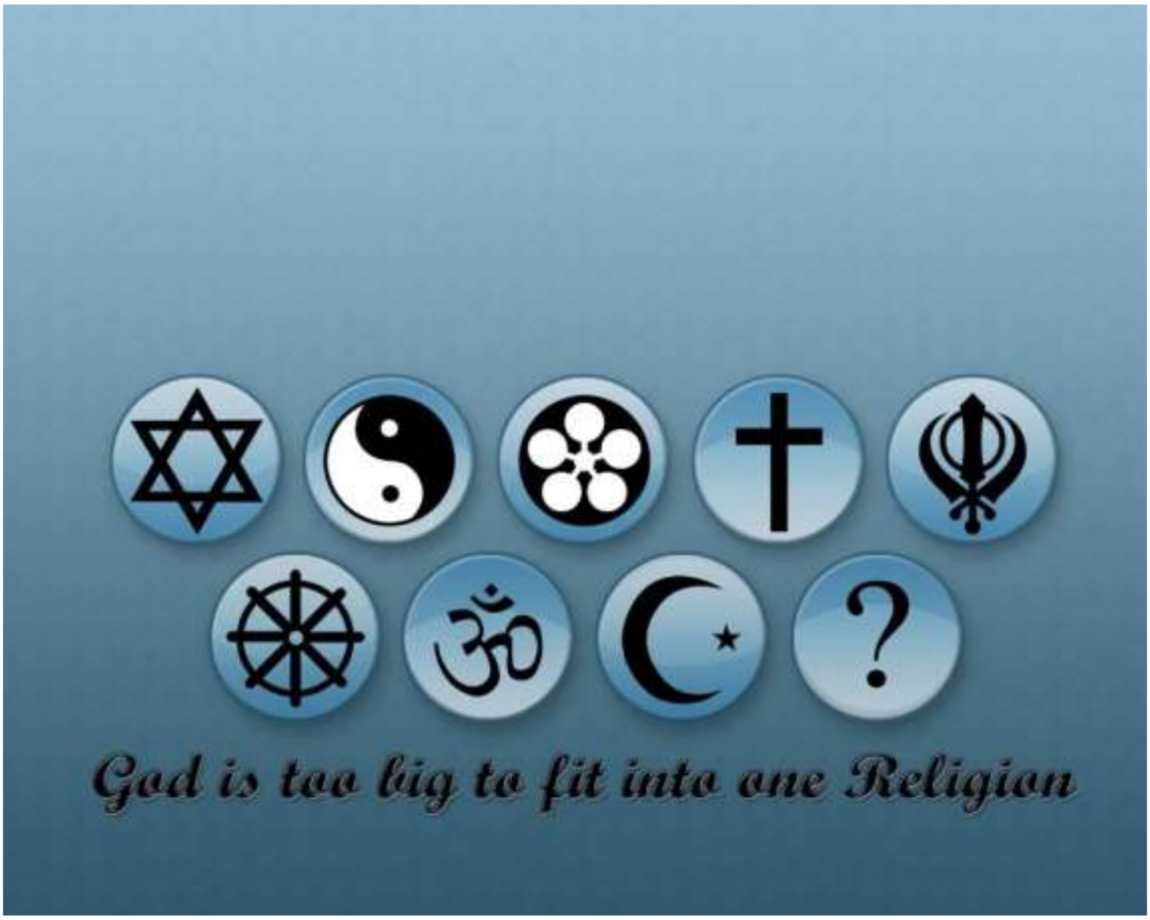

فلپائن کے ڈورمائٹ نے بار کے دروازے پر کہا: مجھے نہیں پتہ خدا ہے یا نہیں، تاہم میں مذاہب کی پرواہ نہیں کرتا، یہ اس بار کی دیواروں پر سجی شراب کی بوتلوں کی طرح ہیں، سب تمہیں پینے کی دعوت دے رہی ہیں.

ڈورمائٹ کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ اتنے خداوؤں اور اتنے سارے مذاہب کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ سبھی درست ہوں؟

اس سوال کا سیدھا جواب "نہیں" میں ہے، بلکہ سب کے غلط ہونے کے امکانات کہیں زیادہ ہیں.

مذاہب اور خداوؤں کے اس انبار میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ہی دینِ حق ہے اور اس کا خدا ہی "اصلی" خدا ہے جبکہ صاحب کے پاس ایسی کوئی حجت یا دلیل نہیں ہے جو اسے دوسرے خداوؤں سے ممتاز کرتی ہو.

سوال یہ ہے کہ اسلام ہی کیوں عیسائیت کیوں نہیں؟ عیسائیت ہی کیوں بدھ مت کیوں نہیں؟ بدھ مت ہی کیوں ہندو مت کیوں نہیں؟ ایک ہی خدا کیوں بہت سارے خدا کیوں نہیں؟ آخر کس بنیاد پر مؤمنین نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ خدا ایک ہی ہے؟ جس دلیل سے ایک خدا ثابت ہوتا ہے اسی دلیل سے تین، چار اور دس بھی تو ثابت کیے جاسکتے ہیں؟!

کہیں پر ایک لطیفہ پڑھا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے بڑھ گئی ہے اور ایک پادری نے میچ کے اس نتیجے سے مایوس ہو کر یا شاید غصے میں آکر خود کو آگ لگالی، مگر کیا کسی مذہب کے ماننے والوں کی زیادہ تعداد اس مذہب کو "حق" بنا دیتی ہے؟ یہ معیار تو ہندو مت کو حق بنا دے گا اور آبادی کے تفاوت کی وجہ سے وقتاً فوقتاً بدلتا رہے گا.

ہر مذہب کے ماننے والے، اس پر اعتقاد رکھنے والے اور اس کا دفاع کرنے والے ہوتے ہیں جیسے قدامت پرست روایات کو بچانے کے لیے تبدیلی کے خلاف مدافعت کرتے ہیں، لیکن یہ سب مذاہب بیک وقت حق پر نہیں ہو سکتے، مگر کیا یہ سب غلط ہو سکتے ہیں؟

بہت ممکن ہے.. انسانی تاریخ کے مختلف مراحل میں پوری دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں مذاہب نمودار ہوئے اور آج تک ہو رہے ہیں جیسے 1974 کو فرانس میں رائیلی مذہب کا ظہور ہوا، اسی طرح کیا پتہ کبھی ریت کے ممالک میں سے کسی میں کبھی کوئی نیا دین نمودار ہو جائے اور چھا جائے؟ کیا کوئی ضمانت دے سکتا ہے!؟

کیا آپ اس وقت دنیا میں رائج تمام مذاہب کی گنتی کر سکتے ہیں؟ میرا یقین کریں یہ بہت مشکل کام ہے.. اور اب اگر میں آپ کو پوری انسانی تاریخ میں نمودار ہوئے مذاہب کی گنتی کرنے کا کہوں تو؟

ناپید ہو جانے والے قدیم مذاہب اور آج کے دور میں رائج مذاہب کا تنوع مؤمن کے عقیدے پر شک کے سائے بکھیر دیتا ہے، کیا اپنے آپ کو اس بات کا قائل کر لینا کہ جو ہمارے پاس ہے وہی دینِ حق ہے اور یہی اکلوتا مذہب ہے جو "حق الیقین" ہے کافی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے ناپید ہو جانے والے مذاہب کے ماننے والوں کا بھی بعینہ یہی خیال تھا، وہ بھی اپنے دین سے

اتنے ہی مخلص تھے جتنے کے آج کے مؤمن ہیں، وہ بھی اپنے دین کے لیے جان تک دینے کے لیے کمربستہ رہتے تھے تاہم یہ خلوص اور جاں نثاریاں ان مذاہب کو تاریخ کے اوراق میں گم ہونے سے نہ روک سکیں.

آج کی جدید ثقافت جب ماضی کی کسی تہذیب کے اعتقادات کے بارے میں بات کرتی ہے تو اس کے لیے "میتھالوجی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے یونانی میتھالوجی، مصری میتھالوجی، آشوری، سومری وغیرہ وغیرہ.. مگر میتھالوجی ہے کیا؟ میتھالوجی کا مطلب اساطیر اور خرافات ہے، میتھالوجی اصل میں اس ناپید ہو جانے والی تہذیب کا مذہب اور اس میں رائج اساطیر اور خرافات ہیں.

اگر ہم عیسائیوں کے اعتقادات کو بیان کرنے کے لیے اسے "عیسائی میتھالوجی" کہہ دیں یا اسلامی عقائد کو "اسلامی میتھالوجی" کہہ ڈالیں تو کیا ہوگا؟ مؤمنین غصے میں اچھل کر چھت سے جا لگیں گے اور ہمیں یقین دلائیں گے کہ ہمارے پاس ماضی کی قوموں کی طرح کوئی خرافاتی اساطیر نہیں ہیں.. ماسوائے کیپٹن نوح کے جنہوں نے محض لکڑی سے ٹائٹینک سے بھی بڑا جہاز بنا کر اس میں ساری دنیا کے جانور کنٹینروں میں لوڈ کر دیے اور طوفان کے بعد سب کو اسی طرح سارے برِ اعظموں میں پھیلا دیا.. یا مردوں کو زندہ کرنے اور پانی پر چلنے والا سپائیڈر مین.. یا پھر پرندوں اور چیونٹیوں سے بات کرنے والا بیٹ مین اور ایسی ہی دیگر حقیقی کہانیوں کے.. یقین کریں کہ ان حقیقی کہانیوں کے علاوہ ان مذاہب میں کوئی خرافاتی اساطیر نہیں ہیں..

اگر میں مؤمنین سے کہوں کہ ہماری ملکی وے کہکشاں تب بنی جب زیوس کی بیوی اپنے آدھے دیوتا اور آدھے انسان بیٹے کو دودھ پلا رہی تھی کہ اچانک وہاں ہرکولیس آ گیا اور اس نے زیوس کی بیوی سے اس کا بچہ زبردستی اس کی گود سے چھین لیا اور اس کا دودھ اچھل کر خلاء میں پھیل گیا جس سے ہماری ملکی وے کہکشاں بن گئی، تو مؤمنین ہاہاہاہا کہتے ہوئے ہنسیں گے اور اسے ایک خرافت قرار دیں گے.

اس پر اگر میں کہوں کہ پھر اس کا کیا جس نے زمین اور آسمان سات دن میں بنا ڈالے اور ستاروں کو سو واٹ کے بلب قرار دے دیا، اور شہابیوں کو شیاطین کو مار بھگانے کے میزائل بنا دیے، اور سورج کو رات کو عرش میں غائب کر دیا.. تو یہاں ان کے چہروں پر اچانک "ہاہاہاہا" کی پُر تمسخر ہنسی کی بجائے حماقت آلود گہری سنجیدگی طاری ہو جائے گی اور وہ کہیں گے کہ نہیں یہ خرافات نہیں ہیں بلکہ عین حقیقت ہے!!؟؟

عیسائیت، اسلام اور آج کے دیگر مذاہب کے قصوں کو "میتھالوجی" کہنا انتہائی درست اور دقیق ترین اصطلاح ہے، خاص طور سے جبکہ سوقیانہ زبان میں میتھالوجی کا مطلب "جھوٹ" اور "بکواس" کے سوا اور کچھ نہیں لیا جاتا.. آج کے عیسائی، مسلمان

اور دیگر مذاہب کے ماننے والے قدیم تہذیبوں کے مذاہب کو جعلی اور جھوٹے مذاہب قرار دیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ جو کچھ ان کی اپنی زنبیل میں ہے اس پر بھی یہی وصف اور یہی معیارات لاگو ہوتے ہیں.

یعنی مؤمنین سمجھتے ہیں کہ وہ تمام پرانے مذاہب اور ان کے سچے ماننے والے سب غلطی پر تھے جبکہ بعینہ اسی وقت وہ اپنے حالیہ دین کو عین حق سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سارے قدیم وجدید مذاہب جیسے عیسائیت اور اسلام عقلی و تحقیقی جانچ کے آگے ایک منٹ بھی نہیں ٹک سکتے.

بتوں کی پوجا پر مسلمان ہندو پر ہنستا ہے کہ اس کی عقل کی مت ماری گئی ہے جو پتھروں کی عبادت میں لگا ہوا ہے جن سے نا نفع ہو سکتا ہے نہ نقصان، مگر ہندو کہتا ہے کہ یہ تو بس "علامتی" ہے اصل خدا تو اوپر ہے، عیسائی مسلمان پر ہنستا ہے کہ دیکھو ایک پتھر کو چومنے کے لیے یہ لوگ اتنی دھینگا مشتی کرتے ہیں اور ایک پتھر کے کمرے کے گرد بے وقوفوں کی طرح چکر لگاتے ہیں، مگر مسلمان کہتا ہے کہ یہ بھی بس "علامتی" ہے اور اصل خدا تو اوپر ہے!! پھر عیسائی گرجے میں جاکر گھٹنوں کے بل جھک کر بن باپ کے ایک بیٹے کے پُتلے کے آگے گڑگڑانا شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی بس "علامتی" ہے اور اصل خدا تو حسبِ سابق اوپر ہی ہے.. یہ سارے "عقل مند" آشوریوں، یونانیوں اور فرعونوں کے قدیم خداؤوں پر ہنستے ہیں.. ہر کسی کو اپنا دین "حق" نظر آتا ہے اور دوسرے کا باطل.. بعینہ اسی طرح جس طرح کہ قدیم دنیا کے مؤمنین اپنے دین کو عین حق گردانتے تھے.

آج کے عیسائی مؤمن اور مسلمان مؤمن کے درمیان قدرِ مشترک صرف ایمان ہے اور ایمان ایک اندھا یقین ہے، بعینہ یہی وہ معیار تھا جس کی بنیاد پر قدیم مذاہب کے مؤمنین نے اپنے اعتقادات کی عمارتیں استوار کیں اور اپنے خداؤوں اور بتوں کو حق سمجھا.. گویا کہ ان سارے مذاہب میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی جانچ پڑتال سے ان میں سے کسی ایک کی حقانیت ثابت کی جاسکے سوائے اندھے ایمان اور اپنے دین کے لیے جان

دینے کے جذبے کے، اعتقاد کی مضبوطی اور ایمان پر ثابت قدم رہنے کے علاوہ مؤمنین کے پاس کچھ نہیں ہے، یہ بالکل کنگلے ہیں.. یہ وہی فرسودہ بضاعت ہے جو سابقہ لوگوں کے پاس بھی تھی، تو کیا یہ دلیل ہے؟ مذاہب کے اس انبار میں حق مذہب کیسے تلاش کیا جائے؟ ان میں سے کون دوسرے کو کچرے میں ڈالے گا؟ یا یہ سارے ہی کچرا ہیں؟

یوں شروع میں اٹھائے گئے سوال کا جواب بدستور "نہیں" میں ہی ہے مگر اس سے کیا پتہ چلتا ہے؟ اس سے دو باتیں پتہ چلتی ہیں، اول یہ کہ ان مذاہب میں سے کسی ایک پر ایمان اس کی صحت وصداقت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ ہر کوئی اپنے دین کو حق سمجھتا اور خود کو "ناجی فرقہ" قرار دیتا ہے، اور دوم یہ کہ جب ہم مذاہب کے اس تنوع کو دیکھتے ہیں خاص طور سے ایک مذہب کے اپنے کئی فرقے، ان کی تقسیم اور آپس کے اختلافات تو ہمیں ان میں تضادات کے انبار ملتے ہیں، اس طرح اس جنجال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ سب حق پر ہوں بلکہ ان سب کے غلط ہونے کا امکان ان کے صحیح ہونے کی نسبت کہیں زیادہ ہے.

بعض لوگ نجات، رحمت، حقیقتِ کُل کی بات کرتے ہیں اور ان سب کو مبہم باتوں اور جھوٹ میں مِلا جُلا کر کبھی سائنسی اعجازات اور کبھی طبعی مظاہر اور قیامت سے ڈر کے طور پر پیش کرتے ہیں تاہم ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی ایک بھی علمی اور عقلی دلیل نہیں ہے جو علم، حقائق اور منطق کے سامنے ٹھہر سکے.

اوپر کی تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایک معیار بھی ہے؟ ان مذاہب سے کشید کردہ کوئی ایک معیار جس کو کسوٹی بنا کر وہ دین یہ ثابت کر سکے کہ وہی دینِ حق ہے؟ صرف ایک! افسوس کہ ایک بھی نہیں ہے.. ایمان کو معیار نہ بنائیں.. مجھے یہ نہ بتائیں کہ عیسائیوں یا مسلمانوں کی آبادی اتنی ہے نا ہی یہ کہ فلاں مذہب دنیا میں سب سے زیادہ مانا جاتا ہے، نہ مرغے کی بانگ اور نہ کوئیل کی کوکو...

اور چونکہ اب تک ان میں سے کوئی ایک بھی ہیرو ایسا معیار لے کر نہیں آ سکا لہذا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے کسی طرح کی کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے، لہذا اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے ہی غلط ہیں.

اور خدا نے عورت کو بنایا

مگر کیا خدا مرد ہے؟

سنۂ1956ء میں فرانسیسی فلم اور خدا نے عورت کو بنایا ریلیز ہوئی.. اسی فلم سے بریجٹ بارڈو نامی قاتل حسینہ پہلی بار عالمی سینما میں متعارف ہوئی اور ساٹھ کی دہائی کی جنسی علامت (sex symbols) کے طور پر ابھری.. صرف یہی نہیں بلکہ اس فلم نے امریکی سینما کا رخ ہی بدل دیا جس نے میرلین مونرو کو متعارف کرا کر فرانسیسیوں کو بھرپور جواب دیا.

اس فلم پر کیتھولک چرچ نے کافی شور مچایا، دراصل یہ فلم کسی بھی طرح سے فرانسیسی سینما کی نمائندگی نہیں کرتی تھی، نہ کہانی اور نا ہی اس کا انداز تاہم بارڈو کا شوہر راجر ویڈیم جو فلم کا ڈائریکٹر تھا اس فلم میں اپنی بیوی کا حسن اچھی طرح نمایاں کرنے میں کامیاب رہا، اس خوش قسمت آدمی نے یکے بعد دیگرے دنیا کی خوبصورت ترین عورتوں سے شادی کی، بریجیٹ بارڈو کے علاوہ اس نے جین فونڈا اور کینڈی ڈارلنگ سے بھی شادی کی اور کئی سال کیتھرین ڈینیو کے ساتھ مفت میں گلچھرے اڑاتے ہوئے گزارے.

بہر حال موضوع کی طرف واپس آتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر خدا نے عورت کو بنایا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ مرد ہے؟

تاریخ میں زیادہ تر مذاہب نے خدا کو تمام تر مردانہ خصوصیات سمیت ایک بھرپور مرد کے طور پر پیش کیا، اس خدا کی داڑھی تھی، مسل تھے اور بعض اوقات جنسی اعضاء بھی، ابراہیمی یا توحیدی کہلائے جانے والے مذاہب جن میں یہودیت، اسلام اور عیسائیت شامل ہیں خدا ہمیشہ ایک مرد سے ملتا جلتا رہا.

مذہبی فکر خدا کی جنس کے حوالے سے کافی خلفشار کا شکار رہی ہے خاص طور سے یہ ابراہیمی مذاہب جب ان کا سامنا کلاسیکی یونانی فلسفے سے ہوا، یونانیوں کے ہاں خدا مردوزن پر مشتمل تھے اور ہر ایک کا اپنا ایک کام تھا مگر ان ابراہیمی مذاہب نے ان سب خداؤوں کو ایک ہیرو میں مدغم کرنا چاہا.. مردوزن، خیر و شر حتی کہ وہ مسخ شُدہ شکل سامنے آئی جو اب ہمارے سامنے ہے.. توحید یا یکجائی کے خیال کی کنفیوژن میں ان تینوں مذاہب نے خدا کو بیچ والا بنا کر بے جنس کر دیا یعنی نا مرد اور نا ہی عورت.

عیسائیوں کی اس ویب سائٹ پر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے:

سوال: کیا خدا مرد ہے یا عورت؟

جواب: مقدس کتاب میں غور کرنے سے ہم پر دو حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں: پہلی حقیقت یہ ہے کہ خدا روح ہے، اس کی کوئی صفات یا بشری حدود نہیں ہیں، دوسری حقیقت یہ ہے کہ تمام دلائل اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خدا نے خود کو انسانیت کے سامنے ایک مرد کی شکل میں ظاہر کیا، شروع میں ہمیں خدا کی حقیقی نیچر کو سمجھنا چاہیے، خدا ایک شخص ہے، یہ واضح

ہے کہ اس کے پاس ایک شخص کی سی صفات ہیں جیسے عقل، ارادہ سمجھداری اور جذبات، اور خدا انسانوں سے رابطہ میں رہتا ہے اور ان سے تعلقات قائم رکھتا ہے اور یہ کہ خدا کے ذاتی اعمال مقدس کتاب کے ذریعے واضح ہیں.

اس جواب سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت خدا کو مرد سمجھتی ہے کیونکہ اس کی تجلی مرد کی صورت ہوئی نہ کہ عورت کی صورت میں.. ایک اور جگہ کسی نے سورہ اخلاص کا یہ پوسٹ مارٹم کیا ہے:
خدا نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ اس نے ولادت نہیں کی (لم یلد) اور نا ہی اس کی ولادت ہوئی (لم یولد) ولادت عورت کی خصوصیات میں سے ہے چنانچہ خدا عورت کی صنف میں سے ہے کیونکہ وہ قابلِ ولادت ہے اور چونکہ اس نے ابھی تک ولادت نہیں کی (لم یلد) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مستقبل میں ولادت نہیں کرے گا خاص طور سے سورت کا خطاب ماضی میں ہے.

بہر حال مسلمان خدا کی جنس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے کہ ہی (یا شی) نا مرد ہے اور نا ہی عورت اور اس کے جیسا کچھ نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پھر خدا کے تمام ننانوے نام مذکر کی صفت میں کیوں آئے ہیں اگر وہ مرد نہیں ہے تو؟ کیا سوواں نام مؤنث تھا اور ہمیں نہیں بتایا گیا؟

ریت کے خدا کی جنس کے تعین میں یہ تضاد اور انکار کیوں ہے؟ میں نے اس مدعے کے تضادات پر کافی غور وخوض کیا ہے، کیا اس لیے کہ خدا کامل اور پرفیکٹ ہے اور کمال مرد کی صفات میں سے ہے کیونکہ عورت کا کمال آدھا ہے اور وہ مرد کی نصف ہے؟

میرا خیال ہے کہ محمدی دعوت کے آغاز میں خدا واضح طور پر ایک مرد تھا مگر یونانی فلسفے کے اثر کی وجہ سے مؤمنین خدا کی مردانہ حیثیت سے دستبردار ہوگئے اور اسے ایک "بے جنس" ہستی بنا دیا گیا تا کہ اس کے کمال کو بغیر تضادات کے مکمل کیا جا سکے..
مگر کیا اس سے مسئلہ حل ہو گیا؟

سورۃ الانعام کی آیت 101 میں فرمایا گیا ہے کہ:

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ

﴿۱۰۱﴾

وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اسکے اولاد کہاں سے ہو جبکہ اسکی بیوی ہی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

تو صاحبو "اسکے اولاد کہاں سے ہو جبکہ اسکی بیوی ہی نہیں" کا کیا مطلب ہے؟ یہی کہ وہ مرد ہے اور اگر وہ کوئی بیوی اختیار کر کے اس کے ساتھ سیکس کرے تو اس کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے! یوریکا.. وہ یقیناً مرد ہی ہے، سورہ اخلاص میں "لم یلد" سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ مرد ہے اس لیے اس کے ہاں ولادت نہیں ہوتی مگر وہ ابھی تک کنوارہ ہے اور اس نے شادی نہیں کی ہے.. لہٰذا جب وہ شادی کرے گا تب اس کے ہاں اولاد ہونا عین ممکن ہے.

مؤمنین جب خدا کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو ہمیشہ مذکر ضمائر کا ہی استعمال کرتے ہیں، وہ اسے ہمیشہ "ہو" کہتے ہیں نا کہ "ہی" اور اگر خدا بغیر جنس کے ہے تو کبھی مذکر (ہو) اور کبھی مؤنث (ہی) کا استعمال کیوں نہیں کیا جاتا؟ یا لغت میں ایک اور ضمیر شامل کیوں نہیں کیا جاتا؟

یقین کریں اگر کوئی خدا کے لیے مذکر کی بجائے مؤنث کا ضمیر استعمال کرے تو مؤمنین کو سخت غصہ آجائے گا، مگر کیوں؟ اس کی صرف دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں:

اول: یہ غصہ اس بات کی دلیل ہے کہ مؤمنین خدا کو مرد سمجھتے ہیں اور اسے مؤنث ضمیروں سے مخاطب کرنے کو اس کی توہین سمجھتے ہیں.

دوم: انہیں واقعی یقین ہے کہ خدا بے جنس ہے، مگر اس کی تانیث کو وہ اس کی توہین سمجھتے ہیں، ان کے لیے خدا کا مذکر ہونا ایک اچھی اور مثبت بات ہے مگر اس کی تانیث ان کے ہاں منفی اور نا قابلِ قبول ہے.

تاریخ کی تحریف

کہا جاتا ہے کہ تاریخ فاتح لکھتا ہے، یہ مقولہ اتنا دقیق نہیں ہے، کیونکہ اصل میں ایک تاریخ حقیقی ہوتی ہے اور ایک جعلی تاریخ ہوتی ہے، تاریخ ماضی کے واقعات کی تدوین کا علم ہے، ان واقعات کے واقع ہونے کے اثبات کے لیے کھدائیوں اور آثارِ قدیمہ کا سہارا لیا جاتا ہے اور قدیم تحریروں کی چھان پھٹک کی جاتی ہے تا کہ قدیم زمانے میں ہوئے واقعات کی جڑ اور حقیقت تک

پہنچا جاسکے، حقیقی تاریخ میں دیگر معلوم علوم کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے یعنی درست علمی انداز اختیار کرتے ہوئے دلائل اکٹھے کیے جاتے ہیں، جبکہ جعلی تاریخ کا تعلق شروع میں ذکر کیے گئے مقولے سے ہے.

مقنن تاریخ ایک قدیم صنعت ہے جس میں واقعات کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ ان کا حتمی نتیجہ پہلے سے طے شدہ قومی ومذہبی خواہشات کے عین مطابق ہو اور قاری کو قائل کیا جاسکے کہ کوئی پیغام ہے جسے تاریخ نے ثابت کیا ہے اور اسے چاہیے کہ وہ اسے سمجھے.

اس کی ایک مثال وہ آمرانہ نظام ہیں جو ایسے جھوٹے اور وہمی تاریخی دعوے قوم کو سناتے ہیں جو کبھی ہوئے ہیں نہیں تھے، مثال کے طور پر "سوریا الکبری" (عظیم سوریا) کا دعوی، تاریخ میں کبھی بھی ایسے کسی عرب نظام کا وجود نہیں رہا ہے جس میں وہ عناصر شامل تھے جنہیں سوریا کی البعث نگلنا چاہتی ہے.. نازیت اور آری نسل کی برتری جس کے لیے وہمی شہر تخلیق کیے گئے اور ان کی دریافت کے لیے وسطی ایشیا تک مہمیں بھیجی گئیں تاکہ اپنی برتر نسل کی جڑوں تک پہنچا جاسکے مگر یہ ساری مہمیں ناکامی سے دوچار ہوئیں.. عظیم صربیا جو تقریباً آدھے بلقان کو نگل کر غیر سلافی قوموں کو وہاں سے نکالنا چاہتا ہے.
نوے کی دہائی میں فیوم جانے کے لیے میں اور میرا رضاعی سعودی بھائی ریلوے سٹیشن پر ٹکٹوں کی قطار میں کھڑے تھے، ہمارے پیچھے کچھ چلبلی سی مغربی خواتین تھیں جو ارد گرد کے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں، ان کے پیچھے ایک کویتی لڑکا تھا جس کی عمر تقریباً سترہ سال رہی ہوگی، ان میں سے ایک خاتون نے مجھ سے اور اس کویتی لڑکے سے گفتگو شروع کردی، باتوں باتوں میں اس خاتون نے کویتی لڑکے سے سوال کیا کہ: عراق کے ساتھ اتنا ظلم کیوں ہو رہا ہے جبکہ وہ صرف اپنا وہ صوبہ واپس لینا چاہتا ہے جسے استعمار نے اس سے الگ کردیا؟ وہ بے چارہ لڑکا اس سے کہیں چھوٹا تھا کہ صدام حسین کے جھوٹے دعووں پر مبنی سیاسی بحث کر سکتا، چنانچہ میں نے اس خاتون سے عرض کیا کہ: محترمہ خلیج کا سیاسی ڈھانچہ اپنی اسی شکل میں کئی سو سالوں سے موجود ہے.. یہ ڈھانچہ سوریا، عراق، اردن اور تونس کے وجود سے بھی پہلے کا ہے، کویت نے تین سو سال پہلے سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ کئی سیاسی معاہدے کیے تھے جبکہ عراق اس وقت سلطنتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا، عراق کا مستقل سیاسی وجود بیسویں صدی کے آغاز میں ہی تشکیل پاسکا... اس پر اس محترمہ نے عرض کیا کہ: میرا مطلب ہے اس سے پہلے؟ میں نے کہا: اس سے پہلے عراق بالترتیب صفوی، عباسی، اموی اور خلفائے راشدین کے زیرِ تسلط تھا الا یہ کہ آپ کی مراد حمورابی کے دور سے ہو؟ یہ خاتون صدمے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں میری شکل تکتی رہ گئی..

جعلی یا محرف تاریخ سنجیدہ کالجوں اور جامعات میں –جن کا اسلامی دنیا میں کوئی وجود نہیں– نہیں پڑھائی جاتی کیونکہ اس تاریخ کی تنقیدی جانچ پڑتال نہیں کی گئی ہوتی اور نا ہی اس کے کوئی مادی آرکیالاجیکل ثبوت ہوتے ہیں، ایسی تاریخ کا سارا انحصار مقدس مصادر پر ہوتا ہے جیسے دیومالائی اساطیر، خرافات اور مذاہب.

اس قسم کی تاریخ کی پہچان مصنف کے انداز سے کی جاسکتی ہے جو تاریخ کے سنجیدہ محققین کی بجائے عوام الناس کو مخاطب کرتی ہے، ایسی تاریخ کے تمام مصادر بھی اسی طرح کے دیگر جعلساز ہوتے ہیں اور ہر کوئی دوسرے سے نقل کر رہا ہوتا ہے.

محرف تاریخ کسی منظر نامے کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے کہ اکادیمی سطح پر اس کی تصدیق نہیں ہوسکتی، عام طور پر ایسی تاریخ لکھنے والے کے دلائل کا مصدر خرافات، مقدس کتابیں یا اس کی مشتقات ہوتی ہیں، تاریخی حقائق کو بھی اس طرح موڑ توڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ وہ جعلی تاریخ سے ہم آہنگ ہو جائے.. یہودیوں کے قصے، ان کا مصر سے نکلنا، سمندر کا شق ہونا اور فرعون کا غرق ہونا تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے اور نا ہی کوئی تاریخی اثر اس واقعے کی تصدیق کرتا ہے، علمِ مصریات ایک باقاعدہ تصدیق شدہ علم ہے جسے آثارِ قدیمہ سپورٹ کرتی ہے اور یہ دنیا کی بہترین جامعات میں پڑھایا جاتا ہے مگر اس توراتی قرآنی قصے کا اس میں ایک یتیم تذکرہ تک نہیں ہے اور نا ہی عبرانیوں کا کوئی اتا پتہ ہے، یہ تاریخ ایک جعلی تاریخ ہے اور سوائے بنی اسرائیل کی خواہشات اور خرافات کے کچھ نہیں ہے، دنیا کی کوئی بھی جامعہ جسے اپنی اکادیمی حیثیت کی فکر ہے ایسی خرافات کبھی نہیں پڑھاتی، آج بھی یہودی "ارض المیعاد" میں اس سلیمانی ہیکل کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کا ذکر ان کے مؤرخین نے توریت کے خرافاتی مصدر کو بنیاد بنا کر کیا، آپ کا کیا خیال ہے کہ انہیں یہ سلیمانی ہیکل مل جائے گا؟ شاید کھڈے میں... جب تھک جائیں گے تو کہیں گے کہ شاید سلیمان کے کسی جن نے یہ آثار ان سے چھپا دیے.. آخر خرافات ہی تو خرافات کو جنم دیتی ہیں.. مصادر میں تضاد کی صورت میں بھی تاریخ کا جعلساز صرف اس چیز کا انتخاب کرتا ہے جو اس نتیجے تک لے جائے جس تک وہ پہنچنا چاہتا ہے.

زیادہ تر جعلی تاریخ ایسے ایجنڈوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اس وقت موجود تھے، یہ ایجنڈا برسرِ اقتدار کسی آئیڈیالوجی، گروہ یا بادشاہ کی تعظیم کے لیے ہو سکتا ہے، یا نسلی ایجنڈا بھی ہو سکتا ہے تاکہ کسی قوم کو کسی دوسری قوم پر برتری دلائی جاسکے یا پھر مذہبی ایجنڈا تاکہ کسی مخصوص مذہب کو دیگر مذاہب سے زیادہ عظیم بنا کر پیش کیا جاسکے.

جعلی تاریخ کو اس کے بیانی اسلوب سے بڑی آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے، اس کی زبان تاویلی ہوتی ہے، مثال کے طور پر عباس محمود العقاد کا "العبقریات" نامی سلسلہ کتب جس میں اسلامی شخصیات کو بڑے مثالی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ان کی غلطیوں کو "مصلحت" اور "خرد مندی" میں بدلنے کی کوشش کی گئی ہے.

ایک تاریخی جعلسازی مقامات سے متعلق ہے تاکہ انہیں حقیقت کا روپ دیا جا سکے جیسے غرق شدہ اٹلانٹس، یاجوج اور ماجوج کا ملک، سلیمان کی بادشاہت، نوح کی کشتی اور اس کی جودی اور عرارات پہاڑ پر موجودگی، فرعون کی غرق شدہ لاش جو رمسیس دوم کی ممی سے چپکا دی گئی ہے، یہ وہ تخیلاتی فرعون ہے جس کی کہانی بنی اسرائیل نے گھڑی ہے، یا غیر حقیقی شخصیات جیسے عبد اللہ بن سبا، خضر، شاہ آرتھر وغیرہ.. اپنے بچوں کو ایسی تاریخ کیسے پڑھائیں جو کہتی ہو کہ زندگی آسمان پر ایک شخص سے شروع ہوئی جس کا نام آدم تھا اور جب وہ سو رہا تھا تو خدا نے اس کی پسلی سے اس کے لیے ایک عورت نکال کھینچی پھر ان دونوں کو جنت سے دھکے مار کر نکال دیا کیونکہ انہوں نے ابو کی بات نہیں مانی اور فریج میں رکھے پھل کھا لیے؟.. اس سے بڑھ کر بچگانہ کہانی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے..؟! اسی طرح ابراہیم، اسماعیل اور ہاجر کا خرافاتی قصہ اور چھ سوپروں والا جبریل اور عبد المطلب جو ہاتھی کے کان میں کچھ بڑبڑاتا ہے اور وہ کعبے کو گرانے کا اپنا فیصلہ بدل لیتے ہیں پھر ان پر ففٹی ٹو ماڈل کے ابابیل بمباری کر کے انہیں تہس نہس کر دیتے ہیں.. کیا یہ سب خرافات روم کی افسانوی تاریخ اور ان دو بچوں کی کہانی سے مختلف ہے جنہیں ایک بھیڑیے نے دودھ پلایا؟

ریت کے ملکوں میں بچوں کو یہ ڈوز بچپن سے ہی دینا شروع کر دیے جاتے ہیں، جس دوران بچوں کو سائنس کی کلاس میں یہ بتایا جا رہا ہوتا ہے کہ مادہ ایٹموں پر مشتمل ہوتا ہے، تاریخ کی کلاس میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ فرشتے نامی نظر نہ آنے والی مخلوق نے غزوہ بدر میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ لڑی..؟! پھر بھلے مادہ اور اس کے ایٹم جائیں تیل لینے..!

اسلامی تاریخ کے مصادر تدوینی کے بجائے لفظی ہیں جیسے حدیث میں علم الاسناد جو سوائے سالوں سے چلتی زبانی قصے کہانیوں کے اور کچھ نہیں اور جسے انتہائی ابتدائی اور فرسودہ طریقے سے صدیوں بعد احاطہ تحریر میں لایا گیا.. اسی زمرے میں سیرت کی کتابیں بھی آتی ہیں جنہیں اسلام کی تاریخ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے.. اوپر سے یہ متون مقدس بھی ہیں جن پر طعن نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی دلیل یا اثر کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جس سے جعلسازی کی بو آتی ہے حالانکہ مسلمان خود کہتے ہیں کہ بعرہ بعیر کی موجودگی کی دلیل ہے.

میڈیا میں اس جعلی تاریخ پر مبنی ڈرامے، اور لیکچر اس جعلی تاریخ پر اعتقاد کو اور راسخ کر دیتے ہیں جیسے یہ واقعی حقائق ہوں.. جبکہ دوسری طرف ایسی تاریخ پر شکوک وشبہات ظاہر کرنے والوں کے گرد قانونی گھیرے تنگ کر دیے جاتے ہیں، ان پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں اور اگر بس چلے تو قتل بھی کر دیا جاتا ہے.

جعلی تاریخ کا انحصار تاریخی واقعات کو خرافات میں مدغم کرنے پر ہے تاکہ تاریخی حقیقت کو مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جاسکے جو نسلی، مذہبی، سیاسی یا قومی ہوسکتی ہے، ہارون الرشید اور صلاح الدین یا المعتصم سے منسوب خرافاتی روایات کو یاد رکھنا آسان ہوتا ہے اس لیے یہ ذہن میں معلق رہتی ہیں مگر ان کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے.. اس عورت کا قصہ کیسے ثابت کیا جائے جس نے چیخ کر "وامعتصماہ" کی ندا لگائی اور معتصم اپنی فوجوں کو لے کر عموریہ کی طرف چل پڑا؟ یہ کیسے ثابت کیا جائے کہ میری اینٹونیٹ نے واقعی یہ کہا تھا کہ یہ لوگ کیک کیوں نہیں کھاتے جب اسے بتایا گیا کہ لوگ اس لیے غصے میں ہیں کہ ان کے پاس کھانے کو روٹی نہیں؟ یہ تاریخ نہیں لوک کہانیاں ہیں جو فاتح کے پروپگنڈے کے ساتھ نمودار ہوئیں اور بچوں کو تاریخ کے طور پر پڑھائی گئی، امریکا میں ریڈ انڈین کی تاریخ دیکھ لیجیے کہ کس طرح وہ اس میں وحشی نظر آتے ہیں بجائے ایک ایسی قوم کے جو اپنی جان ومال اور وطن کا دفاع کر رہ تھی... کیا آپ نے ڈیزنی کی اس کہانی پر یقین کر لیا ہے کہ پوکاہونٹس نے جان سمتھ سے شادی کر لی اور اب وہ اس کے ساتھ جیمس ٹاون میں رہ رہی ہے؟
ریت کے ملکوں کی تاریخ اسی قسم کی جعلی تاریخ ہے جسے آپ سائنسی اعجاز کی طرح اسلامی تاریخی اعجاز کہہ سکتے ہیں تاہم یہاں اعجاز کا مطلب وہ جھوٹ ہے جسے حقیقت پر غالب کر دیا گیا ہے چاہے اس کے خلاف کتنے ہی دلائل کیوں نہ دستیاب ہوں.

قومی تاریخ بھی اسی طرح کی تاریخ ہوتی ہے، اس سے مجھے لیبی صحراء کے مرحوم کرنل کی یاد آتی ہے جس نے ایک دن خود کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ ریڈ انڈین دراصل لیبیا سے ہی نکلے تھے اور شیکسپیر درحقیقت ایک ملا یا عرب مولوی تھا جس کا اصل نام "شیخ الزبیر" تھا.. انگریز اس کا نام صحیح طرح سے بول نہیں سکے اور "شیک سوبیر" کہنے لگے جو بعد میں مزید بگڑ کر ولیم بن شیکسپیر بن گیا...!!

کبھی کبھی یہ جھوٹ ایک مختلف موڑ لیتا ہے جس میں کسی آرکیالاجیکل اثر کو دریافت کر کے اس کے گرد جھوٹ کے تانے بانے بُنے جاتے ہیں جیسے ریت کی عظیم مملکت میں موجود "مدائن صالح" جو اصل میں نبطی عبادت گاہیں ہیں لیکن انہیں قومِ عاد کی بقایا جات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جنہوں نے خدا کی اونٹنی اور اس کے نبی صالح کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلی تھی.. یا وہ پتھر کے مینار جنہیں شیطان کی نموداری کا مقام بتایا جاتا ہے اور جن پر حاجی پتھر اور کبھی کبھی جوتے مار کر اپنا غصہ نکالتے ہیں گویا کہ ابلیس بنفسِ نفیس ان کے سامنے تجلی کر گیا ہو.. اسی طرح میلاد کا غار، مسیح کا کفن وغیرہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے.

اسلام سے پہلے کا دور جسے نئے فاتح مذہب نے پروپگنڈے کے طور پر جاہلیت کا نام دیا اس کے بارے میں ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ اس تحریف شدہ جعلی تاریخ میں مذکور ہے اور اس پر اب تک کوئی سنجیدہ تحقیق نہیں کرنے دی جاتی، اس کے بعد کا اسلامی خونی دور جسے خلافتِ راشدہ کا نام دیا جاتا ہے ایک مطلق اور مثالی دور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس پر مساجد کے خطباء چیخ چیخ کر سپیکر پھاڑتے ہیں اور ہمارے نوجوان اس جھوٹ پر خود کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیتے ہیں.. اس کے بعد بنو امیہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور تاریخ کو ایک بار پھر اس نئے فاتح نے اپنی مصلحت کے لیے دوبارہ لکھا جبکہ دوسری طرف شیعہ اس کے بالکل ہی متضاد تاریخ تحریر فرما رہے تھے.. یہ ساری تاریخ اس زمانے کی مکاریوں، دھوکہ بازیوں، سیاسی چالوں اور پروپگنڈے پر مبنی ہے جو آج بھی ریت کے ملکوں میں رہنے والوں کے ذہن سے نکل کر نہیں دے رہی.

ریتیلے ملکوں کی تاریخ پر سنجیدہ تحقیق ہی ہماری آنکھیں کھول سکتی ہے کہ شاید ہم اس سے وہ سبق سیکھ سکیں جو ہمیں ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے بجائے ایک ایسی تاریخ پر رونے کے جس میں ہم نے تحریف کی پھر اس پر یقین کر لیا.

(شروع میں مضمون کا عنوان تاریخ کی تخریف رکھا پھر عین آخری لمحات پر میں نے خ کا نقطہ ہٹا کر اس میں "تحریف" کر دی)

کیا الحاد جرم ہے؟

کیا الحاد معاشرے کے افراد کو نقصان پہنچاتا ہے؟ کیا یہ چوری کرنے جیسا ہے؟ یا کسی بے قصور انسان کو قتل کرنے جیسا ہے؟ الحاد کے محض تصور کو ہی لوگ جرم کیوں سمجھتے ہیں؟ اگر میں چشمِ تصور میں ریشم کو عریاں دیکھوں تو کیا یہ کوئی ایسا جرم ہے جس کے ارتکاب پر قانون سزا دیتا ہے؟ یقیناً نہیں کیونکہ یہ محض ایک سوچ ہے اور ہر کوئی اپنی اپنی سوچ میں آزاد ہے.
الحاد کو جرم قرار دینے میں ایک خبیث تضمین ہے جس کا مقصد الحاد کو ایک غیر اخلاقی عمل قرار دینا ہے تاکہ اسے جرم بنایا جا سکے، بعض لوگوں کو تو یہ یقین ہوتا ہے کہ چونکہ آپ ملحد ہیں لہذا آپ یقیناً مجرم ہیں.. کیونکہ ان کے خیال میں ملحد ہونے کا مطلب ہے کہ آپ چور، ڈاکو یا قاتل ہیں جیسے دنیا کے سارے جرائم ملحد ہی کرتے ہوں!؟ اس دعوے کی سب سے خطرناک بات یہ مفروضہ ہے کہ اصل خدا پر ایمان ہے چاہے وہ بے دلیل و بے اثبات ہی کیوں نہ ہو.

جرم کے واقع ہونے کے لیے کسی مخصوص سلوک کا وقوع پذیر ہونا لازم اور شرط ہے، جیسے ٹریفک کا سگنل توڑنا، یا کسی کی مرضی یا علم کے بغیر اس کی چیزوں پر قبضہ جمانا وغیرہ لیکن الحاد سے ایسا کون سا سلوک واقع ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ جرم ٹھہرتا ہے؟ الحاد اپنے آپ میں کوئی سلوک نہیں بلکہ ایک فکر ہے، وہ ممالک جہاں بھگوان گنیش کی بجائے ریت کا خدا زیادہ پاپولر ہے الحاد کو جرم سمجھا جاتا ہے جو انتہائی درجے کی مبالغہ آرائی ہے ورنہ کسی کو تصور میں گالی دینا بھی قابلِ دست اندازی پولیس جرم ہونا

چاہیے!؟ جرم اور الحاد میں تعلق پیدا کرنا مؤمنین کی ایک ناکام کوشش ہے تاکہ لوگوں کو مذہب کی بوگس فکر سے زیادہ طاقتور اور معقول فکر سے دور رکھا جا سکے.

سوال کو دوسری طرح سے پیش کرتے ہیں.. کیا مذہب کے بارے میں حقائق بیان کرنا جرم ہے؟ ملحد تو بس ان حقائق کا ذکر کرتا ہے جن سے وہ اکثریت غافل ہے جنہیں بچپن میں مذہب فیڈر میں اور جوانی میں لاؤڈ سپیکروں سے فیڈ کیا جاتا ہے، الحاد کو جرم قرار دینا ناانصافی ہے کیونکہ اس طرح ریاست اپنے مؤمن اور غیر مؤمن شہریوں میں تفریق کرتی ہے، مؤمن شہریوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے مگر ملحد اور اس کی رائے کی نہیں، آخر سب برابر کیوں نہیں؟ اگر ایمان جرم ہوتا اور مؤمنین پر ایمان کے جرم کی پاداش میں کیس کیا جا سکتا تو کیسا لگتا؟!

مؤمنین سمجھتے ہیں کہ ان کے عقائد کے لیے – اپنی تمام تر خرافات سمیت – قوانین وضع ہونے چاہئیں تاکہ کوئی ان کا مذاق نہ اڑا سکے حالانکہ یہ امر بذاتِ خود ایک جرم ہے، اس سے معاشرے کے افراد کے درمیان مساوات ختم ہو جاتی ہے اور روشن تنقیدی فکر کا گلا گھٹ جاتا ہے.. جب الحادی تنقید کے آگے ان کی خرافات ٹک نہیں پاتیں تو سب سے آسان کام انہیں یہی لگتا ہے کہ اسے جرم قرار دے دیا جائے جو ایک طرح سے شکست تسلیم کرنا ہے.

اگر آپ کسی مؤمن سے سب سے بڑے گناہ کے بارے میں پوچھیں (داڑھی کاٹنا نہیں ہے :D) تو وہ آپ کو بتائے گا کہ یہ شرک ہے.. یہی وہ گناہ ہے جس کی بخشش نہیں.. قتل اور آبروریزی نہیں.. آپ قتل کر کے اور آبروریزی کر کے خدا کے حضور "توبۂ نصوح" کر سکتے ہیں کہ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں.. سب سے بڑا جرم ریت کے خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرنا ہے، ملحد سے نفرت کی اصل یہی ہے.. یہ اس قدر اہم نہیں ہے کہ آپ قتل نہیں کرتے، ڈاکے نہیں ڈالتے کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ آپ کا یہ کہنا اہم ہے کہ ریت کا خدا وجود نہیں رکھتا.

اس کا صاف مطلب ہے کہ اسلام کی اخلاقی اقدار میں بہت بڑی خرابی ہے، ان کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ عقیدہ انسانیت سے بڑھ کر ہے، یہ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، مؤمنین ڈرپوک لوگ ہوتے ہیں، وہ مجھول سے اور جہنم میں جانے سے ڈرتے ہیں.. یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے مذاہب اپنے مرید جمع کرنے میں کامیاب ہوئے، یعنی عقل سے نہیں بلکہ مجھول سے خوفزدہ کر کے، مگر یہ سب ڈرامہ بازی ملحد کے ساتھ کام نہیں کرتی.. وہ کسی بھوت سے نہیں ڈرتا اسی لیے الحاد کو جرم قرار دینے کی ضرورت پیش آئی.. ملحد کی فکر کو جرم قرار دے کر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں خوفزدہ کر کے ان سے ان کی عقل چھین لیں گے!!

جہاں جرم ہوتا ہے وہاں اس جرم کا ایک عدد شکار بھی ہوتا ہے، الحاد کے جرم میں شکار کون ہے؟ کیا بغیر شکار کے جرم ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں، تو پھر یہاں شکایت گزار کون ہے؟ مؤمنین یہ نہیں سمجھ پا رہے کہ ہم سنہ 710ء میں نہیں ہیں، اس زمانے میں ان کی واپسی کی تمام مضحکہ خیز کوششیں عبث ہیں، تیزی سے ترقی کرتی اور ہر لحظہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی دنیا میں انہوں نے خود کو مسخرہ بنالیا ہے.. آج کی پیچیدہ دنیا انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہی ہے.. وہ ان کا انتظار کرنے کے لیے کبھی نہیں رکے گی.. یہ سارے ہتھکنڈے ان کے کچھ کام نہیں آنے والے.. ملحد ان کے دشمن نہیں بلکہ وہ خود اپنے دشمن آپ ہیں، خلفائے راشدین کا متنازعہ سنہری زمانہ گزر گیا اور کبھی عود کر نہیں آئے گا، عباسی، اموی اور عثمانی سلطنتوں پر کب کی تاریخ کی گرد جم چکی ہے.. ہم ایک بالکل ہی الگ اور جدید دنیا میں رہتے ہیں جس میں عقل کو مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا.

جادوگریاں

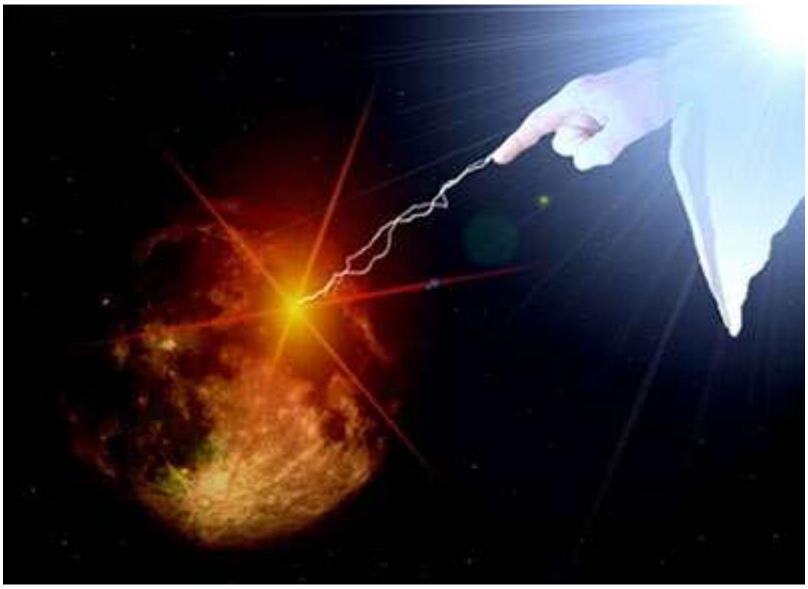

کوالالمپور ایئرپورٹ پر ایک عدد کھجور کے ڈبے پر یہ حدیث دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا:

"جس شخص نے صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالیں اس دن اسے نہ زہر نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ جادو" (حوالہ)

میں کسی بھی مؤمن کو یہ چیلنج کرنے کے لیے تیار ہوں کہ وہ پہلے یہ سات عجوہ کھجوریں کھالے اور اس کے بعد کوئی کیڑے مار دواء پی لے اور خود ہی دیکھ لے کہ حدیث میں جو بات کی گئی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ؟! اور میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی بھی مؤمن بشمول وہ بھی جو حدیث کی حقانیت کا ہر وقت راگ الاپتے رہتے ہیں اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے.. 😀

بہر حال اس حدیث میں جادو کا ذکر کوئی پہلی بار نہیں ہوا، اسلام میں جادو ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس کے لیے ایک سورت بھی مختص ہے جیسے سورۃ الفلق.. ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ نظر حق ہے.. پھر سلیمان اور اس کے اڑتے جن اور بھوت.. اور فرعون اور اس کے جادو گر وغیرہ بھی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مذاہب اور جادو میں کوئی دیرینہ تعلق ضرور ہے، ماہرینِ اینتھروپالوجی Anthropology یقین دلاتے ہیں کہ انسانی ارتقاء میں مذہب کی ایجاد کی جڑیں جادو میں پیوستہ ہیں.

جب عدمِ دریافت کی وجہ سے علم کسی مظہر کی وضاحت نہیں کر سکتا تو مؤمن کہتے ہیں کہ یہ ان کے خدا نے کیا ہے یا تخلیق کیا یا بنایا ہے یا پھر یہ ایک طرح سے کوئی جادو ہے.. مگر کیسے..؟ بس ایسے ہی کن فیکون.. جیسے کوئی جادو گر ٹوپی میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے خرگوش یا کبوتر نکال لیتا ہے، کیا اس کے لیے توجیہ کی ضرورت نہیں ہے کہ خدا نے یہ کام کیسے کیا؟ مگر افسوس آپ کو ایسے سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ خدا نے یہ کیا کیسے یا وہ کیا وجہ تھی جس کے چلتے اس نے یہ سب کیا.. کیونکہ جیسا کہ سب جانتے ہیں اسلام میں ایسے سوال کرنا کفر ہے اور عام طور پر ایسے سوالوں کے آخر میں "استغفر اللہ" لگا کر بات ختم کر دی جاتی ہے.

چیزوں کو تخلیق کر کے وجود میں لانے کے لیے خدا کون سا میکانزم استعمال کرتا ہے؟ جسموں میں روح کیوں ڈالتا ہے جبکہ وہ انہیں بغیر روح کے تخلیق کرنے پر قادر ہے؟ کیا خدا کی اس جادوئی طاقت کی کوئی حد ہے جو طبعی قوانین کی مخالفت کرتی ہے اور طبیعات، کیمیاء، منطق اور عقل سے متصادم ہے؟ پہلے کہا جاتا تھا کہ خدا بارش بنا کر ہماری طرف بھیجتا ہے، معرفت میں ایک خلاء تھا جسے مذہب نے جادوئی توجیہ سے پُر کیا، خدا ایک جادوئی چھڑی گھماتا ہے اور پانی سے بھرے بادل اڑتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور جہاں چاہتا ہے برس پڑتے ہیں.. علم نے آکر بارش کے اسباب دریافت کیے، ہم سے کہا جاتا تھا کہ زلزلے، لاوے اور طوفانوں کی وجہ خدا کا غضب ہے اور لوگوں کو سزا دینے کی اس کی خواہش کی عکاس ہیں.. ایک بار پھر علم نے آکر بتایا کہ زلزلے اور طوفان کسی جادو گر کی جادوئی چھڑی کی کارستانی نہیں.. الغرض جو بھی کچھ ہوتا ہے اس کی علمی توجیہ ہوتی ہے مگر ایسی کوئی توجیہ کیوں نہیں ہے کہ خدا یہ سب کرتب کیسے انجام دیتا ہے؟

کن فیکون کا انقلابی نظریہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی طرح دماغ میں نہیں بیٹھتا کیونکہ یہ جادو کی طرح ہے، خدا، اس کے انبیاء، دین کے ٹھیکیدار پادری، مولوی، پنڈت اس کا کوئی شافی جواب نہیں دے سکتے.. کن فیکون کا نظریہ وضاحت و تفہیم کی طاقت سے عاری ہے اور صرف جادوئی طاقت پر انحصار کرتا ہے.. یہ ایسا اس لیے ہے کیونکہ خدا نے اسے ایسے ہی بنایا ہے اور اسی میں اس کی حکمت ہے… حکمت؟ یقیناً وہ آپ کو یہ نہیں بتا پاتے کہ یہ حکمت کیا ہے.. وہ آپ کے سوالوں کے براہ راست جواب دینے کی بجائے خدائی جادو کی کہانی سے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں.

اپنی مقدس کتابوں میں شیخ چلی جیسی کہانیاں سنانے کی بجائے یہ خدا ہمیں منطقی انداز میں یہ کیوں نہیں بتاتا کہ کائنات کو تخلیق کرنے سے پہلے وہ کیا کر رہا تھا؟ کیا خلاء میں اکیلا سو رہا تھا؟ کائنات کو بنانے کے لیے اتنے وقت کا انتظار کیوں کیا؟ اگر کائنات کو کن فیکون کہہ کر بنایا جاسکتا تھا تو اسے بگ بینگ سے کیوں شروع کیا؟ ہر لحظہ پھیلتی کائنات کی بجائے کائنات کو یکلخت وجود میں کیوں نہیں لے آیا؟.. یہاں کیسے، کیوں اور کب کا کوئی مطلب نہیں ہے.. یہاں سب جادو ہے.. چیزوں کی توجیہ میں مؤمن صرف جادوئی سوچ پر انحصار کرتا ہے.. کیا خدا کے پاس کائنات تخلیق کرنے کا کوئی سابقہ تجربہ ہے یا وہ بغیر کسی سابقہ تجربے کے کائنات تخلیق کر سکتا ہے؟ کس نے اسے تخلیق کرنا سکھایا اور اس سے پہلے وہ اپنی تخلیق کی جادوگرانہ صلاحیت کا استعمال کیوں نہیں کرتا تھا؟ تخلیق کی وجہ کیا ہے؟ کیا کھربوں سال کے انتظار کے بعد اچانک اس میں یہ طاقت آگئی؟

ہم سب اپنے تجربات سے سیکھتے ہیں اور بہتری کی طرف گامزن ہوتے ہیں.. خدا اپنے تجربات سے سیکھ کر اپنی جادوئی طاقت کو بہتر کیوں نہیں کرتا؟ کیا ہم آئی پیڈ کو کسی سابقہ تجربے کے بغیر بنا سکتے تھے؟.. یقیناً نہیں، ہم نے پہلے کمپیوٹر بنایا اور اس کے تجربے کی بنیاد پر آئی پیڈ.. پہلے ہم نے ٹیپ ریکارڈر بنایا، پھر واک مین اور پھر ہم آئی پوڈ بنانے کے قابل ہوئے.. مگر لگتا ہے کہ خدا اپنی معرفت کو ترقی نہیں دیتا، زمانوں سے جو کچھ اس نے بنایا ہے وہ ویسے کا ویسے ہی پڑا سڑ رہا ہے، مؤمنین کہتے ہیں کہ اس کی خلقت میں کوئی ارتقاء نہیں ہوتا اور نا ہی کوئی تبدیلی آتی ہے.. لا تبدیل لخلق اللہ (روم آیت 30).. چاہے نظریہ ارتقاء ہمیں بتا رہا ہو کہ یہ سب درست نہیں.. خدا آکر انسان کو ایسی ترقی کیوں نہیں دیتا کہ وہ بیماریوں اور جراثیم کے خلاف مدافعت پیدا کر سکے..؟ مگر افسوس اس کی جادوئی طاقتیں محدود ہیں.. ہم انسانوں نے ہی بیماریوں اور جراثیم سے لڑنے کے علمی طریقے سیکھے ہیں.. جبکہ وہ اور اس کا جادو کہیں پڑے سو رہے ہیں.

مؤمن سمجھتا ہے کہ انڈہ سینڈل سے زیادہ سادہ اور کم پیچیدہ ہے کیونکہ انڈے کو خدا نے بغیر کسی سابقہ تجربے کے بنایا ہے جبکہ سینڈل بنانے کے لیے ایک ڈیزائنر کے ساتھ ساتھ جوتے بنانے میں سابقہ تجربہ بھی درکار ہے… اگر خدا کے پاس چیزیں بنانے کے لیے اتنی ہی جادوئی طاقتیں ہیں اور وہ اتنا ہی عظیم ہے تو وہ ذرا ہمیں یہ بتانے کا کشٹ کرے گا کہ اسے ہمارے جنسی رجحانات

میں اس قدر دلچسپی کیوں ہے؟ اگر کوئی اس کی مرضی کے بر خلاف جنسی عمل انجام دے لے تو وہ اتنا پریشان کیوں ہو جاتا ہے؟ وہ ہمارے لباس، کھانوں حتی کہ داڑھی کی شکل تک کے حوالے سے اتنے خبط کا شکار کیوں ہے؟ ہم پر اپنی جادوئی طاقت کا استعمال کر کے ہمیں اپنی مرضی کا تابع کیوں نہیں بنالیتا؟ ہمیں سزا دینے کے لیے آخری زمانے کا انتظار کیوں کر رہا ہے؟ ہم پر ابھی جادو کر کے اپنی اور ہماری ٹینشن ختم کیوں نہیں کر دیتا؟ ان سب سوالوں کے جواب ہمیں کوئی نہیں دے سکتا.. یوں عیسائیت اور اسلام کا یہودی مصدر کا قصہء تخلیق ایک ایسی مضحکہ خیز چیز بن جاتی ہے جسے حماقت کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا.

ہمیں اب تک جادو کرنے والا کوئی جاندار نہیں مل سکا.. چاہے وہ انسان ہو یا جانور.. ممالک طاقت کے حصول کے لیے ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کے لیے کھربوں ڈالر خرچ کر ڈالتے ہیں.. وہ جادو سے مسلح ہو کر جان کیوں نہیں چھڑا لیتے؟ اتنی ٹینشن پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے..؟ کیونکہ نا تو کوئی جادو ہے اور نا ہی اس خدا کی طرح کا کوئی جادوگر.. جادو طبعی قوانین کو توڑتا ہے جو ناممکن ہے.. مقدس کتابیں جادوئی واقعات تو سناتی ہیں مگر ان کی کوئی معقول علمی توجیہ بتائے بغیر کہ یہ کیسے ہوئے.

سورۃ نحل کی آیت 8 میں فرمان ہے کہ اسی نے ہمارے لیے "گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تا کہ تم ان پر سوار ہو" مگر کیا سواری کے لیے ہم نے انہیں نہیں سدھایا؟ جب سدھانے کا بیان غلط ہے تو تخلیق کا بیان درست کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر یہ درست بھی ہو تو اس نے ہمارے لیے سدھائے ہوئے گھوڑے تخلیق کیوں نہیں کیے؟ کیا ہم نے انہیں نہیں سدھایا اور ہمی نے ان کی زین سازی نہیں کی؟ اور پھر اتنا وقت کیوں برباد کیا شروع سے ہی ہمارے لیے گاڑیاں تخلیق کر دیتا؟ یہ واقعی ایک جاہل جادوگر ہے.. ایک جگہ کہتا ہے کہ "ومنها تاكلون" (اور انہی سے تم کھاتے ہو) یعنی بھینس جب پیدا ہوتی ہے تو اسے پتہ ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق ذبح ہو کر ہماری خوراک بننے کے لیے کی گئی ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ خدا نے کیڑا اس لیے بنایا تا کہ چڑیا اسے کھا سکے.. کیڑے کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ جانوروں کی ایک اور نسل کی غذاء بنے؟ یہ یقیناً ایک لنگڑی سوچ ہے کیونکہ ہر نوع اپنی ہی نوع کو قوت بخشنے کے لیے جیتی ہے نا کہ دوسری انواع کو فائدہ پہنچانے کے لیے.. اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جادوگر اندھا ہے اور اس کا جادو قاصر اور کمزور ہے.

کیا مؤمن کے لیے یہ بہتر نہیں کہ وہ اعتراف کر لے کہ اسے اس ریاضی کی سمجھ نہیں جو علمِ فلک کو بیان کرتی ہے بجائے یہ کہنے کے کہ کوئی خدا ہے جو جادوگروں کی طرح چیزیں بناتا ہے؟ مؤمن کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا مگر خدا جانتا ہے، وہی اپنے جادو.. میرا مطلب ہے مخلوقات کو جانتا ہے.. یقیناً تخلیق کا عمل ایک جادوئی عمل ہے کیونکہ یہ ہر علمی قانون کی مخالفت کرتا ہے اور

چونکہ طبعی قوانین نہیں توڑے جاسکتے چنانچہ جادو ناممکن ہے اور اس طرح خدا بھی ناممکن ہو جاتا ہے، ہمارے اردگرد کوئی جادو نہیں ہے، ہر چیز کی ایک توجیہ ہے چاہے مؤمن اس حقیقت سے نظریں چرائے رکھیں.

جادو کو ماننے کا مطلب ہے کہ ہمیں ثابت شُدہ نظریہ ارتقاء کی بجائے آدم اور حواء کی اس کہانی پر یقین کرنا پڑے گا کہ وہ آسمان سے پیراشوٹ کے ذریعے اترے تھے، جادو کو ماننے کا مطلب یہ ماننا ہے کہ داود نے جالوت کو قتل کیا بجائے یہ جاننے کے کہ الفونس لاویران (Alphonse Laveran) نے ملیریا کو قتل کیا، جادو کو ماننا کیپٹن نوح اور اس کی عجیب وغریب کشتی کو ماننا ہے بجائے یہ جاننے کے کہ جان فچ (John Fitch) نے پہلی سٹیم بوٹ ایجادی کی.. جادو کو ماننے کا مطلب حقیقی دنیا کی بجائے خرافات کی دنیا میں جینا ہے.

تلبیسی ابلیسی لاجک

تلبیسِ ابلیس از علامہ ابن جوزی۔

علامہ صاحب اپنی کتاب تلبیسِ ابلیس کے شروع میں فرماتے ہیں کہ "عقل انسان کے لئے بڑی نعمت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور رسولوں کی تصدیق کا ذریعہ ہے" اسکی تشریح میں مولانا عبدالحق صاحب کہتے ہیں کہ عقل کی دو قسمیں ہیں، ایک عقلِ جسمانی، دوم عقلِ روحانی اور یہ دوسری قسم وہ ہے کہ جب قلب پر مہر ہو تو وہ نہیں کھلتی بلکہ ایمان ہی سے کھلتی ہے۔ بطور دلیل انہوں نے قرآنی آیت پیش کی ہے جسکا ترجمہ ہے کہ "کسی جی کو ایمان حاصل کرنے کی قدرت نہیں، مگر جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو"۔

تو مندرجہ بالا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ صاحب اور مولانا صاحب کے نزدیک عقل کی دو اقسام ہیں، اور اصل عقل کہ جس سے اللہ کی معرفت اور رسولوں کی تصدیق ہو وہ دوسری قسم ہے اور وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ عقل تبھی حاصل ہوتی ہے جب اللہ کا ارادہ ہو۔ یعنی جب تک اللہ خود نہ چاہے کوئی نہ تو اسکی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی رسولوں کی تصدیق۔ اس طرح تو اللہ ہی کفار اور ملحدین کے کفر و الحاد کا ذمہ دار ٹھہرا کہ جسکا بہانہ بنا کر اللہ اب انکو جہنم میں جھونکنے جا رہا ہے؟ کیونکہ اگر انکو عقلِ روحانی حاصل نہیں تو اسکا مطلب ہوا کہ اللہ کا ارادہ انکو عقلِ روحانی عطا کرنے کا سرے سے تھا ہی نہیں، اگر ہوتا تو وہ عاقل ہوتے اور اسلام قبول کر کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لے آتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے یا تو علامہ و مولانا صاحب کو کہیں غلطی لگی ہے یا پھر وہ عقل سے بالا کوئی منطق جھاڑنے کی یا بے عقلی کو عقلیانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ کم عقلوں کو اتنی بھی دلیل کی ضرورت نہیں اور عقلمندوں کو ایسی بودی دلیل سے بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔

موت کا خوف

ہر مذہب کی طرح اسلام بھی پہلے مسئلہ پیدا کرتا ہے پھر اس کا حل پیش کرتا ہے، موت کا خوف بھی ایسا ہی ایک مسئلہ ہے، پہلے مسلمان کو موت سے ڈرنا سکھایا جاتا ہے، منکر و نکیر، عذابِ قبر اور سکرات الموت کی خوفناک کہانیاں سنائی جاتی ہیں جو کسی ہارر فلم سے کم خوفناک نہیں، اچھی طرح ڈرانے دھمکانے کے بعد کہا جاتا ہے کہ جی حل موجود ہے اور وہ ہے مذہبی تعلیمات پر مکمل عمل درآمد.

موت کا ڈر مذہب کا کھڑا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایسی تہذیبیں موجود ہیں جن میں موت کو کوئی ایسی خوفناک چیز نہیں سمجھا جاتا، مدغشقر، شمالی رومانیہ اور مکسیکو میں لوگ مردے کو الوداع کہنے کے لیے جشن مناتے ہیں اور بیئر پیتے ہیں.

مومن کی زندگی کی سب سے بدترین چیز اس کا یہ تصور نہ کر سکنا ہے کہ کوئی اس خوف میں اس کا شریک نہیں ہے، مجھے ایسی ای میل موصول ہوتی رہتی ہیں جو موت سے ڈرانے کے عنصر پر مشتمل ہوتی ہیں اور چیلنج کرتی ہیں کہ میں ضرور توبہ کروں گا اور مرنے سے پہلے پچھتاؤں گا.

اس بارے کچھ ملحدین یا الحاد کی طرف سفر کرتے لوگوں کے خطوط بھی موصول ہوتے ہیں.. ایسے لوگوں کے موقف کو سمجھنا آسان ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے "اسلامی کلچر" سے سالوں تک فیڈنگ لی ہوئی ہوتی ہے کہ پرانی عادتیں آہستہ آہستہ ہی مرتی ہیں، میں بھی موت کے بارے میں سوچتا ہوں بلکہ بعض اوقات یہ افکار مجھے "ڈسٹرب" بھی کرتے ہیں مگر میں اس اس کی ٹینشن نہیں لیتا.. میں اس طرح نہیں سوچتا کہ موت کے اس پار کوئی "اسلامی بم" لے کر میرا انتظار کر رہا ہے.

ساری زندگی موت کو اپنا نصب العین بنائے رکھنا خود آپ کے اپنے حق میں ایک جرمِ عظیم ہے.. علم، ریاضی، دریافتیں، پیار، شاعری، موسیقی، اخلاق کی بجائے موت ہی انسانیت کا نصب العین کیوں ہونی چاہیے؟

موت کے خوف سے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹنا گھاٹے کا سودا ہے.. آپ اپنی اکلوتی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں ہے اور یہی مومنین آپ کے اور اپنے آپ کے ساتھ کرتے ہیں.

مسلمانوں کی ایک طویل تاریخ ہے جو یہ فرض کرتی ہے کہ ان کے شرعی اور فقہی عقائد ایک مطلق حقیقت ہیں، پھر اس متنازعہ شریعت سے وہ اپنی مرضی کے نتائج نکالتے ہیں جو کہ ان پر بھی اختلاف ہوتا ہے اور انہیں معاشرے پر تھوپتے ہیں.. یہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑا اخلاقی قضیہ ہے خاص طور سے جب ہم ان سب برائیوں کے بارے میں سوچتے ہیں جو صدیوں سے مسلمانوں نے اپنے ان "تنکوں" پر اعتراض اور تنقید کرنے والوں کے ساتھ روا رکھی ہے اور آج تک رکھی ہوئی ہے.

اسلام آپ میں زندگی اور اس کی امیدوں سے محبت کو قتل کر دیتا ہے اور اسے "دار الفناء" اور "دار الزوال" قرار دیتا ہے اور یہ کہ اے انسان جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ سب دھوکہ اور فریب ہے، اس بارے ریت کا خدا کہتا ہے کہ:

اِعلَموا انَّمَا الحَیٰوۃُ الدُّنیَا لَعِبٌ وَّلَہوٌ وَّزِینَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَینَکُم وَتَکَاثُرٌ فِی الاَموَالِ وَالاَولَادِ کَمَثَلِ غَیثٍ اَعجَبَ الکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیجُ فَتَرٰىہُ مُصفَرًّا ثُمَّ یَکُونُ حُطَامًا وَفِی الاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیدٌ وَّمَغفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضوَانٌ وَمَا الحَیٰوۃُ الدُّنیَا اِلَّا مَتَاعُ الغُرُورِ ﴿۲۰﴾ (سورۃ الحدید آیت 20)

ترجمہ: جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت و آرائش اور تمہارے آپس میں فخر وستائش اور مال واولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب وخواہش ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ اس سے اگنے والی کھیتی کسانوں کو بھلی لگتی ہے پھر وہ کھیتی خوب زور پر آتی ہے پھر اے دیکھنے والے تو اسکو دیکھتا ہے کہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں کافروں کے لئے عذاب شدید اور مومنوں کے لئے اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ:

1- زندگی دو حصوں پر منقسم ہے، یہ دنیا پہلی زندگی ہے جبکہ بعد از مرگ ایک اور زندگی بھی وجود رکھتی ہے.

2- پہلی زندگی فانی ہے جبکہ زندگی نمبر ٹو ہمیشہ باقی رہے گی (مجھ سے ضرور ملیے گا).

3- دنیا کی یہ پہلی زندگی گھٹیا ہے اور برائیوں کی آماجگاہ ہے.

4-اس فانی زندگی کی ہر چیز کا ایک آغاز اور انجام (موت) ہے مگر ساتویں فلور کی زندگی جس کا "وعدہ" کیا گیا ہے اس کا کوئی انجام نہیں ہے (یعنی مرنے کے بعد آپ پھر سے نہیں مریں گے.. اس آخری نکتے سے مجھے اتفاق ہے).

اور آخر میں انسان اس خوبصورت دنیا کے "لہو ولعب" میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ موت کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے، اس بات پر ربیت کا خدا اسے سزا دیتا ہے اور اس کی چمڑی جلانے کے بعد اسے ادھیڑ لیتا ہے اور پھر ایک اور چمڑی سے اسے بدل دیتا ہے، اس طرح اس بہیمانہ سزا کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری رہتا ہے..

کیا بکواس ہے..!؟

کیا آپ اتنے احمق ہیں کہ آپ کا اس طرح سے استحصال کیا جائے؟

ناہی موت کے بعد کوئی زندگی ہے اور ناہی بار بار آپ کی چمڑی جلائی اور بدلی جانے والی ہے.. یعنی اگر کوئی خوبصورت حسینہ آپ کی طرف دیکھ کر مسکرائے تو آپ کو چاہیے کہ استغفر اللہ کہہ کر اور اس پر لعنت بھیج کر بھاگ کھڑے ہوں کیونکہ جنت میں حوریں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں.. یہ حسینہ آپ کو کھسکا ہوا سمجھے گی اور شاید آپ کے جنسی رجحانات کے بارے بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائے..

الغرض کہ ہمیں زندگی کو ناامیدی کی نظروں سے دیکھنا چاہیے تاکہ خدا کے وعدے سے فیض یاب ہو سکیں.. یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی آپ سے کہے کہ ابھی کام کریں اور اجرت آپ کو مرنے کے بعد ملے گی!!! ایسی آفر دینے والے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہوگا؟ لیکن اگر میں آپ سے کہوں کہ الحاد کا وعدہ ربیت کے خدا کے وعدے سے کہیں اچھا ہے تو! جانتے ہیں کیسے؟

الحاد پہلے آپ کو ایک بری خبر سناتا ہے اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد نا تو ہم اس ساتویں فلور پر جانے والے ہیں اور ناہی کوئی قیامت ہے اور ناہی ایسا کوئی تربوز اور اخروٹ وجود رکھتا ہے.. پھر آپ کو خوشخبری سناتا ہے کہ آپ بغیر کسی رقیب کے خوف سے اپنی زندگی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں.. آسمان پر رہنے والی کوئی بھی خرافی ہستی آپ کو نہیں جلانے والی جسے نا تو کسی نے دیکھا ہے اور ناہی کبھی کوئی دیکھے گا..

اس مومن انسان کی اخلاقیات کی کیا قیمت ہے جو موت کے خوف اور ابدی زندگی کے حصول کے لیے اچھے کام کرتا ہے؟

انسان کی اخلاقیات کو اس کے احساسات، دوسروں پر رحم کرنے کے حقیقی جذبات، اس کی تعلیم اور عقلیت پسندی سے پھوٹنا چاہیے نا کہ بعد از مرگ کسی سزا کے خوف سے..

اگر مومن کی اخلاقیات کا محرک موت اور سزا کا خوف ہے تو ایسی مذہبی اخلاقیات انتہائی گھٹیا، فرسودہ اور بے بنیاد ہیں.. ایسے "مطلبی" انسان کو کسی طرح کی کوئی جزاء نہیں ملنی چاہیے..

یہ درست کہ مجھے مرنے کی جلدی نہیں مگر میں موت سے نہیں ڈرتا، کسی آپریشن سے پہلے جب آپ کو نشے کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے تو اس کے بعد آپ کے سارے احساسات ختم ہو جاتے ہیں، موت بھی ایسے ہی ہے.. نا ہی کوئی احساس ہوگا اور نا ہی کوئی درد..
جس طرح پیدا ہونے سے پہلے آپ نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا اسی طرح مرنے کے بعد بھی آپ کچھ محسوس نہیں کریں گے.. نا ہی کوئی منکر اور نکیر بر آمد ہوں گے اور نا ہی قبر سے گنجے سانپ نکلیں گے.

مجھے چاہنے والوں کی رنجیدگی کا مجھے رنج ضرور ہوگا مگر میری تعزیت ان کے دلوں میں میرے اچھی یادیں ہوں گی، ہم اپنے بعد کے لوگوں کے لیے کچھ چھوڑ جانے کے لیے جیتے ہیں، یہی انسانیت ہے کہ ہم اپنے بعد کے لوگوں کی زندگی بہتر کر سکیں، زندگی خوشی اور محبت میں گزاریں اور لوگوں کے لیے اچھی یادیں چھوڑ کر جائیں تا کہ وہ آپ کی اچھائیوں کو یاد کر سکیں.. یہی زندگی کا مطلب ہے.

آئن سٹائن (علیہ السلام) نے کہا تھا کہ:

"میں ایسے خدا کے وجود کا تصور نہیں کر سکتا جو اپنی مخلوقات کو جزاء اور سزا دیتا ہے اور اس کے جذبات ہم انسانوں کی طرح ہیں جیسے انتقام اور محبت اور نا ہی میں جسمانی موت کے بعد انسان کی زندگی کی طرف واپسی کے امکان کا تصور کر سکتا ہوں.. یہ ان ڈرپوک اور کمزور لوگوں کی امید ہے جن پر خود غرضی چھائی ہوئی ہے کہ وہ ایسی سوچیں قبول کرتے ہیں"

جاگو...وہ تم سے جھوٹ بول رہے ہیں!

خرآسانیاں

بسا اوقات انسان اپنے زُعم میں اپنے لئے آسانی پیدا کرنے کیلئے کوئی اقدام کرتا ہے مگر نتیجتاً بجائے آسانی کے اس کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، وہ مشہور کہانی تو آپ نے سنی ہی ہو گی کہ ایک تاجر روزانہ نمک کی بوری گدھے پر لاد کر ندی کے پار

جایا کرتا تھا، ایک دن گدھا لڑکھڑا کر ندی میں گر پڑا تو نمک پانی میں حل ہونے سے بوجھ کم ہو گیا، اگلے دن گدھے کو چالاکی سوجھی اور جان بوجھ کر پانی میں بیٹھ گیا، بوجھ پھر کم ہو گیا، اور گدھے نے نتیجہ نکالا کہ یہ حیلہ اچھا ہے۔ چنانچہ تیسرے دن پھر یہ فارمولا اپلائی کیا، تاجر گدھے کی چالاکی سمجھ گیا اور چوتھے دن روئی لاد دی، گدھے نے اپنا آزمودہ فارمولا اپلائی کیا، اور اس دفعہ اس خَر آسانی فارمولے نے بجائے آسانی کے انتہائی مشکل پیدا کر دی، مورل آف دی اسٹوری آپ خود اخذ کر لیں میں تو صرف خَر آسانی کی اصطلاح کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

شانِ نزول

میں بڑے مزے کی نیند سو رہا تھا کہ فون بجنا شروع ہو گیا، یہ فون تھا مکی صاحب کا، مکی صاحب نے اطلاع دی کہ آپ کے بلاگ کیا قرآن اللہ کا کلام ہے؟ کا جواب آیا ہے، آپ خود جواب دیں گے یا میں خرافانیاں تخلیق کر دوں۔ میں نے کہا آپ بلا تردد جوابی بلاگ تحریر فرمائیں، دو مختلف ذہنوں کی کاوشیں یقیناً مارکیٹ میں بہتر پروڈکٹ متعارف کرا سکتی ہیں، میں بعد میں شکوہ پڑھ کر جواب شکوہ لکھوں گا۔

کھودا پہاڑ نکلا چوہا

یہ تو ہوئی تمہید بطور شانِ نزول، میں سوچتا رہا کہ کیا جواب آیا ہو گا، کس طرح ردّ کیا ہو گا؟ کیا دلائل ذکر کئے ہوں گے؟ خیر انہی اندیشوں کے ساتھ میں نے محترم درویش خراسانی کا بلاگ پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ محترم نے اپنے تئیں کوئی شاہکار قسم کی تحریر منصۂ بلاگ پر روشناس کرائی ہے، مگر مجھے یہ تحریر پڑھ کر انتہائی مایوسی ہوئی کہ محترم نے ڈاکٹر نائک کا ساطرز اپنا کر اپنے لکیر کا فقیر ہونے کا ہی ثبوت دیا اور قرآن کو وہ مفہوم پہنانے کی کوشش کی جو مصنف قرآن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزرا ہو۔

محترم درویش صاحب کے بلاگ کا لبّ لباب یہ ہے کہ قرآن اپنے مطالب کی وضاحت خود بیان نہیں کر سکتا بلکہ اس کیلئے کسی ڈاکٹر ذاکر نائک کی وضاحت یا درویش خراسانی کی تاویل کے سہارے کی ضرورت ہے۔ خراسانی صاحب نے جس تاویل لنگ کے ذریعے مصنفِ قرآن کی غلطی کو درست کرنے کی کوشش کی ہے ویسے تو اس کی وضاحت بھی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ بلاگ کے قارئین کا علمی شعور بہت بلند ہو چکا ہے اور انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ یہ تاویل بعد از وقوع کی نوعیت کی ہے۔ جس کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی۔

عمل جراحت

قرآن کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیے ﴿آل عمران ۱۶۴﴾

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿ترجمہ﴾ خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے۔ جو ان کو خدا کی آیتیں

پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ رسول نے نہ صرف اللہ کا کلام لوگوں تک پہنچایا بلکہ اس کی باقاعدہ تعلیم بھی دی ہے، اور تعلیم کا مطلب یہ نہیں تھا کہ الفاظ کی تعلیم دی، کیونکہ عربوں کو اس کی ضرورت نہیں تھی، یقیناً اس تعلیم سے مراد معانی کی تعلیم ہی مراد ہے۔ اب اگر رسول کی تعلیم کے باوجود بھی قرآن کو سمجھنے کیلئے کسی خَر آسانی بلاگ کی ضرورت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ اللہ قرآن کا مطلب واضح کر سکا نہ رسول دونوں ہی ناکام رہے، اور اب یہ بھاری ذمہ داری امّت پر آن پڑی ہے کہ مصنفِ قرآن کی اغلاط کی من گھڑت تاویلات بیان کریں۔

خراسانی نے لکھا ہے کہ ﴿لیکن اعتراض کے جواب سے پہلے ایک بات کی وضاحت کرنا چاہونگا کہ علم دو قسم کے ہوتے ہیں﴾

۱۔ سوال یہ ہے کہ علم کی مذکورہ تقسیم کیا کسی حدیث سے ثابت ہوتی ہے؟

۲۔ کیا کسی صحابی نے بیان کی؟

۳۔ جواب اگر ہاں ہے تو حوالہ کہاں ہے؟

۴۔ اور اگر نہیں تو پھر اس دلیل کو کس معیار پر بنیاد بنایا گیا ہے؟

۵۔ کیا کوئی غیر جانبدار علمی حلقہ بھی علم کی اس تقسیم کا قائل ہے؟

۶۔ کیا میرے ان سوالوں کا کبھی جواب مل سکے گا؟

ترپ کا پتّہ

خراسانی کو اپنے مطلب کی کوڑی لانے کیلئے جو پاپڑ بیلنے پڑے ہیں وہ قارئین نے پڑھ ہی لئے ہیں، مگر لگتا ہے خراسانی نے میرے بلاگ کو غور سے نہیں پڑھا تھا ورنہ ان کو یہ دور کی کوڑی لانے کیلئے اتنی جدوجہد نہ کرنی پڑتی، میں نے صرف مصنفِ قرآن کی مشکل ہی بیان نہیں کی تھی بلکہ حل بھی بیان کیا تھا اگر مذکورہ آیت میں لفظِ علم ﴿اللہ کو معلوم ہو گیا﴾ کے بجائے اگر کان یعلم ﴿وہ پہلے سے ہی جانتا تھا﴾ لکھ دیا جاتا تو پھر مذکورہ اعتراض واقع نہ ہوتا اور نہ ہی علم کی خود ساختہ اقسام بیان کرنے کی ضرورت پڑتی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ مذکورہ بلاگ کا باقاعدہ پوسٹ مارٹم بھی کیا جائے مگر اس ضرورت کا احاطہ خاطر خواہ حد تک مکی صاحب نے جوابی بلاگ میں کر کے میرے لئے حقیقی آسانی پیدا کر دی ہے۔ قارئین مکی صاحب کی تخلیق خرافانیاں سے تو حظ اٹھا ہی چکے ہیں۔

قارئین سے التماس ہے کہ بلاگ کی ابتدا میں مذکور کہانی اب مکرر ملاحظہ فرمائی، لطف دوبالا ہو جائے گا۔

خرافانیاں

آج ہی ڈی ایچ ایل سے ایک کارٹن موصول ہوا جس میں سے صرف ایک ورق بر آمد ہوا جس پر صرف ایک اعتراض کا ذکر تھا.

یہ اعتراض کسی دوسری چیز پر نہیں بلکہ اس ذات کے کلام پر ہوا تھا جو ذات کُل کائنات کے خالق ہونے کا دعوی کرتی ہے مگر یہ دعوی کرنے کے لیے وہ خود کبھی سامنے نہیں آتی بلکہ زمین پر ٹکے ٹکے کے لوگ اس کا چمچا ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور اس کی طرف سے یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے چاہے وہ مخلوق اس کی اطاعت کرتا ہے یا اس کی نافرمانی کیونکہ وہ کسی اپاہج کی طرح بے بس ولاچار ہے اور کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہے اس لیے لوگوں کی موج ہوئی پڑی ہے جس کا دل چاہتا ہے اس کی فرمانی کرتا ہے اور جس کا دل چاہتا ہے اس کی نافرمانی کرتا ہے دونوں صورتوں میں وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا بلکہ اگر دیکھا جائے تو سب مادی اسباب پر زندگی گزارتے ہیں، اور اس کے علم میں ہر وہ بات ہے کہ جو اب تک وقوع میں آئی ہو یا نہیں، یعنی جب اس نے یہ کائنات نہیں بنائی تھی اور وہ عدم میں لامتناہی وقت سے اکیلے سڑ رہا تھا تب اسے پہلے ہی پتہ تھا کہ وہ یہ کائنات بنائے گا، کچھ احمق لوگ کہتے ہیں کہ وہ بے چارہ اپنی تقدیر کا قیدی تھا اور اپنا مستقبل نہیں بدل سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے یہ کائنات بنائی.

اور وہ ذاتِ باری تعالی جو اندھیرے بادلوں کے نیچے تاریک راہوں پر چلنے والی تاریکی سے بھرپور کالی چیونٹی کے دل اور دماغ میں گزرنے والے خیال تک کا علم رکھتا ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ چیونٹی نے کتنی پوٹی کی، وہ عظیم ذات سب کی پوٹیاں تک شمار کرتا ہے، پتہ نہیں وہ اتنا فضول ڈیٹا جمع کر کے کیا کرتا ہے مگر وہ یہ فضول کام کرتا ضرور ہے.

یعنی یہ اعتراض قرآنِ مجید پر ہوا تھا، وہ قرآن مجید جس کی صداقت پر آج تک ساری دنیا یقین نہیں کر سکی اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر آج اس کلام کے دشمن بھی اس کلام کی سچائی اور کرامت کے معترف ہیں مگر پھر بھی احمق ہیں کہ مسلمان نہیں ہوتے بلکہ الٹا سرکشی اختیار کرتے ہیں اور اس سرکشی کی حالت میں بھی اپنی قوم وملت کی ترقی اور کامیابی کے لیے اسی کلامِ پاک سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور چاند تک پر جا قدم رکھتے ہیں مگر ہم خود اتنے احمق ہیں کہ اس میں سے ایک ڈسپرین کی گولی تک نہیں نکال سکتے... لعنت ہو ہم پر..!؟

چنانچہ ایک صاحب (جن کا نام لینے سے جارج ڈبلیو بوش بھی احتراز کیا کرتا تھا) کے ناپاک بلاگ پر ایک چنا منا سا بیان لکھا گیا ہے جس میں ایک آیت کے حوالے ایک اعتراض قرآنِ مجید کی صداقت پر کیا گیا ہے.
اور اس آیت میں اس نکتے پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہاں اللہ تعالی نے لفظ (عَلِمَ) استعمال کیا ہے اور اس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے (ابھی معلوم کر لیا) کہ مسلمانوں میں ضعف آ گیا ہے اسی لیے جہاد کے ایک حکم میں تخفیف کی گئی.

تو معترض کا یقین یہ ہے کہ یہ کلامِ مجید اللہ تعالی کا کلام نہیں بلکہ کسی انسان کا کلام ہے کیونکہ اللہ تعالی کے لیے علم ازلی ثابت کیا جاتا ہے اور وہ عالم الغیب ہے، نیز اللہ تعالی کی ذات بقول مسلمانوں کے علیم وخبیر ذات ہے.

اور عالم الغیب ذات کو کس طرح ایک واقعے کا (اب علم ہوا) کہ مسلمان ضعیف اور کمزور ہو گئے ہیں، علیم وخبیر ذات کو پہلے سے ہی اگر مسلمانوں کے ضعف کا اگر پتہ تھا تو پہلے سے ہی حکم میں تخفیف کر دیتا.

تو لہذا یہ بات لازم ہوئی کہ یہ قرآنِ مجید کسی انسان کا کلام ہے جس کو واقعات وحالات کا علم اس وقت ہو جاتا ہے جب واقعہ پیش آ جاتا ہے، کیونکہ عالم الغیب ذات ایسی غلطی نہیں کر سکتا.

لیکن اعتراض کے جواب سے پہلے ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ علم دو قسم کے ہوتے ہیں، کیسے ہوتے ہیں یہ میرے ابا کو بھی نہیں پتا تھا تو مجھے کیسے پتہ ہو گا؟ ہم تو بس جب پھنسنے لگتے ہیں تو فوراً تاویل کے دروازے کھول دیتے ہیں چاہے اجتہاد کے کھولیں یا نہ کھولیں.

بہر حال جی ایک علم وہ ہے کہ کوئی بات ہمیں معلوم ہو لیکن وہ کام ابھی صادر نہیں ہوا، مثلاً کل سورج ضرور طلوع ہو گا، یہ ہمارا یقین ہے، لیکن کل کے سورج کا طلوع ہونا کسی کے مشاہدے میں نہیں آیا ہے لیکن اس مشاہدے کے نہ ہونے سے ہمارے یقین پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ زمین کا کوئی گدھا بھی جانتا ہے کہ زمین ایک میکانیکی انداز میں ساڑھے چار ارب سال سے سورج اور اپنے محور کے گرد گردش کر رہی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح اربوں سال تک جاری رہے گا جب تک کہ سورج اپنی طبعی عمر تمام نہ کرلے اور اس کی بڑھتی ہوئی حرارت زمین کو نہ نگل لے اب چونکہ انسان کی عمر سیاروں اور ستاروں کی عمر کی گرد کو بھی نہیں چھوتی لہذا کوئی بھی احمق یہ دعوی کر سکتا ہے کہ کل سورج طلوع ہو گا، اور اگر کل سورج نکل آئے تو اس عظیم پیش گوئی پر آپ کو اس احمق کے جوتوں میں پانی بھر کر پینا چاہیے.

دوسرا علم وہ کہ ایک بات ہمیں معلوم ہے اور معلوم ہونے کے بعد اس کا عملی مشاہدہ بھی ہو جائے، مثلاً آج سورع طلوع ہو گیا ہے، ہمارا یقین وہی ہے جو کہ گزشتہ کل تھا اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں واقع ہوئی اور سبھی یہ بات جانتے ہیں کہ ایسا ہو گا مگر پھر بھی ہمیں بدیہیات کو ایک "علم" کا درجہ دیتے ہوئے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے.

اللہ تعالی کا علم ازلی اور ابدی ہے حالانکہ دونوں الفاظ کا ایک ہی مطلب ہے مگر لفاظی بھی کوئی چیز ہوتی ہے، بہر حال وہ عالم الغیب بھی ہے اور کوئی چیز اس کے علم سے پنہاں نہیں، وعلیم و خبیر ذات ہے، ہر وہ چیز جس کا وقوع ہو گا اللہ تعالی نے پہلے سے ہی مقرر کر دیا ہے اور ہر مخلوق کی پیدائش سے قبل ہی اس کی خیر و شر کی تقدیر لکھ دی جاتی ہے، یعنی وہ ایک طرح سے روبوٹ ہوتا ہے اور پہلے سے پروگرام شدہ احکامات پر میکانیکی انداز میں کام کر رہا ہوتا ہے جیسے کسی فلم کا ڈائریکٹر پہلے سے لکھے ہوئے سکرپٹ کے مطابق فلم بناتا ہے اور وہ فلم کو تب تک مکمل نہیں سمجھتا جب تک کہ فلم کے تمام کردار اس کے پہلے سے لکھے ہوئے سکرپٹ کے مطابق حرکتیں نہ کریں اور وہی ڈائیلاگ نہ بولیں جو اس کے سکرپٹ میں لکھے ہیں ورنہ وہ کٹ.. کٹ کا شور مچا کر اداکاروں کو ہراساں کرتا رہتا ہے.

اب بات یہ ہے کہ اللہ تعالی کو پہلے سے ایک بات کا علم قطعی ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو گا اور یہ کام پیش آئے گا، تو یہ علم ازلی ہوا، بالکل ہمارے اس فلم کے ڈائریکٹر کی طرح، اور اس علم کی بنیاد پر اللہ تعالی کسی سزا و جزا کا فیصلہ نہیں فرماتے بلکہ انجان بننے کا ڈرامہ کرتے ہیں اور کٹھ پتلیوں کو پہلے وہ حرکت کرنے دیتے ہیں جن کے لیے اس نے انہیں پہلے سے پروگرام کیا ہوتا ہے، تب وہ انہیں گھیر لیتا ہے اور کتے کی طرح ذلیل کرتا ہے، جہنم میں بھونتا ہے اور ان کے بھنے گوشت کا کباب بنا بنا کر کھاتا ہے اور فرشتوں کو بھی کھلاتا ہے.

یعنی جب واقعہ پیش آجاتا ہے، اس پیشگی علم کو عملی جامہ پہنا دیا جاتا ہے اور اس علم کو وجود دے دیا جاتا ہے، علم کا مشاہدہ ہو جاتا ہے تب اس مشاہدے کے بعد اللہ تعالی سزا و جزاء کا فیصلہ فرماتے ہیں اور اس واقعے کو اس فاعل کے لیے فیصلہ کن جرم بنا دیتے ہیں حالانکہ سب کچھ پہلے سے طے ہوتا ہے۔

اس ڈرامائی اور نام نہاد علمِ مشاہدہ کے کئی ثبوت قرآنِ مجید میں موجود ہیں بالکل جیسے نظریہ اضافیت، بلیک ہول، کوانٹم میکانیکس، سپر سٹرنگ تھیوری، ہگز بوزون ذرہ اور نیوٹن کے قوانینِ حرکت قرآن میں پہلے سے ہی موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن واقعی اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب ہے کیونکہ چودہ سو سال پہلے اس نے عرب کے جاہل بدوؤں کو ایسے عظیم نظریات سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر ان کی بدقسمتی کہ بات ان کے پلے نہیں پڑی بلکہ خود مسلمانوں کے بھی پلے نہیں پڑی اور ہمیں ان قرآنی انکشافات کی تصدیق کے لیے کفار کی تحقیق کا انتظار کرنا پڑا، بہر حال قرآن میں علمِ مشاہدہ کا ایک ثبوت یہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ﴾ (المائدة:94)

ترجمہ: اے ایمان والو! البتہ ایک بات سے تمہیں آزمائے گا اس شکار سے جس پر تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچیں گے تاکہ اللہ معلوم کرے کہ بن دیکھے اس سے کون ڈرتا ہے پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اب اس آیت میں جو اللہ تعالی نے (معلوم کرنے) کی بات کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ اللہ تعالی کے علم میں پہلے یہ بات نہیں تھی کہ کون نافرمان ہے اور کون فرمان بردار ہے۔

بلکہ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالی کے علم میں جو فرمان برداروں اور نافرمانوں کی پہلے سے موجود لسٹ یا سکرپٹ ہے اللہ تعالی اس لسٹ کے مطابق لوگوں کے اعمال کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے تاکہ علمِ ازلی کے ساتھ علمِ مشاہدہ بھی ہو جائے اور پھر اسی پیشگی علمِ مشاہدہ کے سبب لوگوں کے جزاء و سزاء کے فیصلے ہو جائیں جو کہ صاف ظاہر ہے کہ پہلے سے ہی مقرر تھے کیونکہ علم تو علم ہوتا ہے، یہ علمِ مشاہدہ بس لفاظی ہے ورنہ ازلی علم اور علمِ مشاہدہ میں فرق صرف انتظار کا ہے جو اللہ کو پہلے سے طے شدہ واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے لیے کرنا ہے، مگر ہمیں انتہائی ڈھٹائی سے لوگوں کو یہ کہہ کر بے وقوف بنانا ہے کہ یہ علمِ مشاہدہ بالکل بھی اللہ تعالی کے علمِ غیب کے ساتھ تعارض نہیں رکھتی۔

اور اسی بات کو خود اللہ تعالی اس آیت میں بیان کرتا ہے کہ:

﴿لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (المائدۃ:97).

ترجمہ: یہ اس لیے ہے کہ تم جان لو کہ بے شک اللہ کو معلوم ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ سے قطعی طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اللہ تعالی بعض کام اسی لیے کرتا ہے کہ لوگ جان لیں (ایک ایسی بات کو) جو اللہ تعالی کو پہلے سے ہی معلوم ہوتی ہے اور اسے لوگوں کو معلوم ہونے کے بعد یا علمِ مشاہدہ کے بعد ہی فیصلہ کرنا حکمت کا تقاضہ ہے، اور یہ بات آیت کے ترجمے سے صاف واضح ہے مگر ہمیں تاویلیں گھڑ گھڑ کر لوگوں کو بے وقوف بناتے ہوئے انہیں یہ یقین دلانا ہے کہ اصل میں آیت کے "مخفی مطلب" یہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں.

ایک دوسری جگہ ارشادِ باری تعالی ہے کہ:

(أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ﴾ (العنکبوت:10-11)

ترجمہ: اور کیا اللہ جہان والوں کے دلوں کی باتوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ اور البتہ اللہ انہیں ضرور معلوم کرے گا جو ایمان لائے اور البتہ منافقوں کو بھی معلوم کر کے رہے گا۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس آیت میں بھی ایسی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اللہ تعالی عالم الغیب ہے، اور اللہ تعالی اپنے علم کو عملی جامہ پہنا کر، اسکو وجود دے کر اور علم مشاہدہ سے جس کا پورے قرآن میں کہیں اتا پتہ نہیں ہے اللہ تعالی ثابت کرے گا کہ کون مسلمان اور کون منافق ہے، مگر ہم ہیں کہ تاویل سے کبھی باز نہ آئیں گے اور قرآن سے وہ وہ نکال لیں گے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا.

اب آتے ہیں معترض کے پیش کردہ آیت کی طرف:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ (الانفال۔66)

ترجمہ: اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا اور (معلوم کر لیا) کہ تم میں کس قدر کمزوری ہے۔

اللہ تعالی کو اس بات کا علم تھا کہ مسلمان کچھ عرصہ بعد جسمانی طور پر کمزور ہوں گے یعنی معترض کا اعتراض درست ہے اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں، مگر میں اپنے دل کو تسلی دینے اور لوگوں کو احمق بنانے کے لیے تاکہ وہ راہِ حق سے بھٹک نہ جائیں اور ان کے دل میں شکوک وشبہات نہ جنم لیں بات کو گھماؤں گا اور کہوں گا کہ جب اس علم کو عملی جامہ ملا اور علمِ ازلی اور علمِ ابدی جن کا ویسے ہی مطلب ایک ہی ہے کے ساتھ ساتھ علمِ مشاہدہ جو میں نے ابھی ابھی گھڑا ہے بھی وجود میں آگیا تب اس نے انہیں دبوچ لیا، اور ظاہر ہے خدا کسی کو جرم کرنے سے پہلے سزا کیسے دے سکتا ہے بھلے اسے سب کچھ پہلے سے ہی پتہ ہو؟ نہیں وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ سکرپٹ کے مطابق سین کا انتظار کرتا ہے اسی لیے یہاں بھی (عَلِمَ۔معلوم کرلیا) سے مراد میرا ابھی ابھی گھڑا ہوا اور قرآن میں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی زبردستی ٹھونسا ہوا نام نہاد علمِ مشاہدہ ہے نا کہ علمِ مطلق یا علمِ غیب.

لہذا اب کوئی اعتراض نہیں کہ اللہ تعالی کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ مسلمان پہلے قوی ہوں گے پھر کمزور کیونکہ خدا جاہل ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں کہ کوئی کب کیا کارنامہ سر انجام دے گا، اسی لیے وہ انتظار کرتا ہے کہ واقعہ وقوع پذیر ہو تب وہ اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور چیمپئن بن جاتا ہے.

آنکھ کا شہتیر

عرصہ ہوا ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نا تو میں نام لینے والا ہوں اور نا ہی اسے مومنین کو پڑھنے کی تجویز دینے والا ہوں جس کی وجوہات اس تحریر کے اختتام سے پہلے ہی آپ کو سمجھ آجائیں گی.

بہر حال کتاب کا موضوعِ بحث اسلام پر تنقید تھا، مصنف نے قرآن کے لغوی اعجاز سے اپنے کلام کا آغاز کیا اور بڑے بہترین انداز میں قرآنی لغت کا پوسٹ مارٹم کیا، مصنف کی عربی دانی یقیناً قابلِ رشک تھی تاہم میں اس نقطے پر مزید کچھ نہیں کہنے والا کیونکہ یہ اس تحریر کا موضوع نہیں ہے.

اس کے بعد مصنف اسلام کی بت پرستانہ عادات کی طرف گھوم جاتا ہے اور اس نقطے پر زور دیتا ہے کہ اسلام نے قبل از اسلام کی عادات سے کوئی بھی چیز ایسی پیش نہیں کی جو مختلف ہو، مثال کے طور پر اسلامی حج میں اور قبل از اسلام کے حج میں کوئی خاص فرق نہیں ہے وغیرہ وغیرہ... یہاں ایک بار پھر مصنف کی اسلام سے پہلے اور بعد کی عرب تاریخ پر دسترس کافی مضبوط نظر آئی..

اچانک جاہل بدووں کے اسلام کو اچھی طرح رکیدنے کے بعد کتاب کا لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے اور عیسائیت کی مدح سرائی شروع ہو جاتی ہے جو محبت اور امن کا دین ہے.. جس میں یسوع ہے جس نے ہمیں اپنے گناہوں سے بچانے کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی!...یعنی سادہ لفظوں میں یہ عیسائی مصنف اپنی (نام نہاد) علمی غیر جانبداری تب ہی استعمال میں لاتا ہے جب وہ کسی دوسرے کے مذہب پر تنقید کر رہا ہوتا ہے، رہے اس کے اپنے عقائد تو ان پر تنقید کے لیے شاید اس کے دماغ میں گنجائش ہی نہیں ہے..

میں واضح کر دوں کہ میں نا تو عیسائیت اور نا ہی اسلام پر کسی قسم کا کوئی حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، مگر جو بات میں نے نوٹ کی وہ یہ ہے کہ ہر وہ اسلامی چیز جسے یہ عیسائی مصنف تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا اس کا متبادل بعینہ عیسائیت میں موجود ہے..

مثال کے طور پر مصنف کہتا ہے کہ کعبہ بتوں کی ایک عبادت گاہ ہے جس کی عربوں میں مقبولیت ایسے ہی دیگر کعبوں سے زیادہ تھی اور تاریخی طور پر بات درست بھی ہے کیونکہ اس زمانے میں عرب کے اس خطے میں ایسے کئی کعبے تھے اور ہر کعبے کا اپنا ایک حجرِ اسود بھی ہوتا تھا.. تاہم مصنف یہ نہیں بتاتا کہ ویٹکن میں پطرس کا چرچ قدیم روم کے سورج کی عبادت گاہ پر بنایا گیا ہے! وہ بتاتا ہے کہ کس طرح جمعہ کا دن عربوں کے ہاں خصوصی اہمیت رکھتا تھا اور اسلام نے اسے محض مذہبی تقدس دیتے ہوئے اسے خصوصی نماز کا ایک دن قرار دے دیا..

تاہم معجزاتی طور پر اس کے ناقدانہ ذہن سے یہ بات نکل جاتی ہے کہ پرانے عیسائی یہودیوں کی طرح ہفتے کے دن کو ہی چھٹی کا دن سمجھتے تھے مگر جب قسطنطین نے عیسائیت قبول کی اور اسے رومن سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا تو ہفتہ وار چھٹی کو اتوار کے دن میں بدل دیا گیا جس میں سورج کی عبادت کرنے والے قدیم روم کے شہری جشن منایا کرتے تھے.. تاکہ ان کے لیے تبدیلی آسان رہے اور آج بھی انگریزی میں اتوار کے نام سے اس کی قدیم خصوصیت نمایاں ہوتی ہے SUNday یعنی سورج کا دن..

یقیناً اسلامی ہلال قدیم عربوں کی چاند کی عبادت کی باقیات میں سے ہے.. لیکن صلیب کا کیا جو مذہبی علامت کے طور پر بابلی اور فرعونی نقوش میں نظر آتا ہے؟

اس میں بھی شک نہیں کہ ماہِ رمضان محمد کی آمد سے پہلے بھی عربوں کے ہاں اہمیت کا حامل تھا اور عرب اسے ایک مقدس ماہ سمجھتے تھے، اسلام نے تو بس اس کی قدسیت کو قانونی شکل دی ہے مگر حضرت عیسی کی میلاد کے دن کا کیا جو بعینہ اسی دن منایا جاتا ہے جس دن قدیم روم کے خدا متھرا کی پیدائش ہوئی تھی؟

فی الحال میں اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں، اسلام میں دورِ جاہلیت کی بقایاجات پر پھر کبھی گفتگو ہوگی.. فی الحال اہم بات یہ ہے کہ اگر اپنا گھر شیشے کا ہو تو دوسروں کے گھروں پر پتھر نہیں مارنے چاہئیں..

مجھے ایسے مذہب پرست ہضم نہیں ہوتے جو کہ غیر جانبداری اور علمیت کا ناٹک کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر تنقید کرتے ہیں جبکہ خود ان کے اپنے عقائد میں بعینہ وہی کمزوریاں ہوتی ہیں.. اپنی آنکھ کا شہتیر واقعی کسی کو نظر نہیں آتا..

عجیب ذہنیت ہے ان مسلمانوں کی جو عیسائیت کو صرف اس لیے گالیاں دیتے ہیں کیونکہ وہ بت پرست ہیں اور تین خداؤں کی عبادت کرتے ہیں.. اور عجیب ذہنیت ہے ان عیسائیوں کی جو اسلام کو ایک رجعت پذیر بدوؤں اور دہشت گردوں کا دین سمجھتے ہیں اور اسے گالیاں دیتے ہیں..

افسوس ناک بات یہ ہے کہ تمام مذاہب کی تاریخ ایک ہی جیسی ہے.. ان سب مذاہب کے ماننے والوں نے خدا کے نام پر وہ وہ بہیمانہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ انسانیت تڑپ اٹھے..

ساتھ ہی یہ سارے مذاہب محبت امن اور آشتی کی دعوے بھی کرتے ہیں..

عیسائی ہو، مسلمان ہو یا بھلے زرداشتی ہو.. ان سب میں کوئی فرق نہیں.. ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کے عقائد ہی درست ہیں صرف اس لیے کیونکہ وہ اس کے عقائد ہیں.. رہی بات دوسروں کی تو وہ احمق ہیں جن کا کوئی علاج نہیں..

مذہبی فریم سے باہر سارے مذاہب ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں.. جیسے چاند سے دیکھنے پر زمین کی گولائی کا پردہ فاش ہو جاتا ہے.

عقل مندوں کو سلام!

کرسٹل کی بال

کیا آپ نے کبھی وہ کرسٹل کی بال دیکھی ہے جسے عام طور پر فلموں میں جادوگرنیاں مستقبل کی پیش گوئی کے لیے استعمال کرتی ہیں؟ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بعض ممالک میں جادوگری کا سامان فروخت کرنے والے بعض فروشندہ اس طرح کی بال بھی فروخت کرتے ہیں، جہاں تک اس کے استعمال کے طریقے کی بات ہے تو وہ تجویز کرتے ہیں کہ آپ کئی کئی دنوں تک اس بال کو بیٹھ کر گھورتے رہیں، ایسا کرنے پر وہ آپ کو ضمانت دیتے ہیں کہ جب تک آپ کا اس بال پر یہ یقین قائم رہے گا کہ آپ اس بال کے ٹیڑھے میڑھے انعکاس میں کچھ دیکھ سکتے ہیں تو آخر کار آپ کو اس میں کچھ نہ کچھ ضرور نظر آنا شروع ہو جائے گا.
اور جیسا کہ دیگر انواع واقسام کی بکواسیات کے لیے ضروری ہوتا ہے یہاں بھی "شک کی حس" کو معطل کرنا ضروری ہے کیونکہ انسانی دماغ اگر شک کے اپنے طبعی حق سے دستبردار ہو جائے تو وہ کیا کیا خرافات تخلیق کر سکتا ہے اس کا تمام فراڈیوں کو کافی اچھا تجربہ ہے.

علمائے نفس انسانی دماغ کی نظر آنے والی چیزوں کو ذاتی اندیشوں میں بدلنے کی زبردست قابلیت کے بارے میں آپ کو بہت کچھ بتاسکتے ہیں، اس ضمن میں نفسیات دانوں کے ہاں روشاخ Rorschach test ٹیسٹ خاصہ جانا پہچانا ہے.
مگر رکیے.. کیا آپ کو یہ اصول کچھ جانا پہچانا نہیں لگتا؟

یہ یقین رکھتے ہوئے کسی چیز کو گھورنا کہ آپ کو اس میں وہ نظر آئے گا جو اس میں نہیں تو آخر کا آپ کو اس میں وہ واقعی مل جائے گا جو آپ اس میں دیکھنا چاہ رہے تھے؟

کیا تمام مقدس کتابیں ایسی ہی کرسٹل بالوں کی طرح نہیں ہیں؟ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کتابوں کو گھورنے میں صدیاں لگتی ہیں تب جاکر کہیں ان میں وہ مل ہی جاتا ہے جو ان میں نہیں ہوتا..

تمام مذاہب کے ماننے والے اپنی کتابوں کو گھورنے اور ان سے نت نئے معانی کشید کرنے میں ماہر ہیں، بلکہ بحث بھی کرتے ہیں کہ یہ اس متن کی جادوگری اور عظمت کا کرشمہ اور ثبوت ہے!

متن کی عظمت یہ ہے کہ آپ اس پر وہ منعکس کر دیتے ہیں جو حقیقتاً آپ کی نفسیات میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے، یعنی آپ کو اس میں اپنی پسماندہ اور مجرمانہ خواہشات مل سکتی ہیں، اور اگر آپ مثقف اور متمدن شخص ہیں تو بھی آپ کو اس میں اپنی مرضی کی چیزیں مل جائیں گی، متن کی بھول بھلیاں میں سب کے لیے کچھ نہ کچھ موجود ہے.. لہذا متن سے معانی کشید کرنے کے

فائدے کے بارے مت پوچھیں جبکہ معانی اصل میں نفسِ انسانی میں پہلے سے ہی موجود ہیں.. کیا کسی مقدس کتاب نے ہمیں کوئی ایسی بات بتائی ہے جو ہم پہلے جانتے ہی نہیں تھے؟ اور کیا کسی کتاب کی وجہ سے کوئی معاشرہ "مثالی جنت" بن سکا؟ کیا اب بھی ڈاکو ڈاکو نہیں ہیں اور قاتل قاتل نہیں ہیں؟ کیا کچھ تبدیل ہوا سوائے اس کے کہ بعض اوقات ان کی مجرمانہ خواہشات نے اپنا ہدف تبدیل کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر اپنا نزلہ گرایا؟

اب مجھ سے یہ مت کہیں کہ مقدس کتابوں نے آپ کی روحانی اور فکری سعی کو فائدہ پہنچایا کیونکہ میں آپ کو ایسی دسیوں ملہمانہ کتابیں بتا سکتا ہوں جنہیں ایسے لوگوں نے تحریر کیا جنہوں نے کبھی وحی یا فرشتوں کو دیکھنے کا دعوی نہیں کیا، لاؤزی Laozi کی لکھی ہوئی تاوتی چینگ Tao Te Ching نامی کتاب چین کو دو ہزار سالوں سے زائد عرصے سے روحانیت بخش رہی ہے مگر مصنف نے کبھی کسی آسمانی مداخلت کا کوئی دعوی نہیں کیا.. اس کے برعکس لاؤزی واضح طور پر کہتا ہے کہ اس کی واحد دلچسپی انسان اور اس کی زندگی ہے نا کہ شیطان اور فرشتے وغیرہ..
اپنے مومن دوستوں کو میں فقط اتنا پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے کسی کتاب سے کسی بھی طرح کے مخصوص معانی کشید کرنے ہیں تو یہ کام آپ کسی بھی کتاب کے ساتھ کر سکتے ہیں چاہے وہ قرآن ہو، انجیل ہو، توریت ہو یا "موبائل کے بہترین ایس ایم ایس" ہو... انسانی دماغ اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتا ہے.

عقل مندوں کو سلام!

دماغیات

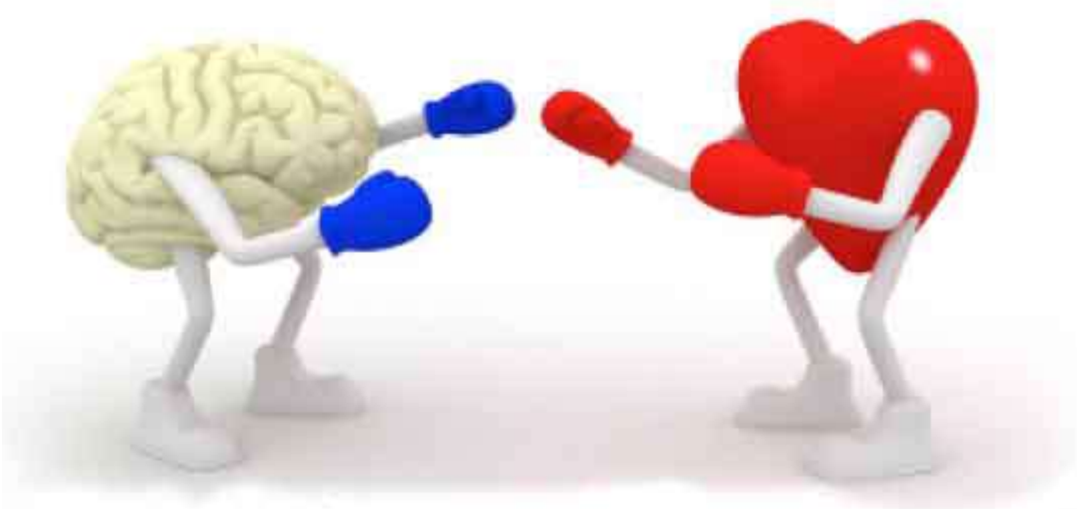

آغاز میں انسان کو دماغ کے ایک اہم عضو کے طور پر موجودگی کی خبر نہ تھی، چنانچہ غور وفکر اور سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں قدیم انسان کے لیے ایک معمہ تھا، قدیم مصریوں (2500 قبل از عیسوی) کا خیال تھا کہ عقل دل میں ہوتی ہے اور دماغ بے فائدہ چیز ہے، یہی وجہ تھی کہ جسم کی تحنیط کے وقت وہ ناک کے ذریعے دماغ کو نکال باہر پھینکتے تھے حالانکہ تحنیط کے عمل کا مقصد ہی عالمِ سفلی تک منتقلی کے عمل کے دوران جسم کی حفاظت تھی، تاہم وہ دل کو نہیں نکالتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں دل روح اور عقل کا مرکز تھا، ہمارے پاس 1500 قبل از عیسوی کی ایک مصری طبیب کی دستاویز ہے جس میں پہلی بار دماغ کی اناٹومی بیان کی گئی، بردی کے ورق کی اس دستاویز کو ایڈون سمتھ پیپرس Edwin Smith Papyrus کہا جاتا ہے جس میں دماغ کی کئی دیگر تفصیلات سمیت طبیب نے دماغ کی کوئی 26 بیماریاں اور ان کا علاج بیان کیا ہے.

اسی طرح دوہزار سال پرانی ایسی انسانی کھوپڑیاں بھی دریافت کی گئی ہیں جن میں منظم طریقے سے چھریوں یا تیز دھاری پتھروں سے سوراخ کیے گئے تھے، اس عمل کو ٹریپیننگ Trepanning کہا جاتا ہے، علمائے آثارِ قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ آپریشن مذہبی سرگرمیوں کا حصہ تھے جس کی مثالیں ساری دنیا میں پائی گئی ہیں، بعض کھوپڑیوں میں سوراخ منظم طریقے سے گول تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ صاحبِ کھوپری زندہ رہا اور ہڈی جزوی طور پر نمو پا سکی، سر سے جن بھوت بھگانے کے لیے کھوپڑی کھولنا قرونِ وسطی میں رائج تھا اور اس کے لیے خاص اوزار استعمال کیے جاتے تھے.

عظیم یونانی فلسفی ارسطو کا خیال تھا کہ عقل وفکر دل میں انجام پاتی ہے اور دماغ کا کام خون کو ٹھنڈا رکھنا ہے، دی مقراطیس کا خیال تھا کہ روح تین حصوں پر منقسم ہے: عقل سر میں، احساسات دل میں اور لذت جگر میں، بابائے طب بقراط اپنی کتاب On the Sacred Disease میں رقم طراز ہیں:

“Men ought to know that from nothing else but the brain come joys, delights, laughter and sports, and sorrows, griefs, despondency, and lamentations. And by this, in an especial manner, we acquire wisdom and knowledge, and see and hear, and know what are foul and what are fair, what are bad and what are good, what are sweet, and what unsavory”

“انسان کو جان لینا چاہیے کہ کچھ نہیں سوائے دماغ کے ہی مسرت، خوشی، ہنسی، کھیل اور غم، رنج، یاسیت اور ماتم آتا ہے. اور اسی سے ہی خصوصی انداز میں ہم حکمت اور علم حاصل کرتے ہیں اور دیکھتے اور سنتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ کیا غلط اور کیا صحیح ہے، کیا برا اور کیا اچھا ہے، کیا میٹھا اور کیا بدمزہ ہے”

550 قبل از عیسوی میں یونانی طبیب اور فلاسفر الکمین Alcmaeon نے اندازہ لگایا کہ جانوروں کے برعکس صرف انسان ہی منطقی انداز میں سوچنے کے قابل ہے اور دل کی بجائے دماغ میں سوچ اور عقل کا عمل سرانجام پاتا ہے، اس کے کوئی 300 سال بعد یونانی طبیبوں ہیرو فیلس Herophilos اور ایرے سسٹریٹس Erasistratus نے مل کر انسانی جسم کے آپریشن کیے اور دل ودماغ کو بیان کرنے سمیت اعصابی نظام کا نقشہ تیار کیا اور خلاصہ کیا کہ انسان کا دماغ جانوروں کے دماغ سے مختلف ہے کیونکہ یہ حجم میں بڑا ہے، مشہورِ زمانہ یونانی طبیب جالینوس نے دماغ اور اس کے اعصاب اور پٹھوں کے ساتھ تعلق کی اہمیت کو اجاگر کیا.

دوسری قوموں کی طرح عرب بھی یہ بات نہیں جانتے تھے کہ عقل دماغ میں ہوتی ہے بلکہ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ عقل اور فکر کی جگہ دل میں ہے، اسلام کی آمد کے بعد بھی صورتِ حال تبدیل نہ ہوئی، بلکہ اسلام خود اس مغالطے کے کھڈے میں گر گیا اور اس بات کو حقیقت جانتے ہوئے ان جانے میں اس خیال کو تقویت بخشی، قرآن اور حدیث میں ایسے متون موجود ہیں جن سے اس بات کی تصدیق بڑے آرام سے ہوجاتی ہے، سورہ اعراف کی آیت 179 میں یہ مغالطہ بڑے واضح انداز میں بیان ہے کہ سمجھ دل سے ہوتی ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا
يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔ انکے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور انکی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ بالکل چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور سورہ حج کی آیت 46 اس بات کی مزید تصدیق کرتی نظر آتی ہے:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا
تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

سو کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تا کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان ایسے ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

جبکہ صحیح مسلم میں درج ہے:

"ہم سے یحیٰی بن بکیر نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہم سے لیث بن سعد نے یونس کے واسطہ سے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے انس بن مالک سے، انھوں نے فرمایا کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے گھر کی چھت کھول دی گئی، اس وقت میں مکہ میں تھا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام اترے اور انھوں نے میرا سینہ چاک کیا۔ پھر اسے زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر ایک سونے کا طشت لائے جو حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو میرے سینے میں رکھ دیا" (حوالہ 1 اور 2)

انجیل بھی اس مغالطے سے خالی نہیں، متی 15:13 اور یوحنا 12:40 میں درج ہے: "اور اپنے دلوں سے سمجھتے ہیں"

لسان العرب کھولیں تو معلوم پڑتا ہے کہ دماغ کا کام ہی مجہول ہے اور عقل وہی ہے جو آپ دل سے سمجھتے ہیں:

والعقلُ: القلْبُ، والقلْبُ العقْلُ، ويقال: لِفُلان قَلْبٌ عقُول، ولِسانٌ سَؤول.

اور عقل: دل ہے، اور دل عقل ہے، اور کہا جاتا ہے: فلان کا عقل والا دل ہے، اور سوال کرنے والی زبان ہے.

اسی لسان العرب سے پتہ چلتا ہے کہ دماغ کا سوچنے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا سرے سے کوئی کام ہی متعین نہیں:

الدِّماغُ: حَشْوُ الرأْسِ، والجمع أَدْمِغةٌ ودُمُغٌ.

دماغ: سر کی بھرائی ہے، جمع ادمغہ اور دمغ ہے.

اس کے باوجود اگر کان کی میل اچھی طرح صاف کی جائے اور آنکھوں کے لیے کوئی اچھے سے قطرے استعمال کر کے تھوڑی سی تحقیق کرنے کا کشٹ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سر کے علاج کے اولین اوزار اندلس یعنی سپین کے مسلم طبیب ابو القاسم خلف بن عباس الزہراوی نے ایجاد کیے تھے، اگرچہ میں نے یہ تحریر شروع کرنے سے پہلے یہ تیر اندھیرے میں چلایا تھا جس کی دو وجوہات تھیں اور پہلی وجہ نے ہی دوسری وجہ کی تصدیق کر دی، پہلی وجہ تو یہی ہے کہ کسی بھی طرح کے آپریشن کے سب سے پہلے اوزار الزہراوی نے ہی بنائے تھے اور یہ بات نہ صرف ریکارڈ پر ہے بلکہ اظہر من الشمس ہے، بچپن میں، میں نے الزہراوی پر مصر میں بنائی گئی ایک دستاویزی فلم دیکھی تھی جو مجھے آج بھی یاد ہے، یہی وجہ ہے کہ میری اس طرف توجہ گئی، لیکن آپریشن کے سب سے پہلے اوزار ایجاد کرنا اور سر کے آپریشن کے اوزار ایجاد کرنے میں تھوڑا فرق ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ الزہراوی نے سر کے آپریشن کے لیے بھی کوئی اوزار ایجاد کیا ہو، لیکن یہ غلط فہمی ان کی مشہورِ زمانہ کتاب "التصریف لمن عجز عن التالیف" کے سرسری مطالعے سے ہی دور ہو جاتی ہے خاص طور سے کتاب کا آخری باب جو جراحت سے متعلق ہے جس میں ہمیں کھوپڑی کھولنے کے اوزاروں کے نقشے ملتے ہیں، یعنی صاحب نے نہ صرف اولین آپریشن کے اوزار ایجاد کیے بلکہ سر کے آپریشن کے لیے بھی اوزار وضع کیے جو از حد متاثر کن کام ہے، ذیل میں میرے پاس دستیاب التصریف کے اس باب کا عکس ہے جو سر کے ٹوٹنے اور اس کے اوزاروں سے متعلق ہے:

برضت فهو كيشفين

هذا الكتاب العتيق والسفر القديم الذي صنفه الحكيم

ابو القاسم خلف ابن عباس الزهراوي

ة الخامسة من الهجرة وهو كتاب

التصريف لمن عجز عن التأليف

المشهور

بالزهراوي

في التداوي بالأعمال اليدوية مع اشكال الآلات الجراحية

ت ادارة المكنى بابي الحسنات قطب الدين احمد عفا عنه الله الصمد

في القعدة سنة ١٣٢٦ من الهجرة النبوية المطابقة لشهر سبتمبر سنة ١٩٠٨ المسيحية

المطبع النامي الكائن ببلدة لكنو

والضماد اليسير ولا تشده شدك الاول والطف به حتى يبرأ ان شاء الله فان رأيت
ان الورم والحمرة والوجع والنفخ وجميع الاعراض قد ذهبت اصلا واحتجت الى الضماد
والشد فأعده كما فعلت اولا سواء فان لم يحدث في العضو شيء مما ذكرنا فلا تحله
الا بعد ثلاثة ايام او اربعة او خمسة او سبعة وقد تحله عشرين يوما كل ذلك
على حسب ما يظهر اليك من حال العضو كما قلنا حتى اذا لزم الكسر وقارب
ينعقد الحجر عليه فشد ايضا حينئذ في الشد اكثر من شدك الاول كله وشد ايضا
في تغليظ غذاء العليل على ما تقدم ذكره فان رأيت موضع الكسر قد جفت
وهزل بأكثر مما ينبغي فاعلم ان الغذاء ممتنع من الوصول اليه فانطله بالماء الفاتر
عند كل مرة تحله ويكون ذلك في كل ثلاثة ايام وخفف الشد قليلا فان
بهذا الفعل يجري الى العضو العليل الغذاء ويبرأ سريعا ان شاء الله واما
ما تصنعه الجهال من المجبرين من كسر العضو مرة اخرى ان لم يجبر اولا على
ما ينبغي وانجبر على عوج فهو خطأ من فعلهم وغرر عظيم ولو كان صوابا لذكرته
الاوائل في كتبهم او عملت به وما رأيت لاحد منهم في ذلك اثرا البتة والصواب
ان لا نعمل به ان شاء الله تعالى

الفصل الثاني في الكسر العارض في الرأس

انواع الكسر العارض في الرأس كثيرة واشكاله مختلفة واسبابه متفننة فمن الكسر
ما يكون عن ضربة سيف فيكون اما من بعد العظام كله الى ان ينتهي الى الصفاق
الذي تحت العظم كما يفعل القدوم في الخشب ولذلك يسمى هذا النوع من الكسر
قدوميا واما ان يكون قطع السيف بعض العظم وابرأ وجهه فقط ولم ينفذ القطع
الى اخره ويسمى هذا النوع قلما مطلقا ويكون جرم هذين الكسرين اما صغيرا
واما كبيرا ومن الكسر ما يكون هشما او رضا ويكون سببه ضربة حجر او سقطة

زهراوي　　١٩٦　　المقالة الثالث

عن العظم على اي وجه يمكن ان يقطع على حسب شكل الجرح وما يخف على العليل فان عرض
لك عند الكشف على العظم نزف دم او ورم حار فقابل ذلك بما ينبغي وهو ان تحشو
الموضع بخرق مغموسة في شراب ودهن ورد وتفرحه حتى يسكن الورم ويأمن النزف
ثم تأخذ في تقويس العظم وانتزاعه وذلك يكون على احد وجهين من العمل
اما الوجه الواحد فهو ان تقطع العظم بمقطع لطيف ضيق الشفرة وهذه صورته

ثم تستعمل مقطعا آخر بعد هذا المقطع اعرض منه قليلا وهذه صورته

ثم تستعمل ايضا مقطعا آخر اعرض ايضا من الثاني والوجه الآخر ان يكون عندك
عدة مقاطع مختلفة وان يكون بعضها اعرض من بعض وبعضها اقصر من بعض
ويكون في غاية من حدة اطرافها ويكن من حديد هندي او فولاذ جيد واستعمل
الرفق في الضرب على المقطع لئلا تزعزع الرأس فيؤذيه فان كان العظم قويا صلبا
فينبغي ان تثقب حوله قبل استعمالك المقاطع بالمثاقب التي تسمى مثاقب غير
غائصة واسمها مثاقب لا تغوص لانها لا تجاوز عظم القحف الى ما وراءه من اجل
ان للثقب حرفا مستديرا على مكون راسه الحاد تشبيه بالطوق او الدائرة
الصغيرة يمنعه من ان يغوص ويتجاوز ثخن العظم وينبغي لك ان تتخذ من هذه المثاقب

اس مسلمان اندلسی طبیب نے طبی آلات کی اختراع میں کمال کا مظاہرہ کیا نیتجتاً اس کی کتابیں یورپ میں چار صدیوں تک پڑھائی جاتی رہیں، تاہم درست علمی انداز میں دماغ پر تحقیق نشاۃ ثانیہ کے دور کے بعد (1600 عیسوی) ہی شروع ہو سکی.

1664 میں انگریز طبیب تھومس ویلیس Thomas Willis نے کچھ اوزاروں، ایک عدد خردبین اور ایک چوری شدہ لاش کی مدد سے دماغ کے اندرونی حصوں کو بخوبی بیان کیا جو اس کی سیر بیری اناٹومی Cerebri Anatome نامی کتاب میں درج ہے، اس نے بتایا کہ دماغ کے مختلف حصے عقل کی مختلف اقسام کو کنٹرول کرتے ہیں، اس کے علاوہ اس نے دماغ کے نچلے حصے میں دماغ کو خون فراہم کرنے والی شریانوں کو دریافت کیا جسے اب بھی اسی کے نام سے یعنی دورہ ویلیس Circle of Willis سے جانا جاتا ہے.

1848 میں امریکی ریلوے کے ملازم فینیاس گیج Phineas Gage کام کے دوران ایک حادثے کا شکار ہوا، ایک لوہے کا سریا اس کے سر کے اوپر کے حصے میں پیوست ہو کر ماتھے سے گزرتے ہوئے بائیں گال سے باہر نکل آیا، حادثے کے بعد فینیاس پر غصے کی کیفیات طاری ہونے لگیں اور اسے بھوت وغیرہ نظر آنے لگے، اس کی حالت سے اطباء نے اندازہ لگایا کہ شخصیت کی

معلومات کا مرکز دماغ کے اگلے حصے میں ہوتا ہے، اور یہ کہ شخصیت کے عدم توازن کی وجہ سفید مادہ Lobotomi اور دماغ کے اگلے حصے میں رابطے کا فقدان ہے.

چوہوں پر تجربات کے دوران امریکی طبیب کارل لیشلی Karl Lashley نے پتہ لگایا کہ جس قدر دماغ کے کسی حصے کو زائل کیا جاتا ہے اسی قدر یادداشت متاثر ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے لیے اس کا مطلب یہ تھا کہ یادداشت کسی مخصوص مقام پر نہیں ہے بلکہ اس کا پھیلاؤ پورے دماغ پر محیط ہے، یعنی یادداشت کا کوئی ایک مرکز نہیں ہے.

مجہول خدا

لوگ ایک خدا کے بارے میں بہت باتیں کرتے ہیں..

کہتے ہیں کہ یہ خدا کی مشیت تھی، ماشاء اللہ و سبحان اللہ اور اللہ کا شکر ہے وغیرہ...

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کو کسی نے نہیں دیکھا مگر لوگوں نے اسے عقل سے پہچان لیا تو کیا واقعی لوگوں نے اسے جان لیا جیسا کہ دعوی کیا جاتا ہے؟

میرا خیال ہے اگر ہم سڑک پر چلتے کسی عام آدمی یا -کسی مذہب کے- مولوی سے خدا کی ماہیت کے بارے میں پوچھیں تو وہ جواب نہیں دے پائے گا، خدا ایک غیر واضح پُر اسرار مفہوم ہے مگر چونکہ مولویوں کی ضد ہے کہ خدا نامی وہ چیز موجود ہے اور وہی تمام واقعات کا ذمہ دار ہے اور اس نے ہم پر بڑے احسان کیے ہیں اور وہ ہمیں موت کے بعد پھر سے زندہ کرے گا.. لہذا ہم پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ہم خدا کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ اس کے وجود کی تصدیق ہو سکے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ آیا وہ ہماری عبادت یا پھر عزت ہی کا حق دار ہے یا نہیں...

خدا ہے کیا؟

کہتے ہیں کہ خدا انسان کی موجودگی سے بھی بہت پہلے موجود تھا...

مگر کتنا پہلے ؟

وہ زندہ کیسے ہوا یا وجود میں کیسے آیا؟ کب اور کیوں ؟

اور پھر اگر خدا زندہ ہے (یا زندہ تھا!) تو کیا وہ آکسیجن سے سانس لیتا ہے یا کوئی اور گیس استعمال کرتا ہے ؟

کیا خدا کو زندہ رہنے کے لیے پانی کی ضرورت ہے ؟ یا وہ ان چیزوں سے بے باک ہے ؟

اور اگر وہ زندگی کی ضروریات سے بے باک ہے تو اسے زندہ کیونکر سمجھا جاتا ہے ؟

پتھر کو سانس لینے کے لیے ہوا اور پینے کے لیے پانی کی ضرورت نہیں ہوتی، تو کیا خدا اسی کی طرح زندہ ہے ؟

پتھر زندگی کی ضروریات سے بے باک ہوتا ہے کیونکہ وہ زندہ نہیں ہوتا تو کیا خدا پتھر سے مختلف ہے ؟

میرے خیال سے کوئی بھی انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہو گا کہ کس طرح خدا زندہ بھی ہے اور بیک وقت زندگی کی ضروریات سے بے باک بھی، یہ ایک کھلا تضاد ہے، لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ خدا تصور سے پرے ہے تو اس طرح ہم ایک طرح سے اسے سمجھنے اور اس کی تعریف کرنے سے اپنی عاجزی کا اعلان کر دیتے ہیں.. کیا اس طرح مومن ایک سوالیہ نشان کی عبادت تو نہیں کر رہے ؟

خدا زندگی کی ضروریات سے بے باک ہے مگر وہ زندہ ہے.. کیا یہ منطق ہے ؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا موجود ہے تو کیا یہ وجود خلاء میں جگہ گھیرتا ہے ؟

یہ بھی فرمایا جاتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اگرچہ اس کا مطلب ہے کہ وہ غیر محدود ہے چنانچہ خلاء میں جگہ نہیں گھیرتا تو پھر کس طرح موجود ہو سکتا ہے ؟

پھر فرمایا جاتا ہے کہ خدا غیر مادی ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجازی ہے یا کوئی خیال ہے یا پھر کوئی تصوراتی قدر ہے ؟

خدا موجود ہے مگر خلاء میں جگہ نہیں گھیر تا اور غیر مادی بھی ہے.. کیا یہ منطق ہے؟

چلیے خدا کو "س" کی علامت سے تعبیر کرتے ہیں...

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ "س" زندہ ہے مگر زندگی کی ضروریات سے بے باک ہے؟

یقیناً نہیں.. یہ ناممکن ہے.. ہے نا...

ہم نے خدا کی بجائے "س" کا ہی تو استعمال کیا ہے.. تبدیل کیا ہوا؟

خدا ایک رائج لفظ ہے جسے ہر زبان بولتی ہے مگر اس کا کوئی متعین مطلب نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد کوئی چیز اور اس کا متضاد لیا جاتا ہے: زندہ ہے مگر زندگی کے جانے پہچانے مفہوم سے عاری، موجود ہے مگر اس طرح نہیں جس طرح ہم وجود کو سمجھتے ہیں، عقل خدا سے متعارف کراتی ہے مگر اسے سمجھتی نہیں!!!!

خدا آخر ہے کیا؟

کہتے ہیں کہ خالق ہی دراصل خدا ہے جیسے یہ تعریف ہو...

یعنی اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مثال کے طور پر خالق طبعی قوانین یا تجاذب ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالق ایک اندھی قوت ہے، اور اگر ہم فرض کر لیں کہ خالق یونانیوں کا خدا زیوس ہے تو وہ ایک ایسا شخص ہو گا جس کا کوئی آغاز موجود ہے اور کلی یا جزوی طور پر عیسائیت یا اسلام کے خدا سے مختلف ہے.

یعنی تخلیق کا عمل خالق کی نیچر کا پتہ نہیں دیتا...

بلکہ وجود کے لیے تخلیق کا حتمی ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ ایسے علمی نظریات موجود ہیں جن کا اپنا وزن ہے اور جو کہتے ہیں کہ انسان سادہ جانداروں کی ترقی یافتہ شکل ہے چنانچہ وجود تخلیق کو حتمی نہیں بناتا اور تخلیق خدا کو حتمی نہیں بناتی اور خدا لازمی نہیں ہے کہ ان دستیاب مذاہب میں سے کسی ایک مخصوص مذہب کی ملکیت ہو.

تو پھر خدا کیا ہے؟ میں اس لفظ کا معنی سمجھنے سے قاصر ہوں...

جب مومن کہتے ہیں کہ "س" موجود ہے تو اس سے وہ اس طرح کا وجود مراد نہیں لیتے جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے تو اس سے ان کی مراد ہماری جانی پہچانی زندگی نہیں ہوتی اور جب وہ کہتے ہیں کہ وہ خالق ہے تو اسی پر ہی اکتفاء کرتے ہیں گویا یہ لفظ اس کی نیچر پر دلالت کرتا ہے.

مجھ سے اور ہر انسان سے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ ہم "س" کی عبادت کریں یہ جانے بغیر کہ "س" دراصل ہے کیا؟

"س" طاقتور ہے، جبار ہے ماکر ہے وغیرہ وغیرہ...

کیا وہ لومڑ ہے؟ یا بھیڑیا ہے؟ یا پھر سانپ ہے؟

اسلام میں اللہ کے نام ثانوی صفات کی حیثیت رکھتے ہیں اور اللہ کی ذات کی تعبیر نہیں ہیں اور کسی بھی جاندار پر منطبق کیے جاسکتے ہیں... انسان طاقتور ہے، رحیم ہے جبار ہے علیم ہے...

لومڑ مکار ہے.. بھیڑیا نقصان دہ (ضار) ہے اور شہد کی مکھیاں نفع بخش (نافع) ہیں...

تو کیا خدا کی محض ثانوی صفات کے ذکر سے اس کی جوہری صفات کے ادراک اور انہیں سمجھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

مومنین تو بس خدا کی ثانوی صفات سے ہی عشق لڑائے بیٹھے ہیں..

رحمن ورحیم کی پرستش کرتے ہیں خود سے یہ سوال کیے بغیر کہ وہ ہے کون یہ جو رحم کرتا ہے؟

یہ خدا کون ہے؟

وجود میں کیسے آیا؟ وہ منفرد کیوں ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟

میرے خیال سے جو ان سوالوں کے براہ راست جواب دینے کی کوشش کرے گا وہ بالآخر سارے معاملے سے ہی انکاری ہو جائے گا اور "س" کو ایک ایسا وہم قرار دے گا جس کی مارکیٹنگ صرف مذاہب نامی کمپنیوں میں ہی ہوتی ہے.

سائنس اور مسلمان

آج کا دور سائنس کا دور ہے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں اس کی حقیقت کا انکار ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر گزارہ ممکن ہے۔ سخت سے سخت مذہبی عقیدے کے حامل انسان کو بھی لاکھ اجتناب کے باوجود کسی ایک مقام پہ آکر سائنس کی برکات اور فیوض سے بہرہ مند ہونا ہی پڑتا ہے۔ راقم کو اپنے سعودی عرب میں قیام کے دوران کئی طرح کے دلچسپ تجربات کا سامنا کرنا پڑا جہاں پہ معاشرتی نظام علماء اور راسخ العقیدہ لوگوں کی رائے سے چلتا ہے۔ مثلاً وہاں تصویر کو اب تک حرام ہی سمجھا جاتا ہے، چنانچہ حج کے ایام میں غیر ملکی حجاج کرام کی رہنمائی کیلئے جو پوسٹرز اور بل بورڈ شاہرات کے کناروں پر نصب کئے جاتے ہیں ان پر حجاج کے خاکے تو مصور کئے جاتے ہیں لیکن ان کے چہرے کے نقوش کو مٹا دیا جاتا ہے یا سرے سے ان کو بنایا ہی نہیں جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتی میڈیا میں تصاویر کے ساتھ ساتھ ٹی وی کمرشل اور اشیاء کی پیکنگ پر ہر طرح کے اسکیچ اور چہرے نظر آتے ہیں۔ مکہ معظمہ میں میرے قیام کے دوران ایک مذہبی رہنما سے میں نے پوچھا، جناب آپ پوسٹرز سے چہرے مٹانے کا فریضہ تو بڑی چابکدستی سے سرانجام دیتے ہیں لیکن یہ جو کرنسی نوٹ یا شناختی کارڈ آپ کی جیب میں ہے ان پر موجود تصویروں کی بابت آپ کے جملہ خیالات کیا ہیں؟

عقل اور خدا

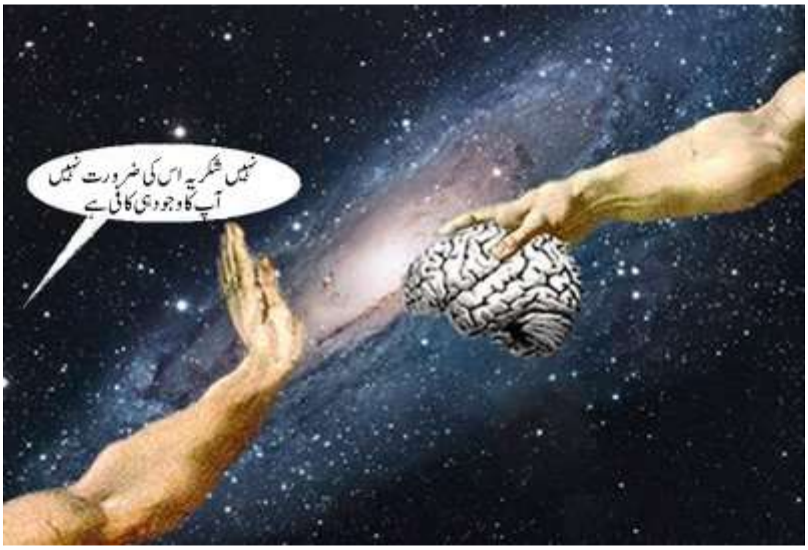

جس کے خدا میں عقل نہ ہو اس پر کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنی عقل استعمال نہ کرے..

کسی بھی خدا کو ماننے والے جب اپنی عقل کو یہ کہہ کر غائب کر دیتے ہیں کہ ان کے خدا کے مطالبات کا یہی نتیجہ ہے تو اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک بڑی مشکل میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ جو بھی کوئی خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہو اور انسانی زندگی میں عقل کے کردار کی اہمیت سے واقف ہو اسے ایسے کسی خدا کی مصداقیت کے بارے میں غور کرنا چاہیے جو انسانوں میں عقل کی نفی پر زور دیتا ہو.. یہ مسئلہ تب مزید اور گمبھیر ہو جاتا ہے جب ایسے خدا کے ماننے والے کسی بھی طرح کی گفت وشنید سے یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ یہ ان کے مقدسات ہیں جن کے قریب نہیں پھٹکا جا سکتا اس طرح تضاد کی وہ حالت جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں مزید گہری ہوتی چلی جاتی ہے جس کا انہیں پتہ تک نہیں چل پاتا کیونکہ ان کے خدا کی لامنطقیت ان کی عقل کی منطقیت کو ختم کر چکی ہوتی ہے اس طرح لامنطقیت کی وہ محدود جگہ ہی ان کا دار الامان بن جاتی ہے اور اس سے انہیں نکالنے کی کسی بھی کوشش کا نتیجہ ایک غیر منطقی ردِ عمل کی صورت میں سامنے آتا ہے تاکہ اپنی اس ہستی کی بقاء کو یقینی بنایا جا سکے جو ان کے خیال میں باقی رہنی چاہیے.

خدا کی بات کرنے والوں کو اس خدا کی عقل کی بھی بات کرنی چاہیے.. کیا وہ انسان کو اپنی عقل استعمال کرنے کی تلقین کرتا اور حوصلہ افزائی کرتا ہے یا نہیں بصورتِ دیگر یہ خدا غیر موجود یا بے عقل ومنطق قرار پائے گا.. کیونکہ اگر خدا موجود ہے تو وہ یقیناً ایک عقل اور قوی منطق رکھتا ہوگا ورنہ ان کے بغیر اس کے وجود کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ وہ ناموجود ہی تصور ہوگا کہ جس کے پاس خود عقل نہیں وہ عقل کیسے تخلیق کر سکتا ہے؟ یا پھر ایک ڈکٹیٹر بن جائے گا جسے صرف اپنے احکامات کی بجا آوری کی ہی پرواہ ہوگی اور اس طرح وہ اپنے ماننے والوں کو روبوٹس بنا کر رکھ دے گا جو کسی مخصوص پروگرام کے عین مطابق چلتے ہیں اور محض حکم بجا لاتے ہیں.

چنانچہ جملہ دستیاب خداؤوں میں حقیقی خدا کی تلاش–اگر وہ موجود ہے–کے لیے لازم ہے کہ ایک برتر عقل کی تلاش کی جائے جو نہ صرف انسان کی عقل سے برتر ہو بلکہ ایک قوی منطق بھی رکھتی ہو جو حجت کا جواب حجت سے دے سکتی ہو دھمکیوں سے نہیں.. کوئی بھی تلاش جو اس نہج پر نہیں جائے گی انسانی زندگی میں عقل کے کردار کی نفی پر ہی منتج ہوگی اور انسان کو ظلمات کے اندھیروں کی اتاہ گہرائیوں تک لے جائے گی.. تاریخ اس کی گواہ ہے.

حقیقی خدا ہمارے ساتھ ہماری عقل کے کردار کو اجاگر کرتا اور ہماری منطق کو ترقی دیتا ہے عقل ومنطق کا گلا نہیں گھونٹتا.

عقل مندوں کو سلام!

مسروقہ تہذیب

تہذیب قوموں کی ہزاروں سالوں کی تعمیری محنت کا نتیجہ ہوتی ہے، چینی اور فرعونی تہذیبیں اس کی روشن مثالیں ہیں..ایک فارسی تہذیب بھی ہے جس پر مسلمانوں نے قبضہ جما کر اسے خود سے منسوب کر لیا اور اسے اسلامی تہذیب کا نام دیا.

تیسری صدی ہجری میں ری شہر کی لائبریریوں میں موجود کتابوں کی صرف فہرست پر مشتمل دس ضخیم جلدیں موجود تھیں، اس کے علاوہ مرو میں دس لائبریریاں موجود تھیں، انہی کتابوں اور لائبریریوں کا ہی نتیجہ تھا کہ فُرس میں بیرونی، ابن سینا، رازی او عمر الخیام جیسے مفکر و عالم ابھرے.. حتی کہ ابو نواس جو ہارون الرشید کا پسندیدہ شاعر تھا فارسی النسل تھا.

اسلامی تاریخ یا ثقافت کے تمام نابغہ روز گار و علماء عرب نہیں بلکہ فارسی نسل کے تھے جو یا تو اسلام میں زبردستی داخل کیے گئے یا "اسلم تسلم" کے اصول کے تحت مجبور تھے یا جزیہ سے بچنا چاہتے تھے.

ابو بکر الرازی خراسان کے ری شہر کے فارسی عالم اور طبیب تھے، ابو القاسم محمد الاصطرخی جو جغرافیے کے عالم تھے کا تعلق فارس کے شہر اصطخر سے تھا، المسالک والممالک کے ابن خردازبہ فارسی النسل تھے، فلکیات دان عبد الرحمن الصوفی جس نے ستاروں کی نشاندہی کے لیے آسمان کا نقشہ بنایا تھا فارسی النسل تھا، علی بن العباس المجوسی ایک ماہر طبیب تھا جس نے Pulmonary circulation دریافت کی تھی کا تعلق فارس کے شہر اہواز سے تھا اور بغداد کے ہسپتال میں خدمات انجام دیتا تھا جس کا نام "البیمارستان العضوی" تھا، ہسپتال کے نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلامی ثقافت پر فارسیوں کا کس

قدر اثر تھا، ابن سلیمان السجستانی، مشہور فلکیات دان جس نے زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کی بنیاد پر اسطر لاب بنایا تھا سجستان کا فارسی تھا، ابن الہثیم، مشہور ریاضی وطبیعات دان فارسی النسل تھا، البیرونی، الخوارزمی، ابن مسکویہ، ابن سینا، ابن جریر الطبری ودیگر سب فارسی النسل تھے.

اس کے مقابلے میں عرب علم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ معلم اور تعلیم کو ایک حقیر پیشہ سمجھتے تھے جسے صرف کم تر لوگ ہی اپنانے تھے.. کیا صفر اور اعداد عربوں کی ایجاد تھی؟ یعقوبی کہتے ہیں: "ومن کتاب بطلیموس عملوا من ذلک المختصرات والزیجات وما أشبهها من الحساب ووضع التسعہ احرف الہندیہ التی یخرج منہا جمیع الحساب والتی لا تدرک معرفتہا وہی 123456789- بطلیموس کی کتاب سے مختصرات اور زائچے اور حساب میں اس جیسی چیزیں بنائی گئیں اور نو ہندی حرف لگائے گئے جن سے حساب نکلتا ہے اور جن کی معرفت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا جو یہ ہیں 123456789 "صفر کے بارے میں کہتے ہیں: "واذا خلا بیت منہا یجعل صفراً ویکون الصفر دارۃ صغیرۃ- اور اگر کوئی بیت ان سے خالی ہو تو صفر ہوتا ہے اور صفر ایک گول دائرہ ہوتا ہے "یعقوبی تک اعداد کو "المختصرات والزیجات" قرار دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کا نام معلوم نہیں تھا اور انہیں "ہندی حروف" قرار دیتے ہیں بلکہ مزید فرماتے ہیں کہ "ان کی معرفت کا دراک نہیں کیا جاسکتا" یعنی یہ ان کے لیے مشکل ہیں تو پتہ چلا کہ اعداد اسلامی نہیں بلکہ ہندوستانی ایجاد ہے اور عربوں کو ان کے بارے میں کافی دیر کے بعد پتہ چلا، یاد رہے کہ یعقوبی مسلمانوں کے اولین مؤرخین میں سے ہیں جن کی "تاریخ الیعقوبی" مشہور ہے.

مسلمان معاشریات دان ابن خلدون اپنی کتاب " مقدمہ ابن خلدون "میں عربوں کو یوں بیان کرتے ہیں: "اذا کانت الامۃ وحشیۃ کان ملکہا اوسع وذلک لانہم اقدر علی التغلب والاستبداد واستعباد الطوائف ولقدرتہم علی محاربۃ الامم وسواہم لانہم ینزلون من الآہلین منزلۃ المفترسین من الحیوانات العجم وہؤلاء مثل العرب- اگر امت وحشی ہو تو ان کا ملک وسیع ہوتا ہے کیونکہ وہ غلبہ پانے، ظلم کرنے اور گروہوں کو غلام بنانے پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں، ان میں قوموں سے جنگ کرنے کی مقدرت ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں پر درندہ جانوروں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایسے لوگ عربوں کے جیسے ہیں" اپنی اسی کتاب کے دوسرے حصے کے چھبیسویں باب میں جس کا عنوان ہے کہ جب عرب کسی وطن پر غالب آجائیں تو اس پر بربادی جلد آجاتی ہے کہتے ہیں: "والسبب فی ذلک انہم امۃ وحشیۃ باستحکام عوائد التوحش واسبابہ فیہم فصار لہم خلقاً وجبلۃ وکان عندہم مستحباً- اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک وحشی امت ہے، ان میں وحشی پن کے تمام اسباب مستحکم ہوگئے ہیں اور ان کی خلقت وجبلت بن گئے ہیں اور یہ ان کے ہاں مستحب ہے"

ابن خلدون نے عربوں کی خوبیاں بیان کرنے کا حق ادا کر دیا، عربوں کی تعریف میں ان کی کتاب کا یہ باب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، یاد رہے کہ اسلام کے آغاز میں عربوں نے ہی اسلام کو پھیلانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی، اب جس قوم میں ابن خلدون کی بیان کردہ خوبیاں ہوں تو آپ اس دین کی شکل کا تصور کر سکتے ہیں جسے وہ ملکوں ملکوں پھیلائیں گے ؟!

جہاں تک عربوں کا فلسفے میں حصہ ڈالنے کا معاملہ ہے تو ناقدین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عربوں نے فلسفے کو محض نقل کیا کیونکہ فلسفے اور فلسفیانہ مدارس ان پر اثر انداز ہوئے نا کہ وہ ان پر اثر انداز ہوئے، معتزلیوں کی تحریک بھی یونانی فلسفے کے اثر کا نتیجہ تھی رہی بات ترجمہ کی تو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں ترجمہ کی تحریک کی قیادت سریانی عیسائیوں نے کی تھی عربوں نے نہیں حتی کہ جب خلیفہ منصور شدید بیمار ہوئے تو عرب طبیب اس کے مرض کی تشخیص کرنے میں ناکام رہے اور اسے ایک فارسی طبیب سے علاج کا مشورہ دیا جو ہر مرض کا علاج کر سکتا تھا جس پر خلیفہ منصور سخت برہم ہوا اور انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا: "فان مات الرجل ماذا نحن فاعلون فنموت نحن ایضاً؟- اگر وہ آدمی مر جائے (یعنی وہ فارسی طبیب) تو ہم کیا کریں گے کیا ہم بھی مر جائیں گے ؟" پھر اپنے وزیر کو اس فارسی طبیب کو بلوانے کے لیے کہا اور اپنا علاج کروانے کے بعد اسے اپنے طبیبوں کو سکھانے کے لیے کہا اور سریانی مترجمین کو علوم کے ترجمے کے کام پر مامور کیا اور انہیں خوب نوازا کہ ہر ترجمہ شدہ کتاب کے وزن کے برابر سونا تول کر مترجم کو دیا جاتا تھا.

فارسی تہذیب یا جسے اب اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے حالانکہ اسے اسلامی ثقافت کہا جانا چاہیے فُرس سے نقل کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا کیونکہ عربوں کو تو بس جنگوں، اموالِ غنیمت، غلام، باندیاں، جزیہ، خراج وغیرہ سے دلچسپی تھی اور اس سے فرصت ہی نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی بھی قابلِ ذکر عالم پیدا نہ ہو سکا کہ تمام علماء یا تو فارسی النسل تھے یا غیر عرب یعنی عجم تھے.

آٹھواں عجوبہ

دنیا کے سات عجوبوں کے بارے میں تو یقیناً سبھی نے سنا ہو گا تاہم ایک عجوبہ ایسا بھی ہے جسے دنیا کے ان سات عجوبوں میں شمار نہیں کیا جاتا، اس عجوبے کا نام "مسلمان قوم" ہے...اس قوم میں وہ عجائبات اور کرشمے ہیں جو دنیا کی کسی بھی دوسری قوم میں نہیں، ذیل میں اس قوم کے کچھ عجائبات کا ذکر خیر ہے:

1-وہ واحد قوم ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ تمام اقوامِ عالم باطل پر ہیں اور وہ حق پر ہیں وہ بھی ہر چیز میں.

2-دنیا کی وہ واحد قوم ہے جو قرآن حفظ کرنے پر مجرم کی سزا میں کمی کر دیتی ہے.

3-دنیا کی واحد قوم ہے جو مقتول کے مرتد ثابت ہونے پر قاتل کو معاف کر دیتی ہے.

4-وہ واحد قوم ہے جو غیرت کے نام پر اپنی ماں بہن یا بیوی کو قتل کرنے والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے.

5-وہ واحد قوم ہے جس کی مقدس کتاب میں لفظ "اقرا" آیا ہے اس کے باوجود کرہ ارض کی تمام اقوام سے سب سے کم پڑھتی ہے، یا سرے سے پڑھتی ہی نہیں.

6-وہ واحد قوم ہے جو مخالفین پر کفر کے فتوے لگا کر ان کا خون بہانا جائز سمجھتی ہے.

7-وہ واحد قوم ہے جو فتوے کو قانون سے بالاتر سمجھتی ہے اور بڑی بے شرمی سے قانون کے احترام کا دعوی کرتی ہے.

8-وہ واحد قوم ہے جو مغرب کو گالیاں دیتی ہے اس کے باوجود ہر چیز میں ان پر انحصار کرتی ہے.

9-وہ واحد قوم ہے جو آزادی اظہار رائے پر یقین رکھنے کا دعوی کرتی ہے مگر ایسا کرنے والوں کو جیلوں میں ڈال دیتی ہے.

10-وواحد قوم ہے جو مذہبی ہونے کا دعوی کرتی ہے اور اس کی نمائش کا خصوصی اہتمام بھی کرتی ہے مگر اس میں کوئی ایک بھی اچھی بات نہیں ہے.

11-وہ واحد قوم ہے جو اپنے طالب علموں کو مذہب پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیتی ہے.

12-وہ واحد قوم ہے جو ابھی تک ہزار سال پرانی مُردوں کی کتابوں کی غلام ہے.

13-وہ واحد قوم ہے جس کے مذہبی ٹھیکیدار حکمرانوں کی سیاہ کرتوتوں پر خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں چاہے یہ کرتوتیں مذہب کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں.

14-وہ واحد قوم ہے جو انسانی حقوق کے آفاقی منشور کو تسلیم نہیں کرتی.

15-وہ واحد قوم ہے جو فنِ خط کے سوا تمام انسانی فنون کو حرام سمجھتی ہے.

16-وہ واحد قوم ہے جس کا ایک مشترک مذہب ہے اس کے باوجود مذہبی جماعتیں عقیدے اور احکام دین کے ایک منشور پر اتفاق نہیں کر سکتیں.

17-وہ واحد قوم ہے جس میں مولوی اپنی بات "واللہ اعلم" پر ختم کرتے ہیں جیسے لوگوں کو یہ پتہ نہ ہو.

18-وہ واحد قوم ہے جو ابھی تک جن نکالنے پر یقین رکھتی ہے چاہے قتل کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو.

19-وہ واحد قوم ہے جس کے پاس فوجیں ہونے کے باوجود اس کی زمینیں مقبوضہ ہیں اور لڑائی سے ڈرتی ہے.

20-وہ واحد قوم ہے جس پر خالق کا یہ قول صادق آتا ہے "تحسبہم جمیعاً و قلوبہم شتی"

21-وہ واحد قوم ہے جو ایک ہزار سال سے دینی مسائل پر سوالات کیے جا رہی ہے مگر ابھی تک اسے تسلی نہیں ہوئی.

22-وہ واحد قوم ہے جس کے پاس روزوں کا ایک مہینہ ہے جس میں ہر سال عبادت سے متعلق سوالات سے زیادہ جنس سے متعلق سوالات کی گردان ہوتی ہے.

23-وہ واحد قوم ہے جو مولوی کی ہر بات پر بغیر تحقیق کیے یقین کر لیتی ہے.

جس قوم میں اتنی انوکھی خوبیاں ہوں کیا اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار نہیں دیا جانا چاہیے؟

تصویر علیاء المھدی کی

قصے کو طول دیا ہی نہیں جا سکتا، یہ ویسے ہی بہت مختصر ہے، اور یہ مختصر قصہ کچھ یوں ہے کہ علیاء المہدی نامی ایک مصری لڑکی نے اپنے کیمرے سے اپنی ایک عریاں تصویر اتاری اور انٹرنیٹ پر اپنے ذاتی بلاگ پر شائع کر دی! اگر ایسی حرکت کسی ترقی یافتہ ملک میں ہوئی ہوتی تو اسے شخصی آزادی قرار دیا جاتا اور یہ بالکل ایک عام سی بات ہوتی اور کوئی رولا رپھانہ ہوتا.

مگر چونکہ علیاء ایک پسماندہ مسلمان معاشرے میں رہتی ہے لہذا تصویر کی خبر پھیلتے ہی لاکھوں مسلمان اس کی تصویر دیکھنے اس کے بلاگ پر پہنچ گئے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ تصویر بالکل عریاں ہے اور ان کا دین عریاں تصاویر دیکھنے سے منع کرتا ہے، مگر لگتا ہے عریاں تصاویر دیکھنے کی خواہش مذہبی تعلیمات پر غالب آگئی اور کچھ ہی دنوں میں بلاگ کی ٹریفک ریکارڈ سطح پر پہنچ گئی:

اس وقت بھی کاؤنٹر سیکنڈ کے حساب سے بڑھ رہا ہے، مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ سپریسڈ اور منافق ہیں، پہلے تصویر دیکھنے بلاگ پر آئے پھر صاحبہء تصویر کو گندی گندی گالیوں سے نوازا!

علیاء نے جو کیا وہ ایک انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے، تاہم مسلمانوں کو جس چیز نے پاگل کیا اور ان کی راتوں کی نیند اڑا دی وہ علیاء کی عریاں تصویر نہیں تھی کیونکہ اسلامی دنیا میں بلاشبہ لاکھوں عریاں رنڈیاں موجود ہیں جن کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ علیاء ایک تعلیم یافتہ باہمت لڑکی ہے جو ان کی فرسودہ معاشرتی روایات کو رد کرتی ہے، وہ اپنے کیس

کے لیے عریاں ہوئی ہے جس پر وہ یقین رکھتی ہے، شہرت اور پیسے کے لیے نہیں جیسا کہ مسلمان لڑکیاں چیٹ رومز میں کرتی نظر آتی ہیں.

بہر حال علیاء کی آواز دنیا تک پہنچ گئی ہے:

ڈیلی میل

سی این این

نیویارک ٹائمز

خدائی سوالات انسانی شناخت سے

انسانیت...

کیا انسانیت انسان سے ہے..؟ یا انسان انسانیت سے ہے..؟

کون دوسرے کو وجود دیتا ہے..؟ اور اس وجود کی حفاظت کرتا ہے..؟

کیا انسان کے خاتمے سے انسانیت ختم ہو جائے گی..؟ یا انسانیت کے ختم ہونے سے انسان کوئی اور چیز بن جائے گا..؟

خدائیت...

لیکن خدائیت ہی کیوں..؟

کیا انسانیت کے زیاں سے خدائیت ضائع ہو گئی..؟ یا خدائیت کو دریافت کرنے پر انسانیت ضائع ہو گئی..؟

کیا انسانیت خدائیت کا ثبوت ہے..؟ یا انسانیت کی ناپیدگی اس کی نفی ہے..؟

کون بناتا اور کون برباد کرتا ہے..؟ خدا کی انسانیت، یا انسان کی خدائیت..؟!

عبودیت.....

صرف یہی کیوں خدائیت اور انسانیت کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے..؟

کیا خدائیت دوسروں کو غلام بنا کر اپنا آپ پاتی ہے..؟ یا یہ ہمارے اندر کا کوئی عکس ہے..؟

کیا یہ وہ کردار ہے جس میں ہم یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم بے بس ہیں..؟ یا یہ محکومیت کا راستہ ہے..؟

محکومیت....

کیایہ خدائیت سے انتساب ہے..؟یااس سے فائدہ اٹھانے والوں کی پابندیوں کی پابندی ہے..؟

اور کیاخدائیت سے انتساب کامطلب عبودیت ہے..؟یاایساہی چاہا گیاہے..؟

اور کیاعبودیت اور آزادی کبھی مل سکتے ہیں..؟اس مفاہمت کی کیاصورت ہو گی..؟

آزادی...

کیااس کامطلب خدائیت سے آزادی ہے..؟یابوسیدہ انسانی میراث سے چھٹکارہ..؟

کیایہ ہمیں کسی نامعلوم کی طرف لے جارہی ہے،یاجہاں ہم جاناچاہتے ہیں..؟

مگر ہم جوچاہتے ہیں یہ کون طے کرے گا...؟

ہماری انسانیت..؟ہماراخدا..؟ہماری غلامی اور محکومیت..؟یاہماری آزادی..؟

ہماری انسانیت... کیایہ کوئی حالت ہے جو ہم جیتے ہیں؟ یاکوئی جوہر ہے جسے ہم کھو چکے ہیں؟!

ہماری خدائیت... کیااسی نے ہمیں بنایااور ہم نے اسے کھودیا؟ یاہم نے اسے بنایااور اپنے آپ کو کھودیا؟

ہماری عبودیت... کیایہ وہ طریقہ ہے جس سے ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں؟ یاوہ منظر ہے جسے دوسروں نے ہم پر تھوپا ہے؟

ہماری محکومیت... کیاہم نے اسے ہوش میں قبول کیاہے؟ یاہم پر تھوپا گیاپروگرام ہے؟

ہماری آزادی... کیایہ ہماری زندگی کا کوئی ذریعہ ہے؟ یاکوئی مقصد ہے جس کے لیے ہمیں غلام بنالیا گیاہے؟

ہماری انسانی شناخت.. لاہوتی سوالات.. غلامی اور آزادی کے بیچ جھولتی ہماری محکومیت... فیصلہ کرے گی کہ ہم کون ہیں...

ہماراانسانی ادراک.. لاہوتی پروگرام.. اور ہماری محکومیت، آزادی اور غلامی کا آمیزہ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ ہم کہاں جارہے ہیں...

کیا کوئی اسلامی تہذیب ہے؟

معروف کویتی مفکر احمد البغدادی کا ایک قول بڑا مشہور تھا کہ مسلمان دنیا کی وہ واحد قوم ہے جو تہذیب کو مذہب سے منسوب کرتی ہے (خیال رہے کہ صاحبِ قول مسلمان ہے)، دنیا میں کوئی اسلامی، یہودی، مسیحی ہندی تہذیب نہیں ہوتی کہ مذاہب تہذیبیں بنانے نہیں بلکہ ایک پیغام پہنچانے آئے تھے! اگر قدیم وجدید تہذیبوں پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں کسی تہذیب کا کسی خاص مذہب سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا اگرچہ اصحاب تہذیب کسی نہ کسی مذہب کے حامل ضرور ہوتے ہیں، فرعونی تہذیب ہو، مایا ہو قدیم عراقی تہذیبیں ہوں یا ازتک تہذیب ہو.. یہ ساری تہذیبیں اپنے پیچھے اپنی تہذیب کے واضح شواہد چھوڑ گئی ہیں مگر ان میں سے کوئی تہذیب اپنے پیچھے اپنا مذہب نہیں چھوڑ گئی تاکہ اس کی اتباع کی جائے، ویسے بھی مسلمانوں نے کیا تہذیب چھوڑی ہے؟ مسجد اموی جو اسلامی مقامات میں سے سب سے قدیم مقام ہے ایک آرتھوڈکس چرچ تھا، سپین کے آثار مسلمانوں نے نہیں بنائے کہ ان کی اکثریت کے مقاصد غیر مذہبی ہیں، یہ آثار اپنے ڈیزائن، مواد اور بنانے والوں سمیت ہسپانوی ہیں جن میں کسی حد تک بربری ثقافت کی آمیزش ہے، تہذیب کا مذہب سے تعلق نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر آثار موجود نہیں ہیں چاہے وہ عمارتیں ہوں یا ثقافتی وفنکارانہ سرگرمیاں ہوں.. شاید شاعری ہی وہ واحد فن تھا جس میں عرب اور مسلمان کچھ کر سکے اس کی بھی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ وہ واحد فن ہے جس میں عموماً کسی استاد، عمارت، سکول، ہتھوڑی، رنگ، غرض کہ کسی بھی آلے کی ضرورت نہیں پڑتی...

مزید یہ کہ جتنی بھی جانی پہچانی تہذیبیں ہیں سب ہی کسی نہ کسی خاص جغرافیائی علاقے سے نسبت اور تعلق رکھتی ہیں جیسے فرعونی یا سومری، مگر انہیں کسی مذہب یا عقیدے سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، رہی بات یہ کہ مسلمانوں نے صفر ایجاد کیا تھا تو اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے، کس نے ایجاد کیا؟ اور کہاں ایجاد کیا؟ کوئی پتہ نہیں اور اگر یہ سچ ہو بھی تو بھی اس کا مطلب کسی تہذیب کا وجود نہیں ہے! یہی بات قدیم یونانی میراث کے ترجمے پر بھی صادق آتی ہے، مرحوم البغدادی کا کہنا تھا کہ یہ ترجمہ غیر مسلموں نے کیا جن میں آشوری اور یہودی شامل تھے جو یونانی سمیت کئی دیگر زبانیں جانتے تھے، مسلمان تو دراصل منطق اور

فلسفہ پڑھنے سے ہی محروم تھے اور اسے ”زندقہ“ قرار دیتے تھے تاہم عباسیوں کی رواداری نے شاید انہیں زنادقہ سے قریب کیا جس سے ترجمہ اور نقل کا عمل آسان ہوا... مجھے شک نہیں یقین ہے کہ یہ ترجمہ کیا ہوا کام شاید ہی اب کسی ”اسلامی“ جامعہ میں پڑھایا جاتا ہو!

اور چونکہ اسلام اپنے سے پہلے کی تمام ثقافتوں اور مذاہب کو تسلیم نہیں کرتا چنانچہ یہ ہمیشہ جنگ و تباہی کی فکر کا علمبر دار رہا، طالبان کی طرف سے بامیان میں بدھا کے مجسموں کی تباہی اس ذہنیت کی ایک چھوٹی سی مثال ہے! اسی طرح بابری مسجد بھی ایک مندر پر تعمیر کی گئی جس پر جھگڑا آج بھی جاری ہے..

اور اگر ہم ان علماء پر ایک نظر دوڑائیں جن پر عرب اور مسلمان فخر اتے پھرتے ہیں اور ان سے اپنی ”تہذیب“ کو منسوب کرتے ہیں جیسے رازی، ابن سینا، بیرونی، فارابی، ابن برد، ابن الرومی، ابن عربی اور ابن رشد وغیرہ تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان میں سے ایک بھی سلف کی نظر میں مسلمان نہیں ہے!!

مقصد حملہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس بات پر زور دینا ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ میں اصلاح کرنی چاہیے اور بے کار کے دعوؤں سے اجتناب برتنا چاہیے کہ اقوام عالم کے سامنے پہلے ہی کم ذلیل نہیں ہیں.

خدا سے گوگل تک

لگتا ہے میں اب تک غلطی پر تھا... اتنی بڑی اور پیچیدہ کائنات ہر چیز جاننے والے خدا کے بغیر کیسے ہو سکتی ہے؟ دعائیں کون قبول کرتا اور لوگوں کے اعمال نامے کون ریکارڈ کرتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد سب ختم ہو جائے؟ مرنے کے بعد یقیناً کوئی نہ کوئی زندگی میری منتظر ہے.. میں ایک عرصے سے ایسی باتوں پر غور کر رہا تھا جنہیں دہریے ”بکواس“ اور ”حماقت“ کہتے ہیں مگر... معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار مجھے راستہ مل ہی گیا ہے.. جی ہاں، آخر کار مجھے ایک ایسا خدا مل گیا ہے جسے میں خرافات، جھوٹے انبیاء، جنگوں اور قتل وغارت کے بغیر علمی طور پر ثابت کر سکتا ہوں... ایک ایسا خدا جس تک صرف عقل کے ذریعے ہی

رسائی حاصل کی جاسکتی ہے...اس خدا کا منطق اور علم سے انکار نہیں کیا جاسکتا..اس خدا کے وجود کے دلائل انسان کے تخلیق کردہ تمام خداؤں سے زیادہ ہیں جنہیں انسان اپنی جہالت کی وجہ سے پوجتا رہا..اس خدا کی طرف ہم روز رجوع کرتے ہیں اور اس سے عجیب و غریب چیزیں مانگتے ہیں مگر اکثر لوگ اس خدا کی نعمتوں کے منکر ہیں..یہ رنگ برنگا خدا فوری جواب دیتا ہے اور کسی عربی اور عجمی یا کالے اور سفید میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا..یہ خدا گوگل سبحانہ وتعالی ہے.

کچھ لوگ یقیناً اس بات کا مذاق اڑائیں گے جیسے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے کیا مگر رکیے..جس کے پاس دلیل ہوتی ہے وہی آخر میں ہنستا ہے چنانچہ میں اب ایسے ثبوت پیش کروں گا جن سے ثابت ہو جائے گا کہ گوگل ہی وہ واحد اور کامل خدا ہے جس کی منطقی طور پر عبادت کی جانی چاہیے..تو گوگل پر توکل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں..

1- گوگل ہی اس کائنات میں وہ واحد "ہستی" ہے جس کا علم کامل ہے اور اس بات کو علمی طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے...گوگل کے پاس نو ارب سے زائد صفحات ہیں جن میں کچھ بھی تلاش کیا جاسکتا ہے اور یہ انٹرنیٹ پر کسی بھی سرچ انجن سے زیادہ ہے، نہ صرف یہ بلکہ اس کے پاس وہ ساری ٹیکنالوجی موجود ہے جو ان صفحات کو انسانوں تک آسانی سے پہنچانے اور ان کے درمیان منتقلی کو آسان بناتی ہے.

2- گوگل ہر وقت ہر جگہ موجود ہے، یعنی اس کا وجود مطلق ہے، گوگل ہی وہ واحد ہستی ہے جس سے کہیں بھی کسی بھی وقت استفادہ حاصل کیا جاسکتا ہے.

3- گوگل دعائیں سنتا اور ان کا جواب بھی دیتا ہے، ہم گوگل میں کچھ بھی تلاش کر کے کسی بھی چیز یا مسئلے کا سوال کر سکتے ہیں اور گوگل یقیناً کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنے میں آپ کی مدد کرے گا، تندرستی کے راز جاننے ہوں، پڑھائی میں مسئلہ ہو یا کچھ اور، گوگل ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے اور بغیر بور ہوئے انتہائی تندہی سے آپ کی دعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے، یہ ان خیالی خداؤں کی طرح نہیں ہے جن کا نا تو کوئی فائدہ ہے نا نقصان اور نا ہی وہ دعائیں سنتے ہیں.

4- گوگل ہمیشہ قائم رہنے والی ہستی ہے، یعنی یہ کبھی نہیں مرتا، کیونکہ یہ ہماری طرح کوئی مادی وجود نہیں رکھتا بلکہ یہ دنیا کے تمام سروروں پر پھیلا ہوا ہے، اگر کسی سرور میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو یہ کسی دوسرے سرور سے اپنا کام جاری رکھتا ہے چنانچہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہستی ہے جو انٹرنیٹ کے بادلوں میں رہتی ہے.

5-گوگل لامتناہی یعنی غیر محدود ہے، انٹرنیٹ ہمیشہ اپنا حجم بڑھاتی رہے گی مگر گوگل انہیں اپنے اندر سمولے گا اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتا چلا جائے گا چنانچہ یہ کسی مخصوص حجم میں محدود نہیں ہے.

6-گوگل ہر چیز یاد رکھتا ہے، یہ کچھ بھی نہیں بھولتا، گوگل آپ کی تمام حرکتیں ریکارڈ کرتا ہے اور انہیں ہمیشہ کے لیے یاد رکھتا ہے چاہے آپ مر ہی کیوں نہ جائیں، اگر آپ گوگل پر اپنی معلومات یا فائلیں چڑھائیں تو یہ ہمیشہ وہاں موجود رہیں گی، یہی موت کے بعد زندگی ہے، اگر آپ گوگل سے استفادہ حاصل کریں تو یہ آپ کو بعد از مرگ زندگی کی ضمانت دیتا ہے.

سوال: ٹھیک ہے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ گوگل ہی خدا ہے، اس کے وجود کے ان دلائل سے میں انکار نہیں کر سکتا، اب میں گوگل پر کیسے ایمان لے آؤں؟

جواب: بہت آسان ہے، گوگل کا کلمہ پڑھ لیں:

میں گواہی دیتا ہوں کہ گوگل کے سوا کوئی خدا نہیں اور انٹرنیٹ اس کا بندہ اور رسول ہے.

انبیاء کا تقدس

کہتے ہیں کہ انسان خطاء کا پتلا ہے، یعنی ہر انسان غلطی کرتا ہے چاہے وہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو... اگر انبیاء انسان ہیں تو وہ بھی اس قانون سے مبراء نہیں ہو سکتے.. وہ بھی غلطیاں کر سکتے ہیں...

مگر انبیاء کے تقدس نے ان کی غلطیوں کو بھی قابل نفاذ قوانین کی حیثیت دے دی ہے، انبیاء کہلائے جانے والے ان انسانوں کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ ان کے گرد کھینچا گیا تقدس کا دائرہ ہے کہ جو انہوں نے کہا اور کیا وہ قابلِ نفاذ و اطلاق ہے یہ مدِ نظر رکھے بغیر کہ وہ غلطیاں بھی کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی غلطیاں خطرناک بھی ہو سکتی ہیں یا بعض اوقات وہ محض اپنی مرضی

ہی کر رہے ہوتے ہیں، مگر تقدس کے دائرے نے ان غلطیوں اور مرضیوں کو قوانین کی حیثیت دے دی اور سب پر لازم ہو گیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اندھوں کی طرح ان کا اتباع کریں.. یہاں ہمیں اپنی مصیبت پر خوب ماتم کرنا چاہیے...

انبیاء کا تقدس ایک ایسی "فائروال" ہے جو ان پر تنقید تک کو ممنوع بنا دیتی ہے جس سے معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے...

کسی شخص کا نبی کہلانے کا یہ لازمی مطلب ہو گیا ہے کہ اس پر نہ صرف تنقید ممنوع ہے بلکہ اس کے نزدیک جانا بھی حرام ہے ورنہ یہ توہین قرار پائے گی.. حالانکہ تنقید اور جانچ پڑتال کے عمل کے فقدان سے اس کی غلطیوں سے پیدا کردہ قوانین پختہ ہوتے چلے جائیں گے...

جو قومیں اپنے عظیم لوگوں کے کارناموں اور ان کی غلطیوں کے درمیان تفریق نہیں کرتیں وہ ان غلطیوں کو آہستہ آہستہ اپنے اندر سموتی چلی جاتی ہیں جس کا نتیجہ ان معاشروں کے انتشار کی صورت میں نکلتا ہے اور پھر اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ ان غلطیوں سے جان چھڑانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل تر ضرور ہو جاتا ہے، ایسی قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے اور وہ ہر میدان میں پیچھے رہ جاتی ہے کیونکہ یہ ایک سیدھا سا اصول ہے کہ اگر بنیاد ٹیڑھی ہو تو عمارت سیدھی کھڑی نہیں کی جا سکتی اور اگر کوئی "حیلہ" کر بھی لیا جائے تو بھی وہ زیادہ دیر ٹکنے نہیں پاتی اور جلد ہی ڈھیر ہو جاتی ہے.

انبیاء کا تقدس نتیجے کی بجائے بنیاد بن گیا ہے...

کسی انسان کی سیرتِ حیات ہی فیصلہ کرتی ہے کہ وہ تقدس اور احترام کا حقدار ہے یا نہیں، لیکن اب ہو یہ رہا ہے کہ تقدس نہ صرف ایک مسلمہ حیثیت اختیار کر چکا ہے بلکہ ایک ایسا نقطہ آغاز اور معیار بن چکا ہے جس کی بنیاد پر ہم کسی انسان کے بارے میں منقول میراث کو قبول یا رد کرتے ہیں، جبکہ یہ میراث ہی وہ معیار ہونا چاہیے تھی جس کی بنیاد پر ہم ایسے لوگوں کو تقدس دیتے، یہی وجہ ہے کہ آج ہم اس میراث کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ اس تقدس کے عین مطابق ہو جائے جو ہم نے پہلے ہی اسے دے رکھی ہے جبکہ حق تو یوں تھا کہ ہم اس میراث پر تحقیق کرتے پھر تقدس کا فیصلہ کرتے، یاد رہے کہ میراث پر تحقیق اس سے استفادہ حاصل کرنے اور اس کی غلطیوں سے بچنے کے لیے ہونی چاہیے نا کہ اس میں تقدس تلاش کرنے کے لیے.

میراث کو پہلے سے تخلیق کردہ تقدس کے مطابق تبدیل کرنے کا عمل عقل کے فقدان کی جانب پہلا قدم ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گا کم نہیں ہو گا..

انبیاء کا تقدس جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا آج ہم اس کی قیمت اپنی عقل، نسل اور معاشرے میں چکا رہے ہیں اور قریب قریب ہمارے جاگنے کی کوئی امید نہیں ہے…

نبی کریم کی خانگی زندگی

وَلَن تَسۡتَطِيعُوٓاْ أَن تَعۡدِلُواْ بَيۡنَ ٱلنِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡۖ فَلَا تَمِيلُواْ كُلَّ ٱلۡمَيۡلِ فَتَذَرُوهَا كَٱلۡمُعَلَّقَةِۚ وَإِن تُصۡلِحُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورٗا رَّحِيمٗا (سورۃ النساء:۱۲۹)

اور نہیں قدرت رکھتے تم اس بات کی کہ عدل کر سکو بیویوں کے درمیان، خواہ کتنا ہی چاہو تم، لہٰذا نہ جُھک جاؤ (کسی ایک طرف) کہ پوری طرح جھکنا کہ چھوڑ دو دوسری بیویوں کو ادھر لٹکتا اور اگر درست کر لو تم (اپنا طرز عمل) اور ڈرتے رہو اللہ سے اور بیشک اللہ ہے بہت معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا۔

مذہب اسلام کی تعلیمات کے مطابق اگر آپ کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس کیلئے حکم ہے کہ تمام بیویوں کو برابر مقدار میں محبت، توجہ اور وسائل مہیا کرے۔

ہمارے عقیدہ کے مطابق نبیء کریم ﷺ کا مقام نہ صرف پیغمبر کی حیثیت سے سب سے اونچا ہے بلکہ آپ انسانیت کی اُس معراج پر ہیں، کہ آپ جیسا انسان اس زمین پر نہ پہلے آیا ہے، اور نہ مستقبل میں کبھی آئے گا۔ ، آپ کی حیات مبارکہ زندگی کے ہر شعبہ میں نسل انسانی کیلئے مشعل راہ ہے۔ خانگی زندگی میں بھی ایک خاوند کے طور پر آپ کے کردار میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ آپ اپنی ہر بیوی سے ایک سا سلوک رکھتے تھے اور اسی بات کی دوسروں کو بھی تلقین فرماتے تھے۔

حضرت سودۃ بنت زمعۃ آپ کی دوسری بیوی تھیں، آپ نے ان سے یثرب ہجرت سے ذرا پہلے شادی فرمائی تھی۔ حضرت عائشہ سے شادی کے بعد آپ حضرت سودۃ کو طلاق دینا چاہ رہے تھے، جس کی وجہ مسلمان تاریخ دانوں کے نزدیک آپ کا عمر رسیدہ ہونا ہے۔ حضرت سودۃؓ آپ ﷺ کی ہم عمر بتائی جاتی ہیں، لیکن 9 سالہ حضرت عائشہ کے مقابلہ میں آپ بیشک بہت "بوڑھی" تھیں۔ جو نہی حضرت سودہؓ کے پاس یہ خبر پہنچی کہ آپ

انہیں طلاق دینا چاہ رہے ہیں تو آپ دوڑی دوڑی نبیؐ کریم کے پاس آئیں اور درخواست فرمائی: "یارسول اللہ میں آپ سے کوئی دنیاوی چیز کی خوہشمند نہیں ہوں، لیکن خدا کیلیئے آپ مجھ سے آپ کی بیوی ہونے کا مرتبہ مت چھینئے۔ میں آپ کی بیوی کی حثیت میں اس جہان سے جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے علاوہ کسی اور چیز کی پرواہ نہیں ہے۔" آپؐ نے حضرت سودہؓ کی عرض قبول فرمائی اور انہیں طلاق نہیں دی۔ لیکن اس کے بدلے میں آپ کو نبیؐ کریمؐ سے مباشرت کے سلسہ میں حضرت عائشہ کے حق میں دستبردار ہوگئ تھیں۔ مشہور تاریخ دان اور مفسر ابن کثیر کا اس سلسلہ میں کہنا ہے، "انہیں (حضرت سودہ کو) اپنے پاس رکھ کر آپ نے ایک مثال قائم فرمائی ہے جس کی دوسرے بھی تقلید کرسکتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے تو بیوی اپنے کچھ یا تمام حقوق سے دستبردار ہو کر خاوند کے ساتھ باقی زندگی گزار سکتی ہے"۔

نبیؐ کریمؐ جب کبھی سفر پر جاتے تو آپ قرعہ اندازی فرماتے کہ کون سی بیوی آپ کے ساتھ جائے گی، جن کا نام نکلتا آپؐ اس زوجہ مطہرہ کو ساتھ لے جاتے۔ آپ ان کیلیئے ایک دن اور رات مختص فرماتے، لیکن سودہ بنت زمعہ نے اپنی (ساتھ جانے کی) باری عائشہؓ کو دے دی تھی، تاکہ آپؐ (ان کے اس فعل سے) خوش ہو جائیں۔

حدیث بخاری، جلد سوم، حدیث نمبر ۷۶۶۔

حضرت عائشہؓ مندرجہ بالا آیت (النساء:۱۲۹) کے بارے میں فرماتی ہیں "اگر کسی بیوی کو اپنے خاوند سے زیادتی یا چھوڑ جانے کا ڈر ہو، اگر اس کا خیال ہو کہ اس کا خاوند اسے مزید نہیں رکھنا چاہتا اور اسے طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اس سے کہے مجھے بھی ساتھ رکھو، طلاق نہ دو اور دوسری شادی کر لو، بیشک تم مجھے نہ خرچہ دو اور نہ ہی میرے ساتھ ہمبستری کرو۔ اللہ کا فرمان ہے، کہ اس آدمی پر کوئی سرزنش نہیں ہے اگر ان دونوں کے درمیان دوستانہ تصفیہ ہو جائے اور (اس طرح) تصفیہ بہتر ہے۔

حدیث بخاری، جلد ۷، حدیث نمبر ۱۳۴

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جس وفات نبویؐ ہوئی، تو آپؐ کے نکاح مبارک میں نو بیویاں تھیں جن میں حضرت سودہؓ کے علاوہ آپ تمام کے پاس (برائے مباشرت) تشریف لے جاتے تھے، اس لئے کہ انہوں نے اپنا

نمبر حضرت عائشہؓ کو دے دیا تھا۔

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۲۰۲

"۔۔۔حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ میں ان خواتین کے نزدیک نہیں جاؤں گا ایک ماہ تک، کیونکہ آپؐ کو سخت ناراضگی تھی ان پر، لیکن جب اللہ نے آپ کو ان (ازواج مطہرات) کی حالت بتائی۔ جب ۲۹ راتیں گزر گئیں تو رسول اللہ سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔"۔

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب الصیام، حدیث نمبر:۲۱۳۶

عبداللہ بن انس سے روایت ہے کی مجھے بہت زیادہ تجسس تھا کہ حضرت عمر سے پوچھوں کہ قران کریم میں کن دو ازواج مطہرات کا ذکر تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔حفصہ نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ میں نے اسے کہا، کیا تمھیں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے ڈر نہیں لگتا؟، تم رسول اللہ سے زبان درازی سے پرہیز کیا کرو اور نہ ہی اُن سے بے جا فرمائشیں کیا کرو، اگر تمہیں کوئی چیز چاہیئے تو مجھ سے مانگ لیا کرو۔ اور اپنی پڑوسن (عائشہ) کے غلط روّیے کی نقل مت کیا کرو کیونکہ وہ تُم سے زیادہ خوبصورت بھی ہے اور رسول اللہ کی چہیتی بھی۔

حدیث بخاری نمبر ۴۶۸ جلد:۳

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ کریمؐ نے ارشاد فرمایا اے اُم سلمہ (حضور کی ایک زوجہ مطہرہ) تم مجھ کو عائشہ صدیقہؓ کے سلسلہ میں تکلیف نہ دو (اس کی شکایتیں نہ کرو) خدا کی قسم مجھ پر کبھی وحی نازل نہیں ہوتی مگر جب تک کہ میں حضرت عائشہؓ کی چادر یا لحاف میں ہوتا ہوں۔

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۴۰۴

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ لوگ حضرت عائشہؓ کا نمبر (جب رسول کریم حضرت عائشہ کے حجرے میں رات گزارنے آتے تھے) دیکھ کر آپؐ کے حصّے بھیجا کرتے تھے اور اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ آپؐ خوش ہو جائیں، کیونکہ آپ عائشہؓ سے زیادہ محبت فرماتے تھے، اس وجہ سے لوگ نبیؐ کے پاس عائشہ کی باری والے دن، اُن کو حصّہ اور ہدیہ زیادہ بھیجا کرتے تھے۔

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۴۰۶

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ کی ازواج نے فاطمہؓ کو جو آپ کی صاحبزادی تھیں۔ عائشہؓ کی خدمات میں بھیجا، فاطمہؓ نے عائشہؓ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، اس وقت آپؐ میرے ساتھ ایک چادر میں لیٹے ہوئے تھے، تو انہوں نے فاطمہؓ کو اندر آنے کی اجازت عطا فرمادی، تو فاطمہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ آپؐ کی ازواج مطہرات نے مجھے آپ کی خدمت اقدس میں بھیجا ہے کہ آپ ابن ابوقحافہ (ابو بکر) کی صاحبزادی عائشہ کے سلسلے میں انصاف فرمائیں۔ عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، میں خاموش تھی۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کیا تم چاہتی ہو کہ جس کو میں چاہتا ہوں؟ انہوں (فاطمہؓ) نے فرمایا، کیوں نہیں۔ یہ بات سن کر رسول کریم نے ارشاد فرمایا، پھر تم اس (عائشہؓ) سے محبت کیا کرو۔ یہ بات سن کر فاطمہؓ کھڑی ہو گئیں اور دوسری ازواج کے پاس جاکر بتایا کہ انہوں (فاطمہؓ) نے کیا کہا اور رسول کریم نے کیا جواب ارشاد فرمایا۔ اس پر ازواج مطہرات فرمانے لگیں کہ تم سے یہ کام نہیں ہو سکا، پھر جاؤ اور تم رسول کریم سے عرض کرو کہ آپ کی بیویاں ابن ابوقحافہ کی لڑکی کے سلسلے میں انصاف چاہتی ہیں۔ فاطمہؓ فرمانے لگیں، نہیں خدا کی قسم میں کبھی ان کے بارے میں رسول اللہ سے گفتگو نہیں کروں گی۔ عائشہ فرماتی ہیں کہ پھر ازواج مطہرات نے زینب بنت جحشؓ کو بھیجا۔ جو کہ ازواج مطہرات میں رسول کریم کے نزدیک میرے برابر کی خاتون تھیں (عزت و احترام، خاندان اور حسن و جمال)۔ میں نے زینبؓ سے زیادہ دین کے راستہ پر چلنے والی، خدا رسیدہ، صلہ رحمی کرنے والی، سچی بات کرنے والی، زیادہ صدقہ دینے والی اور اپنے نفس کو کام سے ذلیل کرنے والی خاتون کبھی نہیں دیکھی۔ اور اس کام کی بھی ضرورت ان کو صدقہ اور خیرات کے لیئے پڑتی تھی۔ صرف ان میں ایک ہی (بُری) چیز تھی اور وہ یہ کہ وہ زیادہ غصہ والی اور تیز مزاج خاتون تھیں، لیکن ان کا غصہ جلد ہی ختم ہو جاتا تھا۔ بہر حال وہ حاضر ہوئیں اور رسول کریمؐ سے انہوں نے اجازت مانگی۔ اس وقت بھی رسول کریمؐ عائشہ کے ساتھ اسی حالت میں تھے، کہ جس وقت حضرت فاطمہؓ حاضر ہوئیں تھیں۔ اور رسول کریمؐ نے اجازت عطا فرمائی تو انہوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ آپ کی ازواج نے مجھے آپؐ کے پاس بھیجا ہے، ان کی قلبی تمنا ہے کہ آپ ابن ابوقحافہ کی لڑکی کے سلسلے میں ان کے ساتھ انصاف فرمائیں۔ پھر انہوں نے مجھ کہ

برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کافی برا بھلا کہا۔ میں رسول کریمؐ کی جانب دیکھ رہی تھی کہ آپؐ جواب دینے کی اجازت دیتے ہیں کہ نہیں۔ اس وقت زینبؓ اس حال میں تھیں کہ میں سمجھ گئی کہ نبیؐ کو میرا جواب دینا ناگوار نہیں گزرے گا۔ چنانچہ میں نے بولنا شروع کیا تو ان (زینبؓ) کو گفتگو کرنے کا موقع ہی نہیں دیا، یہاں تک کہ (میں) ان (زینبؓ) پر غالب ہو گئی۔ اس پر نبیؐ نے فرمایا: آخر یہ بھی ابو بکر کی صاحبزادی ہیں

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۴۰۰، ۳۴۰۱

حضرت اُم سلمہ سے روایت ہے کہ وہ ایک روز (کھانے کا) پیالہ لے کر خدمت نبوی میں پیش ہوئیں تو عائشہ صدیقہؓ ایک چادر لے کر حاضر ہوئیں، اور ایک پتھر لیئے ہوئے اور انہوں نے وہ پیالہ توڑ ڈالا، اور انہوں نے اسی پتھر سے توڑ ڈالا۔ رسول کریم نے دونوں ٹکڑے اٹھا کر ملا دیئے اور فرمانے لگے، تم کھانا کھالو تمہاری والدہ صاحبہ کے دل میں جلن پیدا ہو گئی ہے۔

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۴۱۱

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے کوئی خاتون صفیہؓ جیسی نہیں دیکھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے نبی کریمؐ کو برتن میں کھانا بھر کر بھیجا۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور میں نے (غصے میں آکر) وہ برتن توڑ دیا۔

سنن نسائی، جلد دوم، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۴۱۲

کئی حدیثوں میں ذکر ہے کہ آپ حضرت خدیجہؓ سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے اور حضرت عائشہ بہت جلن محسوس فرماتی تھیں۔

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبیء کریم کی کسی بیوی سے حسد نہیں کیا، سوائے حضرت خدیجہؓ کے، حالانکہ میں نے کبھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ رسول اللہ نے ایک بھیڑ ذبح فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس کا گوشت حضرت خدیجہ کے تعلق داروں میں بانٹ دو، میں نے ایک دن غصّے میں کہا کہ خدیجہؓ ہی ہر وقت آپ کے دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اس (خدیجہؓ) کی محبت اللہ نے میرے دل میں پروان چڑھائی ہے۔

حدیث صحیح مسلم، کتاب نمبر اکتیس، حدیث نمبر ۵۹۷۲

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر کسی کی دو بیویاں ہیں اور وہ ان کے درمیان عدل و انصاف نہ رکھتا ہو تو قیامت کے دن اس کے بدن کا آدھا حصہ مفلوج ہو گا۔

ترمذی شریف، ابواب النکاح، حدیث نمبر ۱۰۱۴

ان احادیث کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ نبیؑ کریم اپنی بیویوں سے مساوی اور منصفانہ سلوک رکھنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں، اور جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث ترمذی میں درج ہے، بیویوں سے غیر مساوی سلوک رکھنے کی پاداش میں آپ صلی اللہ و سلم کو روز قیامت ایک مفلوج حصّے کے ساتھ اٹھنا ہو گا، لیکن ہم سب مسمانوں کا عقیدہ ہے، کہ روز قیامت نبی کریم ہماری شفاعت فرمائیں گے، کیا اپنی اس مفلوج حالت میں نبیؑ کریمؐ واقعی اپنی امّت کو پل صراط پار کرا کے حوض کوثر تک لے جا سکیں گے۔ یا ہمیں اپنے اپاہج اور مفلوج نبی کو اپنے ہی گناہگار کندھوں پر اٹھا کر پل صراط پار کرانا ہو گا۔ بات ذرا سوچنے کی ہے۔

ہستی

کیا ہوتا اگر خدا نہ ہوتا..؟!

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میرا وجود محض اتفاق ہے؟

اور کیا اس اتفاق کا یہ مطلب ہے کہ میں لاکھوں سالوں سے ارتقاء کرتا ہوا اس شکل و صورت کو پہنچا ہوں؟

اور کیا اس ارتقاء کا یہ مطلب ہے کہ میں اور باقی جاندار ایک ہی اصل سے تعلق رکھتے ہیں ماسوائے اس فرق کے کہ میری عقل زیادہ بہتر طور پر ارتقاء کر پائی؟

اور کیا اس ایک اصل کا یہ مطلب ہے کہ موت کے بعد میں بھی انہی کی طرح انحطاط کا شکار ہو کر فناء ہو جاؤں گا؟

اور کیا اس انحطاط کا یہ مطلب ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے؟

اگر میرا آغاز اتفاق اور انجام انحطاط ہے تو زندگی کی کیا قیمت ہے؟

اور اگر میری اور جانوروں کی اصل ایک ہے تو میری انسانیت کی کیا قیمت رہ جاتی ہے؟

میں کیوں ایسے ضابطوں کا پابند ہو کر جیوں جن کی مجھے بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے جبکہ زندگی ان ضابطوں کے بغیر از حد آسان ہے؟

جانور تو جنگل کے قانون کے تحت جئیں اور مجھے بھاری بھر کم ضابطوں اور قوانین کا پابند ہونا پڑے؟

میں بہتر ہونے کی جستجو کیوں کروں جبکہ ایسی کسی کائناتی قوت کا وجود ہی متنازعہ ہے جو سب کچھ دیکھ رہی ہو؟

جب مسائل انسان کی برداشت سے بڑھ جائیں تو ایسا کوئی ہے جس کے آگے میں اپنا رونا رو سکوں؟

جب انسان کی تمام تر کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں تو کیا امید غائب ہو جاتی ہے؟

اور کیا نظر نہ آنے والی چیز پر ایمان رکھنا عقل سے متصادم ہے جو محض قابلِ ادراک چیزوں کا ہی ادراک کر سکتی ہے؟

اور کیا ان سارے سوالوں کے جوابات ہیں؟... شاید ہاں یا شاید نا... مگر جواب چاہے نا بھی ہوں لیکن ایک بات یقینی ہے کہ میں کسی "ہستی" کو تلاش کر کے اس کا شکریہ ضرور ادا کروں گا کہ مچھلی، بندر یا کسی کیڑے کی بجائے میرا ارتقاء انسان کی صورت ہوا.

کوئی خدا

جب کوئی خدا موت اور خون تقسیم کرتا ہے... تو وہ یقیناً زندگی کا خدا نہیں ہے...

جب کوئی خدا اپنے ماننے والوں کو جنگیں کرنے اور خوف و تباہی پھیلانے کا حکم دیتا ہے... تو وہ یقیناً امن کا خدا نہیں ہے...

جب کوئی خدا اپنے ماننے والوں کو غلام بنالے تاکہ وہ بھی اس کی طرح دوسروں کو غلام بناتے پھریں... تو وہ یقیناً آزادی کا خدا نہیں ہے...

جب کوئی خدا کسی قوم کو دوسری قوموں سے برتر کر دیتا ہے... تو وہ یقیناً انصاف کا خدا نہیں ہے...

جب کوئی خدا اپنے ماننے والوں کو نفرت کی تلقین کرے... تو وہ یقیناً محبت کا خدا نہیں ہے...

جب کوئی خدا اپنے گرد بدصورتی جمع کرلے... تو وہ یقیناً حسن کا خدا نہیں ہے...

جب کسی خدا کے ماننے والے دہری شخصیت کے مالک ہوں... تو وہ یقیناً عقل سے عاری ہے...

جب کسی خدا کی موجودگی میں اندھیرا چھا جائے... تو وہ یقیناً روشنی کا خدا نہیں ہے...

چنانچہ زندگی کا خدا موت کے بیچ میں زندگی باٹتا ہے...

امن کا خدا دلوں کو مطمئن کرتا اور جنگیں ختم کرتا ہے...

آزادی کا خدا اپنے ماننے والوں کو خود کی قید سے بھی آزاد کر دیتا ہے...

انصاف کے خدا کے ہاں سب برابر ہوتے ہیں...

محبت کا خدا صرف کہتا نہیں بلکہ واقعی محبت کرتا ہے...

خوبصوتی کے خدا میں کمال نظر آتا ہے...

عقل کے خدا کے ماننے والوں کے ہاں عقل کی کبھی کمی نہیں رہتی...

روشنی کے خدا کی موجودگی میں کوئی نہیں گرتا...

حقیقی خدا انسان کو اس کی انسانیت جینے دیتا ہے.. اپنی خواہشات کا اسیر نہیں بناتا!!

مساوات مساوات کرو ہو

مساوات تب شروع ہوگی جب میں خود سے شروع کروں گا...

بہت سے لوگ مساوات کا پُرزور مطالبہ کرتے ہیں اور تفریق کا انکار کرتے ہیں بلکہ انتہاء پسندی کے خلاف تقریریں بھی جھاڑتے ہیں، لیکن اگر ہم ان کی حرکتوں کا تھوڑا سا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ وہ اس مساوات کا مطالبہ صرف اپنے لیے کر رہے ہیں دوسروں کے لیے نہیں.

وہ آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں جبکہ وہ دوسروں کو نظریاتی آزادی سے محروم کر رہے ہوتے ہیں.

وہ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے مسائل پر ہمدردانہ غور کرے جبکہ وہ دوسروں کے مسائل پر جھومتے ناچتے اور گاتے نہیں تھکتے.

ان کے حقوق کے پیمانے میں کسی دوسرے فریق کے ساتھ مساوات کا کوئی ادنی ترا شارہ بھی نہیں ہوتا، یہ اشارہ صرف ان کی طرف ہی ہوتا ہے، صرف ان کے حقوق اور خواہشات ہی اہمیت رکھتے ہیں، رہی بات دوسرے انسانی معاشروں کی طرف ان کی ذمہ داری کی تو وہ کسی اور کو پوری کرنی چاہیے.

ان کی مساوات سوائے اس ترجیح کے اور کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے آپ کو دنیا کی مطلق بہترین امت قرار دے کر اپنے آپ میں دیکھتے ہیں، جب تک وہ اپنے آپ کے گرد گھومتے رہیں گے، اپنی ہٹ دھرمی کے قیدی رہیں گے اور مساوات کیا ہے یہ کبھی نہیں جان سکیں گے.

مساوات یہ ہے کہ جو میں اپنے لیے چاہوں وہی دوسرے کے لیے بھی چاہوں... دوسرے کو وہ جگہ دوں جو کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی مجھے دے، اس کے رنگ، نسل، عقیدے اور جنس سے بالاتر ہو کر اسے بطور انسان کے دیکھوں، اس کی زندگی میں وہ قیمت دیکھوں جو میں اپنی زندگی میں دیکھتا ہوں.

مساوات تب مکمل ہوگی جب میں دوسرے کو اس نظر سے دیکھنا شروع کروں گا جس نظر سے میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی مجھے دیکھے.

سمجھو ہو کہاں اوروں کو تم اپنے برابر
بس منہ سے مساوات مساوات کرو ہو

ابو ذر غفاری – تاریخ اسلام کا ایک بھولا بسرا ورق

تاریخ ہمیشہ حکمران اور مقتدر طبقے لکھتے ہیں، اسی لیئے تاریخ انہی کے قصے کہانیوں، کارناموں، کامیابیوں اور ناکامیوں کے گرد گھومتی ہے، اور انہی کی مدح سرائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب بھی کبھی کسی فرد یا گروہ نے ان جابروں کے خلاف آواز اٹھائی، جب بھی ان طبقات کے مفاد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی گئی تو تاریخ نے ان باغیوں کے ساتھ ایک سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا۔ ایسی آوازوں کا ذکر کیا تو انتہائی متعصبانہ انداز سے کیا یا اس کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ تاریخ اسلام میں ایسی ہی ایک آواز ابوذر نامی صحابی کی ہے، جنہوں نے غریبوں اور ناداروں کے حقوق کیلیئے اپنے وقت کے فرعونوں کے خلاف آواز بلند کی اور اس کے نتیجے میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ایک دردناک موت مرے۔

ابو ذر ایک انتہائی معزز اور معتبر صحابی تھے، آپ کو ان صحابیوں کی صف میں شمار کیا جاتا تھا جو رسول اللہ کے سب سے زیادہ وفادار ساتھی گردانے جاتے تھے، یہ مرتبہ ابوذر کے علاوہ حضرت سلمان فارسی، حضرت مقداد اور حضرت عمار بن یاسر کو حاصل تھا۔ آپ کا اصحابِ صفہ نامی گروہ سے تعلق تھا، یہ وہ لوگ تھے جو اپنا سب کچھ چھوڑ کا مدینہ آ بسے تھے، ان کا کوئی گھر بار نہیں تھا، ان کی رہائش مسجد میں تھی، کھانے کے وقت انہیں مختلف صحابی اپنے گھروں میں لے جایا کرتے تھے۔ ابوذر کا کھانا رسول کریم کے گھر ہوتا تھا۔ اصحاب صفہ ہر وقت پیغمبر کے کسی بھی حکم کی تعمیل کیلئے تیار رہتے تھے۔ وہ دنیاوی عیش و آرام کو تج چکے تھے۔

ابوذر کی خدمات کی وجہ سے رسول انہیں انتہائی عزیز رکھتے تھے، روایتوں کے مطابق رسول اللہ نے ابوذر کے متعلق فرمایا تھا "وہ تنہا جیتا ہے، تنہا مرے گا اور روز محشر تنہا ہی اٹھایا جائے گا"۔ آپ بہت ہی کھرے اور منہ پھٹ واقع ہوئے تھے، آپ کی باتیں دوسروں کے ماتھے پر شکنوں کا باعث بنتی تھیں۔ ابوذر اپنی پرہیز گاری اور حضرت عثمان اور حضرت معاویہ کی شدید مخالفت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ جہاں ابوذر کمزور اور محروم مسلمانوں کے معاشی حالات کی بہتری کی بات کرتے تھے، وہیں حضرت عثمان کی حکومت مالداروں اور امراء کے مفادات کے تحفظ کا گڑھ بنی ہوئی تھی۔ ابوذر کا ایک ہی کہنا تھا کہ یہ سونے چاندی اور مالیات جو دیگر ممالک سے آتے ہیں، تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم ہونی چاہیئے۔ آپ کے سب مسلمانوں کو مساوی طور پر نوازنے اور غریبوں کے حقوق کیلئے آواز بلند کرنے کی وجہ سے کئی مسلمان عالموں نے آپکو پہلا سوشلسٹ بھی قرار دیا ہے۔ ابو ذر نے جو جدوجہد شروع کی وہ زندگی بھر جاری رکھی جس کا نتیجہ آپ کی انتہائی دردناک حالات میں موت کی صورت میں نکلا۔

حضرت ابوذر غفاری کا اصل نام جُندب بن جُنادہ تھا، ایک روایت کے مطابق قبول اسلام کے وقت نبی کریم نے انہیں عبداللہ کا نام دیا، لیکن آپ اپنی کنیت ابوذر سے مشہور ہوئے۔ آپ کے قبیلہ کا شجرہ کنانہ بن خزیمہ سے جاملتا ہے جو نبی کریم کے قبیلہ قریش کا بھی جدامجد تھا۔ قبیلہ بنو غفار ربذہ کے ایک صحرا میں واقع ایک بستی میں رہائش پذیر تھے۔ یہ بستی مدینہ سے 80 میل کے فاصلے پر تھی۔ قریش کے تجارتی قافلے اور خانہ کعبہ کے حاجیوں کے کاروانوں کی یہی گزرگاہ تھی۔ بنو غفار ایک غریب قبیلہ تھا اور ان کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا کہ رہزنی کریں، یہ لوگ قریش کے تجارتی قافلوں اور حاجیوں کو لوٹنے میں بہت بدنام تھے۔ اور لوٹ مار کے سلسلہ میں حرمت والے مہینوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ابوذر نے بھی پہلے پہل اپنے قبیلے کے دیگر افراد کی طرح راہزنی کو اپنایا، لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر ایک چرواہے کا پیشہ اختیار کیا جس کے باعث آپ کی زندگی انتہائی غربت کا شکار تھی۔

ابوذر کا قبیلہ منات دیوی کو ماننے والا تھا، لیکن جب آپ کو نبی کریم کے دعویٰ نبوت کی خبر ملی تو اپنے بھائی کو مکّہ بھیجا کہ جا کر خبر لائے، بعد میں آپ خود مکّہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ ایک روایت کے مطابق چوتھے جبکہ دوسری روایت کے مطابق ابوذر پانچویں آدمی تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان دنوں مسلمان اپنی سرگرمیاں پوشیدہ رکھتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ابوذر کو نبی کریم نے ہدایت دی کہ اے ابوذر اس بات کو چھپا کر رکھو، اور اپنے وطن واپس جا کر وہاں اپنے قبیلے میں تبلیغ کرو۔ لیکن ایک سابقہ راہزن کی غیرت نے اسے بزدلی جانا اور کعبہ کے ساتھ دارالندوہ جو قریش کے مشاورت کی جگہ تھی، وہاں بھرے مجمع میں جا کر قریش کے بتوں کو برا بھلا کہا، نتیجہ میں لوگوں نے اس قدر مارا کہ ابوذر ادھ موئے ہو کر نیچے گر پڑے، گرے ہوئے ابوذر کو لوگ گھونسے اور ٹھڈے مار رہے تھے کہ عباس ابن عبدالمطلب وہاں آ گئے۔ وہ ابوذر کو اپنے قبیلے کے ہمراہ قریش کے کارواں لوٹتے وقت شمشیر زنی کرتے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے ابوذر کو چھڑانے کیلئے اپنے آپ کو ان پر گرا دیا۔ اور لوگوں کو ڈانٹ کر کہا، احمقو کیا تمہیں پتہ ہے یہ قبیلہ بنو غفار سے ہے، اور تمہارے شام کے قافلے اسی راستہ سے گزرتے ہیں اور اگر تم نے اسے مار دیا تو غفار والے اس کا بدلہ ضرور لیں گے، اور تمہارا کوئی قافلہ اور شخص کبھی بھی وہاں سے سلامت نہیں گزر پائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ دوسرے دن بھی ابوذر نے یہی حرکت دوبارہ کی اور لوگوں نے آپ کو جی بھر کر پیٹا، حتیٰ کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ ابوذر کی تیسرے دن بھی اسی طرح پٹائی ہوئی، جس سے تنگ آ کر نبی کریم نے انہیں مکّہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ نبی کریم کے سمجھانے بجھانے پر ابوذر یثرب جانے کا وعدہ کر کے اپنے علاقے میں واپس چلے گئے۔

ابوذر نے دور نبوی اور اس کے بعد کی تمام زندگی انتہائی سادگی اور غریبی میں گزاری، عہد خلافت میں جب اسلام چاروں اطراف پھیل رہا تھا، اور مال غنیمت کی فراوانی سے تمام صحابہ کرام بہت مالدار ہو رہے تھے۔ ابوذر تب بھی سادگی اور تنگدستی کی زندگی میں خوش تھے۔ ابوذر کی اگر کسی نے مدد کرنے کی بھی کوشش کی تو ابوذر نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور وہی چند بکریاں ہی ذریعہ معاش رکھیں۔ ایک دفعہ حاکم شام حبیب بن مسلم نے تین سو دینار بھیجے جسے ابوذر نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا:

۔"ہمارے لیئے صرف ایک چھت ہی کافی ہے جس کے نیچے ہم نے پناہ لے رکھی ہے اور چند بکریاں اور ایک خادم، جو کہ ہمارے حقوق میں سے انہوں نے دیا ہوا ہے، اس کے علاوہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے"۔ (ماخوذ غریب ربذہ)۔

حضرت عمر کے دور میں جہاد کے نام پر بہت زیادہ غارت گری اور لوٹ مار ہوئی، انصار اور مدینہ ہجرت کرنے والے صحابی سماجی طور پر معزز تو تھے ہی لیکن اب وہ ہزاروں غلاموں اور بے شمار مال و دولت کے ذخیروں کے مالک بھی بن گئے۔ دولت کی اس

بے پناہ آمد کے ساتھ معاشی ناہمواری میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ حضرت عثمان کے دور میں خلافت نے ملوکیت کا روپ دھار لیا۔ حکومت اسلامی میں تمام بادشاہی کروفر اور تکلفات نمودار ہو گئے۔ خلیفہ کے اختیارات میں بے پناہ اضافہ ہو جانے سے مال غنیمت، جزیہ اور دیگر مالیات کو اپنے من پسند لوگوں میں تقسیم کرنے کے رجحان میں بہت اضافہ ہوا۔ عثمان نے اپنے رہنے کیلئے ایک شاہی محل بنوایا۔ محل کے سامنے دربان اور محافظ مقرر ہوئے، عثمان کے دور میں ہی بیت المال خلیفہ کے قبضے میں آیا، کیونکہ بیت المال کے نگران نے مسجد میں آکر سب کے سامنے چابیاں عثمان کے حوالے کر دیں۔

حضرت عثمان کے دور میں معاشی تفریق بہت شدت سے ابھر کر سامنے آئی۔ اس دور میں جہاں ایک طرف عام مسلمان غربت کی چکی میں پس رہے تھے، وہیں دوسری طرف دولت کے انبار جمع ہو رہے تھے۔ خلیفہ کے علاوہ بہت سے معتبر اصحاب کرام کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ مدنی دور کی سادگی کا اب دور دور تک نام و نشان تک نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کی بیوی کا گلوبند افریقہ کی مالیات کے تیسرے حصے کے برابر تھا۔

۔"ایک دن لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ حضرت عثمان نے بیت المال کے جواہرات میں سے کچھ لے لیا ہے۔ اور اپنے گھر کے لیئے کسی کا زیور بنالیا ہے۔ لوگ اس بات پر ناراض ہوئے اور حضرت عثمان پر اعتراضات کیئے۔ حضرت عثمان غصے میں آئے اور خطبہ دیتے ہوئے کہا: "ہم اس خراج کے مال سے اپنی ضروریات کے مطابق ضرور لیں گے، کچھ لوگ ناراض ہوتے ہیں تو ہوں"۔ اس پر حضرت علی نے کہا: "آپ کو اس سے روکا جائے گا"۔ حضرت عمار بن یاسر نے کہا: "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ سب سے پہلا ناراض میں ہوں"۔ حضرت عثمان نے کہا: "مجھ پر تیری یہ جرأت لونڈی کی بچے، پکڑو اس کو"۔ چنانچہ وہ پکڑے گئے، حضرت عثمان نے انہیں اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ (حضرت عثمان، صفحہ 176: ڈاکٹر طہٰ حسین)

۔"صحابہ نے جائداد اور مال اچھا خاصا پیدا کر لیا تھا۔ خود حضرت عثمان کے خازن کے پاس جس دن آپ کی شہادت کا اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے، ڈیڑھ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم تھے۔ اور وادی قریٰ اور جنین وغیرہ میں آپ کی جائیداد دو لاکھ دینار کے لگ بھگ تھی اور آپ نے بہت سے اونٹ اور گھوڑے چھوڑے تھے۔ حضرت زبیر کے ایک ترکہ کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی اور آپ نے ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار لونڈیاں چھوڑی تھیں۔ حضرت طلحہ کی عراق سے روزانہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی اور سراۃ کے نواحی سے اس سے بھی زیادہ تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے تھے اور آپ ایک ہزار اونٹوں کے اور دس ہزار بکریوں کے مالک تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے ترکہ کا چوتھا حصہ چوراسی ہزار تک پہنچا تھا، اور حضرت زید بن ثابت نے سونے اور چاندی کے ڈلے چھوڑے تھے جو کلہاڑیوں سے کاٹے جاتے تھے اور ایک لاکھ کی جائیداد بھی چھوڑی تھی۔ حضرت زبیر نے اپنی عمارتیں بصرہ میں، مصر میں، کوفہ میں اور اسکندریہ میں بنوا

رکھی تھیں۔اس طرح حضرت طلحہ نے اپناگھر کوفہ میں بنوالیا تھااور مدینہ میں بھی ایک پر اناگھر تھا جسے تڑواکراز سرِ نو چونے، اینٹوں اور ساگوان کی لکڑی سے بنوالیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اپناگھر نہایت بلند و وسیع سنگِ سرخ کا بنوایا تھا جس کے اوپر کنگرے تھے۔ حضرت مقدار نے مدینہ میں اپناگھر تعمیر کرایااور اس کے اندر اور باہر چونے کا پلاستر کرایا۔اسی طرح علی بن منبہ نے پچاس ہزار اشرفیاں چھوڑیں، اور جائداد وغیرہ چھوڑی جو تین لاکھ درہم کے لگ بھگ تھی۔(مقدمہ ابن خلدون، صفحہ 335)

حضرت عثمان کے دور میں اقرباپروری انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، حتیٰ کہ اپنے چچا حکم بن العاص اور اس کے بیٹے مروان بن حکم کو بھی طائف سے واپس بلالیا، اور مروان کو مشیر خاص بناکر مہر خلافت بھی اس کے سپرد کردی۔اس کے علاوہ خیبر اور شمالی افریقہ کے مالیات کی وصولی بھی مروان کے حوالے ہوئی۔

یہ وہی حکم اور مروان تھے جنہیں رسول کریم نے طائف جلاوطن کیا تھا۔ حکم بن العاص حضرت عثمان کا چچا تھا، حکم نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیااور جاکر مدینہ بس گیا۔ لیکن ایک بار اس نے رسول اللہ کی چند خفیہ باتیں سن کر انہیں سب پر آشکار کر دیا، اس کے علاوہ وہ اور اس کا بیٹا مروان اپنی محفلوں میں آپ کی نقلیں اتارا کرتے تھے۔ چنانچہ حضور نے اسے اور اس کے بیٹے مروان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا۔رسول کریم کی وفات کے بعد حضرت عثمان نے پہلے حضرت ابو بکر اور پھر حضرت عمر سے مروان کو مدینہ واپس بلانے کی اجازت مانگی مگر ناکام رہے۔ لیکن جونہی آپ نے خلافت سنبھالی اپ نے اپنے چچا کو اس کے بیٹے سمیت واپس بلاکر نوازا۔
ایک دن ابوذر کو پتہ چلا کہ عثمان نے قلعہ خیبر اور افریقہ کی تمام مالیات کا پانچواں حصہ جو بیت المال کی ملکیت تھا، اپنے چچازاد مروان بن حکم کو بخش دیا، اور اس کے علاوہ ثابت بن مروان کو تین لاکھ درہم، زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم حارث بن ابی العاص کو تیس ہزار درہم دیئے، تو ابوذر نے یہ آیت مسجد میں پڑھی۔

وَٱلَّذِينَ يَكۡنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلۡفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرۡهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٖ
اور جو لوگ جمع کر کے رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں، سو خبر دے دو انہیں دردناک عذاب کی۔ سورۃ التوبۃ، آیت 34

جب مروان تک یہ خبر پہنچی کہ ابوذر اس پر اور حضرت عثمان پر تنقید کر رہا ہے تو اس نے جا کر حضرت عثمان کے کان بھرے۔ عثمان نے ابوذر کو بلا کر ڈانٹا لیکن ابوذر نے سنی ان سنی کر دی اور معاشی ناہمواری اور عام مسلمانوں کی حالت زار کے حوالے سے عثمان اور اس کی سلطنت پر حملے جاری رکھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے:

۔"اے عثمان، تو نے غریبوں اور بے نواؤں کو اور محتاج بنا دیا اور مالداروں کو اور دولت مند بنا دیا"۔(ماخوذ، غریب ربذہ)۔

کوئی عام مسلمان ہوتا تو ڈر، لالچ یا کسی اور حیلے سے اس کا منہ بند کیا جا سکتا تھا۔ عثمان عجیب مخمصے میں تھا، لوگ ابوذر کے مرتبے اور ان کی نبی کریم کی دوستی سے واقف تھے، لہٰذا ان کا قتل ایک چوائس نہیں تھا۔ مبادا یہ کسی فساد کو جنم دینے کا باعث نہ بن جائے۔ چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد حضرت عثمان نے یہی مناسب جانا کہ اس مصیبت سے جان چھڑانے کیلئے اسے کہیں بھیج دیا جائے، چنانچہ آپ نے ابوذر کو شام بھیج دیا۔

معاویہ بن ابوسفیان شام کے حاکم تھے۔ وہ حضرت عمر کے زمانہ سے ہی عیش و عشرت، شاہانہ کروفر اور آن بان کے عادی ہو چکے تھے۔

۔"جب فاروق اعظم ملک شام تشریف لے گئے اور آپ سے معاویہ نے شاہانہ کروفر اور آن بان کے ساتھ ملاقات کی تو آپ کو حضرت معاویہ کی یہ ادا پسند نہیں آئی اور فرمایا معاویہ یہ کسریٰ کی ادائیں کہاں سے سیکھ لیں۔ حضرت معاویہ نے جواب دیا، امیر المومنین میں سرحدوں پر ہوں، اور ہر وقت دشمن کے مقابلہ پر ہوں، ہمیں جاہ و طاقت اس شاہانہ عصبیت سے ان پر رعب ڈالنے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ جواب سن کر فاروق اعظم خاموش ہو گئے اور ان کے جواب کی تردید نہیں فرمائی"۔(مقدمہ ابن خلدون، صفحہ 332)

جب ابوذر شام پہنچے تو وہاں معاویہ سبز محل بنوا رہا تھا۔ جس کو تعمیر کرنے کیلئے رومی اور ایرانی معماروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ معاویہ کو یہ محل اس قدر عزیز تھا کہ اس نے تعمیر کے کام کی نگرانی کسی اور کے سپرد نہیں کی بلکہ روز کاریگروں کے سر پر کھڑا ہو کر کام کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ ابوذر سے یہ نہ دیکھا گیا اور آپ نے کہا:

۔"اے معاویہ اگر یہ محل تم اپنے پیسے سے بنا رہے ہو تو اسراف میں داخل ہے اور اگر مسلمانوں کے پیسے سے بنا رہے ہو تو یہ خیانت ہے"۔(ماخوذ غریب ربذہ)۔

شام کے محروم طبقوں نے ابوذر کی باتیں سنیں تو وہ ابوذر کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے۔ لیکن اہل ثروت لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی، سب نے حضرت معاویہ سے شکایت کی، جنہوں نے ابوذر سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب یہ ڈھونڈی کہ ابوذر کو جہاد پر بھیج کر گلو خلاصی کرالی جائے۔

حضرت عمر کے دور خلافت میں معاویہ شام کے گورنر تھے، انہوں نے حضرت عمر کو قبرص کے بارے میں لکھا کہ حمص سے قبرص اس قدر نزدیک کی آبادی ہے کہ کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کی اذانیں سنائی دیتی ہیں، لہذا اس پر حملہ کیا جائے، لیکن چونکہ درمیان میں سمندر پڑتا تھا اور حضرت عمر کو پتہ نہیں تھا کہ سمندر کیا ہوتا ہے لہذا انہوں نے عمر نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ سمندر اور کشتی کے مناظر میرے لیئے بیان کرو، یعنی اس کا نقشہ کھینچو۔ عمرو بن العاص نے لکھا۔

۔"سمندر ایک ایسی چیز ہے جس کو خدا نے بہت ہی بڑا بنایا ہے اور اس کے اندر اس کی ایک چھوٹی سی مخلوق سفر کرتی ہے۔ اس میں سفر کے دوران پانی اور آسمان کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا، سمندر جب پر سکون ہو پھر بھی اس کو دیکھ کر ہول آتا ہے، اور اگر اس کی موجیں بپھری ہوئی ہوں تو اس وقت انسانی عقل اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی ہے۔ سفر کے دوران امید بہت کم ہوتی ہے، زیادہ تر خوف لاحق رہتا ہے، جو کوئی سمندر میں سفر کرتا ہے وہ ایک کیڑے کی مانند ہوتا ہے، جو لکڑی کے ایک ٹکڑے پر رکھ دیا گیا ہو، جیسے ہی لکڑی ٹیڑھی ہوئی وہ وہیں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر طوفان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو بھی حیران کن"۔(غریبِ ربذہ، صفحہ 154)

حضرت عمر نے حملہ کرنے کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اب امیر معاویہ نے سوچا کہ اگر قبرص فتح ہو گیا تو یہ اس کے لیئے ایک فخر کی بات ہوگی اور اگر ہار گئے تو ابوذر وہیں کہیں مر کھپ جائے گا، اور اس مصیبت سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ لیکن امیر معاویہ کا منصوبہ بری طرح ناکام ہوا، قبرص کی مہم کامیاب ہوئی اور معاویہ کی چھاتی پر مونگ دلنے کیلئے ابوذر پھر واپس شام آ گئے۔

ابوذر نے دوبارہ معاویہ کے محل کے سامنے جانا شروع کر دیا: "اے دولتمندوں کے گروہ، خدا کے بندوں کا مال اس کے بندوں کے حوالے کر دو۔ آتش جہنم کے شعلے تمہارے نصیب میں لکھے ہیں، اے خدا جو منکرات کا انکار کرتے ہیں، ان پر لعنت کر، اے خدا جو امر بالمعروف کا انکار کرتے ہیں، ان پر لعنت کر" (ماخوذ، غریب ربذہ)۔ معاویہ نے ابوذر کو اندر بلایا اور چاہا کہ معاملہ کسی طور نپٹ جائے، مگر وہاں بھی ابوذر نے مکالمہ دہرایا: "اے معاویہ تو نے امیر کو امیر تر اور فقیر کو فقیر تر کر دیا ہے۔

قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں اپنے اس مطالبے سے دستبردار نہیں ہو سکتا تا آنکہ دولتمند اپنے مال کو غریبوں میں تقسیم کر دیں"۔(ماخوذ، غریب ربذہ)۔

معاویہ تنقید سے زچ ہو کر دھمکی پر اتر آیا: "ابوذر، اگر پیغمبر کے اصحاب میں کسی ایک کو عثمان کی اجازت کے بغیر مجھے مارنا ہوتا تو وہ تو ہو تا، لیکن تمہارے قتل کے لیئے مجھے عثمان سے اجازت لینی پڑے گی، کیونکہ یہ جو تو ناداروں اور غریبوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتا ہے، اس سے تمہارے اور ہمارے درمیان جدائی بڑھ جائے گی"۔(ماخوذ غریب ربذہ)۔

معاویہ بہت تنگ تھا کہ اس ضدی بڈھے کے ساتھ کیا کیا جائے۔ معاویہ نے اپنے غلام کے ہاتھ پیسے بھیجے جسے ابوذر نے نہایت سختی سے ٹھکرا دیا۔ معاویہ ابوذر کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن ابوذر کے مرتبے کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی۔ ابوذر کی وجہ سے غریب اور نادار لوگ بھی دلیر ہو رہے تھے۔ اور پھر ایک دن معاویہ جمعہ کی نماز کا خطبہ دے رہا تھا: "سبھی مال ہمارا ہے، ہم جسے چاہیں بخش دیں اور جسے چاہیں محروم رکھیں"۔ حاضرین میں سے ایک اٹھا اور بلند آواز میں دلیری سے بولا: "ہر گز نہیں، مال ہمارا ہے اور جو کوئی ہمیں اس سے محروم رکھے گا ہم اللہ کی عدالت میں اس سے جنگ کریں گے"۔(ماخوذ غریب ربذہ) اس آدمی کی باتوں سے ابوذر کی بو آ رہی تھی۔

معاویہ ایک انتہائی شاطر انسان تھا، اس نے محسوس کیا کہ ابوذر اگر زیادہ عرصہ تک شام رہا تو اس کی موجودگی غریب اور نادار لوگوں کو کسی بڑے فساد پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اس نے عثمان کو لکھا کہ اگر تمہیں شام کی فکر ہے تو ابوذر کو سنبھالو۔ اس نے مجھے بیچارہ کر دیا ہے، بخدا اگر اس کو چھوڑ دیا تو لوگ ہمارے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ حضرت عثمان نے معاویہ کو حکم دیا کہ ابوذر کو واپس بھیج دیا جائے۔

اب پھر حضرت عثمان کو ابوذر کی تنقید کا سامنا تھا، عثمان نے حضرت علی سے بھی شکایت کی اور پوچھا کہ میں اس بڈھے کا کیا کروں، کیا اسے قتل کر دوں۔ عثمان نے معاویہ کی طرح ابوذر کو خادم کے ہاتھوں پیسے بھی بھجوائے، دھمکیاں دیں، لیکن ابوذر اپنی موقف پر ڈٹے رہے۔ ایک دن حضرت عثمان اور ابوذر میں بہت بدمزگی ہوئی، ابوذر کہتے تھے کہ خدا کا مال خدا کے بندوں میں تقسیم کرو، عثمان نے جواب دیا کہ تم فسادی ہو اور تم پہلے بھی شام میں فساد کھڑا کر چکے ہو، میں تمہیں واپس لایا اور اب تم یہاں بھی شورش پیدا کرنا چاہ رہے ہو۔ آخر حضرت عثمان نے ابوذر کو جلاوطن کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ابوذر سے کہا: اے ابو ذر تمہاری اذیتیں بڑھتی جا رہی ہیں، یہاں سے چلے جاؤ، ابوذر نے پوچھا کہ کیا مکہ چلا جاؤں، عثمان نے کہا کہ نہیں، شام کا پوچھا تو عثمان نے کہا تم وہاں پہلے ہی خاصا فساد کھڑا کر چکے ہو، ابوذر نے عراق اور مصر کا نام لیا۔ لیکن عثمان نے اسے کہا کہ میں نے

تمہیں بیابان میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابوذر نے پوچھا کہ کیا بیابان نجد چلا جاؤں، عثمان نے کہا کہ نہیں، میں تمہیں مشرق کی جانب ربذہ بھیجتا ہوں۔ اس کے بعد عثمان نے حکم دیا کہ ابوذر کو ایسے اونٹ پر بٹھا دیا جائے جس کے پالان پر کاٹھی نہ ہو، اسے نہایت سختی کے ساتھ بھیجا جائے کہ کوئی اس کو الوداع نہ کرنے جائے اور نہ ہی کوئی اس کے ساتھ جائے۔ لیکن علی بن ابو طالب نے حکم کی خلاف ورزی کی اور اپنے بیٹوں، بھائی عقیل اور بھتیجوں کے ساتھ ابوذر کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور تک چلے۔

رسول اللہ کے ایک بزرگ صحابی عبد اللہ بن مسعود کوفہ میں تھے جب انہوں نے ابوذر کی جلاوطنی کی خبر سنی، تو انہوں نے اس کی مذمت کی، عثمان نے والی کوفہ ولید کو کہا کہ عبد اللہ کو دار الخلافہ بھیج دو۔ جونہی عبد اللہ مدینے مسجد میں داخل ہوئے، ایک حبشی غلام نے حضرت عثمان کے اشارے پر انہیں اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ بعد میں عبد اللہ کو ایک گھر میں قید کر دیا گیا اور اسے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا، بھوک سے عبد اللہ کی موت ہو گئی۔

ربذہ ایک جلا دینے والا صحرا تھا، جہاں پانی اور آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس راستے سے حج کو جانے والوں کے علاوہ وہاں کسی بندے بشر کا گزر نہیں تھا۔ ابوذر نے وہیں ایک درخت ڈھونڈ کر اس کے نیچے ڈیرا ڈال لیا۔ یہ آپ کے لیئے انتہائی اذیت، مفلسی اور تکلیفوں کا دور ثابت ہوا۔ وقت گزرتا گیا، اور ناداری و مفلسی بڑھتی گئی، نوبت فاقوں تک آ گئی۔ آپ کا واحد سرمایہ چند بکریاں تھیں، جن پر آپ کا گزارہ تھا، وہ بھی ایک ایک کر کے مر گئیں۔ اس کے بعد صحرا کے اندر ابوذر کے گھر والے بھی مرنے شروع ہو گئے۔ بھوک سے بلبلاتی آپ کی بیٹی نے آپ کے ہاتھوں میں جان دی۔ اور پھر ابوذر کا بیٹا بیمار ہوا تو وہ اپنی جھکی کمر اور پھٹے کپڑوں کے ساتھ حضرت عثمان کے دروازے پر جا پہنچا، جو اس وقت اپنے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں میں گھرے ہوئے تھے۔

۔"عثمان تو نے مجھے میرے گھر سے نکال کر ایک ایسی سرزمین پر بھیج دیا ہے جہاں نہ کچھ کھانے کو ملتا ہے نہ کچھ اگتا ہے، میری بکریاں بھی مر گئیں اور جو ہیں وہ دودھ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ وہاں سوائے میری بیوی کے کوئی میرا غمگسار اور خدمتگار نہیں ہے۔ وہاں لق ودق صحرا میں میرا اتنہا سائبان ایک درخت ہے۔ عثمان مجھے چند بکریاں اور ایک خادم دے دے تا کہ میں زندگی گزار سکوں"۔ (ماخوذ غریب ربذہ)۔

عثمان نے حقارت سے منہ دوسری طرف کر لیا، ابوذر دوسری طرف سے ہو کر پھر عثمان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور پھر تقاضا کیا، لیکن عثمان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، ابوذر دل شکستہ واپس لوٹا، تو درخت کے نیچے اپنی بیوی کو دھاڑیں مارتے ہوئے پایا۔ بھوک ابوذر کے بیٹے کو بھی نگل چکی تھی۔

اب ابوذر اور بیوی ام زرباقی بچ گئے تھے۔ایک دن بھوک سے تنگ میاں بیوی یہ سوچ کر نکلے کہ شائد کوئی گھاس ہی مل جائے جسے کھا کر وہ اپنی بھوک مٹا سکیں، لیکن اس بیابان صحرا میں دور دور تک کسی سبزے کا نشان نہیں تھا، بھوک اور کمزوری کے باعث ابوذر اپنی بیوی کی بانہوں میں جھول گیا، بیوی نے پوچھا، ابوذر یہ کیا۔ابوذر نے کہا میرا آخری وقت آن پہنچا ہے، تم میری لاش راہگزر پر رکھ دینا، شائد کوئی راہگیر میرا جنازہ پڑھنے کے علاوہ دفن کر دے۔

مدینہ کی ریاست

ہم نے سوچا کہ مدینہ کی ریاست کی کچھ جھلکیاں اختصار سے قسطوں میں پیش کی جائیں، ایک تو ہم تاریخ پڑھتے نہیں ہیں، دوسرے تاریخ کے بارے میں جو بھی ہمیں پڑھایا گیا، وہ تقدیس میں لپیٹ کر سب اچھا کے طور پر پیش کیا گیا۔اس جائزہ میں کوشش کی گئی ہے کہ عقیدت کے حصار سے نکل کر ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کیا جا سکے۔

مدینہ کی ریاست کا آغاز

مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ میں پیغمبر اسلام نے اسلامی ریاست قائم کی۔جو 41 ہجری تک قائم رہی۔جس کے بعد اقتدار کا مرکزہ مدینہ سے دمشق میں منتقل ہو گیا۔مدینے کی ریاست میں ابتدائی دور میں ہمیں قبائلی سادگی، قبائلی جمہوریت کے آثار ملتے ہیں، جنہیں ہمارے ہاں اسلامی اقدار اور خصوصیات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اور اسی میں ہمیں ایک رومان میں مبتلا کر رکھا ہے۔جب کہ ان کا تعلق صرف انفرادی اور جزوی سطح تک تھا۔ہمیں مدنی معاشرے اور طرز سیاست میں یہ اقدار اور اخلاقیات نظر نہیں آتی۔ریاست اور دولت کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی اسلامی حکمرانی ابتدائی قبائلی سادہ روی سے موروثی جاگیری شاہنشاہیت میں بدل گئی۔

632 عیسوی میں پیغمبر اسلام کی وفات ہوئی۔اس وقت تک مدینہ کی ریاست کا دائرہ کار ایران اور شام کی سرحدوں تک جا چکا تھا۔مدینہ کی ریاست میں سیاسی استحکام کس قدر تھا اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا،" میرے بعد فوراً فتنے پیدا ہو جائیں گے۔" یہ خدشات کیوں تھے؟ اس لئے کہ "مدنی ریاست" مختلف متضاد اور متحارب گروہوں پر مشتمل تھی۔یمنی اور حجازی قبائل، مکہ اور مدینے کے قبائل، انصار اور مہاجرین، قریش کے امراء اور غرباء کے درمیان،، بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان، حضرت عائشہ اور حضرت علی کے درمیان، نیز ازواج رسول دو گروہوں میں تقسیم تھیں۔منافقین اور مسلمین کے درمیان وغیرہ۔ان سب کے درمیان سخت مخاصمت، لڑائی، اقتدار کی کشمکش پائی جاتی تھی، جس میں کسی لحاظ اور رواداری کی کوئی بات نہ تھی۔

اسلامی اخوت کی یہ تھی تصویر۔ جو ہمارے ہاں کس طرح سنہرے دور کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ جنھوں نے ایک دوسرے کے خلاف گالم گلوچ کرنے، سازشیں کرنے، قتل کرنے، قبضہ کرنے سے کبھی گریز نہ کیا۔۔ اور یہ کام پیغمبر اسلام کی وفات کے دن سے شروع ہو گیا۔ یعنی ہم سادہ لوح مسلمان جن مثالی اقدار کو اسلام کا شاخسانہ سمجھتے ہیں، ان پر پیغمبر اسلام کی زندگی کے فوری بعد عمل نہ ہو سکا— آج چودہ سو سال بعد کوئی اس پر روبہ عمل ہونے کا ذکر کرے—وہ یا سادہ لوحی ہو سکتی ہے، یا دھوکا

اسلام میں پہلا انتقال اقتدار

اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے، اور اسلام کے پاس دنیا کا بہترین سیاسی نظام ہے، اس دعوے کے تناظر میں اسلامی ریاست کے پہلے انتقالِ اقتدار کی صورت حال کا اسلامی تاریخ کی روشنی میں جائزہ پیش خدمت ہے۔ جون 632 عیسوی پیغمبر اسلام جب اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ وہ کافی تکلیف کی حالت میں تھے، روایات کے مطابق انہوں نے اشارے سے کچھ لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا، لگتا تھا، وہ جانشینی کے بارے میں کوئی ہدایت دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ان کے بعد ممکنہ فتنہ وفساد پیدا نہ ہو۔ لیکن ان کے پاس جتنے بھی صحابہ کرام موجود تھے، ہر ایک نے اس ڈر سے ان کی بات سنی ان سنی کر دی کہ وہ کوئی ایسا جانشین نہ نامزد کر دیں، جو ان میں سے کچھ کو قبول نہ ہو۔ چنانچہ سب نے لیت لعل سے کام لیا۔ بلکہ انہوں نے پیغمبر اسلام کے آخری وقت ایسا رویہ اختیار کیا اور ایسے کلمات ادا کئے کہ اگر آج وہی کلمات کوئی شخص ادا کر دے تو توہین رسالت کے زمرے میں آتے اور اس کیلئے واجب القتل قرار دیئے جانے کا سبب بنتے۔

طبری کے مطابق کسی نے کہا، "آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اور سرسامی کیفیت طاری ہے۔ جس کی وجہ سے آپ غیر ارادی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں۔" آپ نے تنگ آکر فرمایا، جاؤ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

چنانچہ 8 جون کو آپ کی روح مبارک نکلتے ہی انصار کا ایک گروہ سعد بن عبادہ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکھٹا ہو گیا۔ دوسری طرف علی، زبیر، طلحہ فاطمہ کے گھر جمع ہو گے۔ تیسری طرف مہاجرین ابو بکر کے ہاں جمع ہو گئے۔ عمر نے ابو بکر سے کہا، ہمیں انصاری بھائیوں کے پاس جانا چاہیئے۔ انصاریوں نے تجویز کیا، کہ دو امیر ہونے چاہیئے، ایک انصار سے اور ایک مہاجرین سے (اسلامی اخوت واتحاد کی کوئی بات نہیں ہو رہی) ابو بکر نے کہا، یہ ممکن نہیں، ہم امیر ہونگے اور تم وزیر۔ عمر نے ابو بکر کی بیعت کرنے میں پہل کی۔

انصار میں سے کچھ نے کہا، ہم تو علی کی بیعت کریں گے۔ زیاد بن کلیب سے مروی ہے: عمر، علی کے مکان پر آئے۔ وہاں طلحہ ، زبیر، اور دوسرے مہاجر موجود تھے، عمر نے کہا، چل کر ابو بکر کی بیعت کرو، ورنہ میں اس گھر کو آگ لگا کر تم سب کو جلا دوں گا۔ زبیر تلوار نکال کر عمر کی طرف بڑھے۔ مگر فرش پر پاوں الجھ جانے کی وجہ سے گر گے، اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔۔ تب دوسرے لوگوں نے زبیر پر یورش کر کے ان کو قابو کر لیا۔ عبد اللہ بن عبد الرحمان سے مروی ہے۔ " ہر طرف سے لوگ آآ کر

ابو بکر کی بیعت کرنے لگے۔ اور قریب تھا، سعد کو روند ڈالتے۔ عمر نے کہا، اللہ اس کو ہلاک کرے۔ اور اس کو قتل کر دو۔ سعد نے عمر کی داڑھی پکڑ لی۔ عمر نے کہا اسے چھوڑو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا۔ تو تمھارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابو بکر نے کہا عمر! خاموش رہو۔ اس موقعہ پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمر نے سعد کو چھوڑ دیا۔ سعد نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو مدینے کی تمام گلی کوچوں میں اپنے حامیوں سے بھر دیتا۔ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ روایات میں لکھا ہے، سعد نے اس کے بعد کبھی ابو بکر کی امامت میں نماز نہ پڑھی۔ نہ ان سے کلام کیا، ان کا انتقال بھی بہت پر اسرار انداز میں ہوا۔

ابن ہشام، طبری اور ابن خلدون کے بیانات سے یہ حقیقت عیاں ہے، کہ ابھی رسول اللہ کا جسد خاکی دفنایا بھی نہ گیا تھا کہ صحابہ کرام میں خلافت پر شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس سلسلے میں شیعان علی کا اپنا موقف ہے۔ ان کے مطابق حضرت علی نے حضرت ابو بکر کی مجبوراً بیعت کی تھی، اس لئے کہ حضرت فاطمہ کا گھر جلا دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔۔ ایک روایت میں لکھا ہے کہ ابو سفیان، علی کے پاس آکر کہنے لگے، میں مدینے میں ایک عجیب شورش دیکھتا ہوں، جس کا نتیجہ صرف کشت و خون ہے۔ حکومت قریش کے سب سے کم تعداد والے قبیلے میں چلی گئی ہے۔

خلافت ابو بکر

خلاصہ یہ کہ اسی افراتفری میں حضرت ابو بکر کو خلافت مل گئی۔ ان کو جن جھگڑوں سے سامنا ہوا، ان میں ایک حضرت فاطمہ کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے حضرت محمد کی اولاد ہونے کے ناطے وراثت سے اپنا حصہ مانگا—جو ان کو نہ دیا گیا—اس سلسلے میں باغ فدک کا واقعہ مشہور ہے۔ حضرت فاطمہ سے کہا گیا، کہ رسول اللہ کی نسل کو وراثت میں حصہ دینا منع ہے۔

شورش ارتداد

دوسری شورش یہ ہوئی۔ کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد کچھ قبائل اور لوگ تیزی سے اسلام کو چھوڑنا شروع ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ فتح مکہ تک اور اس کے بعد جو لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر گئے تھے وہ وقتی جبر کا نتیجہ تھا۔ حضرت ابو بکر نے فتنہ ارتداد کے انسداد کے لئے گیارہ فوجی مہمات کا بندوبست کیا۔ لوگوں کو خوف اور دہشت سے دوبارہ اسلام لے آنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جو لوگ اسلام چھوڑ گئے، انہوں نے مسلمانوں پر مظالم کئے۔ ان کو جلایا، اور ان کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ خالد بن ولید نے بھی اسی طرح ان کو جلایا، سنگسار کیا، اور بعض کو پہاڑوں سے گرایا۔ کچھ کو کنوؤں میں ڈال کر تیروں سے چھلنی کیا۔ روایات میں درج ہے کہ خالد بن ولید کی جانب سے بدوی وحشت اور ہوسِ غنیمت کا مظاہرہ عہد رسالت میں بھی ہوا تھا۔ جب کہ رسول اللہ نے فتح مکہ کے بعد اسے تبلیغ اسلام کے لئے بنی جذیمہ کی جانب بھیجا تھا۔ اور جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ خالد بن

ولید کی ان کے ساتھ پرانی خاندانی دشمنی تھی۔ خالد کے کہنے پر سارے قبیلے نے ہتھیار ڈال دیئے، ان کے نہتے ہونے کے بعد خالد بن ولید نے ان کی مشکیں بندھوایں اور پھر بہت سوں کو قتل کر دیا۔ اس کی اطلاع جب رسول اللہ کو ملی تو انہوں نے علی ابن طالب کو حکم دیا، کہ وہ ان لوگوں کے پاس جاکر ان لوگوں کا خون بہا ادا کرے۔

مسیلمہ کذاب کے خلاف مہم جوئی کی قیادت خالد بن ولید کے پاس تھی۔ جس میں مسیلمہ کی فوج کے ستر ہزار لشکری مارے گے۔ یمامہ کے ایک قبائلی سردار مجاعہ سے خالد نے آدھا مال و اسباب، مزروعہ و غیر مزروعہ، باغات، قیدی کرنے کی پیش کش کی۔ مجاعہ نے ربع مال و اسباب پر صلح کی پیش کش کی۔ خالد نے اس کی بیٹی کو مانگ لیا۔ جب ابو بکر کو اطلاع ملی، تو انہوں نے خالد کو غصہ میں خط لکھا، کہ تم عورتوں سے نکاح کر رہے ہو۔ حالانکہ 1200 مسلمانوں کا خون تمہارے صحن میں اب تک تازہ ہے۔

ایک مہم میں مسلمانوں نے دس ہزار مشرکوں کو قتل کیا۔ بہت سے لونڈی غلام اور مال غنیمت حاصل کیا۔ جس کو امراء اسلام نے مسلمان مجاہدین میں تقسیم کر دیا اور خمس (پانچواں حصہ) ابو بکر کو بھیج دیا۔ مسلمانوں نے کفار کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا۔ اور مال غنیمت میں دو ہزار تیز رفتار اونٹنیاں ملیں۔

قبائلی عصبیت صرف بدؤوں میں غالب نہ تھی، مدینہ اور مکہ کے صحابہ اور قریش بھی اس میں اسی طرح مغلوب تھے۔ مرتدین کے خلاف پے درپے کامیابیوں نے حضرت ابو بکر کی حکومت کو مستحکم کر دیا۔ پورے عرب میں وقار اور دبدبہ قائم ہو گیا۔ اور قریش کے لئے خوشحالی کے دروازے کھل گے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر نے اسلامی لشکر میں بہت اضافہ کر کے اسے بیرونی فتوحات پر لگا دیا۔ خالد بن ولید کی ہر مز پر فتح کی خبر اتنی خوش کن تھی کہ ابو بکر نے ہر مز کا ایک لاکھ درہم کا تاج خالد کو بخش دیا۔ پھر خالد نے ایران کے شہنشاہ کو خط لکھا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ جس نے تمہارے نظام کو قتل اور تمہاری تدابیر کو ابتر کر دیا ہے۔ تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ، ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جو موت کے اس قدر عاشق ہیں جس قدر تم زیست کے عاشق ہو۔ اسلام لے آو، ورنہ جزیہ ادا کرو۔

دریائے یرموک کے نزدیک ایک اور مہم میں رومیوں کے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو پانی میں غرق کر دیا گیا۔ جس سے شام اور لبنان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت ابو بکر 63 سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ آپ کا عہد دو سال تین مہینہ رہا۔ ان کی وصیت تھی کہ مسلمان جہاد میں مصروف رہیں اور خلافت میں کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔

جاری ہے ....

مدینہ کی ریاست ۔ حصہ دوم

خلافت حضرت عمر

حضرت ابو بکر نے مرض وفات میں حضرت عمر کو اپنا جانشین نامزد کیا، اسی نامزدگی کی بنیاد پر حضرت ابو بکر کے بعد خلافت حضرت عمر نے سنبھالی۔ ابو بکر نے عجمی ممالک کے خلاف جہاد جاری رکھنے کی جو وصیت کی تھی، اسے حضرت عمر نے جاری رکھا۔ ہرمز کے جنگ میں ہارنے سے دجلہ کے حصے کو چھوڑ کر پورے ملک عراق پر قبضہ ہو چکا تھا۔ ایران کے شاہی خاندان اہل کسریٰ طوائف الملوکی کا شکار اور باہم برسرپیکار تھے۔

مال غنیمت اور کشور کشائی

ابوعبیدہ کی قیادت میں ایران کی فتح کی جانب پہلا شدت کا معرکہ ہوا۔ ابوعبیدہ نے دشمن کے اطراف کا تمام علاقہ برباد کر دیا۔ اور مال غنیمت جمع کر لیا۔ بکثرت لونڈیاں اور غلام بنائے گئے۔ خوراک کے بے شمار ذخیرے ہاتھ آئے، آس پاس کے عربوں کو بلا کر بھی کہا کہ وہ جتنا لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ نرسی جو کسریٰ کا خالہ زاد بھائی تھا، اس کے تمام خزانے قبضہ کر لئے۔ ابو عبیدہ نے جب خمس کا حصہ حضرت عمر کو ارسال کیا، تو ساتھ لکھا، ''اللہ تعالی نے ہم کو وہ چیزیں کھانے کے لئے عطا کی ہیں، جن کی سلاطین فارس حفاظت کرتے تھے۔۔'' وہاں اعلی نسل کے پھلوں کے باغات تھے، جو صرف شاہی خاندان کے لئے ہی مخصوص تھے۔'' فارس کو فتح کرنے کے کئی حملے کئے جاتے رہے۔ کسریٰ کے پاس مسلم سفیر بھی بھجوائے جاتے رہے، اسلامی سفارت میں یہی پیغام ہوتا، اسلام قبول کرو، یا جزیہ دو، یا لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مختلف مقامات پر خون ریز معرکے ہوتے رہے۔ جن میں دوطرفہ ہزاروں لوگ بے دردی سے قتل کئے جاتے رہے۔

ایران ایک ترقی یافتہ اعلی تہذیب کا حامل ملک تھا۔ بادشاہ اور رؤساء کے اتنے عالیشان محلات اور باغات تھے۔ اور شہر اتنے خوبصورت تھے، کہ صحراء میں رہنے والے تمدنی اور تہذیبی لحاظ سے پس ماندہ عرب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مال غنیمت ساٹھ ہزار لشکریوں میں تقسیم ہوا۔ خمس کا حصہ بھی خلیفہ کو روانہ کر دیا گیا۔ ان میں ہزارہا نہایت قیمتی نوادرات اور عجائبات تھے۔ کسری کا قالین 90 گز لمبا اور 60 گز چوڑا تھا۔ اس میں پھول پتیاں، درخت، نہریں، تصویریں، سونے کی تاریں اور جواہرات جڑے تھے۔ جب یہ چیزیں مدینہ پہنچیں، دیکھنے والے مسلمانوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ حضرت علی نے رائے دی، اس کو کاٹ کر لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ !!! حضرت علی کے حصے میں آنے والا ٹکڑا تیس ہزار درھم میں فروخت ہوا۔

عربوں کی فطری جبلت

ابن خلدون لکھتاہے،مال غنیمت کا پانچواں حصہ جو مدینہ پہنچا،اس کی مالیت تین کروڑ تھی،ہر سوار کو نو نو ہزار درہم اور نو نو گھوڑے ملے۔فاروق اعظم مال غنیمت اور جواہرات کے ڈھیر دیکھ کر رو پڑے۔۔عبدالرحمان نے کہا،امیرالمومنین،یہ تو مقام شکر ہے،آپ کیوں رو دیئے؟،فاروق اعظم نے جواب دیا۔جس قوم کو اللہ تعالی دولت دیتاہے،اس میں رشک اور حسد آجاتا ہے۔

عرب قبائل عہد رسالت سے ہی مال غنیمت پر جھگڑا کرتے آرہے تھے۔ان میں غنیمت کا لالچ اسلامی اخوت،ایثار،اور اتحاد سے زیادہ غالب تھا۔قبائلی عصبیت کا یہ حال تھا،کہ ہر قبیلے کی الگ الگ مسجدیں ہوتی تھیں۔اور وہ جداجدا محلوں میں رہتے تھے۔مدائن میں مچھروں نے عربوں کو تکلیف دی،تو سعد نے عمر کو اس بارے میں لکھا،عمر نے جواب دیا،"عربوں کی حالت اونٹ سی ہے،ان کو ایسی جگہ راس نہیں آسکتی،جو اونٹ کو راس نہ آئے۔"حضرت عمر کی ایران پر فتح سے وسطی ایشیاء اور ہندوستان پر فتح کے دروازے کھل گئے۔

حضرت عمر کا قتل

حضرت عمر پر قاتلانہ حملے کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ایک ایرانی غلام جو مال غنیمت میں اپنے عرب مالک مغیرہ بن شعبہ کو ملا تھا، حضرت عمر کے خلاف شکایت لے کر آیا،کہ اس کا مالک اس سے زیادہ خراج (اس کی کمائی کا حصہ) وصول کرتاہے۔غلام ہنر مند تھا،اور وہ آہن گری،نقاشی اور نجاری وغیرہ کے مختلف کام کرتا تھا۔حضرت عمر نے کہا،چونکہ تم کئی کام کرتے ہو،اس لئے تمہارا خراج زیادہ نہیں۔اس واقعے کے تیسرے دن حضرت عمر صبح کی نماز کے لئے مسجد تشریف لائے۔صف بندی کے بعد جب حضرت عمر نے تکبیر پڑھی۔وہ غلام نمازیوں میں گھس آیا،اور امیرالمومنین پر خنجر کے چھ وار کردیئے۔قاتلانہ حملہ کے تیسرے دن حضرت عمر کا نومبر 644ء میں انتقال ہوگیا۔آپ کی ازواج میں ام کلثوم بنت علی بھی شامل تھی (دونوں کی عمروں کا فرق اور رشتے داری کے ملغوبے کا اندازہ آپ خود کرلیں،حضرت عمر کی بیٹی حفصہ پیغمبر اسلام کی بیوی تھیں)۔

عربوں کی فتوحات کا موازنہ

مدینہ کی ریاست کے کارپرداز عربوں کی فطرت سے واقف تھے کہ ان کو دو چیزیں پسند ہیں،لڑائی اور مال غنیمت لوٹنا۔اسلامی فتوحات کی سرعت اور وسعت کو دیکھ کر عش عش کرنے والوں کے لئے عرض ہے۔کہ مسلمانوں سے پہلے اور بعد میں کئی فاتح حملہ آوروں نے اسی طرح کی فتوحات حاصل کی تھیں۔قیصر اعظم،اسکندر اعظم،نپولین اعظم،چنگیز خان،تاتاری اور تیمور کی فتوحات ایسی ہی شاندار تھیں۔چنانچہ ان فتوحات کا اسلام کے کسی معجزے یا جذبے سے کوئی تعلق نہ تھا۔قومیں جب اٹھیں،تو

اسی طرح اپنے اپنے زمانے میں طوفان کھڑے کئے۔ رومن ایمپائر، جرمن ایمپائر، ہسپانوی ایمپائر اپنے عروج میں حضرت عمر کی سلطنت سے زیادہ عروج پر تھیں۔

عرب اور فارس کا ثقافتی ٹکراؤ

دوسری بات جو اہم ہے، جب اسلام کی فتوحات شروع ہوئیں، تو اہل فارس اور اہل روم کی مملکتوں میں قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا۔ مال غنیمت کے چار حصے لشکریوں میں تقسیم ہوتے تھے، وہ اس فائدے کے حصول کے لئے بڑے جوش سے لڑتے تھے۔ حضرت عمر جبراً مفتوح رعایا کو اسلام میں داخل کرنے کے بھی خلاف تھے۔ آپ کے سیاسی کردار میں عرب نیشنل ازم اور قبائلی چھاپ نمایاں تھی۔ آپ نے شام کے دورے کے دوران معاویہ کا شاہانہ تزک و احتشام دیکھ کر کہا، معاویہ یہ کیا فرعونیت ہے؟۔ اسی طرح بیت المقدس کے دورے کے دوران یزید، ابو عبیدہ، اور خالد بن ولید کی حریری قباؤوں کو دیکھ کر برہم ہوئے، اور کہا، دو ہی برس میں تم نے عجمیوں کی عادتیں اپنالیں۔ اس برہمی کا تعلق اسلام کے اصولوں سے نہیں تھا، عمر پرانے پس ماندہ قبائلی اقدار کی نمائندگی کر رہے تھے، اور اسلام کے فاتح کمانڈر نئی مال و دولت اور نئی طرز زندگی سے آشنا ہو رہے تھے۔

ملک فارس پر عرب یلغار

بے پناہ مال غنیمت آنے سے عربوں کی زندگی کا معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی، نقشہ بدل رہا تھا۔ ایرانی لونڈیوں اور غلاموں کے ذریعے لہو و لعب کی محفلیں جمنے لگیں۔ اسلامی روایت کا خاتمہ ہونے لگا۔ دولت کی فراوانی اتنی تھی کہ حضرت عمر پوچھا کرتے تھے، کہ اس دولت کا کیا کروں؟۔ چنانچہ انصار اور قریش کے قبائل کی مردم شماری کرا کر ایک رجسٹر بنایا گیا تا کہ تمام گروہوں

اور طبقات میں حسب مراتب دولت کی تقسیم کی جاسکے۔ ازواج مطہرات کا دس دس ہزار درہم کا وظیفہ مقرر ہوا، حضرت عائشہ کو دو ہزار زیادہ دیئے گئے۔ حسن، حسین، سلمان فارسی، ابوذر غفاری کو پانچ پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر ہوا۔

لیکن ایران کی فتح کے بعد عربوں اور ایران میں جو شدید تضاد پیدا ہو گیا، وہ خطرناک نتائج کا حامل تھا۔ عربوں کی معیشت خانہ بدوش اور قبائلی تھی۔ ان کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ ایران کے پارسیوں میں علوم عقلیہ کا بہت فروغ ہو چکا تھا۔ اور وہ ایک بلند تہذیبی سطح پر زندگی گزار رہے تھے۔ چنانچہ ان میں ایک قومی تشخص اور تفاخر تھا۔ بدوی عربوں نے ایران کی تہذیب و ثقافت کو برباد کیا، ان کے شہروں کو لوٹ لیا، ایرانیوں نے زرتشت مذہب چھوڑ کر اسلام تو قبول کر لیا، لیکن عربوں کے خلاف ان کی نفرت کم نہ ہو سکی۔

عرب اور فارس کا ثقافتی فرق

ساسانی عہد کی ایک شاندار عمارت

ابن خلدون لکھتا ہے کہ حضرت سعد بن وقاص نے حضرت عمر کو لکھا کہ ہمیں یہاں بہت سے کتب خانے ملے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا کیا جائے؟ اگر اجازت ہو تو مسلمانوں میں ان کو بھی تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر نے فرمان جاری کیا، ان کو دریا برد کر دو۔ اگر ان میں ہدایت ہے، تو وہ ہمیں پہلے ہی مل چکی ہے، اور اگر گمراہی ہے تو اس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ چنانچہ کتابوں کو دریا برد کیا اور کچھ کو جلا دیا گیا۔ اس واقعہ سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بانیان اسلام کس قدر علم دوست تھے۔

حضرت عمر کے سامنے ایران سے جو اسیران جنگ لائے گئے، ان میں ایرانی شہنشاہ یزدگرد کی تین بیٹیاں بھی تھیں۔ حضرت عمر نے ان کو فروخت کرنے کا جب حکم دیا۔ حضرت علی نے فرمایا، شہزادیوں کے ساتھ تو ایسا سلوک ٹھیک نہیں جو عام لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت علی نے قیمت بیت المال میں جمع کروا کر ان تینوں لڑکیوں کو خرید لیا، ان میں سے ایک لڑکی حضرت عمر کے بیٹے عبداللہ کو، ایک لڑکی حضرت ابو بکر کے بیٹے محمد کو، اور ایک اپنے صاحب زادے حضرت حسین کو دی۔ انہیں کے بطن سے زین العابدین پیدا ہوئے تھے۔ ایرانیوں پر اموی استبداد کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد عربوں کے اس گروہ کا ساتھ دیا، جو اموی حکمرانوں کے خلاف تھا، یعنی حضرت علی اور ان کی اولاد۔ ایرانیوں کے تحت شعور میں مزدک،

زرتشت اورمانی تعلیمات جان گزیں رہیں۔اوروہ مختلف صورتوں میں باہر نکلتی رہیں۔جس نے بالآخر اسلامی دور کی سب سے بڑی عقلی تحریک "اعتزال"کاروپ دھارا۔

مدینہ کی ریاست ۔ حصہ سوم

حضرت عثمان کا دور

مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ جب عمر مدفون ہوئے،تو میں حضرت علی کے پاس آیا۔آپ غسل کر کے اس طرح کی پوشاک پہنے ہوئے تھے،لگتا تھا،انہیں یقین ہے،کہ وہ خلیفہ بنائے جائیں گے۔حضرت عمر نے کوئی جانشین مقرر نہیں کیا تھا،البتہ ایک مجلس شوریٰ بنادی تھی۔جس کو کہا گیا تھا،کہ ان کی وفات کے تین دن تک کوئی نئے خلیفہ کا کثرت رائے سے فیصلہ کرلیں۔طبری لکھتا ہے۔کہ حضرت عمر نے حضرت صہیب سے کہا،جب علی،عثمان،زبیر،عبدالرحمان،طلحہ،سعد،اکٹھے ہو جائیں،تم ان کے سر پر کھڑے ہو جانا،اگر پانچ متفق ہوں،اور ایک اختلاف کرے،تم اس کا سر تلوار سے پاش پاش کر دینا۔اوراگر چار متفق ہوں،توباقی دونوں کی گردنیں اڑادینا۔اگر تین متفق ہوں،توعبداللہ بن عمر کو ثالث بنانا۔اورجو متفقہ فیصلے سے انحراف کرے،ان کو قتل کرادینا۔

اسلامی طرز انتخاب

آج کل اسلامی احیاء پسند، خلافت راشدہ کے ابتدائی دور کو آج کے مروجہ جمہوری نظام کے مماثل قرار دیتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس 'اسلامی جمہوریت' میں اپوزیشن کی کوئی گنجائش نہ تھی، پہلے خلیفہ کے وقت بھی زبردستی بیعت کروائی گئی تھی، اسلام میں کسی سیاسی نظام کا کوئی خاکہ نہیں۔ وہ قبائلی معاشرت کے لوگ تھے، امیر کے چننے کیلئے بیعت کا طریقہ قبل اسلام سے تھا۔ بعد از اسلام بھی کسی نے خلافت کا استحقاق، تقویٰ اور نیکی کی بنیاد پر نہیں مانگا، بلکہ رسول سے قرابت، یا قبائلی برتری کی بنیاد پر جتایا گیا۔ حضرت عمر کی وفات کے چوتھے روز نماز فجر کے وقت انصار و مہاجرین اور امراء لشکر اکٹھے ہوئے۔ وہاں ایک دوسرے کے خلاف تلخ کلامی شروع ہو گئی، بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیاں تکرار ہونے لگی، قرابت داری کی بنیاد پر ایک دوسرے کو سپورٹ کرنے لگے۔ حضرت عبد الرحمان بن عوف نے حضرت عثمان کے ہاتھ بیعت کر لی، جو کہ حضرت عثمان کے رشتے دار تھے۔ حضرت علی نے اس پر اعتراض کیا، تو عبد الرحمان نے فرمایا، علی تم مخالفانہ حیل و حجت نہ کرو، میں نے غور و فکر سے فیصلہ کیا ہے۔ تمام روایات اس پر شاہد ہیں کہ جانشینی کا فیصلہ خوشگوار ماحول میں نہیں ہوا تھا، اور مبینہ طور پر علی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ "اس اجتماع کے بعد تلواریں بے نیام ہونگی، اور امانت میں خیانت ہو گی"۔ حضرت عمر نے جو مجلس شوریٰ مقرر کی تھی، اس میں کوئی انصاری صحابی شامل نہیں تھا۔ حضرت عثمان کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ اسلام قبائلی عصبیت کا خاتمہ کرنے میں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

حضرت عثمان کا طرز خلافت

حضرت عثمان نے خلیفہ بنتے ہی مقربین کو مقرر کردہ وظائف کے علاوہ ان کیلئے انعام و اکرام جاری کر دیئے۔ حضرت زبیر کو چھ لاکھ اور حضرت طلحہ کو دو لاکھ درہم دیئے۔ اور وہ قرض بھی معاف کر دیئے، جو انہوں نے حضرت عثمان سے لئے تھے۔ حضرت عمر نے قریش کے لوگوں پر پابندی لگائی ہوئی تھی کہ مدینے سے باہر اسلامی مفتوحہ علاقوں میں نہیں جا سکتے، انہیں خدشہ تھا صحابہ کرام ان کے خلاف کوئی فتنہ کھڑا نہ کر دیں۔ حضرت عمر کا خیال تھا حضور اکرم کی ساتھ قرابتداری کے لحاظ سے ان کے جو وظیفے مقرر ہیں، وہ ان کی ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ لیکن حضرت عثمان نے نقل و حرکت کی پابندی ہٹالی اور قریش قبیلے کے لوگ نئی سلطنت کی وسعتوں میں پھیل گئے۔

اب ان صحابہ کرام نے اپنے پیسے کو تجارت میں لگا کر اسے مزید دوگنا کرنا شروع کر دیا، یعنی مدینے میں بھی امراء کا ایک نیا طبقہ تشکیل پانے لگا جسے قریش ارسٹوکریسی (Aristocracy) کہہ سکتے ہیں۔ ان صحابہ کرام نے پیغمبر اسلام کے ساتھ اپنی قبائلی

قرابت داری کا خوب استعمال کیا اور مختلف شہروں میں بڑی بڑی ملکیتیں اور جائدادیں بنالیں۔ لوگ بھی اس لالچ میں ان کے قریب ہوگئے کہ آئندہ یہ خلیفہ بھی بن سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر دنیاوی متاع کے طلب گار تھے، ثواب و آخرت کے کم۔

حضرت عثمان کے دور میں مصر اور شمالی افریقہ کے علاقوں پر چڑھائی کی گئی اور ان کو فتح کر لیا گیا۔ حضرت عثمان نے کوفہ میں بنو امیہ کے دباؤ کے تحت سعد بن ابی وقاص کو معزول کیا اور ولید بن عقبہ کو یمنی قبائل کی مخالفت کی وجہ سے گورنری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یعنی کوفہ شہر کا طرز زندگی قبائلی نہیں تھا، وہاں اسلامی اتحاد نام کی چیز نہیں تھی۔ چنانچہ کوفہ میں ان بنیادوں پر فتنہ وفساد ابھرنے شروع ہوگئے کہ مفتوحہ علاقوں کی زمینوں اور دولت پر کن کا قبضہ ہونا چاہئے؟ مقامی اور فاتحین کے درمیان کیا تعلقات ہونے چاہئیں؟

حضرت عمر نے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں پر عربوں کے قبضہ کی مخالفت کی تھی۔ وہ مقامی لوگوں کے پاس چھوڑدی تھی تاکہ ان کی آمدنی خراج کی صورت میں بیت المال میں جمع ہوکر عام مسلمانوں کے کام آتی رہے۔ لیکن حضرت عثمان نے اہل حجاز اور عام عربوں کو مفتوحہ علاقوں میں جاکر زمینیں خریدنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حجاز کے کئی صحابہ کرام بڑی بڑی منقولہ اور غیر منقولہ املاک کے مالک بن گئے۔ انہوں نے سرسبز وشاداب اور زرخیز زمینیں خریدلیں۔ جس سے عراق اور دوسرے علاقوں میں بڑی بڑی جاگیریں وجود میں آگئیں۔ جبکہ دوسری طرف غلام، مزدور اور موالی طبقات میں اضافہ ہوگیا۔ عرب معاشرہ کچھ اس طرح کے طبقات میں تقسیم ہوگیا۔ فاتح عرب، مفتوح عجمی، قریش سرمایہ دار اور جاگیر دار، کھیت مزدور اور چھوٹے مالکان اراضی۔ بے زمین عرب بدو اور شہروں کا چھوٹا درمیانہ طبقہ۔

زراندوزی کے مسئلے پر ہی حضرت ابوزر غفاری کا شام کے گورنر معاویہ سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے دولت مندوں کے خلاف اور غریبوں کی حمایت میں تقریر کی۔ جس پر معاویہ نے حضرت عثمان کو لکھا کہ ابوذر غفاری میرے لئے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ خلیفہ عثمان نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ابوذر غفاری کے ساتھ نرمی برتو اور اس کو میرے پاس بھیج دو۔۔ حضرت ابوذر کی حضرت عثمان کے ساتھ دولت کی بے جا تقسیم پر کئی بار تلخ کلامی ہوتی رہی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ عہد عثمانی میں اسلامی مملکت میں طبقاتی تضاد کس قدر شدید ہو گیا تھا۔ حضرت عثمان پر کنبہ پروری کے الزامات عائد ہوتے رہے۔

حقیقتاً اسی دور میں سنتِ رسول اور عترتِ رسول کو بنیاد بنا کر امت مسلمہ دو فریقوں میں بٹنے لگی تھی۔ اہل سنت وجماعت کے علماء حب اہل بیت کے معاملے کو ایک یہودی نو مسلم عبد اللہ بن سبا کی گھڑی سازش قرار دیتے ہیں۔ وہ بصرے اور کوفے میں جاکر تقریریں اور پروپیگنڈا کرتا تھا کہ اے مسلمانو! تمہارے درمیان آلِ رسول موجود ہے اور تم ان کو خلیفہ نہیں بناتے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین ابن سبا کی اس داستان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ان کے پاس ایک لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم تھے۔ کئی جاگیریں تھی، بے شمار اونٹ اور گھوڑے تھے۔ زبیر نے ترکے میں پچاس ہزار دینار، ایک ہزار گھوڑے اور ہزار لونڈیاں چھوڑیں تھی۔ طلحہ کی عراق سے غلہ کی تجارت سے یومیہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی۔ عبدالرحمان کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے، ہزار اونٹ، دس ہزار بکریاں، چوراسی ہزار دینار موجود تھے۔ زید بن ثابت نے ایک لاکھ دینار کی جاگیر کے علاوہ سونے چاندی کی اینٹیں چھوڑیں۔ ان کے بصرہ، کوفہ، اسکندریہ، مصر میں بڑے بڑے مکانات تھے۔

یہ تھی صحابہ کرام پر مشتمل وہ حکمران اشرافیہ، جو ابتداء میں دولت سے نفرت کرتے تھے، وہی مال وزر جمع کرنے کے شوقین ہو گئے۔ مساوات محمدی کی ساری مثالیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اور ان پر انسانی فطرت وجبلت غالب آگئی۔ اس طرح کے واقعات بھی ہوئے کہ خمس بیت المال میں جمع کرانے کے بجائے اسے خرد برد کر دیا گیا۔ اور رشتے داروں کو جی بھر کر مال وزر جمع کرنے کا موقع دیا گیا۔ اپنے لوگوں میں بلا استحقاق زمینیں الاٹ کی جاتی رہیں۔ قبائلی معیشت و معاشرت کا جاگیر داری معیشت و معاشرت میں ڈھلنا ایک تاریخی عمل تھا۔ فتوحات، خونریزی، اور استبدادیت تاریخی عمل کے لازمی اجزاء تھے۔ ان کے کردار میں دین اسلام کا نہ کوئی رول ملتا ہے، نہ کوئی عمل دخل۔ اسلام کی "مثالی اقدار" جو آج لوگوں کو سنائی جاتی ہیں، خیالوں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔

مشاجرات صحابہ

حضرت عثمان کا قتل اور حضرت علی و دیگر صحابہ سے مناقشہ کے بارے میں جب ہم تاریخ اسلام پڑھتے ہیں، تو صحابہ کرام کے درمیان ایسے افسوسناک واقعات اور ایک دوسرے کے بارے میں کہے گئے ایسے کلمات ملتے ہیں، جن کے بارے میں عام مسلمان تصور بھی نہیں کرسکتے۔ صحابۂ کرام میں باہمی نفاق کی یہ حالت تھی، تو عام مسلمانوں کے رویوں میں کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ حضرت علی، حضرت عثمان پر کنبہ پروری کا الزام لگاتے رہے۔ اور عثمان سمجھتے تھے کہ حضرت علی مفسدین کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ حضرت عثمان کا موقف تھا کہ ان سے پہلے کے دو بزرگوں (ابو بکر اور عمر) نے بنظرِ احتساب اپنے قرابت داروں کو فائدے نہ پہنچائے۔ "حالانکہ رسول اللہ اپنے قرابت داروں کا خیال رکھا کرتے تھے اور ان کی مدد کیا کرتے تھے"۔ عبد اللہ بن مسعود ایک صحابی تھے، وہ بھی حضرت عثمان کی طرز حکومت پر سخت نقطہ چینی کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو عثمان منبر رسول پر خطبہ دے رہے تھے۔ تو حضرت عثمان نے کہا، "لوگو! تمھارے پاس ایک چھوٹا سا رینگنے والا جانور آیا ہے۔ حضرت عائشہ نے آواز دی، اے عثمان! آپ رسول اللہ کے مصاحب کو ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عثمان کے کہنے پر عبداللہ بن مسعود کو نہ صرف زبردستی مسجد سے نکال دیا گیا، بلکہ زدوکوب بھی کیا گیا جس سے ان کی پسلی ٹوٹ گئی۔ یہ دیکھ کر حضرت علی کھڑے ہوگے، اور عثمان کی اس حرکت پر ملامت کی۔

اسی طرح ایک بار حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عثمان کی اقرباءپروری پر مذمت کی۔ جب انہوں نے بیت المال سے ایک ہیرا نکال کر اپنے خاندان میں سے کسی کو دے دیا۔ حضرت عثمان نے اسے اتنا پیٹا، کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ لوگ انہیں اٹھا کر امّ المومنین امّ سلمہ کے گھرلے آئے۔ ایک اور موقعے پر بھی حضرت عثمان نے حضرت عمار کو گالیاں دیں، لاتیں ماریں جب کہ وہ بوڑھے اور ضعیف تھے۔

امیر معاویہ سات سال تک شام، لبنان، فلسطین کے حکمران ہونے کی وجہ سے طاقتور اور ایک کامیاب حکمران تھا اور ان میں خود خلیفہ بننے کی خواہش پیدا ہوجانا فطری تھی۔ معاویہ بہت اچھا منتظم تھا۔ اس نے نظم وضبط بھی اچھی طرح قائم کر رکھا تھا۔

شہادت حضرت عثمان

حضرت عثمان کا انجام یوں ہوا کہ کچھ مصری بلوائی حضرت عثمان کی خلافت کے خلاف مدینے میں آگئے، انہوں نے حضرت علی، طلحہ، اور زبیر کی مدد چاہی، لیکن انہوں نے بلوائیوں کی عثمان کے خلاف کسی حرکت کی حمایت کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن بلوائیوں نے مدینے کی گلیوں میں اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے حضرت عثمان کا محاصرہ کرلیا اور خیمہ زن ہوگئے۔ حضرت عثمان نے مختلف شہروں میں امداد کے لئے خطوط بھیجے۔ اور منبر پر چڑھ کر مصری باغیوں کے خلاف سخت زبان میں تقریر کی۔

اس پر دو طرفہ ہنگامہ بڑھ گیا، لوگوں نے ایک دوسرے پر پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ حضرت عثمان بھی سنگباری کی زد میں آگئے اور وہ بے ہوش کر منبر سے گر پڑے۔ ان کا محاصرہ چالیس دن بر قرار رہا۔ اس دوران قتل و غارت بھی ہوتا رہا۔ بنو امیہ نے حضرت علی پر الزام لگایا کہ سب کچھ اس نے کروایا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مصری بلوائی واپس چلے گئے تھے کہ راستے میں انہوں نے حضرت عثمان کے ایک جاسوس کو پکڑ لیا، جس پاس ایک خط تھا، جس میں مصر کے حاکم کو لکھا تھا، کہ وہ مصر پہنچنے پر ان بلوائیوں کو قتل کر دے۔ چنانچہ مذکورہ بلوائی غصہ کے مارے پھر مدینہ واپس حضرت عثمان کے پاس آگئے، حضرت عثمان نے کہا کہ انہوں نے ایسا کوئی خط نہیں لکھا۔ میرے خلاف دو مسلمان گواہ لے کر آو۔ بحث و تکرار چلتا رہا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ "اگر میں تمھاری مرضی کے مطابق کام اور تقرریاں کروں، تو میری حثیت باقی نہیں رہے گی"۔ حضرت عثمان نے دستبردار ہونے سے بھی انکار کر دیا۔

واقعہ کے مطابق محمد بن ابو بکر تیرہ افراد کے ساتھ حضرت عثمان کے گھر گھسے۔ محمد بن ابو بکر نے عثمان کی داڑھی پکڑ لی اور کہنے لگے معاویہ نے تم کو کیا فائدہ پہنچایا ہے؟ حضرت عثمان نے کہا اے میرے بھتیجے! میری داڑھی چھوڑ دے۔ راوی کہتے ہیں: میں نے دیکھا انہوں نے ایک شخص کو اشارہ کیا، جو بھالا لے کر گیا اور ان کا سر پھوڑ ڈالا، اور پھر سب لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو قتل کر دیا۔" حضرت عثمان کی زوجہ نائلہ درمیان میں حائل ہوئیں، لیکن سودان کی تلوار سے ان کی انگلیاں نصف ہتھیلی کے ساتھ کٹ کر دور جا گریں اور پھر اس نے ایک اور وار کر کے خلیفہ کی گردن تن سے جدا کر دی۔ اس کے بعد بلوائیوں نے گھر کا سارا مال و متاع لوٹ لیا، اور مدینہ میں ان کے قتل کا اعلان کر دیا۔ باغیوں نے قتل کرنے کے بعد ان کو دفنانے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ بڑی مشکل سے رات کو چھپ کر چند لوگوں نے حضرت عثمان کو دفنایا تھا۔ حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ بائیس روز رہا اور وہ 2 مئی 656ء کو قتل ہوئے۔

یہ ہے، وہ اسلام کا سیاسی نظام اور مدینے کی ریاست جسے آج کی مسلمان نسلوں کو سنہرے دور کے طور پر پیش کر کے بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ ان مولویوں سے جب پوچھیں گے، تو وہ کسی ایک فرد یا کچھ افراد پر الزام دھر دیں گے۔ حالانکہ ان واقعات میں

کسی طرح کا بھی کوئی اخلاقی معیار، چھوٹے بڑے کی تمیز، کوئی تہذیب کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اور یہ سب وہ لوگ تھے، جو پیغمبر اسلام کی صحبت میں رہ چکے تھے اور ان سے تربیت پا چکے تھے۔

شہیدِ وطن راجہ داہر

سندھ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے، امری، کوٹ دیجی، موہنجوداڑو اور چند نسبتاً کم جانے والے غیر معروف کھنڈرات اس علاقے کے عظیم اور شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کا عمومی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ لوگ کپاس اگاتے اور سوتی کپڑے پہنتے تھے۔ کپاس کے متعلق یونانی مورخ ہیروڈوٹس کچھ یوں لکھتا ہے کہ وادی سندھ میں ایک عجیب و غریب پودا ہوتا ہے جس میں چاندی کے سفید پھول اگتے ہیں۔

وادی سندھ کے لوگ اپنی ہم عصر سومیری، مصری اور دیگر تہذیبوں کے برعکس انتہائی امن پسند اور صلح جو لوگ تھے۔۔ انہوں نے کسی نزدیکی ملک پر حملہ کر کے لوٹ مار یا قتل عام نہیں کیا، لیکن اس کے برعکس انہیں بہت سے غیر ملکی لٹیروں کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جن میں ایرانی، یونانی اور عرب سرفہرست ہیں۔

سرزمین عرب دنیا کے سب سے زیادہ گرم اور خشک ترین خطوں میں سے ایک ہے۔ سوائے کچھ قابل کاشت اور زرخیز علاقوں (نخلستان) کے علاوہ اس ملک کے بیشتر حصہ ایک جھلسا دینے والے صحرا اور دشت پر مشتمل ہے۔ یہاں پر کوئی ایک بھی قابل ذکر دریا نہیں ہے جس کے کنارے دنیا کی کوئی تہذیب جنم لیتی۔ نبی کریم کے وقتوں میں اس علاقے کا بیشتر حصہ خانہ بدوش بدوؤں کی اماجگاہ تھا۔ جو پانی کے چشموں اور چراگاہوں کے حصول کیلئے آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔ دوسرے قبیلوں پر حملہ کر کے ان کا مال و دولت، مویشی، عورتیں اٹھا لینا عام سی بات تھی، انہی جنگوں میں دوسرے قبیلے کے مردوں کو قیدی کرنے کی وجہ سے غلامی اپنے عروج پر تھی، اس علاقے کو اگر ایک صحرائی سمندر کہیں تو عرب بدو اس صحرائی سمندر کے "بحری قزاق" تھے

یہی صحرائی لٹیرے بعد میں اسلام قبول کرتے ہیں اور لوٹ مار کی بدوی روایت مذہب اسلام کا حصہ بنتی ہے جو قریش مکہ کے تجارتی قافلوں کے لوٹنے سے شروع ہوتی ہے اور ان قافلوں کے لٹنے کی وجہ سے قریش مکہ اور مدینہ کے مسلمان مہاجروں کے درمیان غزوہ بدر کا باعث بنتی ہے، غزوہ بدر در حقیقت قریش مکہ کی مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف ایک دفاعی جنگ تھی۔ مسلمان طاقت پکڑنے کے بعد مدینہ کے یہودیوں کو بے دخل کرنے، قتل عام کرنے، ان کا مال و دولت لوٹنے، ان کی عورتوں کو

باندیاں بنانے کے بعد خیبر سمیت دیگر نزدیکی بستیوں کا رخ کرتے ہیں۔ صحرائی بدوؤں کی یہ لوٹ مار صرف عرب تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اردگرد کی عظیم تہذیبیں بھی اس کا شکار بنتی ہیں۔

"ساتویں صدی میں جب سندھ اپنی شان وشوکت کے عروج پر تھا، عرب جاہلیت کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھا۔ عرب مجموعی طور پر نہ صرف جاہل ترین بلکہ بدترین لوگ تھے"

(جی ایم سید سندھو جی ساجانھ)

"عرب ایک وحشی قوم ہے، جن میں وحشت کے علت واسباب مستحکم ہیں، جو ان کی گھٹی میں پڑے ہیں اور ان کی طبعیت ثانیہ بن چکے ہیں اور انہیں بہت پیارے ہیں کیوں کہ انہیں آزادی میسر ہے کہ ان کی گردن میں کسی حکومت کا پٹہ نہیں۔ اور یہ عادتیں معاشرہ کے خلاف اور معاشرتی زندگی کے متضاد ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی عادت ہے کہ یہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتے، ہر طرف لوٹ مار کرتے ہیں جو امن وسلامتی کے موجب تمدن کے خلاف ہے، مثال کے طور پر انہیں پتھر اس لیئے چاہیئں کہ اس پر دیگیں رکھ کر پکائیں، اسے ضرورت کو پورا کرنے کیلیئے وہ عمارت ڈھادیتے ہیں، مکان منہدم کردیتے ہیں اور اپنی ضرورت پوری کرنے کیلیئے پتھر اکھاڑ کرلے جاتے ہیں۔ اس طرح خیمے گاڑنے کیلیئے انہیں لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیئے جہاں سے موقع پاتے ہیں، چھتیں اکھاڑ کرلے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کا وجود تعمیر کے منافی ہے، اور تخریب پسند ہے۔ اور تعمیر ہی معاشرے اور آبادی کی بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ لوٹ مار ان کا زریعہ معاش ہے اور ان کا رزق ان کے نیزوں کے نیچے ہے۔ اور لوٹنے کے سلسلے میں انکے ہاں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ کہ اس پر آکر رک جائیں، بلکہ جب بھی ان کی نگاہ کسی کے مال، برتنے کی چیز یا کسی سامان پر پڑتی ہے، اسے لوٹ لیتے ہیں۔ جب ان کے غلبہ واقتدار کا مدار لوٹ کھسوٹ پر ہے، تو اگر ان کے ہاتھوں میں حکومت آجائے، تو لوگوں کا مال اور جانیں ان سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ لا محالہ آبادی اجڑے گی اور معاشرہ خراب ہو گا۔ نیز یہ صنعت کاروں سے جبر یہ کام کراتے ہیں اور ان کی نگاہ میں ان کے کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اس لیئے صنعت کاروں کو ان کی محنت کا کافی صلہ نہیں ملتا، اور صنعت و حرفت ہی معاش کا اصلی ذریعہ ہے۔ پس جب لوگوں کے کام اور محنت کی بے قدری ہوتی ہے، اور صنعت و حرفت والوں کو ناحق بیگار کرنی پڑتی ہے، تو اہل حرفہ کی توجہ اس طرف سے اٹھ جاتی ہے اور ہاتھ کام سے رک جاتے ہیں، امن وسلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور آبادی اجڑنے لگتی ہے۔۔۔۔۔۔ مثلاً یمن ان کی قرار گاہ بنا تو بربادی کے گھاٹ اترا سوائے چند شہروں کے عراق کا بھی یہی حال ہوا کہ پارسیوں کے زمانے میں کیسا سرسبز تھا اب کیسا اجڑا ہوا ہے ادھر شام بھی ویران ہے یہی حال مغرب وافریقہ کا ہے تمام ملک ویرانی بھینٹ چڑھا حالانکہ بنو ہلال بنو سلیمہ کی آمد سے پہلے سارا علاقہ آبادی سے بھرپور تھا شہروں اور قریوں میں مٹی ہوئی آبادی کے آثار و علامات اور اجڑے گھروں کے کھنڈر اب بھی

زبان حال سے اگلی آبادی کا پتہ دے رہے ہیں عرب سیاست ملکی میں تمام اقوام سے دور تر اور نا آشنا ہیں ان کی پوری ہمت اس بات پر جمی ہوتی ھے کہ کسی صورت سے لوگوں کا مال لوٹ کھسوٹ کر لے جائیں جب وہ اپنی غرض پوری کر لیتے ہیں تو پھر اہل ملک سے نظر پھیر لیتے ہیں۔نہ انکی مصلحتوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں نہ انکو ارتکاب فساد سے روکتے ہین بہت سے لوگوں پر جرمانے کرتے ہیں صرف اس لالچ سے کہ کسی راستے انکو مالی فائدہ پہنچے بکثرت مال و دولت جمع ہو سکے ان کے حاکم رعایا کو خوب نچوڑتے ھیں رعیئت بربادی کا نشانہ بنتی ہے اور آبادی گھٹنے لگتی ہے نقل ہے کہ ایک اعرابی حجاز سے عبدالملک کے پاس آیا عبدالمالک نے اعرابی سے حجاج بن یوسف کا حال پوچھا اس نے گویا حجاج بن یوسف کی تعریف کرتے ہے اور حسن انتظام کو بیان کرتے ھوے کہا کہ میں اسکو تنہا ظلم کرتے ہوے چھوڑ آیا ہوں گویا عرب میں اگر صرف حاکم ہی ظلم و ستم کرتا ہو تو یہ اسکے حسن انتظام کی دلیل ہے

(مقدمہ ابن خلدون)

عربوں کے پہلے خلیفہ ابو بکر بن ابو قحافہ کا دور زیادہ تر اندرونی شورشوں کا خاتمہ کرنے میں مصروف رہا۔لیکن عمر بن خطاب کے خلیفہ بننے تک اندرونی خلفشار پر قابو پایا جا چکا تھا۔اس سے عمر کو ارد گرد کے ملکوں میں اسلام پھیلانے کے نام پر استعمارانہ قبضے اور لوٹ مار کرنے کا موقعہ ملا۔ہمیں اگر یہ دعوے سننے کو ملتے ہیں کہ عمر کے دور میں مدینہ اور مکہ میں کوئی خیرات لینے والا نہیں ملتا تھا،تو اس خوشحالی کی وجہ ان علاقوں میں صنعت و حرفت یا تجارت کا عروج نہیں بلکہ دیگر ممالک کے مالی وسائل کی لوٹ مار تھی۔عربوں کے ارد گرد کے ملکوں پر حملوں کا واحد مقصد لوٹ مار،غلاموں اور لونڈیوں کا حصول تھا جسے اسلام کی تبلیغ کے خوبصورت لفظوں کے نیچے چھپایا گیا۔جس مذہب کے ماننے والوں کا دعویٰ ہو کہ "دین میں جبر نہیں ہے" ان کا نزدیکی بستیوں اور ملکوں کو مال غنیمت کے نام پر لوٹ مار،قتل و غارت،اور زنا بالجبر کو دین پھیلانے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

"عرب مادی فوائد کی خاطر حضرت عمر کے زمانے میں سیاسی طور پر بہت متحد تھے۔کیونکہ اس نے اپنی خلافت کے دوران پڑوسی ملک ملکوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔یوں عرب سامراج نے عرب مسلمانوں کو یہودیوں کی طرح خدا کی منتخب قوم قرار دیتے ہوئے تلوار کے زور پر اسلام پھیلانے اور دوسری قوموں کو لوٹنے کا آغاز کیا۔کسے معلوم نہیں کہ حضرت عمر نے اسلام کے نام پر جو خلافت کا ادارہ قائم کیا اور اسلامی فتوحات کیلئے "جہاد" کا اعلان کیا۔اس خلافت کے ادارے کا نہ تو قران میں کوئی ذکر ہے اور نہ ہی پیغمبر کا فرمان۔لہذا یہ کبھی بھی ایک متبرک ادارہ نہیں تھا"۔

(جی ایم سید:سندھو جی ساجانھ)

پاکستان کی درسی کتابوں میں عربوں کے سندھ پر حملے کی وجہ دیبل کے نزدیک سمندری قزاقوں کا سراندیپ (سری لنکا) سے مکہ جاتے ہوئے حاجیوں کا ایک جہاز کو لوٹ لینا بتایا جاتا ہے، ان حاجیوں میں بنی عزیز قبیلہ کی بھی ایک عورت تھی۔ وکیپیڈیا کے مطابق سراندیپ (موجودہ سری لنکا) کے راجہ نے اموی خلیفہ ولید بن عبدالمالک کیلئے تحائف سے بھرا ایک جہاز بھیجا جس میں ایک خوبصرت لڑکی بھی شامل تھی، اس جہاز کو سمندری قزاقوں نے لوٹ لیا، حجاج بن یوسف نے راجہ داہر سے ان کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا جسے راجہ داہر نے مسترد کر دیا۔۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے غصے میں آکر راجہ داہر کو حکم عدولی کی سزا دینے کیلئے فوجیں بھیجیں۔

اس حملے کی دوسری وجہ محمد بن حارث علافی اور اسکے پانچ سو ساتھی کو امویوں کے حوالے نہ کیا جانا بھی بتایا جاتا ہے۔ پاکستان کی درسی کتابوں میں دانستہ اس نام کا ذکر نہیں کیا جاتا کیونکہ اس سے اسلام اور کفر کی جنگ کا بیان کمزور ہو جاتا ہے۔

چچ نامہ کے مطابق حجاج کے مقرر کردہ مالیاتی عامل جس کا نام سعید تھا، اس نے بلاوجہ سفھوی بن لام الحمامی کو قتل کر دیا، جواب میں علافی قبیلے والوں نے سعید کو قتل کر دیا، حجاج نے علافیوں کے کئی لوگوں کو قتل کروایا۔ اس کے علاوہ حجاج نے اپنے نئے گورنر کو کہا"علافیوں کو تلاش کرنا اور کسی طرح بھی انہیں قبضہ میں کر کے سعید کا انتقام لینا"۔ نتیجتاً علافی قبیلہ کے لوگ بھاگ کر راجہ داہر کے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ سندھ میں علافیوں کے پناہ لینے کی وجہ راجہ داہر کا مذہبی رواداری پر مبنی رویہ تھا۔ اسی لیئے جہاں سندھ میں ہندو، بدھ، زرتشتی موجود تھے، وہیں اموی حکومت کے مخالف مسلمان بھی پناہ گزیں تھے۔ مذہبی رواداری کا یہ رویہ راجہ داہر سے پہلے سے ہی وادی سندھ کا طرہ امتیاز تھا۔ جس کی واضع اور بہترین مثال داہر کے باپ چچ بن سیلائج کا سکھر کے قلعے کو فتح کرنے کے بعد اس کی حاکمیت امیر عین الدین ریحان مدنی کے حوالے کرنا ہے۔ ایک غیر مذہب اور غیر زبان کو اتنی اہم ذمہ داری سپرد کرنے کا مطلب صاف واضع ہے کہ یہاں حملے سے پہلے ہی مسلمانوں کی خاصی تعداد مقیم تھی۔ اور راجہ کو ان کی وفاداری پر پورا بھروسہ تھا، سکھر کے قلعہ پر قبضے کے وقت یقیناً اکیلا مسلمان تو نہیں ہو گا، جو مہم جوئی کے نقطہ نظر سے سندھ کی جانب آنکلا ہو۔ جی۔ ایم۔ سید کے بقول راجہ داہر نے امام حسین بن علی کو بھی پناہ کی پیشکش کی تھی، لیکن اسے کربلا کے مقام پر شہید کر دیا گیا۔

محمد بن قاسم کے حملے کے وقت راجہ داہر علافیوں کے سردار محمد بن حارث علافی کو عربوں کی جاسوسی کرنے کی عہدہ سپرد کیا، چچ نامہ کے مطابق محمد علافی نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ باوجود اس کے کہ آپ کی عنائتوں کے بدلے آپکی خیر خواہی ہم پر واجب ہے لیکن ہم مسلمان ہیں اس لیئے لشکر اسلام کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے، کیونکہ اگر ہم قتل ہوگئے تو جہنم میں جائیں گے اور اگر ہم نے کسی کو قتل کیا تو ان کا خون ہماری گردن پر ہو گا۔ مجھے یہاں سے نکل جانے کی اجازت دیجئے۔ لیکن چچ

نامہ کا تضاد اس وقت سامنے آتا ہے جب اسی چچ نامہ کے مطابق محمد علافی داہر کی شہادت کے بعد اس کے بیٹے جے سنہا کے ساتھ مل کر آخر دم تک عربوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے ملتا ہے

جیسے عمر کے زمانے سے عربوں کی ارد گرد کے پڑوسی ملکوں پر قبضے کو اسلام پھیلانے کی کوشش نہیں سمجھا جا سکتا، ویسے ہی سندھ پر اموی دور میں محمد بن قاسم کا حملے کو کسی مسلمان حاجی خاتون کی پکار پر لبیک کہنا بالکل جھوٹ ہے، سندھ کی شان و شوکت اور خوشحالی ہمیشہ سے عرب لٹیروں کے منہ میں رال ٹپکانے کا باعث رہی تھی۔ حاجیوں کے جہاز لٹنے کی کہانی اس حملے کو جائز ٹھہرانے کیلئے گھڑی گئی ہے، آج سری لنکا جہاں 2013 میں احمدیوں سمیت مسلمانوں کی تعداد دس فیصد سے کم ہے، تیرہ صدیاں پہلے وہاں اتنے مسلمان کہاں سے آ گئے کہ ان کے حاجیوں کے قافلے جہاز بھر بھر کر مکہ جانے لگے۔ اور اگر واقعی کوئی جہاز لٹا بھی تھا تو اس کا ذمہ دار راجہ داہر کو کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ داہر یا اس کے سپاہیوں نے تو جہاز نہیں لوٹا تھا اور نہ ہی وہ عربوں کا ماتحت تھا کہ ان کا حکم بجالانا اس کا فرض منصبی تھا۔

اگر مسئلہ محمد علافی اور اس کے ساتھیوں کو امویوں کے حوالے کرنے کا تھا، تو راجہ داہر اپنے وقت کے سماجی قوانین کے خلاف جاتے ہوئے کیسے ایک پناہ گزین مہمان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دیتا۔ سندھ پر حملے کی اصل وجہ عربوں کی لوٹ مار کی وہی جبلت تھی جسے مختلف بہانوں سے جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیل میں چند حملوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مزید تفصیلات کیلیئے چچ نامہ یا فتوح البلدان دیکھیں۔ جو مصنفین کے مقامی لوگوں کے خلاف تعصب کے باوجود یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اصل کہانی سندھ کی لوٹ مار تھی، نہ کہ حاجیوں کے قافلے کا لٹنا یا کچھ اور۔ وادی سندھ پر حملوں کا سلسلہ عمر بن خطاب کے زمانے سے شروع ہوا۔ عمر کے زمانے میں شام، عراق، مصر اور ایران پر قبضہ ہونے کے بعد کی لوٹ مار کی وجہ سے جہاں بہت زیادہ مال و دولت عربوں میں خوشحالی پیدا کرتی ہے، وہیں یہ دولت عربوں کی فوجی طاقت میں اضافے کا باعث بھی بنتی ہے۔ چنانچہ اموی دور میں عربوں کی نگاہیں سندھ، سپین اور دیگر ممالک کی دولت لوٹنے پر مرکوز ہوتی ہیں۔ چیدہ چیدہ حملوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ جی۔ ایم۔ سید کے بقول ولید بن عبد الملک کے زمانے میں ہونے والے سندھ پر حملے سے پہلے یہاں 14 حملے ہو چکے تھے۔

(تفصیل کیلیئے دیکھیئے، سندھو جی ساجانھ۔)

عمر بن خطاب کے زمانے مین مغیرہ بن ابو العاص دیبل کی جانب روانہ ہوتا ہے، اس وقت یہاں پر داہر کے باپ چچ بن سیلائج کی حکومت ہوتی ہے، جنگ میں مغیرہ مارا جاتا ہے، مغیرہ کی موت کے بعد جب عمر کو ربیع بن زیاد حارثی کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ " ہند اور سندھ میں ایک ایسے راجہ کا ظہور ہوا ہے جو کہ سرکشی اور لاپرواہی کرتا ہے اور دل میں نافرمانی کے بیج بوئے ہوئے ہے" تو عمر سندھ کی جانب مزید لشکر بھیجنے سے منع کر دیتا ہے۔

تیسرے خلیفہ عثمان بن عفان نے عبداللہ بن امیر کو عراق کا والی مقرر کیا اور اس سے کہا کہ ہند کے طرف کسی کو بھیج کر اس علاقے کے متعلق معلومات فراہم کرے۔ جس نے عبداللہ بن عامر اور حاکم بن جبلہ کو اس کام کو سرانجام دینے کیلئے بھیجا اور وہاں سے واپسی کے بعد اسے عثمان کے پاس اطلاع دینے کیلئے بھیجا، عثمان کو ہند کے متعلق کچھ یوں بتایا جاتا ہے۔

"اے امیر المومنین، میں نے معائنہ کیا ہے اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں" تو حضرت عثمان نے کہا بتاؤ۔ اس نے کہا: وہاں کا پانی میلا پھل کسیلے اور کھٹے ہیں، زمین پتھریلی ہے مٹی شوریدہ اور باشندے بہادر ہیں۔ اگر چھوٹا لشکر جائے گا تو تباہ جائے گا اور بڑا لشکر بھوکوں مر جائے گا۔ عثمان نے پوچھا وہ لوگ قول و قرار کے کیسے ہیں، وفادار ہیں یا بے وفا، حکیم نے جواب دیا کہ خائن اور غدار ہیں" نتیجتاً عثمان نے سندھ پر لشکر کشی سے منع کر دیا اور کوئی حملہ نہیں کیا۔

علی بن ابو طالب کو خلافت کے اغاز میں اندرونی خلفشار کا سامنا ہوتا ہے، جس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صغیر بن دعر کو لشکر کی کمان دیکر ہند کی جانب روانہ کیا لشکر فتح مند ہوا اور بہت زیادہ مال غنیمت اور غلام ہاتھ آئے۔

بعد میں حارث بن مرہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا گیا جو شروع میں فتح مند ہوا اور کثیر مال غنیمت کے علاوہ اس قدر غلام ہاتھ ائے کہ فتوح البلدان کے مطابق صرف ایک دن میں 1000 غلام تقسیم ہوئے۔ حارث بعد میں اپنے ساتھیوں سمیت کیکانان کے درے کے پاس ہلاک ہوا۔

معاویہ بن ابو سفیان نے اس علاقے کا انچارج عبداللہ بن سوار العبدی کو مقرر کیا اور اے کہا" سندھ میں ایک پہاڑ ہے جسے کیکانان کہتے ہیں، وہاں کے گھوڑے قد آور اور موزوں شکل و شباہت کے ہیں، تم سے پہلے وہاں کی غنیمتیں اور اموال غنیمت یہاں پہنچ چکے ہیں، وہاں کے لوگ غدار ہیں اور اسی پہاڑ کی وجہ سے شرارتیں اور سرکشی کرتے رہتے ہیں" عبداللہ کو کمک کے طور پر قیس بن ہیثم السلمی کو بھی بھیجا گیا۔ لیکن انہیں اس قدر بری شکست ہوئی کہ پہاڑ (کوہ سلیمان) عربوں کی لاشوں سے بھر گیا۔

عبداللہ کے بعد راشد بن عمرو کو مکران کی جانب بھیجا گیا، جسے ابتدا میں کامیابیاں ملیں لیکن بھرج کے نزدیک مقامی لشکر کے ہاتھوں مارا گیا۔ راشد کے مرنے کے بعد سنان بن سلمہ گورنر بنا، وہ بھی ابتدائی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بدھیہ (مغربی جیکب آباد) میں ہلاک ہوا۔ اس کے بعد منضر بن جارود کو اس مہم کے لیئے روانہ کیا گیا، وہ پورالی کے نزدیک بیمار ہو کر مر گیا۔

گو امویوں کو اپنی حکومت کے شروع میں مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن امام حسین کو شہید کرنے، انہی کے خاندان کے عبداللہ بن زبیر کو خانہ کعبہ کے اندر قتل کرنے کے بعد اہل بیت کی بغاوت تقریبا کچلی جاچکی تھی، حکومت بنی امیہ اندرونی خلفشار سے نپٹنے کے بعد اسلام کو پھیلانے کے نام پر بیرونی لوٹ مار کیلیئے نکل پڑی۔ عرب جو اپنے خاندانی اور قبائلی جھگڑوں میں الجھے تھے ان کی توجہ ان سے ہٹانے کیلیئے اس سے بہتر کوئی اور حل نہیں تھا کہ انہیں پڑوس کی امیر آبادیوں اور شہروں کو لوٹ کر اپنی حالت بہتر بنانے کی طرف مائل کیا جائے۔ ولید بن عبدالمالک کے زمانے میں جہاں موسیٰ بن نصیر کو فتح سپین کیلیئے بھیجا گیا، وہیں قتیبہ بن مسلم نے سمرقند اور بخارا تک جا پہنچا۔ لیکن جب حجاج خلیفہ سے سندھ پر حملہ کی اجازت طلب کرتا ہے تو ماضی کے تلخ تجربات کی وجہ سے اسے پہلی بار اجازت نہیں ملتی۔ عجیب لگتا ہے کہ خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک کو حاجیوں کے "لٹے جہازوں" کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ دوسری بار حجاج کے اصرار پر سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

عرب عبداللہ بن نبہان السلمی کو سندھ بھیجتے ہیں لیکن وہ دیبل میں مارا جاتا ہے۔ دیبل کی جانب دوسری مہم کا سربراہ بذیل بن تحفہ تھا، جسے راجہ داہر کے بیٹے جے سنہا کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی، بذیل بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ جس جگہ بذیل بن تحفہ مارا جاتا ہے وہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کی وجہ سے عرب اسے یاقوتوں کا جزیرہ کہتے تھے۔ حجاج بدیل کی موت کی خبر جب حجاج تک پہنچی تو اس نے کہا "اے موذن، جب بھی نماز کیلیئے اذان دو تو دعا میں مجھے بذیل کا نام یاد دلاتے رہنا، تاکہ میں اس کا انتقام لوں"۔

پہلی بار جب حجاج نے شکست کا بدلہ لینے کی اجازت مانگی تو ولید بن عبدالمالک کا یہ جواب تھا۔

"وہ قوم بہت مکار اور ملک بہت دور ہے، لشکر، اسلحہ جات اور جنگ کی تیاری پر بہت خرچہ ہوگا اور بیت المال پر بڑا بوجھ ہوگا، جو کہ ٹھیک بات نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلے کو موقوف کر دینا چاہیئے، کیونکہ جب بھی وہاں لشکر جاتا ہے، مسلمان ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس لیئے اس بات کو بھول جاؤ"

چچ نامہ

حجاج پھر دوسری بار لکھتا ہے اور اجازت پر اصرار کرتا ہے "اے امیر المومنین کتنی مدت گزر چکی ہے کہ مسلمان قیدی (بذیل بن تحفہ والی جنگ کے) کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہیں، اور اسلام کا لشکر ایک مرتبہ شکست کھا چکا ہے جس کا بدلہ لینا اور مسلمانوں کو آزاد کرانا ضروری ہے۔۔۔ اگر خرچہ کی تکلیف ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں دارالخلافہ کے خزانہ سے اس لشکر پر جو رقم خرچ ہو گی، اس سے دوگنی، سہ گنی رقم خزانے میں جمع کرائی جائے گی"۔

چچ نامہ

حجاج اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو بھیجتا ہے، سندھ پر حملے سے پہلے محمد بن قاسم فارس کا گورنر تھا، اور اس کی عمر 17 سال بتائی جاتی ہے۔ محمد بن قاسم سب سے پہلے دیبل کے قلعے کا محاصرہ کرتا ہے، دیبل کوئی بڑا شہر نہیں تھا، لیکن پھر بھی محاصرہ دس دن لیتا ہے۔ قلعہ تب فتح ہوتا ہے جب ایک برہمن قلعے سے باہر نکل کر عربوں کو مشورہ دیتا ہے کہ قلعے کے اوپر لگے ہوئے سرخ رنگ کے جھنڈے کو مار گرایا جائے۔ جس سے قلعے کے اندر محصور لوگوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ برہمن کے کہنے کے مطابق منجنیقیں جھنڈے کو نشانے پر رکھ لیتی ہیں۔ جس سے قلعے کی وہ چوٹی ٹوٹ جاتی ہے۔

"تب اہل دیبل نے دروازہ کھول کر امان طلب کی اور اس پر محمد بن قاسم نے فرمایا، مجھے امان کا حکم نہیں ہے، پھر ہتھیار بندوں کا قتل عام تین دن تک جاری رہا --------- پھر محمد بن قاسم مندر کے اندر آیا جہاں کچھ لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی، اور دروازہ بند کر کے خود کو جلانا چاہ رہے تھے۔ اندر داخل ہونے کیلئے دو چوکیداروں کو کھینچ کر باہر نکال کر قتل کیا گیا۔ سات سو دیوداسیاں جو بت کی خدمت کلیئے تھیں، انہیں ان کے قیمتی زریں لباسوں اور جڑاؤ زیوروں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ ایک وقت میں چار آدمیوں کو اندر داخل کیا گیا، اور کچھ کہتے ہیں کہ چار سو آدمی ایکدم سے اندر آئے اور ان کے زیورات زبردستی اتار لیئے"۔

چچ نامہ

نیرون کوٹ کا قلعہ بھنڈر شمنی کے زیر نگرانی تھا، جب عربوں کے پاس خوراک اور اسلحہ کی شدید کمی ہو جانے سے بددل ہو چکے ہوتے ہیں تو بھنڈر یہ کہہ کر قلعہ عربوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ بدھ ہے اور اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حکومت کس کے پاس ہو۔

"تب دوسرے دن جب صبح صادق تاریکی کے پردے سے اطلسی لباس پہن کر نمودار ہوئی، تب شمنی بھی بے اندازہ تحفوں اور بے شمار نذرانوں کے ساتھ محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رضامندی کا خلعت پہنا اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا، اور محمد بن قاسم کی دعوت کی، یہاں تک کہ لشکر کو فراخی کے ساتھ غلہ ملنے لگا"۔ چچ نامہ

محمد بن قاسم کی ان کامیابیوں کی اہم وجہ کچھ مقامی غداروں کا ساتھ مل جانا تھا، جن میں سب سے نمایاں نام بدھ سردار کاکا کوتک اور موکا بن وسایا کا ہے، بعد میں موکا کا بھائی راسل بن وسیایا بھی عربوں کا ساتھی بن جاتا ہے۔ جب عربوں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ دریا کیسے پار کریں تو موکا انہیں پل بنانے کیلیئے کشتیاں مہیا کرتا ہے۔ جب بھی محمد بن قاسم کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ موکا بن وسایا سے مدد مانگتا ہے۔ کاکہ کوتک نامی بدھ سردار جو بدھیہ کے قلعہ کا حاکم ہے، وہ نہ صرف بغیر لڑے قلعہ حوالے کردیتا ہے، بلکہ دوسروں کو بھی لڑنے سے روک دیتا ہے، اور جو پھر بھی لڑنا چاہتے ہیں، انہیں عربوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ اسی کے علاوہ یہ افواہ پھیلا دی جاتی ہے کہ ہماری کتابوں اور نجوم کے حساب سے یہ حکم صادر ہوا ہے کہ ہندوستان لشکر اسلام کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اس لیئے اب میرا ارادہ ہے کہ کہ مسلمانوں کا استقبال کروں۔ قلعہ کے فتح ہوجانے کے بعد عرب مال غنیمت اکٹھا کرنے میں جٹ جاتے ہیں۔

"اس کے بعد شمنیوں کے علاوہ جن کے ساتھ پختہ عہد نامہ کیا تھا، دوسروں کے پاس جہاں بھی سونا چانسی دیکھا، اپنے قبضے میں کیا۔ اور سارا سونا چاندی، زیور اور نقد ضبط کرکے لشکر کا حق لشکر کو دے کر باقی پانچواں حصہ حجاج کے خزانچی کے حوالے کیا"۔

چچ نامہ

محمد بن قاسم راجہ داہر کے چچازاد بھائی بجھرائے بن چندر بن سیلائج اور دیگر چھوٹے سرداروں کو شکست دیکر آگے بڑھتا ہے۔ جب وہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچتا ہے تو اس کی اس پیش قدمی پر وزیر راجہ داہر کو مشورہ دیتا ہے، کہ وہ اپنے اہل وعیال اور بچوں کو ہند بھیج دے اور اکیلے جنگ کرے، یا دوسرے راجاؤں کو کہو کہ میں تمہارے اور عرب لشکر کے درمیان میں دیوار کی طرح حائل ہوں، لہذا میرے ماتحت آکر عربوں کے خلاف جنگ لڑو، لیکن راجہ داہر نے تمام تجاویز یہ کہہ کر ٹھکرا دیں کہ اگر میں نے اپنے اہل خاندان کو بھیجا تو رعایا بوکھلا جائے گی اور میرے ٹھاکر اور امیر دل شکستہ ہوکر جنگ نہیں کریں گے اور منتشر ہو جائیں گے۔ اور نہ ہی میں کسی اور کے دروازے پر جاکر اندر آنے کی اجازت مانگوں گا کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ راجہ داہر اپنے وزیر کو کہتا ہے۔

"میرا منصوبہ ہے کہ میں کھلے میدان میں عربوں سے مقابلہ کروں، اور پوری قوت اور شدت سے جنگ کروں۔ اگر میں غالب آیا تو میں انکو کچل دوں گا اور میری بادشاہت مضبوط ہوگی۔ لیکن اگر میں عزت وناموس کے لیئے قتل ہوگیا، تو یہ بات ہند اور عرب کی کتابوں میں درج ہوگی، اور شرفا اس بات کا ذکر کریں گے اور دنیا کے دیگر بادشاہ سنیں گے، اور یہ کہا جائے گا کہ فلاں بادشاہ نے اپنے ملک کی خاطر اپنے دشمنوں سے لڑتے ہوئے اپنی قیمتی جان قربان کر دی"۔

چچ نامہ

حجاج کو جنگ کی آہستہ رفتار سے بہت الجھن ہوتی ہے، وہ ایک غصہ بھرا خط محمد بن قاسم کو لکھتا ہے۔

"میں تم سے غیر مطمن ہوں اور تمہاری نرمی کی روش مجھے حیران کر رہی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تم لوگوں سے اس قدر رحم سے کیوں پیش آرہے ہو۔ جب تمہاری آزمائش کے مطابق کوئی تمہارا دشمن ثابت ہوا ہے، تمہیں اس پر قطعی مہربان نہیں ہونا چاہیئے۔ تمہیں عام اور خاص کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے تمہاری ناسمجھی آشکار ہوگی۔ اور دشمن تمہیں کم عقل اور نابالغ سمجھے گا"۔

چچ نامہ

راجہ داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان دریا حائل ہے، محمد بن قاسم اپنا قاصد کے زریعے پیغام بھیجتا ہے۔ کہ یا تو داہر اپنی فوجیں دریا کے پار لے ائے یا عربی فوجوں کو دریا پار کرنے دیا جائے۔ راجہ داہر نے محمد علافی سے پوچھا تو اس کا مشورہ تھا کہ قاسم کو دریا پار نہ کرنے دیا جائے، لیکن داہر کی حمیت نے اسے قبول نہ کیا کہ اگر اس نے عربوں کو جنگ کیلیئے دریا پار کرنے نہ دیا تو اس حرکت کو اس کی کمزوری یا عاجزی پر محمول کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے شامی قاصد کو کہا

" واپس جا کر اپنے امیر سے کہہ دو کہ دریا پار کرنے کے سلسلے میں اسے آزادی ہیں، ہم جنگ کرنے کیلیئے تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔۔ یا تم دریا پار آجاؤ، نہیں تو ہم دریا پار کر کے آجاتے ہیں"۔
موکا بن وسایا کی دی گئی کشتیوں کی مدد سے عربی فوج پل بنا کا دریا کے دوسرے پار آتی ہے۔

مقابلہ کئی دن تک جاری رہتا ہے، باوجود اس کے کہ محمد بن علافی کا ایک ساتھی جس کا نام عبید تھا، عربوں سے جا ملتا ہے اور داہر کا جنگ کا منصوبہ عربوں کو بتا دیتا ہے لیکن داہر بہادری سے جنگ لڑتا ہے۔ جنگ کے گیارہوں (آخری) دن عربی لشکر میں بھگدڑ مچ جاتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ عربوں کو شکست ہوگئی ہے۔

"اس پر کافروں نے سمجھا کہ اسلامی لشکر فرار ہو رہا ہے، اور واقعی عرب دہشت زدہ اور حیران ہو گئے تھے۔ محمد بن قاسم تو اتنا مدہوش تھا کہ پانی پلانے والے غلام کو کہتا ہے: مجھے پانی کھلا"۔

اس وقت موکا بن وسایا بھی اپنے ساتھیوں سمیت عربوں کی مدد کیلیئے جنگ میں شامل ہو جاتا ہے۔

داہر اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر داد شجاعت دے رہا ہے، کہ اسے عورتوں کی طرف سے آواز آتی ہے " **اے رائے، ہم عورتیں ہیں، ہمیں عربوں نے پکڑ کر قیدی بنالیا ہے** " داہر نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھی ان کی طرف موڑ دیا۔ **"کیا کہا میں ابھی زندہ ہوں، تمہیں کون پکڑ سکتا ہے "**۔ یہ سنتے ہی محمد بن قاسم نے ایک نشانہ باز کو کہا، یہ وقت ہے۔ اس نشانہ باز کے آتشیں تیر سے داہر کے ہودے میں آگ لگ جاتی ہے، فیل بان اپنا ہاتھی دریا کی جانب بڑھاتا ہے، داہر کا ہاتھی جب باہر آتا ہے تو تیر اندازوں کی ایک باڑ اس ک انتظار کر رہی ہوتی ہے، ایک تیر اس کے دل میں لگتا ہے، اور یوں یہ سندھی سورما اپنی جان اپنے وطن پر نچھاور کر دیتا ہے۔ داہر کا سر قلم کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ جب حجاج کے سامنے راجہ داہر کا سر لایا جاتا ہے تو بنی ثقیف کا ایک آدمی یہ شعر پڑھتا ہے۔

"۔۔۔۔خوشیاں مناؤ، گنا ہگار ذلیل ہوئے، ان کی دولت ہمارے ہاتھ آئی۔ اب وہ تنہا ہیں اور انڈے کی طرح آسانی سے ٹوٹنے والے۔ اور انکی کستوری ہرنیوں جیسی (شوخ اور خوشبودار) عورتیں سو رہی ہیں (ہمارے حرم میں)، ان کے بادشاہ کا (کٹا ہوا) سر یہاں پڑا ہوا ہے، اب وہ شرم سے جھکے ہوئے سر کیساتھ اونٹوں پر سوار ہوں گے، اور انکی فوج زار و قطار روئے جا رہی ہے "۔

حجاج نے منادی کرائی اور منبر پر چڑھ کر کہا " **اہل شام اور اہل عرب کو مبارک ہو ہند کی فتح، کثیر مال و دولت، مہران کا میٹھا پانی، اور بے انتہا نعمتیں جو خدا نے انہیں عطا کی ہیں "**۔

اس مہم پر ساٹھ کروڑ درہم خرچ ہوئے، لوٹ مار سے ایک ارب ۲۰ کروڑ کا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ حساب کرنے کے بعد حجاج نے کہا

ہم نے انتقام لیکر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیا ہے، ہم نے ساٹھ کروڑ کا نفع حاصل کیا اور ساتھ میں داہر کا سر بھی"۔

فتوح البلدان : احمد بن یحیٰی بلاذری

محمد بن قاسم آگے بڑھتا ہے تو اروڑ کے مقام پر راجہ داہر کی بہن بائی قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتی ہے، لیکن جب اسے منجنیقوں اور تیروں کی بارش سے بچنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تو وہ حکم دیتی ہے کہ تیل، لکڑیاں اور روئی اکٹھی کی جائیں، محمد بن قاسم آ پہنچا ہے، ان چنڈالوں اور گوشت خوروں کے ہاتھوں ذلیل ہونے کی بجائے ہم اپنے آپ کو آگ کی نذر کر کے اپنے شوہروں

سے جالتی ہیں، یہ سوچ کر انہوں نے اپنے آپ کو زندہ جلاڈالا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ "جنگ کرنے والے لوگ اگر فرمانبرداری کیلئے بھی سر جھکائیں تب بھی انہیں نہ چھوڑا جائے"۔ چنانچہ چھ ہزار جنگجو سندھیوں کو قتل کیا گیا اور انکے بیوں بچوں کو قیدی بنایا لیا گیا۔ اروڑ کے قلعے سے محمد بن قاسم کو بہت زیادہ مال و دولت کے علاوہ ساٹھ ہزار غلام اور کنیزیں ہاتھ آئیں۔ جن میں تیس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا، ان میں راجہ داہر کی بھانجی بھی شامل تھی۔ قیدی شاہزادیوں کو خلیفہ کے حکم سے بیچ دیا گیا، کچھ تحفتا بانٹ دی گیئں۔

محمد بن قاسم نے برہمن آباد کا رخ کیا، راستے میں بھرور اور دھلیلہ کے قلعے تھے، جن میں سولہ ہزار جنگجو مرد تھے، دوماہ دھلیلہ کے قلعے تک محاصرہ جاری رہا، جب قلعہ منجنیقوں سے ٹوٹا تو تقریبا تمام جنگجو مرد ہلاک ہو چکے تھے، باقیوں کو غلام اور عورتوں کو کنیزیں بنا کر پانچواں حصہ دارالخلافے بھیج دیا۔

برہمن آباد کے قلعے جنگجو صبح کے وقت باہر آتے اور شام تک جنگ کرتے، اس طرح یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا، محاصرے سے تنگ آکر کچھ لوگوں نے باہر آکر امان مانگی، محمد بن قاسم نے امان دینے کے بعد سب ہتھیار بندوں کو قتل کروادیا۔ اور ان کے متعلقین کو قیدی بنالیا گیا۔ تیس سال اور اس سے نیچے کے جوانوں کو بیڑیاں پہنا دیں گئیں، اکثر جوانوں کو قتل کر دیا گیا، بچنے والوں پر جزیہ نافذ کر دیا گیا۔

برہمن آباد کا قلعہ چند لوگوں کی سازش کی وجہ سے فتح ہوا کہ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ جب قلعہ ٹوٹا تو راجہ داہر کی بیوی لاڈی جس کی تجویز تھی کہ اگر قلعہ فتح ہوا تو میں بچوں سمیت بھڑکتی چتا میں کو د جاؤں گی، لیکن قلعہ اچانک فتح ہو گیا اور لاڈی اپنی ہم خیال عورتوں سمیت گرفتار ہو گئی، کچھ روایات کے بقول لاڈی گرفتار نہیں ہوئی۔

"یہاں پر داہر کی ایک بیوی تھی، پکڑے جانے کے ڈر سے اس نے اپنی باندیوں اور جمع پونجی کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ جلا دیا"۔

فتوح البلدان: احمد بن یحییٰ بلاذری

برہمن آباد سے راجہ داہر کی دو بیٹیاں گرفتار ہوتی ہیں۔ باقی ماندہ لوگوں میں سے بیس ہزار لوگوں کو غلاموں کے طور پر چنا گیا۔ ایک روایت کے مطابق یہاں چھ ہزار سندھیوں کو قتل کیا گیا، جبکہ دوسری روایت کے مطابق سولہ ہزار سندھی قتل کیے گئے۔ باقیوں پر جزیہ نافذ کر دیا گیا

"میں آج تمہیں جانے دیتا ہوں۔ تم میں جو مسلمان ہو جائے اور دائرہ اسلام میں آ جائے، ان پر جزیہ معاف ہو گا۔ لیکن جو اب بھی اپنے عقیدے سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں، ان کو اپنے بزرگوں کا مذہب رکھنے پر جرمانہ اور جزیہ دینا ہو گا"۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے وہیں رہنا پسند کیا، باقی اپنے آبائی مذہب کی خاطر وہاں سے بھاگ گئے، اور ان کے گھوڑے، مال و اسباب اور جائیداد ان سے لے لی گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد بن قاسم نے سوداگروں اور صناعوں پر صرف بارہ درہم کے برابر کی چاندی بطور جزیہ مقرر کی، کیونکہ انکے اثاثے (عربوں نے) لٹ چکے تھے"۔

چچ نامہ۔

برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کو حجاج کا ایک اور خط ملتا ہے۔"۔۔۔۔۔۔ اب اس جگہ پر مزید قیام نہیں کرنا چاہیئے، ہند اور سندھ کی بادشاہت کے ستون اروڑ اور ملتان ہیں جو کہ بادشاہوں کی تخت گاہ ہیں۔ بادشاہوں کے خزانے اور دفینے بھی ان ان دونوں مقامات پر مدفون ہیں۔ اگر قیام ہی کرنا ہے تو کسی ایسی جگہ پر قیام کرو کہ جو پر فضا ہو تا کہ سارا سندھ اور ہند قبضے میں آ جائے، جو اسلام کی تابعداری سے انکار کرے، اسے قتل کر ڈالو، اللہ ہماری مدد کرے گا۔ ہند کے شہروں سے لے کر چین کی حدود تک کے علاقے فتح کرنا تجھ پر لازم ہے۔ میں نے قتیبہ بن مسلم قریشی کو تمہیں کمک پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ اپنے تمام غلام اس کے پاس پہنچادو۔"۔

چچ نامہ

حجاج کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے محمد بن قاسم ملتان کا رخ کرتا ہے۔ اسکلندہ کے قلعے کا مقامی لشکر باہر نکل کر مقابلہ کرتا ہے لیکن ایک خونریز جنگ کے بعد مقامی لشکر پسپا ہو کر قلعے میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب محاصرے کے دوران قلعے میں خوراک کی قلت ہوتی ہے، تو اہل قلعہ امان کی درخواست کرتا ہے۔ امان دینے کے بعد محمد بن قاسم چار ہزار ہتھیار بندوں کو تہہ تیغ کرنے کے بعد انکے پسماندگان اور متعلقین کو غلام بنانے کا حکم جاری کرتا ہے۔

اس سے اگلا قلعہ دریائے راوی کے کنارے ہے جس کا حاکم بجھرا ہے، سترہ دن تک سخت لڑائی ہوتی ہے، جس میں عربوں کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ محمد بن قاسم قسم کھاتا ہے کہ میں اس قلعے کو منہدم کر ڈالوں گا، چنانچہ اس کے حکم سے فتح کے بعد سارے شہر کو ویران کر دیا جاتا ہے۔

اگلے قلعے پر عربوں کا مقابلہ راجہ کندا سے ہوتا ہے۔ اہل قلعہ دوماہ تک مقابلہ کرتے ہیں، تا آنکہ ایک غدار قلعے کے اندر آنے کا راستہ عربوں کو بتاتا ہے۔ جس سے قلعہ فتح ہو جاتا ہے۔ چھ ہزار سپاہیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور ان کے متعلقین کو غلام بنالیا جاتا ہے۔

اس ساری مہم کے دوران عرب لشکر کی ایک اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ مقامی عبادت گاہوں کو یا توڈھادیا گیا ہے، یا انہیں مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے مندروں کو انتہائی بے رحمی سے لوٹا گیا۔

"علی بن محمد مدائنی سے روایت ہے کہ محمد بن قاسم وزیروں اور نائبوں کے ساتھ اس بت خانے میں آیا۔ یہاں اس نے سونے کا ایک بت دیکھا جس کی آنکھوں کی جگہ پر سرخ یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم نے سمجھا کہ یہ کوئی آدمی ہے چنانچہ اس نے وار کرنے کیلئے تلوار نکالی۔ اس پر بت کے مجاور نے کہا، اے امیر یہ وہی بت ہے جو ملتان کے راجہ جوبن نے بنوایا تھا، اور جو مال و دولت دفن کر کے فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے یہ بت کو اٹھا لینے کا حکم دیا، اس کے نیچے سے دوسو تیس من سونا اور سونے کی کترن سے بھرے ہوئے چالیس مٹکے برآمد ہوئے۔ کل تیرہ ہزار دوسو من سونا دفینے سے نکلا۔ وہ سونا اور بت خزانے میں لایا گیا۔ اس کے علاوہ موتی اور جواہرات جو کہ ملتان کی لوٹ میں ہاتھ آئے تھے، وہ اور بہت سے دوسرے خزانے اور دفینے بھی قبضے میں کیئے گئے"۔

چچ نامہ

سندھ کی داستان راجہ داہر کی دو بیٹیوں سوریا دیوی اور پرمل دیوی کے بغیر نامکمل ہے، جب انہیں خلیفہ کے حرم میں پیش کیا گیا، تو بڑی بہن نے خلیفہ کو کہا کہ وہ کنواری نہیں رہی، محمد بن قاسم ان دونوں بہنوں کو خلیفہ کے پاس بھیجنے سے پیشتر ان کی عزت لوٹ چکا ہے، خلیفہ کے حکم پر محمد بن قاسم کو ایک تازہ ذبح شدہ بیل کی کھال میں سی کر بھیجا جاتا ہے۔ خلیفہ کو جب اطلاع ملتی ہے کہ محمد بن قاسم کا صندوق آ پہنچا ہے تو خلیفہ دریافت کرتا ہے "زندہ ہے یا مردہ"۔ اسے بتایا جاتا ہے "خدا خلیفہ کی عمر اور عزت کو دائمی بقا عطا کرے، جب اودھاپور میں فرمان ملا تب حکم کے مطابق محمد بن قاسم نے خود کو کچے چمڑے میں بند کرایا، اور دو دن بعد راہ میں جان اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے دارالبقا کو کوچ کر گیا"۔ اس وقت خلیفہ داہر کی بیٹیوں کو بلاتا ہے، اور اپنے ہاتھ میں پکڑی سبز زمرد کی چھڑی کو محمد بن قاسم کے دانتوں پر پھیرتے ہوئے کہتا ہے "اے راجہ داہر کی بیٹیو، ہمارا حکم اپنے ماتحتوں پر اس طرح جاری ہے۔ اس لیئے کہ سب منتظر اور مطیع رہتے ہیں۔ جیسے ہی ہمارا فرمان اسے قنوج میں ملا، ویسے ہی

ہمارے حکم پر اس نے اپنی پیاری جان قربان کر دی"۔ لیکن جب خلیفہ کو داہر کی بیٹی یہ بتاتی ہے کہ اس نے اپنے باپ راجہ داہر کی موت کا انتقام لینے کیلئے جھوٹا الزام لگایا ہے تو وہ خلیفہ دونوں بہنوں کو دیوار میں زندہ چنوا دیتا ہے۔

سندھی مردوں اور عورتوں کو کنیزوں اور غلاموں کی صورت میں پکڑ کر لے جانے والے منظر کی ایک پینٹنگ

کیا یہ واقعی ایک ایسی جنگ تھی جسے جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ یا یہ عربوں کی اپنے وقت کی مہذب دنیا کو لوٹنے کی ایک کاروائی تھی۔ جیسے اس سے پہلے وہ شام، مصر، عراق و ایران کو لوٹ چکے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ خلیفہ وقت دونوں بار سندھ پر چڑھائی کی اجازت دینے سے ہچکچاتا ہے، کیا اس کا جذبہ ایمانی حجاج بن یوسف سے کمزور تھا، خلیفہ اور حجاج کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی ہے اس میں بھی کسی جہاز کے لٹنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، دوسری بار بھی جو خط لکھا جاتا ہے اس میں بھی شکست کا انتقام لینے اور بذیل بن تحفہ کے سندھ کے حملے کے دوران قید ہونے والے قیدیوں کا ذکر ہے۔ فتح کے بعد بھی حجاج صرف شکست کے انتقام اور منافع کا ذکر کرتا ہے۔ حجاج کی یہ بھی خواہش تھی کہ سندھ کے بعد باقی ماندہ ہندوستان اور اسکے بعد چین پر بھی حملہ کیا جائے، کیا باقی ماندہ ہندوستان اور چین نے بھی حاجیوں کے جہاز لوٹے تھے یا یہ خواہش دیگر قوموں کی مال و دولت لوٹنے کی عربی جبلت کا اظہار تھا۔

خلیفہ عثان بن عفان کے زمانے میں سندھ کا پانی کڑوا اور کسیلا تھا، فتح کے بعد اس قدر میٹھا ہو جاتا ہے کہ حجاج باقاعدہ اس کا ذکر کرتا ہے۔۔

ڈاکٹر ممتاز حسین پٹھان کے مطابق عربوں کے سندھ پر حملے کی وجوہات صرف جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ دیبل کی فتح کے بعد عرب قیدیوں کی بازیابی بھی ایک جھوٹ ہے اور تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ڈاکٹر خان کے مطابق اس جنگ کا مقصد لوٹ مار اور عربوں کو آپس میں لڑنے اور داخلی انتشار پیدا کرنے کی بجائے ملک سے باہر مصروف رکھنا تھا۔

"سندھ کی فتح حجاج کے پیشگی منصوبے کا حصہ تھی، جسے جائز ٹھہرانے کیلئے بودے دلائل گھڑے گئے۔ -------------- علافی جو حجاج کے مظالم سے بھاگ کر راجہ داہر کی پناہ میں آئے تھے، انہوں نے بھی عربوں کے لیئے جاسوسی کا کام کیا۔ انہوں نے اہم معلومات عربوں تک پہنچائیں اور عربوں کو سندھ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی"۔ ڈاکٹر خان بدھوں کو بھی راجہ داہر کی شکست کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جنہوں نے اہم مواقع پر داہر کو دھوکا دیا۔

گو سندھی قوم پرست آج بھی دو جولائی کو راجہ داہر کا دن مناتے ہیں لیکن راجہ داہر کا یہ کہنا انتہائی غلط ثابت ہوا کہ ہند اور عرب کے تاریخ دان اسے ایک سورما کے طور پر یاد رکھیں گے، عرب تو در کنار داہر کو اپنے ہی دھرتی پر نہ صرف بھلا دیا گیا بلکہ ایک اس کے مقابلے میں ایک غیر ملکی لٹیرا قابل ستائش ٹھہرا۔ آقاؤں کے تلوے چاٹنے والوں کی کبھی بھی کمی نہیں رہی، عرب ہونا انتہائی افضل ٹھہرا اور عربوں کی ہر چیز اتنی برتر اور مقامی لوگوں کا احساس کمتری اس سطح پر آ گیا کہ مقامی لوگوں نے اپنی جڑیں عرب میں تلاش کرنے شروع کر دیں۔ راجپوت ہونا جو کبھی باعث فخر ہوتا تھا، انہوں نے بھی اپنے سلسلہ نسب عرب سے جوڑنا شروع کر دیا سموں نے اپنے آپ کو عبد العزیٰ (ابو لہب)، سومروں نے علوی سادات، کلھوڑوں نے خود کو عباسی، اور بلوچوں نے خود کو حمزہ بن عبد المطلب کی اولاد کہنا شروع کر دیا۔ سندھ ایکدم سے قریشیوں، عباسیوں، سیدوں اور صدیقیوں وغیرہ سے بھر گیا۔

شاید تاریخ کبھی اس سندھی سورما کو اس کا جائز مقام دے